اقبال احمد کے منتخب مضامین

تالیف : زہرہ احمد، افتخار احمد اور ضیا میاں

ترجمہ : حسن عابدی

The free electronic download of this book has been made possible by the generous financial assistance provided by:

The Eqbal Ahmad Foundation

MashalBooks.org

مشعل بکس

آر۔بی 5، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔پاکستان

اقبال احمد کے منتخب مضامین

تالیف: زہرہ احمد' افتخار احمد اور ضیا میاں

اردو ترجمہ: حسن عابدی

کاپی رائٹ اردو (c) 2001 مشعل بکس

ناشر: مشعل بکس

آر۔بی۔5' سیکنڈ فلور

عوامی کمپلیکس' عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور۔54600' پاکستان

فون و فیکس: 042-5866859

E-mail: mashbks@brain.net.pk

http://www.mashalbooks.com

ٹائٹل ڈیزائن: عمر رحمٰن

پرنٹرز: مکتبہ جدید پریس' لاہور

قیمت: -/300روپے

ترتیب

پیش لفظ — پرویز ہود بھائی — 7

تعارف — 25

ایک انٹرویو: ڈیوڈ بریسمین — 26

ریاست: نوآبادیاتی نظام کے بعد — 53

آلوؤں کی بوری سے آلوؤں کے بھرتے تک — 54

نوآبادیاتی نظام کے بعد نظام اقتدار — 69

نوآمدہ فسطائی ریاست — 86

پاکستان کی ساخت — 105

پاکستان کی زیرِ عتاب تاریخ — 106

محمد علی جناح ایک منفرد شخصیت — 110

بدعہدی کی قیمت — 114

برصغیر کیسے تقسیم ہوا؟ — 118

پاکستانی سفارت کار کے نام ایک خط — 124

ایک تحریر: جنوبی ایشیا کے بحران پر — 131

عبرت آموز تباہی — 142

عسکریت اور ریاست — 147

پاکستان ۔ پولیس ریاست کی نشانی — 148

پاکستان میں فوجی مداخلت — 171

پاکستان کا بحران ۔ ایک انٹرویو — 189

یہ پاکستان کے خدائی فوجدار — 209

MashalBooks.org

فوج حکومت میں کیوں آتی ہے؟ 215

ہندوستان کی جنونی کیفیت اور ہمارا انتخاب 218

جب پہاڑ دم توڑ دیں 222

جوہری دھماکے: نفع و نقصان 227

عقل حیران ہے 233

ہندوستان 238

ہندوستان: اب کہ سر ما گزر چکا ہے 239

ہندوستان کا غیر یقینی مستقبل 247

ہم پھر آن ملتے ہیں 252

پاکستان کو بی جے پی کا چیلنج 257

گجرال سے گفتگو 262

کشمیر 267

کشمیر: ہندوستان کی شامت اعمال 268

کیا ہندوستان اور پاکستان کی جنگ ناگزیر ہے؟ 273

کشمیر کا کشمیری حل 277

افغانستان 294

خونیں کھیل 295

افغانستان: اب جنگ بندی ضروری ہے 338

اک سرزمین بے ساز و آواز 342

افغانستان کی موجودہ صورت حال 346

سراب کے بعد 351

خانہ جنگی 356

عورتوں سے جنگ آزمائی 357

ایک شہر کا قتل 361

کراچی کا تشویش انگیز پیغام 365

کراچی کی جنگ کے بعد	370
جب حکومت قانون شکنی کرنے لگے	374
نوشتہ دیوار	379
شانتی نگر: جو ایک قصبہ تھا	384
تشدد کی بنیادیں	388
فیوڈل معاشرہ اور تشدد	409
راستے بند ہیں سب کوچہ قاتل کے سوا	414
فساد اپنے اندر	420
ایک اسلامی المیہ	424
اسلام اور سیاست	428
اسلام اور سیاست	429
ماضی اور مستقبل کے درمیان تعلق	449
اسلام: ناکام حکمرانوں کی پناہ گاہ	453
دائیں بازو کی مذہبیت اور اس کی جڑیں	457
سیاست میں مذہب	463
مذہبی جماعتوں کے اصل چہرے	468
امیدیں اور امکانات	472
جمہوریت کے فروغ کے لئے	473
اقتدار کا مسئلہ	477
حق کا سوال	482
انصاف کے منافی قانون	486
معاشرے میں دانشور کا کردار	492
مولانا کے آئین	496
آپ کے ملک کا میزانیہ	508
گلے شکوے کا معاشرہ	513

MashalBooks.org

پیش لفظ

پرویز ہود بھائی

ڈاکٹر اقبال احمد سے پہلی ملاقات کو کوئی شخص بھول نہیں سکتا۔ ان سے میں پہلی بار 1971ء میں ملا تھا۔ اس وقت ایم آئی ٹی (MIT) میں ویت نام جنگ کے خلاف مظاہرے ہو رہے تھے۔ میں ان دنوں وہاں ایک طالب علم تھا، ایک عام سا طالب علم، بالکل غیر سیاسی، کراچی گرامر اسکول کا پروردہ، ایک بے نیاز سا نوجوان، لیکن اس قطعی نئے معاشرے میں ایک جھٹکا مجھے اس طرح لگا جیسے کسی نے برفیلے پانی کا ایک ڈول مجھ پر الٹ دیا ہو۔ اچانک میری آنکھیں کھل گئیں۔ ہولناک حقائق سے بھری ہوئی دنیا میرے سامنے تھی۔ امریکی اپنے B-52 بمبار طیاروں سے ویت نام پر دھواں دھار بمباری کر کے اسے پتھر کے زمانے میں پہنچا دینے کے درپے تھے۔ دوسری طرف مغربی پاکستانی جوش و خروش کے ساتھ مشرقی پاکستان کی نسل کشی پر تلے ہوئے تھے۔ کیمبرج میں کسی بھی پاکستانی طالب علم یا وہاں مقیم تارک وطن کو ویت نام کے مسئلے کی ذرہ بھی پرواہ نہ تھی وہاں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو پاکستانی فوج کی کارروائیوں پر واہ واہ کر رہے تھے۔ وہاں سے مصائب اور تباہیوں کی جو لرزہ خیز خبریں آ رہی تھیں وہ انہیں سرے سے رد کر دیتے اور دلیل یہ دیتے کہ اس بارے میں سارے فوٹو گراف اور ٹی وی کے نشریئے یہودیوں کے بنائے ہوئے اور جعلی ہیں۔

ایم آئی ٹی میں اقبال احمد کا لیکچر میرے لئے گویا بجلی کا کوندا تھا۔ بصیرت، زور بیان اور جذبے کا ملا جلا ایسا بھرپور وار جس نے امریکہ کی سامراجی مہم جوئی کی دھجیاں بکھیر دیں اور نہایت چابک دستی سے حقائق کو نمایاں کر دیا۔ میرے لئے یہ ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ حاضرین میں تقریباً سبھی امریکی وہ تھے اور ان کے ایک ایک لفظ سے مسحور ہو رہے تھے۔ اقبال احمد کبھی اپنے حاضرین کو چیلنج کرتے کبھی ان کو لطف اندوز کرتے اور ان کی فہم میں اضافہ کرتے۔ بعد میں جب ان کے مداحوں نے انہیں گھیر لیا، تو اس ہجوم میں، میں بھی شامل تھا۔ اس کے بعد کے برسوں میں اقبال احمد کے ساتھ میرا تعلق صرف گہری عقیدت مندی کا نہیں رہا بلکہ یہ قریبی دوستی کے رشتے میں تبدیل ہوا۔

اقبال احمد بادشاہوں سے اور وزرائے اعظم سے جس بے تکلفی سے ملتے، اسی طرح عام لوگوں سے میل جول رکھتے۔ ان کے حسن سلوک سے بچے ان کے گرویدہ ہو جاتے، یہاں تک کہ دور کے رشتے دار بھی ان

سے قربت محسوس کرتے۔ ان کے سلوک میں گرم جوشی ایسی ہوتی کہ پہلی بار ملنے والا بھی یہ محسوس کرتا' جیسے وہ ایک عمر سے انہیں جانتا آیا ہے' یہ تھا ایک شخص نادرو نایاب خوبیوں کا حامل' جس کی رفاقت میں گزارا جانے والا ہر لمحہ ایک نعمت اور باعث رحمت تھا۔

حد بندیوں سے بے نیاز' سرحدیں پار کرنا

اقبال احمد 1932ء یا 1933ء میں بہار کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے' ان کے والد ایک زمیندار تھے' وہ اراضی کی اصلاحات کے حامی تھے' چنانچہ دوسرے زمینداروں نے انتقامی کارروائی کے تحت انہیں قتل کرا دیا۔ اس وقت اقبال احمد چار سال کے تھے۔ یہ قتل ہوتے انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ تشدد کا دوسرا سانحہ انہوں نے ابتدائی زندگی میں ہندوستان کی تقسیم کے موقع پر دیکھا۔ بہار سے لاہور آتے ہوئے خون میں نہایا ہوا ہندوستان انہیں دکھائی دیا۔ زمانے کی ان ہولناکیوں نے اقتصادی اور سماجی انصاف کے سلسلے میں ان کے عہد کو اور بھی پختہ کر دیا۔ پاکستان آ کر انہوں نے 1948ء میں کچھ عرصے کشمیر کی آزادی کی جنگ میں حصہ لیا' لیکن ان کی زندگی کے اس پہلو کے بارے میں زیادہ معلومات میسر نہیں۔ چند سال بعد جب انہیں ایک اسکالرشپ ملا تو وہ پاکستان سے نکلے اور پرنسٹن یونیورسٹی میں گریجویشن کے لئے داخلہ حاصل کیا۔ شمالی افریقہ میں مزدور جدوجہدان کے مطالعہ کا مضمون تھا' لیکن وہ بہت جلد فرانس کے خلاف ہونے والی الجزائر کی جنگ آزادی میں شریک ہو گئے۔ ابتدا میں وہ بن بیلا کے گہرے معاون رہے' اس کے بعد الجزائر کی انقلابی کونسل میں شامل ہو گئے اور جب ایف ایل این (مجاہدین آزادی) کا وفد امن مذاکرات کے لئے پیرس گیا تو اقبال احمد بھی اس وفد کے ایک رکن تھے۔

اقبال احمد کے ایک گہرے دوست ایڈورڈ سعید کا کہنا ہے کہ الجزائر ان کی سیاسی زندگی کا نقطہ آغاز تھا۔ لکھتے ہیں:

(یہ زندگی ایک رزمیہ ہے' شعریت سے بھرپور' جہاں گردی سے بھری ہوئی' جس میں آزادی کی تحریکوں سے اور ستم زدہ اور ستائے ہوئے لوگوں کی جدوجہد سے جبلی طور پر ایک کشش پائی جاتی ہے اور ان لوگوں کے ساتھ قلبی لگاؤ' جنہیں ناجائز طور پر سزا دی گئی ہو۔ خواہ وہ یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے شہری مراکز میں رہنے والے ہوں یا مہاجر کیمپوں کے پناہ گزین' محصور شہروں کے مکین ہوں یا بمباری سے تباہ ہونے والی بستیوں کے لوگ ہوں اور بوسنیا' چیچنیا' جنوبی لبنان' ویت نام' عراق' ایران اور ہاں' خواہ وہ برصغیر ہند کے باشندے ہوں۔)

ویت نام میں امریکہ کی سامراجی دہشت گردی کے اولین مخالفوں میں اقبال احمد شامل تھے' ان کو اپنی تحریروں میں ذہانت اور فراست کی بنا پر نہایت تیزی سے ملک گیر شہرت حاصل ہو گئی۔ امریکی حکومت نے بوکھلاہٹ کے مارے اقبال احمد کو 1970ء میں ایک بڑے مقدمے میں پھانس دیا۔ الزام لگایا کہ انہوں نے

ہنری کسنجر کو اغوا کر لینے اور وہائٹ ہاؤس کے گرمائی نظام کو ایک دھماکے سے تباہ کر دینے کی سازش کی تھی۔ جب عدالت نے حکومت کے خلاف فیصلہ کیا تو اس سے امن کی تحریک کو بڑی تقویت پہنچی۔ بعد کے برسوں میں اقبال اس قضیئے کو بہت لطف لے کر بیان کرتے تھے۔ مقدمے سے منسلک جو واقعات تھے اور امریکی ایف بی آئی نے انہیں اور ان کے دوستوں کو اس قضیئے میں ملوث کرنے کی جو کوشش کی تھی' انہیں وہ اس طرح بیان کرتے کہ سامعین ہنس ہنس کر دوہرے ہو جاتے۔

اقبال احمد میں بین الاقوامیت کا جو جذبہ تھا' اسے ایران' فلسطین' کیوبا اور چلی کے انقلابی رہنماؤں نے بہت جلد بھانپ لیا۔ چنانچہ وہ ان سے مشورے کرتے رہتے تھے۔ اس طرح بہت سے بادشاہ' شہزادے' حکومتوں کے صدور اور وزرائے اعظم' جنرل اور ایڈمرل بھی ان سے مشورے مانگتے تھے۔ اس کی دو وجوہ تھیں: پہلی وجہ یہ کہ تاریخ میں رونما ہونے والی سیاسی تحریکوں اور ان کے تہذیبی اور سماجی پہلوؤں پر ان کا علم انسائکلوپیڈیا کی طرح بے پایاں تھا۔ اوائل اسلام سے لے کر یورپ کے نشاۃ الثانیہ تک اور سامراجی اور نو آبادیاتی نظام کی نمود سے گلوبلائزیشن (عالم گیریت) کے عہد حاضر تک' پوری تاریخ پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ اقبال احمد نہ صرف یہ کہ ایک نہایت ذہین اور زبردست مقرر تھے' بلکہ اتنی اہم بات یہ ہے کہ وہ ایک اچھے سامع بھی تھے۔ آپ نے ان سے جو کچھ بھی کہا' یقین کیجئے کہ اقبال احمد نے اسے نہ صرف سمجھ لیا' بلکہ یہ بھی جان لیا کہ وہ بات آپ نے کیوں کہی اور آخر میں ہمیشہ اس میں اپنی طرف سے اضافہ بھی کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ذہانت آمیز اور بے لاگ ناقدانہ تجزیے کے لئے انہی کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔

اگرچہ اقبال احمد عالمی رہنماؤں کے ساتھ روابط کو اہم سمجھتے تھے' لیکن ان کے ساتھ دوستی غیر مشروط نہیں تھی۔ اقبال احمد نے ایسی پالیسیوں کی حمایت سے ہمیشہ انکار کیا' جنہیں اپنی جدوجہد کے مقاصد کے خلاف پایا' خاص طور پر ایسی پالیسیاں جن کا جھکاؤ تنگ دلانہ عصبیت کی طرف ہوتا تھا۔ الجزائر کے انقلابی مقاصد میں جب انہیں آلودگی نظر آئی تو اقبال احمد نے اس سے دور ہونا شروع کیا اور بن بیلا کے ساتھ تعلقات میں سرد مہری آ گئی۔ مجھے ان کے نیویارک والے اپارٹمنٹ میں ہوانا کے نہایت نفیس سگار نظر آ جاتے تھے۔ وہ فیڈل کاسترو کا ان کے پاس تحفہ ہوتا تھا۔ لیکن جب اقبال نے کاسترو سے اندرون ملک مخالفوں کے خلاف سختی برتنے کے معاملے پر اختلاف کیا' تو سگار آنے بند ہو گئے۔ یاسر عرفات کے ساتھ ان کے تعلقات کئی سال تک برقرار رہے' جو اقبال کے مشوروں کے بے چینی سے منتظر رہتے تھے اور انہیں فلسطین کی قومی کونسل میں ایک نشست دینا چاہتے تھے' لیکن یہ تعلقات اس وقت ایک دم ختم ہو گئے' جب اقبال کو یقین ہو گیا کہ امریکہ نے جس اوسلو سمجھوتے کو آگے بڑھایا ہے' وہ فلسطینیوں کے لئے زبردست تباہی کا موجب ہوگا۔ اپنے کردار کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لئے جو قربانی دینی ہوتی ہے' اقبال نے کسی تاسف کے بغیر دی۔

خود ان کے ملک کی قیادت کو اقبال احمد کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ پاکستان کی پہلی مارشل لا حکومت کے دور میں ان کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوا۔ جبکہ دوسرے مارشل لاء میں انہیں سزائے موت دی گئی۔ جنرل

MashalBooks.org

ضیاءالحق کی فوجی حکومت نے انہیں ناپسندیدہ شخصیت قرار دیا۔ برسوں بعد جب وہ پاکستان واپس پہنچے تو انہوں نے اپنی کوششیں تقسیم ہند کے رستے ہوئے زخموں کے اندمال پر مرکوز کردیں۔ عدم رواداری اور فوجی مہم جوئی کا جو زہر پھیل گیا تھا' وہ اس کے اثرات کو کم کرنے کی سعی برابر کرتے رہے۔ 11 مئی 1998ء کے دن جب پوکھران کی زمین میں لرزہ طاری تھا اور ایسا لگتا تھا کہ برصغیر کا نقشہ ہمیشہ کے لئے بدل جائے گا' انہوں نے اپنی کوششیں پہلے سے دگنی کردیں۔ اس کے ٹھیک ایک سال بعد 11 مئی 1999ء کو اقبال احمد اسلام آباد کے ایک ہسپتال میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر 67 سال تھی۔

دنیا بھر کے اخبارات میں' اداریوں اور کالموں کے توسط سے اقبال احمد کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ مصر کے روزنامہ (الاہرام) نے لکھا: (فلسطین اپنے ایک دوست سے محروم ہوگیا۔) نیویارک ٹائمز نے جس کی فلسطین اور ویت نام سے متعلق پالیسیوں پر اقبال احمد نے کڑی نکتہ چینی کی تھی' یہ تسلیم کیا کہ (انہوں نے امریکہ کے ضمیر کو بیدار رکھا۔) (اکانومسٹ) نے لکھا کہ (وہ ایک انقلابی اور دانشور اور جدید زمانے کے ابن خلدون تھے۔)

اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان نے ایک موزوں خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے کہا: (اقبال احمد نے اس امر کی ایک نہایت روشن مثال پیش کی ہے کہ بین الاقوامیت کے حامل ایک سچے انسان کو کیسا ہونا چاہیے۔) یہی وہ شخص تھا جس کے لئے ہر ملک اس کا اپنا ملک تھا' وہ ایک بین الاقوامی قبیلے کا سردار تھا' اس قبیلے میں کوئی خون کے رشتے نہیں تھے اور یہ جو مذہب اور نسل کے تفرقوں سے بلند تھا۔ اس قبیلے کے ہزاروں افراد ویت نام سے غزہ کے مغربی کنارے اور مراکش تک اور پاک و ہند سے یورپ اور شمالی امریکہ تک' تمام براعظموں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ انہیں انسان دوستی' انصاف اور آزادی کے عقیدہ نے جوڑ رکھا ہے۔

ایک عوامی دانشور

لوگ پوچھتے ہیں: (اقبال احمد کیا تھے؟ کیا وہ کوئی پروفیسر یا سیاسی تجزیہ نگار تھے؟ انقلابی لیڈر یا سماجی رہنما تھے؟ مورخ یا بشریات کے عالم تھے' مصنف یا صحافی تھے؟) دراصل اقبال احمد جیسے دانشور کو جو دانش کی سرحدیں بھی اسی سہولت سے اور فطری انداز میں پار کر لیتے تھے' جیسے ملکوں کی سرحدیں' کسی خانے میں رکھنا ممکن نہیں۔)

غالباً ایک جامع تعریف اگرچہ تمام تر درست وہ بھی نہیں' یہ ہوگی کہ (اقبال احمد ایک عوامی دانشور تھے۔) اس طرح ان کو اپنے دور کے عظیم اور سرگرم دانشوروں کی صف میں رکھا جا سکتا ہے' جیسے نوم چومسکی' ہاورڈ زن اور ایڈورڈ سعید۔ ان لوگوں کا موقف یہ ہے کہ سماجی علوم میں اکملیت اس وقت تک کھوکھلی ہے' جب تک اس دانشوری کو آزادی اور انصاف کے حصول کی جدوجہد میں اور عوام کے مقاصد کی خاطر استعمال نہ کیا جائے۔ سعید کی طرح اقبال بھی مغرب کی اس بہت ساری علمیت اور تاریخ ساز دانش کی سنگدلی پر کڑی گرفت کرتے رہے جو دردمندی کے احساس سے خالی ہے اور مطالعہ کے مقصد سے بعید۔

MashalBooks.org

(مغرب کے دانشور عام طور پر سامراجی مقاصد پر جتنا پختہ یقین رکھتے ہیں' کم و بیش اتنا ہی وہ کاہلی اور لاعلمی کا شکار بھی ہیں۔ ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے ہمیں کانگو میں ہونے والی خون ریزی کے بارے میں کچھ پتہ ہی نہیں چلا حالانکہ وہ ٹھیک بیسویں صدی میں واقع ہوئی۔ ہم نے اس خون آشامی کے بارے میں بھی' جس میں تہذیبیں فنا ہو گئیں اور کوئی بیس کروڑ افراد مارے گئے' اس وقت تک نہیں سنا جب تک ایک کسٹر (مغرب باشندہ) ہلاک نہیں ہوا اور ایک گارڈن (مغربی باشندہ) محصور نہیں ہوا۔)

تعصب زدہ علم ذہنی کاہلی اور لاعلمی کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے' اس لئے اقبال ہمپشائر کالج میں اپنے طلبہ پر برابر زور دیتے تھے کہ مختلف نقطہ ہائے نظر کی تلاش کرتے رہو اور اطلاعات کے مختلف ذرائع کی ٹوہ میں رہو اور سب سے بڑی بات یہ کہ اپنے علم کو ایک بہتر معاشرے کی تعمیر کے کام میں لاؤ۔

اول یہ کہ پڑھو' دوئم یہ کہ درمیان میں دخل دو' ہمارا کام محض اطلاعات کو سمیٹنا نہیں ہے' کچھ نہ کچھ حقیقت کا علم تو سبھی کو ہوتا ہے اور واقعی میرا خیال ہے کہ ہر وہ شخص جو عین اس وقت آپ کی اور میری باتیں سن رہا ہے' دنیا کے بارے میں کچھ علم' کچھ صداقت اور کچھ تفہیم رکھتا ہے' جو ہمارے ذرائع ابلاغ کے پھیلائے ہوئے علم سے مختلف ہوگی۔ پھر جونہی یہ معلوم ہو کہ تمہارا سچ' اس سچ سے مختلف اور متصادم ہے' جسے سچ کے نام پر پھیلایا جا رہا ہے تو فوراً رک جاؤ اور مداخلت کرو۔ چنانچہ اب مطالعہ کرو' متبادل ذرائع ڈھونڈو' کیونکہ متبادل ذرائع کے بغیر اور اجتماعیت کے بغیر جمہوریت نہیں ہوگی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جب تک طاقت کے دائرے میں عام پبلک کو شامل نہیں کیا جائے گا' جب تک توازن اور روک ٹوک کا معمول نہیں آئے گا' کوئی جمہوریت نہیں آئے گی۔

ایک طرف تو اقبال انتہائی دلنشین پیرائے میں لکھتے رہے اور اتنا کچھ لکھا کہ کئی کتابیں مرتب ہو سکتی تھیں۔ دوسری طرف باقاعدہ کوئی کتاب تصنیف نہیں کی۔ ان کی کچھ صحافیانہ تحریریں جو ادھر ادھر بکھری ہوئی ہیں' انہیں اکٹھا کر کے ایک مجموعے کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ کچھ دوسری تحریروں کو اس کے بعد کے مجموعوں میں شامل کیا جائے گا' لیکن ان کا بیشتر کام نامکمل ہونے کی بنا پر کبھی سامنے نہ آ سکے گا۔ آئندہ چار ابواب میں اختصار کے ساتھ ان کے اس موقف کی صراحت کروں گا' جو ہمارے زمانے کے چار انتہائی سنگین مسائل سے متعلق ہیں' یہ ہیں فلسطین' کشمیر' دنیا بھر میں مذہبی انتہاء پسندی کا ابھار اور پاک و ہند کے درمیان جوہری مقابلے کی تباہ کن دوڑ۔

فلسطین کا کبھی نہ ختم ہونے والا المیہ

اقبال احمد کو فلسطینیوں کے حقوق کی پر جوش وکالت کی بنا پر امریکی دانشوروں کی بیشتر برادری سے خارج کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا وہ اپنی زندگی کے بیشتر عرصے میں بہت سی امریکی یونیورسٹیوں سے گشتی پروفیسر کے طور پر ہی وابستہ رہے۔ انہوں نے ایک موقع پر یاد دلایا کہ کورنل یونیورسٹی میں ان کے بہت سے رفقائے کار

MashalBooks.org

کیفٹیریا کی میز پر ان کے ساتھ بیٹھنے کی بجائے کہیں الگ بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ لیکن آخرکار ہیمشائر کالج نے 1982ء میں انہیں مستقل پروفیسر شپ تفویض کی' جہاں وہ بین الاقوامی امور اور انقلابات کے تقابلی مطالعہ کے مضامین اور شرق وسطیٰ کی تاریخ پڑھاتے تھے۔

ایک نوجوان پاکستانی طالبہ کو وہ موقعہ یاد ہے' جب اقبال احمد 1992ء میں ڈارٹ کالج میں فلسطین کے موضوع پر گفتگو کرنے آئے تھے۔ کمرے میں اس کے ساتھ رہنے والی طالبہ نے جو یہودی والدین کی بیٹی اور عقیدے میں ایک صیہونی تھی' اقبال کے لیکچر کے دوران میں رونا شروع کر دیا۔ اس کے خیال میں اقبال کا بیان تعصب پر مبنی تھا۔ لیکن اقبال احمد نے اس سے نہایت نرم لہجے میں باتیں کیں اور صورت حال کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور اسے گہرے نکات سمجھائے۔ چنانچہ طلبہ جو سیاسی طور پر ان سے اختلاف کرتے تھے وہ بھی ہجوم در ہجوم ان کے لیکچر سننے اور نصاب میں شرکت کے لئے آتے تھے۔

اقبال ایک یہودی طالب علم ناتھن کرسنال کا واقعہ یوں بتاتے ہیں:

(پانچ سال ہوئے' وہ (کرسنال) شرق وسطیٰ کے مضمون کی خاطر میرے سیمینار میں داخلے کی درخواست لے کر آیا۔ میں نے پوچھا: (تم یہ مضمون کیوں پڑھنا چاہتے ہو؟) اس نے جواب دیا: (میں ایک یہودی اور صیہونی ہوں' میں نے مہاجرت کر کے اسرائیل جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب چونکہ میں شرق وسطیٰ میں رہنے جا رہا ہوں لہٰذا میں وہاں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔) میں نے اسے بتایا کہ میں سیاسی صیہونیت کو فرقہ پرستی پر مبنی نظریہ سمجھتا ہوں اور اسرائیل کو ایک تفرقہ باز ریاست جانتا ہوں۔ میری رائے میں شرق وسطیٰ کے اندر قیام امن کی لازمی شرائط یہ ہیں کہ فلسطینیوں کو ان کے حقوق واپس کئے جائیں اور سرائیل میں جمہوریت قائم کی جائے۔) کرسنال نے جواب دیا: (وہ میں سن چکا ہوں' میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ اسے کس طرح دیکھتے ہیں۔) کرسنال کلاس میں بمشکل کبھی بولتا تھا' کبھی کوئی سوال کر دیتا اور پڑھتا بہت تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسرائیل ہجرت کر گیا' کیونکہ اب وہ وہاں کی جیل میں ہے۔ یہ انتخاب اس نے خود کیا۔)

اقبال احمد کا پیغام عربوں کے لئے مختلف تھا۔ عربوں کو ایک جمہوری طرز کے اسرائیل میں رہنے کا چلن سیکھنا ہوگا۔ انہیں عرب قوم پرستی کے علیحدگی پسندانہ نظریات اور اسلامی انتہا پسندی ترک کرنی ہوگی اور شرق وسطیٰ کی تمام اقوام کے جمہوری حقوق کا احترام کرنا ہوگا۔ اسرائیل کے دارالحکومت کی حیثیت سے یروشلم قبول نہیں' لیکن اسی طرح تمام مقدس مقامات کا کسی ایک دعویدار کے قبضے میں دینا بھی قابل قبول نہیں۔ اقبال کی رائے میں ایک قدیم ورثہ جو عربوں اور یہودیوں دونوں کا مشترک ہے' اس کی حفاظت بھی ان کی مشترکہ ذمہ داری ہونی چاہیے۔

جب اقبال نے اوسلو سمجھوتے پر نکتہ چینی کی' جبکہ ان پر بات چیت ہو رہی تھی' اور انہوں نے ان سمجھوتوں کو ایک جبر کے تحت غیر منصفانہ امن قرار دیا تو اس وقت میں ان کی دلیل کا چنداں قائل نہیں تھا۔

MashalBooks.org

میرا موقف یہ تھا کہ فلسطینیوں کو اتنے برسوں تک عذاب سہنے کے بعد آخر کچھ مل تو رہا ہے۔ انہوں نے کہا: (نہیں، یہ صورت حال تو جنوبی افریقہ سے بھی بدتر ہوگی۔) اسرائیل کئی عدد (بن تستان) بنا لے گا اور اسی طرح وہ اپنی ذمہ داریوں کے دست کش ہو جائے گا، لیکن ان کا قبضہ برقرار رہے گا۔ فلسطینیوں کو محض یہ خوش فہمی مل جائے گی کہ وہ آزاد ہو گئے ہیں، حالانکہ اس سرزمین، اس کے پانی اور اس کی معیشت پر ان کا کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ یہ کوئی امن نہیں، یہ تو صاف اپنے آپ کو بیچ دینا ہے۔ چند سال بعد جب انتفاضہ کا از سر نو آغاز ہوا اور (امن کے مراحل) اپنی موت آپ مر گئے تو قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ اقبال کا بیان درست تھا اور میں غلطی پر تھا۔

کشمیر پر اقبال کے افکار

وہ نوجوان جو کشمیر میں لڑ چکا تھا، اس نے آزادی کی اس جدوجہد کو کبھی فراموش نہیں کیا، البتہ زندگی کے حالات نے اسے کہیں اور پہنچا دیا تھا۔ 1990ء کی دہائی میں اقبال جوں جوں امریکہ سے پاکستان کی طرف مراجعت کرتے گئے، کشمیر کے تنازع میں ایک بار پھر شامل ہو گئے۔ اس لامتناہی اور خون آلود الیے کے اسباب معلوم کرنے میں انہوں نے خاصہ وقت صرف کیا اور اس کے لئے بہت کاوش کی۔ اس کے لئے انہوں نے دورے کئے، ان مختلف رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں جو کشمیر کی آزادی کے حق میں تھے۔ اور اس امید کے سہارے کہ دنیا کے اس انتہائی پیچیدہ مسئلہ کا کوئی حل نکل آئے گا، وہ ہندوستان اور پاکستان کے حکمرانوں سے بھی ملتے رہے۔ یہ سب کچھ آسان نہیں تھا۔ بعض اوقات وہ جھنجھلا کے کہتے تھے کہ دونوں ملک آخری کشمیری کے مرنے تک اپنی جنگ جاری رکھنے کا عہد کئے ہوئے ہیں۔ اقبال کی رائے میں اس کی زیادہ ذمہ داری ہندوستان پر عائد ہوتی ہے۔

(حقیقت یہ ہے کہ نئی دہلی کی حکومت اخلاقی طور پر کشمیری عوام سے بہت دور ہو چکی ہے۔ یہ صورت حال بدل بھی سکتی ہے اگر ہندوستان کشمیر کے ساتھ ایک مختلف نوعیت کا تعلق قائم کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ اس طرح کہ حکومت خود اختیاری کی جو امنگیں کشمیریوں میں پائی جاتی ہیں، ان کی بامعنی انداز سے تشفی ہو۔ لیکن ابھی تک تو نئی دہلی کے رویے سے اس میلان کا پتہ نہیں چلتا۔

لیکن اقبال نے یہ بھی دلیل دی کہ پاکستانی لیڈر اگر یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہندوستان کی مسلسل ناکامیوں کا نتیجہ پاکستان کی کامیابی کی صورت میں نکلے گا تو یہ ایک احمقانہ خیال ہے۔ پاکستان کا خیال ہے کہ کشمیر میں ان کی کامیابی یقینی ہے۔ لیکن اس کی پالیسی بنیادی طور پر اس قدر ناقص ہے کہ اس نے اکثر اوقات بڑی ترکیب کے ساتھ آزادی کے منہ سے ناکامی چھین لی ہے۔

پاکستان مسلسل نیم دلی کے ساتھ (اصولی موقف کی لڑائی) کا اعلان کرتا ہے، جس میں نجی نوعیت کے شکوک، علامتی خودنمائی اور چھچھوری موقع پرستی شامل ہے۔ اس کی مدد سے کشمیر کی شورش میں کوئی توانائی پیدا

MashalBooks.org

نہیں ہوئی اور نہ اتحاد دیکھنے میں آیا، جس سے کامیابی حاصل ہوتی۔ نتیجہ یہ کہ جدوجہد ایک مقام پر آ کر رک گئی ہے اور انجماد کی یہ کیفیت (دیرپا) نظر آتی ہے۔ اس میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک روایتی جنگ کے بغیر تبدیلی کا امکان نہیں۔ لیکن چونکہ وہ جنگ پر آمادہ نہیں لہٰذا "اس کی پالیسی کا حاصل یہی رہ گیا ہے کہ وہ ہندوستان کا خون بہاتا رہے اور ہندوستان کشمیریوں کا خون بہاتا رہے اور جب اسے یہ نظر آئے کہ اب پاکستان پر ایک چرکا لگایا جا سکتا ہے تو اسے چرکا بھی لگائے۔)

چونکہ پس منظر میں ایک تباہ کن جنگ کی صورت، جو کبھی بھی ہو سکتی ہے، منہ پھاڑے کھڑی ہے لہٰذا ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ ایک فوری اور لازمی ضرورت بن گئی ہے۔ دونوں ملکوں میں جو لوگ فیصلے کے اختیارات رکھتے ہیں، اقبال نے ان کے سامنے چار بنیادی حقائق پیش کئے ہیں کہ ان کو تسلیم کریں۔

(اول، کشمیر کے تنازعے کا فوجی حل ممکن نہیں۔ دوئم یہ بات بھی اتنی ہی دشوار ہے کہ کوئی سیاسی حل یک طرفہ طور پر اختیار کیا جائے، جیسا کہ ہندوستان کر رہا ہے۔ تیسری بات یہ کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان امن کے معاملے میں امریکہ کا مفاد بھی وابستہ ہے، لیکن اس تنازعہ کو حل کرنے کے لئے نہ تو بڑی طاقتیں اور نہ عالمی رائے عامہ کوئی فیصلہ کن کردار ادا کریں گی۔ چوتھی بات یہ کہ پرامن حل کا ایک ہی موثر طریقہ براہ راست بات چیت کا ہے، تاہم مذاکرات خواہ کتنے ہی بامعنی ہوں، کشمیریوں کی شرکت کے بغیر اس میں کامیابی ممکن نہیں۔ لہٰذا اس تنازعے کے حل کا ایک نہایت ہی معقول طریقہ سہ فریقی مذاکرات ہیں۔ جن میں پاکستان، ہندوستان اور ایک نمائندہ کشمیری وفد کے ارکان شامل ہوں۔ براہ راست مذاکرات سے اقوام متحدہ یا امریکہ کے ایسے کردار کو جو اس میں آسانی پیدا کر سکے خارج نہیں کیا جائے گا۔)

مذہبی انتہا پسندی

گزشتہ دس برس کے واقعات جن میں نسلی اور مذہبی جنگوں سے لے کر آثار قدیمہ کے گراں قدر خزائن کی دانستہ تباہی تک کے واقعات شامل ہیں، اس سانحہ کی تصدیق کرتے ہیں کہ ہم انسانی تاریخ کے ایک سیاہ اور تہلکہ خیز زمانے میں داخل ہو رہے ہیں، جہاں عقل دشمن طاقتوں کی یکسر بالادستی قائم ہے۔ تشدد پسند مذہبی تحریکیں، جن میں کچھ پوری طرح مسلح ہیں، چانک کرہ ارض پر نمودار ہو گئی ہیں۔ ہر ایک کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کا وجود کسی الوہی مقصد کی تکمیل کے لئے ہے اور وہ سماجی طرز عمل میں ان قوانین کو نافذ کریں گی، جن کی توثیق کسی آسمانی طاقت نے کی ہے۔ اور ان سب مراحل اور قوانین کو تہس نہس کر دیں گی، جنہیں انسان نے منطق، استدلال اور ضرورت کی بنیاد پر وضع کیا اور برتا ہے۔ جب یہ سوال اٹھتا ہے کہ کسی عقیدے کے ماننے والوں میں رضائے آسمانی کی تفسیر کون کرے گا؟ تو اس سوال پر تنازعے کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ اس حوالے سے مذہب طاقت کا ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے ایک سیاسی حریف کو بے دست و پا کر کے اس پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔ اقبال کے نقطہ نظر کے مطابق سیاسی تحریکیں، جن میں مذہبی عقائد بھی شامل ہوں، مذہب کی روح

MashalBooks.org

کے منافی ہیں۔

(کسی بھی مذہبی نظام میں ہر قسم کی تعلیمات ہوتی ہیں۔ان میں روشنی اور تاریکی' امن اور جنگ' خیر اور شر' غرضیکہ تمام پہلو ہوتے ہیں۔لہٰذا یہ ہمیشہ ممکن ہوتا ہے کہ کل سے ایک جزو کو نکال کر اس کی مختلف تاویل کی جائے۔اسے اصل متن اور مقصد سے الگ کر دیا جائے اور اس کا استعمال کسی سیاسی مقصد کے لئے کیا جائے۔مذہب کو استعمال کرنے کا یہ طریقہ تقریباً ہمیشہ حتمی ثابت ہوتا ہے۔یعنی اس میں کسی فریق کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ اسے پوری قطعیت کے ساتھ کام میں لائے۔ایسا کرنے میں اسے بالعموم اصل متن کے معنی ومفہوم سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے اور دوسرے تمام پہلوؤں کو سرے سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔یہ کیفیت مذہب کو مسخ کر دیتی ہے' روایات کی تذلیل کرتی ہے اور سیاسی عمل کو توڑ مروڑ دیتی ہے۔اس معاملے میں مسلمان' یہودی اور ہندو کچھ انوکھے نہیں ہیں۔ہمارے زمانے کے مختلف بنیاد پرستوں نے پیچیدہ مذہبی نظاموں اور تہذیبوں کو کسی نہ کسی جدید طرز فسطائیت میں ڈھال لیا ہے۔ان کا مقصد طاقت کا حصول ہے' ان کا روحانیت سے تعلق نہیں۔ان کے پیش نظر عام لوگوں کو سیاسی مقاصد کے لئے متحرک کرنا ہے۔ان کے مصائب وآلام کا ازالہ یا ان کے ساتھ شراکت اور ان کی امنگوں کی تکمیل ہرگز نہیں۔ان کا ایک نہایت محدود سیاسی ایجنڈا اور اس کا فوری حصول ہوتا ہے۔)

جیسا کہ اقبال نے مندرجہ بالا عبارت میں نشاندہی کی ہے' مذہب کو فسطائیت میں ڈھال دینا عین ممکن ہے' کیونکہ مذہبی سیاسی پارٹیاں سیکولر قوانین کو تسلیم نہیں کرتیں اور یہ سمجھتی ہیں کہ جائز قوانین صرف احکام روحانی کے وسیلے سے نافذ ہو سکتے ہیں۔لہٰذا یہ اپنی رائے میں مطلق العنان ہیں' سب سے الگ اپنی مرضی کے مالک ہیں' مرکزیت پسند ہیں' اجتماعی فکر کو رد کر دیتے ہیں اور بنیادی طور پر غیر جمہوری ہیں۔یبوست کے مارے ہوئے' حس مزاح سے عاری' یہ معاشرے کی تہذیبی زندگی کو پوری طرح اپنے ڈھب سے چلانا چاہتے ہیں۔ان میں سے ہر ایک اپنے مخالف عقیدے والوں کو بھیانک بنا کر پیش کرتا ہے اور اپنے ہم مذہبوں پر زور دیتا رہتا ہے کہ مخالفوں سے محتاط اور خبردار رہیں' اس طرح اقلیتی فرقے لامحالہ مذہبی جنون کا نشانہ بن جاتے ہیں۔

اقبال احمد نے مغرب کے سامعین سے خطاب کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ یہ مذہبی منافرت اور جنون جو دنیا بھر میں نظر آ رہا ہے' محض مسلمانوں سے مخصوص نہیں بلکہ ہمارے زمانے کی یہ بیماری اس سے کہیں زیادہ وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی ہے جتنی بالعموم تسلیم کی جاتی ہے۔

(میں خود ایک مسلمان ہوں' لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں ہر روز ذرائع ابلاغ میں اور سیاست دانوں کی زبانی اسلامی بنیاد پرستی کے خطرے کی بات پڑھی اور سنی جاتی ہے۔دوسری حقیقت یہ ہے کہ ایک مسلم قومیت جو انتہائی سیکولر اور مختلف نسلی گروہوں سے مل کر بنی تھی' ہمارے زمانے میں' ہماری ہی دنیا میں یورپ کے قلب میں ہماری اپنی آنکھوں کے سامنے اور عین امن کی حالت میں تباہ وبرباد کر دی گئی۔اور تباہ وبرباد

MashalBooks.org

کرنے والے بدیسی طور پر فاشسٹ مسیحی گروہ تھے' جنھوں نے نسل کشی کا بیڑا اٹھا رکھا تھا۔ اگر قتل کرنے والے مسلمان ہوتے' نسلی اور مذہبی تطہیر کا عمل اگر مسلمان کرتے اور ان کا شکار اگر مسیحی ہوتے تو جو لوگ آج گم سم بیٹھے ہیں' اس وقت ان کا ردِ عمل کیا ہوتا؟)

اس شخص کے لئے جو گندھارا کے آثار سے گہری محبت رکھتا تھا اور جس کے ذاتی سرمائے میں اس کے نہایت نادر نمونے موجود تھے' افغانستان میں گوتم بدھ کے مجسموں کی تاراجی اس کے لئے بے حد کربناک ہوتی۔ اقبال نے یہ سانحہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا' لیکن طالبان کے متعلق وہ شدید ترین الفاظ میں اپنے موقف کا اظہار بہت پہلے کر چکے تھے۔

(اسلام کی تاریخ میں طالبان انتہا درجے کی رجعت پسندانہ سیاسی تحریک سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ جنگجو سردار' جنھوں نے افغانستان میں موسیقی اور کھیلوں پر پابندی عاید کر دی ہے' داڑھی کے بال ترشوانے پر لوگوں کو نہایت سخت سزائیں دی ہیں' زنانہ سواریوں کو ٹیکسی میں بٹھانے پر ٹیکسی ڈرائیوروں کو کوڑے لگائے ہیں' بیمار خواتین کو مرد معالجوں سے علاج کرانے سے روک دیا ہے اور لڑکیوں کو اسکول جانے اور عورتوں کو نوکری کرنے سے روکا ہے۔ وہ افغانستان کو اپنی روایتی اسلامی طرزِ زندگی دوبارہ اختیار کرنے سے روک رہے ہیں' جس کی خبریں نہایت پابندی کے ساتھ مغرب کے ذرائع ابلاغ دیتے رہتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ اخلاقیات' جمالیات' انسان دوستی اور روایتی مسلمانوں کے صوفیانہ طرزِ احساس سے (اور ان میں گزرے زمانہ کے افغانی بھی شامل ہیں)' بھی قطعاً عاری ہیں۔ یہ کہنا کہ وہ (زمانہ وسطیٰ) کے لوگ ہیں' حافظ' سعدی' رابعہ بصری اور منصور الحلاج' امیر خسرو اور حضرت نظام الدین اولیاء کے عہد کی توہین کرنے کے مترادف ہے۔ طالبان جدید دور کی ایک بیماری کی علامت ہیں۔ ایک سماجی ناسور کی نشانی ہیں' جسے اگر بڑھنے دیا گیا اور روکا نہیں گیا اور اسے کُلّیتاً" ختم نہیں کیا گیا تو یہ ناسور تمام مسلم معاشروں کو غارت کر دے گا۔ اگر پاکستان سے یہ اسی طرح منسلک رہا اور اگر یہ بیماری پھیلتی گئی تو اس ہلاکت خیز ناسور کو بڑے موثر انداز سے طالبان ہی آگے پھیلائیں گے۔)

ایک اہم سوال ذہن میں اٹھتا ہے کہ اس مذہبی' سیاسی اور دہشت گردی کی تحریک کا ناسور کہاں سے آیا؟ ابن خلدون اور کارل مارکس کی روایت کی روشنی میں اقبال احمد نے اس کی مادی توجیہہ کی ہے' لیکن ہم پہلے انہی کے الفاظ میں (بنیاد پرستی) کی اصطلاح کا مفہوم سمجھتے ہیں۔

(جن لوگوں کو غلطی سے (بنیاد پرست) کہا گیا ہے' وہ ایک جدید صورت حال کے مظہر ہیں اور جدیدیت اور شناخت کے بحران کے نتیجے میں نمودار ہوئے ہیں۔ جدیدیت ایک تاریخی عمل کی پیداوار ہے۔ اس کا تعلق ایک طریقِ پیداوار سے دوسرے طریقے تک کے مرحلے میں معاشروں کی ترقی سے ہے۔ اور ہمارے زمانے میں اس کا مفہوم ہے زراعت اور گلہ بانی کے طریقے سے نکل کر سرمایہ دارانہ یا صنعتی طریقِ پیداوار تک رسائی۔ ایک سے دوسرے طریقِ پیداوار تک پہنچنے کا لازمی نتیجہ معاشرے میں انقلابی تبدیلیوں کا رونما ہونا

MashalBooks.org

ہے۔ پھر سماجی اور اقتصادی زندگی کے لئے ایک نئی منطق اس کا تقاضہ کرتی ہے۔ اس سے موروثی طریق زندگی کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اس طرح زمین، محنت اور سرمائے کے باہمی رشتوں کے درمیان لازماً تبدیلی آتی ہے۔ پھر اس امر کا تقاضہ ہوتا ہے کہ نئے رہن سہن اور کام کے نئے طریقوں سے ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ اس طرح لازم آتا ہے کہ انسانی اقدار میں اور جنس، طبقات، افراد، خاندان اور برادریوں کے باہمی رشتوں میں زبردست تبدیلی لائی جائے، اقامت میں جو ترتیب چلی آ رہی ہے، اسے بدلا جائے۔ پھر کام کی جگہ میں از سر نو تنظیم کا تقاضہ پیدا ہوتا ہے، پھر یہ کہ نئی مہارتیں کس طرح یکجا کی جائیں اور انہیں تقسیم کیا جائے اور لوگوں پر حکمرانی کا انداز کیا ہو۔ تبدیلی کا جب یہ عمل پوری طرح بروئے کار آتا ہے تو پرانی اقدار اور زندگی کے پرانے قرینے متروک اور ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ جتنی دیر میں زیادہ موزوں اقدار اور نئے آداب زندگی اپنی جڑیں پکڑیں، اس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ یہ عمل ہوتا ہے۔)

معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے نشاۃ ثانیہ کے بعد کی جدیدیت کو اختیار کرنا دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ دشوار تھا۔ کیونکہ اس سے وابستہ جو سماجی اور تہذیبی تبدیلیاں تھیں، وہ انہیں نقصان رساں اور اپنے لئے خطرناک نظر آئیں۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کو بھاری قیمت ادا کرنی پڑی، بلاشبہ کوئی ہزار سال قبل کا دور نہایت روشن اور شاندار تھا۔ ان دنوں اسلامی تہذیب نے سائنس، بالخصوص ریاضی اور طب میں غیر معمولی کمالات دکھائے تھے۔ لیکن آج کسی ایک اسلامی ملک میں بھی کوئی قابل عمل جمہوری اور سیاسی نظام موجود نہیں، نہ کوئی اسلامی ملک اس بات پر فخر کر سکتا ہے کہ اس نے سائنس یا ٹیکنالوجی میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل کی ہو۔

نو آبادیاتی دور میں اور اس کے بعد جب مسلمان بنیادی نوعیت کے اس بحران سے اور زوال سے دوچار ہوئے تو ان کا رد عمل مختلف طرح کا تھا۔ یہ رد عمل ان تین میں سے کسی ایک درجے میں آتا ہے۔ مراجعت، یعنی ماضی کی طرف واپسی، از سر نو تعمیر اور موقع شناسی۔ موقع شناس، یعنی وقت کی ضرورت کے مطابق عمل کرنے والے مسلمان مذہب اور عقیدے کے مطالبات کو سیاسی اور اقتصادی زندگی کے براہ راست مسائل سے لازماً الگ کر کے دیکھتے ہیں۔ وہ اس مبہم عقیدے کو اختیار کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اسلام اور جدید سوچ کے درمیان کوئی تصادم نہیں۔ دوسری طرف از سر نو تعمیر کے حامی، عقیدے کی نئی تفسیر کرتے ہیں تاکہ روایت اور عقائد اور نئے حالات میں پیدا ہونے والے تقاضوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی جائے۔

ماضی کی طرف واپس جانا تیسرا رد عمل ہے۔ اس کے مطابق مسلمانوں کا عروج سے زوال کی طرف آنے کا سبب ان کا مذہبی روایات سے دور ہو جانا ہے۔ لہٰذا ماضی کی طرف واپس جانا ہوگا۔ اس فکر کے نتیجے میں سیاسی تحریک کے مقاصد آسانی سے پورے ہو جاتے ہیں، چنانچہ (بنیاد پرستی) آتی ہے۔ رجعت کی تحریک جب دنیا بھر میں پھیلی تو اقبال احمد نے لکھا تھا:

(پھر ان (بنیاد پرستی) کی تحریکوں اور (بنیاد پرستوں) کا مستقبل کیا ہوگا؟ میرا خیال ہے کہ یہ محدود اور

MashalBooks.org

دھندلا مستقبل ہے۔اس خیال کے کئی اسباب ہیں۔ماضی کے ساتھ ان کے تعلق کی نوعیت مسخ شدہ ہے۔ مستقبل کے باب میں ان کی فکر قابل عمل نہیں اور جدید دور کی طاقتوں اور اعلیٰ قدروں کے ساتھ ان کے روابط منفی نوعیت کے ہیں۔لیکن ان کے محدود ہونے میں ہمارے لئے اندیشے موجود ہیں۔دائیں بازو کی تحریکوں نے اپنے آغاز میں اور جیسا کہ لوگ جانتے ہیں' اپنے آخر میں ملکوں اور قوموں کو بھاری نقصان پہنچائے ہیں۔خدا خیر کرے۔)

ایٹمی خطرے سے بچاؤ

امریکہ میں رونلڈ ریگن کے صدارتی زمانے میں جوہری بم کے خلاف تاریخ کا سب سے بڑا مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔یہ کمیونسٹ دشمن کا ہوّا ہے جوں ہی اقتدار کے گھوڑے پر سوار ہوا' اس نے ایڑ لگائی اور فراٹے بھرنے لگا۔زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اس نے سوویت یونین کے خلاف ایٹمی دوڑ بھرپور انداز سے شروع کر دی۔اس کے بعد تو (اسٹار وار) اور (جوہری سرما) گرما گرم بحث کے موضوع بن گئے۔چنانچہ جب ایٹمی تباہی کے لرزہ خیز خوف کی لہر مغربی دنیا میں دوڑی تو 1982ء میں نیویارک کے سنٹرل پارک میں دس لاکھ مظاہرین احتجاج کے لئے نکل آئے۔یہ کہما گہمی تو ویت نام کی جنگ کے دنوں میں بھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ امن کی تحریک نہایت وجد آفریں تھی۔

اقبال احمد کے اندر دو متضاد رویے پیدا ہوئے اور وہ بے چین ہو گئے۔اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ایٹمی اسلحہ کے خاتمے کا مطالبہ صحیح اور اخلاقی طور پر درست تھا' لیکن سوال یہ تھا کہ امریکہ میں ابھرنے والی تحریک امن اسرائیل کے ایٹمی اسلحہ کے سلسلے میں اس قدر خاموش کیوں ہے؟ یہ 1982ء کا سال تھا' جب اسرائیل نے لبنان پر حملہ کیا تھا۔بیروت کو تباہ ہوتے ہوئے ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا۔ایک ایک بلاک کی تباہی کا منظر۔ اسرائیل کی توپیں' بکتر بند گاڑیاں اور ٹینک بڑے منظم انداز سے یہ کام کر رہے تھے۔ یہی سال صبرہ اور شتیلا کی ہولناک خونریزی کا تھا۔ایسی سفاکی اور خون ریزی جو آریئل شیرون کی نگرانی میں اور اسرائیل کے جانتے بوجھتے بلکہ اس کے اشتراک سے ہوئی۔اقبال احمد کے سینے میں الاؤ دہک رہا تھا۔اس تباہی اور خون ریزی کو روکنے میں اپنی ناکامی کی بنا پر وہ بہت بے بس اور دل شکستہ تھے۔غالباً اس جذباتی صورت حال کا بھی ایک سبب تھا کہ اقبال کو پہلی بار دل کا دورہ پڑا۔

اقبال نے مجھے یہ قصہ سنایا۔(سنٹرل پارک کے اس بے پایاں ہجوم سے جو ایٹم بم کے خلاف مظاہرین کا تھا' منتظمین نے مجھے بھی خطاب کرنے کی دعوت دی۔میں آمادہ ہو گیا۔)ان کا بیان ہے کہ جوں ہی وہ اسٹیج کی طرف بڑھے ایک دوست انہیں کھینچ کر ایک طرف لے گیا اور کہا کہ اپنی تقریر میں اسرائیل کا ذکر نہ کیجئے گا۔اس نے کہا:(یہ نیویارک ہے۔ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ اتنے بہت سے لوگ یہاں کیوں آئے ہیں۔) اقبال دم بخود اور چند لمحوں کے لئے بے حس ہو کر رہ گئے۔پھر انہوں نے اپنے قدم بڑھائے۔اسٹیج کی طرف

MashalBooks.org

نہیں، واپسی کی طرف۔ چلتے چلتے وہ سنٹرل پارک کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے، ان کا جی اندر سے متلانے لگا تھا اور انہوں نے وہیں ایک جھاڑی کے قریب بیٹھ کر قے کر دی۔

چوتھائی صدی بعد یہی ایٹمی مسئلہ ایک بار پھر اقبال کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

اقبال ہندوستان کے ایٹمی دھماکے کے بعد پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں کے بارے میں، جس سے انہیں بہت محبت تھی، خوفزدہ ہو گئے۔ ایسا تو نہیں ہوگا کہ یہ ایٹمی اسلحہ کا جنون ان دونوں ملکوں کے درمیان مفاہمت اور خیر سگالی کی امیدوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے؟ کیا ان دونوں ملکوں کا یہی مقدر ہے کہ آئندہ دس سال کے اندر یا شاید چند ہی برسوں میں وہ ایٹمی تابکاری سے آلودہ لق ودق ویرانے بن جائیں؟ سارا کیا دھرا، ہندوستان کے کج فہم، دائیں بازو کے لیڈروں کا تھا، جنہوں نے اس کی ابتدا کی۔ الزام انہی کے سر جاتا ہے جنہوں نے اپنی کم عقلی کی بنا پر ایٹمی اسلحہ کو طاقت کا سکہ سمجھ لیا۔ اقبال نے لکھا: (جلد ہی انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ وہ سکہ جعلی ہے۔) انہوں نے یہ دلیل دی کہ بی جے پی کی مذہبی عصبیت اور عدم رواداری نے ہندوستان کو اس سمت میں چلنے کے قابل نہیں چھوڑا کہ وہ حقیقی معنوں میں ایک بڑی اور طاقتور قوم بن جائے۔

(ہر تاریخی دور کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے، لیکن ایک عنصر تاریخ کے تمام ادوار میں مشترک رہا ہے، اور وہ ہے ترقی اور بڑائی کا حصول۔ تہذیبوں کے تاریخ داں اس ایک عنصر کی صراحت کئی طرح سے کرتے ہیں۔ مختلف عقائد وافکار کے درمیان مفاہمت، ذہنی کشادگی، اجتماعیت اور رواداری کا جذبہ۔ جہاں خیالات میں ٹکراؤ نہیں ہوتا، جہاں مختلف اثرات، علوم، نقطہ ہائے نظر اور کلچر باہم شیروشکر نہیں ہوتے، وہاں تہذیب ترقی نہیں کرتی اور عظمت کنارہ کش ہو جاتی ہے۔ قوم پرستی میں ایٹمی اسلحہ بندی کی شمولیت سے ہندوستان کا ماحول مزید پست ہو گیا ہے۔ ایٹمی تجربوں نے (ہندوتوا) کے طرفداروں کے جنون اور تنگ نظری میں اضافہ کر دیا ہے۔)

پھر تو جلد ہی پاکستان میں طبل جنگ بجنے لگا۔ خوف کی ایک لہر اٹھی اور پاکستان کے ایٹمی تجربے کے حق میں آواز بلند سے بلندتر ہوتی گئی۔ ہندوستان کی دشمنی پر اب کوئی پردہ نہیں رہ گیا تھا۔ یہ ایسا وقت تھا کہ سوجھ بوجھ والے لوگ بھی بوکھلا گئے: (پاکستان کیا کرے؟) اقبال نے 17 مئی 1999ء کو روزنامہ (ڈان) کے اپنے ہفتہ وار کالم میں لکھا:

(میرا مشورہ یہ ہے کہ ہمیں ہراساں نہیں ہونا چاہیے، ہمارا ردعمل جوابی نہیں ہونا چاہیے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ قاضی حسین احمد اور بے نظیر بھٹو جیسے افراد کی بات نہیں سننا چاہیے، جو یا تو اپنی لاعلمی کی بنا پر یا محض موقع پرستی کے تحت، جس کا زیادہ امکان نظر آتا ہے، ایٹمی تجربوں کا فوری مطالبہ کر رہے ہیں۔ فوری ردعمل میں تامل سے کام لینے کے حق میں بڑے محکم دلائل موجود ہیں۔ ان اسباب کی بنا پر اور دوسری وجوہ کے پیش نظر بھی، اسلام آباد کے لئے یہی بہتر ہوگا کہ سکون سے کام لے اور دہلی نے جو مواقع اسے بہم پہنچائے ہیں ان کا حساب لگائے اور انہیں اپنے حق میں استعمال کرے۔)

MashalBooks.org

کیا دلائل سے غصہ تھم جائے گا؟ کیا اعتدال انتہا پسندی پر غالب آ جائے گا؟ پوکھران کے بعد پہلے ہفتے کے اندر کچھ امید نظر آئی کہ یہاں ایٹمی تجربے سے بچا جا سکتا ہے۔ وزیراعظم نواز شریف اور کابینہ میں ان کے چند قریبی رفقا، ایٹمی تجربے کی حمایت میں کچھ زیادہ پر جوش نظر نہیں آئے اگرچہ ایک سال بعد ان کا دعویٰ اس سے مختلف تھا۔ انہیں ابتداً اندازہ تھا کہ ایٹمی تجربے کے نتیجے میں ان پر بین الاقوامی پابندیاں لازمی طور پر عاید ہوں گی۔ اس اندیشے میں ان کے چیف آف آرمی اسٹاف جنرل جہانگیر کرامت بھی شامل تھے اور حکومت میں کچھ دوسرے افراد تک بھی یہ خیال پہنچ گیا تھا۔ کچھ دوسرے افراد جن کی شاہین صفتی کسی شک و شبہ سے بالا تھی، مثلاً ریاض کھوکھر نے بھی جو ان دنوں امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے مجھے نجی طور پر بتایا کہ انہوں نے ایٹمی تجربے کی مخالفت میں زبردست مہم چلائی تھی، وہ اس فیصلے پر کسی امن پسندی کے حوالے سے نہیں بلکہ صریح عملیت پسندی کی راہ سے پہنچے تھے۔

لیکن مقدر یہی تھا کہ دلائل کی شکست ہو۔ دوسرے ہفتے پاکستان کی قیادت نے پوکھران کے دھماکے کے سترہ دنوں بعد چاغی میں ایٹمی دھماکے کرائے۔ اس کے حق میں فیصلہ کن عوامل کیا تھے؟ وہ تو کبھی معلوم نہیں ہوں گے، لیکن بہت سی وجوہ میں سے ایک وجہ ہندوستان کے وزیر داخلہ ایل کے اڈوانی کا یہ بیان ہو گا کہ جنوبی ایشیاء میں سیاسی حکمت عملی کا جو ماحول تبدیل ہوا ہے، پاکستان کو چاہیے کہ اسے یاد رکھے۔ وزیراعظم واجپائی کا یہ بیان کہ ان کی حکومت کشمیر کے اس علاقے کو بھی جو پاکستان کے ماتحت ہے، چھین لے گی۔ پھر امور کشمیر کی وزارت کو ایک سخت گیر وزیر داخلہ کے حوالے کر دینا، جس نے بابری مسجد کو منہدم ہوتے ہوئے بڑی یکسوئی سے دیکھا تھا اور جنگ بندی کی سرحد پر تصادم کو ہوا دی تھی۔ یہ باتیں پاکستان کے لئے تشویش کا موجب تھیں۔ ادھر ملک کے اندر مخالف رہنماؤں کا ایک دستہ جس کی قیادت پہلے جماعت اسلامی کر رہی تھی اور اس کے فوری بعد بے نظیر بھٹو نے اسے اچک لیا، پاکستان کے فیصلے کا محرک تھا۔ اقبال نے لکھا:

(معلوم ہوتا ہے، بے نظیر نے بھانپ لیا کہ اس قومی بحران میں اس کی اپنی گرتی ہوئی ساکھ بحال کرنے کا امکان موجود ہے۔ پاکستان کی سیاست میں ایسا گھناؤنا واقعہ مجھے نظر نہیں آتا کہ جس بیہودہ انداز میں اس نے چوڑیاں اتار کر نواز شریف کی طرف اچھال دی تھیں۔)

لیکن چاغی کے بعد ساری بحث اچانک ختم ہو گئی۔ اقبال ٹوٹ کر رہ گئے

(میں نے ٹیلی ویژن پر وہ تصویر دیکھی جو ایٹمی دھماکے کے امنڈتے ہوئے بادلوں سے زیادہ بھیانک تھی۔ پہاڑ سفید ہو گئے تھے۔ میں یہ سوچ کر حیران ہوتا ہوں کہ خدا کی اس حیران کن تخلیق کی تباہی پر قدرت کتنے کرب سے گزری ہو گی۔)

اس روز اسلام آباد اور لاہور کی سڑکوں پر لوگ جھوم در جھوم رقص کر رہے تھے۔ ایسا ہی پر جوش مظاہرہ سترہ روز پہلے دہلی اور بمبئی میں دیکھا گیا تھا۔ عقیدت مند لوگ سرخرو ہو گئے تھے۔ اگرچہ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کون سا عقیدہ فتح مند ہوا۔ پوکھران کی ایٹمی ریت، شیو جی کے مقدس نام پر لے کر وشو ہندو پریشد نے تمام

MashalBooks.org

مندروں پر چھڑکی۔ پاکستان میں جماعت اسلامی نے گتے کا (اسلامی بم) بنایا اور گاڑی پر رکھ کر ملک بھر میں اس کی نمائش کی۔ اس کے ساتھ ہی دائیں بازو کے اردو مجلد (زندگی) نے چاغی کا معجز نما احوال شائع کیا۔ اس نے تائید غیبی کی کہانیاں شائع کیں کہ جب ہمارے مردِ مومن جائے وقوعہ پر ایٹمی تجربے کی تیاریوں میں مصروف تھے تو قدرت نے کس طرح زہریلے سانپوں سے انہیں بچایا اور کس طرح تجربے کے بعد محض چار چوزوں کے گوشت سے کوئی ایک ہزار بندگانِ خدا کی ضیافت ہوگئی اور آنحضورﷺ نے کہوٹہ کی تنصیبات کی حفاظت کی ذمہ داری خود سنبھال لی۔ اب بہت سارے عبدالکلام اور خان محترم اور مبارک مند میدان میں نکل آئے کہ یہ وقت انہی کا تھا۔ انہیں برصغیر کے ہیرو بنا کر سرفراز کیا گیا' حالانکہ سائنس کی دنیا میں انہیں کوئی نہیں جانتا۔ وہ تعریف وستائش سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنے آپ کو اعلیٰ سائنس داں سمجھنے لگے۔ لیکن ان سے زیادہ فیض تو سیاسی قیادت نے حاصل کیا۔ جتنے بھی شریف اور واجپائی تھے سب بڑے بڑے گرجدار مجمع کے آگے اکڑتے اور اتراتے پھر رہے تھے۔ اقبال نے نہایت متانت سے انہیں متوقع صورت حال سے متنبہ کیا۔

(میں اب بھی یہ سمجھتا ہوں کہ دہلی کی اشتعال انگیزی اور طاقت کی نمائش کے باوجود پاکستان نے ہندوستان کے جواب میں ایٹمی دھماکوں سے اپنے تحفظ کا بہتر مظاہرہ نہیں کیا۔ ہندوستان اور پاکستان کے لیڈروں نے بالکل ماضی کی بعض مثالوں کی طرح وہ اختیارات خود غصب کر لئے ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں یعنی پہاڑوں کو ہلاک کر دینا' زمین پر لرزہ طاری کرنا' سمندر کے پانی کو ابالنا اور انسانیت کو تہہ و بالا کر دینا۔ میرا خیال ہے کہ جب طاقت کی نمائش کا زور تھم جائے گا اور واہ واہ کا شور کم ہوگا تو یہ لوگ پسپائی اختیار کریں گے اور اس پر غور کریں گے کہ اس خوفناک ذمہ داری کا بوجھ اب کیسے اٹھائیں۔)

لیکن وہ تمام لوگ جو قوم پرستی کی آگ بھڑکا رہے تھے ان کے پاس ایسے مشوروں کا کوئی مصرف نہیں تھا۔ وہ ایک نئی طاقت کے نشے میں مدہوش تھے اور بڑے پیمانے پر قتل و خون کے لئے آمادہ۔ سرکاری جشن میں دیوانگی اور موت کا رقص کر رہے تھے اور بگل کی آواز پر دھماچوکڑی میں مصروف تھے۔ انہیں اس سے غرض نہ تھی کہ پاکستانی اخبارات نے عین اسی سال تین سو افراد کی خودسوزی کی خبریں شائع کی تھیں۔ انہوں نے کرب ناک محرومی اور جام لیوا زندگی کا مزید ایک دن گزارنے کے بجائے موت کو ترجیح دی تھی' ملک میں یورینیم یقیناً بہت تھا' لیکن روٹی اور پینے کا پانی نہیں تھا۔

جوہری طاقت کا جنون درپردہ طور پر ایک خوفناک خیال کو جنم دے رہا تھا' جسے سرکاری ذرائع ابلاغ پوری طاقت کے ساتھ پھیلا رہے تھے۔ مبصر اور ترجمان ہر روز ٹی وی کے ناظرین کو گلے پھاڑ پھاڑ کر یہ سمجھا رہے تھے کہ پاکستان اس طرف سے محفوظ ہوگیا ہے اور فوجی طاقت میں اگر ہندوستان سے زیادہ نہیں تو اس کے برابر تو پہنچ ہی گیا ہے۔ لیکن اقبال احمد کی دلیل یہ تھی کہ ماحول میں تبدیلی کے نتیجے میں جو نیا دھڑا سے تک برقرار نہیں رہتی پاکستان کا غیر یقینی صورت حال سے نکل کر یقینی طور پر ایک ایٹمی طاقت بن جانا' ایسا واقعہ نہیں

MashalBooks.org

کہ اس سے سیاسی منظر بدل گیا ہو۔ اقتصادی طور پر ملک کمزور ہوا ہے' ملک کی داخلی صورت حال آئندہ زیادہ سنگین ہو جائے گی' مذہبی جنونیوں کی طاقت بڑھ جائے گی اور وہ زیادہ تفرقہ ڈالیں گے۔ ایٹمی اسلحہ نے تحفظ کا جو ہیولہ تیار کیا ہے اس کے خوفناک نتائج برآمد ہوں گے۔ چاغی کے بعد کے مہینوں میں اقبال احمد نے ملک بھر میں جوہری بم کے خلاف جلسوں سے خطاب کیا۔ ایسے بیشتر موقعوں پر میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے بڑی صراحت کے ساتھ اور پر جوش انداز میں' جیسا کہ ان کا اسلوب تھا' اپنا موقف بیان کیا۔ ان کے پاس علم اور تجربوں کا جو خزینہ تھا' ان سے مثالیں پیش کیں' سامعین کو روس اور اس کے حواری ملکوں یعنی پولینڈ اور چیکوسلواکیہ کے واقعات یاد دلائے۔ ان ملکوں نے ہر قسم کے اسلحہ تیار کئے تھے' لیکن ان کے معاشرے اپنی توانائی کھو چکے تھے' چنانچہ زمین بوس ہو گئے۔ پاکستان کے لئے بہتر ہوگا کہ وہ وقت نہ آنے دے۔ ہندوستان کے برابر علاقائی سیاسی اثر و رسوخ حاصل کرنے کے جال میں اسے نہیں پھنسنا چاہیے۔

اقبال سب سے زیادہ ہندوستان اور پاکستان کی درپردہ جنگ سے فکرمند رہتے تھے۔ وہ کہتے تھے: (سرد جنگ کی تاریخ پر نظر ڈالو' چونکہ جوہری اسلحہ نے طرفین میں براہ راست تصادم کو غیر ممکن بنا دیا تھا' لہذا امریکہ اور روس نے اپنے تنازعے کو تیسری دنیا کے ملکوں میں پہنچا دیا' جہاں لاکھوں کوریائی' ویت نامی' افریقی' جنوبی امریکی اور افغان' جو عالمی طاقتوں کے ہاتھوں میں محض بساط کے مہرے تھے' نہایت خاموشی کے ساتھ اپنی جان سے گزر گئے۔ اقبال کو یہ اندیشہ تھا کہ یہ خونیں دور کشمیر میں بھی آنے والا ہے۔ ان کی پیش گوئی تھی کہ جوہری اسلحہ سے آلودہ کشمیری اس کے بدترین شکار ہوں گے۔ ہندوستان اور پاکستان' جنہوں نے اپنے اپنے تحفظ کے لئے جوہری اسلحہ کی ڈھال سنبھال رکھی ہے' اپنا کھیل اس وقت تک کھیلتے رہیں گے' جب تک ایک بھی کشمیری زندہ ہے۔

مارچ 1999ء کے ابتدائی دن تھے' جب اقبال نے اسلام آباد میں مجھے فون کیا۔ اس وقت ان کے لہجے میں معمول کی شگفتگی نہیں تھی' بلکہ قدرے تشویش تھی۔ یونیورسٹی میں اپنی کلاس سے فارغ ہوتے ہی میں ان سے ملاقات کے لئے چلا گیا۔ برسوں سے میں نے ان کو اتنے خراب موڈ میں نہیں دیکھا تھا۔ پاکستان کے ایک بڑے جرنیل سے ابھی کل ہی ان کی طویل ملاقات ہوئی تھی۔ عجیب بات ہے کہ وہ ان کے مداحوں میں شامل تھا' لیکن واپسی میں وہ بے حد مضطرب تھے۔ ان کے اندیشوں کی توثیق ہو گئی تھی' کشمیر میں ایک خوفناک بات ہونے جا رہی تھی' لیکن ایٹمی اسلحہ اس بات کے ضامن تھے کہ جنگ کی آگ پاکستان میں داخل نہیں ہوگی۔ تو یہ تھا منصوبہ جو ایک دھماکے کی طرح دو ماہ بعد سامنے آیا۔ کارگل کی واردات سننے کے لئے اقبال زندہ نہیں رہے تھے۔ اس وقت شمال کی لائٹ انفنٹری کے سپاہیوں نے خفیہ طور پر لائن آف کنٹرول کو پار کر لیا تھا اور پہاڑ کی بلندترین چوٹیوں پر کمان سنبھال لی تھی' جہاں سے انہوں نے نشیب میں وادی کے اندر ہندوستانی سپاہیوں کو زبردست جانی نقصان پہنچایا۔ اس کے بعد جب تک دوطرفہ دشمنیاں ختم ہوتیں اور پاکستان کو توہین آمیز پسپائی اختیار کرنی پڑتی' دونوں طرف ہزاروں افراد برف کے مہیب میدانوں میں

MashalBooks.org

موت کے گھاٹ اتر گئے اور یوں باہمی اعتماد اور بداعتمادی کا ایک نیا باب رقم کیا گیا۔

آخری دن

اقبال 1997ء میں ہیمپشائر کالج سے ریٹائر ہو گئے۔ انہوں نے مجھے اس تقریب میں شرکت کے لئے مدعو کیا' جو کالج نے اور اقبال کے بہت سے دوستوں نے انہیں تحریری طور پر خراج تحسین پیش کرنے کے لئے منعقد کی تھی۔ نیو انگلینڈ کے نواح سے سینکڑوں لوگ جوق در جوق وہاں پہنچ گئے۔ بہت سے لوگ دور دراز سے یہاں تک کہ کیلیفورنیا' کینیڈا' الجزائر' مراکش' ترکی اور پاکستان سے اس تقریب میں شرکت کے لئے پہنچے۔ اس کا آغاز جمعہ کی شام کو نوم چومسکی کے مضمون سے ہوا تھا' جس کا موضوع تھا: (تیسری دنیا کے ملکوں کے اندر اور بیرون ملک امکانات) لیکن آنے والوں کی تعداد مسلسل بڑھتی گئی۔ چنانچہ ابتداء میں جو منصوبہ بنایا گیا تھا اسے ترک کرنا پڑا اور تقریب کی جگہ تبدیل کر کے اس کا اہتمام کالج کے جمنیزیم میں کرنا پڑا اور وہ جگہ بھی کھچا کھچ بھر گئی۔ میرا اندازہ ہے کہ کوئی دو ہزار افراد ہوں گے۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ تو میرے سامنے پھر وہی وڈسٹاک کا منظر آ گیا ہے۔ لیکن اس مرتبہ بائیں بازو کی بین الاقوامی برادری کے چند اعلیٰ ترین اور انتہائی مستند دانشور وہاں پیش ہو رہے تھے۔

جی ہاں وہ اقبال احمد کا قبیلہ تھا جو اس موقع پر یکجا ہو گیا تھا۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ اقبال نے بہت سے لوگوں کی مدد کی تھی' جو ان سے محبت کرتے اور ان کی وفاداری کا دم بھرتے تھے لیکن یہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنے بہت سے لوگ ہوں گے' جو ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہوں گے اور دنیا کے اتنے الگ الگ علاقوں سے آئے ہوں گے اور جو ان سے اتنی والہانہ محبت کرتے ہوں گے۔ وہ محض طلبہ نہ تھے' جن کی آوازیں جذبات کی شدت سے بھرائی ہوئی تھیں' بلکہ ان میں ایڈورڈ سعید بھی شامل تھے ان کے سب سے قریبی دوست اور فلسطین کی روشن ترین شعاع دانش۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے جس بات نے اس تقریب کو ایک خاص معنی دے دئے تھے' وہ کسی حد تک سن ساٹھ اور ستر کے عشروں میں ویت نام کے دنوں کی یادیں تھیں' جس میں جنگ کے خلاف امریکی مزاحمت اور اس شعوری بیداری میں اقبال کا بڑا کردار تھا۔

ہیمپشائر کا جشن اقبال احمد کی زندگی کا آخری نقطہ عروج تھا اور اس عہد کی علامت کہ اب وہ باقی تقریباً ساری زندگی پاکستان میں گزاریں گے۔ اب تک وہ اپنا وقت امریکہ میں درس و تدریس اور اخبار میں کالم نگاری کے درمیان تقسیم کرتے آئے تھے اور اسلام آباد میں خلدونیہ کے نام سے آرٹ اور سائنس کی ایک یونیورسٹی کے قیام پر کام کر رہے تھے۔ یہ وہ منصوبہ تھا جس کے بارے میں بے نظیر بھٹو اور نواز شریف دونوں تہیہ کئے بیٹھے تھے کہ چلنے نہیں دیں گے۔ لوگ اقبال سے پوچھتے تھے: (جب آپ اپنی تحریر کی کاٹ میں ذرا سی بھی کمی کے لئے تیار نہیں تو ان سے کسی مختلف فیصلے کی امید کیوں رکھتے ہیں؟) ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا' مگر وہ بہر طور پر امید تھے۔

MashalBooks.org

اور پھر یہ ہوا کہ موت پوری تیزی سے اپنا کام کرنے لگی۔ جب موت کا سرد اور زرد سایہ پہلی بار نمودار ہوا' تب سے لے کر اس وقت تک جب موت ان کے سینے میں اپنا ٹھکانہ بنا چکی تھی' بس چند ہی دنوں کی بات تھی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے آگے میں کیا لکھوں یا پھر اپنی بات یہیں ختم کر دوں۔ موت ہر فرد کے لئے انتہائی نجی' بہت قریبی اور آخری معرکہ ہے۔ کسی اور کے لئے ممکن نہیں کہ اس کیفیت کے وجود کے اندر جا کر بیان کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن موت اپنے ساتھ صداقت کا وہ المیہ بھی لاتی ہے' جب دکھاوے کی گنجائش اور چھپنے کے لئے آڑ باقی نہیں رہتی۔ اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ کوئی شخص اصلاً اندر سے کیا ہے تو اتنا ہی جاننا کافی نہیں کہ اس نے زندگی کیسے گزاری بلکہ دیکھنا ہو گا کہ اس نے موت کو کس طرح قبول کیا۔ آنسوؤں نے میری آنکھوں کو دھندلا دیا ہے' لیکن میری انگلیاں قارئین کو بتائیں گی کہ اقبال نے کس طرح موت کا سامنا کیا۔ وقت آخر سے دو ہفتہ پہلے ہم انہیں ہسپتال لے گئے۔ اس وقت ان کی حالت بہت خراب تھی۔ اگر چہ ہمیں معلوم نہ تھا کہ ان کی بڑی آنت کا سرطان بہت بڑھ چکا ہے۔ انہیں شدت کے ساتھ قے ہو رہی تھی اور سینے میں شدید درد تھا' لیکن ایسے میں بھی جب تکلیف تھم جاتی تو وہ عالمی واقعات کے بارے میں پوچھتے رہتے۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ پاکستان کے ایٹمی دھماکے کی سالگرہ منانے کی سرکاری طور پر تیاریاں ہو رہی ہیں۔ تو انہوں نے بڑے تاسف اور حقارت سے سر ہلایا۔ میں نے کہا: (چھوٹے چھوٹے تمغے' جن میں ایٹمی بادل منڈلاتے ہوئے نظر آئیں گے بچوں میں مفت تقسیم ہوں گے' نظم خوانی کے مقابلے ہوں گے' جن میں اس قوم کی عظمت کو سراہا جائے گا جو ایٹمی طاقت سے بہرہ مند ہوئی ہے۔ اور بڑے بڑے چوراہوں پر میزائل کے نمونے نصب کئے جائیں گے۔) پھر میں نے کہا: (اقبال جب آپ اچھے ہو جائیں گے تو آپ کو وہ مضمون دکھاؤں گا جو اس جشن کے خلاف میں نے ابھی ابھی لکھا ہے۔) انہوں نے جواب دیا: (نہیں' مجھے وہ مضمون ابھی دکھاؤ۔) انہوں نے ہاتھ کی رگ میں پیوست ڈرپ احتیاط سے ایک طرف سرکائی تا کہ قلم پکڑ سکیں۔ پھر کہا: (میرے بستر کو اوپر اٹھا کر نیم نشست کی حالت میں لاؤ۔) اور پھر مضمون پڑھنا شروع کر دیا' جس میں کہیں کہیں اپنے ادارتی تبصرے جو نہایت کاٹ دار اور برمحل تھے شامل کر دیئے۔ میں نے سوچا' یہی کام انہوں نے ساری عمر کیا ہے' دوسروں کی مدد کرنا' ان کے مسائل کو اپنے ہی مسائل سمجھنا اور ہمیشہ سوچتے رہنا کہ دنیا کدھر جا رہی ہے۔

دوسرے روز طبی معائنے سے معلوم ہوا کہ ان کی بڑی آنت کے زیریں حصے میں پھوڑا بہت بڑھ گیا ہے۔ ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا۔ یہ ایک کربناک لمحہ تھا۔ اقبال نے سوال کیا: (کیا یہ سرطان ہے؟) جب ڈاکٹر نے اقرار میں سر ہلایا تو اس وقت میں ان کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا' وہاں نہ خوف تھا' نہ جی چھوڑ دینے کی کیفیت' بس ایک مختصر لمحہ تفکر کا۔ چند ہی لمحے بعد وہ سرجری کے امکانات پر بات چیت کر رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ موت قریب ہے' لیکن انہوں نے کوئی بے مصرف التجائیں نہیں کیں۔ کچھ بھی طلب نہیں

MashalBooks.org

کیا اور نہ کوئی توقع کی۔ ان کی دانش کامل دیانت اور پورے وقار کے ساتھ آخری سانس تک برقرار رہی۔ دوسرے لوگ اگر اپنی تسکین کے لئے یہ مرہم کسی نہ کسی صورت میں استعمال کرتے ہیں اور اپنے عقیدے کے مطابق کوئی دینی وظیفہ پڑھتے ہیں تو وہ ضرور ایسا کریں' خود انہیں اس کی ضرورت نہیں۔ البتہ اقبال احمد ان کی حوصلہ شکنی بھی نہیں کرتے۔

ڈاکٹر ان سے بے حد مرعوب تھے اور نرسیں تو ان سے محبت کرنے لگی تھیں۔ ان سب کو اپنی زندگی میں انتہائی نگہداشت کے مریضوں کا اب تک جو تجربہ ہوا تھا' اقبال ان سے الگ ایک عجیب و غریب شخصیت تھے۔ نلکیوں اور ڈھیروں تاروں کے درمیان پھنسے ہوئے وہ ہر لمحہ آخری ساعت سے قریب ہو رہے تھے' اس کے باوجود انہوں نے ان سب کو اپنی باتوں میں لگائے رکھا۔ ہر بات جاننے کے لئے اصرار کرتے۔ ایک انتہائی نااہل نرس کو انہوں نے جھڑک بھی دیا' جس نے ٹیکہ لگانے کے لئے شریان کی تلاش میں پانچ مرتبہ سوئی چبھوئی تھی۔ انہوں نے دو اچھی نرسوں کی تعریف بھی کی اور سبھی کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا' اسے بھی جسے جھڑکا تھا۔

11 مئی 1999ء کی تاریخ تھی اور صبح کے 5 بج کر 25 منٹ ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا: (مجھے نشست کی حالت میں اٹھاؤ۔) پھر چندہی لمحوں بعد ای سی جی ایک سپاٹ سیدھی لکیر رہ گئی تھی۔ نرس کی آنکھوں سے میں نے آنسو بہتے دیکھے' وہ آخری بار ان پر چادر ڈال رہی تھی۔

MashalBooks.org

تعارف

MashalBooks.org

ایک انٹرویو:

ڈیوڈ برسیمین

اقبال احمد ایک عالم باعمل تھے۔ ان کا سال پیدائش غالباً 1934ء ہے۔ اس بارے میں انہوں نے خود یقین سے کچھ نہیں کہا۔ 1947ء میں انہوں نے اپنے بھائیوں کے ساتھ پاکستان کی نوزائیدہ ریاست کا رخ کیا۔ 1950ء کی دہائی میں وہ پرنسٹن میں تحصیل علم کے لئے امریکا آ گئے۔ اس کے بعد الجزائر چلے گئے۔ وہاں فرانس کے خلاف بغاوت چل رہی تھی جس میں انہوں نے فرانز فینن (Fennon Frantz) کے ساتھ مل کر آزادی کے لئے کام کیا۔ امریکہ میں انہوں نے شہری حقوق کی تحریک میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا اور ویت نام جنگ کے خلاف تحریک میں بھی پیش پیش تھے۔ 1971ء میں انہیں (بیریگن برادران اور چند دیگر افراد کے ہمراہ) اس سراسر جعلی الزام کے تحت کہ وہ ہنری کسنجر کو اغوا کرنا چاہتے تھے گرفتار کر لیا گیا۔ مقدمہ چلا لیکن بعد میں مقدمہ خارج کر دیا گیا۔

اقبال احمد فلسطین کے عوام کی آزادی کے حق میں خاصے طویل عرصے سے سرگرم چلے آتے ہیں۔ اس سرگرمی نے انہیں ایڈورڈ سعید سے بہت قریب کر دیا اور دونوں گہرے دوست ہو گئے۔ ایڈورڈ سعید نے اپنی تصنیف "کلچر اینڈ امپیریل ازم" انہی کے نام معنون کی۔ فلسطین کے حق میں کام کے دوران اقبال احمد یاسر عرفات کی توجہ کا مرکز بن گئے، جنہوں نے اقبال احمد سے کئی بار ملاقاتیں کیں، لیکن احمد کا بیان ہے کہ میرا مشورہ انہوں نے کبھی قبول نہیں کیا۔ 1960ء کی دہائی میں اقبال احمد نے پرنسٹن، یلی نوائے یونیورسٹی اور کارنل کی درسگاہوں میں تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ یہ 1967ء کا سال تھا جب انہوں نے اسرائیل اور عرب ممالک کے درمیان ہونے والی چھ روزہ جنگ کے موضوع پر طلباء کے ایک گروپ سے خطاب کرتے ہوئے یہ دلیل پیش کی کہ ذرائع ابلاغ اس جنگ کو جس طرح پیش کر رہے ہیں، یہ درحقیقت اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس خطاب کے بعد انہیں کچھ یوں محسوس ہوا جیسے انہیں اکیڈمی سے خارج کر دیا گیا ہو۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ (کارنل میں فیکلٹی کے ارکان کی اکثریت نے میرے اس بیان کا بہت ہی برا مانا، دوسرا برس ہوتے ہوتے یہ نوبت آ گئی کہ میں بالکل ہی تنہا رہ گیا۔ یہاں تک کہ لوگوں کی ایک کثیر تعداد

MashalBooks.org

میز خالی ہونے کے انتظار میں قطار باندھے کھڑی رہتی میں اپنی میز پر اکیلا ہوتا' لیکن کوئی فرد میرے ساتھ بیٹھنا گوارا نہ کرتا۔)

احمد نے کارنل کو خیر باد کہا اور فری لانس کام کرتے رہے' پھر ایمسٹرڈم میں ایک بین الاقوامی انسٹی ٹیوٹ قائم کیا' جس کا الحاق واشنگٹن کے انسٹی ٹیوٹ برائے پالیسی اسٹڈیز Transnational کے ساتھ ہو گیا۔ 1982ء سے 1997ء تک وہ ہیمشائر کالج واقع امہرسٹ' میساچوسٹس (Amherst Massachusetts) میں ہر سال ایک سمسٹر کے دوران بین الاقوامی تعلقات اور شرق وسطیٰ کے مطالعہ پر درس دیتے رہے۔

اقبال احمد اکتوبر 1997ء میں ہیمشائر کالج سے ریٹائر ہو گئے۔ ان کی ریٹائرمنٹ کی دو روزہ تقریب کو جس جوش وخروش سے منایا گیا وہ ایک یادگار واقعہ تھا۔ تقریب کا عنوان ہی تھا: اقبال احمد کا جشن اس میں شرکت کے لئے لوگ دور دراز سے وہاں آئے تھے۔ کیلیفورنیا سے' کینیڈا سے' الجزائر' مراکش' ترکی اور پاکستان سے' بھلا کہاں کہاں سے نہیں آئے تا کہ اس جشن میں شریک ہو سکیں۔ ان کے لئے تقریر کرنے والوں میں نوم چومسکی' ہوورڈ زن اور ایڈورڈ سعید' یعنی اقبال کے سارے قریبی اور ذاتی احباب موجود تھے۔ اس موقع پر اقبال احمد سے موسوم ایک ممتاز لیکچر پروگرام کے قیام کا اعلان ہوا۔ (پہلا اقبال احمد لیکچر اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان نے ستمبر 1998ء میں ہیمشائر کالج میں دیا۔)

اب اقبال احمد اپنا بیشتر وقت اسلام آباد (پاکستان) میں گزار رہے ہیں۔ (یہ عبارت ان کی وفات سے پہلے کی ہے) جہاں وہ ایک متبادل یونیورسٹی کے قیام کے لئے کوشاں ہیں۔ وہ پاکستان کے سب سے پرانے انگریزی اخبار ڈان کے لئے ہفتہ وار کالم بھی لکھتے ہیں۔ پاکستان میں وہ بیشتر اس امر کے لئے کوشاں ہیں کہ کشمیر اور جوہری ہتھیاروں کے تعلق سے ہندوستان کے ساتھ جو اختلافات پیدا ہو گئے ہیں' انہیں دور کیا جائے۔

اقبال احمد سے سب سے پہلا انٹرویو میں نے 1980ء کی دہائی کے اوائل میں ان کے اپارٹمنٹ میں کیا' جو نیویارک کے اپر ویسٹ میں واقع ہے۔ یہ ایک یادگار موقع تھا۔ واپسی میں' میں سوچتا اور اس خیال سے حیران ہوتا رہا کہ مجھے ایک زبردست انٹرویو مل گیا ہے۔ لیکن میں نے اسے سننے کے لئے کھولا تو ٹیپ یکسر بے آواز تھا۔ معلوم ہوا کہ مجھے ٹیپ ریکارڈر چلانا ہی یاد نہیں رہا تھا۔ نہایت ندامت اور خفت کے ساتھ میں نے اقبال احمد کو بتایا کہ انٹرویو پر کیا

گزری۔ انہوں نے مجھ سے دوسرے دن آنے کے لئے کہا۔ چنانچہ ہم نے دوسرا انٹرویو کیا۔ اس بار میں نے احتیاط سے بٹن دبایا تھا۔ حالیہ انٹرویو کا بیشتر حصہ ان دو طویل ملاقاتوں کا حاصل ہے جو امہرسٹ (Amherst) کے اس چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں ہوئیں۔ (اس میں کچھ حصے' بولڈر کولوریڈو میں بعد کے

MashalBooks.org

ایک انٹرویو سے شامل کئے گئے ہیں)اس انٹرویو کے لئے آخری نشست کا آغاز سہ پہر میں ہوا اور گفتگو رات کے دو بجے ختم ہوئی۔ خاتمہ ایک اردو نظم کے ساتھ ہوا۔ درمیان میں دوبارہ نہایت چٹ پٹے کھانے بھی کھائے اور قریبی ماؤنٹ بالی یوک کی سیر بھی کی۔

کم عمری میں آپ نے خود ذاتی طور پر پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ابھرتی ہوئی کشیدگی کو دیکھا۔اس نے آپ پر کیا اثر ڈالا؟

☆ ہندوستان کو تقسیم ہوتے ہوئے دیکھتا رہا' یہ ایسا تجربہ تھا جس نے مجھ پر دیرپا اثر ڈالا۔ کیونکہ میں نے یہ دیکھا کہ انسانیت ،اور نہایت شائستہ انسانیت ، کتنی آسانی سے وحشت و بربریت میں بدل جاتی ہے اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ خیالات' نظریے اور سیاسی روابط انسانی رویے میں کس حد تک تبدیلی لاتے ہیں۔

اور وہ آپ کے والد کے قتل کا واقعہ؟

☆ اس نے ایک اہم کردار ادا کیا۔ میں بچہ تھا' مجھ پر اس سانحے نے گہرا زخم لگایا' لیکن اس کے علاوہ میں نے غیر شعوری طور پر زندگی کے بارے میں کچھ نتائج اخذ کئے اور اپنے اندر جذب کئے۔ ایک تو یہ کہ لوگوں کے لئے جائیداد دوستی اور خون کے رشتوں کے مقابلے میں زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ میرے والد کے کچھ رشتے داران کے قتل میں ملوث تھے کیونکہ وہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ والد کی سیاست کے باعث ان کی ملکیت کے حقوق خطرے میں ہیں۔

کیا وہ گاندھی کی تحریک میں شامل تھے؟

☆ جی ہاں وہ انڈین نیشنل کانگریس میں شامل تھے اور اپنی کچھ اراضی بھی ہاریوں میں بانٹ رہے تھے۔

جب انہیں قتل کیا گیا تو کیا آپ ان کے ساتھ تھے؟

☆ ہم ایک ہی بستر پر سو رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بچانے کی کوشش کی اور ظاہر ہے اس میں کامیاب رہے۔ میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔

جب آپ پیچھے مڑ کر گاندھی اور نوآبادیاتی حکمرانی سے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کو دیکھتے ہیں تو آپ کے خیال میں کیا ایسا کوئی طریقہ تھا جس سے ہندوستان کا بٹوارہ اور خون خرابہ نہ ہوتا؟

☆ میرا خیال ہے' تھا۔ جب دونوں قومیں سات سو برس تک ایک دوسرے کے ساتھ رہتی آئی تھیں' تو یہ ناممکن تھا کہ علیحدگی سے بچنے کا راستہ نہ نکلتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندو اور مسلمان دونوں کی ہندوستانی قیادت اور میں اس میں گاندھی کو بھی شامل کروں گا' آخر کیوں اس امر کو یقینی بنانے میں ناکام رہی کہ دونوں قومیں ایک طرف ہندو اور دوسری طرف مسلمان ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو رہ سکتے ہیں۔ اس باہمی تعلق میں کشیدگی تو تھی اور صاف بات ہے کہ ہر تعلق میں کھینچا تانی ہوتی ہی ہے لیکن ہندو اور مسلمان دونوں بڑی حد تک ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہتے آئے تھے۔ اس تعلق سے ایک نئی تہذیب نے جنم لیا تھا' اردو

MashalBooks.org

پیدا ہوئی تھی' نئے فنون' فنِ تعمیر اور موسیقی اور شاعری کو فروغ حاصل ہوا تھا۔

تقسیم سے بچا جا سکتا تھا لیکن اس صورت میں بچا جا سکتا تھا جب ہندوستان میں سامراج دشمن تحریکیں قوم پرستی کے نظریے سے گریز کرتیں اور اس بات کی اہمیت کو سمجھتیں۔ قوم پرستی تفریق کا نظریہ ہے اور کم از کم گاندھی ہندوستان کی تقسیم کے اتنے ہی ذمہ دار ہیں' جتنا کوئی اور ہوگا۔ اس بات سے گاندھی کو کہیں فرقہ پرست ہندو نہ سمجھ لیا جائے جیسا کہ پاکستانی قوم پرست انہیں سمجھتے آئے ہیں اور میں اس معاملے میں ان سے متفق نہیں ہوں۔ البتہ مجھے یہ کہنا

چاہیے کہ وہ سامراج مخالف موقع پرست تھے۔ گاندھی کے اندر موقعہ پرستی کی یہی ایک لہر تھی جس نے انہیں ہندوستان کی سیاست کو روحانیت اور فرقہ واریت کی راہ پر چلانے کے لئے آمادہ کیا۔

گاندھی نے ہندو دھرم کی علامتوں کو آگے لانا شروع کیا' کیونکہ وہ اکثریتی آبادی کی علامتیں تھیں۔ ان میں بڑی وسعت اور توانائی تھی اور وہ علامتیں تحریک پیدا کر سکتی تھیں۔ اس عمل کو دیکھتے ہوئے مسلمان خوفزدہ ہو گئے کہ ان کی تہذیبی روایات کو نظر انداز کیا جا رہا تھا' اہنسا کے فلسفے کی حدود میں رہتے ہوئے عام لوگوں کو حرکت میں لانے کے لئے گاندھی کچھ بھی کر سکتے تھے۔

اور برطانیہ کا کیا کردار تھا؟

☆ دوسری عالمی جنگ نے برطانوی شہنشاہیت کو بالکل کھوکھلا کر دیا تھا۔ جب جنگ ختم ہوئی تو برطانیہ نے نیم دلی کے ساتھ اقتدار پر اپنی گرفت رکھی اور پھر اچانک ہی حوصلہ ہار بیٹھا۔ برطانیہ صرف اس حد تک محتاط تھا کہ وہ اپنے (توانائی) کے مقبوضہ جات سے دست کش نہیں ہوا۔ عالمی جنگ اول اور دوئم کے زمانوں میں جہاں بھی توانائی کے وسائل موجود تھے۔ برطانیہ نے نہایت سختی کے ساتھ ان پر اپنا تسلط قائم رکھا۔ تیل کی اہمیت کا انہیں اندازہ ہو گیا تھا اور ان وسائل سے اس کا گہرا تعلق بن گیا تھا' پھر انہیں ہندوستان جیسی جگہوں سے کچھ زیادہ دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ انہیں دو چیزوں کی پروا تھی' تیل اور برطانوی شہری۔ جہاں کہیں انگریزوں کی بڑی بڑی کالونیاں تھیں' مثلاً کینیا' ان کے ساتھ وہ لگے رہے' جہاں کہیں تیل تھا' اس کے ساتھ بھی وہ چپکے رہے۔ باقی رہی دوسری باتیں' ان کے ساتھ ان کا تعلق تقریباً غیر ذمہ دارانہ تھا۔

میں اس وقت کوئی بارہ سال کا لڑکا تھا۔ میرے حافظے میں کچھ کچھ وہ باتیں موجود ہیں' جب میرے بھائی جو سب کے سب قوم پرست تھے 1946ء میں بدترین امکانات کا تذکرہ کرتے تھے جو انگریزوں کے قبل از وقت چلے جانے سے پیدا ہو سکتے تھے۔ ان میں غور کرنے کی اتنی بھی سکت باقی نہیں رہی تھی کہ جانا ہی تھا تو باضابطہ انداز سے جاتے۔ میرا خیال ہے کہ ہم نے 1947ء میں جو کچھ ہندوستان میں

دیکھا اور پھر 1948ء میں پاکستان میں دیکھا' وہ نا جائز غیر ذمہ دارانہ' عقل سے تہی بلکہ صاف بات یہ کہ بزدلانہ نکلا تھا۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کی سیاست کے بارے میں آپ کیا کہیں گے' جو ہندوستان میں 1998ء میں برسراقتدار آئی؟

☆ یہ اقلیت دشمن ہے۔ کیونکہ یہ ہندوستان میں جو ہزاروں سال سے ایک متحد اور ملی جلی آبادی کا ملک رہا ہے' جہاں بہت سی تہذیبیں اور بہت سے مذاہب موجود ہیں' ایک متحدہ ہندو معاشرہ قائم کرنے کے درپے ہے۔ ہندوستان کا جب آپ کے ذہن میں یہ تصور ہو تو اس کے ساتھ بہت سی چیزیں آئیں گی' وہ ہندوستان کی اس تاریخ سے سخت خفا ہیں جو ان کے نقطۂ نظر سے صحیح طور پر ہندو نہیں۔ اس طرح ہندوستان کی تاریخ سے بودھوں کا زمانہ خارج ہو جاتا ہے۔ 750 سال کا عرصہ جو ان کے حساب سے مسلمانوں کا تھا' ہندوستان کی تاریخ سے وہ بھی خارج ہوتا ہے۔ یہ محض غیر تاریخی نہیں بلکہ تاریخ دشمن تحریک ہے۔ سولھویں صدی کی بابری مسجد کا ڈھایا جانا' اس تاریخ دشمنی اور تاریخ مخالف نقطۂ نظر کا آئینہ دار ہے' وہ اس ساری تاریخ کو جو تمام تر ہندو نہیں' غارت کر دیں گے۔

اس سے ہندوستان کی ایک مختلف تاریخ کا خیال ذہن میں آتا ہے۔ برسراقتدار عناصر جب ایک مختلف تاریخ کا تصور کرتے ہیں تو وہ پرانی تاریخ کو مسمار کر کے ایک نئی تاریخ بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ ہم نے صیہونیوں کی تحریک میں یہی دیکھا' جنہوں نے فلسطین کی ایک بالکل مختلف تاریخ پیدا کی اور ایک حد تک کم از کم مغربی دنیا کے لئے اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب رہے۔ اس نے انیسویں صدی میں نسل پرستی کی تحریک کو کامیابی سے چلایا اور یہاں تک آ گئے کہ ایک مختلف تاریخ بنا ڈالی' جس میں ایسی باتیں آ گئیں کہ مثلاً استنبول کا شہر مغرب والوں کی تخلیق ہے' یہاں تک کہ تاج محل کے لئے کہا گیا کہ اسے اٹلی کے فنکاروں نے بنایا تھا۔

اسی طرح کی ذہنیت لازمی طور پر اقلیت دشمن بن جاتی ہے۔ ہندوستان کی اقلیتیں' مسلمان' سکھ' عیسائی' بودھ سب کے سب اس بات سے خائف ہیں کہ اس ملک کو غیر ہندو عناصر سے پاک کرنے کی کوشش اپنی انتہا کو پہنچ سکتی ہے۔ یہ اقلیت مخالف رجحان اس زمانے کی یاد دلاتا ہے' اگرچہ اس درجے تک پہنچا نہیں اور امید ہے کہ اس حد تک پہنچے گا بھی نہیں' جب یورپ کے اندر یہودیوں کے خلاف فسطائی مہم شروع ہو گئی یا سابق یوگوسلاویہ میں مسلمانوں کے خلاف مہم چلائی گئی۔

آخر اس رجحان کا نتیجہ یہ ہو گا کہ دیگر باتوں کے علاوہ ہندوستان میں جتھہ بندی اور جنگ جوئی بڑھ جائے گی۔ جب سے نو آبادیاتی تسلط کا سامنا ہوا ہے ہندوستان میں ایک طرف منظم تشدد اور دوسری طرف عدم تشدد کے درمیان مخالف سمتوں میں کھینچا تانی ہوتی آئی ہے۔ ایک طرف بال گنگا دھر تلک تھے اور ادھر

عدم تشدد کے حامی گاندھی تھے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی قومیت کے بازوئے شمشیر زن کو بی جے پی کی صورت میں جو فی الوقت برسراقتدار ہے تاہم امید کی جاتی ہے کہ آئندہ نہیں رہے گی مطلوبہ بالادستی حاصل ہو گئی ہے۔

آپ کے بارے میں بی بی سی کی دستاویزی فلم آئی ہے اس کا عنوان ہے "کہانیاں جو میرے ملک نے مجھے سنائیں" اس میں آپ نے یہ بتایا کہ ہر طرح کی تاریخی سچائیوں اور غلط اجھوٹی باتوں کو آپس میں ملایا جاتا ہے پھر اس میں اختلاف کی بنیاد پر آپ لوگوں کے اجتماعی جذبات کو منظم کرتے ہیں پھر اسے انتہا تک لے جاتے ہیں اور نفرت کی آگ بھڑکاتے ہیں؟

☆ جی ہاں! یہی ہو رہا ہے۔ اس دستاویزی فلم میں میں قوم پرستانہ نظریات کے بارے میں باتیں کر رہا تھا جن میں بالعموم یہ رجحانات پائے جاتے ہیں۔ بی جے پی اور اس کی حلیف جماعتوں میں جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں اس میں وشوا ہندو پریشد شامل ہے، شیوسینا ہے، سب سے بڑھ کر راشٹریہ سیوک سنگھ ہے یہ سب مل کر اکثریتی پارٹی کو یعنی آج ہندوستان کی دوسری سب سے بڑی پارٹی کو نظریاتی اختلاف کی انتہائی حد کی طرف دھکیل کے لے جا رہی ہیں۔ ہندو مسلمانوں سے مختلف ہیں عیسائی ہندوؤں سے مختلف ہیں سکھ ان سب سے مختلف ہیں۔ یہی باتیں انتہا پسندی پیدا کرتی ہے۔ اس طرح کی ظالمانہ روش پیدا کرتی ہیں جیسے ایک تاریخی مسجد کا انہدام یا فرقہ وارانہ بلوے جنہیں مختلف جگہوں پر ہوا دی گئی جنگ کا سبب بن جاتی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظریے کے طور پر قوم پرستی کے جذبے کو ایک وسیع اور ٹھوس شناخت درکار ہوتی ہے۔ آپ نے یہ بات کہی کہ "اگر آپ ایک اجتماعی شناخت کی تعمیر کرتے ہیں تو اس طرح تاریخ کو مسخ کر دیتے ہیں؟"

☆ اجتماعی شناخت کی تعمیر ہی نہیں اجتماعی شناخت کی تعمیر کے ساتھ دوسروں کی تکذیب بھی۔ ہم ایسے ہیں اور ویسے ہیں کیونکہ ہم اس طرح کے نہیں جیسے کہ وہ دوسرا ہے۔ ہم وہی ہیں جیسے ہم ہیں کیونکہ ہم مغرب والوں سے مختلف ہیں یا مسلمانوں سے مختلف ہیں یا ہندوؤں سے یا یہودیوں سے یا عیسائیوں سے مختلف ہیں۔ یہی بات تاریخ کو انتہائی حد تک مسخ کرنے کی طرف لے جاتی ہے۔

مثالیں لاتعداد ہیں۔ مثال کے طور پر آج کے ہندوستان میں مسلمانوں کی مغلوں کی حکمرانی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے ایسا تو کبھی بھی نہیں تھا۔ تاریخ داں یہ بتاتے ہیں کہ رئیسوں جاگیرداروں اور مغل سلطنت کے امرا میں اکثریت ہندوؤں کی تھی مسلمانوں کی نہیں۔ تاریخ داں یہ بھی بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کی حکمرانی کے پورے سات سو سالہ دور میں ہندوستانی مسلمان ہندوؤں سے زیادہ بدحال تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہندوؤں میں صاحب جائداد طبقے کے لوگ زیادہ تھے جبکہ مسلمان زیادہ تر اچھوتوں میں سے تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا تاکہ اس طرح مقابلتاً زیادہ آزادی اور برابری کا درجہ حاصل ہو جائے اس لئے کہ اسلام میں اصولی

طور پر ذات پات کا نظام موجود نہیں' لیکن آج کل ایسی تمام باتیں منع کی جا رہی ہیں۔ میں خاص طور پر کہوں گا اور اچھی بات ہے کہ ہندوستان کے انتہائی شہرت یافتہ تاریخ داں ہندوستان کے سلسلے میں اس طرح کے رجحانات کے خلاف نبرد آزما ہیں۔

وہ اسباب کیا تھے' جن کے تحت ہندوستان نے ایٹمی دھماکہ کرنے کا فیصلہ کیا؟

☆ سچ پوچھئے تو ہندوستان کا دوسری بار ایٹمی دھماکہ کرنا ایک ناسمجھی کی حرکت تھی اور پاکستان نے اس کی جو پیروی کی وہ بھی اتنی ہی ناسمجھی کی بات تھی۔ ہندوستان کے اس فیصلے کی توجیہہ بس اسی طرح ہو سکتی ہے کہ بی جے پی جس نوعیت کی قوم پرستی کی نمائندہ ہے' یہ اس کا مظاہرہ تھا۔ ان کے یہاں طاقت کا ہی تصور ہے' فوجی طاقت۔ اثر و رسوخ کا تصور یہ ہے کہ اسے طاقت سے حاصل کیا جائے' اس کے لئے طاقت کا مظاہرہ کیا جائے۔

مجھے یہ بالکل نہیں معلوم کہ پاکستان نے ایٹمی ہتھیاروں کی آزمائش کا جو فیصلہ کیا تو اس فیصلے میں کون سے عوامل کار فرما تھے؟ میرا خیال ہے وہ اس لئے یہ تجربہ کر رہے تھے کہ دوسری ایٹمی طاقتوں کے برابر ہو جائیں۔ انہوں نے ایٹمی دھماکہ اس امید پر کیا کہ احمقانہ امتیاز کے حامل بن جائیں' جسے "نیوکلیئر کلب" کا نام دیا گیا ہے۔ اس کلب کی رکنیت میں کون سے فائدے شامل ہیں' یہ بات میرے علم میں بلکہ کسی اور کے بھی دل میں نہیں اور اگر کسی کو معلوم ہے تو اس نے مجھ سے اس کی وضاحت نہیں کی۔

وہ تجربے لاحاصل کیوں تھے' اس کے کئی اسباب ہیں۔ ہندوستان اور چین کے درمیان 1962ء کی جنگ کے بعد تقریباً تیس سال تک چین سے تعلقات بہتر بنانے کی کوششیں ناکام ہوتی گئیں' اب ان کے درمیان دو طرفہ تعلقات بڑی تیزی سے بحال ہونے لگے تھے۔ ہندوستان اور چین کے سبھی ہمسایوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ ایشیا کی ان دو عظیم طاقتوں کے درمیان قریبی تعلقات تیسری دنیا کی تمام اقوام کے مفاد میں ہوں گے۔ یہ تعلقات اس درجے پر پہنچ گئے کہ چین کے صدر اور وزیر اعظم نے ہندوستان اور پاکستان کا دورہ کیا اور اس عرصے میں بہت سرگرم ہو گئے۔ وہ پاکستان آئے اور یہاں کی قیادت پر زور دیا کہ ہندوستان کے ساتھ صلح کر لیں' خواہ اس کے لئے بعض مسائل' جیسے کشمیر پر سمجھوتہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ گزشتہ دس سالوں میں' امور خارجہ میں ہندوستان کی یہ سب سے بڑی کامیابی تھی۔ بی جے پی کی قیادت نے ایک ہی دن میں اس کارنامے کو غارت کر دیا اور چین کو ایک بار پھر اپنا مخالف بنا لیا۔ پوکھران میں ایٹمی دھماکہ کرنے سے پہلے چین کے خلاف بہت لاف و گزاف ہوتی رہی۔ لیکن ہندوستان اسلحہ کی دوڑ میں چین کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہندوستان کے لئے ایسا کرنا تباہ کن ہوگا' جس طرح پاکستان اسلحہ کی دوڑ میں ہندوستان کے ساتھ نہیں چل سکتا۔

MashalBooks.org

دوسری بات یہ کہ نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد بھی اس ملک کی حالت اقتصادی طور پر حیران کن رہی۔گزشتہ چالیس پچاس برسوں میں اس کی اقتصادی ترقی کی شرح ساڑھے تین سے چار فیصد کے درمیان رہی ہے۔حالانکہ اس ملک کے انسانی اور مادی وسائل بے حد وحساب ہیں۔اس کی ایک انتظامیہ تھی' دفتری بندوبست بہت اچھا تھا' ایک اچھی فوج تھی اور ایک مضبوط ریاست تھی۔اقتصادی ماہر یہ جاننے سے قاصر رہے کہ ایسا کیوں ہے' پھر جیسا کہ سماجیات کے سائنس دانوں کا طریقہ ہے کہ جب کسی معاملے کا صحیح سبب معلوم نہیں ہوتا تو اس کا ایک مقولہ گھڑ لیتے ہیں۔اس کے لئے انہوں نے ''ہندو شرح افزائش'' کہنا شروع کر دیا۔گویا اس کا تعلق کسی تہذیبی صورت حال سے ہے۔لیکن گزشتہ سات برسوں میں ہندوستان نے اس ''ہندو شرح افزائش'' کا طلسم توڑ دیا اور اس کی ترقی کی شرح تیزی سے اوپر جانے لگی۔ یہاں تک کہ یہ شرح 1997ء میں 5، 7 فیصد اور 1998ء میں توقع کے مطابق سات فیصد تھی۔اس دھماکے نے' اس ایٹمی تجربے نے ہندوستان کو ایک بار پھر چار فیصد کی شرح پر پہنچا دیا۔انہوں نے اپنا نقصان کیوں کیا؟

تیسری بات یہ کہ ہندوستان علاقائی طاقت بننے کے لئے بہت پرجوش ہے۔ایک علاقائی طاقت کے سلسلے میں ایک بنیادی بات یہ ہے کہ ہمسایہ ممالک کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے ہوں۔اندر کمال گجرال کی حکومت بنگلہ دیش' سری لنکا اور نیپال کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے میں کامیاب رہی' یہ دھماکہ کرنے کے بعد علاقے میں ایک بار پھر ہیجان پیدا ہوگیا ہے اور ہمسایہ ممالک خوفزدہ ہوگئے ہیں۔

ہندوستان کے سیاسی مبصر جیسے پریم شنکر جھا ہندوستان کے اس عمل کا ذمہ دار پاکستان کو قرار دیتے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہندوستان نے ایٹمی تجربوں میں پیش قدمی اس لئے قبول کی کہ پاکستان نے درمیانی رینج کے غوری میزائل تیار کرنے کے بعد برصغیر میں طاقت کا توازن بدل دیا تھا۔وہ کہتے ہیں کہ میزائل کے نام ہی سے پاکستان کے جارحانہ عزائم کا پتہ چلتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ غوری کا تجربہ ایک غلطی تھی۔اس کی ضرورت نہیں تھی۔ پہلے اس کا نام حتف رکھا گیا تھا' جو انتہائی احمقانہ' ناقص اور ایک طرح سے اشتعال انگیز تھا۔دراصل یہ بھی تمام تر لاعلمی پر مبنی ہے۔غوری کا نام اختیار کرنے کا سبب بھی حکومت پاکستان اور اس کے عہدیداروں کی لسانی لاعلمی ہے۔

ہندوستان نے غوری سے بھی پہلے پرتھوی نام کا ایک میزائل پاکستان کی سرحد پر لا کھڑا کیا تھا۔پاکستان کے حکمرانوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ہندی میں پرتھوی کے معنی ''زمین'' کے ہوتے ہیں۔انہوں نے خیال کیا کہ یہ نام بارہویں صدی کے ہندو راجہ پرتھوی راج کے نام پر رکھا گیا ہے جس نے شہاب الدین غوری کے ساتھ جنگ میں اسے کئی بار شکست دی تھی لیکن بالآخر غوری کے ہاتھوں اسے شکست ہوئی۔چنانچہ انہوں نے قیاس کیا کہ ہندوستانیوں نے اپنے میزائل کا نام پرتھوی راج چوہان کے نام پر رکھا ہے' لہٰذا انہوں نے اپنے میزائل کا نام جو ہندوستان کے میزائل کے بعد آیا تھا' غوری رکھ دیا۔

MashalBooks.org

اس سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ ہمارا معاملہ زمانہ وسطیٰ کے ذہنوں سے ہے' جن پر مسخ شدہ تاریخ کے اثرات ہیں۔ پرتھوی راج چوہان شہاب الدین غوری کے ساتھ اس لئے جنگ نہیں کر رہا تھا کہ وہ ہندو تھا اور شہاب الدین غوری پرتھوی راج چوہان سے اس لئے جنگ آزما نہیں تھا کہ وہ مسلمان تھا۔ وہ سب زمانہ وسطیٰ کے حکمران' فاتح اور حملہ آور تھے۔ ایک طرف سے وہ حملہ آور ہوتے تھے' دوسری جانب بادشاہ ہوتے تھے' وہ زمین کے لئے علاقے فتح کرنے کی خاطر جنگ لڑتے تھے۔

شہاب الدین غوری' پرتھوی راج چوہان کے ساتھ جنگ کرنے سے پہلے آدھے درجن مسلمان حکمرانوں کو جو اس کے راستے میں آئے شکست دے چکا تھا۔ لیکن مسخ شدہ تاریخی کتب نے ازمنہ وسطیٰ کی ایک نئی تاریخ بنائی ہے۔ یہ ہندو تاریخ ہے اور مسلمان تاریخ ہے۔ یہ دونوں غلط فہمیاں ایک مسخ شدہ انداز نظر سے پیدا ہوئی ہیں۔ چنانچہ ایک طرف پرتھوی ہے اور دوسری طرف غوری۔ یہ سب وقتی اشتعال انگیزی پر مبنی ہے' لیکن اس سے زمانہ وسطیٰ کی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے اور ایک عمومی صورت حال ظاہر ہوتی ہے' جس میں پاکستانی اور ہندوستانی دونوں مبتلا ہیں۔

دوسری بات کہ جب پاکستانیوں نے غوری کا تجربہ کیا تو میزائلوں کی دوڑ پہلے سے ہی جاری تھی۔ ہندوستان نے پرتھوی نصب کر دیا تھا اور غوری سے بھی پہلے میزائل کا ایک اور ترقی یافتہ نظام اگنی کے نام سے تیار کر لیا تھا۔ آزاد صحافیوں کے لئے یہ بات مفید نہیں ہوگی کہ قوم پرستی کی وضع پر سوچیں۔ ہمیں اپنی بات یہ تسلیم کر لینے کے بعد شروع کرنی چاہیے کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں کے حکمران ازمنہ وسطیٰ کی جنگ جویانہ ذہنیت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں' وہ آج کے کلنٹنوں اور بشوں سے زیادہ جدید نہیں ہیں' طاقت محض فوجی دبدبے میں نظر آتی ہے۔ ساری دنیا میں صورت حال یہی ہے کہ ہم جدید زمانے میں زندہ ہیں اور ازمنہ وسطیٰ کے ذہن ہم پر مسلط ہیں' وہ سیاسی ذہن جو مسخ شدہ تاریخ میں پیوست ہیں۔

☆ مئی میں دھماکہ کرنے کے بعد نواز شریف نے کہا تھا کہ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا تھا' چنانچہ ہمیں کھیل کے میدان کو ہموار کرنا پڑا۔ آپ کے خیال میں کیا واقعی پاکستان کے پاس کوئی راستہ نہ تھا؟

۔یقیناً اس کے سوا چارہ کار تھا۔ اس بات کی شہادت ہمارے پاس موجود ہے کہ جوہری تجربے کے بعد ہندوستان کے رہنما یہ سوچ کر پریشان ہو گئے کہ اگر پاکستان نے دھماکہ نہ کیا تو پھر وہ بہت ہی برے بن جائیں گے۔ ہندوستان کے وزیر خارجہ نے کہا کہ پاکستان کو جنوبی ایشیا میں اب اپنی حیثیت پر غور کر لینا چاہیے کیونکہ طاقت کا توازن بدل چکا ہے۔ وزیر داخلہ ایل کے اڈوانی نے کہا کہ ہم پاکستان میں داخل ہونے جا رہے ہیں' اس کے بعد کشمیر کے وہ حصے جو پاکستان کے قبضے میں ہیں' ان کو واپس لے لیں گے۔ اٹل بہاری واجپائی نے کہا: "علاقائی حیثیت کا تناسب بدل گیا ہے۔ پاکستانیوں کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے۔" اس طرح

MashalBooks.org

کے اشتعال انگیز بیانات ہر روز آ رہے تھے۔ کشمیر کی سرحد پر کچھ جھڑپیں بھی شروع ہو گئی تھیں۔ بہرحال اس طرح کی اشتعال انگیزی کا جواب دینا ایک ذمہ دارانہ قیادت کا کام نہیں ہے۔ اس وقت میں نے دلیل کے ساتھ کہا تھا کہ دھماکہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مشتعل ہونے کی صورت میں ہم واقعتاً اس بات کی تصدیق کریں گے کہ جو دنیا میں بیشتر نسل پرست کہتے آئے ہیں کہ ہم جوہری اسلحہ بنانے کے اہل نہیں ہیں۔ یہ مضحکہ خیز بات مجھے نہیں معلوم کہ یہاں میں کس طرح سے بات کروں۔ میں جوہری ہتھیاروں پر یقین نہیں رکھتا لہٰذا سب سے پہلے تو میں اس بات پر یقین کرتا ہوں کہ محض اس بنا پر کہ ہندوستان کے پاس جوہری ہتھیار ہیں، پاکستان کو جوہری ہتھیار رکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں یک طرفہ طور پر اس بات کا قائل ہوں کہ جوہری اسلحہ کی دوڑ میں ہندوستان کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیے، یہ تو ہوئی ایک بات۔

دوسری بات یہ کہ بالفرض میں اس پر یقین نہیں رکھتا اور چند منٹ کے لئے مان لیا جائے کہ ایک پاکستانی پالیسی ساز کی طرح سوچ رہا ہوں تو بھی میں یہی کہوں گا کہ آخر کیوں؟ پاکستان ایک چھوٹا ملک ہے۔ اس میں جوہری دھماکہ کرنے کی اہلیت ہے، ہندوستان کو یہ بات پچھلے دس برس سے معلوم ہے کہ پاکستان کے پاس یہ اہلیت ہے۔ دنیا بھر کو معلوم ہے کہ پاکستان کے پاس جوہری دھماکہ کرنے کی اہلیت ہے۔ لہٰذا ایک نسبتاً چھوٹی طاقت کے لئے بہترین بات یہی ہے کہ اپنی اس اہلیت کی نمائش نہ کرے، وہ اس سلسلے میں خاموش رہ سکتا تھا اور یقیناً یہ بات زیادہ موثر ہوتی۔

نواز شریف نے دھماکہ کرنے سے پہلے علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھا تھا:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

اقبال یا صوفیانہ فکر کی تذلیل اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ پاکستان کا وزیراعظم جوہری اسلحہ کا دھماکہ کرنے کو اور اس سے پہلے اپنے اس فیصلے کے اعلان کو کار عشق قرار دیتا ہے۔ اس کا مقابلہ میرے جیسے لوگوں کے دلائل سے کیجئے، جو برابر کہتے رہے: معقولیت کا تقاضا ہے کہ آپ ایسا نہ کیجئے۔ جوہری بم کو الوہیت کے درجے پر فائز کرنا، اعلیٰ اخلاقیات کی سطح پر لے جانا، تصوف اور صوفیانہ عمل کے درجے پر پہنچانا، صریحاً بے ہودگی ہے، یہ بے ہودگی ہے اور مجھے یقین ہے کہ پاکستان کے وزیراعظم اس سے بخوبی آگاہ نہ تھے لیکن بہر طور یہ قابل مذمت ہے۔

☆ نواز شریف نے کہا ہے کہ ان کے خیال میں کہ شریعت کا نفاذ پاکستان کے لئے بہت اچھا ہوگا، کیا آپ کو اس سے اتفاق ہے؟

ہرگز نہیں۔ میں نے تو اسی وقت اس کے بارے میں لکھا تھا، جب انہوں نے آئین میں پندرہویں ترمیم کی تجویز پیش کی تھی۔ میں نے یہ دلیل دی تھی کہ موجودہ دور میں اسلام کی حیثیت پاکستان میں اور دیگر

MashalBooks.org

مسلم ممالک میں کمزور اور بد قماش حکومتوں اور حکمرانوں کے لئے ایک پناہ گاہ کی سی ہے۔ جب بھی انہیں خطرہ محسوس ہوتا ہے' وہ اسلام کو اپنی پٹاری سے نکالتے ہیں اور اسے ایک سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ یہی کام نواز شریف کر رہے ہیں۔ حکومت میں آئے ہوئے انہیں دو سال ہو گئے۔ انہوں نے جوہری ہتھیار کا تجربہ کیا لیکن پاکستان کے تحفظ کی صورت حال بہتر نہیں ہوئی۔ ہندوستان کے ساتھ ہمارے تنازعے حل نہیں ہوئے۔ انہوں نے افغانستان میں طالبان کو مدد دی جس کی وجہ سے ایران سے ہمارا تنازع پیدا ہو گیا۔ گویا ہمیں ایک اور دشمن ہمسایے کی ضرورت تھی۔ ان حالات میں وہ پٹاری کھول کر اسلام نکالتا ہے اور اسلامیانے (اسلامائیزیشن) کا عمل شروع کر دیتا ہے۔ یہ مذہب کا عجیب و غریب استعمال ہے اور ایسے مقاصد کے لئے جو غیر اخلاقی ہے۔

☆ پاکستان کے باشندوں میں عدم تحفظ کا جو گہرا احساس پایا جاتا ہے' اس کی تہہ میں کیا چیز کارفرما ہے؟

دھماکوں کے بعد لوگوں نے سڑکوں پر نکل کر جو مظاہرے کئے' اسی سے اس احساس کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ پاکستانیوں میں عدم تحفظ کا احساس اپنی جگہ لیکن میں یہاں دو باتوں کی وضاحت کروں گا۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں ایٹمی تجربوں پر خوشی کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس معاملے میں پاکستان کے لوگ ہندوستانیوں سے کچھ مختلف نہیں تھے۔ دوسری بات یہ کہ دونوں ملکوں میں لوگوں کی ایک نہایت معمولی اقلیت نے خوشی ظاہر کی تھی۔ پاکستان کے سلسلے میں تو میں اس حقیقت کا شاہد ہوں کہ ان کے یہاں 29 مئی کے ایٹمی دھماکے کے بعد تین دن تک ٹی وی پر جو تصویریں دکھائی گئیں' وہ مغربی میڈیا کی تصویروں کے لئے ایک لقمہ تھی' جو ایسے مواقع کے منتظر رہتے ہیں۔ ان تصویروں میں سے ایک جسے آپ نے ٹی وی پر سی این این سمیت اکثر دیکھا ہوگا' اس کے بارے میں تو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ کیسے بنائی گئی۔ عالمی میڈیا نے اس دن تک جب 29 مئی کی سہ پہر کو پاکستان میں ایٹمی دھماکے کا اعلان ہوا تھا' ہمارے یہاں ورود نہیں کیا تھا۔ دوسری صبح نیوز کانفرنسوں کے بعد جن میں حکام نے میڈیا سے خطاب کیا' سرکاری ایجنٹ اسلام آباد کی آبپارہ مارکیٹ میں دوڑ بھاگ کرنے لگے۔ دکانداروں سے انہوں نے کہا کہ دکانیں بند کرو اور بم کی حمایت میں سڑک پر نکل آؤ۔ یہ دوڑ بھاگ کرنے والے پولیس کے عہدیدار تھے۔ غالباً پچاس ساٹھ افراد اکٹھا ہوئے' ان کے ہاتھوں میں گلدستے پکڑائے گئے۔ دو آدمی لپک کر حلوائی کی دکان پر گئے' ڈھیروں مٹھائی خریدی اور تقسیم کرنی شروع کر دی۔ دوسرے بھی سرکاری ملازم تھے' پھر انہوں نے کیمرہ والوں سے کہا کہ اب تم لوگ تصویریں بناؤ۔ یہ تھا اسلام آباد کا مظاہرہ۔ بے ساختہ خوشی کا اظہار نہ تو میں نے اسلام آباد میں دیکھا نہ راولپنڈی میں۔

ایک ہفتے بعد نواز شریف لاہور گئے۔ وہاں ان کی پارٹی مسلم لیگ نے ان کے اور اسی طرح بم کے خیر مقدم کی خاطر ایک عام مظاہرے کا سرکاری طور پر اہتمام کیا۔ یہ سارا انتظام سرکاری تھا' مظاہرہ سرکاری طور

MashalBooks.org

پر کیا گیا تھا‘ جس کا علم مغربی میڈیا کو نہیں تھا یا وہ اسے سمجھ نہیں سکے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہی صورت ہندوستان میں بھی تھی‘ لیکن اگر ایسا ہی رہا ہو تو مجھے اس پر حیرت نہیں ہوگی۔

ہندوستان کے لوگ اور پاکستان کے لوگ بھی یہاں تک کہ وہ بھی جنہیں خوشی محسوس ہوئی‘ جانتے تھے کہ یہ نہایت سنجیدہ معاملہ ہے‘ ایسا نہیں کہ اس پر جشن مناتے پھریں۔ یہ جشن منانے کا موقع نہیں تھا۔ 1998ء میں دونوں ملکوں میں ہیروشیما ڈے کے موقع پر زبردست مظاہرے دیکھنے میں آئے تھے۔ ہندوستان میں مظاہرے پاکستان کے تناسب سے زیادہ ہوئے تھے۔ کلکتے میں ایٹمی اسلحہ کے خلاف ڈھائی لاکھ افراد سڑک پر نکل آئے۔ ریلی میں مظاہرین کی تعداد انیس ہزار تھی۔

اب پاکستان میں عدم تحفظ کے معاملے کی طرف آتے ہیں۔ یہ ملک متعدد اسباب کی بنا پر خود کو غیر محفوظ سمجھتا ہے۔ میرا خیال ہے‘ سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ یہ ملک ہندوستان کی تقسیم سے پیدا ہوا۔ وہ بہت سے مسائل جو تقسیم کے ساتھ جڑے ہوئے تھے‘ اب تک حل نہیں ہوئے۔ ان میں سے ایک کشمیر ہے۔ اس سے یہ عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان نے پاکستان کے وجود کی حقیقت کو تسلیم نہیں کیا۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے‘ مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ ہندوستان نے تقسیم کی حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے اور انہوں نے بھی جو بین الاقوامیت پر یقین رکھتے ہیں۔

دوئم یہ کہ جب بنگلہ دیش نے علیحدگی اختیار کی تو یہ ملک تقسیم بھی ہوا۔ اس سے یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ غالباً یہ سب کچھ حتمی نہیں ہے۔ آخر میں یہ بات کہ استحکام کا احساس فروغ نہیں پا سکا۔ پچاس سال میں سے پچیس سال فوجی حکومت کے تحت گزر گئے اور باقی پچیس سال ان سول حکومتوں کے تحت جو نہایت غیر مستحکم‘ انتہائی کرپٹ اور حد درجہ نکمی تھیں۔ لوگ اسی غیر یقینی کے عالم میں جی رہے تھے۔ ان کا مخالف ایک بڑا ہمسایہ تھا‘ جسے ہندوستان کی تاریخ نے لا کھڑا کیا تھا۔ لہٰذا اب تک یقین نہیں تھا کہ ان کی حیثیت حتمی ہے بھی یا نہیں‘ چنانچہ وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ رہے تھے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے جس کے تحت مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں ایٹمی اسلحہ رکھنے سے بچنا چاہیے تھا۔

☆ ہندوستان کی ایک بھاری مسلم آبادی مادی اور نفسیاتی طور پر کن حالات میں زندہ ہے‘ اس کے بارے میں بتایئے۔ ان کے احساس قومیت کا عالم کیا ہے‘ خاص طور پر حالیہ فرقہ پرستی کے ماحول میں؟

میرا خیال ہے کہ 1947ء میں ہندوستان کی تقسیم سے ہندوستانی مسلمانوں کا تشخص بری طرح ہل گیا۔ ان میں سے بہت سوں کو پاکستان اور اس کے قیام سے ہمدردی تھی۔ اب وہ اس ذہنی خلفشار کا شکار ہو گئے کہ ، یہ کیا ہوا اور ان کی حیثیت اب کیا ہے؟ اب پچاس سال گزرنے کے بعد ہندوستان کے مسلمان حیرت انگیز طور پر، اور اسے گاندھی اور نہرو کے سیکولر خیالات کی بہت بڑی کامیابی سمجھنا چاہیے کہ خود کو پوری طرح ہندوستانی سمجھنے لگے ہیں۔ اس بڑھتی ہوئی بنیاد پرستی کی بنا پر وہ خود کو غیر محفوظ تو کہتے ہیں‘ لیکن وہ

MashalBooks.org

ہندوستانی تو پھر بھی ہیں' کوئی غیر نہیں ہیں۔ دوسروں سے مختلف نہیں ہیں' کوئی باہر سے آئے ہوئے نہیں ہیں' کچھ اس طرح کے لوگ نہیں ہیں جو کہیں اور جانے کے بارے میں سوچیں۔ سزا اور جزا سب کچھ یہیں ہے' یوم حساب یہیں پر ہوگا۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے، اور یہ ہے ان کے اندر (ہندوستانیت) کا احساس' جو نہایت اثر انگیز ہے۔

ہندوستانی مسلمان یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے اور اپنی اس حیثیت کے لئے وہ ڈٹ کر کھڑا ہو سکتا ہے اور لڑ سکتا ہے۔ یہ ایک نہایت اہم کامیابی ہے' میرا خیال ہے' یہ انڈین نیشنل کانگریس اور گاندھی اور نہرو کی قیادت کا ایک کارنامہ ہے' جسے لوگ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ یہ مسلمانوں کی قیادت کا بھی کارنامہ ہے' جو ہندوستان میں ڈٹے رہے اور جنہوں نے پاکستان کے تصور کی مخالفت کی' ابوالکلام آزاد کی طرح کے لوگ۔

☆ لیکن اس قیادت میں مولانا اور مولوی بھی شامل تھے؟

مسلمانوں کے مذہبی طبقے نے بالعموم تحریک پاکستان کی حمایت نہیں کی' ستم ظریفی یہ ہے' اگرچہ یہ درست کہ اسی طرح 1920ء اور 1930ء کی دہائیوں میں یہودی علما نے صیہونی تحریک کی حمایت نہیں کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ یہودیت کے تصور سے یہ دشمنی ہوگی اور یہودی ہونے کا جو عالمگیر تصور ہے اس کے منافی ہوگا۔

☆ لیکن آج پاکستان میں مسلمان بنیاد پرست پارٹیاں یقینی طور پر قوم پرست ہیں؟

میں نہیں سمجھتا کہ انہیں (قوم پرست) کہا جا سکتا ہے۔ یہ ریاستی اقتدار پر قبضہ کرنے کے درپے ہیں۔ ان معنوں میں یہ قوم پرست ہیں' لیکن ہم اس لفظ کو جس مفہوم میں استعمال کرتے ہیں' اس کے لحاظ سے نہیں۔ یہ پین اسلامسٹ ہیں۔

☆ اور وہ دینی ریاست قائم کرنا چاہتی ہیں؟

وہ پہلے قوم کے طور پر پاکستان میں مذہبی ریاست قائم کرنا چاہتی ہیں' پھر اس کے بعد کہیں اور۔ آج کی اسلامی دنیا میں جو مذہبی تحریک کی ایک عام لہر اٹھی ہے اور جسے زبردست اعانت افغانستان میں امریکہ کی بدولت حاصل ہوئی اور اس میں اسلحہ کا استعمال شامل ہوا' یہ سب اس عام تحریک کا ایک حصہ ہے۔

افغانستان میں جو کچھ ہوا' اس پر مغرب میں بحث و تمحیص نہیں ہوئی' جب سوویت یونین نے افغانستان میں مداخلت کی تو امریکہ کو اس میں دوگونہ مقاصد نظر آئے۔ اول روس کو افغانستان میں ویت نام جیسی جنگ میں پھنسا دینا' دوئم انہیں یہ دکھائی دیا کہ اس موقع سے ساری مسلم دنیا کو اشتراکیت کے خلاف صف آرا کیا جا سکتا ہے۔ امریکی ہرکاروں نے ساری اسلامی دنیا میں گھوم پھر کر افغانستان میں جہاد کرنے والوں کی بھرتی شروع کر دی۔ یہ جہاد کا سارا قصہ بین الاقوامی سطح پر مسلح جدوجہد کے طور پر دسویں صدی

MashalBooks.org

عیسوی کے زمانے کے بعد سے اپنا وجود نہیں رکھتا۔ امریکی کوششوں سے اسے واپس لایا گیا' دوبارہ زندہ کیا گیا اور بین الاقوامیت کا رنگ دیا گیا۔ میں نے انہیں دیکھا' جہاز میں بھر بھر کے چلے آ رہے ہیں' الجزائر سے سوڈان اور سعودی عرب سے' مصر' اردن اور فلسطین سے ان لوگوں کو باضابطہ طور پر لایا گیا۔ انہیں ایک نظریہ دیا گیا۔ انہیں بتایا گیا کہ یہ مسلح جدوجہد ایک کارِ خیر ہے' اس طرح جہاد کے پورے تصور نے بین الاقوامی سطح پر ایک اسلامی دہشت گرد تحریک کی صورت میں جنم لیا۔ امریکہ نے ہمارے زمانے کے اسامہ بن لادن جیسوں کو تیار کرنے میں آٹھ بلین ڈالر خرچ کئے تھے' وہ کیمپ جس پر انہوں نے حملہ کیا' اسے میں نے 1986ء میں دیکھا تھا۔ اس کیمپ کو سی آئی اے چلا رہا تھا۔

پھر سوویت روس افغانستان سے چلا گیا' لیکن کمیونزم تو ابھی زندہ تھا' لہٰذا ان لوگوں کے لئے امریکہ کی امداد جاری رہی۔ 1990ء میں سوویت یونین کا خاتمہ ہو گیا۔ اب 1991ء سے ایک نئی صورت حال پیدا ہوئی۔ امریکہ نے ان لوگوں پر بھروسا کرنا چھوڑ دیا۔ اس سے بھی خراب بات یہ ہوئی کہ امریکہ منشیات کے معاملے میں حرکت میں آ گیا۔ 1980ء کی دہائی میں افغانستان اور پاکستان منشیات کی تجارت کے سب سے بڑے مراکز بن گئے تھے۔ وہ بہت سے لوگ جو سی آئی اے کی مدد کر رہے تھے' وہ بھی منشیات کی تجارت میں شریک ہو گئے۔ لیکن امریکہ کو اب ان کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ چنانچہ اس نے پاکستان کی حکومت اور ترکی اور سعودی عرب کی حکومتوں پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ ان گروپوں کو جو پہلے امریکہ کے ساتھ مل کر کام کر رہے تھے' ختم کر دیں۔ اس طرح ان لوگوں کے ساتھ دہری بدعہدی ہوئی۔ ایک تو حسبِ وعدہ مدد دیتے رہنے میں ناکامی ہوئی' دوسرے پرانے دوستوں سے ہی دشمنی کی جانے لگی۔

☆ یہ کون لوگ ہیں؟

یہ سب وہ لوگ ہیں' جن کے رابطے افغانستان سے اور سی آئی اے سے ہیں۔ یہ قبائلی لوگ بھی ہیں۔ قبائلی لوگوں کا ایک قبائلی ضابطہ کار ہوتا ہے اور اس میں دو باتوں کی حیثیت مرکزی ہوتی ہے' وفاداری اور انتقام۔ قبائلی اخلاقیات' وفاداری اور انتقام کے تصور پر قائم ہیں۔ جب آپ کے دوست نے جس کے ساتھ آپ وفادار رہیں' آپ کو دھوکہ دیا تو آپ انتقام ضرور لیں گے۔ اس بنیاد پر کہ یہ لوگ وفادار تھے اور ان کے ساتھ بدعہدی کی گئی' ان کے پاس خفگی کا خاصا مواد موجود ہے۔

دوسری بات یہ کہ ان کے ذہنوں کو اس طرح تیار کیا گیا اور تربیت دی گئی اور مسلح کیا گیا کہ غاصبانہ قبضہ کرنے والوں' غیر ملکی غاصبوں کے خلاف دہشت گردی اور خون ریز جنگ لڑیں۔ افغانستان میں یہ غاصب سوویت یونین تھا۔ چنانچہ اسامہ بن لادن نے وہی مشن جاری رکھا ہے' جس کے لئے اس نے اب سے پہلے امریکہ سے عہد کیا تھا۔ اب وہ امریکہ کے خلاف جنگ آزما ہے کیونکہ اس کے نقطہ نظر سے اب امریکہ نے اس کی سرزمین پر قبضہ کر رکھا ہے۔ یہ ہے سارا قصہ۔ اس نے شعور کی آنکھ کھولی تو یہ دیکھا کہ

MashalBooks.org

سعودی عرب کو مغرب کی تجارتی کارپوریشنیں اور مغربی طاقتیں بری طرح لوٹ رہی ہیں۔ اس نے ان سعودی شہزادوں کو دیکھا' اس نے ایک خاندان کے تابع ریاست پر نظر ڈالی جو عرب عوام کے تیل کے وسائل کو مغرب کے حوالے کر رہی ہے۔ 1991 تک اسے بس اس قدر اطمینان میسر تھا کہ اس کے ملک پر قبضہ نہیں ہوا۔ سعودی عرب میں امریکی' فرانسیسی یا برطانوی فوجی دستے نہیں دیکھے تھے لیکن خلیج میں جنگ کے دوران اور اس کے بعد جو کچھ ہوا' اس کو دیکھ کر وہ رہا سہا اطمینان بھی جاتا رہا۔

اسلامی تحریک کے تمام شہ زوروں کی تربیت' وہ جہاں کے بھی ہوں' افغانستان میں ہوئی۔ سی آئی اے کے لوگ ان کو اسلامی "بلو بیک" (شہ زور) کہتے ہیں۔

☆ آپ کے خیال میں ایسا کیوں ہے کہ مغرب اسلام کو اپنا دشمن سمجھتا ہے؟

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد مغرب کو اپنے گردوپیش کوئی ایسا خطرہ نہیں نظر آیا جس کی اساس پر وہ اپنی پالیسیاں مرتب کرتا۔ تمام طاقتیں' تمام شاہی طاقتیں' خاص طور پر جمہوری طاقتیں' محض اپنے لالچ کی بنیاد پر طاقت کے استعمال کو جائز نہیں منوا سکتیں۔ اسے (طاقت کےادر استعمال کو) کون جائز کہے گا۔ لہٰذا انہیں دو چیزیں درکار تھیں۔ ایک ہیولہ' دوسرا کوئی مشن' برطانیہ نے سفید فام نسل کا بوجھ خود اٹھا لیا۔ یہ ان کا مشن تھا۔ امریکیوں نے پہلے تو اسے "بدیہی صداقت" کہا' پھر اسے جان ایف کینیڈی کے بلند آہنگ الفاظ میں اپنا مشن حاصل ہو گیا' یعنی دنیا کی آزادی کے حصار پر کھڑے ہو کر پہرہ دینا۔ انہیں لڑنے کے لئے اپنے مخالف مل گئے' سیاہ فام' زرد اقوام اور آخر میں سرخ خطرہ۔ پہلے تو ایک بھوت ہی تھا' پھر ایک مشن مل گیا۔ لوگوں نے اسے قبول کر لیا۔

اب امریکہ بھوت اور مشن دونوں سے محروم ہو چکا ہے۔ چنانچہ مشن نے اب حقوق انسانی کا قالب اختیار کر لیا ہے۔ یہ ایک عجیب و غریب مشن ہے' ایک ایسے ملک کے لئے جو تقریباً ایک سو برس سے آمریت کو امداد دیتا آیا ہے۔ پہلے لاطینی امریکہ میں' اس کے بعد ساری دنیا میں۔ اب خطرے کی تلاش میں' وہ اسلام کی طرف پلٹ پڑا۔ یہ تو سب سے آسان ہے کیونکہ مغرب کو جس مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ الجزائر' مصر' فلسطین' ایران کا انقلاب اور پھر یورپ کا ایک حصہ۔ عجیب جگہ پر واقع ہے کہ یہ مغرب کے لئے تیل کے ذخیرہ تک رسائی کا وسیلہ ہے۔

☆ افغانستان کے طالبان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

طالبان رجعت پسندوں کا ایسا گروہ ہے کہ ان کی مثال ملنا غیر ممکن ہے۔ میں نے افغانستان میں دو ہفتے گزارے' ایک دن اس مکان سے جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا' ڈھول کے ساتھ دوسری آوازیں سنائی دیں۔ میں لپک کر یہ دیکھنے کے لئے پہنچا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟ وہاں ایک لڑکے کو دیکھا' جو بمشکل بارہ سال کا رہا ہوگا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا۔ اس کے گلے میں ایک رسی بندھی ہوئی تھی۔ وہی رسی پکڑ کر اسے کھینچا جا رہا تھا۔

MashalBooks.org

ایک آدمی اس کے پیچھے کھڑا ڈھول پیٹ رہا تھا۔ وہ ڈھول کو آہستہ سے بجا رہا تھا۔ میں نے پوچھا:

''لڑکے نے کیا کیا ہے؟''

لوگوں نے بتایا کہ اسے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔

''کیا کر رہا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ ٹینس کی گیند کھیلتا ہوا پکڑا گیا ہے۔''

میں طالبان کے ایک لیڈر سے ملاقات کرنے کے لئے چل پڑا۔ اس نے کہا:

''ہم نے لڑکوں کو گیند کھیلنے سے منع کر دیا ہے' کیونکہ اس طرح انہیں دیکھ کر مردوں کو خواہ مخواہ ترغیب ملتی ہے۔''

تو یہی ہے وہ منطق' جس کی رو سے وہ عورتوں کو برقع کے اندر اور گھر کی چار دیواری میں بند کر دیتے ہیں اور لڑکوں کو کھیلنے سے روک دیتے ہیں' یہ ایک طرح کا پاگل پن ہے۔

یہ لوگ عورتوں کے مخالف' موسیقی کے مخالف اور خود زندگی کے مخالف ہیں اور امریکہ کے چند اعلیٰ ترین عہدیدار ان سے ملاقات کرنے آتے ہیں اور ان سے گفتگو کرتے ہیں۔ عام تاثر یہ ہے کہ امریکہ ان کی حمایت کر رہا ہے۔

☆ امریکہ آخر ایسا کیوں کرے گا؟

جب سوویت روس ٹوٹ پھوٹ گیا تو اس کی وفاقی جمہوریتیں آزاد ہو گئیں۔ وسط ایشیا کی جمہوریتیں' جن میں آبادی کی اکثریت مسلمان ہے' تیل اور گیس کے ذخائر سے مالا مال ہے۔ ان کی گیس اور تیل کی لائن سوویت یونین سے گزرتی تھی۔ اب ایک نیا کھیل شروع ہوتا ہے۔ یہ تیل اور گیس باہر کی دنیا تک کیسے پہنچے؟ اس مرحلے پر امریکہ کی کارپوریشنیں داخل ہوتی ہیں۔ ٹیکساکو' یونوکل' ڈیلٹا آئل' یہ سب تیل اور گیس کے ذخائر پر قبضہ کرنے کے لئے وسط ایشیاء میں پہنچ رہی ہیں وہ کوئی پائپ لائن ایران کی طرف لے جانا نہیں چاہتیں' کیونکہ فی الحال ایران کا بائیکاٹ ہے۔ وہ امریکہ کا دشمن ہے' چنانچہ اب افغانستان اور پاکستان وہ جگہیں ہیں جہاں آپ پائپ لائن بچھا سکتے ہیں اور روسیوں کو یہاں سے خارج کر سکتے ہیں۔ ذرا یہ خبر ملاحظہ کیجئے۔ صدر کلنٹن نے ازبکستان' قازقستان' تاجکستان اور آذربائیجان کے صدور سے ٹیلی فون پر ذاتی طور پر بات چیت کی ہے اور ان پر زور دیا ہے کہ پائپ لائن بچھانے کے سمجھوتے پر دستخط کر دیں۔ اس کھیل میں پاکستان اور امریکہ دونوں اس کاروبار میں یہ کہتے ہوئے شریک ہوتے ہیں کہ پائپ لائنوں کی حفاظت کے لئے سب سے زیادہ معتمد کون ہو سکتا ہے اور وہ انتخاب کرتے ہیں' سب سے زیادہ خونیں اور سب سے زیادہ جنونی اسلامی بنیاد پرست گروہوں کا' کہ وہ پائپ لائن کے تحفظ کی ضمانت دیں۔

اس صورت حال میں امریکہ کو اس سے غرض نہیں کہ بنیاد پرست کون ہے اور ترقی پسند کون؟

عورتوں سے اچھا سلوک کون کرتا ہے اور برا سلوک کون؟ بات صرف اتنی سی ہے کہ تیل اور گیس کے وسائل کا تحفظ کون بہتر کر سکتا ہے۔

☆ بنیاد پرستی کے ابھار کے پس پردہ کون سی طاقت ہے؟ صرف اسلامی دنیا میں نہیں بلکہ امریکہ، اسرائیل اور سری لنکا میں بھی ان تحریکوں کو طاقت کہاں سے ملتی ہے؟

اس کے بہت سے اسباب ہیں، ایک تو ایک ساتھ رہنے والی آبادی سے خوف اور اس کے ردعمل کا اندیشہ۔ معیشت کی عالمگیر گرفت (Globalisaton)، جدید ٹیکنالوجی کے نتیجے میں زمین کا تنگ ہوتے جانا، مشترکہ ذوق اور ذائقے پیدا کرنے کے سلسلے میں ذرائع ابلاغ کی طاقت... ہر شخص میکڈونلڈ کے برگر کھا رہا ہے اور جینز پہن رہا ہے۔ ان ساری چیزوں نے مل جل کر بہت سے لوگوں میں اضطراب پیدا کر دیا ہے کہ جیسے خود ان کی زندگی سے بہت کچھ نکلتا جا رہا ہے۔ لوگوں کی اس بے چینی کو دائیں بازو کے نظریہ ساز یہ کہہ کر استعمال کرتے ہیں: "ہمارے پاس آؤ، ہم تمہیں پرانے دور کا مذہب واپس دلا دیں گے۔ ہمارے پاس آؤ، ہم تمہیں تمہارے سارے پرانے طور طریقے اور یادداشتیں واپس دلا دیں گے۔" اور وہ لوگ جنہیں کچھ زیادہ علم نہیں ہوتا، ان کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔

ایک دوسرا سبب بھی ہے وہ ہے جدیدیت سے مایوسی۔ خوش فہمی کا خاتمہ، اس زندگی سے جس کی ساخت ہمارے زمانے میں ہوئی ہے۔ یہ زندگی بالکل کھوکھلی اور بے معنی لگتی ہے۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خاندان ٹوٹ رہے ہیں، لیکن جو قربتیں میسر تھیں اب ان کا کوئی بدل نہیں مل رہا ہے، وہ آرام، زندگی کو وہ تحفظ میسر نہیں۔ یہ وہ تبدیلیاں ہیں جو ٹیکنالوجی سے پیدا ہوئیں اور اس سرمایہ داری کے نتیجے میں آئیں جس نے انسانی زندگی کے ہر پہلو میں ایک ہشت پائے کی طرح اپنے پنجے گاڑ دیئے ہیں۔ بہت سے معاملوں میں اشتہار دینے والے یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم کس رنگ کا انڈرویئر پہنیں۔ یہاں تک کہ ہم اپنی بیویوں اور محبوباؤں کی طرف جنسی پیش قدمی کس ڈھب سے کریں۔ ایک بار جب یہ شروع ہو جائے تو لوگ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ وہ اپنا نجی حق خود اختیاری کھو چکے ہیں۔ اس حق خود اختیاری کی تلاش میں ہم کوئی ربط متعین اور انوکھا طریقہ ڈھونڈتے ہیں، جو ہمیں اپنے وجود سے جوڑ دے۔ پرانے زمانے کا مذہب اس طریقے کی پیش کش کرتا ہے۔ نئے وقت کا مذہب بھی یہ طریقہ پیش کرتا ہے۔

☆ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذرائع ابلاغ میں بنیاد پرستی کے ناقد و نکتہ چین اپنا ہدف بناتے وقت اپنی صوابدید سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ سعودی عرب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

یہ خاصا دلچسپ مسئلہ ہے۔ سعودی عرب کی اسلامی حکومت اسلام کی تاریخ میں طالبان کی آمد سے پہلے تک سب سے زیادہ بنیاد پرست تھی۔ مثال کے طور پر ایران میں آج کل عورتیں گاڑی چلاتی ہیں۔ سعودی عرب میں گاڑی نہیں چلا سکتیں۔ آج بھی ایران کے دفاتر میں مرد اور عورتیں ساتھ ساتھ کام کر سکتے

ہیں ۔سعودی عرب میں اس طرح نہیں کر سکتے ہیں۔ سعودی عرب ایران سے کہیں بدتر ہے لیکن وہ 1932ء سے امریکہ کا حلیف چلا آ رہا ہے لہٰذا اس پر کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ لیکن اس معاملے میں اور بہت سی باتیں بھی شامل ہیں۔ سرد جنگ کے زمانے میں جس کا آغاز 1945ء سے ہوا امریکہ نے اسلامی دنیا کی کمیونسٹ پارٹیوں کا توڑ کرنے کے لئے ایک شوریدہ سر اسلام کو اپنے لئے مفید پایا۔

☆ آپ نے نو آبادیاتی دور کے بعد کی ریاستوں کے لئے ایک اصطلاح وضع کی ہے "طاقت کی اضطراری کیفیت" اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟

میری مراد اس حقیقت سے ہے کہ تیسری دنیا کے سیاست دان اور ادارے، وہ افراد جو مقتدر ہوتے ہیں اور ادارے جنہیں وہ چلاتے ہیں بالعموم اپنے اختیارات کا اظہار منطقی اور معقول پیرائے میں نہیں کرتے۔ مثلاً صدام حسین چاہتا ہے کہ ٹائپ رائٹر کے استعمال پر لائسنس لگا دیا جائے یہ ہے طاقت کی "اضطراری کیفیت"۔ یہ وہی بات ہے جس سے کسی انسانی رویے کا فطری اظہار نہیں بلکہ کسی بیماری کسی گہرے مرض کا اظہار ہو رہا ہے۔ معمول کے طرزِ عمل سے ایک بالکل مختلف رویہ۔

سعودی عرب یونیورسٹیاں کھول رہا ہے یہ ایک اچھی بات ہے لیکن طلبہ جب آپس میں مل رہے ہوں اور باتیں کر رہے ہوں تو یہ دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتا ہے کیونکہ اگر وہ ایک دوسرے سے باتیں کریں گے تو وہ سیاسی باتیں بھی ہو سکتی ہیں یا بغاوت ہو سکتی ہے۔ لہٰذا وہ ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ طلبہ آپس میں مل کر مسائل پر گفتگو نہ کریں اور میل جول نہ بڑھائیں۔ یہ یونیورسٹی کے معمول کے بالکل برعکس ہے۔

وہ طبقہ جو دنیا میں سب سے زیادہ خطرے میں ہے تیسری دنیا کا قلمکار ہے۔ آج تقریباً تمام عرب مصنف کسی نہ کسی شکل میں جلاوطنی کاٹ رہے ہیں، عبدالرحمٰن منیف وہ واحد عظیم ناول نگار ہے جسے سعودی عرب نے اپنی پوری تاریخ میں پیدا کیا۔ اس سے اپنے ملک کی شہریت چھین لی گئی اور اب وہ دمشق میں جلاوطنی کے دن گزار رہا ہے۔ یہ کچھ ایسا ہے گویا ایک جسد سیاسی ایک سماجی وجود کسی اہم تر تخلیقی وجود سے اپنے آپ کو کاٹ کر الگ کر رہا ہو۔ ایڈونس (Adonis) شام کا باشندہ ہے۔ وہ پیرس میں اور کبھی کبھار بیروت میں جلاوطنی کی زندگی گزارتا ہے بس یونہی چل رہا ہے۔ پاکستان میں میرا خیال ہے آزادی کے بعد سے ایسی کوئی نمایاں ادبی شخصیت نہیں ہوگی جس نے کچھ عرصہ جیل میں نہ گزارا ہو۔ میرے خیال میں ریاست کا یہ ایک مریضانہ طرزِ عمل ہے جس سے اس کی بیماری یعنی مرض کی "اضطراری کیفیت" ظاہر ہوتی ہے۔

بنگلہ دیش کی ایک ادیبہ تسلیمہ نسرین کا بھی ایک قصہ ہے؟

جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی ایک تازہ ترین مثال تسلیمہ نسرین ہے۔ یہ کوئی معمول کی بات نہیں خاص طور پر اس صورت میں جب آپ دیکھ رہے ہوں کہ ان میں سے زیادہ تر مصنف بلکہ ان کی اکثریت ایسی کوئی

MashalBooks.org

بات نہیں کہہ رہی ہے اور نہ کچھ کر رہی ہے' جس سے معاشرے کو خطرہ لاحق ہو۔ تسلیمہ نسرین نے ایک ناول لکھا' وہ کوئی بہت بڑی ادیبہ نہیں' وہ ان خطرات کی نشاندہی کر رہی ہے جو بنگلہ دیش کی مسلم اکثریتی آبادی میں ہندو قیادت کو لاحق ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک انٹرویو دیا' جس کا مفہوم یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روایات کا پابند نہیں سمجھتی۔ یہ بات اس نے کہی یا نہیں کہی' ہمیں اس کا علم نہیں۔ وہ تو اس سے انکار کرتی ہے اور اس وجہ سے اسے ملک سے باہر بھگا دیا گیا۔

یہ ہیں مریضانہ رویے اور میں اس کی اور بھی مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔ بے نظیر بھٹو نے اپنی وزارت عظمیٰ کے ساڑھے تین سالہ دور میں پاکستان جیسے نادار ملک سے دو بلین ڈالر چوری کر لئے۔ یہ ہے مرض کی اضطراری کیفیت' حالانکہ اسے اس طرح کے روپوں کی ضرورت نہیں تھی' وہ پہلے ہی ایک مالدار خاتون ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ وی ایس نائی پال نے اپنی کتاب Beyond Belief میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں یک طرفہ انداز سے چلتی ہوئی باتیں لکھ دی ہیں۔ ان خیالات کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

☆ نائی پال کی تازہ ترین کتاب کا مرکزی نظریہ یہ ہے کہ ہندوستان' پاکستان' بنگلہ دیش' انڈونیشیا' ملائشیا اور ایران میں اسلام ان لوگوں کا مذہب ہے' جنہوں نے تبدیلی مذہب کے نتیجے میں اسے اختیار کیا۔ وہ کہتا ہے کہ اسلام ایک عربی مذہب ہے' وہ ہر فرد جو عرب نہیں ہے' اس کو تبدیلی مذہب کے نتیجے میں قبول کرتا ہے اور ایسے شخص کا نقطہ نظر مسخ شدہ اور انکار محض پر مبنی ہوتا ہے۔ اس سے فساد پیدا ہوتا ہے۔ یہ نیوروسس (ذہنی خلفشار) کی کیفیت ہوتی ہے۔ ان کی مرکزی فکر اسی بات پر قائم ہے کہ تبدیلی عمل' مذہب تبدیل کرنے والے پر کس شدت سے اثر انداز ہوتی ہے۔ اس پوری کتاب میں نائی پال' پاکستان یا ملائشیا میں ایک ایک مسئلے کی نشاندہی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ مسئلہ پیدا اس لئے ہوا کہ لوگ تبدیلی مذہب کے بعد مسلمان ہوئے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ وہ لکھتا ہے اور بالکل صحیح لکھتا ہے کہ لاہور میں تاریخ کے چند عظیم ترین آثار سے مجرمانہ لاپرواہی برتی گئی۔ اس کیفیت کو بیان کرنے کے بعد وہ لکھتا ہے کہ کوئی قوم اس طرح لاپرواہی کو کیسے برداشت کر سکتی ہے؟ صاف ظاہر ہے اس کا سبب یہ ہے کہ ان لوگوں کا اپنی تاریخ سے کوئی رشتہ نہیں۔ تو مسلم اپنے ماضی کی پرواہ نہیں کرتے' یہ ہے اس کا خیال لیکن یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ تاریخی مجسموں' آثار و عمارات اور ماحولیات سے ہندوستان اور پاکستان میں مصر اور اردن میں افریقہ' لاطینی امریکہ اور کمبوڈیا میں بھی لاپرواہی برتی جا رہی ہے۔ ان سے بہت سے یورپی ملکوں اور امریکہ میں بھی غفلت برتی جا رہی ہے' تو پھر اس کا تبدیلی مذہب سے کیا تعلق؟ یہ ہے ایک مسئلہ۔ اس کا مرکزی نظریہ ہی غلط ہے۔

MashalBooks.org

ایک دوسرا مسئلہ بھی ہے جو زیادہ اہم ہے۔ سوال یہ ہے کہ تبدیلی مذہب کس نے نہیں کی۔ نائی پال کی تعریف کے مطابق اگر ایرانی نومسلم ہیں تو امریکی بھی تو مسیحی ہیں اور جاپانی بودھ کے نئے ماننے والے اور اسی طرح چینی بھی' جن کی بڑی تعداد نے عقیدہ تبدیل کر کے بودھ مت اختیار کیا۔ ہر شخص نے مذہب بدلا ہے' کیونکہ ابتدا میں ہر مذہب کے صرف چند پیروکار تھے۔ مسیحیت' اسلام' بودھ مت' یہودیت' پیغمبروں کے لائے ہوئے تمام مذاہب کو انہی عقائد کی تبدیلی کے نتیجے میں فروغ حاصل ہوا۔ اس طرح تو اس کے نظریے سے باہر کسی کو نہیں چھوڑا جا سکتا۔

آپ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ یہ وی ایس نائی پال ہے' جو خود ساختہ بھوتوں کا اور اوہام کا اسیر ہے۔ اس نے جتنے بھی بھوت بنائے' کوئی بھی اپنا حقیقی وجود نہیں رکھتا۔ وہ رہ رہ کر بالکل غیر متوقع طریقے سے اس کے ذہن پر حملہ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کتاب اسلام کے بارے میں ہے' لیکن پاکستان سے متعلق باب میں وہ اچانک اس کا بیشتر حصہ ایک شخص شہباز کے بارے میں لکھتے ہوئے صرف کر دیتا ہے۔

وہ شخص ایک برطانوی اسکول کا پڑھا ہوا ہے۔ کیمبرج کا تعلیم یافتہ نوجوان پاکستانی ہے۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کے دوران تعلیم میں اس نے مارکس اور لینن کو دریافت کیا اور چے گویرا سے روشناس ہوا۔ اب وہ وطن واپس آتا ہے اور اپنی نسل کے دوسرے نوجوانوں کی طرح جو لاطینی امریکہ' افریقہ' مشرق وسطیٰ یا امریکہ میں رہتے ہیں' بائیں بازو کے گروپ میں شامل ہو جاتا ہے اور بالآخر بلوچستان میں جہاں بائیں بازو والوں نے مسلح بغاوت شروع کی ہے' شریک ہوتا ہے۔ نائی پال اس شخص کے بارے میں بڑی تفصیل سے بیان کرتا ہے اور اس طرح پیش کرتا ہے جیسے وہ ایک مسخ شدہ شخصیت ہے۔ میں اس سے بحث نہیں کرتا کہ وہ مسخ شدہ شخصیت ہے یا نہیں ہے لیکن بائیں بازو کی ناکام بغاوت اور اس کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا وہ ویسا ہی نظر آتا ہے۔ اس بغاوت میں اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں اور وہ دوبارہ اصل زندگی کے معمولات میں واپس آ جاتا ہے۔ اس پورے باب میں کہیں بھی یہ اشارہ نہیں ملتا کہ شہباز ایک عقیدت مند مسلمان ہے یا اسلام کا اس کی زندگی میں اور تعلیم میں کوئی عمل دخل رہا ہے یا اس کے خیالات میں کوئی دخل رہا ہے یا اسلام کا اس پورے بیانیے میں کوئی کردار رہا ہے' جس پر نائی پال نے 35 صفحے کالے کر دیئے۔ وہ اس باب میں بس ایک ہی مقصد لے کر آتا ہے کیونکہ اس کے ذہن پر بائیں بازو کی ہر بات سے نفرت کا کابوس سوار ہے۔ یہاں بھی اسے اپنا بھوت ڈھونڈ نکالنے کا موقع مل گیا اور جونہی اپنا بھوت دریافت کر لیتا ہے' وہ اسے اپنے بیانیے میں خواہ اس کا موقع ہو یا نہ ہو، اگل دیتا ہے۔ اپنا خوف' اپنی نفرت' اپنی بیزاری اور اندر دبی ہوئی ہر کیفیت کو نکال دیتا ہے۔ لیکن اس معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ یہ ایک مخصوص نوعیت کی مردم خور شرق شناسی ہے یعنی وہ دوستوں کو لقمہ بناتا ہے۔ اس کتاب کا شہباز ایک ایسا شخص ہے جو میرا بھی دوست ہے' وہ احمد رشید ہے' جس نے نائی پال کے چھ ہفتے کے قیام پاکستان میں اسے اپنا ذاتی مہمان بنایا' جگہیں دکھائیں' بہت سے

MashalBooks.org

لوگوں سے ملاقات کرائی۔ ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ رشید اپنا نقصان برداشت کرنے کی حد تک فراخ دل تھا' اس نے نائی پال کے لئے وہ بہت سے کام جنہیں وہ کر رہا تھا' چھوڑ دیئے۔ وہ خود بھی کئی کتابوں کا مصنف ہے' اس کا مقصد محض نائی پال کو اس کے کام میں مدد دینا تھا۔ اب نائی پال نے اس کا بدلہ چکا دیا ہے' اس کا ایک مضحکہ خیز خاکہ بنایا ہے' صرف یہ کہ نام بدل دیا ہے لیکن اس طرح کہ ہر تعلیم یافتہ پاکستانی' اس کتاب میں احمد رشید کو پہچان لے گا اور اس پر ترس کھائے گا کہ اس نے کیسے آدم خور شخص کو اپنا دوست بنایا۔

وہ احمد رشید جس کا خاکہ اس نے شہباز کے نام سے بنایا ہے' کسی طرح بھی کٹر اسلامی عقیدے مذہب' اسلامی معاشرے اور ایسی دوسری چیزوں سے تعلق نہیں رکھتا۔ مغربی دنیا میں سن ساٹھ کی دہائی کے اندر روشن خیالی کا جو دور دورہ تھا اور خاص طور پر مغرب کی یونیورسٹیوں میں جو روشن خیالی عام تھی احمد رشید کا تعلق اس طرح کے اور دوسرے دیگر جامعات سے ہے' جہاں اس نے تعلیم پائی۔ مارکس اور چے گویرا کے بارے میں وہیں اس کو علم ہوا' پھر وہ پاکستان آ گیا۔ یہاں کے افلاس اور غریبوں کی حالت زار نے اس پر گہرا اثر ڈالا' وہ ان کے لئے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے وہی کچھ کیا' جسے سب سے اچھا کام سمجھا۔ وہ ایک بغاوت میں شریک ہو گیا۔ مسئلہ یہ نہیں کہ وہ صحیح تھا یا غلط۔ اصل بات یہ ہے کہ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کا خاکہ کھینچا گیا' تیسرے یہ کہ اس نے نائی پال کو اپنا خاکہ کھینچنے کا موقع فراہم کیا۔ دوسرے لفظوں میں نائی پال (اور یہ کہتے ہوئے مجھے بالکل خوشی نہیں ہوتی) ایک بیمار شخص ہے۔ اس کے اندر اسلام کا بھوت سا گیا ہے اور وہ اس بھوت کا پیچھا کرتا رہتا ہے۔ وہ کیپٹن اہاب کی طرح ہے۔ اسلام اس کے لئے سفید وہیل مچھلی ہے۔ اسلام اس کی سفید وہیل ہے اور وہ بچ مچ اس کے پیچھے لگ گیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اہاب کے پاس وہیل کا پیچھا کرنے کا ایک جواز موجود تھا' کیونکہ وہیل نے اسے زخمی کیا تھا لیکن نائی پال کو تو مسلمانوں نے یا اسلام نے میرے علم کی حد تک کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ اس کے باوجود وہ اس کے اعصاب پر سوار ہے۔

☆ کیا یہ بات عجیب نہیں کہ وہ ایک مسلمان خاتون سے شادی کرتا ہے؟

کوئی عجیب بات نہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بہت سے لوگوں نے ایسے لوگوں کے درمیان شادیاں کیں جنہیں وہ اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ نوآبادیاتی تسلط کے تمام مخالفوں، نے تیسری دنیا کے بیشتر سامراج دشمن افراد نے خاص طور پر انہوں نے جو بعد میں انقلابی بن گئے' دشمنوں کی سفید فام عورتوں سے شادیاں کیں۔ یہ بھی ایک طرح کا انتقام ہے اور یہ بات ان پر خاص طور سے صادق آتی ہے جو شادی سے نفرت کرتے ہیں اس کے بارے میں آپ نے کبھی سوچا؟ یہ ایک عجیب بات ہے۔

☆ نائی پال سے آپ کی ملاقات کیسی رہی' اس نے آپ سے کیا باتیں کیں؟

میں اس سے کئی بار ملا' لیکن ہمارے درمیان گفتگو عنقا تھی۔ میں بھی حیران تھا کہ ایسا کیوں ہے؟ میرا

MashalBooks.org

خیال ہے اول یہ کہ مجھ میں انہیں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی جو انہیں لکھنے کے لئے موضوع فراہم کرتی۔ دوئم انہوں نے مجھ سے اپنی سابقہ کتابوں کے بارے میں رائے معلوم کی۔ Among the Believers کے بارے میں میں نے کہا کہ میں نے اسے ناپسند کیا' پوچھا کیوں؟ میں نے جواب دیا کیونکہ آپ کو حقائق سے دلچسپی نہیں ہے۔ اس پر وہ سخت برہم ہوئے' اور کہا: ''کیا مطلب ہے آپ کا' کیا مجھے حقائق سے دلچسپی نہیں؟ وہی تو میں لکھتا ہوں۔'' میں نے کہا' آپ نے اپنی کتاب Among the Believers میں پاکستان کے بارے میں کوئی ساٹھ صفحے لکھے۔ آپ جنرل ضیاءالحق کی حکمرانی میں پاکستان کو ایک اسلامی ریاست قرار دیتے ہیں' شروع سے آخر تک آپ کچھ اس طرح لکھتے ہیں جیسے کہ وہ حکومت اس ملک کی نمائندہ حکومت ہو اور اسے عوام کی تائید حاصل ہو' آپ کی ذمہ داری تھی کہ کم از کم اتنا تو لکھتے' یہ تو بیان کرتے کہ ان اوراق میں جو صورت حالات پیش کی' اس کی مخالفت وہاں کے ہزاروں عوام کر رہے ہیں اور اپنی جان خطرے میں ڈال کر کر رہے ہیں اور ان میں پاکستان کے تمام معروف شاعر' مصنف اور فنکار بلا استثنا شامل ہیں اور یہ کہ ہمارے بہترین مصنف اس وقت جیل میں تھے یا جلاوطن تھے۔ سرعام تمیں ہزار افراد کو کوڑے لگائے گئے تھے۔ تقریباً پینتیس یا چالیس ہزار افراد جیلوں میں بند تھے اور آپ اس کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں کرتے۔ اس حکومت کو آپ اسلامی قرار دے رہے ہیں۔ آپ اور کچھ نہیں تو اتنا تو لکھ سکتے ہیں کہ وہاں مخالفت بھی ہو رہی تھی۔

یہ سب سننا انہیں برا لگا اور یہ ہے بھی شرمناک بات فیض احمد فیض اقبال کے بعد ہمارا دوسرا عظیم ترین شاعر ہے اور یہ دونوں اس صدی کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ فیض ان دنوں جلاوطن تھا۔ حبیب جالب جیل میں بند تھا اور لندن سے آنے والا ایک سنجیدہ مصنف کتاب کے ساٹھ صفحات میں جنرل ضیاءالحق کے دور حکمرانی کا اور جس طرح کا معاشرہ وہ تعمیر کر رہا تھا' اس کا حال رقم کرتا ہے اور یہ نہیں بتاتا کہ اس وقت ہم سب قید کی سزا جھیل رہے تھے یا جلاوطنی کے دن کاٹ رہے تھے۔ اسے لکھنا نہیں کہتے' اسے تو کوڑے پڑنے چاہئیں۔

☆ بی بی سی کی دستاویزی فلم کے مطابق آپ نے پہلی بار بہار میں اپنے آبائی گاؤں کا سفر اختیار کیا اور گرینڈ ٹرنک روڈ کے ساتھ قدم بقدم اس علاقے کا جائزہ لیا۔ آپ نے سفر کے لئے اس شاہراہ کا انتخاب کیوں کیا؟

اس لئے کہ میں اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ آسان سی بات ہے۔ سلطان شیر شاہ سوری نے سولہویں صدی میں گرینڈ ٹرنک روڈ بنوائی تھی۔ یہ کلکتہ سے پشاور تک جاتی تھی۔ میرے لئے وہ ہندوستان کے اتحاد کی علامت تھی' پھر ہندوستانی اور پاکستانی دوقوم پرستوں نے گرینڈ ٹرنک روڈ کے ٹکڑے کر دیئے۔ اس کا تسلسل 1947ء میں ہی ٹوٹ گیا۔ کتنا عجیب لگتا ہے کہ آپ ہندوستان میں ایک نقطے پر پہنچ کر اچانک رک جاتے

MashalBooks.org

ہیں ۔ جہاں گرینڈ ٹرنک روڈ آپ کو روک دیتی ہے۔ پھر آپ پاکستان اور ہندوستان کی سرحدی چوکیوں سے گزرتے ہیں اور گرینڈ ٹرنک روڈ پھر اپنا سفر شروع کر دیتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ میرا بچپن سے اس کے ساتھ کئی طرح کا تعلق ہے۔ اس کے آس پاس ہی میں پلا بڑھا ہوں۔ بچپن کے پورے زمانے میں اسی پر سفر کرتا رہا' پھر کپلنگ کو پڑھتے ہوئے اس کے ساتھ ایک رومانوی تعلق جڑتا رہا۔ کپلنگ آپ کو یاد ہے؟ نو آبادیاتی دور کا مصنف تھا' لیکن اس کے باوجود ایک اچھا مصنف تھا' اس سڑک کے بارے میں اس نے بہت کچھ لکھا۔ تو میں نے سوچا کہ یہ سڑک ہمارے اتحاد اور افتراق بیک وقت دونوں کی اور ہماری محرومیوں اور زندگی کی علامت ہوگی۔

☆ آپ وہاں اپنے گاؤں ارکی جاتے ہیں' جسے آپ نے آخری بار اس وقت دیکھا تھا جب آپ تیرہ سال کے تھے۔ یہ ایک نہایت خوشگوار منظر ہے۔ بچوں نے چاروں طرف سے آپ کو گھیر رکھا ہے' جیسے آپ واپس آنے والی ایک مشہور شخصیت ہیں؟

گاؤں کے قریب پہنچتے ہوئے جو چیز سب سے پہلے نظر آئی وہ مسجد تھی۔ میں نے گاؤں کو اسی مسجد سے پہچانا۔ یہ دیکھ کر میرا جی بھر آیا کہ گاؤں کے لوگوں نے جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے' پچاس سال بعد بھی ہمارے خاندان کو یاد رکھا' محبت کی اور اس کا احترام کیا۔ میرے آنے کی خبر جہاں پہنچی' وہ سب لوگ وہاں سے آتے رہے' تحائف آئے' بچے آئے' مسلمان آئے' ہندو آئے' بوڑھے لوگ خاص طور پر جذباتی تھے کیونکہ وہ مخصوص لوگوں کے بارے میں' جن کے متعلق پوچھا جاتا' بخوبی جانتے تھے لیکن وہ گاؤں' جب میں نے اسے چھوڑا تھا' تب کے مقابلے میں زیادہ غریب ہو گیا ہے۔ بہت ہی غریب ہو گیا ہے۔ پہلے یہ ایک غریب گاؤں نہیں تھا۔ ہماری ایک عظیم الشان لائبریری تھی۔ میرے دادا نے ایک لائبریری قائم کی تھی جس میں تقریباً پانچ ہزار کتابیں اور تین ہزار خطوط تھے۔ 1946ء اور 1947ء کے کشت و خون میں اور بلوے میں سب کچھ تباہ ہو گیا۔

☆ فلم میں ایک منظر بڑا رقت انگیز ہے' جب آپ گاؤں کے قبرستان میں جاتے ہیں اور کچھ ایسی باتیں کرتے ہیں جن میں خوشی اور اندوہ دونوں شامل ہیں۔

میرے والد کی قبر تو غائب ہو گئی' قبرستان کے عین مقابل آپ کو دیہاتیوں کے چند مکان نظر آتے ہیں جو اینٹ اور پتھر سے بنائے گئے ہیں اور انہی قبروں سے لئے گئے ہیں۔ یہ بات بڑی تکلیف دہ تھی لیکن یہ دیکھ کر خوشی بھی ہوئی کہ وہ زندہ لوگوں کو زندگی دے رہے تھے۔ ان کی زندگی کو بہتر بنا رہے تھے۔ ان پتھروں کا استعمال مقبرے کی بجائے گھروں میں مجھے کہیں بہتر معلوم ہوا۔ میرا خیال ہے والد بھی یہ دیکھتے تو خوش ہوتے۔

فلم کلکتہ سے شروع ہوتی ہے' اس میں آپ نے ٹیگور سے اپنی ملاقات کو بھی یاد کیا ہے؟

MashalBooks.org

ٹیگور اگر چہ بین الاقوامیت کے حامل تھے لیکن پورے ہندوستان میں انہیں ایک خاص احترام کا درجہ حاصل تھا۔ انہوں نے ایک پیغمبرانہ بصیرت کے تحت اس قوم پرستی کے خلاف متنبہ کیا جو ہندوستان کی نفسیات سے ہم آہنگ ہوتی جا رہی تھی۔ اس وقت ٹیگور بہت بوڑھے تھے۔ میری اس ملاقات کے بعد چھ ماہ کے اندر ہی وہ وفات پا چکے ہوں گے، اس موقع پر بہت سے لوگ ان سے ملنے آئے تھے۔ وہ ایک سفید چغہ جیسا لباس پہنے پلنگ پر لیٹے تھے، وہ صاف لہجے میں بول رہے تھے۔ انہوں نے اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھا اور زیر لب کچھ اس طرح کے الفاظ ادا کیے "اچھے بچے بنو!" بس اتنی ہی بات مجھے یاد رہ گئی۔ انہیں میں نے بعد میں پڑھا اور ان کی تخلیقات کی معنویت کو ابھی حال ہی میں کم و بیش پچھلے چھ سال کے دوران میں دریافت کیا، حیرت ہوتی ہے کہ ان کا ذہن کتنا واضح تھا۔

☆ فلم میں آپ نے 1946ء کے زمانے کو یاد کیا جب بہار میں ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے تھے اور مہاتما گاندھی نے دورہ کیا اور ہندو اور مسلمان بچوں کو اپنے ساتھ لے کر تباہ شدہ گاؤں سے گزرے، یہ بچے اتحاد کی علامت تھے اور ان بچوں میں آپ خود بھی شامل تھے۔

میں گاندھی جی کے ساتھ کوئی چھ ہفتے تک دورے پر رہا۔

☆ آپ کا ان سے کوئی ذاتی رابطہ بھی پیدا ہوا یا کسی اور طرح کا تاثر؟

ہر روز رابطہ تھا۔ کاش میرا ذہن آج کے مقابلے میں اس وقت زیادہ صاف ہوتا۔ اس وقت تیرہ سال کی عمر میں، میں بہت حد تک پاکستانی قومیت پرستوں کے گروہ میں شامل تھا اور گاندھی جی چونکہ کانگریس کے ایک لیڈر تھے، اس لئے انہیں ایک خیر خواہ سیاست دان نہیں سمجھتا تھا۔ میری یہ کیفیت بھائیوں کے اثر سے تھی، جو مسلم لیگی ہو گئے تھے۔ میں اس لئے چلا گیا تھا کہ میری والدہ اور والد دونوں کے کانگریس سے روابط تھے، چنانچہ میرا خیال ہے کہ میں کچھ سیکھنے کے موڈ میں نہیں تھا، حالانکہ مجھے ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

لیکن بعض چیزیں بہت صاف تھیں۔ ان میں سے ایک محبت تھی، طاقت نہیں، محبت مسلسل اور بالکل چھوت کی طرح لگنے والی وہ محبت جو آس پاس کے لوگوں میں ان کے لئے تھی۔ لوگ ان کی اطاعت کرتے تھے، ان کی باتیں سنتے تھے، اس لئے کہ وہ ان سے محبت کرتے تھے۔ محض اس لئے نہیں کہ ان میں جادوئی کشش تھی، بلکہ ان کے وجود سے طاقت کی لہریں پھوٹتی تھیں۔ وہ ایک نیک آدمی تھے، میں آپ کو ایک قصہ سناتا ہوں اور میں اب اور زیادہ باتیں نہیں کروں گا۔ جب میں جانے لگا تو میرے بھائیوں نے مجھ سے کہا: "اب چونکہ تم گاندھی جی کے ساتھ جا رہے ہو، تو ان سے کہنا کہ تمہیں اچھی انگریزی لکھنا سکھا دیں" اور بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ انہوں نے بالکل صحیح بات کی تھی، وہ بہت معیاری تحریر لکھتے تھے، چنانچہ میں نے کہا: "گاندھی جی، میرے بھائیوں نے مجھ کو بتایا ہے کہ آپ نہایت معیاری انگریزی لکھتے ہیں۔" انہوں نے کہا: "اوہ، بڑی مہربانی ان لڑکوں کی۔" پھر میں نے کہا: (انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ اچھی انگریزی لکھنے کے

اصول آپ سے سیکھوں۔" انہوں نے جواب دیا: "میرے بچے' ایک ہی اصول ہے۔ بائبل کو پڑھو اور بار بار پڑھو۔ وہ جو کنگ جیمز نے مرتب کی ہے۔" مجھے اکثر اس کا خیال آتا ہے کیونکہ اگر آپ ان کی تحریریں اور تقریریں پڑھیں تو ان کی انگریزی نثر میں بائبل کا اسلوب نظر آئے گا۔ منفرد' نہایت سادہ' چھوٹے چھوٹے فقرے' آسان بیانیہ' اپنائیت اور بے حد دلچسپ۔

☆ کیا گاندھی جی کو علم تھا کہ آپ کے باپ کو قتل کیا گیا تھا۔ محض اس لئے کہ وہ کانگریس کی حمایت کرتے تھے؟

☆ جی ہاں' انہیں سارے واقعات کا علم تھا۔

☆ پھر آپ نے ایک نہایت اندوہناک فیصلہ کیا؟

نہیں' میں نے نہیں کیا۔

☆ کیا وہ آپ کے لئے اندوہناک نہیں تھا؟ ماں کو چھوڑنا کتنا مشکل لگا ہو گا؟

میں نے کوئی فیصلے نہیں کئے۔ فیصلے تو میرے لئے کئے گئے تھے۔ میں صرف 13 سال کا تھا۔ ہندوستان میں تیرہ سال کے لڑکے اپنے لئے خود فیصلے نہیں کرتے۔

☆ آپ کے بھائیوں کا اور آپ کا پاکستان جانا' آپ کی والدہ کا اس بارے میں کیا کہنا تھا؟

وہ ہم میں سے کسی کے بھی جانے کی مخالف تھیں۔ ایک موقع پر انہوں نے خفا ہو کر کہا' جاؤ' اگر جانا ہی ہے تو' لیکن یاد رہے کہ تم سب مسلم یہودی بن گئے ہو۔ وہ اس بارے میں بہت ناراض تھیں۔

☆ ان سے بچھڑنے کے بعد کیا پھر آپ کی ملاقات والدہ سے ہوئی؟

ان کا انتقال 1972ء میں ہوا۔ میں نے مرنے سے پہلے انہیں دیکھا' لیکن وہ اس وقت بات کرنے کے قابل نہیں رہ گئی تھیں۔ وہ آخری سانس لے رہی تھیں۔

☆ معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی صورتوں میں آپ نے بھی مادی دولت کو اور شہرت اور مقبولیت کی کشش کو ٹھکرا دیا ہے؟

آپ کی بڑی مہربانی' لیکن میرا خیال ہے کہ خوشی حاصل کرنے کے معاملے میں' میں خاصہ خودغرض واقع ہوا ہوں' بہت سے معاملوں میں' میں بہت خوش وخرم انسان ہوں۔

میں روحانیت' روحانی دولت کے مفہوم میں آپ سے بات کر رہا ہوں۔

مجھے معلوم ہے' آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے جو بات کی وہ یہ ہے کہ اس میں میری کسی قربانی کو دخل نہیں۔ میں نے جو کچھ کیا' اس کا مجھے فائدہ ہی ہوا۔ میری کوئی زیادہ ملکیت نہیں' لیکن میں اپنی ذات میں خوش ہوں۔

☆ فیض احمد فیض آپ کے محبوب شاعروں میں سے ایک ہیں' آپ کی پسندیدگی کی وجہ؟

MashalBooks.org

نوآبادیاتی نظام کے خاتمے اور اس کے بعد کی صورت حال میں ریاستوں کے اندر جو احساس محرومی پیدا ہوا فیض نے اس کو پیش از وقت اور نہایت واضح طور پر دیکھ لیا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کے کچھ ہی مہینے بعد انہوں نے ایک نظم لکھی۔ دراصل اس نظم میں وہ ان دونوں سے مخاطب تھے۔ ہم اس زمانے میں جس چیز کو رہائی اور آزادی کہہ رہے تھے فیض نے غیر معمولی بصیرت کے ساتھ اس کے ناقص کردار کو دیکھ لیا تھا۔ اس بات نے اس نظم کو بہت طاقت ور بنا دیا تھا۔

اس سے ملتی جلتی مثال میں یہ پیش کروں گا کہ ایک طویل اور خونریز جنگ آزادی کے بعد جب الجزائر کی آزادی کا دن آیا تو فرانز فینن (Frantz Fennon) نے افتادگان خاک (The Wretched ofthe Earth) لکھی، اس نے لکھا ''قومی شعور کی ناہموار گزرگاہ'' ریاست کو نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ پر درپیش ہوتی ہے لیکن شاعر فیض اور انقلابی مصنف فینن میں فرق یہ ہے کہ فیض نے اس طرح کی کسی ناکامی کو پہلے نہیں دیکھا تھا۔ فینن گھانا میں رہ چکا تھا، وہ گنی جا چکا تھا، مصر کے جمال ناصر سے واقف تھا اور اس نے دیکھ لیا تھا کہ نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد ریاست کس بدحالی میں مبتلا ہوتی ہے یا کس قدر نوآبادیاتی ہو جاتی ہے۔ میں وہ نظم آپ کو پڑھ کر سناؤں۔ عنوان ہے، صبح آزادی۔ اگست 1947ء

صبح آزادی

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غم دل
سنا ہے ہو بھی چکی ہے فراق ظلمت و نور

MashalBooks.org

سنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہلِ درد کا دستور
نشاطِ وصل حلال و عذابِ ہجر حرام
جگر کی آگ، نظر کی امنگ، دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی
ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

☆ ایک اور پسندیدہ نظم اقبال کی ہے، اس کا ترجمہ کیسا رہے گا؟

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس شاعرانہ عبارت کے اختتام پر میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

(رسالہ ''مشعل'' مارچ 1999ء)

ریاست: نوآبادیاتی نظام کے بعد

MashalBooks.org

آلوؤں کی بوری سے آلوؤں کے بھرتے تک
تیسری دنیا کا حالیہ بحران

یہ مضمون ان تین مضامین کے سلسلے کا پہلا مضمون ہے جو نو آبادیات کے بعد کے معاشروں پر لکھے تھے۔

''چھوٹے قطعات اراضی کے مالک کسان بڑی تعداد میں ہیں' یہ سب یکساں حالات میں زندگی گزارتے آئے ہیں' لیکن وہ ایک دوسرے کے ساتھ مختلف نوعیت کے رشتوں میں شریک ہیں۔ ان کا طریق پیداوار انہیں باہمی میل جول کی طرف لانے کی بجائے انہیں ایک دوسرے سے دور کر دیتا ہے۔ اس طرح فرانسیسی قوم کی بھاری اکثریت ایک ہی جیسے حجم سے مل کر بنی ہے' جس طرح ایک بوری میں بھرے ہوئے آلو صرف آلوؤں کی بوری ہوتے ہیں۔'' کارل مارکس 1852ء

اس مضمون میں تین سوالوں سے بحث کی گئی ہے' جو ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں:

1۔ یہ تیسری دنیا کے حالیہ بحران کی نشاندہی کرتا ہے۔

2۔ وہ معیارات متعین کرتا ہے' جن کی بنیاد پر یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ اس بحران کا سامنا کہاں تک اس طرح کیا جا رہا ہے کہ اس سے ایک متوازن' منصفانہ اور جمہوری معاشرے کے فروغ میں مدد ملے۔

3۔ ان خصوصیات کی نشاندہی کرتا ہے' جن کی مدد سے کوئی حکومت' کوئی پارٹی یا کوئی سیاسی تحریک اس بے مثل چیلنج کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ اس طرح یہ مضمون صورت احوال کو بیان کرنے اور اس کا تجزیہ کرنے کے بعد معمول کے بیانات اور فیصلوں کی طرف رخ کرتا ہے۔ تمام تصورات کی سیر حاصل صراحت کو اس مضمون میں شامل کرنا ممکن نہیں اور نہ یہ ممکن ہے کہ عمومی نوعیت کے جو بیانات آتے ہیں' ان کے سلسلے میں ضروری وضاحت بھی کرتے چلیں' اس لئے کہ یہ مضمون ایک طویل اور ہنوز نامکمل کام کے تعارفی حصے اور اس میں شامل اصل موضوعات کی صراحت پر مبنی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اس طرح میرے دلائل سامنے آ جائیں اور ان پر ردعمل بھی معلوم ہو جائے اور اس دوران میں کام جاری رہے۔

MashalBooks.org

1۔سرمایہ داری سے پہلے کا سماج

تیسری دنیا کے مستقبل پر بحث کرتے وقت اس کے ماضی کا کھوج سب سے پہلے لگانا چاہیے' اس لئے کہ ان نام نہاد "عبوری" معاشروں میں ان کا ماضی بہر طور موجود ہوتا ہے۔ یہ ایک نہایت ٹوٹا پھوٹا ماضی ہوتا ہے' جس پر نئی دنیا کی آزاد منڈیاں حملہ کرتی رہتی ہیں' جو اپنی اصل سے اور توانائی سے محروم ہو چکا ہے' اور جس میں یہ صلاحیت نہیں کہ اس اجتماعی زندگی کے تسلسل کی ضمانت دے سکے' جو لاکھوں برس پر پھیلی ہوئی ہے۔ تاہم اس سے اس کی طاقت کم نہیں ہوتی۔ وہ یوں کہ اس کی طاقت کا منبع تیسری دنیا کی موجودہ زندگی کے مصائب اور آلام ہیں اور جن کے متبادل حل بھی موجود نہیں۔ تیسری دنیا کی بیشتر قوموں کے لئے زمانہ ماضی کا آزمودہ متبادل وہ دور ہے' جسے برزخ کہنا چاہیے۔ اپنی مٹی سے بیگانگی' شکستہ جھونپڑوں کی بستی میں اقامت' غیر ملکوں میں مہاجرت کی زندگی اور زیادہ سے زیادہ خوش اندیشی کی ایک مستقل کیفیت۔ اس برزخ سے نکلنے کا ایک راستہ تو یہ ہے کہ اپنے مثالی ماضی پر تکیہ کیا جائے' وہ ماضی جو اپنی مردانگی سے محروم ہے اور پھر اس کی بحالی کی آرزو میں گھلتے رہیں اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ اپنے احتجاج اور غصے کے تحت اس ماضی سے تعلق توڑ لیا جائے۔ کبھی کبھی یہ دونوں رویے ملے جلے ہوتے ہیں' کبھی کسی تاریخی مرحلے میں الگ بھی ہو جاتے ہیں' لیکن اس کے باوجود آپس میں جڑے رہتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں کسانوں کی بغاوت اکثر جدید انقلابوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی آئی ہے۔ بیرنگٹن مور جونیئر (Barrington Moore Jr.) نے کہا ہے کہ "جدت کا عمل کسانوں کی ناکام بغاوتوں سے شروع ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کے دوران یہ عمل کسانوں کے کامیاب انقلاب پر منتج ہوا ہے۔"(1)

یہ بھی ایک نمایاں المیہ ہے کہ کسان پتھر کے زمانے سے ہی بھاری اکثریتی آبادی میں شامل رہے ہیں۔ آبادی کی احتیاج پوری کرنے والے تنہا کسان ہیں' اس کے باوجود ان کے ساتھ "بے جان" اشیا کا سا سلوک کیا گیا۔ تاریخ کی نظر میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ جان برجر (John Berger) نے لکھا ہے کہ انہیں ایک مسلسل عمل کا حصہ کہا گیا' تاریخ کا وہ خام مال جس کا کوئی نام نہیں' جو بجائے خود مٹی ہو' جسے برتا گیا اور اپنے تصرف میں رکھا گیا اور اقلیت پر مبنی ان سماجی طاقتوں نے' جن کی شناخت ممکن ہے' ان کا بالآخر تاریخی ہونا تسلیم کر لیا... ان کا اجتماعی تشخص عارضی طور پر اس وقت تسلیم کیا گیا جب انہیں تابع رکھنے کے طریقے ناکام ہو گئے یا اس صورت حال کو بدلنا پڑا'' (2) ایسا وقفے وقفے سے ہوتا رہا۔ دنیا کی تاریخ کسانوں کی بغاوتوں سے' جن کے بارے میں بہت کم لکھا گیا' بھری پڑی ہیں۔ اب وہ طبقہ جو مدتوں نسل انسانی کی اکثریت پر مبنی تھا مغرب کی دنیا میں تقریباً ختم ہو چکا ہے اور تیسری دنیا میں بھی اس کا وجود سکڑنے لگا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ آج کی دنیا میں آبادی کی اکثریت اب بھی کسانوں پر مشتمل ہے' لیکن یہ کہتے

MashalBooks.org

وقت ایک نہایت اہم حقیقت پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے؛ وہ یہ کہ یہ بات پہلی بار ممکن دکھائی دیتی ہے کہ وہ طبقہ جو اب تک دوسروں کو زندہ رکھتا آیا تھا' آئندہ خود زندہ نہ رہے۔ ایک صدی کے اندر کسان باقی نہیں رہیں گے۔

کسان جو رفتہ رفتہ ختم ہو رہے ہیں' حال سے متصادم ہو سکتے ہیں' ایسا کرتے وقت وہ یہ سوال اٹھا سکتے ہیں اور اس کی وکالت کر سکتے ہیں کہ اس وقت جس مستقبل کی تعمیر ہو رہی ہے' وہ ماضی کی عام توقعات سے کہاں تک مطابقت رکھتا ہے۔ سرمائے کو تو صرف اپنے اضافے سے دلچسپی ہے' وہ یہ سوال نہیں کر سکتا۔ مارکس جیسے دانش وروں سے بھی یہ سوال کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا' کیونکہ نظریاتی خوش فہمی سے یہ سوال ذرا دور کا ہے۔

(3) جیسا کہ ظاہر ہو رہا ہے' کسانوں نے اپنے آپ کو بے جان شے کی سطح سے اٹھا کر تاریخ کا زندہ وجود منوا لیا ہے۔ بیسویں صدی کے اندر چین سے لے کر کیوبا تک اور الجزائر سے ویٹ نام تک ان کی حیثیت انقلاب کے بنیادی تاریخی اوزار کی رہی ہے۔ اس طرح حال کے روبرو' وہ ایک سوال اٹھاتے ہیں اور اس کی پیروی بھی کرتے ہیں' جیسا کہ برجر نے کہا اور یہ سوال سرمایے کی طرف سے اٹھانا ممکن نہیں اور روایتی طرز کا مارکسی اس سوال کو کوئی اہمیت نہیں دے گا۔ سوال یہ ہے کہ مستقبل کے سماجی منصوبوں میں ماضی کی عام آزادی کی کس حد تک نمائندگی ہو رہی ہے۔

''متبادل ترقی'' کی کسی بھی سنجیدہ بحث میں' ایسی بحث انجینئرنگ کی تکنیکی لغت سے آگے کی چیز ہو گی' اس سوال کا ایک بامعنی جواب معلوم کرنے کی کوشش ضرور ہونی چاہیے۔ یہاں یہ صراحت ضروری ہے کہ ''امیدیں'' محض ''ماضی'' سے وابستہ نہیں' ان کا اظہار لازمی طور پر اقدار کے حوالے سے ہوتا ہے۔ خواہشیں اور امنگیں ماضی کی تو ہوتی ہیں' لیکن وہ انسانی وجود میں پیوست ہوتی ہیں' جن میں مروجہ بحران کے اندر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر تیسری دنیا کے ملکوں میں نظریاتی روایت پرستی کا اکثر شہرہ سنا جاتا ہے۔ (ذرائع ابلاغ نے 1960ء کی دہائی کے اوائل میں بدھ مت کی ''بازگشت'' کا جس قدر ڈھنڈورا پیٹا تھا' اس قدر اب اسلام کا چرچا کیا جا رہا ہے) یہ بھی نامساوی اور انتہائی درجے کی ''جدیدیت'' کا شاخسانہ ہے۔ ''عبوری'' دور کے معاشروں میں حال کے بارے میں فیصلہ اخلاقی طور پر تو ماضی اور ورثے میں ملنے والی اقدار کے حوالے سے' لیکن مادی طور پر مستقبل کے تعلق سے کیا جاتا ہے۔ یہیں پر ہماری سماجی اور سیاسی زندگی میں ایک نئے انداز کا دہرا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ اس دہرے پن سے نبٹنے کی اہلیت یا خواہش نہ ہو تو نتیجے میں شدید ناکامی کا احساس پیدا ہوتا ہے' جس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور کسی المناک حادثے کا امکان بھی رہتا ہے۔ ایک شخص کمبوڈیا کے لئے سوگوار ہے۔ ایران کے لئے اندیشے میں مبتلا ہے۔ رومانوی مصنفوں اور فنکاروں نے سرمایہ دارانہ عہد سے پہلے کے معاشروں کو ہمیشہ اس نظر سے دیکھا ہے گویا وہ امن اور سماجی یگانگت کے

MashalBooks.org

گہوارے ہوں اور جہاں کسی طرح کی تبدیلی اور تصادم موجود نہ رہا ہو۔ علما نے اس دور کو اس طرح دیکھا گویا وہاں ہر حال میں صابر اور قانع رہنے والے لوگ بستے ہوں یا انہوں نے تن بہ تقدیر رہتے ہوئے خود کو مصائب' آلام' بیماری' ظلم اور ایذا' لاعلمی اور بے یقینی کی زندگی کے حوالے کر دیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ داری سے پہلے کی دنیا میں مختلف نوعیت کی سماجی' اقتصادی اور سیاسی کشیدگی اور کھینچا تانی موجود تھی' بعض اوقات وہ تشدد اور تصادم کی صورت میں ظاہر ہوتی' جس کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی۔ بغاوتیں بھی سر اٹھاتیں' خانہ جنگی بھی ہوتی اور کبھی اس کا نتیجہ ایک حکمران گروہ کے مکمل خاتمے کی صورت میں نکلتا۔ اس کے باوجود روایتی معاشروں کا کلچر' وہی ایک بار ختم ہو کر اپنے ملبے سے دوبارہ پیدا ہونے والا کلچر تھا۔ لیکن اجتماعی نوعیت کی شکایات جس طرح ظاہر ہوتیں اور حل کی جاتیں' ان کا انداز منفرد ہوتا۔

1۔ روایتی طرز کی بغاوتیں اکثر اوقات مقامی اور فوری نوعیت کے مفادات کے دفاع میں موثر ثابت ہوتیں' لیکن جب یہ ضرورت پیش آتی کہ ساری قوتیں مجتمع کی جائیں اور گاؤں سے قبیلوں تک ایک مشترکہ مقصد کے حصول کی خاطر اس جدوجہد میں رابطہ پیدا کیا جائے تو یہ بغاوتیں نہایت بے اثر ثابت ہوتیں۔

2۔ ان کا نظریاتی موقف بالعموم مروجہ نظام کی بحالی کا ہوتا' یعنی اس نظام کے جواز پر سوال اٹھانے کی بجائے وہ اس کے حاکمانہ طور طریقے سمیت اس کی بحالی کے لئے کوشش کرتے۔ ایک ظالم کے خلاف احتجاج کرنے کی بجائے وہ ایک اچھے بادشاہ کا دفاع کرتے اور اس کے لئے آرزومند رہتے۔ ان کا حملہ بادشاہ پر ہوتا تھا۔ بادشاہت پر نہیں۔ سرمایہ داری سے قبل کے معاشرے میں کسانوں کی بغاوت اصلاح احوال کے لئے ہوتی تھی اور اکثر و بیشتر ایک جمے جمائے نظام کی تائید کا مقصد پورا کرتی۔

3۔ روایتی باغی ریاستی طاقت کے مخالف ہوتے تھے۔ ان کی اصل کوشش یہی ہوتی تھی کہ حکمرانی کم سے کم ہو' زیادہ نہ ہو۔ کسانوں کی بغاوتیں اکثر و بیشتر ریاست کے کردار میں توسیع اور بالادست حاکموں کی شدید حاکمیت کے خلاف ہوتی تھیں۔

4۔ روایتی بغاوتوں کے مقاصد نہایت ٹھوس اور محدود ہوتے۔ شاذ و نادر ہی ان کا مقصد ناقابل برداشت ناانصافیوں پر قدغن عائد کرنے کے لئے' نہ کہ ان کے کلیتاً خاتمے کے لئے ہوتا۔ ان میں لوٹ کھسوٹ کرنے والے سرداروں کے مظالم' حد سے بڑھی ہوئی بیگار اور حاکمانہ طاقت کی من مانی کارروائی شامل ہوتی۔ ان کی کوشش بالعموم یہ ہوتی کہ تھوڑا سا وہ تحفظ' جسے انہوں نے سخت کاوش سے حاصل کیا اسی کو برقرار رکھیں۔ پوری سوسائٹی کو نئے انداز سے مرتب کرنا یا اس کی تجدید نو کرنا' ان کا مقصد نہیں ہوتا تھا' وہ باغی تھے' انقلابی نہیں تھے۔

5۔ سرمایہ داری دور سے پہلے کے معاشروں میں ان کے غیر مستحکم بالائی ڈھانچے اور مضبوط بالائی ڈھانچے کے درمیان ایک مستقل افتاد کی صورت اسی سے واضح ہوتی ہے' بغاوتیں یکے بعد دیگرے ایک

MashalBooks.org

مستقبل تسلسل کے ساتھ رونما ہوتیں' یہاں تک کہ حکمران خاندانوں کا تختہ الٹ دیا جاتا لیکن وہ ابتدائی ادارے جو سیاسی اور اقتصادی زندگی کے معمولات کو چلاتے تھے' برقرار رہتے اور شورش کے بعد ان کی طاقت میں اکثر اضافہ ہو جاتا تھا۔

صنعتی اور سرمایہ داری دور سے پہلے کی سوسائٹی میں یہ صورت حالات اس زمانے کے اقتصادی' سیاسی اور سماجی حقائق کی بدولت برقرار رہیں۔ اس کیفیت کو ہم اب اختصار سے بیان کریں گے۔

احتیاط کی عام منطق کا رواج

سرمایہ داری دور سے پہلے کے معاشروں میں عام لوگوں کو یہ نظر آتا کہ زندگی کی بنیادی اور لازمی ضرورتوں تک رسائی کا انحصار قدرتی اور طبعی عوامل پر ہے اور یہ عوامل انسانی ضرورتوں سے بے نیاز اور اس کی کاوشوں اور انسانی منطق سے ماورا ہیں۔ (مثلاً سیلاب' طوفان' خشک سالی' فصلوں میں کیڑے لگ جانا' باہر کے چھاپے اور حملے اور سرداری لوٹ کھسوٹ) ان مستقل اور غیر یقینی خطرات کے مقابلے میں عام لوگوں کو بخوبی اندازہ ہو گیا کہ انسان کے تعلق سے یہ تمام چیزیں کتنی کمزور اور ناپائیدار ہیں۔ حالات اچھے ہوں تو کفایت شعاری' سخت کوشی اور مستقل مزاجی سے ہی اپنی سلامتی ممکن ہے' لیکن عذاب کا خطرہ تو ہر ایک کے سر پر لٹکا رہتا تھا۔ ان حالات نے لوگوں کو محتاط بنا دیا تھا' وہ اپنے گرد تحفظ اور تعین کا دائرہ' چھوٹا سا دائرہ کھینچ لیتے تھے اور اپنے صریح اور محدود مقاصد کے لئے کوشاں رہتے اور اپنی عبادت' چڑھاوے اور مناجات اور ٹونے ٹوٹکے اور رسوم کے ذریعے الوہی طاقتوں کی خوشنودی چاہتے تھے اور ان باتوں سے اجتماعی زندگی کے استحکام میں بھی مدد ملتی۔ کسانوں کو طاقت کا تجربہ یہ تھا کہ طاقت بنیادی طور پر مصائب کا سبب ہے' لہٰذا وہ اس پر بھروسا نہیں کرتے تھے۔ انہیں دھوکا دیا جا سکتا تھا۔ ایک کہاوت ہے کہ سوار گھوڑے پر ایک بار سواری گانٹھ لے پھر اسے ایڑ لگانا شروع کر دیتا ہے' چنانچہ اگر کسی کو اقتدار میں شریک کر لیا جاتا تو وہ بددیانت ہو جاتا اور پوری برادری سے بدعہدی کرتا جیسے وہ ابھی ابھی مسلمان ہوا ہے اور اپنا نسلی تعلق پیغمبر سے جوڑنے لگا ہے۔ کسان قدرتی عناصر کے خلاف نہیں تھے' بلکہ ان کے ساتھ مل کر اپنے کام کرتے تھے اور جس ہوا کی تیزی کے آگے ٹھہر نہیں سکتے تھے' اس کے آگے جھک جاتے تھے۔ جب کچھ جرات مندانہ اور نئے منصوبے درپیش ہوتے تو کسان انہیں قبول کرنے میں یہ سوچ کر تامل اور پس و پیش کرتے کہ ان کی حیثیت کہیں اس کہاوت کے بیوقوف آدمی کی سی نہ ہو جس نے بارش سے بچنے کے لئے ندی میں چھلانگ لگا دی تھی۔

ان باتوں کے باوجود کسان اس مثالی دنیا کے بارے میں سوچنے سے باز نہ آتے' جس میں انصاف کی حکمرانی ہو۔ ان کی زندگی میں ایک منظم' اقتصادی بے انصافی شامل کر دی گئی تھی۔ معمولی سی اضافی شے بھی ان سے چھین لی جاتی اور "دائمی محرومی" ان کی جان کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ جان برجر کا حوالہ ایک بار

پھر ... جب خوراک پیدا کرنے والا پابند ہو کہ اپنوں کو کھلانے سے پہلے دوسروں کو کھلائے تو یہ بات حسن انتظام کی مکمل ضد ہوگی۔ کسان یہ دلیل دیتا ہے کہ ایسی بے انصافی ہمیشہ رہنے والی نہیں' اس لئے وہ سب سے پہلے ایک منصف دنیا کا تصور کرتا ہے'(4) یہیں سے ایک خیالی اور دائمی تحریک پیدا ہوئی جو کاشتکار معاشرے میں اکثر اوقات زبردست لہر بن کر پھیل گئی' جب اصل دنیا کو اپنی پسند کی دنیا میں بدلنے کا خیال پیدا ہوا تو ان تحریکوں نے جنم لیا اور بالکل اچانک اور مکمل طور پر ایک قیامت خیز اتھل پتھل کی صورت میں جنم لیا۔ یہ بھرپور تحریکیں' لوگوں کے مشترکہ مزاجوں کی ترجمان ہوتی تھیں' ان میں یکسانیت نہیں ہوتی تھی اور عمل کا کوئی کارآمد پروگرام بھی نہ ہوتا تھا۔ ہمارے زمانے میں یہی ابتدائی نوعیت کی شورشیں انقلابی تحریکوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی ہیں اور جیسا کہ بیرنگٹن مور کے گزشتہ اقتباس میں آیا ہے۔ یہ تحریکیں ماضی کے دہرے پن (dualism) کو حال کے دہرے پن سے ملاتی ہیں۔

سیاسی طاقت کا جواز اور طاقت کا حصے بخرے ہونا

اقلیت کی حکمرانی' اس کی اشرافیہ نوازی اور بے انصافیوں کے باوجود سرمایہ داری نظام سے پہلے کے زمانے میں' عام لوگوں نے جو اس نظام کے تابع تھے' اس کا جائز ہونا کسی حد تک تسلیم کر لیا تھا۔ جواز (Legitimacy) ایک ایسی اصطلاح ہے' جس کی تعریف بہت بری کی گئی اور اسے غلط طور پر برتا گیا۔ بہرحال یہاں جواز سے مراد محض ایمان اور جذبات نہیں بلکہ اس سے بھی کمتر سطح پر اس سے مراد ہے' حکومت کی عوامی مقبولیت کا معاملہ۔ ریاست اور اس کے طاقت ور اداروں کا جائز ہونا اس وقت ثابت ہوتا ہے جب ریاست کے اجزا سختی اور دباؤ کے ذریعے نہیں بلکہ کچھ اصولوں کے تحت اس کی حکمرانی کو تسلیم کریں اور جب اس کے شہری پرجوش انداز سے اور بامعنی طور پر حکومت کے معمولات کی ادائیگی میں شریک ہوں' یعنی جب کہ خود حکومتی نظام (Self government) زیادہ سے زیادہ ہو۔ ان سب سے بالا کوئی حکومت کس حد تک جائز ہے۔ اس کی ضمانت یوں ملتی ہے کہ نظام اقتدار کے معمولات' ان طاقتوں سے کہاں تک ہم آہنگ ہیں' جو پیداواری نظام کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ اقتدار کو اپنا جواز پیدا کرنے کے لئے ایک متحرک نظریے کی تائید درکار ہوتی ہے۔ یعنی بادشاہ کا آسمانی حق حکمرانی' مذہبی فرمان' پروہتوں کی تائید یا سرداروں کی برتری۔ آئین کی دستاویزات میں جمہوری رضامندی کا اصول درج ہوتا ہے یا مزدور طبقے کی آمریت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے موثر ہونے کا جواز اس وقت پیدا ہوتا ہے جب معاشی اور سماجی طاقتیں اور ان کے مطالبے سیاسی اداروں اور ان کے رشتوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں۔ جب عام شہری اقتدار کی اطاعت کرنے کی بجائے' اس کے خلاف رفتہ رفتہ بغاوت شروع کر دیں تو حکمرانی کا جواز ختم ہونے لگتا ہے اور اس کا خاتمہ ہمیشہ انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ باغی عناصر عام طور پر اقتدار پر فائز لوگوں کی ناکامیوں اور

زیادتیوں پر احتجاج کرتے ہیں ان کے وجود کی صداقت سے انکار نہیں کرتے۔ لیکن اس کے برعکس انقلابی مروجہ نظام کی حکمرانی سے ہی انکار کر دیتے ہیں اور اس کے وجود کو ہی چیلنج کرتے ہیں۔ وہ پورے نظام کے جائز ہونے سے اختلاف کرتے ہیں' اس کے وجود کے بارے میں سوال اٹھاتے ہیں اور نئی اقدار کی بنیاد پر حکمرانی کی نئی اساس ڈھونڈتے ہیں اور نئے سیاسی اور اقتصادی بندوبست کا تقاضا کرتے ہیں۔

سرمایہ داری دور سے پہلے کے نظام میں ان کے وجود کا جواز کچھ نہ کچھ موجود ہوتا تھا' کیونکہ آج کی مرکزیت کے تعلق سے ان معاشروں میں ریاستی طاقت لازمی طور پر مختلف مراکز میں بٹی ہوئی ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ مرکزیت پر مبنی ہر نظام میں مثلاً چینی' مغلیہ یا عثمانیہ دور حکمرانی میں' اقتدار کم و بیش خود مختار قبیلے اور مذہبی رہنماؤں' بڑے قطعات کے مالک سرداروں' صوبائی گورنروں اور دوسرے سرکاری عمال کے درمیان تقسیم ہوتا تھا۔ جب بے چینی بڑھ جاتی تھی اور ٹوٹ پھوٹ شروع ہوتی تھی' تو باغیوں کا نشانہ عام طور پر مقامی عہدیدار بنتے تھے۔ اقتدار کا مرکز بالعموم دور ہوتا تھا' لہٰذا اسے ذمہ دار قرار نہیں دیا جاتا تھا۔ (''کاش بادشاہ کے علم میں یہ ہوتا'') بادشاہت یا خلافت کو حکمرانی کا جواز اور تقدس کا درجہ حاصل ہوتا تھا' لہٰذا اس پر سوال نہیں اٹھایا جاتا تھا۔ (اس طرح زور سابقہ نظام کی بحالی پر ہوتا) یہ جو مضبوط مرکز پر قائم جابرانہ ریاست قائم ہے' اور جسے نہایت منظم افسر شاہی اور قومی پولیس کی پشت پناہی حاصل ہے اور دفاع کے لئے ایک فوج دست بستہ کھڑی ہے' تو یہ دین بڑی حد تک مغربی سامراجیت کی ہے۔ ''مشرقی طرز کی حاکمیت'' تیسری دنیا میں 'مغربیت'' کا لبادہ اوڑھ کر داخل ہوئی ہے۔ یہ نو آبادیاتی عناصر کا ایک بہت اہم عنصر ہے۔ نو آبادیاتی نظام کے بعد کے دور میں اسے بہت فروغ حاصل ہوا اور جدیدیت کی آڑ میں اسے بہت طاقت ملی۔

مقامی مسائل اور پورے سماج پر پھیلے ہوئے مسائل کے درمیان رابطے کا ٹوٹ جانا

سرمایہ داری دور سے پہلے کے معاشرے عام طور پر جن وحدتوں سے مل کر بنتے تھے' وہ کثیر تعداد میں اور چھوٹی چھوٹی' آپس میں جڑی ہوئی' خود کفیل' خود مختار اور اکثر ایک دوسرے سے متصادم وحدتیں ہوتیں' جن کا ایک بڑے کل میں مدغم ہونا صریح طور پر نقائص سے پر تھا۔ ان کے اس طرح مدغم نہ ہونے سے نہایت اہم نتائج پیدا ہوتے۔ لوگ بیشتر زندگی مقامی معاملات میں الجھے رہتے۔ دیہی برادری یا اپنے لوگوں سے باہر کے افراد ان کے نزدیک غیر ضروری لوگ اور محض اجنبی ہوتے' جن سے بچنا اور جن کو نظر انداز کر دینا ہی بہتر ہوتا یا جو کٹر قسم کے دشمن گردانے جاتے' جن سے ڈرتے رہنا یا جن کے ساتھ معاملات درست رکھنا ہی مناسب سمجھا جاتا یا پھر انہیں اپنا شکار سمجھ لیا جاتا' جنہیں استعمال اور جن کا استحصال کیا جا سکتا تھا۔ اپنے قبیلے اور برادری کی حدود سے باہر تعاون کی صورت ایک دفاعی معاہدے کی صورت میں ہوتی اور اس وقت ہوتی جب ان سب کو باہر کے کسی دشمن سے اپنا وجود خطرے میں نظر آتا یا کسی قدرتی آفت کا سامنا ہوتا۔ چونکہ وہ

MashalBooks.org

سب منتشر ہوتے اور ان کے درمیان کوئی رابطہ نہ ہوتا' لہٰذا عام لوگوں کی اکثریت غیر منظم ہوتی اور اس حقیقت کے پیش نظر کہ ٹیکنالوجی سے پہلے جیسے ذرائع مواصلات مفقود تھے اور حالات کار بھی ایسے نہ تھے عام لوگوں کا بڑے پیانے پر اور استقامت کے ساتھ منظم ہونا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ مقامی مسائل بمشکل ہی کبھی پورے معاشرے پر محیط ہوتے۔ کارل مارکس نے فرانس کے کسانوں میں انقلابی توانائی کی کمی پر بحث کرتے ہوئے اس صورت حال کو خاص طور پر درج کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ''اگر لاکھوں خاندان اس طرح کی معیشت کے تحت اپنی زندگی گزار رہے ہوں' جو ان کے رہن سہن کے طریق' ان کے مفادات اور ثقافت کو دوسرے طبقوں کے رہن سہن' مفادات اور ثقافت سے جدا کرتی ہو اور آخر الذکر کے ساتھ معاندانہ اختلاف رکھتی ہو' تو ان 'لاکھوں خاندانوں' کی حیثیت ایک طبقے کی ہوگی۔ اور اگر ان چھوٹے کسانوں میں محض مقامی سطح پر رابطہ ہوتا اور ان کے مفادات کے نتیجے میں کوئی اجتماعیت' کوئی قومی تعلق پیدا نہیں ہوتا اور سیاسی تنظیم وجود میں نہیں آتی' تو وہ ایک طبقہ نہیں بنتے۔'' (5) اس کے بعد سو سال سے بھی کم عرصے میں تیسری دنیا کی طویل اور کامیاب انقلابی جدوجہد کے اندر کسان اس کی ریڑھ کی ہڈی ثابت ہوئے اور یہ اس لئے ہوا کہ ان غیر صنعتی ملکوں کے اندر انسانی حالات کا بنیادی تناسب تبدیلیوں سے دوچار ہوا ہے اور تبدیلی کا یہ عمل جاری ہے۔ یہ تبدیلی تیسری دنیا میں بغاوت سے انقلاب تک کے عبوری زمانے کی نشاندہی کرتی ہے۔

2۔ انقلابی چیلنج

انسانی تاریخ اور ٹیکنالوجی نے آج تیسری دنیا کے اندر شدید بے انصافی اور کشیدگی میں شدت پیدا کی ہے اور اس میں توسیع کی ہے۔ سرمایہ داری دور سے پہلے کے زمانے میں ان حالات کے تحت کسانوں کی بغاوتیں رونما ہوتیں اور طویل عرصے تک تحریکیں چلتی تھیں۔ ماضی میں سماجی اور سیاسی صورت حالات نے سماج میں پیدا ہونے والی بے چینی کو مذہب اور بغاوت کے دائرے میں گھیر کر رکھا تھا' لیکن اب یہ بات زبردست طور پر بدل گئی ہے اور اس کا سبب ہے (1) تیسری دنیا کی معیشتوں کا بین الاقوامی منڈیوں کے نظام میں جبراً ادغام (۲) سرمایہ داری زمانے سے پہلے کے سماجی اور معیشت کے انتظامی ڈھانچے پر جدید ٹیکنالوجی کا نفاذ' پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت اور (3) مذکورہ حالات کے نتیجے میں زمین اور محنت' دونوں کا جنس میں تبدیل ہو جانا۔ انگریزی میں اس کے لئے لفظ commodities آیا ہے۔ (سرمایہ داری منڈی کے مفہوم میں)

یہ بنیادی' اور غیر مساوی اور خارجہ تبدیلیاں تیسری دنیا کے حالیہ بحران کی توضیح کرتی ہیں۔ ماضی کی شکایتیں موجود رہتی ہیں' بلکہ ان میں بہت اضافہ بھی ہوتا ہے' تاہم جوابات بغاوت سے انقلاب کے درمیانی مرحلے کی نشاندہی کرتی ہے' وہ شکایتوں میں اضافے کی وجہ سے اتنی نہیں' جس قدر اس سیاسی صورت حال

کے سبب سے ہے جو ایک بہتر دنیا کی تعمیر کے لئے اجتماعی فیصلے پر عمل درآمد کے لئے مجبور کر دیتی ہے' اس صورت حال کی بنیادی قوت محرکہ اور اس کی اندرونی منطق صرف چند مخصوص مقاصد کے حصول تک محدود نہیں رہتی۔ مثلاً یہ کہ فی کس آمدنی کا اوسط' اور خوراک کی سطح بڑھادی جائے' بلکہ اس کا مقصد معاشرے میں اندر سے بنیادی تبدیلی لانا ہے۔ تمام طبقوں اور افراد کے مابین رشتوں کی تبدیلی' اشرافیہ اور عوام کے درمیان' قومی اقلیتوں اور اکثریتی آبادی کے درمیان اور عورتوں و مردوں کے درمیان تبدیلی۔

مہم جوئی کی منطق کا نفوذ

وہ اقتصادی' سماجی اور سیاسی رشتے جو پہلے احتیاط کی منطق کا تقاضا کرتے تھے' اب بہت کمزور پڑ گئے ہیں' کیونکہ ان میں بہت تبدیلی آ گئی ہے۔ تجزیہ نگاروں نے اس بارے میں بڑی وضاحت سے لکھا ہے اور ان حالات کی موجودگی پر بالعموم متفق ہیں' جنہوں نے روائتی معاشروں کو تبدیل ہونے پر مجبور کر دیا ہے اور وہ ہیں:

1۔ نوآبادیاتی نظام کے ساتھ تصادم' جس نے اور باتوں کے علاوہ' طاقت کے روائتی نظام کی حقانیت کو کمزور کر دیا اور اکثر کو سرے سے ہی ختم کر دیا اور نوآبادیاتی ملکوں کو بین الاقوامی سرمایہ دارانہ منڈی میں مدغم کر دیا' اگرچہ اس کی نوعیت غیر مساوی تھی۔

2۔ دیہات کو تجارت کی راہ پر لگانا' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روائتی معاشروں میں رائج ان کا اقتصادی' سماجی اور دیگر آبادیوں کے درمیان توازن تباہ ہو گیا۔ (پہلے جہاں گزراوقات کے یقینی مسائل سے منڈی کے معمولات متعین ہوتے تھے' اب وہاں منڈی کے معمولات سے زندگی اور اس کے مسائل کا تعین کیا جانے لگا۔)(6)

3۔ زراعت کو تجارت کی راہ پر چلانے اور اس میں ٹیکنالوجی کے غیر مساوی طور پر داخل ہونے سے کسان قلاش ہونے لگے' جس سے آبادی میں ہلچل
پیدا ہوئی اور اسی حساب سے پیداوار میں اضافہ ہوا۔

4۔ شہروں کا وجود میں آنا' جس کے ساتھ ہی دیہی عوام بے ٹھکانہ ہو کر نادار بستیوں میں آنے لگے۔

5۔ ثقافتی دربدری:

ان تمام حقائق کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ تیسری دنیا کے روایتی معاشرے منظر سے غائب ہو گئے۔ عام لوگوں کی ایک بڑی تعداد اب بھی پرانی ساخت کے قدیمی معاشروں میں رہتی آئی ہے' لیکن وہ بھی جدید' صنعتی اور اکثر شہری دنیا سے جڑے ہوتے ہیں' یہ وہ مرد اور عورتیں ہیں جو جرمن ٹلنین (Germaine Tillion) کے الفاظ میں ''دو دنیاؤں کی سرحد پر رہ رہے ہیں' اتھلے پانی کے درمیان'

ماضی کا آسیب ساتھ لگائے ہوئے اور مستقبل کے خواب گرم جوشی سے سینے سے چمٹائے ہوئے لیکن اس طرح کہ اپنے خالی ہاتھ اور خالی معدوں کے ساتھ' اپنے آسیبوں اور شدید خواہشوں کے درمیان انتظار کی کیفیت میں مبتلا ہیں۔" ایمی سیزر (Aime Ceaser) کی ایک نظم تیسری دنیا کی اکثریت کا نہایت صحیح تعارف پیش کرتی ہے۔ (7)

میرا نام: غضب ناک

میرا وسطی نام: ذلت کا مارا ہوا

میرا منصب: باغی

میری عمر: پتھر کا زمانہ

میری نسل: شکست خوردہ

اس بے چینی کی شدت کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ دنیا کو بے انصافی اور بدنظمی' دونوں حالتوں سے گزرنے کا تجربہ ہے۔ اس کے باوجود آج تیسری دنیا کا ماحول حیرت انگیز طور پر مایوسی سے بہت دور ہے۔ یہ احساس محرومی سے زیادہ غصہ پیدا کرتا ہے۔ نئی طرز کے تصورات' عقائد اور توقعات آپس میں مل رہے ہیں۔

1) موقع شناسی: یہ احساس پیدا ہوا کہ ایک شخص کا روایتی طرز زندگی دراصل بہت سے ممکنہ سماجی معمولات میں سے اس کے لئے ایک طرز زندگی کا انتخاب تھا اور یہ کہ وہ دوسرے طریقے' اکثر زیادہ نفع بخش اور انصاف پر مبنی تھے اور یہ احساس کہ روایتی عقائد تمام بنیادی مسائل کا حل پیش نہیں کرتے نیز یہ کہ بہت سے روایتی طور طریقے' تحکمانہ اور مہمل تھے اور انتہائی نامعقول۔

2) رجائیت: امید اور اختیار کا ملا جلا احساس اور یہ یقین کہ جو کچھ موجود ہے اسے موجود نہیں رہنا چاہیے اور لوگ اگر چاہیں تو اپنی حالت سدھار سکتے ہیں۔ انقلابی کارکنوں کی بدولت اس یقین کو فروغ حاصل ہوا ہے' جو ایک امید بھرا پیغام اور دعوت عمل لاکھوں افراد تک پیغام رسانی کے جدید ذرائع کی بدولت دے رہے ہیں۔ فرانز فینن (Frantz Fennon) نے لکھا ہے:

"یہ ایک نہایت پرجوش اور پریقین کوشش ہے' لوگوں کو اس یقین سے بہرہ مند کرنے کے لئے کہ ہر بات کا انحصار ان کے عمل پر ہے' اگر ہم ساکت ہیں تو یہ ان کی غلطی ہے' اگر ہم ترقی کرتے ہیں تو یہ ان کی مہربانی سے ہے۔"

اسی طرح آج تیسری دنیا کے ملکوں میں ہر موثر عوامی تحریک کے اندر اس کے پرجوش کارکنوں پر زور دیا جاتا ہے اور یقین دلایا جاتا ہے کہ دنیا میں کوئی مسئلہ ناقابل حل نہیں ہے اور کوئی دشواری ایسی نہیں جسے ختم نہ کیا جا سکے۔

MashalBooks.org

3) معقولیت: جرات مندی کی منطق کو بہت حد تک اس مفروضے سے مدد ملتی ہے کہ منصوبہ بندی، تنظیم سازی اور سائنسی علم کی بدولت سماجی مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔ ایک طرف کھیتی باڑی کی روایتی زندگی، فضول خرچی اور بے بنیاد امیدیں اور کسی منصوبے سے خالی، لیکن فاصلوں کو جس معجزانہ طریقے سے مختصر کیا گیا ہے، جنگل کے جنگل چند منٹوں میں کاٹ دیئے جاتے ہیں اور بھیڑوں کے پورے کے پورے گلے کی اون چند گھنٹوں میں اتاری جاتی ہے ان باتوں نے کسان کی زندگی میں حقیقی ممکنات کو نئے معنی عطا کر دیئے ہیں۔ اس طرح وہ صدر دروازہ کھل گیا جسے "ابھرتی ہوئی امیدوں کا انقلاب" کہا جاتا ہے۔

اقتدار سے مایوسی

نوآبادیاتی طاقتوں نے اپنی نوآبادیات میں ایک ایسا ریاستی نظام نافذ کیا تھا، جو اپنی بنیادی ساخت اور سماجی ترکیب میں سرمایہ داری سے قبل کے شاہانہ، جاگیردارانہ اور قبائلی نظاموں سے مختلف تھا۔ اس حقیقت کی بنا پر اور ایسی برادریوں میں تجارتی طریقوں کے رواج پانے اور اس کے نتیجے میں آبادی اور ثقافت کے اتھل پتھل ہونے کے باعث حق حکمرانی کی روایتی بنیادیں ٹوٹ پھوٹ گئی ہیں اور یوں اقتدار کا بحران پیدا ہو گیا ہے۔ سرمایہ داری زمانے سے پہلے کے باغیوں کے برعکس، حالیہ تیسری دنیا کے باشندے پرانے نظام کی بحالی کا مطالبہ نہیں کرتے۔ ان کی بے چینی کا سارا زور یہ ہوتا ہے کہ اقتدار کی تجدید کی بجائے اسے اٹھا کر باہر پھینک دینا چاہیے۔ "وہ زمانہ گیا جب کوئی کہتا تھا: "آہ! کاش بادشاہ کو اس کا علم ہوتا۔" ایک الجزائری کے بقول: "اب ہم یہ جانتے ہیں کہ بادشاہ کو ہر بات کا علم ہوتا ہے۔" (8) جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ اقتدار کے حق کے خلاف سوال اس وقت اٹھایا جاتا ہے جب پیداوار کے طریقوں کے سبب سے (ٹیکنالوجی سمیت) اقتصادی اور سماجی رشتوں کے بیرونی خطوط تبدیل ہوتے ہیں۔ نیا علم، اقتدار اور طبقات پرانے مفروضوں کو تباہ کر دیتے ہیں، اس کے علاوہ اب کئی صدیوں بعد پہلی مرتبہ صاف اور صریح متبادل طریقے پیدا ہوئے ہیں۔ موجودہ نظام جو ہمیں ورثے میں ملا، اس کا متبادل ایک غیر ملکی حکومت نے دیا ہے۔ یہ ایک مثال ہے۔ نئے نظریات، نئی متبادل صورتیں پیش کرتے ہیں جو زیادہ پرکشش ہیں۔ پرانے ادارے اور ان کی کارکردگی نئی ضرورتوں پر پوری نہیں اترتی اور ان سے نئی طاقتوں کی تشفی نہیں ہوتی، لیکن اقتدار کا بحران شدید ہو جاتا ہے۔ خوشگوار حالات میں یہ بحران تجدید و اصلاح سے حل ہو جاتا ہے لیکن زیادہ تر طاقت کے نئے نظام کو جس طرح کے اقتدار کی ضرورت ہوتی ہے، وہ انقلاب سے ظہور میں آتے ہیں۔

نجی مسائل کو عوامی مسائل میں منتقل کرنے کا عمل

سرمایہ داری نظام سے پہلے کے دور میں جب اجتماعی زندگی کی بالادستی ختم ہو گئی اس کی معیشت خود کفیل نہیں رہی اور بنیادی کارکردگی اس کی گرفت سے نکلنے لگی یعنی انتظامی، قانونی، تعلیمی اور اقتصادی شعبے

کی کارکردگی تو اس وقت نئے اور زیادہ طاقت ور اداروں کے لئے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔

1۔ کسانوں کا قومیت میں شامل ہونا۔ کسان اور پہلے کے کسان بھی اپنے آپ کو ایک بڑے معاشرے کا حصہ سمجھنے لگتے ہیں' وہ اپنے آپ کو الگ الگ برادری خیال نہیں کرتے' جنہیں اچھے حکمرانوں نے تنہا چھوڑ دیا اور ان پر ظالم مسلط کر دیئے بلکہ وہ اپنے آپ کو ان گروہوں اور برادریوں سے جوڑنے لگتے ہیں' جنہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا' پھر وہ کسان جو پہلے ایک دوسرے کو صرف اپنا دشمن سمجھتے تھے اب انہیں اپنے ہی جیسے کلفت زدہ لوگ جاننے لگتے ہیں۔ پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کے نجی اور مقامی مسائل کا تعلق ایک وسیع تر نظام سے ہے' وہی نظام یہ مسائل پیدا کرتا ہے' اور ان کی زندگیوں کی بہتری میں رکاوٹ ڈالتا ہے اور یہ کہ دوسرے افراد اور برادریاں بھی اس طرح کے نظام کے تحت ویسی ہی بدعملی کا شکار ہیں۔ اس طرح کارل مارکس نے جس

"آلوؤں کی بوری" کا ذکر کیا تھا' وہ اب آلوؤں کا بھرتا بن جاتا ہے۔

2۔ سیاسی تنازعے کی عقلی تفہیم: وہ لوگ جو کثیر تعداد میں ہیں اور جنہیں سیاسی عمل سے باہر رکھا گیا تھا' جب قومی سیاست میں در آتے ہیں تو عام آدمی رفتہ رفتہ کر کے سیاست کے لئے اہم ہونے لگتا ہے' عام لوگ بہت سے نوواردوں کے لئے ایک سیاسی سرمایہ بن جاتے ہیں۔ اس طرح سیاست' ایک مراعات یافتہ اقلیتی گروہ کے اندر طاقت کے حصول کی جدوجہد نہیں رہتی۔ اب سیاست مختلف سماجی نظام اور سیاسی مقاصد کے دعویداروں کے درمیان بٹ جاتی ہے جب سیاست میں مقابلہ شروع ہو جاتا ہے' محض عہدوں کے لئے نہیں طاقت کے لئے کہ اسے معاشرے میں تبدیلی کے لئے استعمال کیا جائے یا نہ کیا جائے اور جب مقابلہ انقلاب اور مفادات کو بحال رکھنے کے نظام کے درمیان ہو' تب یہ اس کے شرکا کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ ایک طرف چند لوگوں کے اندیشے ہیں' دوسری طرف بہتوں کا احساس محرومی' ان دونوں کے تصادم سے جو کشیدگی پیدا ہوتی ہے' وہ سماجی زندگی کے اندر پیوست ہو جاتی ہے اور پھر سیاسی تنازعوں کی عقلی تفہیم شروع ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ تیسری دنیا کے لئے ایک ہی انتخاب رہ جاتا ہے' رجعت پسندی چاہیے یا انقلاب۔

3۔ انفرادی نقطہ نظر کا ظہور: جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے' روائتی طرز کے باغی الگ تھلگ رہنے کے قائل تھے' اس طرح وہ بیرونی ریاستی اقتدار کی ظالمانہ موجودگی اور اس کی بڑھتی ہوئی شدت کے خلاف بالعموم احتجاج کرتے تھے۔ آج کی جدید اور بے ترتیب زندگی میں عام آبادی کے احساسات اس سے مختلف طرز عمل کا تقاضا کرتے ہیں۔ موجودہ عوامی سیاسی ماحول دعوت دہی کا ہے' وہ ریاست کو دعوت دیتا ہے کہ سماجی اور اقتصادی زندگی کو نئے سرے سے منظم کرنے کے لئے پوری طاقت کے ساتھ مداخلت کرے۔ یہ صورت

MashalBooks.org

حال اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ریاست کے اقتدار میں اضافہ اور اکثر غیر معمولی اضافہ ہو لیکن المیہ یہ ہے کہ ریاست جو اپنے اقتدار میں توسیع کرتی ہے وہ وہی ریاست ہوتی ہے جس کے ماضی میں ڈانڈے نو آبادیاتی نظام سے جڑے ہوتے ہیں اور جس کے وجود کا انحصار ہی نو آبادیاتی حکمرانوں کے ساتھ مسلسل رابطے پر ہوتا ہے۔

3۔ متبادل اندرونی تبدیلی

تیسری دنیا ایک انقلابی صورت حال سے دوچار ہے جسے محض نو آبادیاتی نظام کی مخالفت، قومی آزادی یا اقتصادی ترقی کے حوالوں سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ ایک سرگرم انقلاب ہے، سیاسی، سماجی اور اقتصادی، جو عوام کی اکثریت کے اشتراک سے اور ایک حقیقی اور بے مثل طاقت اور پوری تطعیت کے ساتھ رونما ہونے کو ہے، تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ایسی حالت میں کسی حکومت کی کامیابی کا امتحان اس کے ظاہری استحکام سے نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ استحکام کے معنی جمود بھی ہو سکتا ہے۔ مسلسل حرکت سے بھی اس کے استحکام کی تصدیق نہیں ہوتی، نہ پر بہار "نشوونما" سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اس میں پہلے سے زیادہ نابرابری اور استحصال کے عنصر شامل ہوتے ہیں۔ نہ اس کا پیمانہ یہ ہے کہ مراعات یافتہ حاکموں کی جگہ متوسط طبقے کے منیجر مقرر کر دیئے جائیں اور نہ اس طرح ممکن ہے کہ روایتی یا نو آبادی نظام کی حاکمیت کو ترمیم کے ساتھ کسی ایک پارٹی کی حکمرانی میں دے دیا جائے۔

اقتصادی ترقی کا لازمی مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ منصفانہ تقسیم کے مطالبے پورے کرے۔ نئے ادارے نہ صرف حرکت و عمل اور اختیار کا وسیلہ ہوں بلکہ جواب دہی کے لئے بھی تیار رہیں۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ تیسری دنیا کو فی الوقت جو چیلنج درپیش ہیں، ان کے ساتھ کامیابی سے عہدہ برآ ہونے کے لئے حکومت کو یا کسی تحریک کو ان چھ بڑے بحرانوں کا تخلیقی اور بامقصد طور پر جواب دینے کا اہل ہونا چاہیے۔ حکمرانی کا جواز، نو آبادیات کا خاتمہ، جمہوریت، ترقی، تقسیم اور ادغام۔ اس کے علاوہ ہماری دلیل کسی معمول کی ترجیح کے تحت نہیں بلکہ مصدقہ ریکارڈ کی بنیاد پر یہ ہے کہ تیسری دنیا کے چیلنج کا کسی قدر کامیابی سے مقابلہ کرنے کے لئے درج ذیل چھ باتوں کی تکمیل ضروری ہے:

1۔ ایک نظریہ، صاف اور صریح، منضبط اور بر سر عمل نظریہ۔

2۔ ایک انقلابی روشن فکر سیاسی قیادت۔

3۔ قیادت کا جواب دہی اور جمہوریت کے اصولوں کی پاسداری کا عہد۔

4۔ اداروں کا قیام جن کا طریق کار جمہوری عمل کو یقینی بنائے اور ارباب حکومت کو عوام کے سامنے جواب دہی کا پابند بنائے۔

MashalBooks.org

5۔ نئے ادارے اُن کی سیاست کے طریقے اور سیاسی علامات عوام کے تاریخی ورثے اور ان کے کلچر سے ہم آہنگ ہوں اور

6۔ منصوبہ بندی اور اس کی تنظیم خود انحصاری پر پختہ یقین اور فطری نشو ونما کی بنیاد پر ہو۔

وہ ممالک جو ان معیارات کی پابندی کلیتاً نہ سہی بڑی حد تک کرتے ہیں اُن کے لئے بہترین موقع ہوگا کہ سماجی تبدیلی کے عمل سے گزرنے کے دوران کم سے کم تشدد اور سیاسی مزاحمتوں سے دو چار ہوں۔ لیکن وہ معاشرے جو نہایت مضبوط مقامی مفادات کے تحت یا غیر ملکی مفادات کے تابع رہتے ہوئے اس ترقی پسندانہ اور جمہوری طریقے کو اختیار کرنے کی بجائے رد کر دیتے ہیں' وہ ممکن ہے کچھ عرصے تک اس چیلنج کے سامنے زندہ رہ جائیں' جس کی بھاری قیمت عام لوگوں کو ادا کرنی پڑے گی' لیکن بالآخر ان میں دھماکہ ضرور ہوگا اور کہیں زیادہ شدت کے ساتھ ہوگا۔

MashalBooks.org

حوالے

1 Moore Jr. Social Origin of Dictatorship and Democracy
Barrington
(Boston Press 966)

2 The Experience and the Modern World_New Society May
17,1997_Seehis(Pig Earth)John Berger:Peasant

3 ایضاً

4 Pig Earth

5 Karl Marx:The Eighteenth Brumair of Louis Bonaparte

6 Eric Wolf: Peasant Wars of Twentieth Century

7 Germaine Tillion: Algeria: The Realities

8 Farhat Abbas: La Nuit
(سہ ماہی 'عرب سٹڈیز' علی گڑھ 1980ء)

نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد نظام اقتدار

تیسری دنیا کے ملکوں میں صرف چند منفی خصوصیات مشترک ہیں' وہ ہیں اقتصادی پسماندگی' غیر ممالک میں اقتدار کے مراکز پر انحصار کرنا' پھر وہ آبادی جس کے افراد ناکافی خوراک پر زندہ ہیں۔ بے روزگار' افلاس زدہ اور زیادہ تر بنیادی تعلیم' رہائش اور صحت کی سہولتوں سے محروم ہیں۔ چند ایک کے سوا بیشتر ملکوں کی سیاسی زندگی کی خصوصیات یہ ہیں کہ اقتدار ایک مرکز کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اور حکومت مغرب کی پروردہ اشرافیہ کرتی ہے' جس کی طاقت کا وسیلہ انتہائی محدود ہوتا ہے یا اسے عوام سے کوئی طاقت سرے سے نہیں ملتی۔ موثر کارکردگی کے ادارے موجود نہیں ہوتے' جس کی وجہ سے حکومت عام لوگوں کے آگے شمہ برابر جواب دہ نہیں ہوتی۔ انتظامیہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرتی ہے' لیکن ایک آزاد عدلیہ میں اس کی چارہ جوئی کی راہ نہیں نکلتی۔

پسماندگی' غیر مساوی تقسیم اور غیر جمہوری سیاست کے اس وسیع منظر نامے میں' تیسری دنیا کے ملکوں کے درمیان بڑا فرق بھی ہے۔ تاہم ان میں جو مختلف تبدیلیاں پیدا ہو رہی ہیں ان کی شناخت اور تبدیلیوں کے اسباب کو سمجھنے کے لئے علمی سرمایہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ تیسری دنیا کے ملکوں کے درمیان متقابل حالات پر تحقیق کے لئے زیادہ زور اختلافات پر نہیں بلکہ مشابہات پر دیا گیا ہے۔ ترقی کے قرینے کیا ہیں؟ نظریاتی کلیوں کا تقاضا ہوتا ہے کہ انہیں سمجھنے پر زور دیا جائے اور ایسا کرتے ہوئے ان ریاستوں کے درمیان جس کا تقابل بظاہر موزوں ہے' نہایت اہم اختلافات کو بھی جو بہت اہم ہوتے ہیں' نظر انداز کر دیا جائے۔ (جن کی مثالیں یہ ہیں: صدر ناصر کا مصر اور عراق' تنزانیہ' یوگنڈا اور کینیا' ہندوستان' پاکستان اور سری لنکا) اور سماجی و اقتصادی حوالے سے ان کی درجہ بندی (بورژوا طبقہ' دلال بورژوازی' نیا متوسط طبقہ' فوجی و افسر شاہی اشرافیہ وغیرہ) کی جائے۔ یہ بات "جدیدیت" پر مبنی علمی کاموں پر بھی صادق آتی ہے اور حالیہ دنوں میں اس سے کمتر تعداد کے اندر شائع ہونے والی "مارکسٹ" تحریروں پر بھی۔ اس طرح "انحصاریت" کا نظریہ جو ابتدا میں نئے نوآبادیاتی روابط کو سمجھنے کے لئے نہایت اہم تھا عمومیت کے ساتھ اور مشینی انداز میں استعمال کیا جانے لگا۔ چنانچہ "انحصاریت" کی مختلف صورتیں اور کسی معاشرے کے ترقیاتی عمل میں اس کے اثرات' ان دونوں کے درمیان اہم امتیازات دھندلا گئے۔ حالیہ برسوں میں نوآبادیات سے آزاد ہونے والے معاشروں کے اندر مفادات کے حصول کا ایک خوشگوار عمل دیکھنے میں آیا ہے۔ لیکن اب تک کی تحریریں جو اس موضوع پر سامنے آئیں مجرد اور حقائق سے اتنی دور تھیں کہ بہت معنی خیز ثابت نہ ہو سکیں۔ نوآبادیات

MashalBooks.org

سے آزاد ہونے والی ریاستوں کے بارے میں اول دور میں جو نتائج مرتب کیے گئے' مثلاً فرانز فینس' روجر مرے اور حمزہ علوی کی تصانیف (1) 'وہ دانش ورانہ کاوش اور گہری بصیرت کی بنا پر نہایت شاندار تھیں۔ لیکن بدقسمتی سے اس موضوع پر بعد میں آنے والی تحریروں میں ان ابتدائی کاوشوں کے ساتھ چنداں انصاف نہیں کیا گیا۔ ایک طرف تیسری دنیا کی ریاستیں ہیں جو متوسط طبقے اور غیر ملکی اقتدار کے بااختیار مفادات کے تابع ہیں۔ اس کے بارے میں اخذ کردہ نتائج اور دوسری نواحی ریاستوں کے متعلق معلومات جو ایک ''اقتصادی'' اور ''فعال سیاسی ادارہ'' کی حیثیت سے موجود ہوں' اتنی کمیاب اور بکھری ہوئی ہیں کہ' ایک نظریے کے طور پر اس کی کوئی وقعت نہیں رہتی اور پھر مخصوص حالات اور رجحانات کا تجزیہ کرنے میں بھی ان سے کوئی مدد نہیں ملتی۔ ''ترقی کا عمل اور حاجت مند معاشروں کی حالت'' اس موضوع پر میرا ایک بڑا اور زیر تکمیل کام ہے۔ زیر نظر متن اسی مضمون کے چند عام نتائج کی ایک تلخیص ہے۔ تیسری دنیا کی سیاست پر حالیہ تحریروں کا ایک ناقدانہ جائزہ اس مضمون کے دائرے سے باہر ہے۔ یہاں صرف اس قدر لکھنا کافی ہوگا کہ میں نے اسباب و علل کی ایک مسلمہ اور سیدھی لکیر جیسے نظریے کو قبول نہیں کیا۔ میرا نظریہ معلومات کو اخذ کرتے ہوئے انہیں مرتب حال میں پیش کرنا ہے۔ حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے میں نے انتونیو گرامچی کی دانش سے استفادہ کیا ہے جو اس کا مجھ پر قرض ہے۔ ''بالادستی'' کا نظریہ'' مختلف طاقتوں کا باہمی رشتہ'' اور'' مختلف حالات کے تجزیے میں دہرے امکانات'' اسی کے نظریے ہیں۔ (2) اس مضمون کا مقصد تیسری دنیا کے اندر ہونے والی تبدیلیوں کی یکسانیت سے زیادہ' ان کے متنوع حالات کی نشاندہی اور ان کی تفہیم ہے۔ تیسری دنیا کی قوموں کی موجودہ زندگی اور ان کی تاریخ میں سامراجیت اور طبقاتی جدوجہد اور ان کے درمیان تعلق کی نوعیت ایک بنیادی اور فیصلہ کن حقیقت ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے مضمون میں سیاست کے صریح اور آزاد کردار کا تعین اور کلچر' اخلاقیات' تاریخ کے تجربات اور نظریے کی اہمیت کا اقرار کیا گیا ہے۔

تیسری دنیا کے بیشتر ملکوں کو ان کے گزشتہ زمانوں کے حوالے سے ان کی رسمی قانونی حیثیت' نظریاتی ترجیحات' اقتصادی حکمت عملی' سیاست میں ان کے طرز عمل اور بین الاقوامی روابط کی بنا پر اقتدار کے درج ذیل خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1۔ انتخابی پارلیمانی نظام (یعنی ہندوستان' سری لنکا' ملائشیا' جمیکا' سنگاپور)

2۔ درباری نظام (ascriptive) (palace) (system) (یعنی مراکش' نیپال' سعودی عرب' کویت)

3۔ خاندانی اقتدار کا نظام جس میں اقتدار چند ہاتھوں میں مرکوز ہوتا ہے۔ (یعنی نکراگوا' سوموزا کے زیر حکومت' ہیٹی' پیراگوئے)

4۔ عملی ضرورت پر مبنی تحکمانہ انداز حکمرانی (pragmatic authoritarian system) (

آئیوری کوسٹ سینیگال' تونس' زمبیا' کیمرون اور سادات کے زیر حکومت مصر)

5۔ قوم پرستی پرمبنی نظام (radical nationalist system) (یعنی الجزائر' تنزانیہ' میکسیکو' عراق' شام' سوائے لیبیا اور سوئیکارنو کے زیر حکومت انڈونیشیا)

6۔ مارکسسٹ سوشلسٹ نظام (یعنی کیوبا' موزمبیق' گنی بساؤ' ویت نام)

7۔ نیا فسطائی نظام (neo-fascist system) (یعنی برازیل' انڈونیشیا' چلی' یوروگوئے ارجنٹائن' شاہ کے ماتحت ایران' زائرے)

ایک وضاحت کرتے چلیں' درجہ بندی کا صرف یہی واحد طریقہ نہیں ہے۔ مختلف معیارات کے تحت ریاستوں کی مختلف درجہ بندی ہوسکتی ہے۔ اس کا مقصد محدود ہے۔ تیسری دنیا کے ملکوں میں سیاست کے متنوع طریقوں کی جانب لوگوں کو توجہ دلانا اور ایک خاکہ بنانا ہے' جس میں رہتے ہوئے متعلقہ ملکوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کیا جاسکے اور تبدیلی کے عمل کو بہتر طور پر سمجھا جاسکے اور اس بات کو بھی سمجھا جائے کہ ایک نظام سے دوسرے نظام کی طرف تبدیلی اچانک کس طرح ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ یہ درجہ بندیاں مجموعی اعتبار سے ہمہ گیر نہیں ہیں' کچھ ریاستیں ایسی ہیں اور ان میں برما اور ایتھوپیا کے نام فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں' جنہیں ایک خاص وقت میں کسی ایک خانے کے اندر نہیں رکھا جاسکتا۔

تیسری بات یہ کہ تیسری دنیا میں ملے جلے سیاسی نظام کی اتنی کثرت ہے اور ریاستیں مسلسل تبدیلی کے عمل سے گزرتی رہتی ہیں کہ ان کی قطعی انداز سے درجہ بندی ممکن نہیں رہتی۔ مثال کے طور پر سوئیکارنو کے زیر حکومت انڈونیشیا میں پہلے ایک انتخابی نظام رسمی انداز سے نافذ تھا اور بہت سے قوم پرست ملکوں کے برعکس جس میں اکیلی پارٹیاں حکومت کررہی ہیں انڈونیشیا ایک کثیر الجماعتی ملک تھا' اس کے باوجود دوسری مضبوط خصوصیات کی بنا پر میں نے اسے قوم پرست حکومتوں کے درجے میں شمار کیا ہے۔ سینیگال میں کچھ خصوصیات قوم پرست ملکوں کی ہیں اور چند ایک روایتی درباری نظام کی۔ تاہم میں نے اسے عملی ضرورت پر مبنی تحکمانہ حکمرانی کے خانے میں رکھا ہے۔ مصر اور تیونس جو ناصر کے زیر اقتدار تھے اور دس سال کے عرصے میں جہاں تیونس کے منصوبہ بندی کے وزیر احمد بن صلاح کی بدولت تعمیر کا عمل جاری تھا' اب وہی ملک دائیں بازو کی طرف جاتے ہوئے تحکمانہ انداز حکمرانی کے درجے میں پہنچ گیا۔ ایران میں پہلوی حکومت جس کی بنیاد 1924ء میں کرنل رضا خاں نے رکھی تھی۔ اپنے قیام کے بعد سے ویسی ہی رہی جیسی لاطینی امریکہ میں سوموزا' بتیستا اور تروجیلو کی حکومتیں ہیں' جن پر ایک خاندان کے مختصر گروہ کی حکمرانی رہی' یہاں تک کہ 1960ء کی دہائی میں مغرب بالخصوص امریکہ کے علاقائی مفادات بروئے کار آئے اور تیل کی آمدنی میں اضافہ ہوا تو یہ حکومت پوری طرح ایک نئی فسطائی حکومت بن گئی۔ ادھر پاکستان دو عشروں کے اندر جمہوریت اور آمریت کے درمیان ڈرامائی طور سے جھول رہا ہے۔ لہٰذا یہ درجہ بندی ایک دائرے میں اس گردش کے

MashalBooks.org

عمل کو سمجھنے کی کوشش ہے۔ یہ عمل ایک خط مستقیم میں نہیں ہوا۔ شاید اس ملک کے بدلتے ہوئے کردار کی وضاحت لفظ "نظام" کے مقابلے میں "حکمرانی کے انداز" کے الفاظ صحیح طور پر کرتے ہیں۔

آخر میں سات میں سے ایک نظام رہ گیا۔ یعنی "مارکٹ سوشلسٹ" جو نوآبادیاتی نظام سے یکسر الگ ہے اور ایک بالکل نیا اور مختلف نظام پیش کرتا ہے۔ اس درجے کے ملکوں میں کیوبا سے ویت نام تک نئے ریاستی ڈھانچوں کی تشکیل کے سلسلے میں تفریق وسیع پیمانے پر موجود ہے تجزیہ کہ ان کے یہاں اپنے عوام کے ساتھ حقیقی اور توانا رشتے کی نوعیت کیا ہے' عوامی اقتدار کو وہ بامعنی طور پر کہاں تک استعمال کرتے ہیں اور عوام کے آگے کس حد تک جواب دہ ہیں اور ان کی حکومتیں کس انداز سے چل رہی ہیں؟ ان ملکوں کا تقابلی تجزیہ نوآبادیاتی نظام کے بعد آنے والے معاشروں میں مارکٹ سوشلسٹ نظام کی ترقی کو اور اس سے وابستہ توقعات اور ناکامیوں کو سمجھنے کے لئے بے حد اہم ہے۔

انتخابی پارلیمانی نظام

نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد پارلیمانی نظام چند ملکوں میں نہایت بالادست ہے اور مستحکم ہو چکا ہے۔ قبل ازیں چند دوسرے ملکوں میں اس پر قوم پرستوں کا غلبہ رہا۔ (یعنی 1952ء کا مصر' 1954ء کا شام' 1958ء کا پاکستان) یا نیا فسطائی نظام (ایران 1953ء' برازیل 1964ء' انڈونیشیا 1965ء' چلی 1973ء)۔ فسطائیت سے بچ نکلنے والے ملکوں کی فہرست سے' جن کی قیادت ہندوستان کر رہا ہے' معلوم ہوتا ہے کہ تیسری دنیا کے ملکوں میں کثیر الجماعتی جمہوریت کی کامیابی میں' علاوہ دیگر اسباب کے' درج ذیل اسباب بھی کام کر رہے ہیں۔ آبادی میں کئی گروہوں کی موجودگی (مذہبی اور لسانی تنوع) قومی بورژوازی کی مناسب قوت جو ریاست کی گرفت سے نسبتاً آزاد ہو' اور جدید معیشت کے پیداواری شعبے میں کسی قدر با اختیار ہو' ایک ترقیاتی پالیسی کا نفاذ' جس میں مقامی سرمایہ دار طبقے کو جو پیداوار کی طرف مائل ہو' ابھرنے کا موقع ملے۔

انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں اس لئے ہوتی ہیں کہ حفاظتی قوانین حکومت کو ایک حد کے اندر من مانے اختیارات دے دیتے ہیں' جن کا بالعموم غلط استعمال ہوتا ہے۔ اندرا گاندھی کی طرف سے ایمرجنسی کا اعلان سرکاری اختیار کے استعمال کی بدترین مثال ہے۔ عام طور پر ایک نسبتاً آزاد عدلیہ' آزاد پریس اور پارلیمنٹ میں ہونے والی تقریریں اور مباحثے جو کسی حد تک ضابطے کے تحت آزادی کی ضمانت دیتے ہیں' یعنی تقریر اور تنظیم کی آزادی' من مانے طریقے سے یک طرفہ طور پر لوگوں کی گرفتاریوں کی ممانعت اور ان پر باضابطہ تشدد سے بچاؤ' یہ ہیں وہ آزادیاں جن کی مثال حکومت کے کسی دوسرے نظام میں نہیں ملتی۔ البتہ اس نظام میں حقیقی آزادی کا دائرہ یعنی فاقے' بے دخلی' ناخواندگی اور دربدری سے نجات کا دائرہ نہایت تنگ ہوتا

ہے۔اس کے باوجود اس نظام کا ایک جواز یہ ہے کہ اس میں عام رائے دہی کے اصول کے تحت وقفے وقفے سے انتخابات ہوتے ہیں۔ جس سے حکومت کا اپنے رائے دہندوں کے آگے جواب دہ ہونا یقینی ہو جاتا ہے۔اس کی بدولت ایک بڑا سیاسی طبقہ اپنی جگہ برقرار رہتا ہے اور اس کا دائرہ وسیع ہوتا رہتا ہے۔اس وجہ سے شہریوں کے معاشرے اور اقتدار کے درمیان ایک تعلق قائم رہتا ہے۔اس نظام کے وجود کا جواز یہ بھی ہے کہ اس کے تحت ایک نسبتاً آزاد عدلیہ اس مفروضے کے ساتھ اپنا کام کرتی ہے کہ اس کی اساس معقولیت پر ہے اور وہ قابل اصلاح بھی ہے۔ان سب کے علاوہ اس انتخابی انتظام میں عوامی مطالبات کو قبول کرنے کی اہلیت ہے اور باضابطہ سیاست میں بھی اس کے لئے قبولیت موجود ہوتی ہے۔جیسا کہ اس مضمون میں آئندہ بحث ہوگی۔جمہوری سیاست کی جگہ فوج اور اکثریتی فسطائیت پر مبنی حکومت اس وقت اقتدار پر قبضہ کر لیتی ہے جب منظم عوامی مفادات انتخابی عمل کے ذریعے طاقت پکڑنے لگتے ہیں۔

درباری نظام

درباری نظام اقتدار جو آج تیسری دنیا میں حکمرانی کا قدیم ترین طریقہ ہے پسپا ہوتا جا رہا ہے۔ یہ "جدیدیت" کی پیدا کردہ سماجی طاقتوں اور کشیدگیوں کا روائتی شکار ہے۔ یہ نظام بعض ملکوں (مراکش، اردن، نیپال) میں اس وجہ سے برقرار ہے کہ اس کے وجود کا ایک جواز (روائتی حاکمیت کی بنا پر) شہریوں کی ایک بڑی تعداد کے لئے قابل قبول ہے۔نیز معاشرے کا ایک اہم عنصر سماجی توازن اور سیاسی نظام کی خاطر اسے برقرار رکھنا ضروری سمجھتا ہے۔ چند دوسرے ملکوں میں (سعودی عرب، کویت، ابوظہبی) روائتی طرز حکمرانی کو محض اس بنا پر زبردست طاقت مل گئی کہ ان کے پاس اچانک بہت دولت آ گئی اور وہ بھی ایک ایسے ملک میں جہاں ایک ہی طرح کے لوگ آباد ہیں اور آبادی بھی مختصر ہے چنانچہ کسی قدر خوشحالی تقریباً تمام شہریوں کے حصے میں آئی ہے اور حقیقی آزاد خیالی بھی خاصی حد تک میسر آئی ہے۔

حکمران ان ملکوں میں سودے بازی لوگوں کو ساتھ ملانے کے حربے استعمال کرتے ہیں معاہدوں میں ردوبدل اور جوڑتوڑ کرتے اور حریفوں اور حلیفوں، سب کو ہراساں رکھتے ہیں اور اس طرح اقتدار پر ان کی گرفت مستحکم رہتی ہے۔ان ملکوں میں انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیاں وقتاً فوقتاً بڑے پیمانے پر ہوتی ہیں۔آزاد عدالتیں شاذ و نادر ہی کبھی قانون کے تقاضے پورے کرتی ہیں، لیکن سیاسی نظام کا یہ احساس کہ اسے اپنا جواز باقی رکھنا ہے آڑے آتا ہے اور معاشرے سے اس کے رشتے اور معاشرے کے معمولات کے لئے اس کا احترام اور سیاسی لین دین کا ماحول، یہ سب باتیں مل کر تشدد میں کمی اور اس کی حدود کو تنگ رکھتی ہیں۔البتہ جب یہ نظام اپنا جواز کھونے لگتا ہے، اس وقت حکومت کے متشددانہ رویے میں خاصا اضافہ ہو جاتا ہے اور انسانی حقوق سے باقاعدہ انحراف کا رویہ بڑھ جاتا ہے۔ جب رویے میں اس طرح کی تبدیلی آئے تو

MashalBooks.org

یہ گویا اس نظام کے خاتمے کی ابتدا ہوگی۔

ان ریاستوں کی اقتصادی اور سماجی پالیسیاں قدامت پسندانہ ہوتی ہیں'وہ بھاری املاک رکھنے والوں کو پسند کرتے ہیں'نجی ملکیت کے شعبے کو اور غیر ملکی سرمایہ کاری کو عزیز رکھتے ہیں۔ زرعی اصلاحات اور دولت کی ازسرنو تقسیم کی مزاحمت کرتے ہیں' جس کی وجہ سے حقیقی آزادیوں کی حدود تنگ ہوتی رہتی ہیں۔ (سوائے چھوٹی ریاستوں کے' جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے'وہ ریاستیں جو تیل کی دولت سے مالا مال ہیں) ان ریاستوں میں عام لوگوں کی فلاح سے تعلق کا اظہار سرپرستانہ اور علامتی انداز سے ہوتا ہے۔بعض صورتوں (یمن'لیبیا'ایتھوپیا'افغانستان'نیپال) میں حکمران سماجی تبدیلی کے امکان کو سختی سے دبائے رکھتے ہیں'لیکن ان تمام مثالوں میں ایک نیپال کے سوا باقی ہر جگہ جدید تربیت یافتہ فوجیوں نے حکمرانوں کو حکومت سے بے دخل کر دیا ہے۔ جب سے نوآبادیات کے خاتمے کا عمل شروع ہوا ہے'ان حکمرانوں کی برطرفی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ درباری نظام حکومت نے آزاد قوم پرست عناصر کی بغاوت کے آگے سپر ڈال دی۔ لیکن اقتدار جمہوری طاقتوں کو نہیں دیا اور نہ سوشلسٹ تحریک کے حوالے کیا' نہ ہی اس نئے فسطائی گروہ کو منتقل کیا۔

گروہی حکمرانی کا نظام

گروہی حکمرانی کا نظام زیادہ تر لاطینی امریکہ میں پایا جاتا ہے۔ کئی لحاظ سے یہ نظام 1960ء اور 1970ء کے عشروں میں قائم ہونے والی نئی فسطائی حکومتوں کا پیش رو ہے۔ اس بنا پر اس کی ساخت میں اور رویوں میں بھی فسطائی ریاستوں کے انداز پائے جاتے ہیں۔ تیسری دنیا کے اندر دائیں بازو کی پرانی اور نئی ظالمانہ حکومتوں کے درمیان بنیادی فرق جو ان کے اداروں کی ساخت اور دہشت خیزی کے طریقوں کا ہے' جو ابتدا میں دور تک نہیں پھیلتے' ایک نظام کے تحت چلتے ہیں اور نئی فسطائی حکومتوں کے مقابلے میں قبل از وقت کارروائی پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے وسائل نسبتاً کم ہوتے ہیں اور ان میں فرق آبادی کی طاقت کو اہمیت دینے کا ہے۔ (جس کی اہمیت ان کے یہاں کم ہے) چونکہ ان کا تعلق غیر ملکی اقتدار اور کثیر الملکی دارالحکومتوں سے ہوتا ہے'اس لئے یہ نظام اپنے وجود کا جواز نہیں رکھتا اور بالآخر ایک منظم' مقبول عام اور اکثر انقلابی تحریکوں کے آگے پسپا ہو کر دم توڑ دیتا ہے۔

ضرورت پر مبنی تحکمانہ نظام

یہ نظام حکومت زیادہ تر افریقہ میں ہے اور خاصا مستحکم ہے۔ زمانہ حاضر کی افریقی ریاستوں کے چوالیس بانی حکمرانوں میں سے اب صرف دس برسراقتدار رہ گئے ہیں۔ (یہ ہیں جیولیس نائریرے'احمد' سکو طور'احمد دادجو' حبیب بورقیبہ'فلیکس ہوفیوٹ بوگنی' لیوارڈ سنگھو' کینتھ کونڈا' سانور میکائل'او گستھو نیٹو اور لوئی

کیبرال) ان میں سے پانچ اس سلسلے میں آگے آگے ہیں' جبکہ تین صرف چند سال تک خودمختار رہ سکے۔ (یہ ہیں میکائیل' نیئو اور کیبرال) صرف پانچ ہیں جنہوں نے برسرِ حکومت رہتے ہوئے وفات پائی۔ (یہ ہیں جمال عبدالناصر' سرلٹن مارگائی' ولیم ٹب مین' لیون ایمبا اور جوموکنیاٹا) ان میں سے تین کا تعلق اسی درجے سے تھا۔ باقی سب کے تخت الٹائے گئے۔ (یہ کام ووٹروں نے نہیں کیا) اس انتہائی ذاتی قسم کے طرزِ حکومت کو ان کے رہنماؤں کی تاریخی قوم پرستی کے حوالے سے آبادی کے ایک بڑے طبقے کی حمایت حاصل ہے اور کسی قدر یہی ان کے وجود کا جواز ہے۔ ان حکومتوں کو دیہات کی سرکردہ شخصیتوں اور شہر کے متوسط طبقے کی حمایت میسر ہے' اس کے ساتھ ہی حکمراں جماعت کا کردار' رابطے اور اپنی مضبوط گرفت کی بنا پر حکومت کے استحکام میں اضافہ کرتا ہے۔ البتہ حکومت کی جائز معیشت اس وقت کھوکھلی ہونے لگتی ہے جب اس کے ارکان سیاسی اشرافیہ کی انتظامی اہلیت پر انحصار کرتے ہیں اور شہری آبادی کے ساتھ اپنے روابط کی خاطر ریاست کی افسر شاہی سے آس لگائے رکھتے ہیں' اس وقت سیاسی جماعت اپنی شراکتی ذمہ داریوں سے اور کارکردگی سے جو اسے نمائندگی کے وسیلے سے حاصل ہے' لاپروائی برتنے لگتی ہے۔

ان ریاستوں کی اقتصادی پالیسی میں عام طور پر نجی شعبے کو سراہا جاتا ہے۔ غیرملکی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ بیرونی فنی اور اقتصادی امداد پر بہت زیادہ انحصار کیا جاتا ہے۔ زراعت اور مزدوروں کے ساتھ تعلق کے باب میں جو روایتی یا نوآبادیاتی نظام مدتوں سے چلا آ رہا ہے' ان میں کم سے کم اصلاح تجویز کرتی ہے۔ بہرحال نوآبادیاتی حکمرانوں نے جو نمونہ قائم کیا تھا' اس کو ایک ضابطے کے مطابق چلائے رکھنے میں اپنا کردار ادا کرتی ہے' خاص طور پر انتظامیہ اور مزدوری کے تعلقات کے باب میں اور کبھی کبھی شہری خدمات کی انجام دہی کے لئے اور خاص طور پر صحت عامہ اور تعلیم کے شعبے کی خاطر بہتر کارگزار ادارے تیار کرتی اور ان میں توسیع کرتی ہے۔ شہری آزادیاں نہایت محدود ہوتی ہیں۔ خاص طور پر جو عدالتیں بنائی جاتی ہیں وہ سیاسی نوعیت کے مقدمات میں نسبتاً آزاد عدالتوں کے کردار کو بے اثر کردیتی ہیں۔ انسانی حقوق بے دردی سے پامال کئے جاتے ہیں۔ (ایذا دہی' مقدمہ چلائے بغیر قید کی سزا) لیکن اپنی شدت اور دائرہ کار میں یہ محدود ہوتے ہیں۔ ان ریاستوں کی دو قابلِ ذکر خصوصیات ہیں' یہ انتہائی مغرب نواز ہوتی ہیں اور اپنے سابق نوآبادیاتی حکمرانوں کے ساتھ نہ کہ امریکہ کے ساتھ مضبوط سیاسی' اقتصادی اور ثقافتی رشتے قائم رکھنا چاہتی ہیں۔ مسلح افواج کی طاقت ایک دائرے میں محدود ہوتی ہے' چنانچہ سول افسروں کے مقابلے میں فوجی افسروں کو سرکاری مراتب میں کمتر حیثیت دی جاتی ہے۔ اکثر اوقات ایک حکومت کو اندرونِ ملک فوجی خطرے سے محفوظ رکھنے کے لئے کوئی بالاتر طاقت سہارا دیتی ہے۔ چنانچہ فرانس کے فوجی دستوں کو سینیگال اور آئیوری کوسٹ میں متعین کیا گیا اور برطانوی افواج نے 1964ء میں تنزانیہ اور یوگنڈا میں فوجی بغاوت کو کچلنے کے لئے مداخلت کی۔ (ماڑیرے کے بعد جب ملٹن اوبوٹے حکومت میں آئے اور

MashalBooks.org

انہوں نے (بائیں چلو) کا نعرہ دیا جس کا بہت چرچا ہوا تو عیدی امین نے 1971ء میں فوجی بغاوت کر دی۔ اس وقت ایک سول حکومت کی حمایت میں مداخلت کرنے کی بجائے برطانیہ نے جیسا کہ بالعموم خیال کیا جاتا ہے' اسرائیل کے تربیت یافتہ جنرل امین کی حوصلہ افزائی کی۔

آزاد قوم پرستی پر مبنی نظام

آزاد قوم پرست ممالک جو 1950ء کے عشرے میں سامنے آئے' پوری 1960ء کی دہائی میں نا وابستہ اقوام کی تنظیم پر حاوی رہے۔ وہ اپنے دعوے کے بموجب ایک آزاد' غیر سرمایہ دارانہ' غیر مارکسی لیکن تیسری دنیا کے معاشروں کی تعمیر میں خود انحصاری کے راستے کی نمائندگی کر رہے تھے' ان کی نمائندگی کرشمہ ساز لیڈر جو اپنی جگہ "ہیرو" تھے کر رہے تھے۔ (یہ تھے جمال عبدالناصر' کوامے نکرومہ' احمد سوئیکارنو' احمد بن بلا وغیرہ) ان کی رہنمائی میں یہ حکومتیں ملوکیت کے خلاف نعروں سے سرشار اور عوام پسند خطابت اور اصلاح و تعمیر نو کی امنگوں سے سرمست تھیں۔ بعض گوشوں سے ان کے خلاف اندیشے محسوس کیے گئے' بعض علاقوں میں انہیں سراہا گیا اور انہیں تیسری دنیا کی آزاد امنگوں کے صحیح اظہار کی علامت سمجھا گیا۔ لیکن 1970ء تک پہنچ کر ان کا ولولہ جاتا رہا۔ بہت سے ملکوں میں ان آزاد قوم پرست حکومتوں کا جھکاؤ دائیں طرف ہو گیا۔ (مثلاً تیونس' مصر' سوڈان) چند دوسرے ملکوں میں ان کی حکومتیں' فوجی طاقت اور اکثر نئی فسطائیت کی بغاوت کے آگے ڈھیر ہو گئیں۔ (مثلاً انڈونیشیا' گھانا' یوگنڈا' کمبوڈیا وغیرہ) بیشتر ملکوں میں حکومتوں کی بے عملی ان کی نمایاں خصوصیت بن گئی۔ حالانکہ وہ کبھی متحرک اور باعمل ہونے کی دعویدار تھیں۔ الجزائر کی طرح شاذ ہی کہیں تعمیر نو کی نشانیاں نظر آتی ہیں۔

ریاستوں کی سات درجوں میں جو تقسیم ہوئی ہے' ان میں آزاد قوم پرستوں کا درجہ سب سے زیادہ وسیع ہے۔ اس کے دائرے میں بڑی وسعت ہے۔ ان میں شامل ریاستوں کی ترقی اور توانائی کی مختلف سطحیں ہیں۔ گھانا' گنی اور انڈونیشیا نے اور بعد میں الجزائر اور عراق نے بھی سرکاری طور پر اعلان کیا کہ ریاست کی جانب سے صنعتی تعمیر تیز رفتاری کے ساتھ کی جائے گی۔ لیکن نکروما اور سوئیکارنو کی بلند بانگ اور خام کارانہ پالیسی نے گھانا اور انڈونیشیا کی ترقی میں روڑے اٹکائے۔ اگر معدنیات کی آمدنی کو الگ کر دیا جائے تو گنی کی معیشت بھی جمود کا شکار ہے۔ دوسری طرف الجزائر اور عراق کی منصوبہ بندی اور ان کے منصوبوں کا نفاذ نسبتاً معقولیت پر مبنی ہے' چنانچہ ان کے یہاں پیداوار کی شرح جس میں تیل کی آمدنی کو بھی شامل کر لیا جائے بہت موثر ہے' لیکن صنعتی تعمیر کے ایسے نمونے کی تشکیل کہ چنگی بجاتے میں کام ہو جائے' نہ تو ملک کے اندر مہارت پیدا کر سکی اور نہ روزگار میں اضافہ ہوا۔ صرف تنزانیہ میں ایسا ہوا' جہاں وسائل بہت کم ہیں کہ جولیس نائریرے کو تیز رفتار صنعتی ترقی اور خود کفالت کے ترقیاتی ہدف کے درمیان تضاد نظر آ گیا' چنانچہ وہاں دیہی

MashalBooks.org

منطقے کی ترقی کے مقابلے میں شہری منطقے پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ ان ریاستوں کے درمیان زمانے کا فرق بھی ہے۔ کچھ حکومتیں، الجزائر، تنزانیہ، گنی اور میکسیکو کی طرح براہ راست طور پر قومی اور عوامی انقلابات کے نتیجے میں قائم ہوئیں۔ ان ملکوں میں تنظیم سازی اور عوامی نمائندگی کی ایک تاریخ ہے اور بہت سے ملکوں میں یہ پارٹیاں اب بھی شہریوں اور ریاست کے درمیان ایک رابطہ قائم رکھتی ہیں۔ چند دوسری ریاستیں، جیسے عراق، شام، سومالیہ اور لیبیا فوجی بغاوتوں کے نتیجے میں قائم ہوئیں۔ ان ریاستوں کو کم و بیش اپنی حکمرانی کا جواز حاصل ہے اور عوام میں مقبولیت بھی، لیکن ان کی بنائی ہوئی سیاسی پارٹیاں اور ٹریڈ یونین ایسی تنظیم نہ بن سکیں جو مقبول عام ہوں اور جن کی ریاستی اقتدار میں شرکت ہو۔

اپنی ساخت، نظریے اور اراکین حکومت کے حوالے سے ان ریاستوں کے درمیان مشابہت، ان کے مابین فرق سے زیادہ نمایاں ہے۔ ان ریاستوں پر حکمرانی کی نوعیت تحکمانہ ہے۔ بالعموم ان پر کسی ایک پارٹی کی حکومت ہوتی ہے، جو یہ جہد کرتی ہے کہ مرکزی منصوبہ بندی اور اراضی کی ترقی پسندانہ اصلاحات کے ذریعے اور بنیادی صنعتوں کو قومیانے اور ریاست کی تحویل میں لے کر (اور بعض صورتوں میں زراعت کو آپریٹو قائم کر کے) وہ معیشت کو تیزی سے فروغ دیں گی اور یہ کہ صحت عامہ، تعلیم، مواصلات اور رہائش کی بنیادی سہولتیں منصفانہ طور پر سب کو فراہم کی جائیں گی۔ ان کے قائد نظریاتی اعتبار سے فلسفیانہ فکر کے حامل اور اپنے نقطہ نظر سے قوم پرست اور گفتگو میں عوامی ہوتے ہیں۔ وہ طبقاتی بالادستی کے خیال کو رد کرتے ہیں اور اس کے ساتھ طبقاتی جدوجہد کو بھی، تاہم وہ سوشلسٹ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اس دعوے کی بنیاد وہ اپنے اقتصادی پروگرام کو اور اپنے اس صریح اعلان کو قرار دیتے ہیں کہ وہ ایک آزاد، عوام کی خیر خواہ اور ایک سوشلسٹ جمہوریہ قائم کریں گے۔

ان ریاستوں میں اقتدار چونکہ انتظامی شعبے کی مٹھی میں ہوتا ہے اور آزاد عدالتیں اور بااختیار منتخب ادارے موجود نہیں ہوتے، لہٰذا شہری آزادیوں کا دائرہ فطری طور پر تنگ ہوتا ہے۔ لیکن ان کی خلاف ورزیوں کی سطح اور ان کے اقدامات کی شدت مختلف نوعیت کی ہوتی ہے۔ اس کا انحصار ماضی کے حالات پر نظریاتی اپیل پر اور قیادت کے سماجی و لسانی رشتوں پر ہے۔ مثال کے طور پر عراق میں جہاں شیعوں کی آبادی اکثریت میں ہے اور سب سے بڑی تعداد غیر عرب قومیت (کردوں) کی ہے، انہیں حکمران پارٹی میں مناسب نمائندگی نہیں دی جاتی، چنانچہ یہاں انسانی حقوق کی شدید خلاف ورزیاں ہوتی رہی ہیں۔ ان میں مقدمہ چلائے بغیر قید اور گرفتاریاں اور اختلاف کرنے والوں کے لئے پھانسی کی سزائیں بھی شامل ہیں۔ دوسری طرف الجزائر، جہاں کی قیادت قومی جنگ آزادی میں شرکت کی بنا پر خاصی بااختیار ہے اور جہاں علاقائی اور لسانی مفادات کو اقتدار میں بہتر نمائندگی دی گئی ہے اور جہاں ایک ترقی پسند حزب اختلاف مضبوطی سے قائم ہوتے ہوئے بھی حکومتی اشرافیہ کے لئے خطرہ نہیں ہے، وہاں انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کبھی

MashalBooks.org

کبھار ہی دیکھنے میں آئی ہیں اوران میں بھی تیزی سے کمی ہو رہی ہے۔ بہ اعتبار مجموعی ان ریاستوں میں سیاسی تشدد بہت کم ہوتا ہے اور اتنے وسیع پیمانے پر اور اتنے منظم انداز سے نہیں ہوتا' جس طرح نئی فسطائی ریاستوں میں ہوتا ہے۔ایسی ریاستوں میں حکومت پر عوامی دباؤ بہت آہستہ آہستہ بڑھتا ہے' جس کے ردعمل میں حکومت یا تو اپنی اقتصادی اور سماجی پالیسی میں دائیں طرف چل پڑتی ہے۔ (تیونس' مصر) یا ان کے اندر سے ہی کوئی فوجی یا نئی فسطائی طاقت ابھرتی ہے اور اقتدار پر قبضہ کر لیتی ہے۔ (ملاحظہ کیجئے گھانا' یوگنڈا اور انڈونیشیا)

باقی رہی یہ نظریاتی بحث کہ یہ حکومتیں ناکام کن وجوہ سے ہوئیں اور بالآخر دائیں بازو کی تشدد پسندانہ حکومتیں کیوں کر بن گئیں تو اس بات کو آئندہ سلسلہ مضامین میں اقتدار کے نئے فسطائی نظام کے ساتھ زیر بحث لایا جائے گا۔ اس وقت ہم ان انوکھے تضادات پر نظر ڈالیں گے' جو موجودہ صورت حال کی بنیاد میں پائے جاتے ہیں۔اول اقتدار حاصل کرنے کے بعد یہ حکومتیں ریاست کی آبادی کا تعاون' ان کی حمایت اور کسی قدر اپنے قیام کا جواز حاصل کر لیتی ہیں۔ ان کی عوام پسند گرم گفتاری' اصلاح کے پروگرام' ترقیاتی عزائم' سماجی انصاف کی وکالت اور اس انداز سے جس میں ملوکیت کی مخالفت کا تاثر ہو' عام لوگوں میں جوش وخروش پیدا ہوتا ہے۔ ان کی مقبولیت کی جڑیں اس وقت اور بھی گہری ہو جاتی ہیں جب ان کا یہ عہد سامنے آتا ہے کہ اقتصادی اور سماجی انصاف نافذ کر کے قومی وسائل کو قومی ملکیت میں لے لیا جائے گا۔قوم کی حاکمیت بحال کر دی جائے گی۔ان کی ترقی پسندی اور حب وطن کی توثیق ملوکیت کے ایوانوں کے خلاف ان کے واضح رویے سے ہوتی ہے۔ یہ حکومتیں سیاست کی جو زبان استعمال کرتی ہیں' ان سے مراد ایک عوامی حلقہ مقبولیت پیدا کرنا ہوتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے وہ عوامی شعور کو آزادی عمل کی راہ پر لگا دیتی ہیں اور محنت کشوں کے اجتماعی جوش وخروش کو بیدار کر دیتی ہیں۔تاہم ان حکومتوں کی طبقاتی ساخت' نظریہ اور ترجیحات ایسی نہیں ہوتیں جو ان کے مشن کی تکمیل میں معاون ہوں۔ پھر جب عوام کی مایوسی بڑھتی ہے اور ان کا دباؤ پڑتا ہے تب وہ دائیں طرف مڑ کر تشدد کی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔ان کے رویے میں یہ تبدیلی رفتہ رفتہ ہوتی ہے یا اچانک' ان کا دائیں بازو کا روائتی انداز ہوتا ہے یا وہ نئی فسطائیت کی سمت چل پڑتے ہیں۔ان باتوں کا انحصار بہت سے اسباب پر ہوتا ہے' جن میں مخالف عنصر کی نوعیت اور بیرونی طاقتوں کی سرپرستی اور ملک میں ان کے سیاسی اور اقتصادی مفادات شامل ہیں۔ بہرحال دونوں صورتوں میں یعنی بظاہر فیاض حکمرانی اور شدید ظالمانہ قوم پرستی' ان دونوں کے درمیان فرق عوامی چیلنج کے آگے ختم ہو جاتا ہے۔

دوسری بات' ان حکومتوں کی بلند بانگ لفاظی' ان کے دعوے اور سیاسی رویے' ان کی نظریاتی ریاست ہونے کا تاثر دیتے ہیں۔ لیکن یہ حکومتیں بالآخر ایک واضح دیرپا اور باعمل نظریے سے محروم ہوتی ہیں۔ضمیر کی پاسداری کا نظریہ' ناصرازم' بورقیبہ ازم' پیرون ازم اور بعث ازم' یہ سب ایسے نظریوں کی واضح

MashalBooks.org

مثالیں ہیں' جن میں کوئی نظریاتی مواد موجود نہیں۔ یہ سب جذبات' عام نوعیت کی توقعات اور ترجیحات' نعروں اور گھسے پٹے مانگے کے' بلکہ کرایے کے نعروں کا ملغوبہ ہوتے ہیں۔ یہ مانگے کے فقرے مختلف ذرائع سے حاصل ہوتے ہیں' لیکن ان کی ادائیگی میں ایک انوکھا پن ہوتا ہے اور کبھی کبھی پر اسراریت بھی اور موقع پرستی کی مبہم سی کیفیت بھی۔ یہ باتیں دماغ سے بچ نکلتی ہیں اور سیدھی دل پر اثر کرتی ہیں۔ ان میں یہ اہلیت ہوتی ہے کہ تحریک تو پیدا کر دیتی ہیں' لیکن رفاقت اور رہنمائی نہیں کرتیں۔ نتیجہ یہ کہ اصول اور اقدار کی جگہ جو کسی سیاسی نظام کی اساس ہوتے ہیں' ذاتی اقتدار اور سیاسی شعبدے جاری ہو جاتے ہیں اور انہی سے اس سیاسی نظام کا سطحی پن ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے نظریاتی بودے پن' جن کی جڑیں سطحی ہوتی ہیں اور ان کے حکمران طبقے کے انتظامی کردار سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ کس طرح اچانک اور موقع پرستی کے تحت بین الاقوامی تعلقات تبدیل کر دیتی ہیں۔ (مصر' سومالیہ اور سوڈان کو یاد رکھئے)

تیسری بات' ان آزاد قوم پرست ریاستوں کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ جو نوآبادیاتی ریاستی ڈھانچہ انہیں ورثے میں ملتا ہے' اس کے فرائض اور اختیارات میں زبردست توسیع کرتی ہیں۔ وہ ریاستیں بجائے خود افسر شاہی کی پیداوار ہوتی ہیں' چنانچہ برابر بڑھتی اور پھیلتی ہوئی افسر شاہی اور قومی تحفظ کے ادارے پر پوری طرح تکیہ کرنے لگتی ہیں۔ جن ملکوں میں عوامی سیاسی پارٹیاں موجود تھیں اور عوام میں ان کی جڑیں کسی قدر موجود تھیں' وہ بھی زوال پذیر ہیں اور انہوں نے اپنا کام سرکاری ایجنسیوں اور افسر شاہی کے حوالے کر دیا ہے۔ جہاں ایسی کوئی پارٹی موجود نہ تھی اور قوم پرست حکومت بغاوت کے نتیجے میں قائم ہوگئی' وہاں حکومت کی جاری کردہ پارٹیاں جڑ پکڑنے میں ناکام ہوگئیں۔ بہرصورت ان ملکوں میں شراکتی اور نمائندہ ادارے' گروہی اقتدار اور سرکاری انتظامی ڈھانچے کے مقابلے میں کمزور ہوتے چلے گئے۔ عوامی سیاست سے علیحدگی' اس عمل کا لازمی نتیجہ ہے۔ چونکہ ایک مستقل اور بامعنی نظریہ موجود نہیں ہوتا اس لئے سرکاری انتظامی ڈھانچے میں توسیع اور اضافے کا جواز ان دو تصورات سے ملتا ہے' جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں' یہ ہیں ''ترقی'' اور ''قومی سلامتی۔'' دونوں کو جوڑ کر جدیدیت کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ ایک جو نظریاتی جعل سازی ہے۔ اس کے تحت سرمایے کی افزودگی کی اونچی شرح پر زور دیا جاتا ہے اور ریاست کو بنیادی ترقیاتی ادارہ سمجھا جاتا ہے۔

ہم ایک علیحدہ مضمون میں اور کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس نکتے سے بحث کریں گے کہ تیسری دنیا کی موجودہ ریاستیں نوآبادیاتی نظام کی پیدا کردہ تھیں' تاکہ وہ ملوکیت کی عالمی طاقتوں کے زیر اثر اور انہی کی مقررہ شرائط کے مطابق ان کی خدمت انجام دیتی رہیں۔ اس طرح یہ قوم پرست ریاستیں سرمایہ دار ملکوں کی ہی توسیع تھیں' جنہوں نے اپنے پیش رو یورپ کے تجارتی اور صنعتی بورژوازیوں کی ضرورتوں کے مطابق ترقی کی اور ایسے قوانین بنائے اور ادارے قائم کئے جو سرمایہ دارانہ پیداواری رشتوں کی ترقی کے لئے لازمی

MashalBooks.org

تھے۔ یہ پوری ریاستیں نوآبادیات ہونے کی حیثیت سے بیرونی عالمی سرمایے کی توسیع کا ذریعہ تھیں۔اس عمل سے دو مقاصد پورے ہوتے تھے نہ صرف یہ کہ اس سے نوآبادیات کا استحصال ہوتا تھا بلکہ جاگیرداری نظام سے سرمایہ داری نظام کی طرف منتقلی کے دوران میں جو سماجی اور سیاسی کشیدگی پیدا ہوتی تھی' اس کا رخ نو آبادیات کی طرف منتقل کردیتے تھے۔ سماجی تبدیلی کے نتیجے میں جو کشیدگیاں پیدا ہوئیں' ان کو نوآبادیات میں برآمد کرنے سے ہی آزاد جمہورتیوں کا فروغ ممکن ہوا۔ان جمہورتیوں میں جبر اور اتفاق رائے کے اداروں کے درمیان ایک نہایت حساس اور پیچیدہ توازن رکھا جاتا ہے۔ نوآبادیاتی توسیع اور بورژوا جمہوریت کے نظام میں امکانی طور پر جو ربط ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان طاقتوں کا ایک بار پھر جائزہ لیا جائے' جن کی بنا پر یورپ میں فسطائیت کا فروغ ہوا۔اس لئے کہ یہ محض اتفاق نہیں کہ فسطائیت انہی ملکوں میں مستحکم ہوئی جہاں صنعتی ترقی کا عمل جاری رہا لیکن اس عمل کے دوران میں وہ بڑی حد تک نوآبادیات کے خام مال سے اور منڈیوں سے محروم رہے' مزید یہ کہ وہ اپنے یہاں پیدا ہونے والی کشیدگی کو بھی ان ملکوں میں برآمد نہیں کرسکتے تھے۔ (جرمن اور اٹلی اس کی نمایاں مثالیں ہیں) اسی سے یہ بات بھی اگرچہ جزوی طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ تیسری دنیا میں تحکمانہ انداز حکمرانی کی جڑیں کہاں پیوست ہیں (یعنی سوشلسٹ' قوم پرست اور نئی فسطائیت کی بنیادیں)

دانش وروں نے یہ نکتہ خاص طور پر رقم کیا ہے کہ نوآبادیاتی ریاستیں مرکزیت رکھتی تھیں' ان کی ایک منظم اور جدید طرز کی فوج تھی' پولیس اور انتظامی امور کا ایک مربوط ڈھانچا تھا۔نوآبادیاتی حاکم نمائندہ اداروں کی ترقی پر معمولی توجہ دیتے تھے' چنانچہ ان ملکوں میں ابتدا سے ہی جدید طرز کی حاکمیت مسلط رہی' جس میں اجماع اور اتفاق رائے سے کہیں زیادہ جبر اور شدید جبر کا عنصر شامل ہوتا تھا۔اس سے زیادہ اہم بات یہ کہ نوآبادیاتی ریاستوں میں ایک جدید ریاست کی تشکیل کے عمل کو الٹی طرف موڑ دیا گیا۔بجائے اس کے کہ ایک ابھرتی ہوئی قومی بورژوازی اس کی تشکیل کرتی' اب وہ ایک غیرملکی مقتدر طاقت کی توسیع بن کر رہ گئیں۔سول ملازموں اور سپاہیوں کا ایک مقامی طبقہ' جو تیسری دنیا کا ریاستی بورژوازی تھا' اس لئے پیدا کیا گیا کہ وہ نو آبادیاتی ریاست کی خدمات انجام دیتا رہے۔تیسری دنیا میں ایک جدید ریاست کی تشکیل کا عمل شروع سے ہی کچھ یوں تھا گویا شراکت کی ایک ناپختہ بنیاد پر کوئی نہایت ترقی یافتہ فوجی اور افسر شاہی اقتدار کا ڈھانچا کھڑا کردیا جائے۔

تاہم دوسرے تجزیہ نگاروں کے برعکس ہمارا موقف یہ ہے کہ نوآبادیاتی حکومت کو "بہت زیادہ ترقی یافتہ" نہیں کہا جاسکتا۔اس نے معاشرے میں کم سے کم مداخلت کی بنا پر اور روایتی حکمراں طبقے کے ساتھ سمجھوتوں کا ایک جال بچھا کر اور ریاستی افسر شاہی اور سیکورٹی کے اداروں کی توسیع پر گرفت رکھتے ہوئے اپنے آپ کو برقرار رکھا تھا۔اس کے کردار کی ایک نوعیت یہ بھی تھی کہ نوآبادی میں جو مقامی بورژوازی پیدا ہوا تھا' اسے

MashalBooks.org

حکمران ادارے کے مقتدر اراکین کے تابع بنایا۔ مختصر یہ کہ نوآبادیاتی حکومت نے ایک خاصے بڑے اعلیٰ روایتی طبقے کو قائم رکھا' جس کی طاقت اور حیثیت نوآبادیاتی نظام کے ساتھ شراکت کی بنا پر باقی تھی اور وہی اس طبقے کی طاقت کو اپنی گرفت میں رکھتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی نوآبادیاتی حکمرانوں نے ایک ریاستی بورژوا بھی پیدا کیا اور اسے برقرار رکھا۔ نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد سابق نوآبادیاتی حکمرانوں میں نہ تو یہ خواہش باقی رہی اور نہ اس کی اہلیت رہ گئی تھی کہ روایتی اعلیٰ طبقے کو اپنے تابع بنائے رکھیں۔ یہی وجہ تھی کہ نوآبادیات کے ختم ہونے پر ریاستی اقتدار سے سویلین سیاسی قیادت کو جب بھی ریاستی استحکام کے لئے بے مصرف پایا' پھینک دیا' یا اسے نظر انداز کر کے اپنا کام کرتا رہا۔ یہی کام اس وقت بھی کیا' جب ریاستی اقتدار کو ان کا وجود اپنی گروہی طاقت کی راہ میں رکاوٹ نظر آیا یا جب اسے مقبول عام اداروں کو مستحکم بنانے اور مقبول عام طاقت کو بروئے کار لانے کا خیال آیا۔ تیسری دنیا کے معاشروں میں صرف ہندوستان مستثنیٰ ہے' جہاں سرمایہ داری انیسویں صدی میں ہی فروغ پانے لگی تھی' پھر جنگوں کے درمیانی عرصے میں اس کے یہاں خاصی توسیع ہوئی۔ اس کا اپنا قومی بورژوازی طبقہ ہے۔ (وہ طبقہ جو ریاستی حلقے سے باہر ہے) اس نے یہاں تک ترقی کی کہ ریاستی بورژوا طبقے پر حاوی ہو گیا یا کم از کم اس کے برابر کا شریک بن گیا۔

ریاست کے بورژوازی کو ریاست سے طاقت ملتی ہے۔ اس کی توسیع کا دارومدار ریاست کی طاقت اور اس کی کارکردگی پر ہے۔ لہٰذا اس کے مفاد کا تقاضا اور لازمہ یہی ہوگا کہ ریاستی کاروبار میں توسیع ہو۔ نوآبادیاتی حکومت میں اس کی یہ خواہش نوآبادیاتی حکمران کی ضرورت کے تابع اور اس کے تصرف میں تھی اور نوآبادیاتی آقا کی ضرورت یہ تھی کہ ایک مستعد' محکم نسبتاً مختصر اور نپے تلے انداز کی حکومت قائم رہے۔ نوآبادیات کے ختم ہونے پر یہ مرحلہ آیا کہ ریاستی کاروبار بورژوازی کو' جو پہلے اس کے ماتحت تھا' حوالے کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ بورژوازی کو کچھ پھیلنے کی آزادی بھی دی گئی۔ اس ماتحت طبقے (بورژوازی) کو اقتدار سنبھالتے دیکھ کر اور قومیت پرستی پر مبنی خطابت سن کر اسے شروع میں صدمہ تو ہوا' لیکن سابق نوآبادیاتی حکمرانوں اور خاص طور پر امریکہ نے نوآبادیات کے بعد آنے والی ریاستوں کی توسیع میں بہت مدد کی۔

کہا جاتا ہے اور یہ بات زیادہ درست نہیں کہ حکمران طبقہ جو آزاد حکمرانہ حکومت پر حاوی ہے' بورژوا طبقے سے پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ اس تعریف سے تو وہ طبقہ ذہن میں آتا ہے جو سماجی درجے میں متوسط حیثیت کا مالک ہے۔ اس کی آزاد عملی اصطلاح یہ ہو سکتی ہے کہ یہ ایک "نیا متوسط طبقہ" ہے۔ اس تعریف سے اس کی اصل حیثیت اور بنیاد کا پتہ چل جاتا ہے۔ تیسری دنیا میں یہ ایک انوکھی صورت حال کا مظہر ہے۔ نوآبادیاتی نظام اور غیر مساوی ترقی کے نتیجے میں یہ پیدا ہوا' ایک جدید تعلیم یافتہ انتظامی شعبے کا اشرافیہ' پیداواری عمل سے الگ' اپنے کلچر سے کٹا ہوا' بیرونی سرمایے اور بیرونی مہارت پر مسلسل انحصار کرنے والا طبقہ جو اس کا بھی اہل نہیں کہ خود پھیل کر قومی بورژوازی کے اندر ایک پیداواری طاقت بن جائے۔ یہ وہ طبقہ ہے جسے اصل بورژوازی

MashalBooks.org

سے کھینچ کر الگ کر دیا گیا ہے اور کسی قدر بورژوازی طبقے کی بنیادوں سے بھی' اور پھر اسے جدید قومی نوکر شاہی کے حفاظتی حصار میں دے دیا گیا۔ یہاں وہ اس طرح کا رویہ اختیار کرتا ہے اور امنگیں پالتا رہتا ہے جن کے پورے ہونے کے امکانات خدمت' نظم و نسق اور اختیارات کے شعبوں کی مسلسل توسیع پر منحصر ہوتے ہیں۔ لفظی معنوں میں یہ ایک "قوت بردار اشرافیہ" ہے۔ ان معنوں میں اس کی اولین ذمہ داری قوت کو استعمال کرنا ہے اور اس کے وجود کا تمام تر انحصار نظم و نسق کے کاموں کی انجام دہی سے ہے۔ قومی حکمرانی کا ماحول ہو تو یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کی اپنی حیثیت اور طاقت میں توسیع کے لئے قومیانے کی پالیسی اور معیشت پر ریاست کا کنٹرول نہایت مفید ہوں گے۔ اس حکمران گروہ کو رفاہ عامہ کی بدولت ایک آزاد مادی بنیاد مل جاتی ہے اور غیر ملکی ترقیاتی امداد کی بدولت اس بنیاد کا رشتہ غیر ملکی مرکز اقتدار سے قائم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ غیر ملکی سرمایہ داری کا منطقہ جہاں بھی کمزور ہوگا اور "خدمت گزار" بورژوازی جہاں ریاست اور ملازم پیشہ نوکر شاہی میں منقسم ہوئی' وہاں اس طبقے کی خویش پروری' ایک خود ساختہ سوشلسٹ حکومت تیار کر لے گی۔ ان ملکوں میں جہاں سامراجیت' خاص طور پر امریکی سامراجیت کی بالادستی ہو اور اس پر مبنی مفادات دور تک پھیلے ہوں اور ان کی جڑیں گہری ہوں' یہی حکومت آسانی کے ساتھ نئی فسطائیت کی طرف مڑ جائے گی۔

ریاست کے بورژوا حکمرانوں سے جب اصل قوم پرست سیاسی طبقے یا قومی "ہیرو" رہنما کی حمایت' جس سے اس کو حکمرانی کا جواز ملا ہے' چھن جاتی ہے تو اس کے پاس اپنے وجود کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ نہ صرف یہ کہ وہ ایک بامعنی اور فعال نظریے سے محروم ہو جاتا ہے بلکہ ایک تاریخ سے بھی اور ان علاقوں سے بھی جن میں عوام کی ایک خاصی بڑی تعداد کو اپنے ساتھ ملانے کی اہلیت ہوتی ہے۔ پھر ایسی حکومت طاقت تو استعمال کرتی ہے' لیکن اس کے پاس قیادت نہیں ہوتی' وہ ریاستی قوت کو بلا جواز استعمال کرتی ہے' وہ ریاست پر حاوی تو ہوتی ہے' لیکن عام لوگوں کے معاشرے سے الگ تھلگ رہتی ہے۔ بلاشبہ ایسے معاشروں میں ریاست کسی قدر خود مختار ہوتی ہے۔ جیسا کہ بعض مارکسی دانش وروں نے بھی کہا ہے' کیونکہ یہ خود مختاری ان کو معاشرے سے ان کی دوری کے نتیجے میں ملی ہے اور یہ خود مختاری ان کو ایک غیر ملکی اقتدار کے ساتھ نامساوی تعلق برقرار رکھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ایسی ریاست محض امداد پر چلنے والی نہیں ہوتی بلکہ معلق ہوتی ہے۔ اپنے اندر کی توانائی سے ترقی کرنے کی استعداد اس میں طبعی طور پر نہیں ہوتی۔

حوالے

1. Frantz Fennon, *Les Damnes de La Terre* (Paris: Francois Maspero, 1961); Roger Murray, *Second Thoughts on Ghana,* New Left Review. (1967:42); Hamza Alavi, "The *State in Post-Colonial Societies.*" New Left Review. (1972-74).
2. See Quentin Hoare, Dennis Nowell Smith, *Selections from the Prison Notebooks* (London and New York: Lawrence and Wishard International Publishers, 1971).

کتابیات

Alavi, Hamza. "*The State in Post-Colonial Societies.*" New Left Review 74 (1972): 59-81.

Amin, Samir, Unequal Development: *An Essay on the Social Formation of Peripheral Capitalism.* New York: Monthly Review Press 1976.

Apter, D. *The Politics of Modernization,* Chicago, 1965.

Dos Santos, Theotonio. "*The Structure of Dependence.*"

MashalBooks.org

In *Readings in U.S. Imperialism,* edited by Farm and Hodges.

........."*Socialism and Fascism in Latin America* Today." Socialism in the World. no. 1 (1977).

Fennon, Frantz. *Les Dammes de La Terre.* Paris: Francois Maspero, 1961.

Michaela von. "*The Post-Colonial State and its Tanzanian Version.*" Review *Freehold of African Political Economy*

Hoare, Quentin, and Smith, Dennis Nowell. *Selections From The Prison Notebooks.* London and New York: Lawrence and Wishhard International Publishers, 1971.

Hughes, Arnold, and Kolinsky, Martin. "*Paradigmatic Fascism and Modernization: A Critique.*" Political Studies, December, 1976.

Huntington, S.P., and Moore, C.H., eds. *Authoritarian Politics is Modern Society,* New York, 1970 La Palombara, J and Weiner, M., eds. *Political Parties and Political Development.* Princeton, 1966. Leys, Colin. "*The Over-Developed Post-Colonial State: A Re-evaluation.*" Review of African Political Economy 5 (1976). Murray, Roger. "*Second Thoughts on Ghana.*"

MashalBooks.org

New
Left Review 8 (1967).

Organski, A.F.K. *Stages of Political Development.* New York: Knop, 1965

Rokkan, S., and Eisenstadt, S.N. *Building States and Nations*. Beverly Hills, 1966.

Saul, J. *"The State in Post-Colonial Societies: Tanzania."* Socialist Register (1974).

........*"The Unsteady State: Uganda, Obote and General Amin,"* Review of African Political Economy 5 (1976)

Wallerstein, I. "*The State and Social Transformation: Will and Possibility.*" Politics and Society (1971).

Ziemann, W. and Lanzendorfer. "*The State in Peripheral Societies.*" Socialist Register (1977).

(سہ ماہی "عرب سٹڈیز" خزاں 1990)

MashalBooks.org

نو آمدہ فسطائی ریاست
تیسری دنیا میں طاقت کی ساخت پر چند باتیں

1960ء اور 1970ء کے عشروں میں جب کہ ہماری نظریں ہند چینی جنگ پر لگی ہوئی تھیں تیسری دنیا میں ایک ناخوشگوار تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ ان دونوں عشروں میں ایسی حکومتوں نے سر اٹھایا جو پہلے سے موجود تھیں' ان کے رویے میں پختگی آ گئی' جسے ہم کسی موزوں تر اصطلاح نہ ہونے کے باعث نئی فسطائیت کا نام دیں گے۔ ان میں سے بعض ممالک مثال کے طور پر جنوبی کوریا' ایران اور نکارا گوا تو 1950ء کے برسوں میں ہی استبدادی تھے' جن کی بقا کا یہی تقاضا تھا کہ سیاسی مخالفوں پر تشدد کریں اور ریاستی اقتدار سے باہر جو سماجی ادارے ہیں (مذہبی' تعلیمی اور پیشہ ورانہ انجمنیں' مزدوروں اور کسانوں کی تنظیمیں) ان پر ظلم ڈھائیں۔ 1960ء اور 1970ء کے عشروں کے دوران میں ان ریاستوں کے ظالمانہ طریقے سخت تر ہوتے گئے۔ دہشت کا ایک پورا نظام قائم ہوا اور تشدد کے جو ادارے تھے انہیں "زیادہ جدید" اور "زیادہ معقول" بنایا گیا۔ دوسری ریاستوں مثلاً برازیل' انڈونیشیا' یونان' فلپائن' یوگنڈا' زائرے' یوروگوائے اور چلی میں 1960ء کے وسط اور 1970ء کے اوائل میں تبدیلی رونما ہوئی۔ وہ جمہوری سے نیم جمہوری یا اپنی اصل میں حاکمانہ ریاستیں اور پھر جنگجو ریاستیں بن گئیں۔ 1970ء کے عشرے میں ایسی ریاستوں کی صف میں تیزی سے اضافہ ہوتا گیا۔ ارجنٹائن اور تھائی لینڈ اس صف میں نو وارد تھے۔ تاہم ان میں سے کوئی ریاست اور ممکن ہے برازیل اس میں شامل نہ ہو' اپنے ظالمانہ اقتدار کو مستحکم نہیں کر سکی' یعنی وہ باہر کی مستقل امداد کے بغیر اس قابل نہیں ہو سکے کہ معیشت کے مطالبے پورے کرتے ہوئے اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں۔ اسی طرح وہ شہریوں کے معاشرے میں اس کے سرکردہ لوگوں کے ساتھ کوئی بامعنی سیاسی تعلق بھی پیدا نہ کر سکے۔

اس کے ساتھ ہی 1970ء کے اواخر نے یہ بھی دیکھا کہ پہلے تو یونان میں' اس کے بعد ایران اور نکارا گوا میں یہ نئی فسطائی حکومتیں انتہائی نازک اور کمزور تھیں اور جونہی ایک بڑا مرحلہ درپیش ہوا' وہ بالکل ہی ڈھے گئیں' اس تیزی کے ساتھ کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ اس مضمون میں کوشش کی گئی ہے کہ

(1 تیسری دنیا میں اس طرز کی حکومتوں کا کردار متعین کیا جائے۔ (2) اس نئی فسطائیت کی بنیادیں معلوم کی جائیں اور (3) دیکھا جائے کہ ان حکومتوں کے حساس اور نازک پہلو کون سے ہیں اور ان کی مدافعانہ کوششوں کے ذرائع کیا ہیں۔

نئی فسطائی ریاستوں کی عمومی خصوصیات

جزوی اختلاف سے قطع نظر ان نئی فسطائی ریاستوں کی مشترک خصوصیات درج ذیل ہیں:

دورِ حاضر میں یہ ریاستیں اپنی سرشت میں اور طریق کار میں بھی حقوق انسانی کی شدید مخالف ہیں۔ ان میں سے بیشتر نے تشدد کی نہایت باریک اور پیچیدہ مشینری وضع کی ہے۔ جو لوگوں کو دہشت زدہ کرنے اور ان کی مخالفت کو ختم کرنے کے لئے نئے نئے ہتھکنڈوں کا مسلسل تجربہ کرتی رہتی ہیں۔ ساتھ ہی اپنی زیادتیوں کو زیادہ سے زیادہ پوشیدہ رکھتی ہیں۔ چنانچہ مسلسل یہ ہو رہا ہے کہ لوگوں کو جیل میں یا عقوبت خانوں میں' جہاں آسانی سے نشان دہی ہو جاتی ہے' ٹارچر نہیں کیا گیا بلکہ شہری بستیوں میں ''محفوظ مکانوں'' کے اندر انہیں ایذا دی جاتی ہے۔ حقیقی اور طاقت ور مخالف تو اکثر گرفتاری سے پہلے ہی غائب کر دیئے جاتے ہیں۔ کوئی خوش قسمت قیدی اگر بین الاقوامی دباؤ کی بنا پر جیل سے چھوڑ دیا جاتا ہے تو وہ اکثر کسی مہلک حادثے کا شکار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ 77-1976ء میں ارجنٹائن میں اس بات کا سرکاری طور پر اعلان ہوا کہ حزب اختلاف اور آزاد اداروں کے کوئی ساڑھے آٹھ ہزار افراد غائب ہو گئے۔ یہ بھی سرکاری طور پر بتایا گیا کہ ''مقابلوں'' میں چھ سو افراد ہلاک اور پندرہ زخمی ہوئے۔ دوسری طرف ایمنسٹی انٹرنیشنل نے مصدقہ طور پر بتایا کہ پندرہ ہزار افراد غائب کر دیئے گئے۔ آٹھ ہزار تا دس ہزار افراد معروف سرکاری جیلوں میں قید تھے' ان میں وہ تعداد شامل نہیں جو خفیہ کیمپ جیلوں میں نظر بند تھی۔ ارجنٹائنا اور غیر ملکی اخباری نمائندوں کا عام خیال یہ ہے کہ مارچ 1976ء کی فوجی بغاوت اور اوائل 1978ء کے درمیان پندرہ ہزار افراد قتل کر دیئے گئے۔ ان دیگر ملکوں میں جو اسی شمار میں آتے ہیں' سرکاری اعداد اور آزاد اداروں کے فراہم کردہ اعداد کے درمیان اسی طرح کا فرق پایا جاتا ہے۔ جس پیمانے پر تشدد کیا جا رہا ہے' اس کے بارے میں قیاس ہی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایران کے عقوبت خانوں میں تین لاکھ پچاس ہزار افراد سزائیں کاٹ چکے ہیں۔ 1965ء کی فوجی بغاوت کے بعد ایک اندازے کے مطابق پانچ سے دس لاکھ افراد جو مبینہ طور پر کمیونسٹ تھے ہلاک کر دیئے گئے۔ سرکاری اعداد کے مطابق سات لاکھ پچاس ہزار افراد قید کر لئے گئے۔ ان میں سے ایک فرد کو بھی عدالت کے سامنے پیش نہیں کیا گیا اور ایمنسٹی انٹرنیشنل کو ایک شخص کی بھی رہائی کی خبر نہیں ملی۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے سربراہ مارٹن اینلز نے بتایا کہ سرکاری حفاظتی دستوں اور ان سے ہمدردی رکھنے والوں نے جب لاطینی امریکہ پر قبضہ کیا تو اس کے بعد سے دس سال کے عرصے میں تیس ہزار افراد لاپتہ ہو چکے ہیں۔

انسانی حقوق کی اس سفاکانہ خلاف ورزی میں ایک اور بات جو خاص طور پر نمایاں ہے' وہ ظالمانہ وارداتوں کی کثرت ہی نہیں بلکہ ان کے طریقوں اور مقاصد میں تبدیلی ہے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی ایک رپورٹ میں جو سال 1972ء کے دوران میں تشدد پر مبنی ہے' اس میں لکھا ہے کہ ''تاریخی حالات کے پیدا

کردہ روائتی ظالمانہ طریقوں میں اور ایک خاص انداز کے تشدد میں جو گزشتہ دس برسوں کے دوران لاطینی امریکہ میں پھیلایا گیا ہے' نمایاں فرق ہے۔" زیادہ اہم بات یہ ہے کہ سرکاری تشدد کا مقصد ایذا دہی سے بدل کر اب روک تھام کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔ تشدد کوئی اطلاع حاصل کرنے کے لئے ہی نہیں کیا جاتا' یا اس کا مقصد کسی مخالف رہنما کو سزا دینا ہی نہیں ہوتا بلکہ عملاً یہ مقصد ہوتا ہے کہ لوگوں کو آپس میں سیاسی اور سماجی سطح پر رابطہ کرنے سے روکا جائے' اس کا مقصد ہے سیاسی عمل کو اور عام لوگوں کے درمیان تعلقات کو استوار ہونے سے روکا جائے۔

ان حکومتوں کا برسر اقتدار آنا تاریخ کا ایک المیہ ہے۔ یہ ایک ایسے دور میں رونما ہوا جب کہ دنیا بھر میں دوسرے علاقوں کے اندر معمول کی آزادیوں اور انسانی حقوق کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ مثال کے طور پر اسپین اور پرتگال فسطائی ریاستیں تھیں۔ 1960ء کی دہائی کے آغاز سے ان ریاستوں میں رواداری کا ایک عمل شروع ہوا اور 1970ء کی دہائی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے وہ سوشل ڈیموکریٹ یعنی سماجی جمہوری سیاست پر کاربند ہو چکی تھیں۔ جب اسٹالین دور کے اثرات ختم ہونے شروع ہوئے تو مشرقی یورپ اور سوویت یونین میں باضابطہ آزادی کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ اس میں نمایاں فرق آیا' البتہ اتنا نہیں جسے اطمینان بخش کہہ سکیں۔ مثال کے طور تشدد کی بابت عالمی رپورٹ (1974ء) میں آیا ہے کہ "مشرقی یورپ اور سوویت یونین میں اگرچہ جیلوں کے حالات اور ان کے قیدیوں کے حقوق' جنہیں سیاسی الزامات کے تحت گرفتار کیا گیا ہے' اب بھی بہت سی صورتوں میں غیر تسلی بخش ہوں گے لیکن تشدد جسے حکومت کی منظوری حاصل ہوئی تھی اور جو اسٹالن کے دور کا معمول تھا' اب وہ نہیں رہا۔" اس کے مقابلے میں اس رپورٹ کے بموجب "تشدد میں لاطینی امریکہ کے اندر غیر معمولی اضافہ ہوا ہے" اس میں مزید یہ بتایا گیا ہے کہ تشدد کی ایک منظم صورت کی بنا پر اور سیاسی قتل کی بڑھتی ہوئی وارداتوں کے پیش نظر ایذا دہی کا مسئلہ تو دب کے رہ گیا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ نئی فسطائی حکومتیں انسانی حقوق کے ضمن میں کیفیت اور کمیت دونوں اعتبار سے بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہیں' جیسا کہ اس سے پہلے ایک مضمون میں (2) بحث کی جا چکی ہے کہ تیسری دنیا میں حکومتوں کے جو طریقے ہیں' ان میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی روا رکھی گئی اور اب تک یہی ہوتا آیا ہے لیکن ان دوسرے ملکوں میں دہشت کا عمل نہ تو کسی ضابطے اور مقررہ نظام کے تحت ہے اور نہ بہت عام ہے اور نہ یہ سختی ایسی ہے کہ حکومت اپنی بقا کے لئے اسی پر انحصار کرے۔ علاوہ ازیں ان میں سے بعض ریاستوں میں (مثلاً جن میں قدرے فراخ دلانہ لیکن حاکمانہ طرز حکومت یا مارکسی سوشلسٹ نظام موجود ہے) حقیقی آزادیوں کا دائرہ عام آبادی کے لئے خاصا پھیل گیا ہے (مثلاً صحت' تعلیم اور غذا کے معاملات میں بہتری) چنانچہ یہ حکومتیں کسی حد تک اپنے وجود کا جواز رکھتی ہیں' اس تناسب سے ان کے یہاں سختی کی ضرورت بھی کم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح محلاتی یا عملی ضرورت کے تحت قائم' تحکمانہ انداز کی حکومتیں ایک حد تک الوہی یا

MashalBooks.org

تاریخی حیثیت کی بنیاد پر اپنے وجود کا جواز رکھتی ہیں اور روایتی انداز تضادات کے ساتھ چلتی رہتی ہیں۔ انسانی حقوق کی خلاف ورزی وہ بھی کرتی ہیں اور کبھی تو بڑی شدت سے کرتی ہیں' لیکن تشدد پر ان حکومتوں کا تمام تر انحصار نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں ان نئی فسطائی ریاستوں کو زیادہ سے زیادہ ایک نہایت معمولی اقلیت کا تعاون میسر ہوتا ہے۔ جس کی حیثیت محافظ دستے کی سی ہوتی ہے' اس طرح انہیں حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں ہوتا' چنانچہ وہ اقتدار میں رہنے کے لئے ایک منظم ریاستی دہشت گردی کو اپنی بنیادی ضرورت سمجھتی ہیں۔

فسطائیت اور نو تشکیل فسطائیت

ان نو تشکیل شدہ فسطائی ریاستوں اور روایتی فسطائیت کے درمیان بہت سی خصوصیات مشترک ہیں' جس کا مظاہرہ 1920ء اور 1930ء کے عشروں میں یورپ میں ہوا۔ ان میں یہ خصوصیات شامل ہیں: تشدد کا ریاستی ادارہ' معیشت اور محنت پر ریاست کا کنٹرول' اس کی ابتدا درمیانہ طبقے اور جائداد رکھنے والے طبقوں سے ہوئی۔ لیکن بہت سی صورتوں میں یہ کلاسیکی انداز سے مختلف ہے۔ روایتی فسطائیت سے یکسر مختلف تیسری دنیا کی یہ نئی فسطائی ریاست نظریاتی قوم پرستی سے زیادہ طاقت حاصل نہیں کرتی۔ اس کے برعکس یہ فسطائیت آزادی کی پیداوار لگتی ہے۔ اس کا رشتہ ان خارجی عناصر سے ہے اور وہ ایک دوسرے سے توانائی حاصل کرتے ہیں۔ تقریباً تمام نئی فسطائی ریاستیں' جن میں ارجنٹائن بھی شامل ہے' اسرائیل سے نہایت قریبی روابط رکھتی ہیں۔ قرائن سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ یہ ریاستیں شہنشاہیت اور امریکہ کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ ایک مشترکہ رشتہ ان کے درمیان موجود ہے۔

یہ نئی فسطائی ریاستیں یہ امتیاز بھی رکھتی ہیں کہ ان میں کرشمہ ساز "قیادت" پیدا کرنے کی اہلیت نہیں' نہ وہ عوام سے تعاون حاصل کر سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ فسطائی ریاستیں' اس فسطائیت کے برعکس' جس کی ایک تاریخ ہے' اگرچہ کل اقتدار کی مالک ہوتی ہیں' پھر بھی عام لوگوں کو اکٹھا کرنے' ان سے رابطہ رکھنے اور ان کے ساتھ میل جول برتنے کا سیاسی کردار ادا کرنے سے معذور ہوتی ہیں۔ ان سب سے بالا جرمنی اور جاپان کی مثالیں ہیں جہاں اجرتوں کی شرح کم ہے' اس کے ساتھ ہی خرچے میں کفایت برتی جاتی ہے' جس سے مجموعی قومی بچت اور صنعت کاری کی شرح بہت بڑھ گئی ہے۔ اس کے برعکس نئی فسطائی ریاستوں کی معیشت ہے' جو بنیادی طور پر لوٹ کھسوٹ پر قائم ہے اور جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ عالمی کارپوریشنوں پر اس کا انحصار بڑھتا جاتا ہے۔ اس طرح یہ ریاستیں "تجدد" کا ذریعہ نہیں ہیں' جیسا کہ آزاد خیال سماجی سائنس دان ان کے متعلق دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان ریاستوں میں کسی حد تک ہموار انداز سے صنعت کاری ہوتی ہے' لیکن اس کے ساتھ ہی وہ دیہی آبادی کی اکثریت کو اپنی زمین سے بے دخل

MashalBooks.org

اور در بدر کر دیتے ہیں ۔محنت کش طبقوں کا معیار زندگی گر جاتا ہے۔وہ ملک کے مستقبل کو غیر ملکی سرمایہ کاروں اور قرض دینے والوں کے یہاں گروی رکھ دیتے ہیں اور بالعموم معاشی تباہی پیدا کر دیتے ہیں ۔شاہ کے زمانے کا ایران 1964ء کے بعد کا برازیل اور 1965ء سے اب تک کا انڈونیشیا اس کی مثالیں ہیں ۔

نئی فسطائی ریاستوں کی نظریاتی بنیاد

ان نئی فسطائی ریاستوں کا چونکہ کوئی مستقل اور واضح نظریہ نہیں ہوتا لہٰذا ان کی ابتدا اور بقا دونوں کا تعین ایک مجہول نظریاتی فضا میں کیا جاتا ہے جو ریاست کی قومی سلامتی کے مطابق ہوتا ہے اس قومی سلامتی کے اصول کی جڑیں سرد جنگ سے وابستہ تصورات، اداروں اور پالیسیوں میں پیوست ہوتی ہیں ۔ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہی اس کی نشو ونما جدید قوم پرستی اور نو آبادیاتی نظام کی بظاہر مخالفت سے ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک اول و آخر ریاست ہی سب کچھ ہے۔فرد غیر اہم ہے۔اس کا زور اس بات پر ہوتا ہے کہ اشتراکیت اور آزادی، استحکام اور انتشار، قومی سلامتی اور نراجیت کے درمیان جنگ مسلسل جاری رہے۔ بجائے اس کے کہ وہ عوام کو ساتھ ملائے اور انہیں اپنے قابو میں رکھنے کے لئے سیاسی اداروں، مثلاً پارٹیوں، نوجوانوں اور مزدور تنظیموں سے مدد لیں، وہ مسلح افواج پر بھروسا کرتی ہیں جو نلسن راکیفلر کے الفاظ میں ''ایک تعمیری سماجی تبدیلی کے لئے ایک بہت بڑی طاقت'' مسلح افواج کے بعد پولیس کے خفیہ ادارے آتے ہیں ۔ساوک، دنیا بھر کے سی آئی اے، جن سے معاشرہ بھرا ہوا ہے۔ان کے اعلیٰ ترین عہدیدار ممالک عالم کے سب سے طاقت ور افراد میں شمار کئے جاتے ہیں۔اے لینگوتھ نے لاطینی امریکہ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ عملاً تمام نئی فسطائی ریاستوں پر صادق آتا ہے۔

''یہ امریکہ ہے جو سرد جنگ کے تصورات کا خصوصی برآمد کنندہ ہے اور اس موقف کا خاص وسیلہ ہے کہ اختلاف رائے کو ہر ذریعے سے خواہ وہ کوئی بھی ذریعہ ہو سختی کے ساتھ کچل دینا چاہیے۔ ہماری غیر ملکی فوجوں کی ذہنی تربیت کے نتیجے میں لاطینی امریکہ کے اندر جیل کی کوٹھریوں میں بند قیدیوں پر ظلم کرنے کا جواز پیدا ہو گیا۔ پہلے تو پنامہ کی انٹر امریکن پولیس اکیڈمی کے اندر، اس کے بعد کہیں زیادہ مستعد واشنگٹن کی انٹرنیشنل پولیس اکیڈمی میں غیر ملکی پولیس مینوں کو یہ سبق سکھایا گیا کہ بین الاقوامی اشتراکیت کے خلاف جنگ میں ان کی حیثیت ''پہلی دفاعی لائن'' کی ہے۔اس طرح امریکہ کی تربیت نے ان لوگوں کو جو پہلے ہی قدامت پرست تھے، رجعت پسند بنا دیا۔

اس نئے فسطائی نظام کے قائدین میں سب سے بالا دست وہ فوجی افسر ہوتے ہیں جنہیں امریکی حکومت کے جاری کردہ پروگرام کے مطابق ان کی اکیڈمیوں میں امتناع بغاوت کی تربیت دی جاتی ہے۔ یونان کے جنرل پاپا ڈوپاؤلس، چلی کے جنرل پنوشے (Pinochet) اور جنرل لی (Leigh)، برازیل

MashalBooks.org

کے جنرل گیزل (Geisel) ارجنٹائن کے جنرل ماسیرا (Massera) اور پاکستان کے جنرل ضیاء الحق ایسے ہی فوجیوں کی مثالیں ہیں۔ ان تربیتی پروگراموں میں لامحالہ افسروں کو یہ کمیونسٹ مخالف نظریہ اچھی طرح سکھایا پڑھایا جاتا ہے کہ تخریب کار اور گھس بیٹھیے کہیں بھی ہو سکتے ہیں۔ آخر الذکر کسانوں کی مانگ، مزدوروں کی ہڑتال اور طلبہ کے احتجاج اور کئی دیگر طریقوں سے قومی سلامتی کو تباہ کر دیتے ہیں۔ لہٰذا قومی سلامتی کا بنیادی نقطۂ نظر عوام کی مقبول تحریکوں سے ڈرتے رہنا اور ان سے شدید عناد رکھنا ہے۔

قومی سلامتی کا تصور فوجی مصلحتوں سے یکسر بالاتر ہوتا ہے۔ دراصل یہ لباس، اقتصادی اور سماجی مسائل سے جڑا ہوا ہے اور اس کی بنیاد پر مسلح افواج اپنے وسیع المقاصد مشن پر کاربند ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ کسی ملک کے مفروضہ سلامتی کے مسائل اور بین الاقوامی پیمانے پر اس کی اصل طاقت اور اہلیت کے درمیان منفی انداز کا تعلق پایا جاتا ہے یعنی کوئی ریاست جتنی زیادہ طاقتور اور مالدار ہوگی اس کا حکمران طبقہ اسے اتنا ہی غیر محفوظ سمجھے گا۔

ترقی کا ایک "نمونہ"

"ترقی" اور "تجدید نو" کے تعلق سے مسخ شدہ نظریاتی تصورات، قومی سلامتی کے تصور سے جڑے ہوئے ہیں۔ ایک نوفسطائی ریاست اقتصادی ترقی سے گہری وابستگی رکھتی ہے۔ اس نئی فسطائیت کو ہم "ترقی پذیر فسطائیت" بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہ "ترقی" کو شرح پیداوار کے حوالے سے دیکھتی ہے۔ (پیداوار) میں دولت اور طاقت دونوں کا ارتکاز شامل ہے۔ کیونکہ سرمایے کی تشکیل کی مطلوبہ شرح کے لئے یہ نہایت ضروری ہے۔ یہ کچھ اس طرح ہے کہ منافع برائے سرمایہ کاری، سرمایہ برائے پیداوار اور پیداوار کا حاصل طاقت۔ ترقی کا مثالی نمونہ ترجیحی طور پر "آزاد منڈی" ہے۔ لیکن آزاد منڈی کی طرف واپسی میں ہمیشہ انتخاب سے کام لیا جاتا ہے۔ اس میں یہ بات شامل نہیں کہ اجارہ دار کی طاقت میں کمی آئے یا بے روک ٹوک سرمایہ کاری کی ترغیبات میں تخفیف ہو۔ بلکہ اس میں شامل یہ بات ہے کہ اجرتوں پر کنٹرول ہو، لیبر یونینوں پر گرفت رکھی جائے اور ہڑتالوں پر پابندی ہو۔ سرمایے کو اول اول ترغیب سستی مزدوری سے ملتی ہے پھر اندرون ملک منڈیوں میں اسباب تعیش کی فراہمی کے سوا کوئی توسیع نہیں ہوتی۔ معیشت رفتہ رفتہ برآمدات پر انحصار کرنے لگتی ہے۔ خام مال جس میں دکھاوے کی غذائی مصنوعات شامل ہیں، بنیادی برآمدی مال شمار ہوتی ہیں۔ آمدنیوں میں نابرابری تیزی سے بڑھتی جاتی ہے۔ غیر ملکی کمپنیوں اور بیرونی مفادات کے خلاف مداخلت کا رویہ لازمی طور پر پولیس کا معاملہ بن جاتا ہے۔ ترقی کے اس قرینے پر اگر کوئی حرف گیری کرے تو اسے تخریب کار اور دہشت گرد سمجھا جائے گا۔

ادھر نادار لوگوں پر فاقے کی نوبت آجاتی ہے، ادھر مغرب کے اقتصادی ماہرین اور اس کے ادارے اپنے

MashalBooks.org

حواریوں اور گاہک ریاستوں کو "اقتصادی معجزے" دکھانے پر خوب واہ! واہ! کرتے ہیں۔ سوہارتو کی حکومت برسراقتدار آنے کے بعد دس برس کے عرصے میں اسی طرح انڈونیشیا کو جو پہلے اپنی ضرورت کا چاول خود پیدا کرتا تھا' دنیا کا سب سے بڑا چاول کا درآمدی ملک بنادیا اور دارالحکومت جکارتہ سے چند ہی میل کے فاصلے پر قحط پھوٹ پڑا۔ اسی طرح برازیل میں 80 فیصد دار آبادی کی آمدنی 1962ء کی فوجی بغاوت کے بعد دس برس کے اندر رفتہ رفتہ گرتی چلی گئی' حالانکہ مجموعی قومی پیداوار تین گنا بڑھ کر 80 بلین ڈالر تک جا پہنچی تھی۔

مئی 1973ء میں برازیل کے شمال مشرق میں اٹھارہ کیتھولک پادریوں نے ایک دل دوز بیان جاری کیا' جس میں علاوہ دیگر باتوں کے یہ بتایا گیا تھا کہ 'مشرق میں بھوک نے وبا کی صورت اختیار کر لی ہے۔" بیان میں کہا گیا تھا کہ بچے (یعنی وہ بچے جو پانچ سال کی عمر تک زندہ رہ گئے۔) غذائی قلت کا سب سے زیادہ شکار تھے' ان زندہ رہنے والوں کے درمیان ذہنی پسماندگی تشویش ناک حد تک بڑھ گئی تھی۔ سماجی کاموں کی رفتار گر جاتی ہے' اس کے مقابلے میں شاندار منصوبے بروئے کار آتے ہیں' مثلاً مواصلاتی سیٹلائٹ اور اندرون ملک مواصلاتی نظام جس پر انڈونیشیا نے صرف 1978ء میں 840 ملین ڈالر خرچ کئے' ایسے ہی منصوبے غیر ملکی ٹھیکداروں اور ملک کے اندر صحیح رابطہ رکھنے والوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اناج کے بڑے آڑھتی اور وسیع قطعات اراضی کے مالک غریب کسانوں کو نقصان نہیں پہنچاتے بلکہ انہیں سرے سے ہی صاف کر دیتے ہیں۔ ریاستی اجارہ داریاں بااثر افراد کو مقتدر جاگیردار بنا دیتی ہیں۔ چنانچہ ہر نئی فسطائی ریاست میں کم وبیش ایک درجن ایسے خاندان ضرور نکل آتے ہیں جن کے نام عام بول چال میں بار بار سنے جاتے ہیں۔ یہ تمام مردود خلائق ہوتے ہیں اور متعلقہ ریاستی نظام میں کرپشن اور اس کی سنگدلی اور سفاکی کی علامت تصور کئے جاتے ہیں۔ اگر کسی ملک میں ایسی اقلیت موجود ہو جسے آسانی سے خارج کر دیا جائے (مثلاً ایران کی انڈین' بلوچی اور تیموری آبادی) تو مقتدر گروہ' ان کو زندگی کے ہر معمول سے بے دخل کرنے بلکہ ان کی نسل کشی کی پالیسی اختیار کرتا ہے۔

یہ وہ حقیقتیں ہیں جن سے انسانی حقوق کی پامالی اور ان کی سنگین خلاف ورزی کا المیہ کچھ اور بڑھ جاتا ہے' اسے دیکھتے ہوئے حقوق انسانی کی باضابطہ اور اعلانیہ خلاف ورزی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

مشترکہ مفاد پر مبنی خارجی روابط

کم وبیش کسی استثنا کے بغیر یہ حکومتیں امریکہ کی گاہک ہوتی ہیں اور سوائے یوگنڈا اور ایتھوپیا کے اقتصادی اور نفسیاتی طور پر اور حکمت عملی کے باعث مغرب کے دارالحکومتوں سے جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان میں سب سے بڑی اور سب سے زیادہ متمول (یعنی ایران' برازیل' انڈونیشیا اور جنوبی کوریا) ریاستوں کا سب

MashalBooks.org

سے پہلا انتخاب نکسن اور کسنجر کے بنیادی اصول کے تحت ہوا' جو چھوٹی چھوٹی مغرب نواز ریاستوں کے جتھوں کی قیادت کر رہے تھے۔ یہی وہ حکمت عملی اور سیاسی ترجیح تھی' جو معمولی ترمیم کے ساتھ کارٹر انتظامیہ کے دور میں برقرار رہی۔ عالمی اجارہ دار کمپنیاں ان ملکوں کو تیسری دنیا کے لئے "برآمدی" تجارت کے پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ امریکہ کے پالیسی سازوں کو اور بین الاقوامی کارپوریشنوں کو ان میں بڑی کشش محسوس ہوتی ہے۔ اپنے محل وقوع اور قدرتی وسائل کی بنا پر یہ ممالک نہایت بیش قیمت ہیں۔ ایک نکتے کی بات یہ ہے کہ معاشی ترقی پر کمربستہ یہ ظالم ریاستیں غیر ملکی سرمایے کے لئے نہایت درجہ مہمان نواز ہیں۔ ان حکومتوں کے زیر تسلط چونکہ مساوی انصاف کا دستور نہیں لہذا ان کے یہاں منافع کی شرح بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ان کے تشدد کے حربے اس امر کی یقینی ضمانت ہوتے ہیں کہ سہمے ہوئے خاموش مزدور معمولی اجرت پر کام کرتے رہیں گے۔ مقامی بورژوازی چونکہ بہت ترچیلے ہوتے ہیں لہذا ان کے چھوٹے سے گروہ انہیں اپنے حلقے میں لے کر انہیں مغربی مصنوعات کی منڈی بنا لیتے ہیں' اس طرح یہاں سے حاصل ہونے والا "زائد سرمایہ" مغرب کے مالیاتی اداروں کو منتقل ہوتا رہتا ہے۔

جیسا کہ نوم چومسکی اور ایڈورڈ ہرمن نے اپنے مضامین میں نشاندہی کی ہے' مذکورہ پالیسی کے تحت "امریکی امداد اور انسانی حقوق کی پامالی' ان دونوں کے درمیان ایک باقاعدہ تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور برقرار رہتا ہے۔" چومسکی اور ہرمن نے مثال کے لئے اس ملکوں کا انتخاب کر کے اس بارے میں ایک غیر معمولی ربط باہمی کو ظاہر کر دیا ہے۔ اس کی ایک نمایاں مثال برازیل کی ہے جہاں "امریکہ اور سرکردہ بین الملکی اداروں کی امداد اور قرض کی رقم 112 فیصد تک بڑھ گئی ہے اور یہ سب تین برس کے اندر فوجی بغاوت (1962) کے بعد ہوا۔ یہ اضافہ تین گنی شرح سے ہوا۔" ان مفکرین نے دس مثالوں کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان میں سے بیشتر ملکوں کے لئے امریکی امداد بظاہر سرمایہ کاری کے لئے سازگار حالات کی روشنی میں جاری ہوتی آئی ہے' لیکن منفی انداز سے اس کا تعلق جمہوری نظام اور حقوق انسانی سے رہا ہے۔

اس طرح میکائیل کلارے نے یہ ثابت کیا ہے کہ 1973ء سے 1978ء تک ان ممالک کو امریکہ کی اقتصادی اور فوجی امداد بطور خاص حاصل ہوتی رہی' جو حقوق انسانی کی تنظیموں مثلاً ایمنسٹی انٹرنیشنل کی فہرست میں حقوق انسانی کی پامالی کے بدترین مجرم پائے گئے۔ اس عرصے میں ان کو دو بلین ڈالر سے زیادہ کی اقتصادی امداد دی گئی اور 3،2 بلین ڈالر کے قرضے اور فوجی امداد کے تحت حاصل ہوئے۔ ان کو اٹھارہ بلین ڈالر سے زائد کا اسلحہ فروخت کیا گیا اور ان ملکوں کے فوجی افسروں کو امریکی اسکولوں میں اور امریکی پروگرام کے تحت تربیت دی گئی۔ کلارے نے نہایت مفید شواہد کے ساتھ یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "امریکہ تشدد کے حربے فراہم کرنے والی صف میں سب سے آگے ہے۔"

MashalBooks.org

نئی فسطائیت کی جڑیں

تقریباً تمام نوزائیدہ فسطائی ریاستیں' عوام پسند اور اصلاحی حکومتوں کے بعد ہی ظہور میں آئی ہیں' ان کا تعلق بیشتر آزاد اور تحکمانہ انداز کی حکومتوں سے رہا ہے' جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ (11) ان نئی فسطائی حکومتوں کے بارے میں مفروضہ یہ تھا کہ ان کی نوعیت نوآبادیاتی نظام کے بعد کی صورت پر ہوگی اور فطری طور پر ان کا رشتہ قومی بورژوازی کے ساتھ جڑا ہوگا' جو ریاست کی اپنی ہوگی اور ایک عوام پسند اور اصلاحی طرز کے نعروں کی بدولت اس بورژوازی کی توسیع بھی ہوئی ہوگی۔ اپنے گزشتہ مضمون میں' میں نے یہ دلیل دی تھی کہ:

1۔ فی زمانہ تیسری دنیا کی ریاست کی ساخت نوآبادیاتی ہے' جسے اس طرح بنایا گیا ہے کہ بڑے شہروں کی اشرافیہ کی خدمات بجا لائیں۔ اس عمل کے ہوتے ہوئے جدید ریاست کی تشکیل کا سفر الٹی سمت میں چلنے لگتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ قومی بورژوازی کے ذریعے وجود میں آئے' نوآبادیاتی نظام کی پیدا کردہ ریاست سرکاری افسروں اور سپاہیوں کے مقامی طبقے کو جنم دیتی ہے۔ جو قومی بورژوازی کہلاتی ہے۔ تیسری دنیا کے اندر جدید ریاست کی ترقی میں ایک نہایت منظم فوجی اور افسر شاہی تسلط شامل رہا ہے' اس کی بالادستی ایک پسماندہ ریاستی نظام پر رہی ہے' جو اس کاروبار میں بطور ماتحت شریک رہا ہے۔

2۔ نوآبادتی نظام کے رسمی خاتمے کے بعد جب شہریوں کا پسماندہ سیاسی طبقہ گروہی اقتدار کے فروغ میں رکاوٹ بننے لگا' جب اس نے یہ خواہش کی کہ عوامی نوعیت کے اداروں کو نئے سرے سے مستحکم کرے اور عوامی طاقت کو بروئے کار لائے تو' ریاستی بورژوازی نے یا تو اسے اٹھا کر باہر پھینک دیا یا اسے سرے سے نظر انداز کیا۔

3۔ طاقت ور ریاستی اشرافیہ نے سول حکومت کے نظام کو جو بالعموم پارلیمانی ہوتا ہے' بے دخل کر کے اپنے اقتدار کا جواز عوامی' اصلاحی اور قومی نعروں کے ذریعے پیش کیا' لیکن ایسی حکمرانی کی جبلت میں یہ بات شامل ہے کہ اپنے طبقے کے ارکان "ریاستی ملازمین" میں اور اس کے اقتدار میں ممکن حد تک توسیع کرے اور عام لوگوں کی بہبود کے کاموں کو بہتر بنائے بغیر ایسا کرے۔ بالآخر ایسی حکومت کو ان عوام کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو بڑی امیدیں رکھتے ہیں اور بہت مایوس ہوئے اور جب آخری گھڑی آ پہنچی تو اسی حکمران طبقے میں ایک زیادہ طاقت ور مقتدر گروہ نے فسطائیت کا نمونہ "انقلاب" کے طور پر پیش کیا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ تقریباً تمام صورتوں میں یہ نیا فسطائی نظام' بنیادی اقتصادی اور سماجی تبدیلی کے منظم عوامی مطالبوں کے جواب میں ردعمل کے طور پر ظاہر ہوا۔ ایران' گوئٹے مالا' ڈومینیکن ری پبلک' چین' زائرے اور انڈونیشیا' ان تمام ملکوں میں انقلاب مخالف بغاوتیں اس وقت ہوئیں' جب عوام کی بے چینی کھل

MashalBooks.org

کر اور نمایاں طور پر ظاہر ہونے لگی۔ ان بغاوتوں کے بعد بیرون ملک منافع کی منتقلی اور قومی وسائل دولت کو قومی ملکیت میں لینے کے سلسلے میں اصلاحات کے نفاذ کا ایک رجحان سامنے آیا۔ یہ اقدامات عوامی دباؤ کے تحت کئے گئے۔ بعض حالات میں جب بین الاقوامی مفاد پرستوں کو اداروں کی عمل داری سے خطرہ لاحق ہوا تو اقتدار کے حامل اعلیٰ گروہ نے جوابی کارروائی کی۔ مثال کے طور پر 1972ء میں فلپائن میں جب سپریم کورٹ نے غیر ملکیوں کو زمین کا حق ملکیت دینے کے خلاف اپنا فیصلہ صادر کیا تو' حکومت کا تختہ الٹا گیا۔ برازیل میں 1964ء میں حکومت کا تختہ اس وقت الٹا گیا جب ہنا مائننگ کمپنی Mining (Hanna Co.) کو کانکنی کے سلسلے میں بعض مراعات دینے پر تنازعہ پیدا ہوا۔ اس طرح 1953ء میں ایران میں جب تیل کو قومی ملکیت میں لیا گیا تو اس کے بعد ہی محمد مصدق کی حکومت کا تختہ الٹا گیا اور چلی میں الاندے کی سرگزشت تو سبھی کے علم میں ہوگی۔

یاد رکھنے کی ایک بات یہ ہے کہ یہ نیا فسطائی نظام ان معاشروں میں ظاہر ہوا' جن میں کسی حد تک طبقاتی شعور اور اقتصادی تفریق اور درجہ بندی پیدا ہو گئی تھی۔ اقتدار اعلیٰ کے مالک ان باغیوں کی کوششیں ابتدا میں کامیاب رہیں' اس لئے کہ وہ حکومتی طاقتوں کو' جن میں خاص طور پر متوسط طبقہ قدامت پرست مالکان اراضی اور غیر ملکی اجارہ دار کاروباری شامل ہیں' محنت کش طبقے کے لوگوں' کسانوں اور ان کے ترقی پسند سیاسی رفیقوں کے خلاف صف آرا کر سکے۔ اس ضمن میں نئی فسطائی ریاستیں یورپی فاشزم سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ تاہم یورپ کی فاشزم سے ان کے امتیاز بہت نمایاں ہیں۔ تیسری دنیا کا غیر ریاستی (Non_state) بورژوازی جو ابتدا میں فوجی اقدام کی حمایت کرتا ہے' اپنی اصل میں صنعت کار سے زیادہ کاروباری ہوتا ہے۔ مقامی مفادات سے وابستہ کم اور غیر ملکیوں کا دلال زیادہ ہوتا ہے' اس طرح وہ اپنے کردار میں یورپی بورژوازی سے مختلف ہوتا ہے۔ اس طرح ریاستی بورژوازی' شہری آبادی کے تعلق سے کسی قدر آزاد ہوتا ہے اور اس میں بہت کم اس بات کی تحریک پیدا ہوتی ہے کہ شہری معاشرے کے کسی شعبے کے ساتھ کوئی بامعنی تعلق پیدا کرے کیونکہ اس کا رابطہ غیر ملکی سرمایہ کاروں سے ہوتا ہے جو اس کی پرورش کرتے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ ان عناصر سے جو آئندہ اس کے حلیف ہو سکتے ہیں' محروم ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا تعلق چونکہ غیر ملکی کارپوریشنوں کے ساتھ رہتا ہے' اس لئے وہ ملک کے اقتصادی وسائل پر زیادہ بااختیار ہوتا ہے۔ اس طرح وہ ملکی آبادی سے نہایت آسانی کے ساتھ کٹ جاتا ہے اور اس کا تعلق فطری طور پر غیر ملکی سرمایے کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے اور وہ غیر ملکی سرمایے کے مفادات کی علامت بن جاتا ہے۔

اس نئے فسطائی نظام کے تسلط کا حاصل یہ نہیں کہ نو آبادی نظام سے پہلے کا اقتدار واپس آ گیا اور وہ مقامی طبقہ دوبارہ مقتدر ہو گیا جو نو آبادیاتی دور میں یا تو سرے سے ختم ہو گیا تھا یا نہایت کمزور ہو کر اپنی

حیثیت گنوا بیٹھا تھا۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ملک میں اس کا اپنا سرمایہ کار طبقہ برسراقتدار آ گیا۔ کیونکہ ملک کی محتاج اور پسماندہ معیشت تو بدستور غیر ملکی سرمایے کے تابع رہے گی اور بین الاقوامی اجارہ دار کارپوریشنوں کا عمل دخل اوران کا اثر اور نفوذ برقرار رہے گا۔ اس نوفسطائیت کے برسراقتدار آنے کا مطلب محض یہ ہے کہ وہ نوآبادتی بورژوازی طبقہ جو ریاست پر اپنے اقتدار کی وجہ سے طاقت ور تھا اور اس کے پاس انتظامی صلاحیت اور فوجی اہلیت بھی تھی' اب اس طبقے کا دائرہ اثر زیادہ پھیل گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں نئی فسطائی ریاستوں کی سماجی بنیادیں یورپ کی فسطائیت سے یکسر مختلف ہیں۔

نوآبادیات میں توسیع پر جب سخت پابندیاں عاید ہوئیں تو یورپی فسطائیت پیدا ہوئی' جبکہ تیسری دنیا میں یہ نئی فسطائیت نوآبادیاتی اور جدید نوآبادیاتی نظام کی پیدا کردہ ہے۔

مزاحمت اور عدم استحکام

امریکہ اور یورپ میں اس نئی ریاستی فسطائیت کو اس طرح دیکھا گیا جیسے وہ تیسری دنیا میں استحکام کی ضامن ہوگی۔ جب قبرص کے سوال پر یونان اور ترکی میں جنگ چھڑ گئی اور یونان کی فوجی حکومت جسے امریکہ کی حمایت حاصل تھی حیرت انگیز طور پر تیزی سے ڈھے گئی تو اس مثال کی روشنی میں ایسی حکومتوں کی کمزوری اور بودے پن کا بغور جائزہ لینا چاہیے تھا' لیکن اس واقعہ کو نظر انداز کر دیا گیا اور ایسی حکومتوں کے فرضی استحکام کا جائزہ پھر بھی نہیں لیا گیا' یہاں تک کہ ایران میں شاہ کا تختہ الٹا گیا۔ ایران کے فوراً بعد نکارا گوا میں انقلاب برپا ہوا' پھر جنوبی کوریا اور ایل سلواڈور کی حکومتیں بری طرح لرزنے لگیں۔ ایسی حکومتوں کی بنیادوں میں جو کمزوریاں پیوست ہیں ان کا مفصل تجزیہ کیا جانا چاہیے۔ تفتیش کن ممکن خطوط پر کی جائے؟ یہاں ہم اختصار کے ساتھ اس کی نشاندہی کرتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ کہ نئی فسطائی ریاست اپنے کردار میں' جس کی شناخت اے سیوانندن نے نہایت درست کی ہے' تیسری دنیا کی ہر ریاست سے زیادہ "بے جوڑ ترقی (disorganic development) میں مبتلا ہے۔ اپنے اقتصادی ماڈل کے مطابق یہ تیسری دنیا کے ملک پر ایک ایسی سرمایہ دارانہ معیشت تھوپ دیتی ہے' جس کے ساتھ "نہ تو سرمایہ داری نظام کا کلچر ہوتا ہے اور نہ سرمایہ دارانہ جمہوریت ہوتی ہے۔" اس کا نتیجہ ایک ایسے اقتصادی نظام کا نفاذ ہے جو ان لوگوں کے تہذیبی اور سیاسی اداروں کے ساتھ میل نہیں کھاتا' جن کا وہ استحصال کرتا ہے۔ یہ ایسا اقتصادی نظام ہے' جس کی ملک کی تہذیب کے ساتھ کوئی مفاہمت نہیں اور جس کے وجود کا کوئی سیاسی جواز نہیں اور سیاسی طاقت اور شہری معاشرہ جس کی توثیق نہیں کرتے' چہ جائے کہ ان کے درمیان کوئی تعلق پیدا ہو' (12) اس کے برعکس وہ ایک دوسرے کے ساتھ بنیادی نوعیت کے تضادات کے ساتھ زندہ رہتے ہیں۔ چونکہ ان حالات میں سیاسی ادارے سختی کے ساتھ دبائے جاتے ہیں لہٰذا مزاحمت

MashalBooks.org

کا شدید ترین اظہار کلچر اور مذہب کے ذریعے ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسے معاشروں میں جو انقلاب آتا ہے' وہ ضروری نہیں کہ طبقاتی نوعیت کا ہو' مثال کے طور پر ایران کا انقلاب دراصل یہ عوامی تحریکیں ہوتی ہیں' جو طبقاتی رشتوں کو کاٹتی ہوئی ہر طرف پھیل جاتی ہیں۔ ان تحریکوں میں کلچر کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے اور مذہب کا یقین بھی۔

دوسری بات یہ کہ اس نئے فسطائی نظام میں ریاستی ڈھانچا اتنی تیزی سے بڑھتا ہے کہ معاشرے میں اس کو سنبھالنے کی اہمیت نہیں ہوتی۔ چونکہ ریاست کا اوپری ڈھانچا معاشرے کے دوسرے اداروں سے کوئی منطقی رشتہ نہیں رکھتا' لہٰذا اس میں معاشرے کی ضروریات سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت نہیں ہوتی' وہ ان کے مطالبات پورے نہیں کرسکتا اور اس کے اندر رونما ہونے والی تبدیلیوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ چنانچہ پہلوی ریاست کا ڈھانچا اتنا بھاری ہوگیا تھا کہ ایرانی عوام کے لئے اسے اٹھائے رکھنا ممکن نہیں رہا۔ اس کے بعد خمینی کا یہ اعلان کہ ریاست کو الٹ دو' قوم میں اتنا مقبول ہوا کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

تیسری بات یہ کہ نئی فسطائیت کے نمونے میں جو واضح تضادات ہیں' ان کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔

1۔ نئی فسطائیت کے اس نظام میں زبردست مرکزیت پائی جاتی ہے' جس میں ریاست' غیر ملکی کارپوریشنوں اور نہایت مختصری مقامی اشرافیہ کے درمیان رابطے کا کام دیتی ہے۔ ایسے میں ریاست اور اس کے حکمران گروہ کے خلاف عوام کی بےچینی بڑھتی جاتی ہے۔

2۔ اس نمونے کا اقتصادی نظام جس میں ریاست اور بین الاقوامی سرمایے کا اشتراک موجود ہو' مقامی کاروباری طبقے کو توسیع کے مرحلے میں ثانوی حیثیت دیتا ہے اور جب معیشت زوال آمادہ ہو تو ان زمانوں میں ان کی سماجی اور معاشی حیثیت کو زیادہ خراب کردیتا ہے۔ اس طرح مقامی کاروباری طبقہ جسے ایک طویل عمل کے تحت اقتصادی طور پر کونے میں لگا دیا گیا ہے' اس وقت آگے نکل کر صف اول میں کھڑا ہو جاتا ہے' جب حزب اختلاف جمہوریت کا مطالبہ لے کر نکلتی ہے۔ یہ وہ صورت حال ہے جس کا مشاہدہ ایران میں بھی ہوا اور نکاراگوا میں بھی۔

3۔ ان فسطائی ریاستوں میں حکمراں گروہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی بنیادوں میں توسیع کرنے کی بجائے' اسے تنگ کرتے جاتے ہیں۔ اختیارات کے استعمال میں ان کا انداز قبائلی جانب داری کا ہوتا ہے اور مراعات بھی اس نہج سے اپنے گروہ میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مال ومنال رکھنے والے طبقے بھی اقتدار سے دور ہو جاتے ہیں' چنانچہ جب کوئی سنگین مرحلہ درپیش ہوتا ہے تو صاحب جائداد طبقہ بھی اپنے حلیف حکمران کا ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔

حوالے

Martin 19Ennals,The Boston Globe,November 26,78 1

(Post- Colonial Systems of Power)Arab Studies Quarterly 2

1-2,no-4(Fail1980):351-52 These were:

(1) The Elective-Parliamentary System (eg-,India,Sri Lanka,

Malaysia, Jamaica, Singapore)-

2) The Ascriptive-Palace System(e-g-,Morocco,Nepal,

Saudi Arabia, Kuwait)

(3) The Dynastic- Oligarchic System(e-g-,Nicaragua under Somoza,

Haiti,Paraguay),

(4) The Pragmatic-Authoritarian System (e-g-,Ivory Coast,Senegal-

Tunisia, Zambia, Cameroun,Egypt under Sadat);

Radical-Authoritarian System (e-g-, Algeria,Tanzania,Mexico, Iraq,

(5) The

(5) S3tria, Somalia bya, Indonesia under Sukarno);

(6) The Marxist-Socialist System (Cuba,Mozambique,Guinea-Bissao,

Vietnam);

(7) The Neo-Fascist System (e-g-,Brazil,Indonesia,Chile-Uruguay,

Argentina, Iran under the Shah, Zaire).

3. Jacques Langguth, "The Mind of a Torturer

Nation, June24,1978 See also A-J-Langguth, Hidden Terrors

(New York: Pantheon,1978)

4. ON this point see Frederick Nunn,Military Professionalism and

Professional Militarism in Brazil,)

MashalBooks.org

Journal of Latin American Studies 4,no.I (1972)

Jeffrey Stein,(Grad School for Juntas) Nation, May 21,1977,

Authoritarian

Michael Klare Supplying Repression: U.S.Support

for Authoritarian Regimes

Abroad (Washington, D.C.: Institure for Policy Studies,

and Chomsky and Edward Herman, The Washington Connection

Noam

and Third World Fascism (Boston: South End Press, 1979)

5. Frances Moore Lappe and Joseph Collins, Food First: Beyond the

See

. myth of Scarcity (Boston: Houghton Mifflin Co.,1977), especially

chapts. 5,6,8

6. Business Week, April 28,1975, p.8.

7. (I Have Heard the Cry of My People,) May 6.1973, unpublished

8. Shelton.H.Davis, Victims of the Miracle (Cambridge University

and Chomsky and Herman, Washington Connection, pp. 109.18

Press)

9. Chomsky. and Herman, Washington Connection. p. 44.

See especially tables I, II, pp. 43,45

10. Supplying Repression. p. 9

Ahmad, "Post-Colonial Systems of Power," Arab Studies Quarterly. 2,

11. Eqbal

no. 4 (Fall 1980): 350.63

12. A Sivanandan, (Imperialism and Disorganic Development in the

Silicon Age,) Race and Class 21, no. 2 (Autumn 1979)

(سہ ماہی ''عرب سٹڈیز'' بہار 1981ء)

MashalBooks.org

اقبال احمد - 1996

Manabooks.org

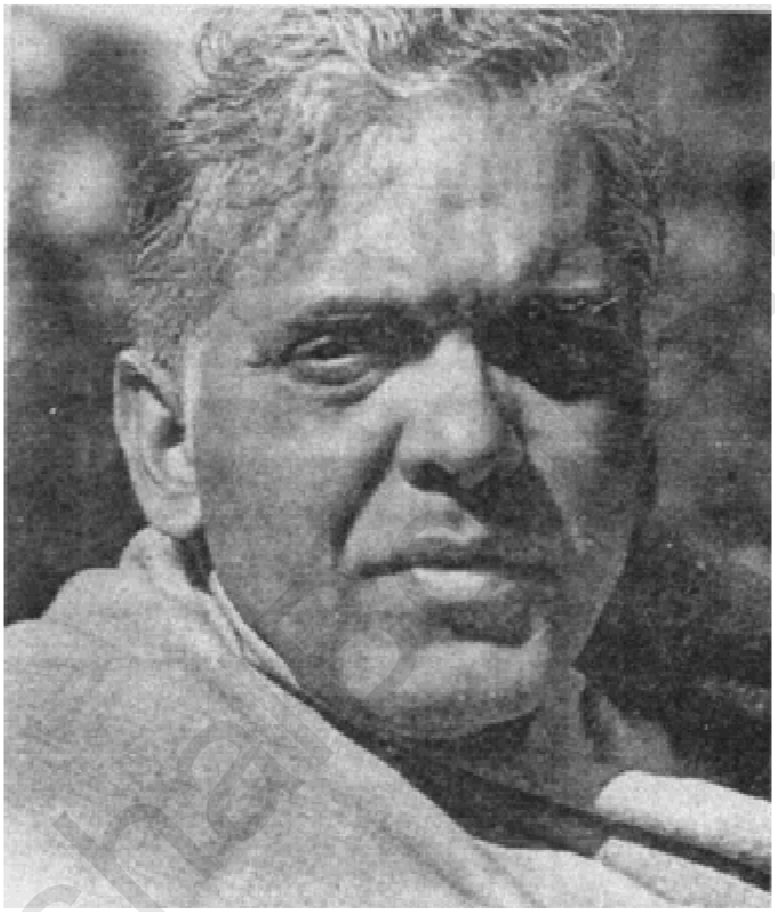

اقبال احمد - 1996

Mashal Books .org

اقبال احمد کے لڑکپن کی تصویر- اگست 1943

اقبال احمد- 1968

MashalBooks.org

اقبال احمد ویت نام کی جنگ کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں

MashalBooks.org

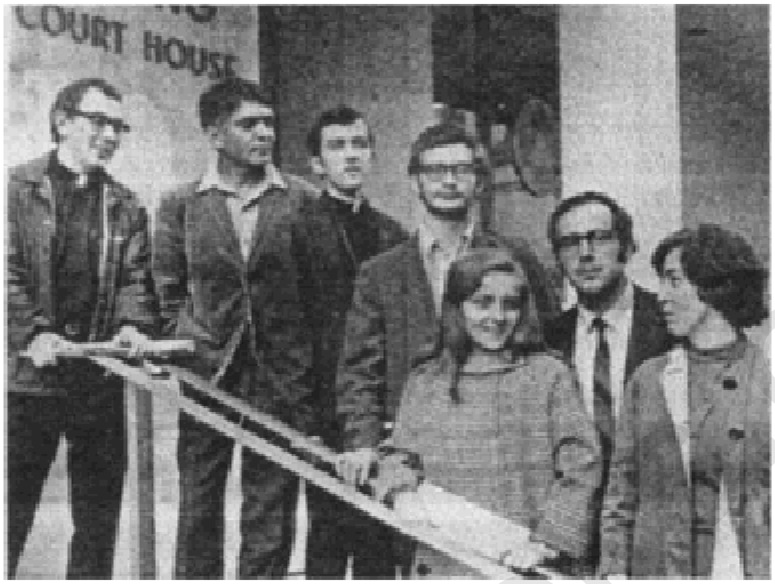

ہنری کسنجر کے اغوا کی سازش کے مقدمہ کی سماعت کے دوران اقبال احمد ہیرس برگ
کی عدالت کے باہر دوسرے ملزموں کے ساتھ

مقدمہ میں بری ہونے کے بعد اقبال احمد پریس کانفرنس میں اپنی فتح کا اعلان
کر رہے ہیں

پاستان کی ساخت

MashalBooks.org

پاکستان کی زیرِ عتاب تاریخ

یہ میرے لئے نہایت سعادت کی بات ہے کہ اس منفرد موقع پر آپ سے خطاب کر رہا ہوں۔ پاکستانیوں میں ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ قائداعظم کو خراجِ تحسین پیش کرنے میں لفاظی سے قطع نظر کوئی وقیع گفتگو کریں۔ پروفیسر زیدی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے جناح پیپرز کو دو جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ یہ قائداعظم کے شکستہ آثار کا محض ایک جزو ہے' کیونکہ یہ تین ہزار سے کچھ زائد صفحات ان کی واقعات سے بھرپور زندگی کے صرف چار ماہ اور دس دنوں کا احاطہ کرتے ہیں' جو 20 فروری 1947ء سے 30 جون تک ہے۔ قائداعظم منصوبے میں کتابوں کی پچاس جلدیں شامل ہیں' جو اس سلسلے میں شائع ہوں گی۔

میں پروفیسر زیدی کو جانتا ہوں' جو دھن کے انتہائی پکے ہیں' انہوں نے اس قومی خزانے کے اوراق کو جمع کرنے' انہیں مدون کرتے' مرتب کرنے اور ادارت میں اپنی زندگی کے تیس سے زائد سال صرف کر دیئے۔ یقیناً میری اس آرزو میں آپ بھی شامل ہوں گے کہ ان کی صحت قائم رہے' جو اس بڑے مشن کی تکمیل کے لئے درکار ہوگی۔ مجھے یہ علم ہے کہ جب تک ان کے جسم میں توانائی باقی ہے' ان کی روح اور مقصد سے لگن کبھی کم نہیں ہوگی۔ اس لئے میں یہ کہوں گا کہ آپ کو طویل عمر نصیب ہو تا کہ آپ آئندہ سالہا سال تک بابائے قوم کے زمانے اور ان کی حیات کے تعلق سے اپنے کام میں منہمک رہیں۔

پروفیسر صاحب ایک مورخ اور وقائع نگار کے طور پر اب اس خواب کی تعبیر کے مرحلے تک پہنچ گئے ہیں جو ایک عرصے تک آپ دیکھتے آئے تھے۔ آپ نے مسٹر جناح کے نجی کاغذات کو صریح بے توجہی سے اور آمریت کے تاریک عقوبت خانے سے نکال لیا ہے۔ آپ ان کاغذات کو محفوظ کر لینے' ان کو ترتیب دینے اور شائع کرنے کی کاوش میں ہمیشہ ثابت قدم رہے اور آج آپ ایسی منفرد مسرت سے ہمکنار ہیں کہ آپ کے دو پرانے شاگرد جن میں ایک برسرِ حکومت ہے اور دوسرا ایک معمولی استاذ آپ کی مرتب کردہ دو جلدوں کی اجراء کے موقع پر خطاب کر رہے ہیں۔ بہت کم ہی مورخ اور ان سے بھی کمتر تعداد میں ایسے اساتذہ ہوں گے جو اپنے جیتے جی اس سے بھی زیادہ کامیابی کی امید کرتے ہوں گے۔ لہٰذا ہم دل کی گہرائیوں سے شکریہ پیش کرتے ہوئے آپ کو مبارکباد کہتے ہیں۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں ایک شخص کی اس غیر معمولی کامیابی پر گفتگو کر کے پیچھے ہٹ جاؤں' ایک بات کہتا چلوں کہ اس کامیابی میں ایک خاتون کا بھی حصہ ہے۔ ان مہینوں کے دوران میں جو پھیل کر برسوں تک جا پہنچے' پروین زیدی نے بڑے تحمل کے ساتھ پروفیسر زیدی کی انتہا درجے کی مایوسیوں کا صدمہ بھی

برداشت کیا' جو پاکستان کے انتہائی عیار نا خیر پسندوں نے ان کی راہ میں پیدا کی تھیں اور حقیقتاً انہوں نے ان بوسیدہ اور قدیم اوراق کو اصل حالت میں لانے اور ان کو محفوظ کرنے کے دشوار عمل میں بڑی مدد کی۔ اس طرح وہ پاکستان کی پہلی محافظ دستاویزات بن گئیں جن کو بین الاقوامی طور پر تسلیم کیا گیا۔ چنانچہ ان کی خدمات بین الاقوامی تنظیموں مثلاً یونیسکو نے اور ترکی' ایران اور ملائیشیا کی حکومتوں نے بھی طلب کی ہیں۔ ان کاغذات میں برسوں تک اپنی جان کھپانے کے علاوہ انہوں نے فاضل پروفیسر کی تیمارداری بھی کی' جن پر دو بار دل کا دورہ پڑ چکا تھا اور ان کے دو بیٹوں میں سے ایک چھوٹے بیٹے کی اندوہناک موت کا سانحہ بھی ان کے ساتھ برداشت کیا۔ مجھے امید ہے کہ ہمدردی کے گہرے جذبات کے علاوہ آپ ہمارے ساتھ ان کا شکریہ ادا کرنے میں بھی شامل ہوں گے۔ اب میں خوب سے خوب تر کی تلاش اور اس بارے میں ہمارے لوگوں کے رویے کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔ افسوس کی بات ہے کہ اس ملک میں اعلیٰ ترین معیار کی قلت رہی ہے۔ محمد اقبال' محمد علی جناح' سعادت حسن منٹو' فیض احمد فیض اور پروفیسر عبدالسلام کی سرزمین پر ہمیشہ یہ کیفیت نہیں تھی۔ اب ہم نے ان سب کو اپنے درمیان سے رسمی طور پر خارج کر دیا ہے۔ اس لئے عام شہری جب کسی شخص کو اعلیٰ معیار تک پہنچنے کے لئے محنت کرتے دیکھتے ہیں' جبکہ اس کا مقصد دولت مند بننے کے سوا کچھ اور ہو تو اس پر حیرت سے سوچنے لگتے ہیں۔ پھر وہ اس کوشش میں اپنی مدد بھی شامل کرتے ہیں اس جوش وخروش کے ساتھ' جو بالکل خلاف توقع ہوتی ہے۔ پاکستان میں عام شہریوں کے اندر پر مسرت کیفیت کی گواہی عبدالستار ایدھی اور ڈاکٹر اختر حمید خاں جیسے لوگ دیں گے۔

مجھے یاد آتا ہے کہ پروفیسر زیدی ایسے لوگوں کی تلاش میں کس قدر فکرمند رہتے تھے جو قائداعظم پیپرز کے ایک بڑے انبار مرتب کرنے' جوڑنے اور مدون کرنے میں ان کے مددگار ہو سکتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ پروفیسر زیدی تین سال پہلے جب پاکستان واپس آئے تو یہاں پہنچتے ہی' میں نے انہیں اپنے اندیشے کا اظہار کرتے سنا۔ (اقبال! یہ ایک کمر توڑ کام ہے۔ اس کے لئے بڑے صبر و تحمل اور مہارت کی ضرورت ہے۔ میں کام تو سکھا سکتا ہوں لیکن مجھے وہ لوگ کہاں ملیں گے جن میں کام کرنے کا ضابطہ ہو اور اس میں ثابت قدم رہنے کا جذبہ ہو۔'' تو پھر ایسے لوگ آئے' مرد اور خواتین' نوجوان اور بوڑھے جو مدد کرنے پر آمادہ اور سیکھنے پر مستعد تھے۔ انہوں نے سیکھا بھی اور انتھک جذبے کے ساتھ مدد بھی کی۔ بالآخر جناح پیپرز کی تیاری میں ان کا بھی اسی قدر حصہ ہے۔ جتنا پروفیسر زیدی اور مسز زیدی کا ہے۔ وہ لوگ یہاں ہال میں موجود ہیں اور ہماری پرجوش ستائش کے مستحق ہیں۔ اس میں یہ بصیرت ملتی ہے' جس کی نشاندہی مجھے موجودہ قیادت کے فائدے اور پاکستان کی آئندہ قیادت کی رہنمائی کے لئے کر دینی چاہیے۔ اس ملک کا دل یعنی اس کے عام باشندے چشمے کے پانی کی طرح پاکیزہ چٹان کی طرح مضبوط اور نیکی' انصاف اور روشن خیالی کے حصول کی پایاں آرزو میں شاعرانہ مزاج کے مالک ہیں۔ محمد علی جناح کی عظمت یہ ہے کہ انہوں نے اس سادہ سی

MashalBooks.org

حقیقت کو پالیا تھا۔انہوں نے ایک نا قابل شکست دیانت کے ساتھ ان کی راہنمائی ایک ایسے راستے پر کی جس میں ماضی کی رکاوٹوں سے دور معاشی انصاف اور روشن مستقبل کا وعدہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ عوام جوش و خروش اور خود سپردگی کے جذبے کے ساتھ کسی اندیشے یا بدگمانی کے بغیر ان کے پیچھے چل پڑے اور ایک بیرسٹر کو جو الگ سا تھا ایک اہم ریاست کا بانی بننے کا اعزاز سپرد کر دیا۔ یہ ایک اندوہناک حقیقت ہے کہ اس کے جانے کے بعد ان عظیم لوگوں کو جو قائد کے ورثہ دار تھے' بے توجہی اور بدعہدی کا عذاب سہنا پڑا۔

اس بے توجہی کی قیمت جو سب سے بڑی تو نہیں' البتہ ادا کرنی پڑی کہ مسٹر جناح اور وہ تحریک جس کی انہوں نے راہنمائی کی' دونوں سنجیدہ علمی مطالعے سے محروم رہے۔ اب تک ان پر جو چار سوانح عمریاں چھپ چکی ہیں' ان میں سے صرف ایک جو اسٹینلے والپرٹ کی ہے' علمی سطح کی ہے جس میں اصل موضوع کو نو آبادیاتی اور قوم پرستی کی سیاست کے وسیع تر تناظر میں دیکھا گیا ہے اور ڈاکٹر سلیم احمد کی کتاب کے سوا جس میں 1906ء سے 1921ء تک کی تاریخ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مسلم لیگ اور تحریک پاکستان پر کوئی سنجیدہ کام نہیں ہوا۔

قدیم دستاویزات کسی قوم کے حافظے کا توشہ خانہ ہوتے ہیں اور تاریخ کی کتب میں ان یادداشتوں کو منظم اور بامعنی انداز سے' سلیقے کے ساتھ ترتیب دیا جاتا ہے۔ یہ واقعی اندوہناک بات ہے کہ ہمارے قدیم اوراق بکھرے ہوئے اور بے توجہی کا شکار ہیں اور مورخ پاکستان میں تقریباً ناپید ہیں۔ مزید خرابی یہ ہوئی کہ ہم ایسی نسلوں کی پرورش کر رہے ہیں جن کا علم ناقص ہے اور جنہیں اسکولوں میں زہریلا اور تاریخ کا مسخ شدہ طومار پڑھنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ اس صورت حال کا پہلا بصیرت افروز علم مجھے اس مضمون سے ہوا' جس کا عنوان ہے "پاکستان کی تاریخ دوبارہ لکھی جا رہی ہے۔" اس کے مصنف پرویز امیر علی ہود بھائی اور عبدالحمید نیر ہیں۔ یہ مضمون ایئر مارشل اصغر خاں کی ادارت میں (اسلام پالیٹکس اور اسٹیٹ) میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ایک بڑی خدمت پروفیسر کے کے عزیز نے انجام دی' جنہوں نے "مرڈر آف ہسٹری ان پاکستان" (پاکستان میں تاریخ کا قتل) لکھی۔

تاریخ کے سرچشموں کو آلودہ کرنے کا کام اس ملک میں بہت پہلے شروع ہو گیا تھا۔ ضیاء الحق کے زمانے میں یہ کاوش اپنی انتہا پر جا پہنچی تھی۔ انہیں اسلام کے نام پر اپنے ظالمانہ اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے تعلیمی اداروں کی صورت میں ایک نہایت موثر ذریعہ نظر آ گیا۔ "نظریہ پاکستان" کا لیبل بھی انہی کی ایجاد تھا۔ جنرل نے تمام ڈگری کالجوں میں' جن میں انجینئرنگ اور میڈیکل کالج بھی شامل تھے' مطالعہ پاکستان کی تدریس کو لازمی قرار دے دیا۔ اس کے بعد تاریخ کو دوبارہ لکھنے کا کام بڑے پیمانے پر شروع ہو گیا۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے آئندہ نصابی کتب لکھنے والوں کو یہ ہدایت نامہ ارسال کیا کہ نئے نصاب کا مقصد قوم کے ماضی کے لئے تفاخر کا جذبہ حال سے پر جوش وابستگی اور پاکستان کی سالمیت اور بقا کے لئے غیر

متزلزل یقین پیدا کرنا ہے۔) مبادا اس میں کوئی تذبذب باقی رہ جائے لہٰذا مصنفوں کے لئے یہ گنجائش رکھی گئی ہے کہ تاریخ نویسی کے اصولوں کے پیش نظر درج ذیل ہدایات پر عمل کریں۔

"یہ دکھایا جائے کہ پاکستان کی بنیاد کوئی نسلی' لسانی یا جغرافیائی اسباب پر نہیں بلکہ ایک مشترکہ مذہب کا باہمی تجربہ ہے۔ طلبہ کو بتایا جائے تاکہ وہ سمجھیں کہ نظریہ پاکستان کیا ہے؟ اور پھر نعروں کے ذریعے اسے مقبول بنایا جائے۔ انہیں پاکستان کے حتمی مقاصد کے حصول کی جانب صحیح راہ پر لگایا جائے اور وہ ہے ایک مکمل اسلامی ریاست کی تشکیل۔" مجھے کسی اور ملک کے تعلیمی نظام کا علم نہیں جہاں اتنے صریح انداز سے علم کو سیاست کے تابع کر دیا گیا ہو۔ تاریخ پڑھانے اور لکھنے کے معاملے میں پاکستان میں ہمیشہ گھپلا ہوتا آیا ہے اور اب تو یہ کام تاریخ دانوں سے لے کر منشیوں کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے ایک ایسی تاریخ ایجاد کی ہے جسے پاکستان کے مورخ بھی جو اگرچہ تعداد میں مٹھی بھر رہ گئے ہیں' نہیں پہچانتے۔ ان کا پہلا شکار قائداعظم ہوئے۔ انہیں ایک نئی روحانی زندگی دی گئی۔ اب وہ ایک کٹر قسم کے مذہبی آدمی بن گئے' جن کا مقصد ایک دینی ریاست کا قیام تھا اور وہ علماء جنہوں نے باستثنائے چند جناح کی مخالفت کی تھی' وہ اب ہیرو اور باغبان پاکستان بن گئے۔ ہماری تاریخ کو جس طرح مسخ کیا گیا ہے' جناح پیپرز کا وجود اس صداقت کا اظہار ہے اور مخالفوں کے لئے ایک تنبیہ بھی۔ ان سے یہ بات بھی یقینی ہو گئی کہ مستقبل کے مورخ اصل جناح اور ان کی زیر قیادت تحریک کی حقیقت تک آسانی کے ساتھ پہنچ جائیں گے۔

ہماری قدیمی دستاویزات جو منتشر اور بے توجہی کے عالم میں پڑی ہیں' انہیں کس طرح محفوظ اور مرتب کیا جائے' ان کے متعلق پروفیسر زیدی کے کچھ تصورات ہیں۔ میری درخواست ہے کہ ہمارے اسکولوں میں تاریخ اور مطالعہ پاکستان کی جو درسی کتابیں رائج ہیں' ان کا اور تدریس کے نصاب کا جائزہ لیا جائے اور ان پر نظر ثانی کی جائے اور یہ کام قومی سطح پر ہو۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پاکستان کی آئندہ نسلیں جہل اور قدامت پرستی کے حوالے ہو جائیں گی۔

("ڈان" 4 جون 1995ء)

محمد علی جناح، ایک منفرد شخصیت

محمد علی جناح موجودہ تاریخ کی ایک پراسرار شخصیت ہیں۔ ان کا انگریز روساء کا سا رہن سہن، وکٹوریہ دور کے مجلسی آداب اور سیکولر نقطہ نظر، ان باتوں کے ہوتے ہوئے ان کا ہندوستانی مسلمانوں کا قائد ہونا، انتہائی غیر یقینی تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے ایک جداگانہ ریاست کے قیام کے لئے ان کی قیادت کی، ایک تاریخ بنا دی اور سعد خیری کے بقول ''جغرافیہ بدل دیا''۔ وہ ہندوستانی قوم پرستی کو ترک کر کے مسلم علیحدگی پسندی تک کیسے پہنچے؟ اس کی وضاحت کی کوشش بہت سے دانش ور مصنفوں نے کی ہے، جن میں ایچ ایم سیروائی، عائشہ جلال اور سعد خیری شامل ہیں، لیکن جناح کی پرکشش شخصیت کا راز نہیں کھل سکا۔ کیونکہ بہر طور نہ تو مسلم قومیت کی ابتدا ان سے ہوئی اور نہ پاکستان کا تصور انہی سے مخصوص تھا۔ بلکہ ان دونوں تصورات کو انہوں نے بڑی بے دلی سے قبول کیا۔

اس معاملے کو ایک اور پہلو سے دیکھتے ہیں۔ بیسویں صدی میں مسلمانوں کی قیادت کے لئے دو شخصیتیں آگے بڑھ رہی تھیں اور دونوں غیر معمولی تھیں۔ یہ تھے ابوالکلام آزاد اور محمد علی جناح۔ مسلمانوں کی امنگوں کو سمجھنے کے لئے ہم ادھر سے گریز کرتے ہوئے پہلے ان دونوں کے سوانحی خاکوں پر نظر ڈالتے ہیں۔ ان کے خاندانی پس منظر، تعلیم، معاشرت اور قیادت کے قرینوں کے درمیان زبردست فرق نظر آتا ہے۔ آزاد کے آباؤ اجداد کا تعلق بابر بادشاہ کے زمانے سے ہی ہندوستان کی فارسی اور اردو بولنے والی اشرافیہ سے تھا۔ آزاد کے پردادا، مغل سلطنت کے آخری رکن المدرسین تھے۔ یہ عہدہ آج کل کے وزیر تعلیم کے برابر تھا۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد ان کا خاندان مدینہ چلا گیا، جہاں ان کا میل جول شریف خاندان کی اشرافیہ کے ساتھ ہو گیا۔ آزاد کی والدہ شیخ محمد ظاہر وتری کی بیٹی تھیں، جو اپنے زمانے میں مدینہ کے سب سے زیادہ معروف عالم شمار ہوتے تھے۔ ان کے والد مولانا خیرالدین کو دنیائے اسلام میں اسلام کے موضوع پر کتاب لکھنے سے شہرت حاصل ہوئی، جو دس جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے نہر زبیدہ کی بحالی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ یہ نہر مکہ تک پانی کی فراہمی کا واحد ذریعہ ہے۔ ان ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان جو ایک سلطنت کے زوال کے بعد اس کی بازیابی کی آرزو رکھتے تھے اور برطانوی غلامی کے دور سے گزر رہے تھے ابوالکلام آزاد سے بہتر کسی خاندان کے بارے میں سوچا ہی نہیں جا سکتا تھا، جو قیادت کی اہل ہوتی۔

ابوالکلام آزاد ایک غیر معمولی خاندان کے ایک نہایت ہونہار فرزند تھے۔ اس خاندان کی جڑیں

MashalBooks.org

بیک وقت دو تہذیبوں میں پیوست تھیں' ہندوستانی اور بین الاسلامی' جس کے ساتھ جنوبی ایشیا کے مسلمان نفسیاتی اور تہذیبی اعتبار سے تاریخی طور پر منسلک چلے آ رہے ہیں۔ آزاد مکہ میں پیدا ہوئے' وہ عربی زبان میں رواں تھے' فارسی سے بخوبی واقف تھے اور اردو نثر کے نہایت باصلاحیت مصنف۔ وہ اسلام کی صوفی روایات میں پوری طرح ڈوبے ہوئے تھے۔ بہت پہلے 1919ء میں انہوں نے سرمد شہید پر ایک کتاب تصنیف کی تھی' جس میں اسلام کے اندر ریاست اور انسانی معاشرے کے درمیان زبردست تضاد پر بحث کی گئی تھی۔ قرآن کریم پر ان کی تفسیر آج بھی دنیا کی بہترین تفاسیر میں شمار ہوتی ہے۔ چند سال پہلے ایک بار میں نے مولانا کوثر نیازی مرحوم سے پوچھا کہ مفسرین میں آپ کا استاد کون ہے؟ انہوں نے برجستہ جواب دیا: ''ابوالکلام' ابوالکلام نے ''الہلال'' کا اجراء 1912ء میں اس وقت کیا' جب ان کی عمر صرف 22 سال تھی۔ سنجیدہ نوعیت کی اور مقبول عام اردو صحافت کا آغاز اس سے ہوا۔ اس کے بعد البلاغ شائع ہونے لگا۔ اردو کو سیاسی اور سماجی مباحث کا ایک مقبول وسیلہ بنانے میں اس جریدے کی حیثیت سنگ میل کی سی ہے۔ آزاد ایک مسحور کن خطیب تھے اور جناح کی طرح وہ بھی زبردست قوم پرست 1923ء میں' جبکہ ان کی عمر صرف 35 سال تھی' وہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر منتخب کئے گئے۔ وہ سب سے کم عمر صدر قرار پائے' بعد میں یہ ریکارڈ نہرو نے توڑا۔ ہندوستان کے علماء کی بھاری تعداد آزاد کی حمایت کرتی تھی۔

اس کے بعد وہ شخص آتا ہے جسے بعد میں احترام کے ساتھ قائداعظم کہا گیا۔ وہ آزاد کے ہم عصر تھے۔ مسلمانوں کی قیادت کے وہ انتہائی کم مستحق تھے' وہ 1876ء میں پیدا ہوئے۔ آزاد کا سن پیدائش 1890ء تھا' لیکن عمروں کے درمیان اس قربت سے قطع نظر دونوں کے درمیان زبردست فرق تھا۔ آزاد کا آبائی تعلق یوپی اور بنگال کی مسلمان اشرافیہ سے تھا' جبکہ جناح کراچی کے ساحلی شہر میں متوسط طبقے کے کاروباری خاندان میں پیدا ہوئے' اس شہر میں ہندوؤں کی بالادستی تھی۔ اکیس سال کی عمر میں وہ انگلینڈ چلے گئے اور پھر وہاں سے بمبئی جو برطانوی ہند کا نیا دروازہ کہا جاتا تھا' آزاد سنی اکثریتی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جناح ایک اقلیتی شیعہ فرقے کے فرزند تھے۔ وہ ایک ایسے ہندوستانی کا نمونہ تھے' جو مغرب کا تربیت یافتہ ہوتے ہیں' ان کی تعلیم وتربیت لنکنز ران میں ہوئی' ان کے سوٹ ایک بڑے فیشن ڈیزائنرز سیوائل رو کے سلے ہوئے ہوتے تھے' نوجوانی میں وہ شکسپیئر ڈرامے کے اداکار بھی تھے۔ وہ آئینی قانون کے ماہر اور اینگلوسیکسن (انگریزی) روایت کے پروردہ تھے۔ ان کی شادی ایک پارسی لڑکی سے ہوئی تھی۔ اپنی دیسی گجراتی زبان کے مقابلے میں انگریزی انہیں آسان لگتی تھی۔ جناح اردو نہیں بول سکتے تھے' وہی اردو جسے بعد میں انہوں نے پاکستان کی سرکاری زبان قرار دیا تھا۔ فارسی اور عربی انہیں بالکل نہیں آتی تھی اور اسلام کی مبادیات سے واقف تھے۔ یہ ایسی بات تھی جو مغربی تعلیم حاصل کرنے والے مسلمانوں میں عام ہے۔ برصغیر میں علماء کی بھاری اکثریت کے لئے ان کا وجود سخت ناپسندیدہ تھا۔ ان میں مولانا حسین احمد مدنی جیسی بلند

قامت شخصیت اور ابوالاعلیٰ مودودی جیسے عالم دین بھی شامل تھے۔ مسٹر جناح نے اپنی شخصیت میں ان صریح کوتاہیوں سے نجات پانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ بیرسٹر ایم کے گاندھی کے برعکس جن کے ساتھ مسٹر جناح کی بہت سی مماثلتیں تھیں' مثلاً زبان' طبقے اور تعلیم کی مماثلت' وہ اپنے مغربی طریقوں پر ثابت قدم رہے' وہی دھاریدار سوٹ زیب تن کرتے جبکہ گاندھی ہاتھ سے بنے ہوئے کھدر کی دھوتی باندھتے تھے۔ مسٹر جناح عوام پسند علامتوں کے آگے اپنا سر نہیں جھکاتے تھے۔ سیاسی جلسے جلوس میں شاذ و نادر ہی شرکت کرتے تھے۔ وہ علانیہ طور پر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ ان کی گفتگو کی نمایاں خصوصیات معقول دلیل اور کھری منطق ہوتی تھی' سیاسی جلسوں میں وہ اس طرح خطاب کرتے جیسے عدالت سے مخاطب ہوں یا وکلاء کی کانفرنس سے خطاب کر رہے ہوں۔ یہ طریقہ کہیں بھی مقبول نہیں اور جنوبی ایشیا میں تو سرے سے نہیں' اس کے باوجود وہ 1935ء میں لندن سے واپسی کے بعد دس ہی سال کے اندر اپنے سیاسی حریفوں پر چھا گئے۔ یہاں تک کہ مسلم لیگ میں اپنے حلیفوں پر بھی بازی لے گئے اور اپنے آپ کو اور مسلم لیگ کو بھی کامیابی کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کا واحد ترجمان ثابت کر دکھایا۔ 1937ء کے انتخابات میں مسلم لیگ ایک معمولی سیاسی پارٹی کے طور پر بھی اپنا وجود بمشکل برقرار رکھ سکی۔ 1940ء میں اس نے پاکستان کے قیام کو اپنا مقصد بنالیا اور اس کے بمشکل سات سال بعد یہ نئی ریاست وجود میں آ گئی۔

جناح پیپرز کی پہلی جلد کے تعارف میں پروفیسر زیدی نے یہ مرکزی سوال اٹھایا ہے: ''آخر وہ کیا بات تھی جس نے جناح کو مسلمانوں کی امیدوں اور امنگوں کا محور بنا دیا؟'' ایک جواب جسے سعد خیری اور ایچ ایم سیروئی نے بڑی خوش اسلوبی سے مرتب کیا ہے' وہ یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کی قیادت نے جناح کے لئے کوئی متبادل راہ نہیں چھوڑی تھی' اگرچہ وہ اس کے لئے مسلسل کوشاں رہے۔ لیکن پروفیسر زیدی کے تعارف میں اس کی وضاحت بڑی گہرائی کے ساتھ کی گئی ہے' جو اس قابل ہے کہ یہاں اس کا حوالہ دیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں: ''جو بات مسٹر جناح کو ان کے عظیم معاصرین سے ممتاز کرتی تھی وہ یہ تھی کہ وہ ایک خود آگاہ اور نہایت جدید انسان تھے' ایک ایسے شخص جو دیگر باتوں کے علاوہ دلیل' نظم و ضبط' تنظیم اور معیشت کو بہر طور مقدم سمجھتے تھے۔ جناح دوسرے مسلم لیگیوں سے اس اعتبار سے بھی مختلف تھے کہ وہ مقصد کے پابند تھے اور اس میں سمجھوتہ نہیں کرتے تھے' علامتوں کو اہمیت نہیں دیتے تھے' جذبات کی بجائے دلائل کو اور روایت کے مقابلے میں جدت کو فوقیت دیتے تھے۔)

لیکن بظاہر اس جدید شخص میں ان لوگوں کے لئے اتنی زبردست کشش کیسے پیدا ہو سکتی تھی' جو روایت پرستی اور مذہبی جمود میں مبتلا تھے۔ اس سوال کا جواب جو مسٹر زیدی نے دیا' میں اسے مختصراً بیان کروں گا۔'' ہندوستانی مسلمانوں میں جناح صاحب کے لئے خاص طور پر کشش اس لئے محسوس ہوئی کہ ان میں صریح انداز سے نہ سہی' لیکن جبلی طور پر حائیہ تاریخ کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔'' یہ وہ برادری تھی جسے اپنی روبہ زوال

MashalBooks.org

حالت کا شعور تھا اور انہیں پرانی تدبیروں کے بے اثر ہونے کا تجربہ بھی تھا۔ ہندوستان کا مسلمان معاشرہ جن مصائب میں مبتلا تھا' اس کا علاج نہ تو شاہ ولی اللہ کی تجویز میں تھا' جو انہیں ماضی کی طرف لے جانا چاہتے تھے نہ سید احمد شہید کے شعلہ بار جنگی نعروں میں تھا' نہ پرجوش اور ہم رنگ لیکن مبہم خلافت تحریک میں تھا' جس سے ابوالکلام وابستہ ہو گئے تھے' لیکن جناح اس سے واضح طور پر دور تھے۔ اصلاح کی تدبیریں تقریباً ختم ہو چکی تھیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اس المناک دور میں مسٹر جناح دوبارہ واپس آئے' انڈین نیشنل کانگریس کے لیڈروں کو اپنی حیثیت کا اتنا غرور تھا کہ انہوں نے ان زخم خوردہ اور درماندہ لوگوں کے لئے کوئی قابل عمل سیاسی دروازہ کھولنے سے ہی انکار کر دیا۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ اس وقت تک مسلمانوں کے زوال اور اس کے ازالے کی تدبیروں کے بارے میں جدید تصور جسے سرسید نے واضح طور پر بیان کیا تھا اور جس کی صراحت ان کے نظریاتی وارثوں نے ان میں اقبال بھی شامل تھے کی مسلمان دانش وروں کے شعور میں جگہ بنا چکا تھا۔ اس کیفیت میں ایک بین الاسلامی حوالہ بھی موجود تھا۔ 1930ء کے عشرے میں اسلامی دنیا اجتماعی طور پر' البرٹ ہورانی کے الفاظ میں ایک "لبرل ایج" یعنی فکری آزادی کے دور میں داخل ہو چکی تھی۔ اس وقت اصلاح اور تجدد کی بنیادوں پر مسلم قومیت میں زبردست ابال پیدا ہوا۔ مسٹر جناح 1935ء میں انگلینڈ سے واپس آئے' مسلم قوم پرستی کی طوفانی لہروں نے انہیں اپنے شانوں پر اٹھا لیا۔

بانی پاکستان نے اس ملک کا جو تصور پیش کیا تھا اور جس کے لئے عوام نے بے اندازہ قربانیاں دی تھیں' قائداعظم کی وفات کے بعد چالیس سال کے عرصے میں یہ ملک نہایت تیزی کے ساتھ اس کے مخالف سمت میں سفر کرتا رہا ہے۔ دو جلدوں میں مرتب جناح پیپرز اور وہ قدیم اوراق جن سے ان کی ترتیب عمل میں آئی' قائداعظم کے بعد ہونے والی بدعہدی اور بزدلی کی کہانیاں تو بیان نہیں کرتے۔ ہمیں تو صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کون تھے اور انہوں نے ایک ریاست کی تشکیل کے لئے کتنی صبر آزما اور اذیت ناک جدوجہد کی اور اس ملک کے لئے کیا کیا خواب تھے اور کیسی کیسی امیدیں تھیں۔ میں انہیں یاد کرنا چاہوں گا تاکہ ہمیں یاد آتا رہے کہ ہم نے ان کے چھوڑے ہوئے ورثے سے کیا سلوک کیا۔

("ڈان" 11 جون' 1995ء)

بدعہدی کی قیمت

اس سے پہلے کہ میں مسٹر جناح کا تذکرہ کروں اور آپ کو یاد دلاؤں کہ وہ کون سی امنگیں تھیں، جن کی خاطر اس برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے لئے ایک جداگانہ ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا، مناسب ہوگا کہ اس امر کی نشاندہی کرتا چلوں کہ جن توقعات پر ایک ریاست کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ جب ایک ایک کر کے ان سے بدعہدی کی جائے تو اس کی کیا قیمت ادا کرنی پڑتی ہے؟ ریاستوں کے تسلسل اور استحکام میں مرکزی حیثیت ان کے قیام کے جواز کی ہے اور یہ وہ نکتہ ہے، جسے افلاطون سے آج تک سیاسی نظریہ دان تسلیم کرتے آئے ہیں۔ جواز سے مراد کسی حکومت یا اس کے اداروں کی مقبولیت نہیں، اس میں یہ بات شامل ہے کہ طاقت کے اس نظام کو شہریوں نے کس قدر قبول کیا ہے۔ بڑی حد تک یہ جواز معروضی حقائق سے پیدا ہوتا ہے، یعنی وہ اقدار جن سے ریاست یا حکومتی پالیسیوں کی تشکیل ہوتی ہے، اس کے ساتھ قانون کی بالادستی اور معاشرے میں مساوی سطح پر انصاف کی تقسیم اور ان سب کے سوا یہ بات کہ شہریوں کے حقوق کے معاملے میں وعدوں اور ان دعوؤں کی تکمیل میں کس حد تک مطابقت ہے۔ یہی وہ خوبیاں ہیں، جن کے نہ ہونے سے پاکستان اپنے جواز کے بحران میں مسلسل مبتلا چلا آ رہا ہے۔ اس بحران کا سب سے ڈرامائی نتیجہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی تھی اور اس بحران کے باطن میں ہماری یہ اجتماعی ناکامی شامل تھی کہ ہم ایک مرکزی مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام رہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ پاکستانی ریاست کی نوعیت کیا ہے اور وہ قوانین کون سے ہیں؟ جن کے تحت یہاں حکومت کی جاتی ہے۔

ہندوستان کی تقسیم سے پہلے کی دہائی میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں پر مذہب کی زبان اور فرقہ واریت پر مبنی علامتیں حاوی ہو گئی تھیں۔ مسٹر جناح نے جب دوقومی نظریہ پیش کیا تو انہوں نے بھی نمایاں طور پر اس میں حصہ لیا۔ لیکن دو حقائق پھر بھی واضح تھے، ایک تو یہ کہ علما نے بھاری تعداد میں ان کی مخالفت کی اور انہوں نے علماء سے مفاہمت کی چنداں کوشش نہیں کی۔ دوسری بات یہ کہ انہوں نے مذہبی حکومت کی کسی سمجھوتے کے بغیر سختی سے مخالفت کی۔ چنانچہ اس زمانے میں کہ فرقہ واریت کا جنون اپنی انتہا پر تھا اور مذہبی جوش و خروش اپنے شباب پر، یعنی 1946ء کا سال، انہوں نے کہا ''ہم کس بات کے لئے لڑ رہے ہیں؟ ہمارا مقصد کیا ہے؟ ملائیت کے لئے اور مذہبی ریاست کے لئے تو نہیں۔ مذہب ہم سب کو عزیز ہے۔ جب ہم مذہب کی بات کرتے ہیں تو دنیا کی ساری دولت اس کے آگے ہیچ ہو جاتی ہے۔ لیکن کچھ دوسری باتیں بھی ہیں، جو نہایت درجہ اہم ہیں، وہ ہے ہماری سماجی زندگی اور ہماری اقتصادی زندگی اور ہم سیاسی طاقت کے بغیر

MashalBooks.org

آپ کے عقیدے کو اور آپ کی معاشی زندگی کو کس طرح بچا سکتے ہیں۔" توہین رسالت کے قانون' حدود آرڈیننس اور شریعت بل کے اس عذاب ناک دور میں کیا مذکورہ عبارت کے تعلق کو جتانے کی ضرورت رہتی ہے؟

جناح صاحب نے ریاست اور اس کی حکومت کی پالیسیوں اور طریق کار سے باخبر کرتے ہوئے اسلام کے اعلیٰ اصولوں کے حوالے ضرور دیئے لیکن ایسا کرتے وقت ان کا ہمیشہ اس بات پر زور ہوتا تھا کہ جمہوریت' سماجی انصاف اور قانون کی عمل داری کے ڈانڈے بالآخر اسلام کی اقدار سے ملتے ہیں' چنانچہ 1948ء میں سبی دربار کے موقع پر انہوں نے کہا: "آیئے' ہم اپنی جمہوریت کی بنیاد سچے اسلامی اصولوں اور اعلیٰ اقدار پر رکھیں۔ ہمیں خدا نے یہ سبق دیا ہے کہ ریاستی امور کی انجام دہی میں ہم اپنے فیصلے بحث و مباحثے اور مشاورت سے کریں گے۔" مزید یہ کہا "اسلام اور اس کے اعلیٰ اصولوں نے ہمیں بتایا ہے کہ اس طرح زندگی گزاریں' سوچیں اور عمل کریں' یہ ہمارا ملک پاکستان ہے اور ہم سب پاکستانی ہیں۔" یہ پڑھتے وقت' مجھے خیال آیا کہ انہوں نے یہ کب سوچا ہوگا کہ وہ جس ملک کی بنیاد رکھ رہے ہیں' وہ ہر حکومت لوگوں کے فرقہ وارانہ اعمال کی شدت سے ٹوٹ جائے گا اور ان کے ورثا اقلیت سازی میں مصروف ہو جائیں گے اور جن کے سپرد قانون کی عمل داری ہوگی' وہی دن دہاڑے قانون شکنی کریں گے اور اندھیرا ہوتے ہی شہری دوسرے شہریوں کو گلیوں میں' دفاتر میں اور مساجد میں قتل کرتے پھریں گے اور دہشت گردوں کے گروہ خود ریاست کے حلیف ہوں گے۔

ریاستوں اور قوموں کی طرح تہذیبیں بھی قانون کی پابندی سے مشتق ہیں' اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ قائداعظم نے اس بنیادی شہری اصول کو 1947ء کے تاریک ترین دنوں میں بھی فراموش نہیں کیا تھا۔ عوام اور معاشرے کے دفاع کی خاطر جب قانون کے نفاذ کا موقع آیا تو انہوں نے طبقے' نسلی تعلق اور مذہب کا کوئی امتیاز نہیں کیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے 24 جون 1947ء کو ایون جنکنز کے نام ایک خفیہ مراسلہ لکھا تھا' جس میں ایک نایاب ستائشی عبارت ملتی ہے' وہ لکھتے ہیں: "گزشتہ رات میں نے مسٹر جناح سے بات کی اور انہوں نے مجھ سے دردمندانہ کہا کہ امرتسر اور لاہور میں فسادات کو کچلنے کے لئے پوری بے رحمی کے ساتھ کام کیا جائے۔" انہوں نے کہا: (مجھے اس بات کی پروا نہیں کہ آپ مسلمان پر گولی چلاتے ہیں یا نہیں' لیکن اسے بہر طور ختم کرنا پڑے گا۔" فرقہ واریت' دہشت گردی اور جرائم کے نتیجے میں جو خانہ جنگی پیدا ہو گئی تھی' ان میں ہلاک شدگان کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ افسوس کہ سیاست دان اور حکومتیں خود اس میں اس قدر ملوث ہو گئیں کہ ذرہ برابر بھی مسئلہ کا حل تو کیا ہوتیں' خود بھی مسئلہ بن گئیں۔ پھر ذمہ دار کون ہے؟ اور سوال یہ ہے کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں کسی اور کو نہیں اپنے آپ کو ہی الزام دینا ہے۔ آپ اور ہم' وہ سب جو اس ایوان میں موجود ہیں' قوم کے دانش ور طبقے کے سارے ارکان۔ یہاں جی چاہتا ہے کہ

MashalBooks.org

آخری بار مسٹر جناح کے بیان کا حوالہ دوں۔ ''کرپشن (رشوت' بد دیانتی) ہندوستان میں ایک لعنت ہے اور مسلمانوں میں خاص طور پر اس کے نام نہاد پڑھے لکھوں اور اس کے دانشوروں میں۔ بدقسمتی سے یہی وہ طبقہ ہے جو نہایت خود غرض ہے' اخلاق اور دانش کے اعتبار سے بد دیانت۔''

اسلام اور اس کے اعلیٰ اصولوں نے ہمیں جمہوریت کا درس دیا ہے۔ اس نے ہمیں بتایا ہے کہ سب انسان برابر ہیں' انصاف اور عادلانہ سلوک سب کا حق ہے۔ بہر طور پاکستان میں ایک مذہبی ریاست نہیں ہوگی کہ جہاں مذہبی رہنما کسی الوہی مشن کے تحت حکومت کریں۔ ہمارے درمیان بہت سے غیر مسلم ہیں' ہندو' عیسائی اور پارسی ہیں' لیکن وہ سب پاکستانی ہیں۔ ان کو وہی حقوق اور مراعات حاصل ہوں گی' جو دیگر شہریوں کو حاصل ہوں گی اور وہ پاکستان کے معاملات میں جائز طور پر اپنا کردار ادا کریں گے۔

یہ وہ عہد تھا جو تمام شہریوں کو دیا گیا' اب اس کی خلاف ورزی کی جا رہی ہے۔ سال کے تین عشروں کے اندر ہم نے چار ''اقلیتیں'' بنا لیں اور ہر اقلیت نام نہاد مسلم اکثریت کے مقابلے میں قدرے کم پاکستانی ہے۔ ابھی اس سال کے اندر صرف عیسائی شہریوں کو بیرون ملک پناہ لینی پڑی' کیونکہ عدالت نے اگرچہ انہیں توہین رسالت کے الزامات سے بری کر دیا تھا لیکن ان کی سلامتی کی ضمانت نہیں رہ گئی تھی۔ ایک احمدی کو سرکاری عمارت کے اندر مار مار کر ہلاک کر دیا گیا اور بیسیوں ہیں' جو کسی مقدمے کی کارروائی کے بغیر جیلوں میں سسک رہے ہیں۔ اگر وہ کبھی میرے خواب میں آیا تو اس بے شرمی کی مثال کو میں اس نحیف و زار مرد ضعیف کے آگے کس طرح بیان کروں گا' جس کی زندگی کو اور کارناموں کو ہم سال کے سال اس قدر دھوم دھام سے اور جوش و خروش سے دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں یا پھر یہ سنیے کہ عورتوں کے سوال پر وہ کیا کہتے ہیں: ''انسانیت کے خلاف یہ ایک جرم ہے کہ ہماری عورتوں کو ان کے گھروں کی چاردیواری میں قیدیوں کی طرح بند کر دیا گیا ہے۔ عورتیں ہماری ساتھی ہیں' آپ انہیں گھر سے باہر لائیے تاکہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں آپ کے شانہ بشانہ مل کر کام کریں۔''

میں نے ان سے پوچھا تو نہیں' لیکن پروفیسر زیدی اس روز 1944ء میں موجود رہے ہوں گے جب قائداعظم نے علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ سے اس طرح خطاب کیا تھا۔ اس کے چالیس سال بعد ایک آمر نے اس ملک میں زنا اور حدود آرڈیننس نافذ کر دیا۔ قومی ترقی میں اس آرڈیننس کا ایک عطیہ یہ ہے کہ ایک قانون حقیقی زانیوں کو ہر طرح کی آزادی فراہم کرتا ہے اور دوسرا قانون عورت کی گواہی کو مرد کی گواہی کے بقدر نصف قرار دیتا ہے۔ اب تک تین منتخب حکومتیں آ چکی ہیں' لیکن ہمارے معاشرے سے اور ریاست سے اس داغ کو دھونے میں ناکام ہو چکی ہیں۔

ہماری سماجی اور سیاسی زندگی میں فرقہ واریت اور علیحدگی پسندی کا جو رجحان مسلسل چلا آ رہا ہے' قائداعظم کو شروع سے ہی ان کے بارے میں تشویش تھی۔ انہوں نے بار بار اپنی تقریروں میں معاشرے کو

اس خطرے سے خبردار کیا تھا۔ خدا کے لئے یہ صوبائیت ترک کیجئے۔ صوبہ پرستی ہمارے یہاں ایک بڑی لعنت رہی ہے' اسی طرح فرقہ پرستی بھی۔ شیعہ' سنی وغیرہ۔ اس میں ہماری یقینی ناکامی پوشیدہ ہے۔ اس میں ہماری ذہانت کی نہیں' ضمیر کی ناکامی ہے۔ فہم کی نہیں' ارادے کی ناکامی ہے۔ تخیل کی نہیں' ہمت کی ناکامی ہے۔ بنگال کی دیواروں پر جو کچھ طویل عرصے سے لکھا ہوا تھا' وہ ہم پڑھ سکتے تھے' لیکن ہم نے خودغرضانہ خاموشی سے کام لیا' بے پروا اور اپنے آپ میں مگن رہے۔ پاکستانی انتظامیہ ہمارے سیاسی وجود پر چرکے پر چرکے لگاتی رہی' لیکن ہم چپ چاپ سب کچھ گوارا کرتے رہے' شہری حقوق کو ہم نے مذاق بنالیا۔ قتل و غارت گری کو ایک مشن میں بدل دیا اور بالآخر ایک فاتح دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ معمولی بصیرت بھی ہمارے لئے اجنبی ہے۔ ہم نے یہ نہ سمجھا کہ طاقت مل جائے تو اس سے زیادتی' کرپشن اور غلط اندیشی کا امکان ہوسکتا ہے۔ اس میں اعتدال اس طرح پیدا ہوسکتا ہے کہ معاشرے میں اختلاف اور یقین کی طاقت بروئے کار آئے اور ایک ناقدانہ عوامی طاقت پیدا ہو۔ ذہن اور جسم کی سستی سے کبھی تجربہ نہیں آتا۔ نتیجہ یہ کہ اس سے یکے بعد دیگرے ہولناک حالات پیدا ہوتے ہیں' چنانچہ ہم ہر روز کراچی میں مقتل سجے ہوئے دیکھتے ہیں' جس طرح ڈھاکہ اور نواکھلی میں دیکھے تھے۔ یہ سلسلہ ختم ہونا چاہیے۔ لیکن یہ اس وقت تک ختم نہیں ہوگا جب تک جرم کی معاونت ختم نہیں کریں گے' جب تک اپنی خاموشی نہیں توڑیں گے۔

پس نوشت: عالموں نے یہ دلیل دی ہے کہ پاکستان میں نظریاتی بحران کے ساتھ جو فکری انتشار پایا جاتا ہے' اس کے اسباب ہمارے اولین دور کے تجربے میں پوشیدہ ہیں' چنانچہ ڈاکٹر اکبر نقوی نے میرے آخری مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے (ڈان' 15 جون 1995ء' ایڈیٹر کے نام خطوط میں) یہ دلیل دی کہ یہ بات درست نہیں کہ مسلمان عوام نے ملائیت کے خلاف جمہوریت اور ترقی کا انتخاب جبلی طور پر کیا تھا' کیونکہ 1946ء کے انتخابات جو پاکستان کے لئے ریفرنڈم تھے ''اسلام خطرے میں ہے'' کے نعرے کی بنیاد پر جیتے گئے تھے۔ اس بارے میں وہ مزید لکھتے ہیں: ''دو متضاد صورتیں مسٹر جناح کی دین تھیں۔'' ایک کی نمائندگی آزاد عناصر کر رہے تھے اور دوسرے کی علماء۔ پاکستان کے مقصد کو مقبول عام بنانے کے لئے انہیں اس کی ضرورت تھی۔ یہ متضاد صورتیں ان کے لئے کارآمد تھیں۔ 1946ء کے انتخابات کے سلسلے میں اس دلیل کو بیشتر مورخ نہایت اختلافی پائیں گے۔ بہرطور ان انتخابات نے لیگ کے لئے ایک وسیع البنیاد مسلم حمایت پیدا نہیں کی' بلکہ اس کی موجودگی کی تصدیق کردی۔ مزید یہ کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے قائداعظم نے بجائے خود کبھی ''اسلام خطرے میں ہے'' کا نعرہ نہیں لگایا۔ بہرحال ڈاکٹر نقوی کے زیادہ تجزیاتی دلائل جو ''مسٹر جناح کی دین'' کے حوالے سے ہیں' ایسے ہیں کہ ان پر غور کیا جائے اور اس پر بحث بھی ہو' جس میں دوسرے لوگ بھی حصہ لیں۔

(''ڈان'' 18 جون' 1995ء)

MashalBooks.org

برصغیر کیسے تقسیم ہوا؟

سرد جنگ نے جو بیج بوئے تھے اس کی فصل لہلہا کر تیار ہو گئی ہے لہٰذا اس موضوع میں نئے سرے سے دلچسپی ہو گئی۔ بین الاقوامی امور کے چند ماہروں نے پھر یہ دلیل دینی شروع کر دی ہے کہ ایسے تنازعوں کا بہترین حل علاقائی تقسیم ہے۔ اٹلی کی ایک حالیہ کانفرنس میں دنیا بھر سے کوئی ایک درجن "ماہرین" اکٹھے ہوئے تاکہ اس مسئلہ پر بحث و مباحثہ کریں' انہوں نے خاصی معلومات بہم پہنچائیں' کچھ فکری نتائج دریافت کئے اور چند سوالوں کے جواب دیئے۔

کانفرنس میں پانچ ممالک پر غور و خوض کیا گیا۔ ہندوستان' فلسطین' قبرص' آئرلینڈ اور بوسنیا۔ جنوبی ایشیا کے بارے میں سب سے پہلے گفتگو ہوئی کیونکہ دوسری عالمی جنگ کے بعد پہلی تقسیم یہیں ہوئی۔ کانفرنس کے بعض شرکاء نے تقسیم کو اس لحاظ سے ایک کامیاب مثال قرار دیا کہ شرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے کے باوجود ہندوستان کی تقسیم بڑی حد تک برقرار رہی اور جنوبی ایشیا کی ریاستوں کے درمیان معمول کے تعلقات برقرار رکھنا قرین قیاس ہے۔

ستم یہ کہ جنوبی ایشیا کے اپنے مندوبین نے بڑی فیاضی سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا۔ بیشتر کی رائے میں کشمیر کی متنازعہ حیثیت ہندوستان اور پاکستان کے درمیان معمول کے تعلقات میں رکاوٹ ہے۔ حالات معمول پر آ جائیں تو بین الاقوامی تعلقات پر اور سیاسی معیشت پر اس کے نمایاں اثرات مرتب ہونے کا امکان ہے۔ ہندوستان کی تقسیم سے جو پچاس سال پہلے ہوئی تھی' اب نتائج اخذ کرنا واقعی دلچسپ تھا۔ برصغیر کی تقسیم سے اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ نسلی اور مذہبی تنازعات جنگل کی آگ کی طرح کیسے تیزی سے پھیلتے ہیں۔ 1930ء کی دہائی کے تقریباً آخری دور تک مسلمان مسلم لیگ کی بجائے' انڈین نیشنل کانگریس یا صوبائی جماعتوں کی حمایت پر مائل تھے۔ پاکستان کے بانی محمد علی جناح ایک زمانے میں خود ایک سرکردہ کانگریسی لیڈر رہے تھے اور "ہندو مسلم اتحاد کے سفیر" کے طور پر دور دور تک مشہور تھے۔ 1937ء میں ہندوستان کے پہلے انتخابات میں مسلم لیگ کو زبردست شکست ہوئی۔ اس کے بعد اس نے پاکستان کا مطالبہ کر دیا اور 1947ء میں پاکستان بن بھی گیا۔ ناکامی کے بعد ایسی ڈرامائی کامیابی کیسے ہوئی؟ اس پر بحث سے یہ معلوم ہوا کہ قائدین کی اکثریت اقلیتی باشندوں کی تشویش اور ان کے اندر عدم تحفظ کے احساس کو سمجھنے میں ناکام ہو گئی اور یہ کہ اس ناکامی کا نتیجہ کتنی تیزی کے ساتھ اقلیتی برادری کی اکثریتی پارٹی سے مایوسی اور علیحدگی کی صورت میں نکلتا ہے۔ قوموں کی تحریک کے اس دور میں اور عوامی سیاست کی موجودگی میں اسی طرح کی

MashalBooks.org

علیحدگی کا نتیجہ "حق خود اختیاری" اور علیحدہ ریاست کے مطالبہ کی صورت میں نکل سکتا ہے۔ ایسی صورت حال میں نہ صرف خیر سگالی کا طریقہ بلکہ تدبر کا رویہ نہایت پسندیدہ ہوتا ہے۔

ہندوستان کی تقسیم محض پرانی عداوتوں کا نتیجہ نہیں تھی۔ بلکہ اس میں جدید طاقتیں بھی کارفرما تھیں۔ ان میں نوآبادیاتی حکمرانی' قوم پرستی' جدید ریاستی ڈھانچے کی تشکیل اور جمہوریت سے وابستہ امیدیں' ان سب کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ ہندو قوم پرست دانشور اکثر اوقات مسلمانوں کو حملہ آور فاتح قرار دیتے آئے ہیں' جو بنیادی طور پر ہندوستان کے لئے اجنبی ہیں۔ خود مسلمان قوم پرست بھی اپنی الگ شناخت تاریخ کی گہرائی میں جا کر تلاش کرتے ہیں۔ ان دعووں کے باوجود ہندو مسلم تعلقات کی تاریخ میں جو سینکڑوں برس پر پھیلی ہوئی ہے' علیحدہ ریاست کی تشکیل اور اس کے مطالبے کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ برصغیر کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت مقامی' مقامی لوگوں پر مشتمل تھی' جو اپنے ہندو یا سکھ ہمسایوں کے ساتھ مشترک زبانوں' تہذیبوں اور تاریخی تجربوں کے رشتے میں منسلک تھے۔ وہ بزور شمشیر مسلمان نہیں بنائے گئے تھے بلکہ ان کے قبول اسلام کا سبب سماجی طاقتیں تھیں اور وہ صوفیا تھے' جنہیں پورے ملک میں دونوں قومیتوں کے درمیان احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

کشیدگی اور تنازعے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پیدا ہوتے رہے' جیسا کہ ہر قومیت کے اندر بھی پیدا ہوئے۔ اسی طرح فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوتے رہے' خاص طور پر رسوم کی ادائیگی والی جگہوں پر اور ان کے آس پاس۔ اس کے باوجود بیسویں صدی کے آغاز سے پہلے باقاعدہ فرقہ وارانہ تشدد کے واقعات بمشکل کبھی سنے گئے' اس کے بعد ہی شہری آبادیوں میں فسادات شروع ہوئے۔ ہندوستان میں ہندو مسلم تعلقات کی نوعیت کم و بیش ویسی ہی تھی' جیسے مختلف ہندو ذاتوں کے باہمی تعلق یہ تفرقے اور تعاون سے جڑا ہوا ایک روادار ماحول تھا۔ چنانچہ برطانوی راج کے خلاف انتہائی شدید اور دور تک پھیلی ہوئی آخری مزاحمت یعنی 1857ء کی بغاوت میں مسلمان اور ہندو عوام اگر دلی کے نحیف و زار تخت شاہی کے گرد اکٹھا ہو گئے تھے تو یہ بات سمجھ میں آتی تھی۔ 1947ء کی تقسیم کے اسباب عصری حقائق میں پوشیدہ ہیں۔ برطانیہ عظمٰی نے جو ایک نوآبادیاتی طاقت تھی "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کیا اور اس وقت تک اس حکمت عملی پر ڈٹے رہے' جب تک ان کے اندر حکمرانی کی خواہش ختم نہیں ہو گئی۔ اس کے بعد انہوں نے "تقسیم کرو اور چلتے بنو۔" کا عاجلانہ فیصلہ کیا' جو غیر ذمہ دارانہ تھا۔ چنانچہ قتل اور غارت گری کے نتیجے میں قیمتی انسانی جانیں ضائع ہوئیں اور املاک کا نقصان ہوا۔ لیکن (تقسیم کرو اور حکومت کرو۔) کی حکمت عملی سے ہی تفرقے پیدا نہیں ہوئے۔ اس میں نوآبادیاتی حکمرانی سے وابستہ کچھ دوسرے اسباب بھی تھے۔ نوآبادیاتی حکومت کی جانب ہندوؤں اور مسلمانوں کے ردعمل کا اختلاف بھی ایک سبب تھا۔

مسلمانوں نے ابتدا میں غیر ملکی حکومت کے خلاف شدید ردعمل ظاہر کیا جو ہندو اشرافیہ اور سرکردہ طبقے

MashalBooks.org

کے لوگوں کے ردعمل سے کہیں زیادہ شدید تھا۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے کوئی ایک سو سال تک مغربی تہذیب اور تعلیم سے اجتناب کیا اور انیسویں صدی کے نصف آخر تک جدید علوم حاصل کرنے کی طرف آمادہ نہیں ہوئے تھے۔ اس طرح راجہ رام موہن رائے کی قیادت میں ہندوؤں کے اندر اصلاح کی تحریک یعنی براہمو سماج تحریک مسلمانوں میں سرسید احمد خاں کی اصلاحی تحریک سے کوئی ایک سو سال پہلے شروع ہو گئی تھی۔ مغرب کی جانب ہندوؤں اور مسلمانوں کے ردعمل کا یہ اختلاف دوررس نتائج کا حامل تھا۔ مثال کے طور پر حکومت کی انتظامیہ میں مسلمان دیر سے پہنچے اور ان کی نمائندگی بھی تناسب سے کم تھی۔ اس کے بعد جدید سیاسی پارٹیوں کی تشکیل میں اور ان کے اندر شامل ہونے میں بھی وہ پیچھے رہ گئے اور قومی تقاضوں کو مرتب کرنے میں بھی انہیں تاخیر ہو گئی۔ مسلمانوں کے بالائی اور متوسط طبقوں میں' یہ 1920ء اور 1930ء کے عشروں کا زمانہ تھا' گہری تشویش پائی جاتی تھی کہ وہ پسماندہ رہ گئے۔ پھر آزادی اور جمہوری حکمرانی کے امکانات جیسے جیسے قریب نظر آنے لگے' ان کی تشویش بڑھتی گئی۔ پہلی بات انہیں یہ سوجھی کہ حکومت اور سیاست میں اقلیت کی نمائندگی کے لئے تحفظات طلب کریں۔ جب انڈین نیشنل کانگریس یعنی بالادست پارٹی نے ان کی خواہش حسب منشا پوری نہیں کی تو کچھ مسلمانوں نے متبادل راستے تلاش کئے۔

یہ حقیقت قابل غور ہے کہ 1937ء کے انتخابات کے بعد تک مسلمان بڑی حد تک انڈین نیشنل کانگریس سے وابستہ رہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد دو بار کانگریس کے صدر بنے۔ وہ مسلمانوں کے انتہائی مقبول لیڈر تھے۔ یہاں تک کہ مسٹر جناح نے وہ مقبولیت ان سے چھین لی۔ مولانا نے بعد میں اس زبردست تبدیلی کا سبب یہ بتایا کہ 1937ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی شکست کے بعد کانگریس نے اس کے ساتھ فراخدلی نہیں برتی اور کانگریس کی سربراہی میں مختلف صوبوں کے اندر جو حکومتیں قائم ہوئیں' ان میں لیگی ارکان کو شرکت کی دعوت نہیں دی۔ کانگریس کی ناکامی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس نے پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کے جاگیرداروں کی طبقاتی طاقت کو نہیں سمجھا' اس نے بنگال میں اے کے فضل الحق کی عوام پسند دیہی مقبولیت کی طاقت کا بھی اندازہ نہیں لگایا جناح کے زیر قیادت لیگ کو نہیں دیکھا کہ مسلم لیگ سیاسی اتحاد بنانے اور اپنی طاقت اور اثر و رسوخ میں اضافہ کرنے کی کتنی صلاحیت رکھتی ہے؟ 1857ء کی بغاوت کے خاتمے کے بعد ہندوستان رسمی طور پر برطانوی تاجدار کی ایک کالونی بن گیا۔ اس کے نتیجے میں دوسری تبدیلیوں کے بعد یہ ہوا کہ جدید ریاست کے طور پر یہاں تنظیم و توسیع کا کام شروع ہوا اور بتدریج ریاستی امور کی انجام دہی کے لئے مقامی ملازمت پیشہ عملہ تیار ہوا۔ اس ریاست سے جہاں ترقی پذیر سرمایہ دارانہ معیشت نہیں تھی' ہندوستان کا درمیانہ طبقہ پیدا ہوا' جو ریاست کی ضرورتیں پوری کرتا رہا۔ متوسط طبقے کے کلچر' اس کے انداز فکر اور امنگوں' رقابتوں اور مقابلے کے جذبوں کی تشکیل ریاست کی ضرورتوں اور مطالبوں سے ہوئی تھی۔ مسلمانوں نے اس سے پہلے جدید تعلیم کو مغربی اور غلامانہ قرار دیتے ہوئے اس سے اجتناب کیا تھا

MashalBooks.org

اوراب وہ اس کی بے تابانہ خواہش کرتے تھے۔انیسویں صدی کے نصف آخر میں سرسید احمد خاں کی تحریک کے بعد یہ صورت حال پیدا ہوئی۔

دو عالمی جنگوں کے درمیانہ عرصے میں ریاست کی توسیع ہوئی۔اس سے ہندوستانیوں کے لئے اعلیٰ انتظامی اور فوجی ملازمتوں میں داخلے کے دروازے کھل گئے۔اب ملازمتوں کے لئے مقابلہ سخت' زیادہ سیاسی اور اس کا دائرہ وسیع ہوگیا۔ مذہب اور ذات پات کی بنیاد پر برطانوی حکومت نے ملازمتوں کے کوٹے مقرر کئے تھے'اس سے سرکاری انتظامیہ میں ملازمتوں کی اہمیت واضح ہوتی تھی اور یوں ریاست کے وسائل پر فرقہ وارانہ توقعات اور دعوے کی حیثیت برحق تسلیم کی جانے لگی۔حکومت خود اختیاری کے امکانات جیسے جیسے بڑھتے گئے' ریاست میں نمائندگی اور اس کے وسائل پر تصرف کے لئے مقابلہ بڑھتا گیا۔ ہندوستان میں 1909ء میں مورلے منٹو ریفارم ایکٹ کے آغاز سے ہی حکومت نے خود اختیاری کی جانب بتدریج قدم بڑھانا شروع کیا۔ 1935ء کے آنے تک صاف ظاہر ہوگیا تھا کہ سال کی ایک یا دو دہائیوں کے اندر ہندوستان اگر بالکل آزاد ریاست نہ بن سکا تو برطانوی عمل داری کے تحت ایک خود اختیاری حکومت کا مالک ضرور ہو جائے گا۔مسلمان اقلیت نے حکومت خود اختیاری اور جمہوریت کے امکان کو امید اور تشویش کے ملے جلے جذبے کے ساتھ قبول کیا۔ 1937ء کے انتخابات میں مسلمانوں نے وسیع بنیادوں پر کانگریس کو ووٹ دیا تھا۔ یہ ان کی امید کا اظہار تھا۔ 40۔1939ء میں ان کا پلٹا کھا کر مسلم لیگ کے ساتھ شامل ہو جانا ان کی تشویش ظاہر کرتا تھا۔امید اور اندیشے کے درمیان جو فاصلہ تھا'وہ مخالف فریق کی قوم پرستی سے اور زیادہ بڑھ گیا۔اس کے عناصر مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کے اندر پیوست تھے'اگرچہ کانگریس اصولی طور پر ایک غیر فرقہ وارانہ تنظیم تھی۔

ہندوستانی قوم پرستی میں شروع سے ہی تین رجحانات مختلف سمت میں کام کر رہے تھے'خود آگاہ ہوتے ہوئے سیکولر' ہندو اور مسلمان۔ بندھوگوش اور ان کے بعد بال گنگا دھر تلک نے جو شروع دور کے قوم پرست تھے' نہ صرف یہ کہ ہندوؤں کی مذہبی علامتوں کو استعمال کیا بلکہ انگریزوں کے ساتھ مسلمانوں کو بھی غیر قرار دیا۔ان کا دعویٰ تھا کہ دھرتی ماتا کے ساتھ دونوں نے ظلم کئے ہیں۔دوسری طرف مسلمان قوم پرستوں نے عالمگیر اسلامی علامات اور خطابت کے اسلوب کا سہارا لیا جو انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اولین دور میں پورے مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں رائج تھے۔سیکولر اور فرقہ وارانہ قوم پرستی اکثر ایک ہی شخص میں بیک وقت پائی جاتی تھی۔تلک کانگریس کے لیڈر بھی تھے اور ہندو قوم پرست بھی' اردو اور فارسی کے عظیم شاعر محمد اقبال نے قوم پرستی کی نظمیں لکھیں اور عالمگیر اسلامیت پر بھی نظمیں لکھیں۔پاکستان میں ان کو بانی پاکستان قرار دیا جاتا ہے اور ہندوستان میں اس کے یوم جمہوریہ کے جشن میں فوجی دستے اقبال کے نغمے کی دھن پر مارچ کرتے ہیں۔قوم پرستی کے فرقہ وارانہ رجحانات کانگریس کے اندر کچھ عرصے تک برقرار

MashalBooks.org

رہے پھر ہندوستان کی سیکولر قوم پرستی میں مدغم ہو گئے۔ اس ادغام کی ایک نہایت منفرد مثال مہاتما گاندھی تھے جب انہوں نے مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ مل کر خلافت تحریک کی قیادت کی۔ انہوں نے برطانیہ کے خلاف احتجاجی مہم میں خلافت عثمانیہ کا ساتھ دیا' جس کے حامی اور پشت پناہ ترکی میں بھی شاید ہی کوئی ہوں۔ یہ سیاسی عمل گاندھی کے طریق کار کے عین مطابق تھا' جو نو آبادیاتی تسلط کے خلاف جدوجہد میں عوام کو سرگرم کرنے کے لئے تہذیبی اور مذہبی علامات کو استعمال کرتے آئے تھے۔

ستم ظریفی یہ کہ اس وقت کانگریس کے لیڈر جناح تھے' جنہوں نے ہندوستانی سیاست کو روحانیت سے ہمکنار کرنے کے خلاف انتباہ کیا۔ انہوں نے درست کہا۔ کیونکہ مذہبی اور سیکولر علامات اور تصورات کو آپس میں ملانے سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں یکساں طور پر فرقہ وارانہ انداز فکر کو تقویت ملتی ہے۔ جب ہندوستان آزادی کی منزل کے قریب پہنچا تو سردار ولبھ بھائی پٹیل اور راجندر پرشاد جیسے فرقہ وارانہ انداز فکر اور جذبات کے حامل لیڈر کانگریس میں فیصلہ کن منصب پر پہنچ گئے تھے۔ محمد علی جناح تو پہلے ہی مسلم لیگ کی قیادت کر رہے تھے' جس نے 1940ء میں مسلمانوں کی جداگانہ ریاست کا مطالبہ پیش کیا تھا۔

کیا ہندوستان کی تقسیم ناگزیر تھی؟ اس کا قطعی جواب دینا قبل از وقت ہو گا۔ تاہم میرا خیال ہے کہ ہندوستان متحد رہ سکتا تھا لیکن اس کی قیمت مرکزیت پر مبنی ایک نو آبادیاتی ریاست کی صورت میں ادا کرنی پڑتی۔ مسٹر جناح پہلی عالمی جنگ کے بعد سے یہ تجویز پیش کرتے آئے تھے کہ اقلیتوں کے اندیشے دور کرنے اور ایک آزاد ہندوستان میں بہتر حکمرانی کے لئے اقتدار کی مرکزیت ختم کی جائے۔ انیسویں اور بیسویں صدیوں کے دوران میں قوم پرست ہر جگہ یہی کرتے آئے ہیں۔ ہندوستان کے لیڈروں نے بھی قومی اتحاد اور اچھی حکومت کو اقتدار کی مرکزیت کے برابر قرار دیا۔

ہندوستان کے اتحاد کو بچانے کی آخری کوشش 1946ء میں کیبنٹ مشن پلان کی صورت میں سامنے آئی' جس میں ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق اور نسبتاً کمزور مرکزی حکومت کی سفارش کی گئی تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے وہ پلان منظور کر لیا۔ پھر کانگریس نے اس پر دوبارہ غور کیا' اس کا اظہار جواہر لال نہرو نے کیا۔ جناح نے جو اس وقت تک قائداعظم کے طور پر جانے جاتے تھے' پلان کے مسترد کئے جانے پر (ڈائریکٹ ایکشن ڈے) منانے اور احتجاج کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ دن ہندوستان میں باقی تو ہر جگہ خیریت کے ساتھ گزر گیا' لیکن کلکتہ میں بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔ اس کے بعد ضلع نواکھلی میں' جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی بڑے پیمانے پر تشدد کے واقعات رونما ہونے لگے' پھر فرقہ وارانہ خون ریزی بہار میں شروع ہو گئی' جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ یہ کل تین مثالیں موجود تھیں۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں نے تشدد کے واقعات ختم کرانے کے لئے آپس میں تعاون کیا۔ مہاتما گاندھی نے نواکھلی اور بہار میں فرقہ وارانہ امن کی بحالی کے لئے طویل عرصے تک مہم چلائی' لیکن فسادات کی آگ حیران کن تیز

رفتاری کے ساتھ پھیلتی گئی اور اس نے بالآخر مہاتما کو ہی نگل لیا' وسیع خطوط پر پھیلے ہوئے تشدد نے ہندوستان کی تقسیم کو یقینی بنا دیا۔

پھر بمشکل چھ مہینے بعد 3 جون 1947ء کو تقسیم کے منصوبے کا اعلان کر دیا گیا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں نے کلکتہ' نواکھلی اور بہار کے واقعات کو جو سنگین انتباہ کی حیثیت رکھتے تھے' نظر انداز کر دیا۔ لارڈ لوئی ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا آخری وائسرائے بننے کی جلدی تھی۔ ان لیڈروں نے ماؤنٹ بیٹن کی اس سفاکانہ اور احمقانہ عجلت کے آگے چپ چاپ سر جھکا لیا۔

(''ڈان'' 24 اگست' 1997)

MashalBooks.org

پاکستانی سفارت کار کے نام ایک خط

نیویارک ٹائمز (10 اپریل 1971ء) میں ایک مراسلہ جس پر میرے اور مغربی پاکستان کے تین دیگر دانشوروں کے دستخط تھے شائع ہوا۔ اس سے پہلے میرے بیانات آ چکے تھے جن میں مشرقی بنگال کے اندر پاکستان کی فوجی حکومت کی مداخلت کی مخالفت کی گئی تھی۔ ان بیانات اور مراسلے کی اشاعت پر پاکستان کے کئی عہدیداروں نے احتجاج کیا۔ ان سب نے یہ کہا کہ :

1۔ فوج جنرل یحییٰ کی سربراہی میں ایک علیحدگی پسند تحریک کے خلاف صرف قومی سلامتی کا دفاع کر رہی ہے۔ یہ تحریک مغربی پاکستان کے 5 کروڑ 60 لاکھ باشندوں سے مشرقی پاکستان کے 7 کروڑ شہریوں کو کاٹ کر الگ کر دے گی۔

2۔ فوج نے مداخلت صرف اس وقت کی جب بنگالی قوم پرستوں نے مشرقی پاکستان میں مقیم مغربی پاکستان کے شہریوں کو اور ہندوستان سے آنے والے مہاجر بہاریوں کی اقلیت کو قتل کرنا شروع کیا۔

3۔ چونکہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے لیڈروں کا ہمدردانہ تعلق اور رابطے مغرب کے ساتھ ہیں اور چینی وفاقی حکومت کی ''حمایت'' کر رہے ہیں۔ اس لئے سامراج کے مخالف اور روشن خیال عناصر کو فوجی کارروائی کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے۔ ذیل میں ایسے ہی ایک ''دوست'' کے لئے جواب حاضر ہے۔

پیارے ...!

میرا خیال ہے تم یہ جانتے ہو گے کہ میرے اور برادرم صغیر احمد کے لئے اس بیان کی اشاعت کوئی آسان بات نہ تھی، جو تم نے نیویارک ٹائمز (مطبوعہ 10 اپریل 1971ء) میں دیکھا۔ اول تو مجھے بنگلہ دیش تحریک سے کوئی فطری ہمدردی نہیں تھی، بلکہ دراصل میرے اندر یقینی طور پر مشرقی پاکستان کے لیڈر شیخ مجیب کے لئے غیر ہمدردانہ احساس تھا، (جن کی پارٹی عوامی لیگ نے قومی اسمبلی میں موثر اکثریت حاصل کر لی اور جنہیں بنگالیوں کے 98 فیصد ووٹ ملے) مجھ پر اس کا تاثر یہ ہے کہ وہ ایک محدود نوعیت کا شخص ہے، دور اندیشی سے عاری اور فوراً بھڑک اٹھنے والا۔ مغربی پاکستان میں اس کے جو متبادل ہیں میرے دل میں ان کے لئے بھی کم احترام ہے۔ بیچارے بھٹو ہیں جو سیاست میں گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے رہتے ہیں اور فوجی جنرل ہیں، جن کی تربیت برطانوی نوآبادکاروں نے کی اور امریکہ نے انہیں مسلح کیا اور جو بظاہر ملک کو یونان اور اسپین کا اسلامی متبادل بنانے کے درپے ہیں۔

دوئم جیسا کہ آپ جانتے ہیں میں اصلاً بہار سے ہوں۔ میرے بہت سے لوگ ترک وطن کر کے

مشرقی پاکستان چلے گئے۔فوجی مداخلت سے ذرا ہی پہلے ان میں سے بہتوں کو انتہا پسند بنگالیوں نے قتل کر دیا۔مزید یہ کہ تحریک پاکستان کے زمانے میں پل کر بڑا ہوا' چنانچہ قومی اتحاد کے تصور سے قلبی وابستگی نہ رکھنا نہایت مشکل ہے۔آخری بات یہ کہ ایک آزاد خیال فرد اور بین الاقوامیت پر یقین رکھنے والے شخص کی حیثیت سے میں یہ نہیں مانتا کہ علیحدگی کی تحریکیں صحیح سمت میں آگے لے کر چلتی ہیں۔انہی اسباب کی بنا پر میرا جھکاؤ پاکستان کی سالمیت کو قائم رکھنے کی جانب ہونا چاہئے۔

تاہم میری نگاہ ان حقائق پر ہے جو ادھر رونما ہوئے ہیں۔فوجی مداخلت کی موجودہ پالیسی کا میرے نزدیک سیاسی' اقتصادی یا اخلاقی' کوئی بھی جواز نہیں ہے۔میں حقائق کا ممکن حد تک بہت قریب سے مشاہدہ کرتا رہا ہوں۔اس کے باوجود کہ فوجی حکومت نے خبروں پر سنسر شپ عائد کر رکھی ہے' جس کی بنا پر خبروں کی ترسیل میں عدم توازن پیدا ہوا ہے' ان میں سے کچھ خبریں لازمی طور پر ہندوستان سے آتی ہیں۔میری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ:

1۔ وفاقی حکومت کے خلاف جس پر 1957ء سے فوج کی بالادستی قائم ہے' مشرقی پاکستان کے لوگوں کی شکایات جائز و برحق ہیں۔انہوں نے کھلی کھلی اقتصادی تفریق اور استحصال کو جس طرح جھیلا ہے' مغربی پاکستان کا کوئی بڑے سے بڑا جیالا بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔بارہ سال میں براہ راست فوجی حکمرانی نے سیاسی طور پر انہیں اختیارات کے استعمال میں شمہ برابر بھی حصہ دار نہیں بنایا۔

2۔ مشرقی پاکستان کو نظر انداز کرنے کے نتیجے میں' عوامی لیگ کے صوبائی خودمختاری کے مطالبے کو تقریباً متفقہ انتخابی حمایت حاصل ہوگئی اور یہ حمایت اس وقت انتہا پر پہنچ گئی جب گزشتہ نومبر میں سمندری طوفان آیا' جس کے متاثرین کی بحالی سے ناقابل یقین بے توجہی برتی گئی۔میں یہ مانتا ہوں کہ مغربی پاکستان میں بھی غریبوں نے مصائب جھیلے ہیں' ہمارے حکمران سفاکانہ بے توجہی میں کوئی تفریق روا نہیں رکھتے' لیکن علاقائیت پر جس تفریق سے مشرقی پاکستان کے غیر مراعات یافتہ لوگ جس حال میں جی رہے ہیں' اسے کچھ وہی سمجھ سکتے ہیں۔

3۔ پارلیمنٹ سے باہر جب کوئی تصفیہ نہ ہو سکا' تو فوج نے جسے مغربی پاکستان کے لیڈروں کی تائید حاصل تھی' ملک کے پہلے آزادانہ انتخاب کے نتائج کو تہ وبالا کرنے کے لئے 25 مارچ 1971ء کو مداخلت کی۔ غالباً فوج کو ہرگز یہ امید نہیں تھی کہ پاکستان کے منتخب نمائندے کوئی متفقہ فیصلہ کر سکیں گے۔اب یہ بات صاف ہوگئی ہے کہ جنرل یحییٰ اور شیخ مجیب میں جو بات چیت ہو رہی تھی' فوج نے مداخلت کی تیاری کے لئے اس کی آڑ لی۔

4۔ وفاقی حکومت کے لئے عوامی تعاون کی ہرگز کوئی بنیاد موجود نہیں۔چار ماہ کی دہشت ناکی کے باوجود وہ سیاسی کٹھ پتلیوں کا ایک چھوٹا سا گروہ بھی تیار نہیں کر سکی' جو فوجی تسلط کو جواز فراہم کر سکتا ہو۔

5۔ فوج کے پاس اتنی طاقت تو ہے کہ وہ مشرقی پاکستان پر سوار ہو کر حکومت کرے' لیکن مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں کے عوام کو اس نوآبادیاتی تسلط کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنی ہوگی۔ مغربی پاکستان کے حصے میں بڑھتی ہوئی اقتصادی مشکلات آئیں گی' ہماری سیاست اور معاشرے پر فوج کا عمل دخل بڑھ جائے گا اور شہری آزادیاں سرے سے ختم ہو جائیں گی۔ "آزاد" اور "لیل ونہار" جیسے جرائد کی بندش' مغربی پاکستان میں آٹھ سو افراد کی گرفتاری جن میں افضل بنگش' مختار رانا اور جی ایم سید جیسے لیڈر اور شیخ ایاز اور عبداللہ ملک جیسے دانشور شامل ہیں' مقدمہ چلائے بغیر ان سب کی نظر بندی' لائل پور اور سیالکوٹ میں حکومت کے مخالفین کو کوڑوں کی سزائیں' یہ ساری باتیں اس یک طرفہ حکمرانی کی جانب تبدیلی کا اشارہ کر رہی ہیں۔ اسی طرح مجھے ان بیانات اور اداریوں سے تشویش ہوتی ہے۔ جن میں اس حالیہ تصادم کو یہودو ہنود اور امریکیوں کی سازش کہہ کر عام لوگوں کے اندر تعصب کی آگ کو بھڑکایا جا رہا ہے اور اس حقیقت کے باوجود کہ فوجی آمریت کے اس ہلاکت خیز بم کو امریکی حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔ ان سب کے سوا مجھے مذہبی بنیاد پرستوں کو فروغ پاتے دیکھ کر بہت رنج ہوتا ہے جو ہمارے ہندو شہریوں کو خوفزدہ کر رہے ہیں اور فوج باقاعدہ طور سے انہیں قتل کر رہی ہے۔ ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں پر اس کا جو ردعمل ہو سکتا ہے' میں تو اس کے بارے میں سوچ کر ہی کانپ اٹھتا ہوں۔

6۔ جب تک مشرقی پاکستان میں فوج کی عملداری کا فوری خاتمہ نہیں ہوتا' قحط اور اموات اور اس کے ساتھ ہی فوج کی طرف سے وقتاً فوقتاً ہونے والی خون ریزی کے نتیجے میں آئندہ دنوں تک لاکھوں جانیں ضائع ہو چکی ہوں گی۔ فوجی کارروائی کی وجہ سے پہلے ہی ساڑھے تین لاکھ غیر مسلح شہری ہلاک ہو چکے ہیں۔ ساٹھ لاکھ تارکین وطن ہندوستان پہنچ چکے ہیں۔ ساٹھ ہزار سے لے کر ایک لاکھ تک شہری ہر روز وہاں پہنچ رہے ہیں اور ہیضے میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ انہیں نادار ہندوستانیوں کے عناد کا بھی سامنا ہے۔ مشرقی پاکستان کے دیہی علاقوں میں لاکھوں شہری فاقے اور دہشت گردی کا شکار ہیں۔ مصدقہ اعداد سے پتہ چلتا ہے کہ یہ انسانی تاریخ کا سب سے زیادہ ہلاکت خیز سانحہ بننے والا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں' مشرقی پاکستان میں بقائے حیات کا توازن پہلے ہی بہت نازک ہے۔ کبھی کبھی کوئی چھوٹا سا واقعہ بڑے المیے کا باعث بن جاتا ہے۔ 1970ء اور 1971ء کے سال خاص طور پر بہت سخت ثابت ہوئے ہیں۔ گزشتہ اگست اور ستمبر کے سیلاب گزشتہ عشرے میں ہونے والے سیلابوں میں بدترین تھے' جن میں پانچ لاکھ ٹن چاول تباہ ہو گیا۔ گزشتہ نومبر کا سمندری طوفان اس صدی کا سب سے بھیانک طوفان تھا' جس میں چاول کی اس قدر مقدار ضائع ہو گئی اور ہزاروں ایکڑ اراضی کم از کم ایک سال کے لئے قابل کاشت نہیں رہی۔

اس کے بعد فوج نے اپنی اس کوشش میں کہ مخالف بنگالیوں کو رسد نہ پہنچنے پائے' اناج کے ذخائر کو ضبط

MashalBooks.org

کرنا اور جلانا شروع کر دیا۔ دیہات میں بہت سے بےگھر ہونے والے کسانوں نے یا ان سب نے اپنے خوف کی بنا پر سرما کی فصل کاشت نہیں کی۔ اس طرح مجموعی نقصان کوئی پچیس لاکھ ٹن کا ہے۔ اگر عام فاقہ زدگی کو روکنا مقصود ہو تو اس نقصان کی فوراً تلافی کرنی ہوگی۔ عالمی بینک کے حالیہ جائزے اور اس کے ساتھ ہی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے انکشافات کی رو سے جنہیں بہت دبایا گیا ہے' سینیٹر کینڈی کی زبانی اندازہ ہوا کہ مغربی ملکوں کے عہدیدار اور مشرقی پاکستان میں متعین خود امریکہ کے حکام واشنگٹن کو "قحط کی ہیبت ناکی" کے خطرات سے خبردار کرتے رہے ہیں۔

کچھ دوسرے لوگ اپنی پیش گوئی میں اور بھی واضح تھے۔ آکسفم (Oxfam) اور دوسری ایجنسیوں کے افسر رابطہ بحالیات آئن میکڈولڈ نے تین ماہ پہلے خبردار کر دیا تھا کہ آئندہ پندرہ لاکھ افراد کو فاقہ زدگی کا سامنا ہوگا۔ حال ہی میں فنانشل ٹائمز لندن نے یہ اندازہ لگایا کہ اگر بحالی کی تدبیر نہیں کی گئی اور تعمیر نو کا کام تیز رفتاری سے شروع نہیں کیا گیا تو ممکن ہے چالیس لاکھ افراد لقمہ اجل بن جائیں۔ بی بی سی کے ایک رپورٹر ایلین ہارٹ کا خیال ہے کہ "ستمبر یا اکتوبر تک غالباً دو کروڑ یا اس سے بھی زیادہ مشرقی پاکستانی فاقے سے مر چکے ہوں گے۔"

بحالی کے لئے رسد کی فراہمی سے بجائے خود اس بات کا زیادہ امکان نہیں کہ آنے والا المیہ ٹل جائے گا۔ سول حکومت کی فوری بحالی سے ہی یہ ممکن ہے کہ خوراک' اناج اور ادویہ کا استعمال فوجی اسلحہ کے طور پر نہ ہونے پائے اور ایک ایسی ہی حکومت کی بحالی سے یہ دونوں باتیں یقینی ہو سکتی ہیں۔ یعنی بحالی کے سامان کی تقسیم اور بین الاقوامی ایجنسیوں کی طرف سے اس تقسیم کا صحیح بندوبست۔

7۔ میں آخر میں یہ بات زور دے کر کہوں گا کہ جب تک مشرقی پاکستان کے لوگوں کو حق خود اختیاری نہیں دیا جاتا یا ان کی علیحدگی کا حق تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس وقت تک کسی شہری حکومت کی بحالی ممکن نہیں ہوگی۔

ان اسباب کی بنا پر میرا خیال ہے کہ مغربی پاکستانیوں کے لئے قابل عمل راستہ یہی ہے کہ مارشل لاء کے فوری اور غیر مشروط خاتمے پر زور دیں' منتخب قومی اسمبلی کا اجلاس بلایا جائے اور یہ عہد کیا جائے کہ اس اسمبلی کے اکثریتی فیصلے کے ہم سب پابند ہوں گے' خواہ وہ فیصلے مشرقی اور مغربی حصوں پر مبنی پاکستان کے خاتمے پر ہی منتج کیوں نہ ہوں۔ ہمیں فوج کے اس مہمل دعوے کو رد کر دینا چاہیئے کہ اس نے قوم کی "سالمیت" کو بچانے کے لئے مداخلت کی ہے۔ ایک ایسی پارٹی سے بچانے کے لئے جو پاکستان کے واحد آزادانہ انتخابات میں کامیاب ہوئی ہے اور قومی اسمبلی میں جس نے حکمران اکثریت کا درجہ حاصل کیا ہے۔

درحقیقت مشرقی پاکستان کے منتخب نمائندوں نے محض اس امر پر اصرار کیا تھا کہ صوبائی خودمختاری حاصل کرنے کی جو ہدایت انہیں ملی ہے' اسے پورا کرنے دیا جائے۔ مشرقی پاکستانیوں کی جانب سے بنگلہ دیش کی آزاد ریاست کے قیام کا اعلان اس وقت ہوا جب فوج نے قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے سے انکار کر

دیا اور اس کے بعد 25 مارچ 1971ء کو انہوں نے نہایت بے رحمی کے ساتھ مشرقی پاکستان میں فوجی مداخلت کی۔ جنرل یحییٰ خان نے 28 جون کی تقریر میں قومی قانون ساز اسمبلی کے اس حق کو ماننے سے انکار کر دیا کہ وہ ایک آئین بنائے اور عوامی لیگ کے لیڈروں پر زبردست حملے کئے۔ اس طرح انتخابی نتائج کی بنیاد پر تصفیے کی رہی سہی جو امید تھی' وہ بھی غارت ہوگئی۔

مجھے علم ہے کہ اس منوقف پر میری مذمت کی جائے گی۔ ایک ایسے شخص کے لئے جو امریکہ میں ایک سنگین نوعیت کے مقدمے سے دوچار ہے' خود اپنی حکومت کا سامنا کرنا آسان نہیں ہوگا۔ اس کے باوجود میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ جنوب مشرقی ایشیا میں امریکیوں کے جرائم کی مخالفت کروں یا کشمیر پر ہندوستان کے قبضے کے خلاف بات کروں اور اس کے ساتھ ہی مشرقی پاکستان کے عوام کے خلاف ہونے والے جرائم کو جو خود ہماری حکومت نے روا رکھے ہیں' قبول کروں۔ اگرچہ میں بنگالیوں کے جتھوں کے ہاتھوں بہاریوں کے قتل کا سوگ مناتا ہوں اور عوامی لیگ کی غیر ذمہ دارانہ کارروائیوں کی مذمت کرتا ہوں۔ تاہم میں ان کی حرکتوں کو اپنی حکومت اور ایک منظم پیشہ ور فوج کی مجرمانہ کارروائیوں کے برابر تسلیم نہیں کروں گا۔

مشیر اطلاعات کے مطابق' جن کی صداقت کو حکومت نے چیلنج نہیں کیا' بہاریوں کے خلاف قوم پرست بنگالیوں کے بلوے میں دس ہزار افراد ہلاک یا زخمی ہوئے۔ تاہم اگست کے اوائل میں مغربی پاکستان کے فوجی حکام نے ایک قرطاس ابیض شائع کیا' جس میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا بنگال کی مخالف پارٹیوں نے ایک لاکھ افراد کو قتل کیا۔ قرطاس ابیض میں یہ اور ایسے ہی دوسرے مبالغہ آمیز دعوؤں کا مقصد' جیسا کہ ظاہر ہے سیاسی مخالفین کو مقدمات میں ماخوذ کرنا اور ممکن ہے سزائے موت دینا ہو۔ اس وقت جب کہ میں یہ خط لکھ رہا ہوں' فوجی حکومت نے یہ اعلان کیا ہے کہ ایک خفیہ فوجی ٹربیونل 12 اگست کو شیخ مجیب پر "پاکستان کے خلاف جنگ" کرنے کے جرم میں مقدمہ چلائے گا۔ قرطاس ابیض میں چونکہ معطل قومی اسمبلی کے 79 ارکان کے نام بھی شامل ہیں اور ان پر جرائم کے وہی الزامات عائد کئے گئے ہیں تو ممکن ہے کہ مجیب کے خلاف مقدمہ دوسری پوشیدہ سزاؤں پر چھا جائے۔

مجھے یہ علم ہے کہ فوج نے غیر بنگالیوں کے قتل کو روکنے کے لئے مشرقی پاکستان میں مداخلت نہیں کی تھی' جس کا سلسلہ تین ہفتے تک جاری رہا اور اس عرصے میں فوجی جنرل یہ ظاہر کرتے رہے گویا وہ حزب اختلاف کے ساتھ پارلیمنٹ سے باہر معاملات طے کرنے میں مصروف ہیں۔ وسیع پیمانے پر ہونے والے تشدد کے پیچھے شہریوں کی جانیں بچانا مقصود نہیں تھا' جس کے نتیجے میں لاتعداد پاکستانیوں کی جانیں ضائع ہوئیں' املاک کا بے اندازہ نقصان ہوا اور لاکھوں افراد بھاگ کر ہندوستان جانے پر مجبور ہوگئے۔ کسی ذمہ دار حکومت کا یہ عمل نہیں ہوتا کہ جو سفاکانہ کارروائیاں ہو چکی ہیں' ان کا حساب چکانے کے لئے برابر کی سفاکی دکھائے۔ فوجی حکومت عوامی لیگ کی زیادتیوں اور مشتعل عوام کی کارروائیوں کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے

رویے کا جو جواز پیش کر رہی ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہماری افواج اور سول ملازمین کے اخلاقی معیارات گر کر کس سطح پر پہنچ گئے ہیں؟ ان کے علاوہ مجرمانہ کارروائی کوئی کاروباری معاملہ نہیں کہ ایک فریق کے جرائم دوسرے فریق کے کھاتے میں ڈال دیئے جائیں۔

اس مسئلہ پر چین کی گفتگو کا حوالہ دینا بے محل ہوگا۔ انہوں نے پاکستان کو اپنا تعاون صرف غیر ملکی مداخلت کی صورت میں پیش کیا تھا اور اپنے اس موقف کا اظہار کیا تھا کہ یہ تنازعہ داخلی نوعیت کا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ تشویش ناک بات امریکی حکومت کا یہ فیصلہ ہے' جس کے تحت وہ ایک اکثریت کے ہاتھوں ہاتھ جنگی ہتھیار فروخت کر رہی ہے اور اسے اقتصادی امداد بھی دے رہی ہے' اس کے باوجود کہ مغرب کی اتحادی طاقتوں' امریکی کانگریس کے اہم اراکین سے اور عالمی بینک کے عہدیداروں نے متفقہ طور پر اس کی مخالفت کی تھی۔ یہ بات خاص طور پر بہت اہم ہے کہ شیخ مجیب اور ان کی پارٹی کی وفاداری مغربی ممالک اور امریکہ کے ساتھ بڑے طویل عرصے سے چلی آ رہی ہے۔

مغربی پاکستان کے فوجی حکمرانوں کے لئے واشنگٹن کی یہ امداد ان پاکستانیوں کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہوگی جنہیں یہ یقین تھا کہ جنگ باز جتھوں اور معتدل مزاج جمہوریت پسندوں کے درمیان اگر انتخاب کی نوبت آئی تو امریکہ آخر الذکر کا انتخاب کرے گا۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے رہنما یہ سمجھنے میں ناکام رہے کہ نکسن کسنجر گٹھ جوڑ کے لئے مغربی پاکستان کا وجود کتنا اہم تھا' جو سوویت روس کے خلاف بحیرہ روم اور بحر ہند میں اسپین اور پرتگال سے لے کر یونان اور اسرائیل سے ہوتے ہوئے ایران اور پاکستان تک اپنے قابل اعتماد حلیف ملکوں کا ایک غیر رسمی اتحاد بنا رہے تھے۔ کہا گیا ہے کہ اب جنرل یحیٰی کو امریکہ کے ساتھ تعاون پر انعام دیا جا رہا ہے۔ جنہوں نے چین کے لئے مسٹر کسنجر کے حالیہ مشن کا بندوبست کیا تھا۔ اگر ایسا ہے تو چین اور امریکہ کی باہمی مفاہمت کا آغاز ہی ایشیا کے کمزور اور نادار عوام کے مفاد کے خلاف ہوا ہے۔ بہر حال امریکی پالیسی کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو' ایک بات تو صاف ہوگی۔ ایشیا کے ایک اور خطے میں انسانیت کے خلاف ہونے والے جرائم میں امریکہ شریک ہو گیا ہے لیکن اس کی ذمہ داریاں اتنی فوری نوعیت کی نہیں' جتنی ہماری اور آپ کی ہیں۔ میں یہ بات بھی زور دے کر کہوں گا کہ موجودہ صورت حال نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ کے امکان کو قوی کر دیا ہے۔ دونوں ممالک عالمی سیاست کی بساط کے مہرے بنتے جا رہے ہیں۔ اب ہندوستان اور روس نے بیس سالہ دوستی کا ایک معاہدہ کیا ہے' جس کے تحت روس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ پاکستان کی ساتھ جنگ کی صورت میں ہندوستان کو فوجی امداد دے گا۔ اس معاہدے سے ان سارے فوائد پر پانی پھر گیا' جو پاکستان نے 1966ء میں تاشقند کانفرنس سے حاصل کئے تھے۔ اس کے تحت روس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ پاکستان کی مدد کرے گا اور پاک و ہند تعلقات کے سلسلے میں غیر جانبدار رہے گا۔

مجھے نہیں معلوم کہ میرے موقف سے ایک انسانی معاملے کے تصفیے میں کوئی مدد ملے گی۔ اس حقیقت کو دیکھتے ہوئے کہ ہماری حکومت نہ تو عوام کے آگے جواب دہ ہے اور نہ انسانیت کی آرا کو کوئی اہمیت دیتی ہے ہمارے احتجاج کا اس وقت تک کوئی اثر نہیں ہوگا جب تک یہ حکومت اپنے سارے وسائل ختم نہ کر چکی ہوگی اور ملک کو اخلاقی، سیاسی اور اقتصادی دیوالیہ پن کی حد تک نہ پہنچا لے گی۔ بہرحال کامیابی کے نہ ہونے سے اس مجرمانہ خاموشی کا جواز پیدا نہیں ہوتا کہ طاقت کے یک طرفہ اور سفاکانہ استعمال پر خاموش رہا جائے۔ (نیویارک ریویو آف بکس، 2 ستمبر 1971ء)

MashalBooks.org

ایک تحریر جنوبی ایشیا کے بحران پر

یہ مکمل مسودہ اقبال احمد کے پینسلوانیا جانے سے ایک گھنٹہ پہلے ڈاک میں ارسال کیا گیا۔ مسٹر احمد ہیر سبرگ میں اپنے مقدمے کی سماعت کے لئے گئے تھے۔

ایڈیٹرز کے نام تحریر:

میں جنوبی ایشیا کے بحران پر جواب تک جاری ہے ایک تحقیقی اور گہری فکر پر مبنی مضمون حسب وعدہ تحریر نہیں کر سکا' حالات کے دباؤ نے مجھے جم کر علمی کام کرنے سے روک رکھا ہے۔ تاہم آپ نے جس ہمدردی اور یگانگت کا اظہار کیا ہے' میں اس سے بہت متاثر ہوا ہوں اور چاہتا ہوں کہ ان دوستوں میں' میں بھی شامل ہو جاؤں' جنہوں نے بلیٹن کے اس شمارے کے لئے مضامین لکھے ہیں۔ اس سے زیادہ موزوں کوئی اور ہدیہ عقیدت ایک ایسے دوست کی یادوں کے حوالے سے ممکن نہیں جو ایشیا کا ایک انتہائی وفا پیشہ اسکالر ہے' میرا ایک ہی بھائی ہے' مشکل حالات میں رفیق کار ہے اور دوستوں کے درمیان بہترین دوست ہے۔ 25 مارچ 1971ء کو جب پاکستانی جرنیلوں نے قوم کی "سالمیت" کو بچانے کے لئے اکثریتی آبادی کے انتخابی نتیجے کو دبا دینے کی مجرمانہ کارروائی کی تو اس کے حوالے سے یہ کچھ یادداشتیں ہیں' شکوک اور فیصلوں پر مبنی یادداشتیں۔

جب یہ تنازعہ شروع ہوا تو پہلے چند ہفتوں کے دوران میں' اور ان دنوں صغیر ابھی ہمارے ساتھ تھے ہم نے بنیادی نکات پر اتفاق کیا اور معمولی نوعیت کے اختلافات دور کر لئے۔ ہماری گفتگو فون پر ہسیٹیلو کی ملاقاتوں میں اور اس کے بعد جون کے آخر میں نیویارک سٹی میں ہوئیں' جہاں ہم آخری مرتبہ فیروز اور اعجاز احمد سے ملے۔ اس وقت ہماری بحث اس بات پر ہوئی کہ اپنے ملک کے اس بحران پر ہم پاکستانی ترقی پسندوں کا کیا فکری رویہ ہونا چاہئے۔ ان یادداشتوں کے بعد میں ہندوستان کی فوجی مداخلت پر اپنا ردعمل پیش کرتا ہوں اور پاکستان کے مستقبل کو جو چیلنج درپیش ہیں' ان پر کچھ اپنے خیالات بھی۔ امید ہے کہ میری اس تحریر سے کم از کم ان پیچیدگیوں کا اندازہ ہو جائے گا جو اس برصغیر کے تنازعے کی موجب تھیں اور اس سیاسی مضمون اور اخلاقی دشواریوں کا بھی' جن کا ہم سب کو سامنا تھا۔ حالیہ ہفتوں کے دوران میں نے بڑی شدت کے ساتھ ان علمی ماہروں' آزاد فکر سیاست دانوں اور پیشہ ور امن فروشوں کے خلاف نفرت اور پہلے سے زیادہ نفرت محسوس کی ہے' جنہوں نے نہایت سستے نعروں کے ذریعے بنگلہ دیش کے مقصد کا اور ہندوستان کا پروپیگنڈہ کیا ہے اور اس کے لئے گمراہ کن اطلاعات اور غلط تجزیے کا سہارا لیا ہے۔ میں یہ بات

MashalBooks.org

اب تک پوری طرح سمجھ نہیں سکا کہ بنگال کے بحران سے ان (انسان دوستوں) میں اتنا جانب دارانہ جذبہ کس طرح پیدا ہو گیا؟ جو اس سے پہلے انڈونیشیا کے قتل عام سے فلسطین کے مہاجروں کی ابتلا سے یا ویت نام اور لاؤس میں وہاں کے لوگوں کی نسل کشی سے متاثر نہیں ہوئے تھے۔ ان لوگوں کی طرح جنہوں نے پاکستان کی فوجی حکومت کے مجرمانہ طرز عمل کی مخالفت کا خطرہ مول لیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ صغیر کو اور مجھے بھی بنگلہ دیش کے ان حمایتیوں کی صف میں شامل کیا جائے۔

1۔ نیویارک ٹائمز (10 اپریل 1971ء) میں ایک بیان ہمارے (صغیر اور اقبال احمد: ایڈیٹر) کے دستخطوں کے ساتھ شائع ہوا۔ جس پر اعجاز اور فیروز احمد کے بھی نام تھے۔ پاکستان کے پہلے آزادانہ قومی انتخابات کے نتائج کو بدل دینے اور خود اختیاری کے مطالبے کو آزادی کی تحریک میں تبدیل کر دینے کے لئے فوج نے مداخلت کی تھی۔ یہ اندازہ لگاتے ہوئے کہ وہ مسئلہ جو معاشرہ پر فوجی غلبے کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے فوجی طریقے سے حل نہیں ہو سکتا' ہم نے پاکستان کی فوجی حکومت کی (مذمت) کی۔ بنگالیوں کے حق خود اختیاری کی تائید کی اور ایسے حالات پیدا کرنے کے لئے اپنی تمام تر توانائیاں صرف کرنے کا عہد کیا جن میں مشرقی بنگال کے عوام اپنا یہ بنیادی حق استعمال کر سکیں۔ اس کے بعد میں نے ایک مضمون میں اپنے موقف کی وضاحت کر دی تھی۔ (نیویارک ریویو آف بکس Vol_XV11 شمارہ 3) اس موقع پر مجھے صرف اپنے شکوک کی وضاحت کرنی چاہیے۔

ہمارے لئے وہ موقف اختیار کرنا آسان نہیں تھا۔ بنگلہ دیش کی تحریک سے ہماری کوئی فطری ہمدردی نہیں تھی۔ عوامی لیگ کا لگاؤ بورژوا طبقے کی طرف تھا۔ اس کی روایات کھاتے پیتے طبقے کی تھیں' اپنے انداز فکر میں وہ مغرب نواز تھی۔ انہی وجوہ سے ہمارا عوامی لیگ پر اعتماد نہیں تھا۔ بنگال کی مسلم قوم پرستی میں شروع سے ہی دو روایات شامل تھیں۔ ایک عوامی اور دوسری اشرافیہ کی روایات۔ کبھی کبھار ان کے اندر تصادم بھی ہوتا' تاہم وہ ایک معاندانہ تعاون کے رشتے میں جڑی ایک ساتھ زندہ رہیں۔ عوام دوست روایت کی نمائندگی 1930ء کی دہائی میں اے کے فضل الحق جیسے رہنماؤں نے اور 1950ء اور 1960ء کی دہائی میں عبدالحمید بھاشانی نے کی۔ انہوں نے سیاسی پروگراموں میں سماجی اور معاشی مسائل کو شامل کر کے عوام میں تحریک عمل پیدا کر دی اور ایک بنیادی کردار ادا کیا۔ اشرافیہ کی قیادت سہروردی جیسے لوگوں نے کی۔ (شیخ مجیب کے مربی وہی تھے) انہوں نے نہایت موثر خارجی ذرائع کی مدد سے' یعنی 1930ء کی دہائی میں برطانیہ اور 1940ء کی دہائی میں مسلم لیگ کی قومی قیادت کے طفیل عوام کے مقاصد کو ذاتی مفادات کی خاطر استعمال کیا۔ عوامی لیگ چونکہ اشرافیہ کی روایات کی براہ راست پیداوار اور ان کی وارث تھی' اس لئے ہم نظریاتی طور پر اس کے خلاف تھے۔

اس کی درمیانہ طبقے کی ساخت' تاریخ اور غیر ملکی روابط کو دیکھتے ہوئے ہمارے شکوک وشبہات میں اضافہ

MashalBooks.org

ہوا۔ یہاں یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ اس کے لیڈر نے امریکہ کے ساتھ پاکستان کے اتحاد کی حمایت کی تھی۔ یہ تھی اس پارٹی کی بنیاد۔ 1957ء سے قبل پرانی مسلم لیگ میں وہ عناصر شامل تھے جنہیں اب نیشنل عوامی پارٹی کہتے ہیں اور اس کے صدر بھاشانی تھے۔ 1956ء میں کاگماری کانفرنس کے موقع پر امریکہ کے ساتھ اتحاد کے سوال پر پارٹی میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ امریکہ کے طرف دار گروہ نے جس کی قیادت سہروردی اور شیخ مجیب کر رہے تھے عوامی لیگ کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ فوجی اتحاد کے مخالف الگ ہو گئے اور انہوں نے نیشنل عوامی پارٹی بنائی۔

عوامی لیگ نے کم از کم اس زمانے سے امریکہ اور اس کے مخصوص مفادات اور اداروں کے ساتھ اسی طرح تعلق برقرار رکھا ہے جس طرح مغربی پاکستان سے روابط رکھے ہیں۔ غیر مصدقہ خبروں کے مطابق 1961ء سے جب ہندوستان کے اندر خاص طور پر اس کے شرقی علاقوں میں چین دشمن خفیہ ایجنسیاں سرگرم ہوئیں اور فسادیوں کی سرگرمیاں بڑھ گئیں تو اس زمانے سے لیگ نے وہاں موجود (دوستوں) سے روابط پیدا کر لئے تھے۔ ان رابطوں کا ذریعہ بیشتر بین الملکی اور باہم جڑی ہوئی کارپوریشنیں مثلاً چین ایم اور چائنز مین ہٹن ہوتیں اور خود سی آئی اے موجود تھی۔ مثال کے طور پر ہم سب کے جانے پہچانے یوسف ہارون تھے۔ ایک پاکستانی (ملٹی نیشنل) ارب پتی مقیم نیویارک جنہوں نے یہ اقرار کیا ہے کہ انہوں نے شیخ مجیب کو پندرہ سال تک اپنی ملازمت میں رکھا۔ (اس میں ان کی قید کا زمانہ بھی شامل تھا) اور جنرل محمد یحییٰ خاں کی اجازت سے عوامی لیگ کو تین لاکھ ڈالر کی رقم ادا کی تاکہ اس اہم انقلابی مہم میں (1970ء) میں ان کے کام آئے۔ (نیویارک ٹائمز 4 جنوری 1962ء)

رسمی نتائج کے پیش نظر عوامی لیگ کی انتخابی کامیابی سے ہم زیادہ متاثر نہیں ہوئے یہ تو دراصل بھاشانی نیپ (NAP) کے بائیکاٹ کے بعد بلا مقابلہ انتخابات تھے بہرحال قومی اسمبلی میں لیگ کو اکثریت دلانے سے یہ ہوا کہ اس میں طاقت کا ایک نیا احساس پیدا ہوا اور فوج کا یہ تخمینہ الٹا ہو گیا کہ مغربی پاکستان کے قدامت پرستوں کی ایک شراکتی پارٹی بنا کر شیخ مجیب کو ٹھنڈا کیا جا سکتا ہے۔ یحییٰ مجیب اور بھٹو کی باہمی بات چیت اب سامنے آنے لگی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فوج اور مغربی پاکستان کے سیاست دان دفاع اور امور خارجہ میں وفاق کے محدود اختیار کو تسلیم کر لینے پر تیار ہو گئے تھے بشرطیکہ شرقی پاکستان کو ایک الگ ملیشیا (فوج) بنانے اور بین الاقوامی امداد اور تجارت کے معاملات کو حسب منشا چلانے کا اختیار دے کر مرکز کو بالکل بے اثر نہ بنا دیا جائے۔ (چھ نکات کے آخری دو نکات بھی تھے۔)

عوامی لیگ کی طرف سے ہماری بے اطمینانی اس وقت اور بھی بڑھ گئی جب اس کے لیڈروں نے نہایت تیزی کے ساتھ شرقی بنگال کے اندرونی علاقے چھوڑے اور صاف نکل گئے اور نہایت مستعدی کے ساتھ ایک افسانوی بستی مجیب نگر میں اپنی عبوری حکومت بھی بنا لی۔ ''آزادی'' کی تحریکوں کی تاریخ میں یہ

ایک عبوری حکومت کے قیام کی تیز ترین مثال ہے۔) اور پھر ہندوستان کی حکومت نے جس طرح اس کا پرجوش خیر مقدم کیا' وہ بھی بے مثل ہے۔ اس وقت ہم پر یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ ہندوستانی حکومت کو بنگلہ دیش پر اپنے کنٹرول کا پورا یقین نہ ہو گیا ہوتا تو وہ قوم پرست بنگالی علیحدگی پسندوں کی اس تحریک کو جو بنگال کا نصف پاکستان ہے' مدد دینے کا خطرہ ہرگز مول نہ لیتی۔ بہر حال نہرو کے انتقال تک یعنی اگست میں ہندوستان اور روس کے معاہدہ دوستی تک اور پھر ہندوستان میں اور اس کے مشرقی محاذ پر روسی اسلحہ کی زبردست فراہمی تک ہمارے "منظرنامے" میں مشرقی بنگال پر ہندوستان کے بھرپور حملے کا امکان شامل نہ تھا۔

بہر حال یہ بات ہمارے ذہنوں میں تھی کہ اس عبوری حکومت میں جو اپنے جائز ہونے کی دعویدار ہوگی' ہندوستان فیصلہ کن اختیار کا مالک ہوگا اور سرحدوں پر موجود مکتی باہنی اس کی مصلحتوں کے تابع ہوگی' جسے وہ اسلحہ' مشورے اور مطلوبہ سہولتیں فراہم کر رہا ہے۔ پاکستانی فوج کی یقینی شکست اور اس کے انخلا کے بعد مشرقی بنگال میں جتنی بھی گوریلا تنظیمیں آئیں گی' وہ دونوں مل کر اسے باسانی شکست دے دیں گے' لیکن ہم نے پاکستان کے دولخت ہونے کے معاملے میں عوامی لیگ کی اہلیت کا بہت کم اندازہ لگایا' ہندوستانی حکومت کے شائستہ طرز عمل کا غلط اندازہ کیا اور یہ سمجھنے میں ناکام رہے کہ روس' چین کے خلاف اپنی حمایت حاصل کرنے کے لئے' اس انتہا تک جا سکتا ہے۔

اس برصغیر کے بحران کے سلسلے میں امریکہ کی پالیسی کیا ہے' رائے عامہ اور اخبارات' اب تک اسے سمجھ نہیں سکے ہیں۔ اس سیاسی پینترے بازی کا تجزیہ ایک پورے مضمون میں ہی ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر کسنجر کے افکار کی عملی تفسیر کس طرح سامنے آتی ہے' یہ اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ واشنگٹن بظاہر پاکستان کی حمایت کر رہا تھا اور ہم سب پہلے تو اس بات پر حیران تھے' پھر رفتہ رفتہ کر کے یہ ظاہر ہونے لگا کہ امریکہ پاکستان کی فوج کو واقعی فوجی امداد دینے کی بجائے' اسے امداد کی خوش فہمی میں مبتلا رکھنا چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر آزاد ذرائع کے مطابق امریکہ نے 1971ء میں پاکستان کے لئے تیس ملین ڈالر سے کم مالیت کا اسلحہ امداد کے طور پر یا قیمتاً فراہم کیا' لیکن ڈاکٹر کسنجر کے 7 دسمبر کے بیان کی رو سے اس کی مالیت پانچ ملین ڈالر تھی۔ اس سارے بحران کے زمانے میں امریکہ بظاہر فوجی حکومت کی حمایت کر رہا تھا' حالانکہ عوام کے لئے یہ ایک ناپسندیدہ بات تھی' لیکن امریکہ نے کسی بھی مرحلے پر نفسیاتی تسکین کے علاوہ پاکستان کو اس کی ضرورت کے مطابق امداد فراہم نہیں کی۔ ظاہر ہے جغرافیائی اور سیاسی مصلحتوں کا تقاضا تھا کہ واشنگٹن کو ایک متحدہ پاکستان سے کوئی ہمدردی نہیں ہونی چاہیے۔ دراصل نکسن حکومت نے اپریل 1971ء سے ہی یہ فرض کر لیا تھا کہ مشرقی بنگال اسلام آباد کے ہاتھ میں سے نکل جائے گا اور اس امکان سے امریکہ کو ہرگز کوئی خوف لاحق نہیں تھا۔ کیونکہ بنگلہ دیش' ہندوستان کے زیر نگیں رہتے ہوئے اگر بہت برا ہوا تو روس کے لئے

MashalBooks.org

چین کے خلاف ایک اڈہ بن جائے گا اور اگر اچھا ہوا تو یہ ہوگا کہ امریکہ کا حلیف اور دست نگر بن جائے گا۔

لیکن نکسن کسنجر حکمت عملی کے لئے مغربی پاکستان بہت اہم ہے' اس کا مطلب ہے تیل کے عالمی مرکز میں بحر روم اور بحر ہند کے علاقوں کے درمیان طاقت کا ایک نیا منطقہ تعمیر کرنا جو مغربی یورپ کے اثر سے آزاد لیکن امریکہ پر اس کا انحصار ہو' یہ منطقہ اسپین اور پرتگال سے یونان اور اسرائیل سے ہوتا ہوا ایران تک اور وہاں سے مغربی پاکستان تک پھیلا ہوا ہوگا۔ چنانچہ ایک پالیسی تیار کی گئی' اس لئے نہیں کہ ایک مصیبت زدہ اور بحران میں پھنسے ہوئے حلیف کو ناگوار حالات سے باہر نکالا جائے بلکہ ایک دست نگر حکومت کو فالتو پرزے اور اخلاقی امداد کے سہارے احتیاج پر مبنی ایک نظام میں اپنے ساتھ پھنسا کر رکھا جائے۔ اس پیدائشی رشتے کو کاٹنے کی خواہش اور ہمت 'زیڈاے بھٹو میں ہے بھی یا نہیں' یہ دیکھنا باقی ہے۔

ہمارے شکوک وشبہات سے جس بات کو تقویت پہنچی' اس میں کچھ ذاتی وجوہ بھی شامل ہوں گی۔ ہم پاکستان کی تحریک آزادی کے زمانے میں پلے بڑھے اور اس کی تخلیق کے متنازعہ مرحلے میں اپنے گھر بار' دوست احباب اور رشتے داروں سے بچھڑ گئے۔ ہمارے لئے اس خواہش سے باز رہنا کس طرح ممکن تھا کہ دونوں پاکستان کے درمیان ایک طبعی تعلق باقی رہے اور اس کے عوام ایک سوشلسٹ معاشرے کی تعمیر کے لئے مل کر جدوجہد کریں۔

بنگال میں بہاریوں کی اقلیت کے ساتھ جو کچھ ہوا' اس سے صغیرا اور میں دونوں شدید کرب میں مبتلا تھے' ہم خود بہاری ہیں' اس لئے ہمیں ان لوگوں کی اذیت کا اندازہ تھا جنہیں 1946ء کے بعد سے دو یا تین بار ہجرت کرنی پڑی' ہندوستان میں قتل عام سے بچنے کے لئے اور بالآخر پاکستان میں پناہ لی' جس کے ساتھ وہ وفادار رہے۔ بےگھر بےدر لوگ' اردو بولنے والے بنگالیوں کی نفرت کے شکار' مشرق میں مغربی پاکستان والوں کو عزیز' وہ درمیان میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ فوجی مداخلت سے پہلے' مارچ کے پورے مہینے میں اور اس عرصے میں جب کہ حکومت پر عوامی لیگ کا عملاً قبضہ تھا۔ بنگالی جنونیوں کے ہاتھوں کوئی دس ہزار افراد مارے گئے۔ اس کے بعد فوج نے قتل عام کی ان مثالوں کو اپنی سفاکانہ مداخلت کا جواز بنا لیا۔ حکومت کے وہائٹ پیپر مطبوعہ اگست 1971ء میں بنگالیوں کے ہاتھوں قتل ہونے والوں کی تعداد ایک لاکھ بتائی گئی جو نہایت مبالغہ آمیز تھی۔

عوامی لیگ کے انتہائی غیر ذمہ دارانہ رویے سے ہمیں بے حد اذیت پہنچی۔ ہم نے بدقسمت بہاریوں کی ہلاکت کا سوگ منایا' جن میں ہمارے بہت سے رشتے دار بھی شامل تھے۔ لیکن بنگالی رضاکاروں کی قاتلانہ کارروائی کا مقابلہ ہم نے حکومت کے اقدام کے ساتھ نہیں کیا۔ یہ تو ایک منظم اور پیشہ ور فوج کا مجرمانہ فعل تھا۔ بہر طور فوج ان لوگوں کو مستقل طور پر تحفظ مہیا کرنے میں ناکام رہی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جس عرصے میں فوجی جرنیل سیاست دانوں کے ساتھ پارلیمنٹ سے باہر سودے بازی میں مصروف تھے تین ہفتے

MashalBooks.org

تک قتل ہوتے رہے اور انہوں نے قتل عام کو روکنے میں مداخلت نہیں کی۔ فوج کا اس وسیع پیمانے پر تشدد کی کارروائیوں کا مقصد شہریوں کی جانوں کا تحفظ نہ تھا۔ علاوہ ازیں ایک ذمہ دار حکومت کا یہ عمل نہیں کہ کسی ظلم کا بدلہ چکانے کے لئے اس سے زیادہ ظلم کرے۔ مجرمانہ افعال کسی کاروبار میں شمار نہیں ہوتے' یہ ممکن نہیں کہ ایک فرد کے جرائم کو دوسرے کے کھاتے میں ڈال دیا جائے۔ عوامی لیگ اور مشتعل بنگالی شہریوں کی زیادتیوں کے حوالے سے فوجی حکومت کا اپنے رویے کو جواز بنانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہماری فوج اور شہری انتظامیہ کس قدر پستی میں گر چکی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ ہمیں یہ احساس تھا کہ بنگالیوں کے حق خود اختیاری کی حمایت اخلاقی اور سیاسی طور پر ضروری ہے۔ اس کے باوجود وہ سامراج مخالف جدوجہد نہیں تھی۔ درحقیقت فوجی حکومت کی غیر معقول اور خطائی پالیسی کا آئندہ نتیجہ یہی نظر آتا تھا کہ ہندوستان کے توسیع پسندانہ مقاصد کی توسیع ہو' طاقت کی بھوکی روسی حکومت کی تشفی ہو اور امریکہ کے سامراجی مفادات پورے ہوں۔ ایک طرف بنگال کی ابھرتی ہوئی بورژوا قوم پرست طاقت تھی۔ دوسری طرف پاکستان کی جنگ جو فسطائیت تھی' ان دونوں کے درمیان ہم نے فوجی حکومت کی مخالفت کا فیصلہ کیا۔ (11)

ہندوستان نے وسیع پیمانے پر فوجی مداخلت کی۔ اب مجھے اس کی مذمت کرنی چاہیے۔ ہندوستان اقوام متحدہ کے چارٹر کی خلاف ورزی کر رہا ہے اور سامراجی ممالک نے عام شہری تنازعوں میں براہ راست بیرونی طاقتوں کی مداخلت کی جو طرح ڈالی ہے' اس خطرناک رجحان کو مزید تقویت پہنچا رہا ہے۔ ہندوستان کے اس عمل کو بین الاقوامی برادری نے کس قدر مواخذے کے لائق سمجھا ہے' اس کی بہترین نشاندہی اس بات سے ہوتی ہے کہ اقوام متحدہ میں اس کے خلاف کتنے زیادہ ووٹ پڑے اور مخالفت کرنے والوں میں ہندوستان کے بہترین دوست دوسروں کے علاوہ یوگوسلاویہ اور مصر بھی تھے۔ ہندوستان نے اقوام متحدہ کی قرارداد کو نظر انداز کر دیا' جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے یہاں بین الاقوامی رائے عامہ کا کوئی احترام نہیں اور آپ کو یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ جارحیت کا سامنا ہو تو انسانیت کتنی بے بس ہو جاتی ہے۔

حکومت ہندوستان کو مرکز گریز طاقتوں سے خطرہ ہے' اس لئے وہ علاقائی خودمختاری کو پسند نہیں کرتی' علیحدگی تو دور کی بات ہے۔ چنانچہ انسانی جانوں کے اتلاف کی پروا کئے بغیر ہندوستان نے بیافرا کے خلاف نائجیریا کی وفاقی حکومت کی حمایت کی۔ پھر مرکزی اقتدار کی تلوار ہندوستان کے سرکشیدہ عوام کے سروں پر گری۔ مغربی بنگال' بنگلہ دیش کا دوسرا نصف ہے جو ہندوستان میں ہے۔ اس میں بار بار فوجی مداخلت ہو چکی ہے اور اب براہ راست وفاقی حکمرانی کے تحت ہے' یہاں بائیں بازو کے لوگوں پر وسیع پیمانے پر اور منظم طریقے سے تشدد کیا جا رہا ہے۔ اس کے عوام' مشرقی بنگالیوں کے ساتھ ملی ہوئی سرحد' مشترکہ تہذیب اور زبان رکھتے ہیں۔ آزادی ان دونوں کا مقدر ہے۔ یہاں کے عوام پوری غذا سے اور قومی حکومت میں اپنے

MashalBooks.org

جائز حصے سے بھی محروم ہیں۔ دو ہی چیزیں ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہیں۔ ایک مذہب (ہندو اور مسلمان) اور دوسری مخالف قوم پرستی (ہندو اور مسلم قوم پرستی) ایک خودمختار سیکولر اور سوشلسٹ بنگلہ دیش اپنے اندر مغربی بنگال کے بیشتر مارکسٹوں کے لئے بڑی کشش رکھتا ہوگا۔ اس سے ہندوستان کی ''سالمیت'' کے لئے خطرہ پیدا ہوسکتا ہے۔ ایسی جہالت سے نپٹنے کے لئے ہندوستان یقیناً بنگلہ دیش کو اپنے ساتھ جکڑ کر رکھے گا اور اسے مغربی بنگال کا توسیعی علاقہ بنا لے گا' اسے اپنے بنگال کے مستقبل کے لئے ایک روشن مثال نہیں بننے دے گا۔

مشرقی بنگال کے عوام کی طاقت کا سرچشمہ ہندوستان کی بندوقیں نہیں ہوسکتیں۔ براہ راست فوجی مداخلت سے ہندوستان کا مقصد ایک حقیقی آزاد بنگلہ دیش کے قیام میں مدد دینا نہیں بلکہ ایک علاقے کو اپنا تابع بنا کر رکھنا ہے۔ اس کا مقصد ہندوستان کے بنگالی حلیفوں کی گرتی ہوئی ساکھ کو سہارا دینا ہے۔ یہ ہیں عوامی لیگی اور ماسکو نواز کمیونسٹ لیڈر جو جلاوطنی میں وقت گزار رہے ہیں اور سرحدوں پر متعین باغی' جنہیں روائتی جنگ لڑنے کی تربیت دی گئی ہے' ان کے ساتھ ہندوستان کے تربیت یافتہ عناصر بھی ہیں' لیکن بیشتر مشرقی پاکستان رائفلز کے تربیت یافتہ اور مشرقی پاکستان رجمنٹ کے سکھائے ہوئے لوگ ہیں' جو ماہ مئی تک پاکستانی فوج سے ٹوٹ کر الگ ہونے کے بعد ہندوستان پہنچ کر آپس میں جڑ گئے تھے۔ ایک ابھرتی ہوئی طاقت ترقی پسند اور خودآگاہ ان گوریلا عناصر کی ہے' جنہیں بائیں بازو والوں نے دیہات میں تعینات کیا تھا اور جو عوامی لیگیوں اور ان کے ''روائتی'' باغی سرحدوالوں کی طرح بنگال کے دیہات سے فرار ہوکر ہندوستان کی نسبتاً محفوظ پناہ گاہوں میں نہیں گئے۔ ہندوستانی فوج کا مقصد ان گوریلا عناصر کے بڑھتے ہوئے اثر پر بھی قابو پانا ہے۔

ہندوستان کا دعویٰ ہے کہ اس کی فوجی مداخلت کا محرک حق خودا ختیاری سے اس کی وابستگی اور مہاجرین سے اس کی تشویش اور ہمدردی ہے۔ ایک ایسی حکومت کی طرف سے حق خودا ختیاری کو فوجی کارروائی کے لئے جواز بنانا سمجھ میں نہیں آتا جو کشمیر پر جبراً قبضہ کر کے بیٹھی ہے اور اس کے عوام کو رائے شماری کا حق نہیں دیتی' جس کا خود اس نے وعدہ کر رکھا تھا اور جس کی منظوری اقوام متحدہ نے دی تھی۔ ایسی حکومت جس نے ناگا اور میزو عوام کی جائز اور قانونی جدوجہد کو جو ہندوستانی قبضے کے خلاف ہے' سختی سے کچل دیا ہے اور یہ وہ تشدد ہے جس کا شہرہ بھی نہیں ہوا' حالانکہ ان کی جدوجہد طویل مدت پر پھیلی ہوئی ہے اور ان پر مظالم' بنگال میں پاکستانی فوج کے مظالم سے کم سفاکانہ نہیں۔ عالمی رائے عامہ برصغیر میں مہاجروں کے المیے سے بہت متاثر ہوئی ہے' لیکن اس مسئلہ کی پیچیدگی سے واقف نہیں' چنانچہ وہ جنگ کے عذر کو درست اور قابل فہم سمجھتی ہے۔ تاہم مسز گاندھی نے یوتھان کی تجویز کو جس طرح سرے سے رد کر دیا' اسی سے ظاہر ہے کہ ان کے یہاں پاکستان کو ٹکڑے کر دینا' مہاجروں کی فلاح اور اپنے وطن میں ان کی واپسی سے زیادہ ضروری کام ہے۔

MashalBooks.org

امریکی سینیٹروں کو جو ہندوستان سے ہمدردی رکھتے ہیں طے شدہ منصوبے کے تحت مہاجر کیمپوں کا دورہ کرایا گیا۔ بین الاقوامی فلاحی تنظیموں کو مقررہ حدود کے اندر رکھا گیا اور انہیں اس بات سے روکا گیا کہ مہاجروں کی اصل تعداد کا صحیح اندازہ کرسکیں۔

بڑے پیمانے پر جنگ کی صورت میں مصائب بڑھ جائیں گے اور مہاجروں کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ جنگ کے شکار ہونے والوں کی تعداد کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا' لیکن ان کے علاوہ تقریباً چالیس لاکھ بے خانماں اقلیتی باشندوں (مغرب میں بنگالی اور مشرقی پاکستان میں غیر بنگالی) کے بارے میں اندیشہ ہے کہ قتل کردیئے جائیں گے۔ جب تک کوئی سمجھوتہ نہیں ہوجاتا اور اس میں اقلیتوں کے تحفظ کی یقین دہانی شامل نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان کے اندر جنگ میں کامیابی ہندوستان کے سر سے مہاجر مسئلہ کا بوجھ کم نہیں کرے گی۔ مہاجروں میں بھاری اکثریت چونکہ ہندوؤں کی ہے اس لئے مستقبل قریب میں یہ امکان نہیں کہ وہ اکثریتی مسلم آبادی کے بنگال میں جانا چاہیں گے اور اگر سب کے سب قتل نہیں ہوئے تو بنگلہ دیش میں مقیم بیس لاکھ بہاری لامحالہ ہندوستان واپس آجائیں گے۔ جہاں ان کی موجودگی کی بنا پر پھر سے فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوسکتے ہیں۔ وہ سرکردہ امریکی جو مہاجر مسئلہ کو پیش کرتے ہوئے ہندوستان کی فوجی مداخلت کو جائز ثابت کررہے ہیں' وہ یا تو ہندوستان کے لئے غیر ذمہ دارانہ معذرت خواہی میں مبتلا ہیں یا پھر برصغیر میں فرقہ وارانہ اختلافات کی پیچیدگی سے لاعلم ہیں۔

امریکی انتظامیہ نے عام لوگوں کو اتنی بار دھوکہ دیا ہے کہ اب اس پر کوئی اعتبار نہیں کرے گا۔ پاکستان کے حکمرانوں کو ملنے والی امریکی امداد' خواہ ان کی ضرورت کے مقابلے میں محض برائے نام ہے' لیکن اس نے ان حکمرانوں کو فوری سمجھوتے پر آمادہ کرنے کی بجائے ان کی ہٹ دھرمی میں اضافہ ہی کیا ہے۔ تاہم ڈاکٹر کسنجر نے حال ہی میں جو بات زور دے کر کہی ہے' وہ میرے علم کے مطابق درست ہے۔ موسم گرما کے آخر تک جرنیلوں نے سمجھوتے کی طرف مائل ہونا شروع کردیا تھا۔ ادھر ان پر بھاری روسی اسلحہ کا دباؤ ہے' ادھر ہندوستانی فوجیں سرحد پر کھڑی ہیں۔ ملک کے اندر افراط زر اور ساتھ ہی مزاحمت بڑھ رہی ہے۔ لہٰذا وہ آئندہ اکتوبر تک حق خودمختاری دینے کے لئے آمادہ ہوجائیں گے' جس سے انہوں نے گزشتہ مارچ میں نہایت سفاکی کے ساتھ انکار کیا تھا۔ اہم بنگالی لیڈر شروع میں تو گفت وشنید میں تو دلچسپی رکھتے تھے لیکن دہلی پر تمام تر انحصار کے باعث اب وہ فوری اور مکمل آزادی سے کم تر کسی بات پر رضامند نہیں۔ تصفیے کی تھوڑی سی جو امید باقی رہ گئی تھی' وہ ہندوستان کی فوجی پیش قدمی سے ختم ہوگئی۔ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے' سول تنازعے کی صورت میں لوگ آپس میں بٹ جاتے ہیں لیکن ان میں مفاہمت اور سابقہ حالات کی بحالی کی خواہش اس وقت دم توڑ دیتی ہے جب ان کے درمیان باہر سے مداخلت ہو۔

پاکستان سے مشرقی بنگال کی علیحدگی اب ایک حقیقت ہے' جنوبی ایشیا میں مرکزیت کی جو اجنبی اور نو

آبادیاتی روایت موجود تھی' اور جس کا خاتمہ بہت ضروری تھا یہ علیحدگی اس کی پہلی نمائندہ مثال ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اقتدار کی منتقلی ایک نظم کے تحت ہو۔ اس میں قیدیوں اور درماندہ لوگوں کے تبادلے کی شرط شامل ہو' اقلیتوں کے تحفظ کی ضمانت موجود ہو اور اکثریتی آبادی والے لوگ اقلیتوں کو ان کے ناقابل تنسیخ حقوق کا یقین دلائیں۔ برصغیر میں تنازعہ کے اسباب یہ ہیں کہ برصغیر کی دونوں حکومتوں نے عوام کے مطالبوں کو جبراً دبائے رکھا اور سیاست دانوں نے عوام کے مفادات کی آڑ میں ذاتی مفادات کو آگے بڑھایا۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں نے اپنے حق خود اختیاری کے لئے ووٹ دیئے تھے' جس کو فوج نے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن ہندوستان کے بنگالی گماشتوں کو یہ اختیار تو نہیں دیا گیا تھا کہ ہندوستانی ٹینکوں کے پیچھے کھڑے ہو کر آزادی کا اعلان کر دیں۔ اسی طرح کشمیری عوام ہندوستانی تسلط کے ماتحت نہیں رہنا چاہتے' لیکن اس بارے میں مجھے یقین نہیں کہ وہ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ ان دونوں معاملات میں صرف انتخابات کے ذریعے جو آزادانہ طور پر بین الاقوامی نگرانی میں ہوں' جس طرح ناگالینڈ میں ہوا' یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ متعلقہ عوام کیا چاہتے ہیں؟ خود مختاری یا آزادی' وفاق یا کنفڈریشن برصغیر میں اس وقت امن کی بحالی کا امکان موجود ہے' جب ان تباہ حال علاقوں کے باشندوں کو اپنے حق خود اختیاری کے استعمال کا موقع ملے گا۔

(III) وقائع نویس 17 دسمبر 1971ء کو اس حوالے سے یاد کریں گے کہ اس روز پاکستان دونیم ہو گیا تھا۔ تاریخ داں کہیں گے کہ اس ملک کی تباہی' جس طرح اس کے بانیوں نے سوچا اور بنایا تھا' 25 مارچ کی رات میں ہی شروع ہو گئی تھی۔ اس لمحے کے آغاز سے ہی تباہی کی طرف پیش قدمی یقینی ہو گئی تھی' اس لئے کہ وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں ہماری تقدیر تھی' سیاست کی منطق' تدبر' اخلاقیات اور فوجی حکمت عملی سے نابلد تھے۔ آٹھ مہینے بعد یعنی اس وقت جب 2 لاکھ 50 ہزار افراد ہلاک کئے جا چکے تھے' ہزاروں شہری بے گھر ہو گئے تھے۔ ہزاروں عورتوں کی عصمتیں پامال اور بچے یتیم ہو چکے تھے' اس وقت پاکستان کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا اپنی انتہا کو پہنچا۔ ایک لاکھ سپاہیوں اور سول عملے نے ہتھیار ڈال دیئے۔ لاکھوں افراد سے بدعہدی کی گئی اور وہ بخوشی یا مجبوری کے تحت ریاست کے وفادار رہے۔ شاید ہی کسی قوم کی تاریخ میں کوئی اتنا سیاہ باب ہو گا۔ سوال کرنا ہو گا کہ ایسا کیوں ہوا؟

پاکستان کے موجودہ المیے کے اسباب معلوم کرنے کے لئے مسٹر بھٹو نے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا ہے۔ ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں' لیکن عام طور پر جو رجحان پایا جاتا ہے کہ الزامات چند خطا کار افراد پر ڈال دیئے جاتے ہیں' حالانکہ وہ محض بحران پیدا کرنے والی طاقتوں کے کارندے ہوتے ہیں' تو ہمیں اس رویے کا ڈر ہے۔ کمیشن نے اگر مسئلہ کے بنیادی اسباب کا جائزہ نہیں لیا اور اس کے برعکس وقتی جذبات کی تشفی کر دی اور چند افراد پر الزام ڈال دیئے تو وہ اپنی تاریخی ذمہ داری پوری کرنے میں ناکام رہیں گے۔

MashalBooks.org

ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ بربادی اس لئے پیدا ہوئی کہ ہم نے اسے بتدریج بڑھنے کا موقع دیا۔ عوامی لیگ کی زیادتیوں کے باوجود مسائل نسبتاً واضح تھے۔ فوجی مداخلت میں اس کی بربریت ایسی کہ اس سے انکار ممکن نہیں اور اس کے نتائج شروع سے ہی اتنے واضح کہ اس کے بارے میں سوچ کر ہی خوف آتا تھا۔ اس کے باوجود ملک میں اور بیرون ملک ایسے لکھے پڑھے لوگ نہ تھے' جن میں پیش بینی کی صلاحیت یا جرات ہوتی کہ آج جس شدومد سے فوجی ٹولے کی مذمت کر رہے ہیں' اس وقت ان کی زندگیوں میں رخنہ ڈالتے۔ ان کے ارادوں میں رکاوٹ بنتے اور ان کو چیلنج کرنے کا خطرہ مول لیتے۔ ہتھیار ڈالنے کے اس شرمناک وقوعہ کے تقریباً آخری روز تک کسی بھی اہم لیڈر نے فوجی پالیسیوں کے بنیادی مفروضوں پر سنجیدگی کے ساتھ سوال نہیں اٹھایا۔ اس لحاظ سے وہ لوگ جو آج یحییٰ اور اس کے حواریوں پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ کر رہے ہیں' اس ملک اور اس کے عوام کے خلاف جرائم میں شرکت سے بری الذمہ نہیں۔ دوسروں پر الزام تھوپنا' ایسوں کو ڈھونڈنا جن میں ہمارے پامال احساسات کو پناہ مل سکے' ہمارے لئے فائدہ مند نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس ہم بنیادی امور پر گہرائی سے سوچنا چھوڑ دیں گے۔

اس بحران کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم نے پاکستان کے بارے میں عوام کے مقصد سے بدعہدی کی ہے۔ عام مسلمانوں نے ایک ریاست کے قیام کے لئے جدوجہد اس خواہش کے تحت کی تھی کہ اس کا معاشرہ جبر و تشدد سے' بے انصافی سے اور عدم مساوات سے پاک ہوگا۔ جب عام مسلمان ایک اسلامی ریاست کی اپیل کے گرد اکٹھا ہوئے تو وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ ہم ایک اچھی ریاست چاہتے ہیں' جہاں انصاف کی حکمرانی ہو۔ چنانچہ اسلامی نیشنل ازم ان علاقوں میں پہلے سے موجود تھی اور اس کی جڑیں گہری تھیں' جہاں ظالم طبقہ بیشتر ہندوؤں کا تھا۔ جیسے بنگال۔ البتہ مسلم اشرافیہ کے لئے پاکستان کا مطلب یہ تھا کہ ہندو مقابلے کے راستے سے ہٹ گیا اور اب اس کی اجارہ داری کامل اختیار اور مراعات پر قائم ہوگئی۔ پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ اس کی اشرافیہ جس میں جاگیردار' سرمایہ دار' اعلیٰ سرکاری عہدیدار اور فوجی شامل ہیں' عوام کی محرومی کی بنیاد پر مراعات حاصل کرتے رہے اور 23 سال تک اقتدار کے ساتھ چپکے رہے۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ پاکستان کی معیشت اور اس کے سماجی ڈھانچے کی مکمل تبدیلی ضروری ہے' اسی سے ایک ترقی پذیر' منصفانہ' پائیدار اور ایک نئے نظم کی بنیاد تیار ہوگی۔

اس برصغیر کے بدترین نوآبادیاتی ورثے کو پاکستان میں تقدس کا درجہ دیا گیا۔ ہم پر حکمرانی وائسرائے کی روایات کے مطابق کی گئی' جس میں ایک مرکزی انتظامیہ حکومت کرتی ہے۔ قانون ساز ادارے کو جب سانس لینے کی اجازت دی گئی تو اسے ایک ربڑ اسٹیمپ کے طور پر استعمال کیا گیا۔ آزاد عدلیہ ایک ناپسندیدہ ذمہ داری قرار دی گئی اور اس کے اختیارات سلب کر لئے گئے۔ تمام اختیارات افسر شاہی اور فوج میں مرتکز ہو گئے۔ ان دونوں اداروں کی تربیت برطانوی غلامی کے دور میں ہوئی اور امریکہ نے اسے

مسلح کیا۔ اداروں سے حق رائے دہی چھین لیا گیا۔ حکومت عوام کے آگے جواب دہ نہیں رہی۔ ہمارے حکمرانوں کی بے حسی' بے حد و حساب تھی۔ تاہم مشرقی پاکستان کے بدنصیب لوگوں کو صرف یہی بات سمجھ میں آتی تھی کہ ان کے حالات کی خرابی کا سبب علاقائی تفریق تھی۔ اکثریت میں ہوتے ہوئے انہوں نے اپنے حقوق کو استعمال کرنے کی جتنی بار کوشش کی' 1954ء میں' پھر 1956؛ 1958ء اور 1968ء میں' ہر مرتبہ ان کی کوشش کو ناکام بنا دیا گیا۔ 1971ء میں ان کے ساتھ بڑی سفاکی برتی گئی۔

پاکستان کو آزادی اور وقار کے ساتھ ترقی کرنے کے لئے ضروری ہے کہ فوج اور افسر شاہی کو فی الوقت جو اختیار حاصل ہے' وہ ان سے واپس لے لیا جائے۔ ہماری افواج ملک کا دفاع کرنے کی بجائے اس پر قبضہ کرنے کی بہتر تربیت رکھتی ہیں۔ افسر شاہی کی تربیت اس طرح کی گئی ہے کہ وہ عوام کی خدمت نہیں کر سکتی' صرف ان پر حکومت کر سکتی ہے۔ ان کا غلامانہ مزاج' ان کی تحکمانہ ساخت' ان کے کم حیثیت معیارات اور انتظامی انداز فکر' یہ سب ان کے غیر ملکی مربیوں کی خدمت کے لئے نہایت مناسب تھے' لیکن ایک آزاد اور جدید قوم کے لئے ہرگز موزوں نہیں۔ لازم ہے کہ ان کو ایسے عوام پسند اداروں میں بدل دیا جائے' جن میں عام لوگوں کی شرکت ہو' جنہیں عوام بنائیں اور جو عوام کے آگے جواب دہ ہوں' جو ملک کو بچانے کی اہلیت رکھتے ہوں اور عوام کی خدمت کرنے کے قابل ہوں۔ مجھے امید ہے کہ ہندوستانی فوج کے ہاتھوں ہماری شکست' جو اتنی ہی ناکارہ ہے' اگرچہ تعداد میں زیادہ اور بھاری آلات و اوزار سے لیس ہے' ہمارے اندر تخلیق کاری اور ندرت پیدا کرے گی۔ نہ یہ کہ ہم فوج کا اور زیادہ وزن اپنے اوپر لاد لیں اور اس چربی سے ہماری افسر شاہی کی شریانیں زیادہ سخت ہو جائیں۔

اسی طرح مجھے امید ہے کہ قومی اتحاد کے حصول کی ازسر نو کوشش ہمیں عقل سے عاری مرکزیت پر آمادہ نہیں کرے گی۔ ہم آج بھی ایک متنوع آبادی والے ملک کے مالک ہیں۔ ایک تہذیب' ایک مذہب' ایک قومیت نے اور انصاف' مساوات اور آزادی کی شدید خواہش نے ہمیں آپس میں جوڑ رکھا ہے۔ پاکستان جیسی متفرق خصوصیات کے ملک "ادغام" کے یورپی نمونوں پر عمل پیرا نہیں ہوتے اور نہ یہ ممکن ہوتا ہے کہ علاقائی باشندوں کی جائز شکایات کو سختی سے کچل دیا جائے۔ علاقائی کلچر اور روایات کا احترام اور عوامی نوعیت کی قومی منصوبہ بندی کے تحت مقامی باشندوں کو زیادہ سے زیادہ حق خود اختیاری دینا' یہی اتحاد اور طاقت کی بنیادی ضرورت ہے۔

(بلیٹن آف کنسرنڈ ایشین سکالرز' سرما 1972ء)

عبرت آموز تباہی

جہاں تک پاکستان کی تاریخ کا تعلق ہے۔اب تک دو واقعات نہایت اہم گزرے ہیں۔ یہ ہیں اگست 1947ء میں اس ملک کا قیام اور دوسرا دسمبر 1971ء میں اس کی شکست۔حسن ظہیر کی کتاب (مشرقی پاکستان کی علیحدگی) جسے حال ہی میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا ہے۔ 1971ء کے بحران پر اب تک کسی پاکستانی مصنف کی سب سے زیادہ متوازن اور مستند کتاب ہے۔ میں اس پر تبصرہ بعد میں کروں گا۔فی الوقت اس مضمون میں وہ اسباق بیان کروں گا جو پاکستان کے ٹوٹنے کے حوالے سے مرتب ہوئے ہیں۔

حسن ظہیر کی اس شاندار کامیابی سے پاکستان کے پیشہ ور دانش وروں کی ناکامی واضح ہوتی ہے۔ یہاں اب تک جو سات کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں سے پانچ (چشم دید) واقعات پر مبنی ہیں' جو فوجی افسروں نے لکھیں۔ان میں کچھ تو مصنف کی غائت پوری کرتی ہیں' کچھ دوسری پوری نہیں کرتیں۔ان میں دو سیاسی تاریخیں ہیں' بالکل بے وقعت۔ایک بنگال کے ایک دانش ور نے لکھی' جو یحییٰ خاں کے مشیر تھے' دوسری کے مصنف ایک اعلیٰ سرکاری عہدیدار ہیں جو بعد میں عالم بن گئے' حسن ظہیر کی کتاب اس سلسلے کی آٹھویں ہے اور اب تک اس موضوع پر شائع ہونے والی سب سے زیادہ فکر انگیز کتاب ہے۔وہ 1990ء میں سول سروس سے ریٹائر ہوئے۔ پاکستان کے ٹوٹنے پر آج تک کوئی ایک قابل ذکر کتاب کسی پاکستانی ذی علم شخصیت نے نہیں لکھی' اس سے پاکستان کے اعلیٰ تعلیمی مدارج میں بحران کی نشاندہی ہوتی ہے۔

علم و دانش کے اس انحطاط کا ہمارے مستقبل پر بڑا اثر پڑ سکتا ہے۔کیونکہ پوری انسانی تاریخ میں معاشرے کی ترقی علم سے وابستہ رہی ہے' جب علم پر زوال آتا ہے تو تہذیبیں رو بہ زوال ہو جاتی ہیں۔معذور اور تہی دست اقوام اور تہذیبیں جب علم حاصل کرتی ہیں تو ترقی کی راہ پر چل پڑتی ہیں۔ یہ محض ہنر تک رسائی کا معاملہ نہیں ہے۔

مدبروں اور معاشرے کے اچھے رہنماؤں کی پرداخت ایسے ماحول میں ہوتی ہے جہاں افکار موجود ہوں اور تجزیے کا معمول ہو۔حسن ظہیر کی بیان کردہ تفصیلات کا مطالعہ کرتے ہوئے جو تمام تر پاکستان کے سرکاری ذرائع پر مبنی ہے' مجھ پر اس بات کا گہرا اثر ہوا کہ ہماری فیصلہ سازی اور سیاسی عمل میں تجزیے کی اہلیت اور دانش کا کس قدر فقدان ہے۔ان بیس برسوں کے دوران میں جب کہ ایک بحران آہستہ آہستہ وجود میں آنے والا تھا' تقریباً ہر سنگین مرحلے میں تفکر' تجزیے اور تاریخی شعور پر طاقت کی جبلت' حرص اور ذاتی و گروہی

مفادات حاوی ہوتے رہے۔ علم کا کام یہ ہے کہ حقیقت شناس ہونا کہ انسان کو خبردار کرے اور وہ اپنے مسائل حل کرے۔ علم بڑی حد تک ہمارے سیاسی معاملات میں اس وقت بھی ناپید تھا' جس طرح آج غائب ہے۔

اتحاد اور قومی یک جہتی کا راز اس امر میں ہے کہ بدلتی ہوئی صورت حالات کا عملاً اقرار کیا جائے۔ ریاست اور اس کے باشندوں کے درمیان رشتے اس وقت مضبوط ہوتے ہیں' جب ادارے کی سطح پر ان کے تشخص کا احترام کیا جائے اور اس کو عزت بخشی جائے۔ جو بات اس کے برعکس ہے' وہ بھی درست ہے۔ اجتماعی تشخص کو دبایا نہیں جا سکتا۔ جبراً دبانے سے دوسرے فریق کے غصے میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے جداگانہ تشخص کا احساس مضبوط اور مستحکم ہوتا ہے اور وہ بغاوت کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

پاکستان کے اتحاد کے بارے میں حسن ظہیر نے مختلف مواقع پر کہا ہے کہ وہ نہایت "نازک" اور غیر "مستحکم" ہے۔ یہ تو ایک عام مشاہدے کی بات ہے۔ لیکن ان کے بیانیے سے جو ایک غیر معمولی بات سامنے آتی ہے' وہ یہ ہے کہ پاکستان کی حکمران انتظامیہ نے اپنے عدم استحکام کا کہیں احساس نہیں کیا۔ وقت آتا اور جاتا رہا اور ان کا طرز عمل اس وقت بھی ویسا ہی تھا' جیسا آج ہے۔ اس روایتی سانڈ کی مصداق جو نازک ظروف کی دکان میں گھس گیا ہو' لوگوں کی امنگوں کو پامال کرتے رہے' ان کی شناخت کی تحریف کرتے رہے' انہوں نے قدرے کمی کے ساتھ اور اپنے آپ کو الگ رکھتے ہوئے قابل تعریف پیرائے میں ان احمقانہ خلاف ورزیوں اور گم کردہ مواقع کی تفصیل بیان کی ہے۔

عام طور پر یہ معلوم ہے کہ مرکز پسند نظریے' ادارے اور ان سے وابستہ مفادات قومی یک جہتی کے عمل کو اور سیاسی استحکام کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ مرکز پسندی ایک نوآبادیاتی نظریہ ہے۔ یہ قبضہ جمانے والوں کا ہتھیار ہے۔ قومی تعمیر کا اوزار نہیں ہے۔ ایسی ریاستوں میں جہاں مختلف قومیتیں آباد ہوں' سیاسی یک جہتی کا صریح اصول وفاقیت ہے' جس میں اقتدار بامعنی طور پر دوسروں تک منتقل ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ انڈین نیشنل کانگریس کی ناکامی تھی کہ وہ اس اصول کو سمجھ نہ سکی اور ایک ایسا اصول اختیار کیا' جس کی بنا پر 1947ء میں جنوبی ایشیا کا برصغیر پہلی مرتبہ تقسیم ہو گیا۔ مغربی پاکستان کی حکمران اشرافیہ سے اس سے بھی بڑی غلطی اس وقت ہوئی جب 1971ء میں دوسری تقسیم عمل میں آئی۔ حسن ظہیر لکھتے ہیں کہ "صوبوں میں مرکز کی مداخلتوں نے بنگال کو مستقلاً وفاق سے دور رکھا۔) 1973ء۔ 1983ء۔ 1989ء اور پھر 1994ء میں اسلام آباد کے طرز عمل سے ظاہر ہے کہ مرکز کے کارپرداز 1971ء کے اس مہیب المیے سے دوچار ہونے کے باوجود ایک بنیادی اصول کو اب تک نہیں سمجھ سکے۔

حسن ظہیر ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ وفاق سے مشرقی پاکستان کے مایوس ہونے کا عمل ہماری تاریخ کے آغاز سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ اس وقت مغربی پاکستان کے لیڈر جو نسبتاً زیادہ موافق حالات میں رہ رہے

MashalBooks.org

تھے۔ مشرق میں اصل اور مضبوط حریف کو اپنے سے الگ رکھنے اور اسے نقصان پہنچانے کے در پے ہو گئے تھے۔ دوسروں کے ساتھ وہ لیاقت علی خان کی مثال پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے حسین شہید سہروردی کے ساتھ کیا سلوک کیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ ''پاکستان کے اوائل سے ہی مخالفوں کو اپنا نشانہ بنانا سیاسی کلچر کا جز بن گیا۔ جسے حکمران جماعت ایک معمول کے تحت اکثر و بیشتر حکمرانی کے اصول کے طور پر استعمال کرتی رہی۔'' وزیراعظم بےنظیر بھٹو کو یہ بات دوسروں سے کہیں بہتر طور پر معلوم ہوگی جن پر اس مشاہدے کی صداقت مسلسل واضح ہوتی آئی ہے۔

تاریخ میں اسلام نے ایک مخالف طاقت کے طور پر ظہور کیا ہے' وہ مظلوموں کے لئے روشنی کا مینار ہے' لیکن حکمرانی کے مطالبے سیکولر مطالبے ہیں' وہ دینیات سے بمشکل ہم آہنگ ہوتے ہیں' خواہ وہ موروثی ہو یا خیالی۔ اسلام کو ایک سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کر کے سیاست داں مذہب اور سیاست دونوں کو آمروں سے کچھ کم نقصان نہیں پہنچاتے۔ حسن ظہیر نے اپنی کتاب میں شروع سے آخر تک یہ بتایا ہے کہ ایک امت اور ایک اسلامی مملکت کے نعرے کو مسلسل استعمال کرنے کی کوشش ہوتی رہی اور اسے ایک ایسے نظریے کے طور پر برتا گیا' جو حکمرانی کا جواز فراہم کرتا ہے اور مختلف عناصر کو آپس میں جوڑتا ہے۔ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے مذہب نے ایک سیاسی مقصد پورا کرنے سے انکار کر دیا۔ بڑے دیندار بنگالیوں نے بھی اسے قبول نہیں کیا۔ بالآخر مشرقی پاکستان میں سرکاری اسلام نے تشدد پسند دھڑوں کی صورت اختیار کر لی۔ یہ بدر' شمس اور جماعت کے دھڑے تھے جو مشرقی پاکستان کی مسلمان اکثریت سے کلیتاً الگ تھے۔

ریاستی حکمرانی کے باب میں جتنے بھی بحران سر اٹھاتے ہیں' ان کی تہہ میں حق حکمرانی کا جواز نمایاں طور پر موجود ہوتا ہے۔ ہمارے زمانے میں یہ جواز سیکولر نوعیت کی کامیابیوں سے حاصل ہوتا ہے۔ سطحی اعلانات سے اور مسیحائی کے دعوؤں سے نہیں۔ یہ جواز ملتا ہے اچھی حکمرانی سے' قانون کی حکومت سے' اقتصادی ترقی سے اور ان سب سے بالا مساوی انصاف سے' جو سب کو میسر آئے' اور انصاف کا سب تک پہنچنا نظر بھی آئے۔ میں محض دولت کی تقسیم کی بات نہیں کر رہا ہوں کیونکہ تیسری دنیا کے ملکوں میں وہ تو پہلے ہی کمیاب ہے۔ لیکن جہاں تقسیم کرنے کے لئے کافی دولت نہ ہو' وہاں یہ تو نظر آنا چاہیے کہ کفایت کے ساتھ سبھی یکساں طور پر گزر بسر کر رہے ہیں۔ ہمارے معاشرے کا عام فارمولا یہ ہے۔ ''وزیروں کے لئے مرسڈیز گاڑیاں' عام لوگوں کے لئے حرکت و عمل۔ ایسا فارمولا جمہوریت یا ریاست کے استحکام کو موافق نہیں آتا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے یہ اندوہناک حقیقت سامنے آئی کہ احتیاج ایک معروضی حقیقت نہیں بلکہ ذہنی کیفیت کا نام ہے۔ یہ کیفیت عام سوجھ بوجھ کو بروئے کار آنے سے روکتی ہے اور معقول فکر میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔ 1971ء کے بحرانی دور میں پاکستان کے لئے امریکہ کی مادی امداد محض برائے نام تھی' لیکن اس قلیل امداد کے مقابل ہمارے حکمرانوں کا واشنگٹن پر انتہا سے بھی زیادہ نفسیاتی انحصار تھا۔ امریکہ میں پالیسی

MashalBooks.org

بنانے والوں نے ایک حکمت عملی کے تحت غیر جانب دار رہتے ہوئے ہماری احتیاج کا پیٹ رسمی دکھاوے سے بھر دیا۔ہنری کسنجر کو جو اس سلسلے میں اصل کرشمہ ساز تھے جولائی 1971ء تک نظر آ گیا تھا کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے؟ چنانچہ انہوں نے وہائٹ ہاؤس کو حقیقت سے آگاہ کر دیا۔پھر اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔حسن ظہیر لکھتے ہیں" "اس کے باوجود یحییٰ امریکی پالیسی کی عملی حکمت کو سمجھنے میں ناکام رہے۔" قومی تحفظ کی ایک بنیادی ضرورت یہ ہے کہ فوج کو سیاست سے دور رکھا جائے۔فوجیں برسراقتدار رہتے ہوئے کچھ عرصے تک یہ دکھاتی ہیں گویا سب کچھ بالکل ٹھیک ہو' لیکن وہ سیاست میں گندے سیاست دانوں سے بھی زیادہ گندگی پھیلاتی ہیں۔پاکستان کو توڑنے کا بنیادی کام محمد ایوب خان کے دس سالہ دور حکومت میں ہوا۔ جیسا کہ حسن ظہیر لکھتے ہیں: "آزادی کے دوسرے عشرے 1969ء۔1958 سے متحدہ پاکستان کے خاتمے کا آغاز ہوا۔" خاتمہ یحییٰ خاں کے زمانے میں ہوا' جس نے مجھے مجبور کیا ہے کہ اس نقطے کو ایک بار پھر بیان کر دوں' جس کا ذکر پہلے کہیں اور بھی کیا تھا:

فوجیں حکومت میں ہوں تو جنگیں ہار دیتی ہیں۔دوسری عالمی جنگ کے بعد سے ہم نے کوئی 150 چھوٹی بڑی جنگیں دیکھی ہیں۔ان میں سے بیشتر جنگیں سویلین حکومتوں اور فوج کی قیادت میں چلنے والی حکومتوں کے درمیان ہوئیں۔ان سب جنگوں میں الجزائر سے لے کر ارجنٹائن' یونان اور یوگنڈا تک ان تمام ملکوں کو شکست ہوئی' جن میں فوج کی حکمرانی تھی اور بعض جگہ تو مثلاً پاکستان میں حکومت کو شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا۔اس صورت حال کی ایک پیچیدہ منطق ہے' جس کی وضاحت میں نے کہیں اور کی ہے۔میں اس موقع پر اسے نہیں دہراؤں گا' البتہ ایک نکتے کی خاص طور پر نشاندہی کروں گا' جس پر حسن ظہیر نے بار بار زور دیا ہے۔وہ یہ کہ سیاسی مسائل' فوجی حل سے میل نہیں کھاتے۔سپاہی جنہیں مسائل کو فوجی ذرائع سے حل کرنے کی تربیت دی جاتی ہے' جب حکومت میں ہوں تو دشوار سیاسی سوالوں کو فوجی طریقے سے حل کرنے پر مائل ہوتے ہیں۔یحییٰ نے مشرقی پاکستان میں یہی کیا۔ارجنٹائن کے جرنیلوں نے فاکلینڈ میں اور صدام حسین نے کویت میں یہی کیا۔

حسن ظہیر نے یہ کہانی بڑی دانائی اور دردمندی کے ساتھ بیان کی ہے' جن سے یہ نتائج مرتب کئے ہیں۔اپنے ابتدائیہ میں وہ پاکستان کی شکست کے ہولناک دن کو یاد کرتے ہیں کہ ان دنوں وہ ڈھاکہ کے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں مقیم تھے۔16 دسمبر کی صبح کو ابھی ناشتہ شروع نہیں ہوا تھا کہ انٹرکون میں موجود پاکستانی حکام کو انٹرنیشنل ریڈ کراس نے یہ بتایا کہ اب وہ ہندوستان کے جنگی قیدی ہیں۔یہ اذیت ناک اطلاع ان کی تشویش پر حاوی ہو گئی کہ ان کے بنگالی رفیقوں کو جو پاکستان کے وفادار تھے اور ہوٹل میں پناہ لئے بیٹھے تھے انہیں وہ تحفظ حاصل نہیں تھا جو ہندوستان کے قیدیوں کو حاصل تھا۔اس کے بعد حسن ظہیر نے ہوٹل کی گیارہویں منزل سے جنگ کے خاتمے کی افراتفری دیکھی۔ہتھیار ڈالنے کی اذیت اور ذلت' آزادی کی

MashalBooks.org

مسرت اور جوش وخروش اور امن کا امکان۔ ان کی سادہ سی نثر میں اس تاریخی تباہی کا شعور در آیا ہے' جس میں ان کی ذات فاصلے پر ہے اور اپنے وجود کی نفی کرتی ہے۔ بے پایاں انسان دوستی اور تاریخ کا شعور جو اس ملک میں نایاب ہے' یہ عبارت ملاحظہ کیجئے۔ "رمنا میدان میں ریس کورس شامیانے کے قریب بڑھتے ہوئے اندھیرے میں ہتھیار ڈالنے کی تقریب ہو رہی تھی۔ گیس کی روشنی میں ہم صرف دور سے انسانوں کے چلتے پھرتے سایوں کو دیکھ سکتے تھے۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی' مکمل ویرانی کی کیفیت اور آزردگی شہر پر طاری نظر آتی تھی۔ وہ آزادی کے لئے لڑنے والوں کی فاتحانہ واپسی کا دن تھا' وہ نو ماہ کے خوف وہراس' شدید ذہنی کشمکش اور عام لوگوں کے لئے گھر میں چھپ کر بیٹھنے سے رہائی کا دن تھا۔ دور تک امنڈتی ہوئی خلقت اپنے کارنامے پر سرشار تھی' ان کی علیحدہ تقدیر اور تشخص نے خود کو منوا لیا تھا۔ تشدد قدامت پرستی اور عوام کی خواہشوں سے انکار پر مبنی 24 سال کی تاریخ کے خلاف یہ ایک فیصلہ تھا اور یہ فیصلہ قومی مسائل کو حل کرنے کے لئے طاقت کے استعمال کے خلاف اور اس کے بے اثر ہونے پر بھی تھا۔" اس روز حسن ظہیر دو سال کے لئے جنگی قیدی بنا دیئے گئے۔

("ڈان" 17 اپریل 1994ء)

عسکریت اور ریاست

MashalBooks.org

پاکستان: پولیس ریاست کی نشانی

پاکستان میں رونما ہونے والے حالیہ واقعات تشویش ناک ہیں۔ حالانکہ اس جانب عام رجحان کا اندازہ تو اس وقت ہو گیا تھا جب دو سال پہلے بھٹو برسر اقتدار آئے تھے لیکن خرابی حالات کی رفتار غیر متوقع طور پر تیز ہو گئی ہے۔ مسٹر بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی جن تضادات میں پھنسے ہوئے ہیں وہ اب زیادہ نمایاں ہو گئے ہیں اور یہ ملک ایک بڑے اور غالباً فیصلہ کن بحران کی طرف جا رہا ہے۔ دو واضح رجحانات ابھرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں' بظاہر ایک دوسرے کے مخالف' لیکن علامتی طور پر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے۔ یہ فسطائیت اور علیحدگی پسندی کے رجحانات ہیں۔ اگرچہ علیحدگی پسندی کا خطرہ عام طور پر زیادہ نمایاں نظر آ رہا ہے' لیکن فسطائیت کا خطرہ زیادہ سنگین ہے۔ بات یہ ہے کہ علیحدگی کے اندیشے کو بنگلہ دیش کی مثال سے تقویت ملی ہے اور حزب اختلاف کے خلاف حکومت کے مسلسل الزامات سے بھی۔ اور اس پر حقیقت کا گمان حزب اختلاف کے رہنماؤں کے بیانات اور اقدامات سے ہونے لگا ہے۔ (مثلاً اجمل خٹک کا کابل میں جلا وطن ہو کر جانا) اور ساتھ ہی بلوچستان میں شورش کا برپا ہونا۔

مذکورہ دونوں رجحانات جس قدر ایک دوسرے کے ساتھ معاندانہ ہیں' اسی قدر ایک دوسرے کو تقویت دیتے ہیں۔ فسطائیت کے ابھرتے ہوئے عناصر سے اور ان کی زیادتیوں سے علیحدگی پسندوں کو اپنے وجود کے لئے سہارا ملتا ہے اور انہیں موجودہ حکومت کے رویوں سے مدد ملتی ہے۔ قومی سلامتی کے خلاف مبینہ "علیحدگی پسندی" "شر انگیزی" اور "خطرے" کے جواب میں ان کو دبانے کا عمل ہوگا اور جوں جوں آگے بڑھے گا' فسطائی عناصر پھیلتے جائیں گے اور ان کی حیثیت ایک محکم ادارے کی بن جائے گی۔ اس طرح فسطائیت میں اضافے سے علیحدگی پسندی کو زیادہ قبولیت حاصل ہوگی اور علیحدگی پسندی کی موجودگی میں فسطائیت کو اپنا جواز مل جائے گا۔ یہ مخالف عناصر جو ایک دوسرے کے دشمن ہیں' لیکن ایک دوسرے کو ختم کرنا ان کے لئے ممکن نہیں' بہر طور اس معاشرے کو اور عوام کو ضرور نقصان پہنچائیں گے' جن کی فلاح کے یہ دونوں دعوے دار ہیں۔ پاکستان میں ایک فسطائی سرکاری ڈھانچا کس طرح تیار ہو رہا ہے' اس کی نشاندہی ان چھ خاص نکات سے ہوتی ہے۔

(ا) پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کے تضادات جو اسے مجبور کرتے ہیں کہ اپنے انتخابی وعدوں اور یقین دہانیوں پر نہ صرف یہ کہ نظر ثانی کرے (جیسا کہ پارلیمانی پارٹیوں کا معمول ہے) بلکہ ان سے یکسر منحرف ہو جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پارٹی اور اس کی حکومت کے لئے عام تعاون کا رویہ گھٹتا جائے گا۔ اس کی بنا پر

MashalBooks.org

بائیں بازو کے افراد ساتھ چھوڑ جائیں گے بلکہ سوشل ڈیموکریٹ بھی الگ ہو جائیں گے۔

(ب) فوج کے اعلیٰ عہدوں غالباً فضائیہ میں بھی عہدے داروں کی نظریاتی اور طبقاتی ساخت۔

(ج) افسر شاہی کو ذاتی اقتدار کا آلہ کار بنانے کے لئے انہیں ہراساں کرنا، استعمال کرنا اور پیشہ ورانہ کردار سے دور کرنا۔ افسر شاہی جو کسی قدر ایک خود مختار اور حکمران طبقے کے اندر فوج کی نسبت سے ایک توازن پیدا کرنے والا ادارہ ہے، ہراساں کرتے کرتے اس کے کردار کو ختم کر دینا۔ یہ بات افسروں کے اس حصے پر زیادہ صادق آتی ہے جو خدمت کے شعبوں میں مامور ہیں۔ "سیکورٹی" کے شعبے پر نہیں، جس کی شاخیں برابر پھیل رہی ہیں، جنہیں زیادہ مضبوط بنایا جا رہا ہے اور "جدید تر" بھی۔

(د) غیر پنجابی علاقوں میں حزب اختلاف کی پارٹیوں کا ارتکاز (ملاحظہ کیجئے 1970ء کے انتخابی نتائج میں 1۔ الف اور ب کے مندرجات۔

(ق) امریکہ کا یہ عزم جسے شاہ ایران کا بھرپور تعاون حاصل ہے کہ پاکستان میں ایران، برازیل، چلی، یونان اور انڈونیشیا کے نمونے پر فسطائیت کے ادارے کو فروغ دیا جائے۔

(ی) زیڈ اے بھٹو کا شخصی رجحان اور ان کے عزائم، جو پیپلز پارٹی میں اور حکومت میں بھی کام کے طریقے وضع کرتے ہیں اور ہر طرح کے فیصلے انجام دیتے ہیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی کا طریق کار

پیپلز پارٹی کی حکومت کے تضادات سب کو معلوم ہیں۔ مجموعی طور پر ان سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں، وہ بھی ظاہر ہیں۔ حکمران پارٹی کے انتخابی وعدوں میں اور اصل یقین دہانیوں کے درمیان جو فرق بڑھتا جا رہا ہے، وہ اور بھی کشادہ ہو جائے گا۔ (ملاحظہ کیجئے نوٹ 2۔ پی پی پی کے پلیٹ فارم سے اقتباسات) ایسا نہیں کہ عام لوگوں سے کچھ بہت زیادہ ہی وعدے کر لئے گئے تھے بلکہ عوام کی بہت معمولی توقعات پوری کرنے کی نہ تو حکومت کے اندر خواہش پائی جاتی ہے اور نہ اہلیت موجود ہے۔ بہر حال یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ پیپلز پارٹی نے انتخابات سے پہلے جو پروپیگنڈہ کر رکھا تھا، کچھ تو اس کی وجہ سے بھی لوگوں میں خوش فہمی رفع ہونے کے ساتھ ہی لاتعلقی کا احساس پیدا ہونے کا امکان کم ہے اور اس سے زیادہ اخلاقی سطح پر دھماکہ ہونے کا اندیشہ زیادہ ہے۔ بھٹو اور ان کے فریب خوردہ اور مشتعل عوام کے درمیان خلا کو قانون نافذ کرنے والے ادارے پر کریں گے۔ تاہم عوام کے دور ہونے کے باوجود اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ ایک جدید سرمایہ دارانہ پالیسی کو صریح اور واضح طریقے سے اختیار کیا جائے گا اور حکومت کی ذمہ داریاں صرف ضابطوں کے نفاذ تک محدود رہیں گی۔ حکومت کی "سوشلسٹ" نوازی اور اقتدار کی ہوس ایسے ہر امکان کو مسترد کر دے گی۔ اب وہ ایک ایسی "ملی جلی" معیشت کے نفاذ پر آمادہ ہے، جو اپنی ساخت میں نو آبادیاتی بورژوازی وضع

کی ہےاور جسے پہلے مسترد کیا جا چکا ہے۔ یہ وہی معیشت ہےجس نے تیسری دنیا کے ملکوں میں گھانا سے انڈونیشیا تک صرف اقتصادی غارت گری اور سیاسی تباہی پھیلائی ہے۔

صریح پیرائے میں اس کے یہ نتائج نکلیں گے' سرمایہ دار طبقہ اس حکومت سے صرف مشروط تعاون کرے گا' سرمایہ لگائے گا لیکن ہاتھ روک کر اور جہاں کہیں پسند کرے گا۔ "قومی ملکیت" میں لی جانے والی صنعتوں سے اس سست رفتاری کی تلافی نہ ہو سکے گی' کیونکہ قومیانے کی جو صورت فی الوقت ہے' وہ محض اس قدر ہے کہ پہلے مالک کی جگہ' جو زیادہ سے زیادہ منافع کی خاطر بڑی مستعدی سے کام کرتا تھا' اب وہ افسر شاہی آ گئی ہے جو کاہل اور بدعنوان ہے۔ (ملاحظہ کیجئے نوٹ نمبر 3 "صنعتوں کے قومیانے کا عمل") اس کا یہ بھی نتیجہ ہو سکتا ہے کہ قومیائی گئی صنعتوں کا انتظامی عملہ سول افسروں کے مقابلے میں زیادہ بدعنوان اور فضول خرچ ہو' کیونکہ اس عملے میں سیاسی سرپرستی کی بنا پر پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی بڑی تعداد شامل ہو گی۔ چنانچہ اقتصادی عمل اگر بالکل منجمد نہیں ہوا تو اس کی "افزائش" بہت سست ہو گی۔ اس سارے عمل کا حاصل یہ ہو گا کہ حکومت عوام سے دور ہوتی جائے گی اور اس پر دباؤ بڑھتا جائے گا۔ چھوٹے بورژوا طبقے پر اس کا انحصار بڑھ جائے گا اور وہ بتدریج تحفظ امن عامہ اور دفاع کے اداروں پر تکیہ کرنے لگے گی۔

طاقت کا چہرہ

فوج اور افسر شاہی' یہ دو ادارے پاکستان میں بنیادی طور پر طاقت کے مراکز ہیں۔ انہوں نے شرکائے کار کے طور پر حکومت کی ہے اور شراکت کی شرائط وقتاً فوقتاً بدلتی آئی ہیں۔ 1958ء تک افسر شاہی کی حیثیت بڑے شریک کی تھی۔ ایوب خان کے فوجی انقلاب کے بعد اس تعلق کی نوعیت بالکل الٹ گئی' اگرچہ انتظامی امور میں فیصلے کے معاملات میں افسر شاہی کی بالادستی قائم رہی۔ (سول افسر اور فوجی سپاہی کے درمیان دوری کا احساس) یعنی ان دونوں کے مابین بد اعتمادی بھی موجود تھی اور کشیدگی بھی۔ لیکن چونکہ طاقت کا توازن قائم تھا اور ان کے اوپر ایک ہی سماجی طبقے کے افراد براجمان تھے' اس لئے ثالثی آسانی سے ہو جاتی تھی۔ (یہ طبقہ تھا چھچھورے بورژوازیوں کا جو اپنی اصل میں بورژوازی نہیں تھے بلکہ بڑے قطعات اراضی کے مالک تھے۔ نوآبادیاتی حکمرانوں کے کاسہ لیس اور انگریزیت زدہ) فوج اور سول کے ملازم ایک ہی طرح سوچتے اور ایک ہی جیسے مفادات رکھتے تھے۔ ان دونوں ہی کو اپنی "پیشہ ورانہ مہارت" پر ناز تھا۔ جن نوآبادیاتی حکمرانوں نے انہیں جنم دیا تھا' سارے قرینے وہ انہی کے سے اختیار کرتے اور برطانوی ہند کے وائسرائے کی روایت سے اپنا رشتہ قائم کرتے۔ دونوں یہ ظاہر کرتے کہ آزاد خیال' معقول اور جدید ہیں۔ وہ جتنا زیادہ میل جول دولت مند سرمایہ داروں سے رکھتے' غیر ملکیوں کے ساتھ گھل مل کر وہ کچھ کم خوش نہ

MashalBooks.org

ہوتے۔ دونوں مغرب کے طرف دار، اسلام پسند، نظم و ضبط کے باب میں مستعد، مراعات پر آمادہ، پابند جمہوریت کے حامی اور ثروت مندوں کے ساتھ تھے، یہ دونوں سیاست کے مخالف، ملاؤں کے مخالف اور کمیونسٹوں کے مخالف تھے۔

ان بورژوا فوجیوں اور افسر شاہی کے ارکان نے جو برطانیہ کی باقیات میں سے تھے 1948ء سے 1971ء تک پاکستان پر حکومت کی۔ ان کی ساری توجہ کا مرکز امن و امان کا قیام تھا، یعنی یہ کہ حالات کو جوں کا توں برقرار رکھا جائے۔ سرمایہ کاری کے لئے اور اپنے اعزہ و اقربا کی دولت میں اضافے کی خاطر حالات کا تقاضا بھی یہی تھا۔ وہ سیاست دانوں کو نہایت تحقیر سے شرانگیز قرار دیتے اور ہمیشہ انہیں جیلوں میں ڈالنے پر آمادہ رہتے اور جیل میں ان کی معاشی حیثیت کے پیش نظر وہی جگہ دیتے جو اعلیٰ نوآبادیاتی روایات کے مطابق ہوتی۔ وہ عوام سے بے رحمی کا برتاؤ کرتے، گویا ان کا وجود ہی اس لئے تھا کہ ان سے مشقت لی جائے اور ان پر حکومت کی جائے، بہت ہوتا تو وہ عوام کے ساتھ ہمدردانہ برتاؤ کرتے اور ان کی فلاح کو لازمی طور پر امیروں کے مال و متاع میں اضافے کا ذریعہ جانتے تھے۔ اس کے باوجود کہ وہ انتہائی حریص اور بے رحم تھے، وہ بہر طور جدید زمانے کے لوگ تھے، اس اعتبار سے کہ نہ تو وہ رجعت پسند تھے اور ماضی کی طرف جانا چاہتے تھے اور نہ مذہبی جنونی تھے۔ یہ عناصر جن کی جڑیں اوپر کے طبقے میں مضبوطی سے پیوست تھیں اور جو لارڈ کرزن اور کسنجر کی روایات کے امین تھے، قدامت پرستوں کے وجود کو پرانے نظام میں ہی محفوظ سمجھتے تھے اور اسی لئے کسی مسئلہ کے حل کے لئے فسطائی طریقے اختیار کرتے تھے۔

اس طبقے کی افسروں کی طاقت، جیسا کہ ظاہر ہے، فوجیوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی۔ اب ان کی جگہ ایک اور گروہ آ گیا۔ جن کی جڑیں چھوٹے بورژوازیوں میں تھیں اور جو اپنے نظریے میں فسطائی تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوج اور افسر شاہی کے مقتدر ارکان کے درمیان تضادات شدید تر ہو گئے اور ان کی شدت جو تیسری سطح پر تھی، ابھر کر اب دوسری سطح پر آ گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی طاقت کا توازن بدل رہا ہے، طاقت اب فوجیوں کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔ اس لئے نہیں کہ فوج طاقتور ہو گئی ہے، بلکہ اس لئے کہ افسر شاہی پست حوصلہ ہو چکی ہے۔ اس بارے میں جو معلومات میسر ہیں وہ نامکمل ہیں۔ (ملاحظہ کیجئے مسلح افواج پاکستان کے بارے میں بنیادی حقائق۔ نوٹ نمبر 4) چنانچہ اب جو کچھ لکھا جا رہا ہے، وہ رجحانات کا بیان ہے، جامع اور مصدقہ اعداد و شمار پر مبنی امر واقعہ نہیں۔ یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ ادھر کئی برسوں کے اندر فوجی افسروں کی سماجی، طبقاتی ساخت اور ان کی نظریاتی فکر میں تبدیلی پیدا ہوتی آئی ہے۔ سنڈرسٹ اور انڈین ملٹری اکیڈمی کے پرانے گریجویٹ کی جگہ کمان کے عہدوں پر اب وہ افسر آ گئے ہیں، جنہیں عالمی جنگ دوئم کے زمانے میں ایمرجنسی یا عارضی کمیشن مل گیا تھا۔ پرانے افسروں کا چلا جانا کچھ تو ریٹائرمنٹ کے معمول کے تحت اور کچھ

ترقیوں کی بنیاد پر تھا۔ لیکن پرانے فوجی افسروں کے زوال کا اصل سبب وہ تنزلی اور برطرفیاں تھیں' جن کے محرک سیاسی فیصلے تھے اور جس کا آغاز 55-1954ء میں ہو گیا تھا اور 1965ء اور 1971ء کی جنگوں کے نتیجے میں یہ عمل اور بھی تیز ہو گیا تھا۔ اب جو گروپ ابھر کر سامنے آیا ہے' اس میں درج ذیل خصوصیات نظر آتی ہیں۔

1۔ جنرل ہیڈکوارٹرز میں جو افسر کمان کے عہدوں اور اہم مناصب پر فائز ہیں' یعنی کرنل بریگیڈیئر اور کچھ جنرل بھی' وہ پنجاب سے ہیں۔ اعلیٰ رینک کے افسروں کے ساتھ جو اپنی اصل میں ہندوستانی مسلمان ہیں اور جن کی خصوصیات بھی تقریباً ویسی ہیں' جب ان کا اشتراک ہوتا ہے تو وہ ایک بڑی طاقت بن جاتے ہیں۔

2۔ وہ زیادہ تر چھوٹے بورژوا طبقے کے افسر ہیں' یعنی اوسط کسان گھرانے' چھوٹے مالکان اراضی اور شہری متوسط طبقے کے گھروں کے افراد۔ ان میں ایک بڑی تعداد راولپنڈی ڈویژن کے بارانی اضلاع کے لوگوں کی ہے' جنہیں نہ تو "سبز انقلاب" سے کوئی فیض پہنچا ہے اور نہ ہی صنعتی توسیع سے کچھ ملا ہے۔ ان جفاکش متوسط مالکان اراضی کو بجا طور پر اپنے برحق ہونے کا احساس ہے اور ان کی خفگی بھی جائز ہے۔ کیونکہ اپنے خیال میں انہوں نے قوم کی زیادہ خدمت کی ہے اور اس کے جواب میں انہیں افسر شاہی اور بڑے جنرل صاحبان اور متمول تاجران کو دیکھتے ہوئے کوئی صلہ نہیں ملا۔ ان کے دلوں میں اوپر کے سول عہدیداروں کے لئے ایک خاص طرح کی نفرت پائی جاتی ہے' وہ ان کی تحقیر کرتے ہیں اور انہیں ملک کے مصائب کا اسی طرح ذمہ دار قرار دیتے ہیں جس طرح ان کے پیش رو سیاست دانوں اور پارلیمانی اداروں کو مورد الزام قرار دیتے تھے۔

3۔ 1930ء اور 1940ء کے زمانے میں جو برصغیر پاک و ہند میں احتجاجی سیاست کے عروج کا زمانہ تھا' یہ بیشتر افسران کچھ کالجوں میں اور زیادہ تر اسکولوں میں زیر تعلیم رہے ہوں گے' چنانچہ فوج میں آنے سے پہلے ان کے ذہن کسی حد تک سیاست کے تجربے سے گزر چکے ہوں گے۔

4۔ ان کی تربیت اور پرداخت چونکہ پرانی روایات کے مطابق ہوئی ہے' اس لئے اپنے بزرگوں کی اقدار کا اثر اور برتری کا احساس ان میں بھی پایا جاتا ہے۔ تاہم چونکہ وہ برطانوی روایات اور آزادانہ اطوار سے واقف نہیں' اس لئے وہ دنیا کو ایک سیدھی لکیر کی طرح دیکھتے ہیں' یعنی حکم اور حکم عدولی' ڈسپلن یا بدنظمی' طاقت بمقابلہ کمزوری۔ ملک کو کس طرح چلایا جائے' اس کے لئے ان کے پاس رجمنٹ کی مثال موجود ہے۔ ڈسپلن ان کا کلیدی لفظ ہے اور اس کے نفاذ کا ذریعہ تحکم اور طاقت ہے۔

5۔ ان کا جھکاؤ مذہب کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔ انگریزی اقتدار کے پروردہ پرانے افسروں کے مقابلے میں ہمیشہ عمل کی حد تک نہ سہی لیکن جذباتی طور پر ضرور ہوتا ہے۔ وہ معاشرے کی خرابیوں کو اخلاق کے

پیرائے میں دیکھتے ہیں اور ان کے اسباب اقتصادی اور سماجی ڈھانچوں میں تلاش کرنے کی بجائے بدقسمتی زدہ عنوان اور افراد کی گناہ آلود زندگی میں ڈھونڈتے ہیں' وہ جس طبقے سے نکلتے ہیں اور جس طرح ان کی ابتدائی تربیت ہوتی ہے' اس کی بنا پر بنیاد پرستی ان کو زیادہ پرکشش لگتی ہے۔ مشرقی بنگال کے تنازعے کے دوران ان کے رویے میں اکثر زبردست مذہبی قوم پرستی اور دوسروں کے ساتھ شدید نفرت دیکھنے میں آئی۔ پاکستان میں ان انتہائی اہم طاقتور مراکز میں جماعت اسلامی کے لئے گہرے ہمدردانہ تعلق کا امکان موجود ہے۔ اگر اب موجود نہیں تو بہت جلد ہو جائے گا' کیونکہ یہ تجزیہ اگر درست ہے تو جماعت اپنی قبولیت کا دائرہ پھیلا رہی ہوگی۔ اپنے پروگرام کو "جدید" خطوط پر مرتب کر رہی ہوگی تا کہ اس میں مناسب کشش پیدا ہو سکے اور ایک نئی استبدادی ریاست کے لئے نظریہ فراہم ہو سکے۔

6۔ ان اعلیٰ فوجی عہدیداروں کی اکثریت نے نہ سہی' لیکن ایک بڑی تعداد نے کچھ امریکی تربیت بھی حاصل کی ہوگی۔ امریکہ میں نصابی تربیت کی بدولت اور ماگ (MAAG) اور میپ (MAP) سے روابط کی بنا پر ان کے اندر امریکہ کی ٹیکنالوجی کے لئے احترام اور ہتھیاروں کے موجودہ نظام کے حصول کی خواہش اور ایسے معاہدوں کے لئے ہمدردی' جو ان ہتھیاروں کے حصول میں مددگار ہوں' ضرور پیدا ہوگی۔ ماگ ملٹری اسسٹنس اور ایڈوائیزری گروپ (Military Assistance & Advisory Group) کا مخفف ہے۔ یہ فوجی ادارہ اکتوبر 1954ء میں قائم ہوا تھا اور میپ سے مراد ملٹری اسٹنس پروگرام (Military Assistance Program) اس بارے میں یہ حقیقت بھی یاد رکھنے کی ہے کہ پاکستان اور امریکہ کے درمیان بیس سالہ فوجی اتحاد کے باعث پاکستان کے فوجی کمانڈروں اور امریکہ کے اداروں اور افراد کے درمیان روابط پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ وہی افراد ہیں جنہوں نے حالیہ برسوں میں برازیل' یونان اور چلی میں فوجی بغاوتوں کو ہوا دی تھی۔ پاکستانی فوج کا نیم رخ آج کم و بیش برازیل اور یونان کے فوجی دھڑے بازوں سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن خوف و ہراس کی یہ وجہ کافی نہیں ہے۔ اوپر جو نقشہ پیش کیا گیا ہے' آج دنیا کی بہت سی فوجوں کا نقشہ اسی سے ملتا جلتا ہے۔ فیصلہ کن عنصر تو سیاسی حالات ہیں۔ یعنی حالات کا پیدا کردہ جبر' اور ایسے کسی قبضے کے موزوں مواقع اور وہ حلقے جہاں مواقع مددگار ہوں اور مزاحمت جو ان حالات میں پیدا ہو سکتی ہے۔ اس سطح پر آ کر دیکھیں تو پاکستان میں حالات نہایت تشویش انگیز ہیں۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ایک دائیں بازو کی فوجی آمریت کی نشوونما کے لئے سیاسی حالات بہت سازگار ہیں۔

7۔ اس ماحول کا ایک عنصر فوجی افسروں کا موڈ اور ان کی فکر کا انداز بھی ہے۔ ان کی سیاسی ترجیحات اور رویے کیا ہیں۔ یہ معلوم کرنا اور باضابطہ انداز سے چھان بین کرنا' ممکن نہیں ہے۔ البتہ غیر رسمی بات چیت کے دوران یہ معلوم ہوا ہے کہ ایک ایسا رویہ کام کر رہا ہے جو اٹھارہ سال پہلے کے طرز عمل سے قطعی مختلف ہے۔ گفتگو کے دوران وہ بڑے خلوص سے "پیشہ ورانہ" اہلیت کی بات کریں گے جو ایک سپاہی کا سب سے

MashalBooks.org

بڑا وصف ہے اور یہ کہ فوج ایک "غیر سیاسی" ادارہ ہے اور اسے یہی ہونا چاہیے اور اس خواہش کا اظہار کہ ملک میں حکومت سول حکام کو کرنی چاہیے۔ مسلح افواج کو بیرکوں میں اور سرحدوں پر ہونا چاہئے اور ان کو رسد بخوبی پہنچنی چاہیے۔ لیکن ان جذبات اور تلقین کی تہہ میں چھپا ہوا ان کا غصہ غیر معمولی تشویش اور دبی ہوئی خفگی صاف محسوس کی جا سکتی ہے۔ ایک ایسی فوج کے لئے جسے اپنی روایات پر بڑا ناز ہو اور جسے اپنے اعلیٰ اوصاف پر اتنا اعتماد ہو' پچھلے 15 سال بڑے اذیت ناک ثابت ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا: "1948ء میں ایک جنگ چھڑی' جو بے نتیجہ رہی' 1965ء میں ایک جنگ لڑی' جو کسی فیصلے تک نہ پہنچ سکی اور 1971ء میں انتہائی رسوا کن شکست سے دوچار ہوئے۔ اس نے قومی بجٹ کا سب سے بڑا حصہ اپنے اوپر خرچ کیا لیکن ملک کا دفاع کرنے میں ناکام رہے۔" (دفاعی اخراجات کے بارے میں جو 1949ء سے 1974ء تک پھیلے ہوئے ہیں' نوٹ نمبر 5 ملاحظہ کیجئے۔)

8۔ یہ بجائے خود بہت بڑی بات ہے' لیکن زخم پر نمک تو اس وقت چھڑکا جاتا ہے جب لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان ناکامیوں کی ذمہ دار بہرطور پاکستان کی فوج ہے۔ فوجی افسروں کا موقف یہ ہے کہ 1958ء سے 1971ء تک اس زمانے میں بھی جب فوج مبینہ طور پر برسراقتدار تھی' سول عہدیدار ہی حکومت کر رہے تھے۔ یہ فوج کی غلطیاں نہ تھیں۔ بلکہ سیاسی فیصلے تھے جو آئندہ دعوؤں کے موجب بنے اور ناکامیاں درپیش ہوئیں' جن کا ذمہ دار فوج کو قرار دیا جا رہا ہے۔ ایک عام یقین یہ ہے کہ فوج کی اجتماعی تقدیر سیاسی فیصلوں کے تحت مرتب ہوئی' جس کا ذمہ دار اب فوج کو سمجھا جاتا ہے حالانکہ انہیں ان فیصلوں پر کوئی اختیار نہ تھا۔ فوجی حکام کے لئے وہ تو حالات کا جبر تھا۔ وہ کچھ اس طرح سوچتے ہیں کہ فوج کو 1958ء میں حکومت پر قبضہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن کمانڈر انچیف نے قومی مفاد میں اگر یہ اقدام کر ہی لیا تھا تو حکومت بھی فوج کو ہی کرنی چاہیے تھی' بجائے اس کے کہ وہ بددیانت سول افسروں اور سیاست دانوں پر تحفظ کا سایہ بن جاتی۔ آخر "ہم نے مارشل لاء کے ابتدائی تین چار مہینوں کے دوران میں یہ تو دکھا دیا تھا کہ حکومت اس طرح کی جاتی ہے۔" (یعنی 1958ء میں ایوب کی فوجی آمریت کے بعد)

9۔ دیگر الفاظ میں اول تو لازماً اس کی نوبت نہیں آئے گی' لیکن اگر ایسا کرنا پڑا تو آئندہ وہ پہلے کی سی بات نہیں ہوگی۔ بلکہ فوجی حکام پورے عزم اور ڈسپلن کے ساتھ اپنا "مشن" براہ راست طور پر انجام دیں گے۔ اگر موجودہ حکومت نے ایک قومی سوشلسٹ پولیس ریاست کے قیام کی جانب نہایت ہوشیاری اور تیز رفتاری کے ساتھ پیش قدمی کی تو شاید "لازمی نوبت" نہ آئے۔ اگر اس نے اپنی موجودہ پالیسیوں کے برعکس اقتدار کی مرکزیت کا فیصلہ کیا' سیاست کو اپنی شخصیت کے تابع بنایا اور سیاسی مخالفوں کو اپنا تابع بنانا چاہا تو گویا ایک موقع ہاتھ لگا تھا' وہ جاتا رہا۔ لیکن موجودہ طرز حکومت کو جاری رکھتے ہوئے اگر نتیجہ خلفشار اور مختلف سمتوں سے مزاحمت کی صورت میں نکلا' جس کا امکان بہت زیادہ ہے تو موقع اور "لازمی ضرورت" دونوں

کے بموجب فوجی مداخلت یقینی ہو جائے گی۔

زوال آمادہ افسر شاہی

جمہوریت یا انصاف دونوں کے لئے افسر شاہی شاید ہی کبھی سازگار رہی ہو اور پاکستان میں تو خاص طور پر اس کی حیثیت نوآبادیاتی افسر شاہی کی ہے جو حاکمیت کی خوگر مغرور اور لاتعلق رہنے والی ہے۔ شاید ہی وہ کسی تعریف کی مستحق ہوگی۔ تاہم اس نے برطانیہ سے اور ہماری اپنی جاگیردارانہ روایات سے ایک پرانے رکھ رکھاؤ اور متمدن رویے کا انداز سیکھا ہے۔ ایوب آمریت کے کردار میں ترقی پیدا ہوئی تو اس کا فیصلہ کن نہ سہی لیکن ایک اہم عنصر غالباً یہ بھی تھا۔ لیکن اب یہ امکان نہیں کہ افسر شاہی فوجی حکومت کو شہری معمولات کی طرف لانے میں کوئی کردار ادا کرے گی۔ اس کی بہت سی وجوہ ہیں۔

پہلی بات تو یہ کہ فوج اور افسر شاہی کے سربراہوں میں جو مفاہمت تھی اور جس کی بدولت ان کے درمیان آسانی سے اتحاد بن گیا تھا' اب اس میں شدید ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے۔ اب ان کے درمیان تفریق بڑے پیمانے پر آ گئی ہے۔ طبقاتی تعلق کا فرق' تعلیم کی سطح کا اختلاف اور اعلیٰ سول افسروں اور فوج کے بڑے عہدیداروں کے درمیان زاویہ نظر کا اختلاف ہے۔ ان دونوں کے درمیان تضادات معمولی سطح کے تھے اب یہ دوسرے درجے پر آ گئے ہیں۔ لہٰذا ان کا حل ہونا دشوار ہے۔ برابر کی شراکت کی بجائے اب اس کا زیادہ امکان ہے کہ ایک کی حیثیت دوسرے کے تابع ہو جائے۔ اس کا اظہار سول سروس کے خلاف فوجی افسروں کے بگڑتے ہوئے موڈ سے ہو جاتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ مذکورہ دونوں اداروں کے درمیان طاقت کا توازن تبدیل ہو رہا ہے۔ افسر شاہی نہایت تیزی کے ساتھ اپنے درمیان ہم آہنگی اور یک جہتی سے محروم ہو رہی ہے اور حوصلہ ہار رہی ہے۔ کیونکہ مسٹر بھٹو نے اس کے اندر بڑی تعداد میں ''پیشہ ور'' اور ''سیاسی'' عناصر کو بھرنا شروع کر دیا ہے۔ یعنی اس میں پارٹی کے وفادار کارکن اور مسٹر بھٹو کے اپنے پسندیدہ افراد' جن کی صلاحیت محدود اور سیاسی کردار مشکوک ہیں' بھر لئے جائیں گے۔ افسر شاہی دل شکستہ اور مایوس' اس لئے بھی ہے کہ مسٹر بھٹو نے ان پر اچانک حملہ کیا ہے اور مقررہ کارروائی کے بغیر کیا ہے' گویا ان کا فیصلہ ہی یہ ہو کہ سزا چند کو دی جائے لیکن دہشت میں مبتلا سبھی کو رکھا جائے۔ (ملاحظہ کیجئے' نوٹ 6)

تیسری بات یہ کہ بہ اعتبار مجموعی خود سول سروس میں عدم توازن اور کشیدگی تیزی کے ساتھ بڑھ جائے گی' کیونکہ خود ان کے درمیان تفریق سول ملازمت اور سیکورٹی کے عملے کی سطح پر موجود ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ افسر شاہی کے اندر سیکورٹی کے شعبے میں توسیع ہو رہی ہے اور اسے جدید تر بنایا جا رہا ہے۔ اس کے عملے میں اضافے اور اہلیت اور اختیارات میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ افسر شاہی کو شہری زندگی کے اندر فوجی طور طریقوں کو متعارف کرانے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ اور اب جو پولیس

MashalBooks.org

اسٹیٹ بتدریج وجود میں آ رہی ہے' اس میں قومی تحفظ کا شعبہ بلا شبہ ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت اختیار کر لے گا۔ اس کو ایک تیسرے فریق سے بھی مدد ملے گی۔ یہ افسروں کا ایک نیا گروہ ہے' جن کا مفاد اس "نئے نظام" کے داؤ پر لگا ہوا ہے۔ یہ ہے "قومیائی" گئی صنعتوں کے افسروں کا گروہ۔

حزب اختلاف

حزب اختلاف کی جماعتیں اپنی موجودہ ساخت کی بنا پر ایک پولیس ریاست کی تشکیل میں زیادہ مزاحمت پیش نہ کر سکیں گی۔ یہ انتخابی پارٹیاں ہیں' تنظیم سازی اور مزاحمت سے زیادہ پبلک جلسہ جمانے اور بلند بانگ تقریریں کرنے والی پارٹیاں۔ ان کی بڑی تعداد یا تو نظریاتی طور پر رجعت پسند ہے یا اپنے کردار میں مقتدر جماعت سے مختلف شناخت نہیں رکھتی۔ لہٰذا' امکان اس بات کا ہے کہ پیش قدمی اور مزاحمت کی حکمت عملی اختیار کرنے کی بجائے وہ رسمی احتجاج اور سمجھانے کا طریقہ اختیار کرے گی۔ ایک سفاک حکومت کے لئے ایسی حزب اختلاف ایک آسان ہدف ثابت ہوتی ہے۔ قرین امکان یہ ہے کہ مسٹر بھٹو کبھی اسے بہلا پھسلا کر راضی کریں گے' کبھی ڈرائیں دھمکائیں گے' اور اس طرح اپنے مخالفوں کو سمجھوتے پر آمادہ کریں گے۔ انہیں عام لوگوں سے کاٹ دیں گے اور انجام کار اکا دکا شورشیں بھی برپا ہوں گی۔

یہ حقیقت کہ حزب اختلاف کا مرکز غیر پنجابی صوبے میں موجودہ صورت حال میں ایک خطرناک بات ہے۔ ایک مفسدانہ منطق کام کر رہی ہے۔ جسے اگر بڑھنے دیا گیا تو اس سے پاکستان کو زیادہ نقصان اور اس سے بھی زیادہ نقصان عوام کو ہوگا' جن کے مصائب میں اضافہ ہو جائے گا۔ ہمیں یہ ماننے میں تامل ہے کہ اس وقت صوبہ سرحد اور بلوچستان میں علیحدگی کی سنجیدہ تحریکیں جاری ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ علیحدگی کو ہی ایک جائز حکمت عملی سمجھا جانے لگے اور یہی لازمی انتخاب بن جائے اور یقیناً یہی ہوگا' اگر سیاست دانوں نے خاص طور پر ان کے مقتدر افراد نے اپنے ذاتی سیاسی مفادات کی خاطر نسلی اور علاقائی تفریق کو استعمال کرنا شروع کیا اور اگر عوام کو ان کے جائز حقوق سے محروم رکھا گیا اور آئین کی بجائے تشدد کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ گزشتہ دو سال کے واقعات اشارہ کر رہے ہیں کہ یہ عمل شروع ہو چکا ہے۔ اس کی ذمہ داری بڑی حد تک مسٹر بھٹو پر عائد ہوتی ہے۔ یہ فیصلے سیاسی پارٹیوں کی ترجیحات سے متاثر نہیں۔ نیپ (نیشنل عوامی پارٹی) کی قیادت' تنظیمی ہیئت یا پروگرام کے سلسلے میں پاکستان پیپلز پارٹی سے کچھ بہتر نہیں۔ اپنے گزشتہ دورے (جون 1972ء) میں یہ بات میرے علم میں آئی کہ صوبہ سرحد اور بلوچستان کی حکومتیں' عوام کے حقوق اور ان کی فلاح سے زیادہ اپنے جاگیردار سرپرستوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ انصاف دینے سے انہیں کوئی واسطہ نہیں۔ نظم وضبط کے نفاذ پر بڑا زور ہے۔ البتہ یہ بات ماننی پڑے گی کہ علیحدگی کے سوال پر نیپ کے رہنماؤں کو مسٹر بھٹو اور ان کے آدمی اکثر ہی آگے دھکیلتے رہتے ہیں۔ (ملاحظہ کیجئے' نوٹ نمبر 8) اور ان رہنماؤں نے اب

MashalBooks.org

تک تو وزیر اعظم سے زیادہ ذمہ دارانہ احساس اور زیادہ بصیرت سے کام لیا ہے۔ ان کے خلاف علیحدگی پسندی اور علیحدگی پر مبنی سرگرمیوں کے جو سنگین الزامات لگائے جاتے ہیں' شواہد سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ ایسے سنگین الزامات اتنی آسانی سے لگا دینا' انتہائی غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ یہ الزامات حزب اختلاف کے ممتاز رہنماؤں پر عائد کئے گئے ہیں' گویا علیحدگی پسندی کو ایک متبادل سیاسی حل کے طور پر پیش کرنا اور اسے اعتبار عطا کرنا ہے۔

اس طرح مسٹر بھٹو نے جس طرح اپنی عیارانہ پینترے بازی سے صوبہ سرحد میں نیپ کی حکومت کا صفایا کر دیا' اسے کوئی بھی ایماندار آدمی اتحاد اور ادغام کے مقاصد کے لئے جائز اور برحق قرار نہیں دے گا' پھر بلوچستان میں نیپ کی وزارت کو جس غلط طور پر برطرف کیا گیا ہے' اس سے کوئی اختلاف نہیں کرے گا۔ (ملاحظہ کیجئے' نوٹ 9) ان دنوں تبدیلی حالات کے بعد فوجی حکومت سے' پختونوں اور بلوچوں کی بداعتمادی بڑھ گئی ہوگی اور ان کی شکایات میں اضافہ ہو گیا ہوگا۔ بلوچستان میں ہونے والی حالیہ فوجی کارروائی کو وہی لوگ علیحدگی پسندی کے خلاف جنگ قرار دیں گے' جن کی آنکھیں سرکاری پروپیگنڈہ نے بند کر دی ہیں یا جو مسٹر بھٹو پر اندھا عقیدہ رکھتے ہیں۔ (ملاحظہ کیجئے' نوٹ نمبر 10) انتہائی بری بات یہ ہوگی کہ فوجی کارروائی پاکستانی معاشرے کا ایک رستا ہوا زخم بن جائے۔ مختصر دورانیے میں اس کا فائدہ مسٹر بھٹو کو ہوگا۔ طویل دورانیے میں ان کے چھوٹے سے سیاسی فائدے کی خاطر پاکستان مصیبت میں مبتلا ہوگا۔

امید کرنی چاہیے کہ مسٹر بھٹو یہ محسوس کریں گے کہ ان کی وقتی حکمت عملی جو یقیناً ان کی ذاتی کامیابیوں کا موجب ہوتی ہے ملک کو مستقل طور پر صدمے سے دوچار کر سکتی ہے۔ پاکستان میں فطری طور پر ایک علاقائی اور لسانی تنوع پایا جاتا ہے اور جن تہذیبوں سے مل کر اس کی تشکیل ہوئی ہے' وہ ناقابل شکست ہیں۔ تاریخ اور حالیہ دور میں کروشیا' برما' ناگالینڈ' کرد اور شان کی مثالیں موجود ہیں' جن سے ظاہر ہے کہ حکومتی کوششیں ان کے عوام کو دبانے اور

تابع فرمان بنانے میں ناکام ہو چکی ہیں۔ اس کوشش میں انسانی جانوں کی اور مادی وسائل کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہے اور جب تک پالیسی میں بنیادی تبدیلی نہ کی جائے' مدافعت کی صورت ہر مرتبہ نئے سرے سے ابھرتی ہے۔ دوسری طرف اگر مقامی خودمختاری اور تہذیبی امنگوں کے احترام کی پالیسی اختیار کی جائے جو اقتصادی ادغام اور جمہوری شراکت کی حدود میں ہو' (قومی منصوبہ بندی اور تعمیر نو کے ذریعے) تو اس سے ترقی اور اتحاد میں اضافہ ہوگا۔

یہ بات بھی یکساں طور پر درست ہے کہ علیحدگی کی تحریکیں اپنے اعلانیہ مقصد میں بمشکل کبھی کامیاب ہوئی ہیں۔ بنگلہ دیشیوں کو غیر معمولی فائدے حاصل تھے۔ اس صدی میں جو علیحدگی کی تحریکوں سے ابھری ہوئی ہے' کامیابی کی یہ ایک ہی مثال ہے۔ اس کے علاوہ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں جغرافیائی'

MashalBooks.org

اقتصادی اور تہذیبی ساخت' علیحدگی کے حق میں خاص طور پر بہت سازگار ہے۔ تاہم یہ بات انتہائی خطرناک بلکہ تباہ کن ہوگی' اگر حکومت نے اور مقتدر جماعت نے مرکزیت کے نفاذ کی خاطر تفرقہ اندازی' تصادم اور تشدد کی پالیسی پر عمل کیا۔ اس طرح یہ بھی امید کی جاتی ہے کہ مخالف پارٹیاں اس جال میں نہیں پھنسیں گی جو ان کی طرف پھینکا گیا ہے۔ انہیں یہ جان لینا چاہیے کہ اگر ان کو علیحدگی اور علاقوں کی خاطر تصادم پر آمادہ کر دیا گیا تو اس سے ان کو کم اور مرکزی حکومت کے محدود مقاصد کو زیادہ فائدہ پہنچے گا۔

ان نیک امیدوں کے باوجود حقائق نہایت تاریک اور اندوہناک ہیں۔ ان میں یہ امر بھی شامل ہے کہ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں حزب اختلاف کو علیحدگی کی طرف ابھارا جا رہا ہے اور جب وہ ایک بار کنارے پر پہنچ گیا تو ممکن ہے کہ ایک بڑی آبادی ان کے ساتھ مل جائے۔ پھر یوں ہے کہ جب مارچ 1973ء میں پنڈی میں تصادم ہوا' اور اس سے پہلے کراچی میں مزدوروں پر فائرنگ ہوئی اور جب سے وفاقی حکومت اور مقتدر جماعت نے صوبائی کشیدگی (پنجابی' پٹھان اور بلوچ پٹھان وغیرہ) کو اپنے حق میں استعمال کرنا شروع کیا ہے اور بلوچستان میں شورش اور ساتھ ہی فوجی کارروائی کا آغاز ہوا ہے' تب ہی سے سیاست اور معیشت کے درمیان ان عوامل کی بنا پر منفی رشتے پیدا ہونے لگے ہیں۔ (جہاں مسٹر بھٹو کی سیاسی کاوش یہ ہے کہ اختلاف رکھنے والے صوبوں میں سیاسی ہم آہنگی پیدا ہو' وہیں وفاق اور صوبوں کی حکومتیں تفرقے اور صوبائیت کو ہوا دے رہی ہیں) آخر میں یہ بات کہ افغانستان' ہندوستان اور سوویت روس اور ایران پاکستان میں علیحدگی کے رجحانات کو تقویت دینے پر تیار بیٹھے ہیں' حقیقی اور نہایت قوی غیر ملکی مفادات اپنا کام کر رہے ہیں۔

اب تک تو حکومت اور مقتدر جماعت ہی اس صورت حالات کو آگے لے جا رہی ہے۔ تاہم حزب اختلاف کو بھی اس سے تمام تر بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ نیپ کو اصل ہدف بنایا گیا ہے' لیکن چونکہ یہ ایک علاقائی بنیاد پر قائم ہے' لہٰذا اس معاملے میں پورے ملک سے باعتبار مجموعی مفاہمت اور جذبہ امداد حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ قومی اعتبار سے وہ تنہا ہوتی ہوئی نظر آتی ہے اور صوبوں میں شکست خوردہ اور مایوس۔ اگر مزید دباؤ ڈالا گیا تو ممکن ہے کہ اس کے لیڈر مسٹر بھٹو کے پھینکے ہوئے دام میں آ جائیں اور علیحدگی کے راستے پر چل پڑیں۔ صوبوں میں کشیدگی اور بداعتمادی کی جو صورت ہے' اس کے پیش نظر عام لوگوں کی امداد سے محروم نہیں رہیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ ملک متحارب دھڑوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ آبادی میں تصادم کی کیفیت طبقاتی جدوجہد پر حاوی ہو جائے گی۔ استدلال اور انقلاب کی آوازیں' رجعت اور بغاوت کے شور و شغب میں دب جائیں گی۔ ان حالات میں کسی چیز کو فروغ حاصل نہیں ہوگا' سوائے دفاع اور سیکورٹی کے اداروں کے۔

واشنگٹن ترقی پذیر فسطائیت کی مدد کرتا ہے۔ امکان اس بات کا ہے کہ امریکہ فسطائیت کے رجحان کی

MashalBooks.org

حوصلہ افزائی کرے گا' کیونکہ کسنجر اور نکسن کی سربراہی میں بننے والی امریکی خارجہ پالیسیاں ترجیحی طور پر اس سے میل کھاتی ہیں۔ امریکہ نے یونان' ترکی' برازیل اور چلی میں ان کی فسطائی حکومتوں کو آگے بڑھانے اور امداد دینے میں جو کردار ادا کیا ہے' اس کا بغور تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ واشنگٹن میں فسطائیت کے لئے ایک شعوری ترجیح پائی جاتی ہے۔ ایسی فسطائیت جسے ترقی پذیر کہا جاسکتا ہے' اسپین' پرتگال اور جنوبی افریقہ اور اب برازیل اور ایران بھی موزونیت اور کامیابی کی اعلیٰ مثال کے طور پر دیکھے جاتے ہیں کہ پسماندہ ریاستوں کا پولیس اسٹیٹ ہونا ہی ضروری ہے۔ جہاں اقتصادی ترقی ہو اور ریاست کو (عوامی) مقبولیت حاصل ہو۔

واشنگٹن کا انتخاب عملی صورت حال پر مبنی ہے۔ اس کی بنیاد استحکام کی خواہش پر ہے' لیکن انجام کار اس کے نظریاتی نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ استحکام حاصل کرنے کی کوشش میں اس زمانے کے انتہائی ظالمانہ نظام کو بھی کوئی ٹھکانہ مل جائے گا لہٰذا استحکام قائم کرنے کے لئے ایک نظریہ چاہیے اور ایک پروگرام چاہیے' جس میں اتنی کشش ہو کہ عام لوگوں میں' معاشرتی فاصلوں کے باوجود جائز اور قابل قبول ثابت ہو۔

پاکستان میں اس وقت فسطائیت کو آگے بڑھانے والے دو نہایت قومی عنصر موجود ہیں' ایک بنیاد پرستی' دوسرے قومی سوشلزم۔ امریکہ جسے شاہ ایران کی بھرپور حمایت حاصل ہے' اپنے لئے تمام راستے کھلے رکھنے کے لئے بیک وقت ان دونوں رجحانات کی حوصلہ افزائی کرے گا۔ اول موجودہ حکومت ایک ایسی ریاست بنانے کے لئے جس میں ایک ہی جماعت کی حکمرانی ہو' غالباً ترغیب ملتے ہی اسے قبول کرلے گا اور اس کا شکار ہو جائے گا۔ اگر ایسا ہوا اور اس امر کے کچھ شواہد موجود ہیں کہ یہ عمل شروع ہو چکا ہے تو پی پی پی نمونے کے ایک فسطائی ڈھانچے میں ڈھل جائے گی اور اس کے ساتھ ہی ریاست پولیس کے عملے میں توسیع اور فوج کے بڑھتے ہوئے کردار اور اس کی طاقت میں اضافے کی بنا پر بتدریج فوجی خطوط میں ڈھل جائے گی۔ اس کے بعد بائیں بازو کی طرف واپسی کی امید نہیں کی جائے گی۔ اس کے باوجود کہ نام بائیں بازو کا ہوگا اور ادارے قومی ملکیت میں لئے جائیں گے' اس کی نفی میں یہ کہا جائے گا کہ پارٹی کے اندر نیشنل سوشلزم کا بیج جو موجودہ تیسری دنیا کے مطابق ہو' پایا جاتا ہے۔

دوسرا امکان یہ ہے کہ ایک اور قومی حکومت' جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے آجائے جو اپنے کردار میں فسطائی ہو۔ بھٹو کی کوشش ہے کہ ساری قوت اپنے ہاتھ میں سمیٹ لے' اس کوشش کے ساتھ ہی لوگوں کے رہن سہن کا معیار تیزی سے گر رہا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ فسادات کی صورت میں نکلے گا اور حکومت کو خوفناک چیلنجوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ یہ صورت حال فوجی بغاوت کے حالات کو سازگار بنائے گی اور اس کے مواقع پیدا کرے گی۔ اگر ایسا ہوا تو ایوب خان کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے یہ افسر اپنے انتخابی حلقوں میں اور اپنی تائید کے لئے فوج سے باہر دیکھنا شروع کر دیں گے۔ لیکن ان کی معاشرت اور معاشرتی رشتے کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جائے گا کہ ان کی مطلوبہ ضرورتیں بنیادی جمہوریتوں کے ذریعے نہیں بلکہ اسلامی بنیاد پرستی کے

MashalBooks.org

تحت پوری ہوں گی۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ جماعت اسلامی ان کو نظریہ فراہم کرے گی اور تحریک استقلال یا پرانی مسلم لیگ کے مساوی کسی جماعت کے مقابلے میں ان کے جائز اور برحق ہونے کا پروپیگنڈہ کرے گی۔ (ملاحظہ کیجئے' نوٹ 11)

اگر یہ تجزیہ درست ہے اور سیاسی فہم رکھنے والوں نے واشنگٹن سے اچھرہ تک (جو ضلع لاہور کے بورژوازیوں کے اس علاقے میں امریکہ نواز دائیں بازو کی جماعت اسلامی کا ہیڈ کوارٹر ہے) ہوا کا رخ پہچان لیا ہے' تو مجھے یہ دکھائی دیتا ہے کہ جماعت اپنے نظریے کو "جدید" بنائے گی' جیسا کہ اس بارے میں اس کی کوششیں ابھی سے ہیں' خود کو زیادہ قابل قبول بنائے گی اور اپنے سماجی اور اقتصادی اعلانات کے "ترقی پسندانہ" پہلوؤں کو زیادہ نمایاں کرے گی۔ تبدیلی کے اس عمل کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی پہلے سے زیادہ قدامت پسند اور رجعتی ہو جائے گی۔

بھٹو' ایک مسئلہ کے طور پر

بحرانی صورت حال میں مسٹر بھٹو کی شخصیت اہم ہو جاتی ہے' کیونکہ اس شخصیت میں پیپلز پارٹی کا حال شامل ہے اور اس کے مستقبل کی نمائندگی کرتا ہے اور ساتھ ہی حکومت کی بھی۔ علاوہ ازیں ایک نہایت سنگین دور میں وہ برسرحکومت آئے ہیں' جہاں ان کے فیصلے اور اقدامات بہت گہرے نتائج کے حامل ہوں گے۔

وہ ایک باہنر اور سرکشیدہ شخص ہیں اور اپنے قوم پرستی کے وعدوں میں مخلص ہیں۔ ان دشوار حالات میں جن کے بعد بنگلہ دیش وجود میں آیا' ان کی کامیابیاں مستعدد ہیں۔ وہ ایک ہی دستیاب آدمی تھے' جو ایک شکست خوردہ ٹوٹے ہوئے پاکستان کی حکومت کے سربراہ ہو سکتے تھے اور اسے ممکنہ انتشار اور خلفشار سے بچا سکتے تھے۔ ہندوستان سے معاملہ کرنے میں انہوں نے بڑے تحمل' مہارت اور لچکدار رویے کا ثبوت دیا۔ مشرق وسطیٰ کی سیاست میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں' انہوں نے بہت جلد اسے بھانپ لیا اور ان کی اس زود فہمی سے پاکستان کی حیثیت میں اضافہ ہوا۔

لیکن ان کامیابیوں کے بالکل برعکس ملک کے اندر کی سیاست میں ان کی بے بصیرتی ہے۔ یہ کچھ بے سبب نہیں کہ مسٹر بھٹو کا تعلق ایک ایسے سماجی طبقے اور نظریاتی روایات سے ہے' جو تضادات پیدا کرنے کے لئے بدنام ہے۔ ایک ایسا شخص جو سوئیکارنو اور نکرومہ' اتاترک اور جمال ناصر کے سانچوں میں ڈھلا ہوا ہو' اندیشہ ہے کہ وہ پاکستان کے لئے اس سے زیادہ مصائب پیدا کرے گا جو ان شخصیتوں نے انڈونیشیا اور گھانا' ترکی اور مصر کے لئے پیدا کیں۔ اس لئے کہ رہبر آزادی کے طور پر ان کا جو شاندار کردار تھا' بھٹو ایسے کردار کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ ان کا کردار بت شکن کا تھا۔ وہ مادار گھروں میں پیدا ہوئے' انہوں نے بے اندازہ

قربانیاں دیں اور مصائب برداشت کئے۔اس کے برعکس مسٹر بھٹو کے یہاں دوسرے رجحانات ہیں۔ان کی بےلگام انانیت' نظریاتی پینترے بازی' طاقت کی ہوس اور سیاسی مرحلہ وار عمل سے آنکھ بند رکھنے کی عادت ان کی کئی لاحاصل پالیسیوں کا سبب بن گئی۔نکسن کے ساتھ ان کا تقابل بہت موزوں ہے۔بھٹو میں بھی نکسن کی طرح طاقت کے حصول کی فطری خواہش پائی جاتی ہے۔ان میں بھی ایک سیلز مین کی جبلت موجود ہے اور موقع پرستی کی غیر فطری حس بھی۔نکسن کی طرح وہ بھی جیت کے بڑے شوقین ہیں' اس جواری کی طرح' جس نے کچھ بھی داؤ پر نہیں لگایا۔

بھٹو سوشل ڈیموکریٹ نہیں ہیں' وہ ٹوری (قدامت پسند) بھی نہیں ہیں۔وہ فسطائی بھی نہیں' وہ صرف اپنی شخصیت کے متوالے ہیں اور طاقت کو اپنی شخصیت کے اظہار کا بہترین ذریعہ سمجھتے ہیں۔وہ برسر اقتدار رہنے کے لئے غیر معمولی توانائی صرف کریں گے' لیکن اپنی وفاداریاں بدلتے رہنے میں انہیں بالکل تامل نہیں ہوگا۔جوڑتوڑ کرنے میں' گمراہ کرنے میں اور دشمنوں سے زیادہ دوستوں کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کرنے کے لئے وہ غیر معمولی چالاکی سے کام لیں گے۔اس طرح وہ حکومت کے مخالفوں کو غیر متوازن اور ڈانو ڈول رکھنے میں کامیاب رہتے ہیں۔کبھی ان سے مفاہمت کرلیں گے' کبھی تصادم پر آمادہ ہوں گے' اس دوران میں ان کے حلیف بےیقینی اور خوف میں مبتلا رہیں گے' وہ تو ان سے امید لگائے رکھیں گے اور یہ صاحب اپنے ذاتی وفادار خوشامدیوں کو ڈھونڈ نکالیں گے۔اس عمل کے دوران میں جو تھوڑی سی مخالف طاقتیں بچ رہی ہیں' بوڑھا سیاست گری اور طریق کار کے اندر رہتے ہوئے' وہ ان کی طاقت یا تو بہت کم کردیں گے یا انہیں سرے سے ختم کردیں گے' وہ سیاسی حلقۂ انتخاب سے بچا کھچا تعلق بھی توڑلیں گے اور قانون اور انصاف کے جو باقی ماندہ معمولات ہیں' ان سے بھی انحراف کریں گے۔یعنی بےمحابہ اور لامحدود سیاسی دہشت گردی سے تحفظ کے لئے جو تھوڑے سے ذرائع رہ گئے ہیں' انہیں بھی نظر انداز کردیں گے۔اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ فوج اور سیکورٹی کی سول نوکر شاہی' ان کی طاقت کی بنیادیں بن جائیں گے اور وہ بتدریج اشرافیہ کے ایک چھوٹے سے بچے ہوئے بےاثر محافظ دستے کے رحم وکرم پر رہ جائیں گے۔

ادھر مختلف اقدامات کے تحت دباؤ بڑھتا جارہا ہے۔ان میں اخبارات اور جرائد کی بندش' سرکاری افسروں کی بڑے پیمانے پر سرسری احکام کے تحت برطرفی' ایک نئی فیڈرل سیکورٹی فورس کا قیام' اسپیشل پولیس کے مصارف میں اچانک بےتحاشا اضافہ' قومی سرگرمیوں کے منافی آرڈیننس کا نفاذ' اور یہ مطالبہ کہ ہر شہری اپنا اندراج کرائے اور شناختی کارڈ (تصویروں کے ساتھ) ہمراہ رکھے' نیز بلوچستان میں حزب اختلاف کی حکومت کا خاتمہ اور اس کے ساتھ ہی وہاں فوجی کارروائی کا آغاز' حکومت کے مخالفوں کے خلاف (غیر سرکاری) تشدد اور دہشت گردی اور اس سے بظاہر لاتعلقی کا اظہار اور ایک خاص طریقے کے تحت قیدیوں پر بڑھتا ہوا تشدد' یہ سارے اقدامات اس دباؤ میں شامل ہیں۔پاکستان کے عوام جس قدر سختی کے عادی ہیں'

ممکن ہے موجودہ حکومت کی تشدد آمیز کارروائی اس سے بدتر نہ ہو' ممکن ہے کہ تقریر اور اجتماع کی آزادی جتنی ایوب خان کے زمانے میں تھی' اس وقت اس سے قدرے زیادہ آزادی حاصل ہو' بلکہ کچھ لوگ صورت حال کو نسبتا بہت بہتر سمجھتے ہوں' لیکن مذکورہ بالا اقدامات بتدریج سخت گیری اور دہشت اور ایک منظم خوف وہراس کی جانب لے جارہے ہیں۔ انتہائی شرمناک قومی اسمبلی کا حالیہ واقعہ ہے' جس میں احمدیہ کمیونٹی کو پاکستان میں اقلیت قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایسا رجعتی فیصلہ ہے جس کی پاکستان میں نظیر نہیں ملتی۔ ان اقدامات سے ایک عبوری صورت حال کا پتہ چلتا ہے' جس کے تحت ملک کی سیاست بورژوا جمہوریت یا جاگیردارانہ حاکمیت کے دور سے نکل کر فسطائیت کی طرف جارہی ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ پاکستان میں جمہوری اور انقلابی گروہ' جن پر یہ ذمہ داری آتی ہے کہ اس رجحان کو روکیں' ان میں کمزوری کے ساتھ حرکت پیدا ہوئی ہے۔

مندرجات

قومی اسمبلی کے انتخابات منعقدہ 7 دسمبر 1970ء میں مختلف سیاسی پارٹیوں نے (مغربی) پاکستان میں جتنے ووٹ حاصل کئے' ان کی فیصد شرح:

پارٹی	پنجاب	سندھ	سرحد	بلوچستان	پاکستان
پاکستان مسلم لیگ (کونسل)	12،6	6،8	4	1۔69	11،29
پاکستان مسلم لیگ (کنونشن)	5،1	2،7	0،5	صفر	4،42
پاکستان مسلم 7 لیگ (قیوم)	5،4	10،7	22،6	10،9	19،
نیشنل عوامی 3،	صفر	3صفر	18،4	45،1	4صفر

پارٹی (ولی)					
جماعت اسلامی	9،8	7،6	صفر	صفر	2،18
جمعیت علمائے پاکستان					
جمعیت علمائے پاکستان (ہزارہ)	5،2	4،3	25،4	20	7،59
پاکستان پیپلز پارٹی	41،6	44،9	14،2	2،3	40

19 دسمبر 1970ء کو ہونے والے صوبائی انتخابات میں پنجاب' سندھ' سرحد اور بلوچستان میں مختلف سیاسی پارٹیوں نے جتنے ووٹ حاصل کیے ان کی فیصد شرح۔

پارٹی	پنجاب 180 نشستیں	سندھ 60 نشستیں	سرحد 40 نشستیں	بلوچستان 20 نشستیں
پاکستان پیپلز پارٹی	113	32	3	ـ
پاکستان مسلم لیگ (قیوم)	6	5	10	3
پاکستان مسلم لیگ (کونسل)	15	4	1	ـ
جمعیت علمائے (ہزاروی)	2	ـ	4	2
جمعیت العلمائے پاکستان	4	7	ـ	ـ

MashalBooks.org

نیشنل عوامی پارٹی (ولی)	-	-	13	8
جماعت اسلامی	1	1		
پاکستان مسلم لیگ (کنونشن)	6	-	2	-

2۔پاکستان پیپلز پارٹی کے انتخابی منشور (1970ء) سے اقتباسات۔

عام مقاصد

پاکستان پیپلز پارٹی کا حتمی مقصد ایک غیر طبقاتی معاشرے کا حصول ہے' جو ہمارے زمانے میں صرف سوشلزم کے ذریعے ممکن ہے۔اس سے مراد ہے تمام شہریوں کے مابین سچی مساوات' جمہوریت کے تحت اخوت جو اقتصادی اور سماجی انصاف کی بنیاد پر ہو۔ یہ مقاصد اسلام کی سیاسی اور سماجی اخلاقیات سے پیدا ہوتے ہیں' اس طرح مسلمانوں کے عقیدے کے بموجب اعلیٰ مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے کوشاں ہیں۔

یہ پارٹی ملی جلی معیشت' قومی حصے کے ساتھ ہی نجی معیشت کی موجودگی کے امکان کو تسلیم کرتی ہے' تاہم دولت کی پیداوار کے تمام بڑے ذرائع قومی حصے میں ہوں گے۔نجی حصے کے اندر پیداواری شعبوں میں افراد کی پیش قدمی کی حوصلہ افزائی کی جائے گی' یعنی جہاں ان کی کارکردگی موثر ہو سکتی ہے۔اجارہ داری کے حالات ختم کر دیئے جائیں گے' چنانچہ نجی سرمایہ مقابلے کے ضوابط کے مطابق اپنا کام کرتا رہے گا۔

قومی ملکیت کے دائرے میں تمام بنیادی اور کلیدی صنعتوں کو شامل کیا جائے گا۔تمام بڑی صنعتیں قومیائی جائیں گی۔اس کا مطلب یہ کہ ٹیکسٹائل' جیوٹ ملز جو ایک خاص پیداواری سطح تک ہوں گی' قومی ملکیت میں لے لی جائیں گی۔نجی ملکیت کے اندران کی حیثیت زبردست منافع اندوزی کی ہے' ان کی پیداوار ست' وسائل کا زیاں اور مزدوروں کا بے روک ٹوک استحصال پایا گیا ہے۔

قومی ملکیت کے دائرے میں نہ صرف بجلی کے وسیع پیداواری شعبے' بلکہ انرجی کی فراہمی کے دوسرے ذرائع یعنی جوہری مادہ' گیس' تیل اور کوئلہ شامل ہوں گے۔

معدنی دولت کے تمام ذرائع' یعنی کان کنی اور دیگر معدنیات قومی ملکیت میں لے جائیں گے۔ کارخانے میں ملازمت کا لازمی جزو یہ ہوگا کہ تمام مزدوروں کو رہائش اور کام پر جانے کے لئے مواصلات کی سہولت حاصل ہوگی۔وہ با تنخواہ چھٹی کے حق دار ہوں گے۔ان کے لئے تفریحی کیمپ قائم کئے جائیں گے'

MashalBooks.org

جہاں کے صحت بخش ماحول میں وہ چھٹیاں گزار سکیں گے۔ اپنی فنی مہارت میں اضافے کے لئے ان کو تربیت کی سہولتیں میسر ہوں گی۔ مزدوروں کی فلاح کے انتظام میں ان کے لئے ہسپتال اور طبی معائنے کی سہولت شامل ہوگی۔

قومی اور نجی پیداواری شعبوں میں کم سے کم اجرتوں کی شرح نافذ ہوگی جو مصارف زندگی کے حساب سے ہوگی۔

اقتصادی اقدامات

مالیاتی اداروں کا نجی پارٹیوں کے ہاتھوں میں ہونا استحصال کا موجب ہے کیونکہ وہ قومی دولت کو اور نجی طور پر جمع ہونے والے سرمایے کو اجارہ دار سرمایہ داروں کے لئے آمدنی کا وسیلہ بناتے ہیں۔ تمام بڑی صنعتیں تمام تر بنک کے قرضوں سے قائم کی گئی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ کھاتے داروں کے سرمایے سے بنائی گئی ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ بنک کاروں نے اس طرح کے قرضے دے کر پبلک کے سرمایے کا ناجائز استعمال کیا ہے۔ بنک جہاں بھی نجی ہاتھوں میں رہے ہیں اس طرح کی بدعنوانی جو اس نظام کی ساخت میں شامل ہے پائی گئی ہے اس سے بینکوں کو اجارہ داری حاصل ہوتی آئی ہے جو بڑے صنعتی خاندانوں کی ملکیت میں ہے۔

ریاست جب تک ان بینکوں کو اپنے قبضے میں لے کر انہیں قومی ملکیت نہیں بناتی، وہ افراط زر کو روک نہیں سکے گی۔ اس وقت تو ریاست کی مالیاتی پالیسی بینک کاروں کی مصلحت کے تابع ہے۔

تمام بینک اور انشورنس کمپنیاں فوری طور پر قومی ملکیت میں لے لی جائیں گی۔

ٹیکسوں کے نظام میں اصلاح: ایک سوشلسٹ نظام کے نفاذ سے ٹیکسوں کا موجودہ نظام فطری طور پر بدل جائے گا۔ موجودہ نظام بنایا ہی اس طرح گیا ہے جو ایک سرمایہ داری معاشرے کو موافق آئے اور جس میں دولت مراعات یافتہ طبقوں میں مرکوز ہوتی جائے۔

زرعی اصلاح

پارٹی کا موقف جاگیرداری نظام کا خاتمہ ہے۔ پارٹی سوشلزم کے مسلمہ اصولوں کے مطابق کسانوں کے مفادات کے تحفظ اور ان کے فروغ کی خاطر مثبت اقدامات کرے گی۔

کاشت کاروں کے حالات کی بہتری کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ان کے درمیان امداد باہمی کے اداروں اور اپنی مدد آپ کے گروپوں کی تشکیل کی جائے اور انہیں ترقی دی جائے۔

اراضی کی ملکیت کے طریقے: جاگیردار مالکان اراضی کی طاقت کو ختم کرنا، ایک قومی ضرورت ہے جس

کے لئے بڑی بڑی جاگیروں کو توڑنا ہوگا' اس کام کے لئے عملی تدابیر اختیار کرنی ہوں گی۔ اس غرض سے ملکیت اراضی کی حد مقرر کی جائے گی۔ یہ بڑی اراضی 5% سے زیادہ سے زیادہ 150 ایکڑ ہوگی۔ تمام قطعات کی زراعتی اہمیت' پیداوار اور آبپاشی کی سہولتوں کے پیش نظر اس کی زیادہ سے زیادہ ملکیت کا فیصلہ کیا جائے گا۔

تعلیم: پرائمری اور ثانوی تعلیم میٹرکیولیشن تک مفت ہوگی۔ پرائمری تعلیم لازمی اور مفت ہوگی۔ ایک پنج سالہ پروگرام کے خاتمے تک تمام لازمی اسکول تعمیر ہو چکے ہوں گے اور پرائمری اساتذہ کی تربیت مکمل ہو چکی ہوگی۔ ہر استاد کو رہائش کی سہولت مفت فراہم کی جائے گی اور ان کے بچوں پر ثانوی اسکول کی بورڈنگ فیس معاف ہوگی۔ اگر انہوں نے درس و تدریس کے پیشے کا آئندہ انتخاب کیا' اگر ایک مقررہ عمر تک اور وقت گزرنے کے ساتھ تعلیم لازمی ہوگی' تو اس صورت میں مزید ثانوی اسکولوں کا قیام لازمی ہو جائے گا۔

اسکولوں میں لازمی تدریس کے نصاب میں ریاضی کو ممتاز حیثیت دی گئی ہے اور اس کی تدریس جدید ترین سائنسی طریقوں کے تحت ہوگی۔ (پیپلز پارٹی کے انتخابی منشور سے' اقتباسات)

3۔ 2 جنوری 1972ء کو دس کیٹگیری (درجے) کی صنعتیں (ریاستی کنٹرول) میں لے لی گئیں' جو صنعتیں لی گئیں وہ یہ تھیں:

لوہا اور فولاد' بنیادی دھاتیں' بھاری انجینئرنگ' بھاری الیکٹریکل' موٹر گاڑیاں' ٹریکٹر سازی کے پلانٹ' بھاری اور بنیادی کیمیکلز' پیٹروکیمیکل' سیمنٹ' بجلی اور گیس اور تیل کی ریفائنریاں۔ مجموعی طور پر 2 جنوری 1972ء اور 16 جنوری 1972ء کو مذکورہ دس کیٹگیریوں سے وابستہ 31 صنعتی یونٹ سرکاری تحویل میں لے گئے تھے۔ (پاکستان ٹائمز لاہور 3 جنوری 1973ء اور 17 جنوری 1973ء)

3- فوج: پاکستان آرمی میں دس انفنٹری' دو بکتر بند ڈویژن' ایک آزاد آرمڈ گروپ اور ایک ایئر ڈیفنس بریگیڈ شامل ہیں۔ ان کی کل تعداد تین لاکھ 59 ہزار ہے۔ جنرل ہیڈ کوارٹر راولپنڈی میں ہے۔ افسروں کے کیڈر کو کاکول کی ملٹری اکیڈیمی میں کمیشن دینے سے پہلے تربیت کے مرحلے سے گزرنا ہوتا ہے۔

بحریہ: بحریہ میں تین سب میرین شامل ہیں۔ (جو فرانس میں 71۔ 1967ء کے دوران بنائے گئے تھے) ایک لائٹ کروزر (یعنی کیڈٹ کا تربیتی جہاز) ہے۔ چار ڈسٹرائر (Destroyers) ہیں۔ دو فائٹ اینٹی سب مرین فریگیٹ ہیں' ایک سروے شپ ہے۔ آٹھ کوسٹل مائن سویپرز ہیں' ایک پیٹرول کرافٹ ہے' دو سی وارڈ ڈیفنس بوٹس ہیں' دو آئلرز' ایک واٹر کیریئر اور چار ٹگ ہیں۔ اصل نیول بیس کراچی ہے۔ 1972ء میں نیوی کے عملے میں 950 افسر اور 9550 ریٹنگس تھے۔ سب میرین غازی (سابق یو ایس ایس ڈبلیو) جسے امریکہ کی بحریہ سے 1962ء میں پاکستان منتقل کیا گیا تھا' پاک و ہند جنگ کے دوران 4 دسمبر 1971ء کو ڈوب گیا تھا۔ ڈسٹرائر خیبر (سابق آئی آئی این آئی ایس' کیڈز) (Ex-IINIS Cadiz)

جسے 1956ء میں برطانیہ سے خریدا گیا تھا' دسمبر 1971ء میں وہ بھی جنگ کے دوران ڈوب گیا۔ تین پیٹرول کرافٹ جو 1965ء میں برطانیہ میں بنے تھے' ساتھ ہی وہ بھی ڈبو دیئے گئے۔

4- فضائیہ: پاکستان ایئر فورس 12 اگست 1947ء کو وجود میں آئی' اس کا ہیڈ کوارٹر پشاور میں ہے اور پرواز کے علاوہ انتظامی اور نگہداشت کے تین شعبوں میں منقسم ہے۔ اس کے ٹیکنیکل یونٹوں میں ایک اسکواڈرن B57_B (کینبرا بمبر) ایک اسکواڈرن میراج E1_III سپر سانک طیاروں کا' کوئی تین اسکواڈرن ایم آئی جی 19 (F_6) سپر سانک فائٹر بمبار طیاروں کے جو چین سے لئے گئے ہیں' ایک اسکواڈرن F_104A اسٹار فائٹر انٹر سپٹرز کا' پانچ اسکواڈرن F_86_F سیبر اور کینیڈین سیبر 6 فائٹرز کے' میراج EP_III جیٹ ریکناسانس ایئر کرافٹ کا اور دو اسکواڈرن C_B0B ہرکولیس ٹربو پراپ ٹرانسپورٹ کے شامل ہیں۔ پرواز کے تربیتی اسکول میں جن میں T_37B/C جیٹ تربیتی طیارے موجود ہیں' امریکہ نے دیئے ہیں۔ میراج DP_III MIG_15 اور دوسری قسموں Allossette ہیلی کوپٹرز کی جو سمندروں میں سراغ رسانی اور امدادی سرگرمیوں کے لئے مخصوص ہیں' فضائیہ میں شامل ہیں۔ رسالپور میں ایک فضائی کالج اور کورنگی کریک میں ایک اپرنٹس کالج قائم ہے۔ 1972ء کے اوائل میں دو سو جنگ آزما ایئر کرافٹ اور مختلف رینک کے پندرہ ہزار طیارے فضائیہ میں شامل تھے۔ ایک ایروٹیکل انجینئرنگ اکیڈمی بھی قائم کی گئی تھی۔

5۔ دفاع پر سرکاری اخراجات کی شرح کل قومی پیداوار کے تناسب سے درج ذیل ہے:

سال	دفاعی مصارف کی شرح پیداوار کے تناسب سے	کل قومی پیداوار کی فیصد شرح
1949_50ء	63.7	3
1957_58ء	48	2.9
1964_65	29.9	
1965_66ء	60.3	5.4
1966_67	40.2	3.8
1967_68	37.6	3.6
1968_69	35.1	3.6
1969_70ء	34.9	3.7
1970_71ء	40.9	4.1
1971_72ء	53.8	7.6فیصد
1972_73	52.7	7.8فیصد

MashalBooks.org

1973ء-74 (نظر ثانی کے بعد)	44،9	-
اوسط	45،17	4،37

6- 1300 سے زیادہ سرکاری افسر' جو مختلف انتظامی منصب سے تعلق رکھتے تھے' 12 مارچ 1972ء کو قبل از معیاد ریٹائر کر دیے گئے۔ ان میں گیارہ سی ایس پی افسر' پانچ پی ایف ایس کے افسر اور چھ پی ایس پی افسر تھے' ان کے علاوہ سولہ سینئر عہدیداروں کو ریٹائر کر دیا گیا اور دو کو 19 اگست 1973ء کی تاریخ میں برخاست کر دیا گیا۔ (پاکستان ٹائمز' لاہور' مارچ 13' 1972ء اور اگست 20' 1973ء) ان افسروں کو من مانے طریقے سے مارشل لاء ریگولیشن نمبر II-4 کے تحت نکال دیا گیا۔ نہ ان کی وجہ بتائی گئی اور نہ انہیں اپنے دفاع میں صفائی پیش کرنے کا موقع دیا گیا۔ 20 اگست 1973ء کو وزیر اعظم بھٹو نے ملک کے انتظامی ڈھانچے میں اصلاحات کا اعلان کیا۔ ان اصلاحات میں سے دو سے زاید خاص فائدوں کی توقع کی گئی تھی۔ (الف) سینیارٹی نہیں بلکہ کارکردگی' کسی عہدیدار کی ترقی کی بنیاد ہوگی۔ (ب) باصلاحیت افراد کو ملازمتوں میں شامل کیا جا سکے گا۔ ان دونوں اقدامات سے افسر شاہی کے اندر پیپلز پارٹی کے منظور نظر' افراد کو بھرنے کی راہ ہموار ہو گئی اور انہی کو ترقی دینے کا راستہ کھل گیا۔ اس کے علاوہ ملازمت میں بھرتی اور تربیت کے نظام سے یہ بات بھی یقینی ہو جاتی ہے کہ جو امیدوار حکومت کے ساتھ ہمدردانہ جذبہ رکھتے ہوں' انہیں ملازمت میں لے لیا جائے۔ پرانے طریقے کے برعکس جس میں مقابلے کے امتحانوں کے فوری بعد صلاحیت کی بنیاد پر کامیاب امیدواروں کو مختلف منصب پر مقرر کر دیا جاتا ہے' اب زیر تربیت افراد کو مزید تربیت دی جاتی ہے اور ان کا ایک بار پھر امتحان لیا جاتا ہے اور انہیں ان کی کارکردگی کی بنیاد پر روک لیا جاتا ہے اور ان کا تقرر ہو جاتا ہے۔ اس دوران میں ان کے سیاسی رجحان کو جانچنے کا موقع مل چکا ہوتا ہے۔

7۔ حزب اختلاف کی سرکردہ پارٹیاں یہ ہیں:

(1) نیشنل عوامی پارٹی (نیپ)

(2) جماعت اسلامی' جمعیت علمائے پاکستان (جے یو آئی' ہزاروی گروپ)

(3) پاکستان مسلم لیگ (پی ایم ایل' کونسل) تاہم اس کا ایک گروہ اب حکومت کی حمایت کرتا ہے اور

(4) تحریک استقلال۔ نیپ کی تقریباً تمام تر توجہ صوبہ سرحد اور بلوچستان پر مرکوز ہے۔ دسمبر 1970ء کے قومی اسمبلی کے انتخابات میں نیپ پنجاب سے ایک بھی امیدوار نامزد نہیں کر سکی تھی۔ سندھ سے اس نے چھ امیدوار نامزد کئے جو سب کے سب ہار گئے۔ انہیں کل ووٹوں کا صفر اعشاریہ تین (3۔0) فیصد ووٹ ملا۔ اسکے برعکس نیپ نے صوبہ سرحد سے سولہ امیدوار الیکشن کے لئے کھڑے کئے' ان میں سے تین جیت گئے۔ مجموعی طور پر انہیں 4،18 فیصد ووٹ ملے' اس طرح صوبہ بلوچستان میں نیپ نے جو تین امیدوار نامزد کئے'

MashalBooks.org

وہ سب الیکشن جیت گئے۔ نیپ کو 1ء45 فیصد ملے۔ پنجاب اور سندھ کی صوبائی اسمبلیوں میں نیپ کو ایک بھی نشست نہ مل سکی۔ جبکہ صوبہ سرحد کی چالیس نشستوں میں نیپ کو تیرہ نشستیں ملیں اور بلوچستان اسمبلی کی بیس نشستوں میں سے آٹھ نشستیں ہاتھ لگیں۔ (ملاحظہ کیجئے' مشتاق احمد کی تصنیف پالیٹکس ودآوٹ سوشل چینج' کراچی)

8۔ صدارت سنبھالنے کے بعد بھٹو نے نیشنل عوامی پارٹی کا تعاون حاصل کرنا چاہا۔ یحیٰی کے زمانے میں نیپ پر جو پابندی لگی تھی' اسے اس نے اٹھالیا اور ایک سمجھوتہ کیا' جس کے تحت صوبہ سرحد اور بلوچستان میں پی پی پی' نیپ اور جے یو آئی کی متحدہ حکومت قائم ہوئی اور مرکز میں بھی تعاون کا سمجھوتہ طے پایا۔ لیکن جب بھٹو نے نیپ سے مشورہ کئے بغیر ان دونوں صوبوں میں اپنی پسند کے گورنر مقرر کر دئیے تو اختلافات اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب بھٹو نے ان گورنروں کی بجائے نیپ کے نامزد افراد کو گورنر بنانے کا فیصلہ کیا تو یہ تنازعہ دور ہوگیا۔ نیپ اور جے یو آئی کی کولیشن کو سرحد اور بلوچستان میں حکومت سازی کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن شکوک وشبہات اور غلط اندیشیاں برابر پیدا ہوتی رہیں اور نیپ نے مرکزی حکومت میں شرکت نہیں کی۔ آخر یہ تعلق ٹوٹ گیا' جب نیپ مستقل آئین کی بابت ایک معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد جنرل کونسل میں اس کی منظوری حاصل نہ کر سکی اور یوں اسے اپنے معاہدے سے دست کش ہونا پڑا۔ بھٹو نے اس پر جوابی اقدام یہ کیا کہ نیپ کے گورنروں کو برطرف کر دیا اور بلوچستان کی صوبائی حکومت برطرف کر دی۔

9۔ سرحد میں نیپ کی حکومت نے 5فروری 1973ء کو صوبے میں مرکزی حکومت کی جانب سے نیپ کی برطرفی اور بلوچستان کی اتحادی حکومت (بشمول نیپ و جے یو آئی) کے خاتمے پر بطور احتجاج استعفیٰ دے دیا۔ (پاکستان میں 1972ء کی مردم شماری میں ان دونوں صوبوں کی آبادی 4ء8ملین (84لاکھ) ہے۔)

10۔ بلوچستان میں شورش کا آغاز کب ہوا' اس بارے میں کوئی حتمی تاریخ نہیں بتائی جاسکتی۔ تاہم 29فروری 1973ء کو سرکاری طور پر اعلان ہوا کہ بلوچستان کے گورنر کی درخواست پر صوبے میں امن وامان کی بحالی کے لئے "وفاقی فورسز" بھیجی جائیں گی۔ اس اعلان سے اس شورش کی وسعت اور شدت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ 1974ء کے اوائل تک صوبے کا چالیس ہزار مربع میل (اور بعض تخمینوں کے مطابق 80ہزار مربع میل) علاقہ شورش کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ اندازے کی رو سے بیس ہزار افراد شورش پھیلا رہے تھے۔ ایک ہفتے میں پانچ مرتبہ تصادم کے واقعات رونما ہو رہے تھے۔ (ملاحظہ کیجئے' آؤٹ لک' کراچی' جلد 2' نمبر 4' جنوری 5' 1974ء) خاص شورش زدہ علاقے جھلواں' سراواں' مری کی پہاڑیاں' سبی کے کچھ حصے' فاران چغئی' مکران اور لسبیلا کے بعض علاقے تھے۔ (بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے کیمپ واقع مری بل

سے اس کے چیئرمین اور طلبہ کے جاری کردہ پریس ریلیز مورخہ 3 جنوری 1974ء کے مطابق)

11۔ جماعت اسلامی ایک بنیاد پرست' دائیں بازو کی جماعت ہے۔ جسے شہری علاقوں میں بورژوا طبقے کے افراد کا تعاون حاصل ہے۔ تحریک استقلال 1970ء کے اوائل میں قائم ہوئی۔ یہ پارٹی سے زیادہ ایک تحریک ہونے کی دعویدار ہے۔ لہٰذا اس کا کوئی مستحکم رویہ اور پارٹی ڈسپلن نہیں۔ 1970ء کے انتخابات میں اس کے امیدوار آزاد امیدواروں کے طور پر کھڑے ہوئے۔ تحریک کا موقف یہ ہے کہ پاکستان کا اتحاد اور جمہوریت کی بحالی' یہی پاکستان کا واحد اور اہم ترین مسئلہ ہے۔ یہ "نظریہ پاکستان" کی دعویدار ہے اور ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خاں اس کے کنوینر ہیں۔ ملاحظہ کیجئے' دسمبر 1970ء میں ریڈیو اور ٹی وی پر اصغر خاں کی تقریریں اور تحریک کا کتابچہ "تحریک استقلال کے اغراض و مقاصد" مطبوعہ پارٹی آفس۔ راولپنڈی۔

(جرنل آف کونٹمپریری ایشیا 1994ء)

MashalBooks.org

پاکستان میں فوجی مداخلت

وہ جولائی کی 4 تاریخ اور 1977ء کا سال تھا' جب رات کے وقت پاکستان کی مسلح افواج نے وزیراعظم زیڈ اے بھٹو اور ان کی کابینہ کے ارکان اور حزب اختلاف کے لیڈروں کو "حفاظتی حراست" میں لے لیا۔ ایسا لگتا تھا کہ "آپریشن فیئر پلے" "منصفانہ کارروائی" نے اس سیاسی بحران کا خاتمہ کر دیا' جس کا آغاز مارچ میں ہوا تھا' اس میں تقریباً پانچ سو افراد ہلاک ہوئے تھے اور پاکستان کی خراب حال معیشت مزید کمزور ہو گئی تھی۔ شہریوں نے اور ان میں وہ بھی جو فوجی حکمرانی سے بدگمان تھے' اطمینان کا سانس لیا۔ بھٹو کے مخالفین نے جن کا تعلق دائیں بازو سے تھا اور ان تاجروں نے جو دائیں بازو کے حمایتی تھے' گلیوں میں جشن منایا اور روایتی طریقے سے حلوے بانٹے۔ لیکن درحقیقت اس فوجی بغاوت نے پاکستان کے مصائب میں اضافہ کر دیا ہے۔

کمانڈر انچیف چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق نے ٹیلیویژن پر تقریر کرتے ہوئے فوج کے نگران کردار پر بہت زور دیا اور اس کی نگرانی میں منصفانہ انتخابات کرانے کا وعدہ کیا' اس طرح انہوں نے حزب اختلاف کا اصل مطالبہ پورا کر دیا' جس نے 7 مارچ کے انتخابات میں دھاندلی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے عوامی ایجی ٹیشن شروع کر رکھا تھا۔ اب یہ معاملہ کہ جنرل اپنا وعدہ پورا کرتے ہیں یا نہیں' اس پر بے چینی کے ساتھ قیاس آرائی کی جا سکتی ہے۔ یہ فرض کرنے کی وجہ تو ہے کہ وہ ایسا کرنا چاہتے ہیں' اس مفروضے کو اس بات سے تقویت ملتی ہے کہ انہوں نے اعلیٰ اختیارات کا ایک انتخابی کمیشن مقرر کر دیا ہے اور بیشتر سیاسی لیڈروں کو رہا کر دیا ہے۔ رائے عامہ نئے انتخابات کے لئے تیار ہے۔ اگر ان میں بلاوجہ تاخیر ہوئی تو ایجی ٹیشن شروع ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ عوام میں فوج کی جو حیثیت ہے' بھٹو حکومت سے اپنے تعلق کی بنا پر اسے بہت نقصان ہوا ہے۔ اب اگر فوج پاکستان کی سیاست میں ایک ثالث کے طور پر اپنی حیثیت بحال کرنا چاہتی ہے تو اسے ایک مستعد اور محتاط نگراں کا کردار ادا کرنا پڑے گا' لیکن فوج کو ایک متضاد صورت حال کا سامنا ہے' جسے اپنی صفوں میں اختلاف کی بنا پر وہ حل نہ کر سکے گی' اس طرح فوجی حکومت غیر معینہ عرصے تک طول پکڑتی جائے گی۔

MashalBooks.org

ہندوستان کے ساتھ تقابل

اب نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو،اس امر میں کوئی شک نہیں کہ سیاست میں فوج کی تازہ ترین اضافی ذمہ داریوں سے اس ملک کا سیاسی بحران شدید تر ہوگا اور اس کے مصائب بڑھ جائیں گے۔ اس کے سیاسی مستقبل میں کچھ اور پیچ پڑ جائیں گے۔

اس تازہ ترین تنازعے کی تہہ میں وہ کشیدگی پائی جاتی ہے' جو اب تک حل نہ ہو سکی۔ کشیدگی ان طاقتوں کے درمیان جو ایک سخت گیر استبدادی حکومت چاہتی ہیں اور دوسری طرف رائے عامہ ہے' جو جمہوریت چاہتی ہے۔ اس سے پہلے جو سیاسی بحران پیدا ہوئے' یعنی 1958ء ۔ 1968ء اور 1971ء کے بحران' وہ سب اس مسئلہ کے گرد گھوم رہے تھے۔ اس بارے میں ہندوستان کے ساتھ تقابل سبق آموز ہوگا۔ اس برصغیر کے مشرقی' جنوبی اور وسطی صوبے جو موجودہ ہندوستان کے بیشتر حصے پر مشتمل ہیں' ایک صدی قبل نوآبادیاتی حکمرانی میں چلے گئے تھے۔ برطانیہ کی منصوبہ اور بتدریج کوشش یہ تھی کہ نمائندہ ادارے قائم کرے۔ چنانچہ ہندوستان پر اس کا گہرا اثر ہوا۔ جدید اور آزاد قوم پرستی کی جڑیں اس سرزمین میں دور تک اور گہرائی کے ساتھ پھیلتی گئیں۔ نوآبادیاتی حکومت کے فوری تقاضے کے تحت سال 1947ء کے آتے آتے جاگیرداری نظام خاصہ کمزور ہو چکا تھا۔ اس کے اسباب میں انتظامی اور اراضی کے ضابطے شامل تھے۔ تجارت بڑھ رہی تھی۔ قومی بورژوازی طبقہ تیزی سے ابھر رہا تھا۔ قوم پرست پارٹی کی جڑیں بہت جلد پیوست ہو چکی تھیں اور گاندھی اور نہرو جیسے لیڈروں کی سرکردگی میں اسے عوام کی حمایت حاصل ہو گئی تھی۔ ایک طرف برطانوی وائسرائے کی نمائندگی کرنے والے اس کے حاکمانہ ادارے تھے اور دوسری جانب ایک نمائندہ حکومت کی مثالی آرزو تھی' جسے قوم پرستوں نے عوام میں مقبول بنا دیا تھا۔

اس کے مقابلے میں ان علاقوں کے اندر جو پاکستان میں ہیں' ایسے حکمانہ اداروں کی بالادستی برقرار رہی' جسے نسبتاً کم چیلنج کیا گیا۔ شمالی صوبے جن کی حساس علاقائی اہمیت تھی' برطانوی ہند کی فوج میں ریڑھ کی ہڈی کی طرح تھے۔ برطانیہ دشمن جماعتوں کی بڑی تعداد بھی یہیں تھی۔ چنانچہ یہاں وائسرائے کی روایات کے مطابق حکمرانی کی گئی' یعنی ایک مضبوط انتظامیہ' جسے جاگیردار اشرافیہ کی شراکت حاصل تھی' یہاں کوئی مقامی سرمایہ دار طبقہ آزادی کے آنے تک ابھر ہی نہ سکا۔ آزادی کے بعد غیر ملکی امداد سے کچھ سرمایہ دار گروپ شراکت کار کے طور پر ابھر سکے۔ درمیانہ طبقہ بنیادی طور پر وہی تھا' جو نوآبادیاتی ریاست کی ملازمت میں تھا۔ ان کی ثروت کا انحصار ریاستی اقتدار کے استحکام پر تھا' نمائندہ حکومت کے قیام کے لئے جو تحریکیں اٹھیں انہیں سختی سے کچل دیا گیا۔ نوآبادیاتی تشدد کے بدترین واقعات مثلاً جلیانوالہ کا قتل عام' رولٹ ایکٹ کا نفاذ جس کے تحت شہریوں کو حکم ہوا کہ گلیوں میں انگریزوں کے آگے زمین پر رینگ کر چلیں اور پٹھان اور

سندھی باغیوں کی سفاکانہ سرکوبی' اس علاقے میں ہوئی۔

عالمی جنگ دوئم کے بعد ہی مسلم لیگ اس قابل ہوئی کہ ایک آزاد پاکستان کے لئے رائے عامہ کو منظم کرے۔ آزادی کے بعد 1947ء میں بابائے قوم محمد علی جناح کے جلد انتقال کر جانے اور ان کے جان نشین لیاقت علی خان کے رخصت ہونے سے یہ ملک ان رہنماؤں سے محروم ہو گیا' جو جمہوری اداروں کو ان کی صحیح طاقت اور جواز مہیا کرنے کے اہل تھے۔ ان کے بعد سے پاکستان پر فوج اور افسر شاہی کی حکومت رہی' جو وائسرائے کے نظام حکومت کے وارث تھے اور ان کی طاقت میں مزید اضافہ امریکہ کے ساتھ ہمارے فوجی اتحاد اور امدادی معاہدوں کی بدولت ہوا۔

مسلم لیگ کے چھچھورے لیڈروں نے جب فوجیوں اور سرکاری افسروں سے مراعات لینی شروع کیں تو لیگ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی' پھر تو غیر مستحکم حکومتوں کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ 1958ء میں جنرل محمد ایوب خاں نے اقتدار سنبھالا اور آج کے فوجی معیارات کے حساب سے خیر خواہی کے ساتھ حکومت کی۔ دس برس بعد ان کے بنیادی جمہوریت کے حاکمانہ نظام کے خلاف عام ایجی ٹیشن شروع ہو گیا اور آزادانہ پارلیمانی انتخابات کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ یہ ایجی ٹیشن پانچ مہینے چلا اور انہیں حکومت سے ہٹنا پڑا۔ اس وقت مغربی پاکستان کے بے چین عوام زیڈ اے بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی کے گرد اسی طرح اکٹھا ہو گئے تھے' جس طرح اب حزب اختلاف یعنی پاکستان قومی اتحاد (پی این اے) کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوئے ہیں۔ جنرل یحیٰ خاں کی نگران حکومت کے تحت ہونے والے انتخابات آزادانہ تو تھے' لیکن ان سے ایسے نتائج سامنے آئے کہ 1971ء میں مشرقی پاکستان میں فوج نے مداخلت کی' ہندوستان کے ہاتھوں اسے ذلت آمیز شکست ہوئی اور بنگلہ دیش بن گیا۔ فوجی حکومت عام لوگوں کی نظر میں اعتبار سے گر گئی' سپاہیوں کے تیور بھی بدلے ہوئے نظر آئے' جس سے فوج کو سیاست سے الگ ہونے کا عندیہ ملا۔

یہ صورت حال جمہوری قوتوں کے فروغ اور پاکستان کی سیاسی زندگی سے فوج کے اخراج کے لئے نہایت سازگار تھی۔ پاکستان پیپلز پارٹی اقتدار میں آئی۔ اس کا وعدہ تھا کہ جمہوریت نافذ کرے گی۔ ترقی پسندانہ اصلاحات لائے گی اور ایک تیز رفتار سوشلسٹ پروگرام کے تحت ملک ترقی کرے گا۔ بھٹو کے نعرے روٹی کپڑا اور مکان اور ان کے عوامی طور طریقے اور رنگا رنگ شخصیت نے مل کر انہیں ایک مقبول رہنما بنا دیا۔ اس کے بعد لوگوں کی مایوسی شروع ہوئی۔ زراعتی نظام میں اور صنعت میں ان کی اصلاحات اگرچہ کاغذ پر بڑی ترقی پسندانہ نظر آتی تھیں' لیکن ان میں نقائص بہت تھے' وہ اصلاحات بھی جزوی طور پر نافذ ہوئیں یا سرے سے نافذ نہیں ہوئیں۔ بھٹو نے سرحد اور بلوچستان کی منتخب حکومتوں کو اقتدار سے بے دخل کر کے اور ہزاروں مخالفوں کو جیلوں میں ڈال کر جمہوریت کو مذاق بنا دیا۔ انہوں نے پیپلز پارٹی اور حکومتی افسر شاہی کو ذاتی اقتدار کے لئے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا۔ سیکورٹی کی ملازمتوں کو اور بھی پھیلا دیا اور ماورائے

MashalBooks.org

عدالت دہشت کا ماحول پیدا کر دیا' جیسا کہ پولیس کی ماتحت ریاستوں میں ہوتا ہے۔ بالآخر اس وقت جب بھٹو کے مخالف ترقی پسند اور مقبول کارکن جیلوں میں بند تھے (ان میں صوبہ سرحد اور بلوچستان کے منتخب اکثریتی لیڈر بھی شامل تھے۔) انہوں نے مقررہ وقت سے پہلے انتخاب کا اعلان کر دیا اور اپنے حیرت زدہ مخالفوں کو تیاری کے لئے صرف دو مہینوں کی مہلت دی۔ مخالف پارٹیوں نے بڑی عجلت میں اپنے آپ کو منظم کیا' ان کی حمایت میں عام لوگوں کے غیر متوقع رویے نے بھٹو اور ان کے وزرا کو بوکھلا دیا' چنانچہ انتخابات میں دھاندلی کی گئی۔ دباؤ بڑھنے پر بھٹو نے مان لیا کہ دھاندلی ہوئی تھی' لیکن اس کی زیادتی کو تسلیم نہیں کیا' اس کی ذمہ داری بھی قبول نہیں کی' دوبارہ انتخابات کرانے سے انکار کر دیا اور اپنی مرضی نافذ کرانے کے لئے فوج طلب کر لی۔ اپریل میں پانچ شہروں کے اندر مارشل لاء کے نفاذ نے پاکستان کی سیاست میں فوج کے ثالثی کے کردار کو دوبارہ بحال کر دیا۔ چند فکر مند افراد نے جن میں پارٹی کے سابق سیکرٹری جنرل بھی شامل تھے' بھٹو کو اس کے نتائج سے خبردار کیا اور پھر پنجاب ہائی کورٹ نے اپنی عدالتی آزادی کا حیران کن مظاہرہ کرتے ہوئے مارشل لاء کے نفاذ کو غیر آئینی قرار دے دیا' لیکن بھٹو قانونی مطالبوں سے باز آنے والے نہیں تھے۔ فوج اس سارے بحران میں موجود رہی' ایک طرف حکومت اس سے آس لگائے ہوئے تھی کہ امن نافذ کرے' دوسری طرف حزب اختلاف کا دباؤ تھا کہ انکار کر دے اور حکومت کا تختہ الٹے' اور ادھر گلیوں میں مشتعل عوام' عورتیں اور مرد فوجیوں کو طعنے دے رہے تھے اور پھبتی کس رہے تھے۔ 5 جولائی کو حزب اختلاف میں دائیں بازو کے عناصر نے فوجی قبضے کا اعلانیہ جشن منایا۔ بھٹو کی ذاتی کامیابیاں خواہ کچھ بھی رہی ہوں' ان کی ناکامی تاریخی سمجھی جائے گی۔

انتخابات

الیکشن کمیشن کے ریکارڈ اور بعض خاص اضلاع کے مختلف واقعات کی چھان بین سے معلوم ہوا کہ دھاندلی بڑے پیمانے پر ہوئی اور اتنی ڈھٹائی سے کھلم کھلا ہوئی کہ 7 مارچ کے عام انتخابات محض ایک ڈھونگ بن کر رہ گئے۔ جن اضلاع میں مقابلہ ہوا' ان میں طرفین نے انتخابی مہم کے مروجہ حربے استعمال کئے' ووٹروں کو ڈرایا دھمکایا' برادری کے سربراہ کو اپنی طرف ملا لیا یا خرید لیا۔ برادری سے مراد خاندان' قبیلے اور فرقے سے ہے۔ پیر صاحبان سے رشتہ جوڑا اور زمیندار سے تعلق قائم کیا جو عموماً دیہی علاقوں کے ووٹروں کو اپنے قابو میں رکھتا ہے اور یوں سارے انتخابی عمل کو بگاڑ کے رکھ دیا۔ اس کے علاوہ برسر اقتدار پارٹی نے دھاندلی کے حربوں پر مشتمل ایک ذخیرہ معلومات فراہم کیا اور متعارف کرایا۔ یہاں ان میں سے چند کی مثالیں پیش کرتا ہوں۔

اول' قومی اسمبلی کی 173 منتخب نشستوں میں سے 19 میں' جن سے مسٹر بھٹو اور ان کے وزرائے

اعلیٰ منتخب ہوئے تھے' پیپلز پارٹی کے مقابلے میں کوئی امیدوار کھڑا نہیں ہوا۔ بلا مقابلہ نشستوں کی اتنی بڑی تعداد کبھی درج نہیں کی گئی ہوگی۔ 1970ء میں صرف ایک نشست پر مقابلہ نہیں ہوا تھا' حزب اختلاف کے امیدواروں کو مقابلے سے روک دیا گیا۔ اس کے لئے تشدد' اغوا' گرفتاری' افسر شاہی کے تاخیری حربے اور کاغذات کی منسوخی کے طریقے استعمال کئے گئے۔

دوم' چند ایک سے زیادہ اضلاع میں جعلی ووٹ ڈالے گئے اور سرکاری طور پر لوگوں کو ہراساں کیا گیا۔ بعض جگہوں پر یہ بھی ہوا کہ پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے ان پولنگ افسروں کو اغوا کر کے ان کی پٹائی کی' جنہوں نے ان کو دھاندلی کرنے سے روکنا چاہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض دیہی علاقوں میں رجسٹرڈ ووٹروں کی 85 فیصد تعداد کے ووٹ آئے۔ بیچارے صوبہ سندھ کے دو پولنگ اسٹیشنوں پر تو یہ معجزہ بھی ہوا کہ سو فیصد اور 102 فیصد ووٹ ڈالے گئے۔ چونکہ پولنگ سے ووٹروں کی آرا نہیں بلکہ ذمہ دار لوگوں کے اختیارات کے استعمال کی عکاسی ہوتی تھی' لہٰذا لازمی طور پر شہری مراکز سے زیادہ دیہات میں بہت ووٹ آئے' حالانکہ شہروں میں سیاسی گرما گرمی زیادہ تھی اور ان میں دھاندلی کرنا زیادہ آسان نہیں تھا۔ اسی طرح ووٹنگ کی شرح ان اضلاع میں زیادہ تھی' جہاں سے پیپلز پارٹی کے امیدوار کامیاب ہوئے اور جہاں سے قومی اتحاد نے نشستیں جیتیں' وہاں نسبتاً کم اور بلوچستان میں تو بہت ہی کم یعنی 6ء29 فیصد' حکمران جماعت نے اس صوبے کو گیا گزرا سمجھا اور یہاں سے دست کش ہو گئی۔

سوئم' بہت سی جگہوں پر مسترد شدہ ووٹوں نے بھی بڑا کردار ادا کیا۔ اس طرح ائر فی جنرل یحییٰ بختیار اپنے ضلع میں 1,489 ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب قرار دے گئے۔ وہاں 10,993 ووٹ مسترد کر دیئے گئے تھے۔ کوئٹہ میں امیدواروں کے ووٹوں کا تناسب یہ تھا:

(اٹارنی جنرل) یحییٰ بختیار	18,264
محمود خاں (قومی اتحاد)	16,755
عبدالوحید	8,68
ملک غلام محمد	1151
مسترد شدہ ووٹ	101993
	55,251

مسٹر حفیظ اللہ چیمہ کے مقدمے میں' جو ان دنوں ریلوے کے وزیر تھے' سپریم کورٹ کے سابق جج جسٹس سجاد احمد جان نے لکھا کہ مسٹر چیمہ اور ان کے ''حواریوں'' کی قانون شکن وارداتوں میں ووٹروں کو

MashalBooks.org

اسلحہ سے ڈرانا دھمکانا، رشوت ستانی، پولنگ افسروں کی پٹائی اور بیلٹ بکس میں ناجائز طور پر ووٹ ٹھونسنا، یہ سب کچھ شامل تھا۔ جج صاحب نے اپنے عدالتی فیصلے میں لکھا کہ "ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ ایک منصوبہ پہلے سے تیار کرلیا گیا تھا کہ مسٹر حفیظ اللہ چیمہ کو ہر قیمت پر کامیاب کرانے کے لئے انتخابی عمل میں رخنہ ڈالا جائے اور معمول کی شائستگی اور جمہوری طرز عمل کو پامال کرتے ہوئے اس مقصد کے لئے قبیح ترین حربے استعمال کئے جائیں۔"

آخری بات یہ کہ الیکشن کمیشن کو جسے صاف ستھرے انتخابات کے لئے مقرر کیا گیا تھا، استحقاق استعمال کرنے سے روک دیا گیا۔ اسے حکومت کے طرز عمل یا پارٹی کے عہدیداروں کو قابو میں رکھنے کا کوئی اختیار نہیں تھا، جیسا کہ جسٹس جان نے اپنے فیصلے میں لکھا "اگر غنڈے ڈکیت اور اوباش مشن میں شگاف ڈالنے پر تل جائیں تو کمیشن بھلا کیا کرسکتا تھا؟" اس کمیشن کو اپنا عدالتی اختیار استعمال کرنے سے بھی روک دیا گیا۔ کمیشن مبینہ بدعنوانیوں کے سلسلے میں تفتیش کرنا چاہتا تھا، لیکن ایک قانون آ گیا، جس کے تحت اسمبلی کے اجلاس کے دوران میں اور اس کے چودہ دن پہلے اور چودہ دن بعد تک، ارکان اسمبلی کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ کمیشن کے آگے معاملے کی سماعت کے لئے اگر چاہیں تو حاضر نہ ہوں۔ اس طرح عرض داشتوں کی تعداد بہت کم ہوگئی۔ جسٹس جان کے بقول یہ محض "ایک تماشہ" تھا۔ جب احتجاجوں کا سلسلہ شروع ہوا تو مسٹر بھٹو نے الیکشن کمیشن کی سماعت کے توسط سے حزب اختلاف کے لئے چند نشستیں چھوڑ دینے کی پیش کش کی۔ اپوزیشن نے مسٹر بھٹو کی اس پیش کش کو محض فریب سمجھا، بہر طور کمیشن عرض داشتوں کی سماعت کرتی رہی۔ 26 اپریل تک اس نے چھ درخواستوں پر نظر ثانی کرلی تھی اور یہ فیصلہ دیا کہ ہر ایک کے معاملے میں "سنگین بدعنوانیاں" کی گئی تھیں۔ پھر 13 مئی کو مخصوص نتائج سے بچنے کے لئے کمیشن کے سارے اختیارات سلب کر لئے گئے۔ اب ایک طرف مسٹر بھٹو کھڑے تھے اور دوسری طرف ان کے مخالفین اور درمیان میں ایک مشتعل رائے عامہ، وہ افواج تھیں۔ (جنہیں مسٹر بھٹو نے امن قائم کرنے کے لئے بلایا تھا) ہر فریق سوچ رہا تھا کہ دوسرا کہاں تک جائے گا اور کب تک ٹھہرے گا۔

پھر کیا ہوا؟

حزب اختلاف تو مختلف پارٹیوں کا ایک غیر یقینی مرکب ہے، جس میں معتدل مزاج، آزاد خیال اور ان سے آگے دائیں بازو کے مذہبی بنیاد پرست شامل ہیں، انہیں جس بات نے جوڑ رکھا ہے، وہ مسٹر بھٹو کے خلاف بداعتمادی ہے، جو بے بنیاد نہیں۔ پانچ سال تک انہوں نے باری باری ہر ایک کو خوشامد سے ڈرا دھمکا کر سمجھوتہ کرنے پر آمادہ رکھا، کبھی ان کو تنہا چھوڑ دیا، کبھی ان کے خلاف بغاوتیں بھی ہوئیں۔ انتخابی مہم کے دوران میں قومی اتحاد کے رہنماؤں کے پاس مسٹر بھٹو کے خلاف کہنے کے لئے کچھ نہ تھا، سوائے الزامات

MashalBooks.org

کئے گالیوں کے اور اسلام کی دہائی دینے کے۔ تاہم انہوں نے ایک بے ترتیب سا پروگرام تاخیر کے ساتھ جاری کیا' جس میں یہ وعدہ شامل تھا کہ بھٹو کے اقتصادی پروگرام کو ختم کر دیا جائے گا۔ آزاد سرمایہ کاری کی اجازت ہوگی اور ان کے ساتھ ایک مبہم سا اسلامی ضابطہ۔ اس مینوفسٹو کے کھوکھلے پن کو دیکھتے ہوئے پیپلز پارٹی کے لئے آسان تھا کہ اپنا ایک بامعنی پروگرام پیش کرتے ہوئے مخالفوں کو راستے سے صاف کر دیتی' کیونکہ اس کے پاس صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے کا کارنامہ تھا۔ زرعی اصلاحات تھیں اور ایک کامیاب خارجہ پالیسی تھی۔ تاہم بیشتر مبصروں کا خیال ہے کہ اگر انتخابات منصفانہ ہوتے تو حزب اختلاف کو قومی اسمبلی میں چالیس فیصد یا اس سے کچھ زیادہ نشستیں مل جاتیں۔ انتخابات میں جس بڑے پیمانے پر دھاندلی ہوئی تھی' اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسٹر بھٹو اور ان کے رفقا کا بھی یہی خیال ہے۔

انتخابات کے بعد مسٹر بھٹو نے خلاف معمول طور پر سیاسی فیصلہ کرنے میں ناکامی کا ثبوت دیا۔ مبصروں کا خیال ہے کہ اس کا سبب ان اطلاعات پر ان کا انحصار تھا' جو خفیہ ایجنسیاں انہیں فراہم کرتی تھیں۔ پھر وزرا کا ان پر اثر تھا اور پارٹی میں بچے کھچے ترقی پسند عناصر سے ان کا کٹ جانا تھا۔ جس پیمانے پر انتخابی دھاندلی ہوئی تھی' اس سے انتخابات کے بعد وہ کچھ پریشان تھے لیکن ان کے دو مشیروں نے جب انتخابات دوبارہ کرانے کا مشورہ دیا تو انہوں نے اسے رد کر دیا۔ حالانکہ دوبارہ انتخابات پر آمادگی سے ان کی کامیابی یقینی ہو سکتی تھی۔ حزب اختلاف نے فوج کی نگرانی میں دوبارہ انتخابات کرانے کا مطالبہ کیا اور اس کی تائید میں عوام کو احتجاج کرنے کی ترغیب دی۔ 28 مارچ کو جب احتجاج کی لہر اکثریتی آبادی کے صوبے پنجاب میں پھیلنے لگی تھی' مسٹر مبشر حسن پیپلز پارٹی کے سیکرٹری جنرل نے جو بائیں بازو کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے یہ مشورہ دیا کہ حکومت مستعفی ہو جائے اور نئے انتخابات کا اعلان کر دے۔ بھٹو نے اس مشورے کو بھی سختی سے رد کر دیا۔ مبشر حسن نے استعفیٰ دے دیا۔ پھر تاج محمد لنگا' جو پنجاب میں پارٹی کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل تھے' وہ بھی مستعفی ہو گئے۔ پیپلز پارٹی کے مختلف دھڑوں میں فرار کے راستے کھل گئے' اس عرصے میں مسٹر بھٹو بحران سے نپٹنے کے لئے ایک ایک کر کے سارے حربے استعمال کرتے گئے۔

عوامی احتجاج مستقل جاری رہا اور اس کا دباؤ بڑھتا گیا۔ (اس کی ایک نمایاں بات یہ تھی کہ پر جوش عورتیں بھی بڑی تعداد میں شامل ہو گئی تھیں) مسٹر بھٹو پر دباؤ تو تھا' لیکن وہ دوبارہ انتخابات کا سامنا کرنے پر رضامند نہ تھے۔ اب انہوں نے سمجھوتوں کی راہ تلاش کی۔ حزب اختلاف کی پارٹیوں نے سمجھوتوں کو حقارت سے رد کر دیا۔ مخالف لیڈروں کی گرفتاریاں اور دوسرے تیس ہزار افراد کی حراست بھی احتجاجی مظاہروں کو روکنے میں ناکام رہی' کیونکہ ان کا احتجاج بڑی حد تک بے ساختہ تھا اور جماعتی تعلق سے بالا تھا۔ مخالفین کے مینوفیسٹو کے جواب میں حکومت نے جن مراعات کا اعلان کیا تھا' یعنی شراب اور جوئے پر بندش اور سعودی عرب کی طرز پر اسلامی ضابطہ حیات کا وعدہ' ان سے بھی صورت حال بہتر نہیں ہوئی۔ اب مسٹر بھٹو نے مسلح

MashalBooks.org

افواج اور نوکر شاہی کو خوش کرنے کی کوشش کی اور ان کی تنخواہوں میں نمایاں اضافوں کا اعلان کیا۔ یہ ایسا فیصلہ تھا جس سے پاکستان کا مالی بحران اور بھی شدید ہو گیا۔ آخر کار انہوں نے 22 اپریل کو فوج طلب کر لی اور پانچ شہروں میں مارشل لا نافذ کر دیا۔

وہ جنرل جن میں سے بیشتر کو نہایت تیزی سے ترقی ملی تھی اور کچھ دوسری مراعات بھی' حکم بجالائے' لیکن درمیانہ منصب کے افسر اور جونیئر افسر' بنگلہ دیش کے تجربے کو بھولے نہیں تھے۔ انہوں نے سوال کیا کہ ایک نا مقبول حکومت کی طرف سے امن عامہ کا نفاذ کہاں کی عقل مندی ہے۔ اس وقت ان کے اضطراب میں مزید اضافہ ہو گیا جب پنجاب ہائی کورٹ نے مارشل لاء کے نفاذ کو غیر آئینی قرار دے دیا۔ چیف آف اسٹاف کی طرف سے آنے والا یہ ان کا دباؤ تھا' جس نے بھٹو کو حزب اختلاف سے مذاکرات پر مجبور کر دیا۔ المیہ یہ ہوا کہ وہ نئے انتخابات کرانے کے سمجھوتے پر بظاہر پہنچنے ہی والے تھے کہ انہیں برطرف کر دیا گیا۔ حکومت پر فوجی قبضے کی وجہ ظاہری طور پر یہ بتائی گئی کہ نئے انتخابات کے امکان کے پیش نظر دونوں فریق تشدد کی تیاریاں کر رہے تھے۔ برسراقتدار پارٹی نے سرکاری ایجنسیوں کی مدد سے اپنے بدمعاشوں اور غنڈوں میں اسلحہ بڑی تعداد میں تقسیم کرنے شروع کر دیئے تھے۔ 5 جولائی سے پہلے ہر زبان پر یہی بیان تھا کہ یہ بڑی خونیں مہم ہوگی۔

(II) یہ سب کیسے ہوا کہ ایک پارٹی جو عام لوگوں کے اس قدر بھرپور تعاون سے ابھر کر آئی تھی' اپنے وعدوں کو پورا کرنے میں ناکام رہی اور اکتوبر 1977ء کے بعد پاکستان کے سیاسی امکانات کیا ہیں؟

پاکستان پیپلز پارٹی کو جس تیزی سے زوال آیا ہے اور اس کی حکومت جس طرح ختم ہوئی ہے' اس کے کئی اسباب ہیں' اور وہ یہ ہیں:

1۔ زیڈ اے بھٹو کی شخصیت اور ان کے عزائم' جو پارٹی اور حکومت میں فیصلہ کن کردار ادا کرتے تھے۔

2۔ پیپلز پارٹی کے اپنے تضادات' جس نے پہلے تو اسے اپنے انتخابی وعدوں پر نظر ثانی کے لئے آمادہ کیا (اور پارلیمانی سیاست میں یہ معمول کی باتیں ہیں) لیکن بعد میں ان سے منحرف ہو گئی۔ نتیجہ یہ کہ پارٹی اور حکومت کے لئے عوام کی حمایت تیزی سے کم ہوتی گئی اور ترقی پسند عناصر یا تو چھوڑ کر چلے گئے یا پارٹی سے نکال دیئے گئے۔

3۔ سرکاری افسروں کو ذاتی اقتدار کی خاطر آلہ کار بنانے کے لئے ان کو ہراساں کرنے کی کوشش کی گئی اور یوں پیشہ ورانہ اہلیت ان سے چھین لی گئی۔ نتیجہ یہ کہ ان کے حوصلے پست ہوتے گئے' ایک نسبتاً خود مختار ادارے کے طور پر انتظامیہ کا کردار ختم ہو گیا اور فوج کے تعلق سے حکمران طبقے میں ان کی حیثیت توازن قائم کرنے والے ادارے کے طور پر باقی نہیں رہی۔

4۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان کے اقلیتی صوبے میں 76۔ 1970ء کے دوران میں حزب اختلاف کا

اجتماع (ان میں ولی خاں کی نیشنل عوامی پارٹی اور مفتی محمود کی جمعیت العلمائے اسلام شامل تھیں)

بھٹو: ایک مسئلہ کے طور پر

بھٹو کی ابتدائی زمانے کی مقبولیت کے واضح اسباب تھے۔ وہ ایک اچھے مقرر اور باصلاحیت اداکار ہیں۔ انہوں نے عوام سے سوشلزم کے محاذوں میں خطاب کرتے ہوئے پاکستان کے قدامت پرستانہ ماحول کو تبدیل کرنے میں مدد دی اور اس کا جواب بھی اسی پرجوش انداز سے ملا۔ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد نہایت دشوار زمانے میں انہوں نے کئی کارنامے انجام دیئے' ایک شکست خوردہ اور شکستہ قوم کی حکومت کی سربراہی کے لئے قومی سطح کے وہی ایک لیڈر باقی رہ گئے تھے' چنانچہ انہوں نے خلفشار کو روکا اور ممکنہ انتشار کا سدباب کیا۔ مشرق وسطیٰ کی سیاست میں جو تبدیلیاں ہو رہی تھیں ان کو بھٹو نے بڑی تیزی سے بھانپ لیا اور ان ممالک میں پاکستان کی حیثیت میں اضافہ کیا۔

لیکن یہ کارنامے' ملکی سیاست میں ان کی کوتاہ اندیشی کے بالکل برعکس تھے اور یہ بات بے وجہ نہیں' کیونکہ بھٹو کا تعلق اس سماجی طبقے سے ہے جو اپنی متضاد خصوصیات کے لئے بدنام ہے۔ وہ ایک عبوری طبقے کی پیداوار ہیں' ایک جامع رنگارنگ شخصیت' جاگیرداری کے پروردہ (سندھی وڈیرے) بورژوا طبقے کی تعلیم (کیلیفورنیا' آکسفورڈ) سیاست میں ایک فوجی ڈکٹیٹر کے پروردہ (ایوب خاں) اور ایک خود ساختہ سوشلسٹ۔ وہ اپنے آپ کو سوئیکارنو اور نکرومہ' اتاترک اور جمال عبدالناصر کی طرح ''ہیرو'' کے قالب میں ڈھلا ہوا دیکھ رہے تھے۔ ان لیڈروں کے نجات دہندہ کے طور پر جو کردار تھا' وہ اس کا دعویٰ تو نہیں کر سکتے تھے نہ ایک عصر ساز شخصیت کے طور پر ان کے جو کردار تھے ان کا مقابلہ کر سکتے تھے' نہ ان کی طرح نادار گھر میں پیدا ہوئے یا ان کی طرح قربانیاں دیں اور مصائب برداشت کئے' البتہ ان میں دوسری خصوصیات ہیں۔ بے لگام نخوت' نظریے کا وزن' اقتدار کا سودا اور سیاسی عمل کے سلسلے میں ان کی بے بصیرتی۔ انہی خصوصیات کی بنا پر انہوں نے ایسی پالیسیاں اختیار کیں جو خود ان کے لئے تباہ کن ثابت ہوئیں۔ رچرڈ نکسن کے ساتھ ان کا تقابل بالکل درست ہوگا۔ نکسن کی طرح بھٹو میں بھی طاقت کے حصول کی طبعی خصوصیت پائی جاتی ہے اور طاقت کے غلط استعمال کا میلان بھی اور موقع شناسی کی ایک پراسرار حس' نکسن کی طرح وہ بھی ہر قیمت پر کامیابی چاہتے ہیں' اس جواری کی طرح جو داؤ پر کچھ بھی لگانا نہیں چاہتا۔ جس طرح نکسن نے 1968ء میں کیا۔ بھٹو بھی اسی طرح اچانک کسی گوشے سے نکل کر ملک کی سیاست پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

بھٹو نہ تو قدامت پسند ہیں نہ سوشل ڈیموکریٹ ہیں اور نہ فاشسٹ ہیں' وہ محض اپنی ذات سے وابستہ ہیں اور طاقت کو شخصیت کے اظہار کا بہترین ذریعہ سمجھتے ہیں۔ برسراقتدار رہنے کے لئے انہوں نے غیر معمولی توانائی صرف کی اور وفاداریاں تبدیل کرنے میں چنداں احتیاط سے کام نہیں لیا۔ اپنی غیر معمولی عیاری سے کام لیتے ہوئے ہیر پھیر کرتے رہے اور نہ صرف دشمنوں کو بلکہ دوستوں کو استعمال اور گمراہ کیا۔ اس

MashalBooks.org

طرح وہ بہت عرصے تک حزب اختلاف کو چکمہ دینے میں کامیاب رہے' کبھی سمجھوتہ کر لیا' کبھی مقابلہ کیا' ادھر ان کے حلیف بے یقینی میں مبتلا رہے' انہیں یہ خوف اور اندیشہ لاحق رہا کہ وہ اپنے اردگرد خودسر اور بے اصولے لوگوں کو اکٹھا کر لیں گے' اس سارے عمل میں انہوں نے ان چند سیاسی طاقتوں کو جو توازن رکھتی تھیں' ضائع کر دیا۔ سیاسی حلقوں سے ان کا جو تھوڑا بہت رابطہ تھا' وہ بھی ختم ہو گیا۔ انہوں نے قانون کے باقی ماندہ معمولات کی بھی خلاف ورزی کی جواب سے پہلے بے روک ٹوک اور بے حد و حساب سیاسی دہشت گردی کے خلاف کسی قدر تحفظ فراہم کرتے تھے۔ لازمی بات ہے کہ فوج جس کے پاس سیکورٹی (حفاظت) کا ایک وسیع شعبہ تھا' بھٹو کی بنیادی طاقت کی بنیاد بن گئی۔ اب وہ رفتہ رفتہ فوجی اشرافیہ پر انحصار کرنے لگے۔

پیپلز پارٹی

یہ پارٹی بھی اپنے لیڈر کی طرح عبوری دور کی پیداوار تھی' نظریاتی موقع پرستی پر مبنی' ظاہر ہے جدید' لیکن درحقیقت جاگیردارانہ۔ اس کے انتخابی وعدوں اور اصل اقدامات کے درمیان فاصلہ ہر سال بڑھتا گیا اور اس وقت تو اور بھی واضح ہو گیا' جب پارٹی پر دیہات کے وڈیرہ خاندانوں کی بالادستی سامنے آ گئی۔ مارچ 1977ء میں پیپلز پارٹی کے اسی (80) فیصد نامزد جنہیں قومی اسمبلی میں منتخب ہونا تھا' انہی خاندانوں کے نمائندے تھے۔

جیسا کہ امید تھی کہ زرعی اصلاحات کے بارے میں حکومت کے قوانین اور اس کے ترقی پسندانہ (لیبر) ضوابط نافذ ہونے سے رہ گئے' جس سے سماجی طبقوں کے درمیان کشیدگی میں اضافہ ہوا اور اداروں کی شکایات کا ازالہ نہ ہو سکا۔ پارٹی کی شورا شوری اور چرب زبانی کے نتیجے میں' جو مایوسی پیدا ہوئی تھی' اب غصے میں بدل گئی اور حکومت سے بے تعلقی کی بجائے خلفشار پیدا ہو گیا۔ اسی طرح وہ فاصلہ جو بھٹو اور فریب خوردہ احتجاجی عوام کے درمیان پیدا ہوا تھا' اسے امن عامہ نافذ کرنے والی طاقتوں کو ختم کرنا پڑا' اور جیسا کہ ایسی مثالوں سے ظاہر ہے نفاذ قانون کی طاقتیں بتدریج قانون کے دائرے سے باہر ہوتی گئیں۔

تاہم عام لوگوں کے موقف میں انحراف سے سرکاری سطح پر ایک جدید سرمایہ دارانہ معیشت کے حق میں کوئی واضح تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔ حکومت کا جاگیردارانہ کردار' "سوشلزم" کے لئے اس کی گرم گفتاری اور اقتدار کے لئے اس کی حرص کو دیکھتے ہوئے ایسی تبدیلی کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ علاوہ ازیں جیسا کہ بیشتر تیسری دنیا کے ملکوں میں ہوتا رہا ہے' پاکستان میں بھی ایک مقامی سرمایہ دار طبقہ موجود نہیں جو اتنا طاقت ور ہو کہ ریاست کے کردار پر اثر انداز ہو سکے۔ دیہی اشرافیہ اور ایک ریاستی بورژوا طبقہ جسے ہر طرف سے تحفظ حاصل ہے' حکمرانوں کے مضبوط ترین منطقے ہیں۔ چنانچہ بھٹو کی حکومت نے اسی کا سہارا ڈھونڈ لیا' جس کا کوئی اعتبار نہیں تھا۔ یہ منفی قوم پرستانہ سوشلزم' جس میں صنعتوں کو قومیانا اور قومی دولت کو اللے تللے خرچ کرنا تھا' اسی

MashalBooks.org

چیز نے گھاٹا کو اقتصادی اور سیاسی تباہی سے دوچار کیا اور یہی انجام مصر سے انڈونیشیا تک کے ملکوں کا ہوا۔ بھٹو نے دعویٰ کیا کہ یہ اسلامی سوشلزم ہے۔ پھبتی کسنے والوں نے اسے چٹ پٹی مصالحے دار سوشلزم کا نام دیا۔ اس پالیسی سے درج ذیل نتائج مرتب ہوئے۔ سرمایہ داروں نے ہاتھ روک کر اور اپنی مصلحت کے مطابق پاکستان میں سرمایہ کاری کی۔ نجی شعبے میں سرمایے کی مقدار جو 70۔ 1969ء میں آٹھ فیصد تھی' 76۔ 1975ء میں گھٹ کر 8ء4 فیصد رہ گئی۔ مصنوعات کی تیاری میں سرمایہ کاری 35 فیصد سالانہ سے گر کر 15 فیصد رہ گئی اور یہ کیفیت تمام نجی سرمایہ کاری میں تھی۔ قومیائی گئی صنعتوں کا شعبہ اس کمی کو پورا نہ کر سکا' کیونکہ قومی ملکیت میں لینے کے عمل میں صرف منافع کے محرکات بدل جاتے ہیں' جس کا اثر پیداواری عمل کی تیزی پر ہوتا ہے۔ سرمایہ دار کی جگہ ایک بدعنوان اور نکمی افسر شاہی لے لیتی ہے۔ عملاً اثر یہ ہوا کہ قومی ملکیت میں آنے والے ادارے حکومت اور پارٹی کا اجارہ بن گئے' جن میں وہ لوگوں کو حسب خواہش نوازتے تھے۔ ان اداروں کا انتظامی عملہ سول ملازموں سے کہیں زیادہ بدعنوان اور فضول خرچ ثابت ہوا۔

''ترقی'' کا انحصار اب تمام تر غیر ملکی وسائل پر تھا۔ 70۔ 1969ء کے وفاقی ترقیاتی مصارف میں بیرونی ذرائع کا حصہ 44 فیصد تھا۔ 1975ء تک یہ سو فیصد ہو گیا۔ غیر ملکی قرضے اور امداد کا دائرہ چونکہ بہت پھیل گیا تھا' اس لئے سرکاری شعبے میں سرمایہ کاری جو 70۔ 1969ء میں 215 ملین ڈالر تھی' 76۔ 1975ء میں 1025 ملین ڈالر ہو گئی۔ لیکن یہ سرمایہ نہایت پھوہڑ پن سے اور مسرفانہ انداز سے لگایا گیا۔ بھٹو نے جو بہت سی اسکیمیں شروع کی تھیں' ان میں سے ایک بھی مکمل نہیں ہوئی۔ سرکاری شعبے میں سرمایہ کاری کا منافع ''رابطہ'' رکھنے والوں اور ٹھیکیداروں کو حاصل ہوا' یعنی تیزی سے پھیلنے والا شاہ خرچ اور مفت خوروں کا طبقہ' نتیجہ یہ کہ پاکستان کی برآمدی تجارت جمود کا شکار ہو گئی۔ درآمدات تیزی سے بڑھنے لگیں۔ 73۔ 1972ء میں درآمدات کی مقدار 850 ملین ڈالر تھی۔ جو 76۔ 1975ء میں 2020 ملین ڈالر ہو گئی۔ چنانچہ جیسا کہ توقع کی جاتی ہے۔ درآمدی تجارت میں صارفین کا اور اشیائے صرف کی مانگ کا حصہ 40 فیصد سے بڑھ کر 60 فیصد ہو گیا' چونکہ عیاشی کے ساتھ خرچ کرنے کا رجحان بڑھ گیا تھا' اس لئے قومی بچتوں کی شرح متوقع 12 تا 14 فیصد سے گھٹ کر کل قومی پیداوار کا 5 تا 6 فیصد رہ گئی۔ ملک پر بیرونی قرضے کا بوجھ دگنا ہو گیا۔ 30 جون 1972ء کو یہ قرض 3500 ملین ڈالر تھا جو 30 جون 1977ء کو تقریباً 7 ہزار ملین ڈالر ہو گیا۔ یہ ملک کی کل سالانہ اقتصادی پیداوار کا 50 فیصد تھا۔

اس دوران میں آبادی سالانہ 3 فیصد کی شرح سے بڑھتی گئی۔ افراطِ زر کی شرح اوسطاً 18 فیصد ہو گئی اور پانچ برس (جون 1972ء تا جون 1977ء) میں کرنسی میں اضافہ 140 فیصد یا 2ء19 فیصد سالانہ کی شرح سے ہو گیا۔ زرعی پیداوار میں اضافہ سالانہ 5 فیصد اوسط شرح سے گزشتہ دس سال تک برقرار رہا' لیکن اب اس میں تعطل آ گیا۔ صنعتی پیداوار گزشتہ دس برسوں میں اوسطاً 9ء9 فیصد کی شرح سے بڑھ رہی

MashalBooks.org

تھی ۔ 1970ء کی دہائی میں اب یہ صرف 2 فیصد رہ گئی اور مجموعی قومی پیداوار جو اوسطاً 6 فیصد تھی' اب صرف 1ء6 فیصد رہ گئی تھی۔ اس افسوسناک کارکردگی کو دیکھتے ہوئے یہ حیرت ہوتی ہے کہ عوام نے اتنے طویل عرصے تک بھٹو کو کیسے گوارا کیا' پہلے کیوں نہ پھٹ پڑے۔ ان کی خاموشی کی ایک وجہ جزوی طور پر یہ تھی کہ پاکستانی مزدوروں کی ایک نہایت بڑی تعداد ایرانی خلیج کی ریاستوں میں نقل مکانی کر گئی تھی اور ان کی بھیجی ہوئی رقوم سے کچھ سکون آ گیا تھا' لیکن خاص وجہ یہ تھی کہ احتجاج کا کوئی ذریعہ موجود نہیں تھا۔ انتخابات اور ان کے بعد کے نتائج نے لوگوں کو اپنے بڑھتے ہوئے احساس محرومی کے اظہار کا موقع فراہم کر دیا۔

زوال آمادہ افسر شاہی

پاکستان میں طاقت کے بنیادی طور پر دو ادارے ہیں' ایک فوج' دوسرا افسر شاہی۔ دونوں نے باہمی شراکت سے ملک پر حکومت کی ہے' اگرچہ شراکت کی شرائط وقتاً فوقتاً بدلتی رہی ہیں۔ 1958ء تک افسر شاہی بڑے شریک کی حیثیت رکھتی تھی۔ ایوب خان کے فوجی قبضے کے بعد یہ تعلق رسمی طور پر تبدیل ہو گیا۔ اگرچہ اعلیٰ حکام بدستور فیصلوں پر حاوی تھے۔ اور انتظامی امور میں انہی کی بالادستی تھی۔ یہ ایک نو آبادیاتی افسر شاہی تھی۔ تحکمانہ رویے کی مالک' متکبر' حریص اور عوام کے ساتھ تعلق میں نہایت بے رحم۔ تاہم اسے برطانیہ سے اور ہماری اپنی جاگیردارانہ روایات سے قدامت پرستی ورثے میں ملی تھی اور اس کا نقطہ نظر بھی اسی رویے کا حامل تھا۔ ایوب کی آمریت میں جو یک گونہ تیزی تھی اس کا سبب یہ عنصر بھی تھا اور اس کی بدولت سول انتظامیہ میں کسی قدر مستعدی آ گئی تھی۔ سول افسروں اور فوجیوں کے درمیان کچھ بد اعتمادی بھی تھی اور کھینچا تانی بھی رہتی تھی۔ لیکن ان کے درمیان ایک طرح کا طاقت کا توازن موجود تھا' لیکن صلح اور مفاہمت آسانی سے ہو جاتی تھی۔ پھر یہ بھی تھا کہ سول اور فوجی دونوں اداروں میں بالادست افسر ایک ہی طبقے سے آئے تھے یعنی اونچے طبقے کی بورژوازی' جن کے مفادات اور سوچنے کے انداز ایک ہی جیسے تھے۔ 1970ء کی دہائی میں سماجی رشتے کی یہ یکسانیت اور نظریاتی ہم آہنگی ختم ہو گئی اور دونوں اداروں کے درمیان طاقت کا توازن بگڑ گیا۔ اب طاقت فوج کی طرف منتقل ہو گئی' اس لئے نہیں کہ فوج طاقت ور ہو گئی تھی بلکہ اس لئے کہ افسر شاہی اپنی اخلاقی طاقت کھو چکی تھی۔

بھٹو کے دور حکومت میں سول انتظامیہ کو بہت ہراساں کیا گیا تھا اور سول حکمرانی کی اخلاقی توانائی اور روح ان سے چھین لی گئی تھی۔ مارچ 1972ء میں تیرہ سو سے زائد سرکاری افسروں کو قبل از میعاد ریٹائر کر دیا گیا تھا۔ اس سال اگست میں اور بھی افسر نکالے گئے۔ انہیں برطرفی کی نہ تو وجہ بتائی گئی' نہ ان سے وضاحت طلب کی گئی اور نہ انہیں عدالت میں اپیل کا حق دیا گیا۔ سرکاری ملازموں کو برطرفی اور تنزلی کے خلاف جو تحفظات حاصل تھے اور تاریخی طور پر انہیں میسر تھے اور جن کی توثیق 1956ء اور 1962ء کے

آئین میں کی گئی تھی۔ 1973ء کے آئین میں وہ بھی ان سے چھین لیے گئے۔ بھٹو نے سول سروس کے لئے ٹریبونل بنائے اور ملازموں پر عدالت تک رسائی کا راستہ بند کر دیا۔ اس طرح انہوں نے افسر شاہی پر سخت ضرب لگائی' جس کی سرکاری حکام کو توقع نہ تھی اور یہ کام معمول کی کارروائی کے بغیر کیا۔ اس سے غالباً ان کا مقصد چند کو سزا دینے کی بجائے سبھی کو خوفزدہ رکھنا تھا۔

بعد میں وہی حقارت سے نکالے ہوئے افسر سیاسی تقرری کا پروانہ لے کر نفع بخش سرکاری عہدوں پر متمکن ہو گئے۔ ان میں چند ایک ایسے تھے جنہوں نے اس ذلت کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔ آج وہ اپنے حسن انتظام کے لئے دور دور تک شہرت رکھتے ہیں۔ سول انتظامیہ میں ہم آہنگی اور ساتھ مل کر کام کرنے کا جذبہ یوں بھی سرد ہو گیا کہ حکومت اس میں "غیر پیشہ ور" لوگوں کو پارٹی کے کارندوں اور ذاتی طور پر پسندیدہ لوگوں کو جن کی صلاحیت مشکوک اور سیاست میں ناقابل اعتبار تھی' بھرنے لگی۔ اسی طرح چھان بین کے عمل اور باہر کی بھرتیوں کے نتیجے میں فدوی قسم کے سرکاری کارندوں کی ایک مختلف نسل پیدا ہو گئی۔ لہٰذا یہ سمجھ نہیں آتا ہے کہ یہی وہ لوگ تھے' جنہوں نے وزیر اعظم اور ان کے حواریوں کا عندیہ پاتے ہوئے انتخابات میں نہایت جوش و خروش سے دھاندلی کی' جو مسٹر بھٹو کی توقعات سے بھی کہیں زیادہ تھی۔

افسر شاہی کے اندر بھی عدم توازن اور کشیدگی بڑھ گئی' جب یہ دو حصوں میں بٹ گئی' ایک تو سول انتظامیہ' دوسری طرف نیشنل سیکورٹی یعنی قومی تحفظ کا شعبہ' جو بھٹو کی حکومت میں بہت تیزی سے وسیع ہوتا گیا۔ خفیہ ایجنسیاں بڑی تعداد میں پھیل گئیں جو حکومت کے مشتبہ دشمنوں سے زیادہ ایک دوسرے کے خلاف خفیہ خبر رسانی پر آمادہ رہنے لگیں۔ بھٹو کی رسوائے زمانہ تخلیق وہ فیڈرل سیکورٹی فورس (ایف ایس ایف) تھی' جس میں تیس ہزار افراد بھرتی کئے گئے تھے۔ یہ وزیر اعظم اور ان کے ساتھیوں کی گویا ذاتی فوج تھی' وہ لوگوں کو اغوا کر کے غائب کر دیتی' اس کے اپنے خفیہ جیل اور عقوبت خانے تھے۔ یہ خفیہ محکمہ جسے اچھی خاصی رقم ملتی تھی' اس افسر شاہی کا حصہ تھا' جس میں برابر توسیع ہو رہی تھی اور اسے جدید سے جدید تر بنایا جا رہا تھا۔ اس کے عملے کی تعداد میں' اس کی اہلیت اور اختیارات میں بھی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ اس طرح جہاں ماضی میں افسر شاہی نے فوجی حکمرانی کو سول حکومت کے طریقوں سے مانوس بنانے کی کوشش کی تھی' بھٹو نے سول زندگی کے معمولات کو فوجیانے کے لئے سول انتظامیہ کو آلہ کار بنا لیا۔

انجام کار یہ 1970ء کی دہائی میں فوجی اور سول حکومت کی باہمی یگانگت' جس نے اوپر کی سطح پر حکمرانی کو آسان بنا دیا تھا' ختم ہو گئی۔ اب اعلیٰ سول افسروں اور فوجی افسروں کے درمیان طبقاتی رشتوں کا اور تعلیم اور نقطہ نظر کا بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ سول افسروں کی سماجی اور لسانی ساخت تو وہی ہے جو پہلے تھی اور نسبتاً زیادہ قومی ہے' لیکن فوج میں ایسا نہیں ہے۔ برطانیہ کے تربیت یافتہ فوجی افسر جن کا ایک آزادانہ انداز فکر ہوتا تھا اور بالائی طبقے کی آن بان ہوتی تھی' اب وہ نہیں رہے۔ ان کی جگہ وہ لوگ آ گئے ہیں جنہیں دوسری

MashalBooks.org

عالمی جنگ کے ختم ہونے تک جب کھلی فوجی بھرتی ہو رہی تھی یا آزادی کے فوراً بعد فوج میں کمیشن مل گئے۔ یہ زیادہ تر پنجاب کے دیہی خاندانوں کے متوسط طبقے کے لوگ تھے۔ سیدھے سادے، مذہبی اور جزا و سزا کے ماحول کے پروردہ لوگ۔ پاکستان کے حکومتی اداروں کے درمیان یہ بڑھتی ہوئی دوری یقیناً ملک کی آئندہ ترقی پر اثر انداز ہوگی۔

تین دوسرے صوبوں سندھ، بلوچستان اور سرحد پر پنجاب کی بالادستی اور پاکستان کی اقلیتی قومیتوں کی شکایات کا اس ملک کی سیاست میں بہت اہم کردار ہے۔ اقتدار میں رہتے ہوئے بھٹو کا سرمایہ ایک تو ان کا سندھی ہونا تھا، دوسرے پنجاب میں ان کی حمایت۔ ان کی آئینی مخالفت پہلے سرحد اور بلوچستان میں مرکوز رہی، جہاں 1970ء میں نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) نے انتخابات جیت لئے تھے اور اپنی حکومتیں بنائی تھیں۔ بھٹو کسی بھی نمایاں اختلاف کو برداشت کرنے کے روادار نہ تھے، چنانچہ وہ ان حکومتوں کو ختم کرنے پر تل گئے۔ حزب اختلاف کے رہنماؤں کو کاٹ کر الگ کر دیئے اور پنجاب میں اپنی حمایت کو مضبوط تر کرنے کے لئے انہوں نے اپنے مخالفوں پر "علیحدگی" پسند ہونے کا الزام عائد کیا اور کہا کہ وہ ایک سازش کے تحت پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں۔ ان الزامات کے اگرچہ کوئی شواہد نہ تھے پھر بھی اکثریتی آبادی میں شکوک و شبہات پیدا ہو گئے اور حکومت کے لئے ان کی حمایت گویا پکی ہوگئی، لیکن اقلیتی صوبوں میں اس چال سے علیحدگی پسندی کو ایک جواز مل گیا اور اسے اعتبار حاصل ہو گیا کہ یہ بھی ایک سیاسی متبادل ہے۔ اس سے بھٹو کی حکومت کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو گئی۔ جب بلوچستان کی صوبائی حکومت کو من مانے طریقے سے ختم کر دیا گیا اور اس کے نتیجے میں فروری 1973ء میں سرحد کی حکومت نے استعفیٰ دے دیا تو اس طرح عملاً دونوں صوبے نمائندگی سے محروم کر دیئے گئے۔ اس زمانے میں بلوچستان کا صوبہ گوریلا کارروائیوں کا میدان بنا ہوا ہے اور اس نے مسلح افواج کو اپنے یہاں مصروف رکھا ہے۔ مارچ 1977ء میں بلوچ اور پٹھان حزب اختلاف ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے۔ اکتوبر میں اگر بھٹو دوبارہ منتخب ہو جاتے ہیں، تو قومی سیاست میں الگ تھلگ رہنے کا عمل بدستور باقی رہے گا۔

اب کیا ہوگا؟

معلوم ہوتا ہے کہ اس سال کی دہائی میں پاکستانی سیاست ابہام اور بے یقینی میں مبتلا رہے گی۔ اگر ملک میں کوئی انقلابی پارٹی ہوتی تو وہ اسے ایک انقلاب آور لمحہ سمجھتی، کیونکہ پاکستان کی برسر اقتدار اشرافیہ کسی ایسے نظریے سے محروم ہو چکی ہے، جو اسے حکمرانی کا جواز مہیا کر سکے۔ حکمرانی کے ادارے اپنے توازن، اختیار اور قوت عمل سے محروم ہو چکے ہیں، معیشت نہ صرف یہ کہ مصیبت میں مبتلا ہے بلکہ انتہائی ماہر اور فعال کارکنوں کے پاکستان سے ترک وطن کرنے کے بعد اب وہ توانائی بھی حاصل نہیں رہی جس کی بدولت ماضی

میں ہر نقصان کا تیزی سے ازالہ ہو جایا کرتا تھا۔ آخری بات یہ کہ مشرقی پاکستان کے الگ ہو جانے سے اور اقلیتی صوبوں میں حزب اختلاف کو دبانے کے باعث اقلیتی قومیتوں کے اندر اپنے حقوق کے سوال پر کشیدگی بہت بڑھ گئی ہے۔

ان سب باتوں کا حاصل یہ ہے کہ حکمرانی کے جواز پر اور نظم وضبط اور قومی یک جہتی کے بارے میں بنیادی نوعیت کا بحران پیدا ہو گیا ہے اور ان اسباب کے تحت ملکی مسائل کا حل بہت پیچیدہ ہو گیا ہے۔ خلیج کی ریاستوں (سعودی عرب' ایران) کے بڑھتے ہوئے اثرات' ہندوستان میں متحدہ رجعت پسند پارٹیوں کا حکومت میں آنا اور فوج کا ملک کے بالادست سیاسی ادارے کے طور پر ابھر کر آنا' وہ فوج جس پر غلبہ پنجابیوں کا ہے اور جو رفتہ رفتہ دائیں بازو کی طرف جھکتی جا رہی ہے۔ مستقبل قریب میں ہونے والی تبدیلیوں سے پتہ چلے گا کہ پاکستان بطور ایک ریاست کے برقرار رہے گا یا نہیں' یہاں کی صورت حال جنوبی ایشیا کے اندر وہی ہے جو دوسری عالمی جنگ کے زمانے تک پولینڈ کی تھی۔

جرنیلوں کو تین بڑے مسائل درپیش ہیں' پہلے کا تعلق مسٹر بھٹو سے ہے' دوسرا مسئلہ غیر پنجابی قومیتوں کی شکایات اور ان کے حقوق کا ہے جو پاکستان کی آبادی کا 42 فیصد ہیں اور تیسرا اقتصادی بحران سے ہے اور عوام میں بائیں بازو کے شعور کی بیداری سے بھی۔ ان میں سے ہر مسئلہ فوج کے آگے ایک مخصوص پیچیدہ صورت حال پیش کرتا ہے۔ 5 جولائی کو اس نے فوجی مداخلت کر کے غالباً خود کو دلدل میں پھنسا دیا ہے۔

ہم یہ مان لیتے ہیں کہ جرنیل صاحبان منصفانہ اور آزادانہ انتخابات مستعدی کے ساتھ اور پرامن انداز میں کرانا چاہتے ہیں۔ اس بنا پر وہ چاہتے ہیں کہ انتخابی دوڑ میں بھٹو بھی شامل ہو جائے' لیکن ان کا اقتدار میں آنا پسند نہیں کریں گے' کیونکہ جب انہیں برطرف کیا گیا' اس وقت وہ حکومت کے آئینی سربراہ تھے اور فوج کے جنرل اسٹاف میں ایک اور تبدیلی کے بارے میں سوچ رہے تھے تاکہ پرانے اطاعت گزاروں کو بنا کر ان کی جگہ نئے وفادار عناصر کو ملا سکیں۔ فوجی افسروں کے نقطۂ نظر سے بہترین حل یہ ہوگا کہ بھٹو ایک کمزور حزب اختلاف کے لیڈر بن کر سامنے آئیں۔ پارلیمنٹ میں ان کی موجودگی سے پاکستان قومی اتحاد (پی این اے) کا اتحاد کچھ اور بڑھ جائے گا اور حکمران پارٹیوں کا ایک کمزور لیکن دیرپا اتحاد یقینی ہو جائے گا اور یہ بات فوج کو پسند ہوگی۔ لیکن اگر اس نے ایک بھرپور انتخابی مہم شروع کر دی تو اتنا کامیاب ہوگا جس کی توقع کسی اور سے نہیں کی جا سکتی۔ جس طرح اوائل اگست میں پاکستان کے تین بڑے شہروں کے دورے میں دیکھا گیا' اس کے کردار کی چمک دمک' اس کی مقبولیت کے اثرات میں اضافہ کر دے گی' جس سے پاکستان قومی اتحاد کے سیاست دانوں میں' اور اس سے زیادہ افسروں میں' کھلبلی مچ جائے گی۔

قتل کے الزامات کے تحت بھٹو کی گرفتاری اور جنرل ضیاء الحق کا نیویارک ٹائمز (7 ستمبر 1977ء) کو بھٹو کے خلاف بیان' اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس بحران کو حل کرنے کے لئے کوئی

سخت طریقہ' جانب دارانہ انداز سے اختیار کیا جائے گا۔ اس کا مخالف ردعمل ہوگا۔ جیل میں ہو یا جلاوطن کیا جائے' وہ بلاشبہ پاکستان کا جان بیرون (انقلابی لیڈر) بن جائے گا۔ اگر اسے قتل کیا گیا تو وہ بعد از مرگ ہیرو بن جائے گا' جس کا سایہ اس کے فوجی یا سول جان نشینوں کو ہمیشہ ڈراتا رہے گا۔

بھٹو کی واپسی کے امکان کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اگر پاکستان پیپلز پارٹی کو انتخابات میں آزادی سے حصہ لینے دیا گیا' تو گزشتہ مارچ کے مقابلے میں آئندہ اکتوبر میں اسے کہیں زیادہ عوامی حمایت حاصل ہوگی۔ اقتدار سے محرومی کے بعد اب بھٹو عام لوگوں کے درمیان ایک ستم رسیدہ شخص ہے' جو ایک مضبوط اور صابر ستم رسیدہ شخص کے گرد اکٹھا ہونا پسند کریں گے۔ 4 ستمبر کو گرفتاری کے بعد اس کی حمایت میں اضافے کا امکان ہے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ پنجاب اور سندھ میں کسانوں کی اکثریت اور مزدوروں کی ایک تعداد اب بھٹو کو قومی اتحاد پر ترجیح دینے لگی ہے۔ کسانوں میں اراضی کی تقسیم کا وعدہ جو اس نے کیا تھا' اگرچہ پورا نہیں کیا' تاہم اس نے زرعی اصلاحات نافذ کیں اور صنعتوں کو قومی ملکیت میں لیا۔ ان ضابطوں کی بدولت اور حکومت کی عوام پسند تقریروں سے کم از کم محروم اور نادار لوگوں میں اس کے لئے سازگار ماحول پیدا ہوا ہے۔ اب عام لوگ اپنی بات زیادہ طاقت سے کرتے ہیں' اب زمینداروں کو کسانوں سے بیگار لینے سے مزاحمت اور مقابلے درپیش ہوتے ہیں۔ اب مزدوروں کے ساتھ معاملہ کرنے میں صنعتی اداروں کے منیجر گالی دینے اور توہین کرنے سے احتراز کرتے ہیں' اس طرح اعلیٰ حکام پبلک کے ساتھ افسری کا رعب کم ڈالتے ہیں۔

ایک ایسے معاشرے میں جہاں کی نادار مخلوق کے لئے تحفظ اور وقار کا امکان بہت کم ہو' یہ کوئی معمولی کامیابیاں نہیں۔ دلچسپ بات ہے کہ بھٹو کے زوال پر بالائی طبقوں نے بڑی تیزی سے اپنا ردعمل ظاہر کر دیا اور لوگوں نے ان کے رویوں میں تبدیلی محسوس کر لی۔ فوجی قبضے کے بعد دو ہی ہفتوں کے اندر کھیتوں اور کارخانوں میں ہڑتالوں اور محاذ آرائیوں کے متعلق خبریں پھیلنے لگیں' جنہیں قومی اتحاد کے حامی دائیں بازو کے اخبارات نے جو سوشلزم کے مخالف تھے' خوب اچھالا اور مارشل لا ریگولیشنز نے تقویت دی' جس کے تحت تمام ٹریڈ یونین سرگرمیوں پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ سماجی اور اقتصادی صورت حالات میں اس تبدیلی نے عوام میں شدید خدشات پیدا کر دیئے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق نے اپنے دوسرے قومی خطاب میں اس رجحان کے خلاف لوگوں کو متنبہ کیا ہے اور مزدوروں اور کسانوں کو فوجی انتظامیہ کی جانب سے خیر خواہی کا یقین دلایا ہے۔ لیکن عام لوگ تو پھر بھی یہ سوچ کر حیران ہوتے ہیں کہ کیا اس اسلامی ضابطے کے تحت جس کا بہت چرچا کیا جاتا ہے امیر لوگوں کے ہاتھ بھی کاٹے جائیں گے' یا بااثر افراد کو بھی سرعام کوڑے مارے جائیں گے۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ اس نگران حکومت کے تحت بھی صرف غریب لوگوں کو کوڑے لگائے گئے ہیں' ناداروں کی بے چینی مزید بڑھ گئی ہے۔ چونکہ کوئی ترقی پسندانہ متبادل صورت موجود نہیں' اس لئے

MashalBooks.org

لازمی طور پر بھٹو کے لئے ایک ان سلجھا پیدا ہو گیا ہے۔ حاکموں کا مسئلہ اس حقیقت کی بنا پر اور بھی پیچیدہ ہو گیا ہے کہ حکومت سے بھٹو کی برطرفی کے بعد سیاست سندھیوں کے احساس تنہائی میں اضافہ کر دے گی جو اپنے صوبے میں غیر سندھیوں کی بالادستی سے پہلے ہی سخت خفا ہیں۔

پاکستان میں جہاں مختلف قومیں آباد ہیں اور مختلف علاقوں میں ترقی کی سطح بھی ناہموار ہے قومی ہم آہنگی اور یگانگت کو فروغ دینا دفاعی انتظامیہ کے بس کی بات نہیں۔ دفاع کا محکمہ ہر سال قومی بجٹ کا ساٹھ فیصد حصہ ہتھیا لیتا ہے۔ اس ملک میں جہاں بالغ مردوں کی چالیس فیصد تعداد بے روزگار ہے فوج کا ادارہ سب سے بڑا تاجر ہے اور اس میں بھرتی ہونے کے لئے ایک خاص حیثیت کا مالک اور مراعات یافتہ ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ مسلح افواج میں بلوچوں اور سندھیوں کی تعداد نہایت معمولی ہے جب کہ اسی فیصد عملے کا تعین پنجاب سے ہے۔ ہماری مسلح افواج غیر پنجابی قومیتوں کے لئے غیر مساوی تقسیم اور غیر منصفانہ پنجابی قبضے کی اسی طرح علامت ہیں جیسے اس سے پہلے بنگال کے لوگوں کے لئے تھیں۔ اگر آزاد انتخابی سیاست کو دبایا گیا اور فوج نے

براہ راست سیاسی طاقت استعمال کی تو اس سے چھوٹی قومیتوں کے غم و غصے میں اضافہ ہی ہوگا اور ان کی یہ امید دم توڑ دے گی کہ شکایات کا تدارک سیاسی ذرائع سے ممکن ہے۔ اگر فوجی افسروں نے برسر اقتدار رہنے کا قصد کر لیا یا اقتدار میں واپسی کی ٹھان لی تو یہ خانہ جنگی کی جانب ایک بہت بڑا قدم ہوگا اور اس ملک کے مزید ٹکڑے ہو جائیں گے۔

بہت سے اعلیٰ فوجی افسر ان خطرات سے باخبر ہیں جو فوج کے اقتدار سنبھالنے کی صورت میں درپیش ہوں گے ان کی مخلصانہ آرزو ہے کہ سویلین حکومت قائم ہو۔ البتہ وہ اقلیتی صوبوں میں بڑی سیاسی پارٹیوں کا حاوی ہونا پسند نہیں کرتے۔ نیشنل عوامی پارٹی 1970ء سے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اکثریتی پارٹی کے طور پر موجود ہے بھٹو کے تشدد کا خاص ہدف یہی پارٹی رہ چکی ہے۔ 1973ء میں نیپ کی صوبائی حکومتوں کو اقتدار سے برطرف کرنے کے بعد بھٹو نے اس کے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا ان پر غداری کا مقدمہ چلایا اور ان کے بلوچ ساتھیوں کو بغاوت کرنے پر مجبور کر دیا۔ ان مبینہ علیحدگی پسندوں کے خلاف کارروائی کا حکم دینے کے بعد بھٹو نے اس جارحیت میں فوج کو اس طرح ملوث کر دیا کہ اب اس سے نکلنا مشکل ہو گیا۔ اب تک بیشتر فوجی افسر نیپ کے رہنماؤں پر بھروسہ نہیں کرتے اور انہیں اقتدار سے باہر رکھنا چاہتے ہیں چنانچہ نیپ کے تمام اہم لیڈر خیر بخش مری سردار عطا اللہ خاں مینگل اور ولی خاں اب تک وہیں ہیں جہاں بھٹو نے انہیں رکھا تھا یعنی جیل میں اور جرنیل صاحبان بلوچستان میں فوجی کارروائی ختم کرنے پر تیار نہیں اس حقیقت کے باوجود کہ نیپ جس پر پابندی لگا دی گئی تھی اب ایک نئے نام کے ساتھ آ گئی ہے اب یہ نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی ہے پاکستان قومی اتحاد کا ایک نہایت طاقت ور جز۔

MashalBooks.org

کہا جاتا ہے کہ چند سویلین سیاست دانوں نے فوج کے اہم عناصر کے ساتھ حکمران اتحاد سے نیپ کو خارج کرنے کے امکان پر بحث کی ہے اور اس امکان کی بنیاد قدامت پرست مسلم لیگ اور جماعت اسلامی پر رکھی ہے جو تحکمانہ مزاج رکھتی ہے لیکن نیپ کو سرحد اور بلوچستان میں اقتدار سے باہر رکھنے اور وفاقی حکومت میں حصہ دار بننے سے روکنے کے لئے پارلیمانی ہیر پھیر سے بھی کچھ زیادہ کارروائی کی ضرورت ہوگی اور اگر ایسا ہوا تو اس کا نتیجہ پاکستان کے چار میں سے دو صوبوں کے عوام کو حق رائے دہی سے محروم کرنا ہوگا اور بھٹو کی برطرفی کے بعد سندھ کے انتہائی نادار اور ستم رسیدہ لوگوں سے ممکن ہے کہ وہ مرکزی حکومت کے لئے ایک بڑا چیلنج بن جائیں۔ اس وقت پاکستان میں علیحدگی کے آسیب حقیقت بن جائیں گے۔

امکان یہ ہے کہ فوج انتخابات کرائے البتہ 13 اکتوبر کے بعد سے بھی اس کا التوا ممکن ہے۔ پاکستان قومی اتحاد بلاشبہ جیت جائے گا اگر پیپلز پارٹی ایک مضبوط پارلیمانی حزب اختلاف کے طور پر مرکزی اسمبلی میں نہیں آئی تو اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ قومی اتحاد کے ٹکڑے ہو جائیں گے غالباً انہی خطوط پر جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ پارٹی ڈسپلن مفقود ہے اور موقع پرستی کا زور ہے یہ توقع کی جائے گی کہ مرکز میں کمزور حکومت بنے جس میں نئے اتحاد بنتے رہیں۔ اگر نیپ کو جو سرحد اور بلوچستان میں بالادست ہے مرکز میں اقتدار سے باہر رکھا گیا اور پیپلز پارٹی نے سندھیوں میں اپنی طاقت برقرار رکھی تو حکومتی عدم استحکام خاص طور پر برقرار رہے گا۔ اس وقت فوج کے سامنے ایسے ہی حالات ہوں گے جیسے ملک کو 1955ء اور 1958ء میں درپیش تھے اور اسے حکومت پر قبضہ کرنے کی ترغیب ملی۔

(لاموند ڈپلومیٹک، اکتوبر 1977ء)

پاکستان کا بحران: ایک انٹرویو

نیوبر ہوپینیں　　پاکستان کی موجودہ حکومت کی خصوصیات کیا ہیں؟

اقبال احمد:　　پاکستان پہنچنے کے بعد جو پہلی بات سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ ہے فوجی حکومت کا یکسر الگ تھلگ ہو کر رہ جانا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس حکومت کے پاس حمایت حاصل کرنے کے لئے کوئی بنیاد نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ اسے ان لوگوں کی حمایت بھی حاصل نہیں میرا مطلب ہے کھلی حمایت حاصل نہیں جن کے مخصوص مفادات ان سے وابستہ ہوتے ہیں۔ سماج کے کسی بھی طبقے میں یا کسی قومیت میں ایسے لوگوں کی تلاش مشکل ہوگی جو پاکستان میں فوجی حکومت کا دفاع کرنے یا ان کی موجودگی کو جائز قرار دینے پر آمادہ ہوں گے۔

دوسری نمایاں بات اس حکومت کے سلسلے میں یہ ہے کہ یہ کھلم کھلا بہت جابرانہ نہیں جیسا کہ اس سے امید کی جانی چاہیے۔ میرا خیال ہے اس کے دو اسباب ہیں۔ ایک تو یہ کہ ضیاءالحق کو وفاق اور صوبوں کی افسر شاہی جس میں پولیس اور سیکورٹی کا عملہ بھی شامل ہے کا پورا تعاون حاصل نہیں۔ اور بڑے پیانے پر اور منظم طریقے سے جبر کو نافذ کرنے کے لئے افسر شاہی کا تعاون نہایت ضروری ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ حکومت کو بھی اس کا بخوبی احساس ہو گیا ہے کہ وہ بالکل ہی یکہ و تنہا ہو کر رہ گئی ہے اور اگر زیادہ جبر کیا گیا تو عام بغاوت اٹھ کھڑی ہوگی۔ لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ پاکستان میں جبر بڑے پیانے پر موجود نہیں تو اس سے میری مراد یہ ہرگز نہیں کہ حکومت جابرانہ نہیں۔ بلکہ اس کے جبر کے دو انداز ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ جبر کرنے میں اپنی پسند سے کام لیتی ہے۔ مسٹر بھٹو کی حکومت میں جس طرح جبر نافذ کرتے وقت انتخاب سے کام لیا جاتا تھا۔ اب اس سے زیادہ انتخاب برتا جاتا ہے۔ بھٹو کی جیل میں تیس سے پچاس ہزار سیاسی قیدی تھے۔ ضیاءالحق کی جیل میں پانچ سو سے کم ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ضیاءالحق کی حکومت ملک کے سیاسی کلچر میں ایذا پسندی اور اذیت دہی کو شامل کرنا چاہتی ہے۔ اس کی سب سے زیادہ ڈرامائی مثالیں کوڑے لگانے کے مسلسل واقعات ہیں جو فوجی حکومت کے قیام کے بعد ادھر دو سال کے اندر دیکھے گئے۔ کوڑے کی سزا سر عام دی گئی عام طور پر نہایت معمولی جرائم پر اور کبھی کبھار کسی سیاسی جرم کی بنا پر۔ نہ صرف یہ کہ یہ سزائیں سر عام دی گئیں بلکہ حکومت کی طرف سے تحریک کی گئی اور لوگوں کو اکسایا گیا کہ بڑی تعداد میں یہاں آئیں اور دیکھیں بعض دفعہ اسے ٹی وی پر دکھایا گیا۔ اس کی بھی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ سزا پانے والوں کے منہ پر مائیکروفون لگا دیئے گئے تاکہ عام لوگ ان کی چیخیں سن سکیں۔ اس کا صاف مقصد یہ تھا کہ ہمارے سیاسی کلچر

MashalBooks.org

میں سفاکی شامل کی جائے اور لوگوں کو اس بات کے لئے تیار کیا جائے کہ وہ ظلم و جبر کو اور ظالمانہ اقدامات کو قبول کرنے لگیں' لیکن اس کا ردعمل لوگوں میں برہمی اور مزاحمت کا تھا۔ مثلاً لاہور میں جب ایک شخص کو کوڑے مارے جا رہے تھے تو ہجوم سے تحسین اور ستائش کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور اس وقت تو لوگوں نے سرخوشی کے عالم میں ناچنا شروع کر دیا جب اس شخص نے تیس کوڑے کھانے کے بعد مائیکروفون میں کہا: "خدا کی قسم' میں یہاں جلد ہی پھر آؤں گا۔" چنانچہ گزشتہ کم و بیش چھ مہینوں سے سرعام کوڑے لگانے کا سلسلہ بند کر دیا گیا ہے۔

این ایچ: کیا مذہبی رہنما کوڑے کی سزاؤں کے خلاف ہیں؟

اقبال احمد: نہیں۔

این ایچ: کیا وہ خلاف نہیں ہیں؟

اقبال احمد: نہیں' ملک میں کوئی مذہبی حزب اختلاف نہیں۔

این ایچ: ابھی آپ نے کہا تھا کہ اس حکومت کی دوسری خصوصیت جبر کے سلسلے میں اس کا انتخاب ہے۔ اس میں آپ کو اور کون سی خصوصیات نظر آتی ہیں؟

اقبال احمد: اس حکومت کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ سول افسر شاہی کا مکمل تعاون حاصل کرنے میں ناکام ہو گئی ہے اور ایسا پہلی بار ہوا ہے۔ ایوب خان کی حکومت کو افسر شاہی کا مکمل تعاون حاصل تھا۔ بھٹو نے کم و بیش افسر شاہی کو خوفزدہ رکھا تھا اور اس کا کردار بھی کسی حد تک بدل دیا تھا' لیکن بہ اعتبار مجموعی اس کا تعاون حاصل رہا۔ اس حکومت کو سرکاری عمال کی جانب سے ایک خاموش عدم تعاون کے رویے کا سامنا ہے اور یہ بہت اہم بات ہے' کیونکہ افسر شاہی کو پاکستان کی انتظامیہ میں آج بھی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے۔ اس حکومت کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ پاکستان کے اندر فوجی حکومتوں کی تاریخ میں پہلی بار فوجی افسروں کے درمیان داخلی طور پر اختلاف پایا گیا ہے۔ چنانچہ آپ افواہیں سنتے ہیں اور کم از کم حال میں اس کے اندر ایک فوجی سازش کی کوشش بھی ہوئی ہے۔ ماضی میں فوج کے اندر افسروں کا طبقہ بالعموم متحد ہوتا تھا۔ جونیئر افسروں میں یہ رجحان پایا جاتا تھا کہ اپنے اعلیٰ افسروں کا حکم بجا لائیں اور اعلیٰ افسروں کے اندر کچھ اس طرح کا رجحان تھا' جیسے معزز لوگوں کا ایک کلب ہو۔ اب وہ اتحاد ٹوٹ چکا ہے اور پہلی بار فوجی سازش اور جوابی سازش کے امکانات بہت نمایاں ہو کر سامنے آئے ہیں۔

این ایچ: افسروں کے طبقے میں بے اطمینانی اور تفرقے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟

اقبال احمد: فوج میں جمود کی حالت ہے' سیاست در آئی ہے اور اقربا پروری آ گئی ہے' بہت سے نوجوان افسر اور کچھ معمر فوجی بھی اس بارے میں تشویش میں مبتلا ہیں کہ پیشہ ورانہ اہلیت' تربیت' فوجی مشقوں اور حوصلہ مندی کے معیارات روبہ زوال ہیں۔ جرنیل اپنی سیاست میں اتنے مصروف رہتے ہیں کہ ان کے پاس

فوجی امور پر توجہ دینے کے لئے وقت نہیں ہوتا۔ ترقی اور تقرر کے معاملات میں بھی خویش پروری اور بددیانتی آ گئی ہے۔ یہ مسئلہ تو کچھ نہ کچھ پہلے بھی تھا' لیکن فوج نے حال ہی میں جو اقتدار اپنے ہاتھ میں لیا ہے تو مسئلہ اور زیادہ سنگین ہو گیا ہے۔ بنگلہ دیش کی ہزیمت کے بعد بہت سے افسروں کو یہ امید تھی کہ فوج اب بیرکوں میں واپس چلی جائے گی اور جنگی اہلیت پیدا کرنے کے لئے وہ اپنے آپ کو از سرِ نو منظم کرے گی۔ پیشہ ور فوجی (اور ابھی پاکستان کی فوج میں ایسے لوگ موجود ہیں) یہ دیکھ کر فطری طور پر ناخوش ہو جاتے ہیں کہ پاکستان میں ایک ہی سیاسی پارٹی فعال رہ گئی ہے اور وہ فوج ہے۔

این ایچ: کیا نوجوان اور جونیئر فوجی افسر قومی اور نسلی اعتبار سے ویسے ہی ہیں' جیسے پرانے فوجی افسر؟

اقبال احمد: جی ہاں' بہت حد تک۔ افسروں میں زیادہ تر پنجابی ہیں۔ اقلیتی قومیتوں میں صرف پختون ہیں' جن کی کم و بیش مناسب نمائندگی ہوتی ہے اور وہ ان معنوں میں کہ مسلح افواج کے اندر جوانوں اور افسروں میں بھی آبادی کے تناسب سے ان کی تعداد مناسب نظر آتی ہے' لیکن اس سوال پر بعد میں ہم اس وقت گفتگو کریں گے' جب قومیتوں کا سوال آئے گا۔

پانچویں بات جو آج کے پاکستان میں بہت نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ کہ معیشت کا ڈھانچا خاصا کمزور ہو گیا ہے۔ دو باتیں ہیں جنہوں نے ملک کو اقتصادی طور پر بچائے رکھا ہے۔ ایک تو باہر سے رقوم کی وصولی' یعنی غیر ممالک میں مزدوری کرنے والے کارکن' خاص طور پر خلیج کی ریاستوں کے ملازم' جو رقم کما کر پاکستان میں اپنے گھر والوں کو بھیجتے ہیں۔ دوسرے ادھر چند برسوں میں فصلیں اچھی ہوئی ہیں' چنانچہ پاکستان کو اپنی ضرورت کے لئے صرف بیس فیصد خوراک باہر سے درآمد کرنی پڑی ہے' جس کی قیمت غیر ملکوں میں مزدوری کرنے والے کارکنوں کی اجرت سے ادا کی جاتی ہے' ورنہ اقتصادی ڈھانچا تو بری طرح کمزور ہوا ہے اور امکان یہ ہے کہ دو سال بعد اور بھی برا حال ہوگا۔ اس سنگین اقتصادی صورت حال کا پیمانہ غیر ملکی قرضوں کا بڑھتا ہوا بوجھ بھی ہے۔ حکومت کا سب سے بڑا مسئلہ ان قرضوں کی واپسی ہے۔ غیر ملکی قرضوں کی کل مقدار نو بلین ڈالر ہے' جبکہ ہمارا غیر ملکی زرمبادلہ کم ہوتے ہوتے 90،4 ملین تک گر گیا ہے۔ برآمدی تجارت کی آمدنی' قرضے کی واپسی کی شرح کے تناسب سے محض 30 فیصد ہے' جو نہایت حیران کن ہے۔

پاکستان کے سلسلے میں آخری بات جو بہت نمایاں ہے' عام لوگوں کا موڈ ہے۔ یہ بڑا عجیب و غریب موڈ ہے' جو میں نے اس ملک میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ پاکستان کی ایک خصوصیت کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ اگر آپ ہندوستان سے پاکستان میں داخل ہوں' جو اب سے پہلے ہندوستان میں ہی شامل تھا یا ایران یا پھر مصر سے' یعنی ان ملکوں سے جو تہذیبی' سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے پاکستان سے ملتے جلتے ہوں' تو جو بات فوراً آپ کے دل کو لگے گی وہ پاکستان کے گلی کوچوں میں زندگی کی شدت' حرکت اور توانائی' تیز رفتار ٹریفک' راستے چلتے ہوئے لوگوں کی بے ساختہ قہقہے یا گانا یا اٹھلا کر چلنا' وہی گہری مضطرب توانائی' جو کام کرتے

ہوئے کارکنوں میں ہوتی ہے۔ یہ ایک نہایت متحرک خلقت ہے' صحت مند' سخت کوش' منہ پھٹ اور ہر معاملے میں بے ساختہ۔

این ایچ: تقریباً بیروت سے ملتا جلتا شہر؟

اقبال احمد: جی ہاں۔

این ایچ: ایک شہر' جس میں شدت اور گہرائی ہے' بیروت سے بہت مشابہہ؟

اقبال احمد: الجزائر بھی بالکل ایسا ہی تھا۔ تاہم اب جو بات آپ کو فوراً عجیب سی لگے گی' وہ ہے گہری افسردگی' جو پاکستان پر چھائی ہوئی ہے۔ آپ کو محسوس ہوگا کہ ضرور کسی طرح کا غم ہے' جس نے یہاں کے لوگوں کی توانائی سلب کر لی ہے۔ آپ یہ دیکھیں گے کہ کوئی بھی شخص سیاست پر بات نہیں کر رہا ہے' جیسے کہ بھٹو کو پھانسی لگنے سے پہلے کرتے تھے۔ یہاں تک کہ تانگے والے' ٹیکسی ڈرائیور' رکشا ڈرائیور' شہر کے قلب میں رہنے والے لوگ' جن کا محبوب مشغلہ سیاست پر گفتگو کرنا ہوتا ہے' وہ بھی باتیں نہیں کرتے۔ آج کل لاہور میں جہاں کے لوگ پاکستان بھر میں سب سے زیادہ سیاسی اور گرم گفتار مشہور ہیں' وہ بھی نہیں۔ آپ کوئی سیاسی سوال کسی شخص سے کریں' وہی سوال اگر پہلے کبھی اس سے کرتے تو وہ فوراً موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے خیالات آپ پر واضح کرتا' لیکن اب ہوسکتا ہے وہ زیر لب اس مسئلے پر لعنت بھیجے اور آپ کا سوال ٹال جائے۔ اب آپ پوچھیں گے' اس خاموشی' اس افسردگی کی وجہ کیا ہے؟ عام لوگوں سے آپ کوئی بات کریں تو اندازہ ہوگا کہ وہ خوفزدہ نہیں۔ وہ خوف کی وجہ سے چپ نہیں رہے۔ اس کا سبب سیاسی لاتعلقی بھی نہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ ان کے ذہن سیاسی نہیں رہے' بلکہ وہ ایک طرح کے احساس جرم میں مبتلا ہیں۔ شاید ایک شرمندگی ہے جو کچھ ہوسکتا ہے اس میں اپنی ذمہ داری کا احساس۔ ایک عام آدمی کی جانب سے آپ اس احساس ذمہ داری کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں' جنہوں نے 1970ء میں مسٹر بھٹو کو بھاری تعداد میں ووٹ دیئے تھے' کیونکہ انہوں نے وہ انتخاب سوشلزم پر اور عوامی نعروں کی بنا پر لڑے اور جیتے تھے۔ پاکستان کی آبادی 25 سال سے اسلام کے نعرے سن سن کر تھک چکی تھی۔ اسلامی ریاست کے قیام اور اقتصادی ترقی کے منصوبے سن کر اچھی طرح سیراب ہو چکے تھے۔ بھٹو نے ایک ایسے پلیٹ فارم سے اپنی انتخابی مہم کا آغاز کیا' جسے ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہے روٹی' کپڑا اور مکان۔ یہ تھا وہ بنیادی نعرہ جس پر بھٹو نے عام لوگوں سے ووٹ لئے اور بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔

جب 1977ء میں بھٹو نے پہلا انتخاب کرایا تو انہی لوگوں نے خاصی بڑی تعداد میں ان کے خلاف ووٹ دیئے۔ ہمیں یہ علم نہیں کہ ان کی اکثریت تھی' کیونکہ انتخابات میں صریحاً دھاندلی ہوئی تھی اور اتنی زیادہ دھاندلی کہ اب یہ بتانا مشکل ہے کہ ان کی جیت ہوئی یا ہار۔ میرا اپنا تجزیہ یہ ہے کہ 1977ء میں اگر انتخابات آزادانہ طور پر ہوتے تو بھٹو کو بہت معمولی تعداد سے کامیابی حاصل ہوتی اور ووٹروں کو بھی اس

MashalBooks.org

نتیجے سے خوشی ہوتی۔ ووٹر جو کچھ کرنا چاہتے تھے وہ یہ نہیں کہ بھٹو کو اقتدار سے برطرف کردیں بلکہ ان کو تنبیہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ کہتے ہوئے انہیں ایک سبق سکھانا چاہتے تھے کہ جن وعدوں کی بنیاد پر آپ نے اقتدار حاصل کیا وہ وعدے آپ نے پورے نہیں کئے بلکہ ان سے مکر گئے۔ ان کا ووٹ ایک احتجاجی ووٹ تھا مخالفانہ نہیں تھا۔ عام لوگ اس وقت بھی بھٹو کے شکر گزار تھے اس لئے کہ انہوں نے کم از کم صحیح باتوں کا وعدہ تو کیا تھا جو پہلے کسی نے بھی نہیں کیا تھا۔ انتخابات میں دھاندلی کے بعد پاکستان قومی اتحاد نے جو اس وقت حزب مخالف تھی، حکم عدولی اور احتجاجی مہم شروع کر رکھی تھی تاکہ حکومت پر دباؤ ڈال کر دوبارہ انتخاب کرائے۔ نئے انتخابات کی خاطر مظاہروں میں بہت سے لوگ، خاص طور پر شہر کے لوگ، جن میں بیشتر مزدور شامل تھے اور کچھ دیہات کے لوگ بھی شامل ہو گئے۔ مسٹر بھٹو نے اس دباؤ کا سامنا اس طرح کیا کہ فوج طلب کر لی اور جب مارشل لاء لگ گیا تو لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور یہ احتجاج تین مہینے تک چلتا رہا۔ جس میں مظاہرین نے فوج کا بھی سامنا کیا، آخر یہ مرحلہ آیا کہ مسٹر بھٹو گھٹنے ٹیکنے ہی والے تھے اور لگتا تھا کہ وہ نئے انتخابات کرانے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ بس یہی وہ مرحلہ تھا، جس میں فوج نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ 5 جولائی 1977ء کو ضیاء الحق نے فوجی کارروائی کی اور ٹھیک اس وقت کی جب مسٹر بھٹو اور حزب اختلاف کے ارکان انتخاب کے بعد پیدا ہونے والے بحران کے حوالے سے ایک قرارداد منظور کرنے ہی والے تھے۔ آپ لوگوں سے باتیں کیجئے تو وہ کہتے ہیں کہ "ہم نے بھٹو کو 1970ء میں ووٹ دیا تھا۔ ہم میں سے کچھ لوگوں نے ان کے خلاف ووٹ دیا کیونکہ انہوں نے اپنے وعدے پورے نہیں کئے تھے۔ ہم میں سے کئی لوگوں نے 1977ء میں ان کی حمایت میں ووٹ ڈالے لیکن پھر ان کے خلاف مظاہروں میں بھی شریک ہوئے، کیونکہ انہوں نے انتخابات میں دھاندلی کی تھی۔ لیکن ہمارا ارادہ فوج کو اقتدار میں لانا نہیں تھا۔" ملک میں فوجی حکومت کے دوبارہ قیام میں وہ کسی قدر خود کو بھی ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ پھر یہ ہوا کہ بھٹو کو گرفتار کر لیا گیا اور ایک سال تک قید میں رکھنے اور مقدمہ چلانے کے بعد انہیں پھانسی دے دی گئی۔ جب بھٹو کو پکڑا گیا تھا تو عوام کی ہمدردیاں ایک بار پھر ان کے ساتھ ہو گئی تھیں، کیونکہ انہوں نے صاف سمجھ لیا تھا کہ فوج ان کو سزا دے رہی ہے، اس لئے نہیں کہ انہوں نے مبینہ طور پر جرائم کئے تھے، بلکہ اس لئے کہ انہوں نے سچے وعدے کئے تھے اور اس لئے کہ انہوں نے ملک کا سیاسی موسم بدل دیا تھا۔ مزدوروں اور کسانوں کو ایک احساس تفاخر دیا تھا، ان کے حقوق کا سوال اٹھایا تھا۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ اس شخص کو اس کی کوتاہیوں کی نہیں بلکہ اس کی طاقت کی اور نیکیوں کی سزا دی جا رہی ہے۔ بھٹو کے لئے اس ہمدردی نے شدت اختیار کی، لیکن اس کو احتجاج کا رنگ دینے اور لوگوں کی قیادت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ لوگ اس غیر منصفانہ، غیر انسانی قتل کا منظر خاموشی سے دیکھتے رہ گئے۔

این ایچ: تو بھٹو ان کے مطالبات کی علامت کے طور پر زندہ ہے؟

MashalBooks.org

اقبال احمد: بالکل۔ اس کے باوجود لوگ ان کی شہادت کے خاموش گواہ تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ بھٹو ان سے بغاوت کے لئے اٹھ کھڑے ہونے کی توقع کرتے تھے لیکن بغاوت تو نہیں ہوئی۔

این ایچ: کیا اس لئے نہیں ہوئی کہ کوئی قیادت کرنے والا نہیں تھا؟

اقبال احمد: بھٹو کی پارٹی کی قیادت نے منظم طور پر مزاحمت کی کوئی کوشش نہیں کی۔ عام کارکنوں نے بڑی سختیاں برداشت کیں اور مسز بھٹو خود بھی عدالت کے کھیل میں کبھی شریک تھے اور کبھی شریک نہیں تھے۔ اس لئے عام لوگ الجھن میں گرفتار رہے' کسی عوامی کارروائی کا راستہ موجود نہیں تھا۔ اس کے باوجود لوگوں کے اندر بھٹو کے سلسلے میں ایک احساس جرم موجود ہے' اس کے علاوہ جیسا کہ آپ نے ابھی کہا' بھٹو عوام کے کچلے ہوئے حقوق کی علامت بن گئے ہیں۔ زرعی اصلاحات کی علامت' معاشی اصلاحات کی' مساوات کی اور ایک ایسی حکومت کی جو انہیں روٹی کپڑا اور مکان دلائے گی۔ اس کی علامت بن گئے ہیں اور اب کہ فوج نے انہیں قتل کر دیا ہے' لوگ یقین کرنے لگے ہیں کہ وہ شروع سے ہی مسلح افواج اور افسر شاہی کی قید میں تھے اور اسی لئے اپنے وعدے پورے نہ کر سکے۔ لہٰذا ان کے قتل کے معنی یہ ہوئے کہ بھٹو کے سوشلسٹ پروگراموں کی عدم تکمیل اور اس قتل کا الزام اور اس ملک میں جمہوریت کے خاتمے

کا الزام بھی دو اداروں کے سر جاتا ہے۔ مسلح افواج اور افسر شاہی۔ بھٹو پاکستان کے پیرون (peron) بن گئے ہیں۔ اب ملک میں کسی مقبول عام سیاسی طاقت کے ابھرنے کا اس وقت تک امکان نہیں جب تک بھٹو کی طرز کی کسی اور حکومت کا تجربہ اسے نہیں ہوتا۔ آج کل ان کے خاندان پر بڑی توجہ دی جا رہی ہے' کیونکہ بھٹو نے اپنے بعد کوئی سیاسی تنظیم ورثے میں نہیں چھوڑی' ان کی پاکستان پیپلز پارٹی بنیادی طور پر کھوکھلی ہے۔ انہوں نے ورثے میں کوئی پائیدار اور بر سر عمل نظریہ نہیں چھوڑا یا کارکنوں کا منظم اور مربوط کیڈر نہیں چھوڑا' جو عوامی مطالبات کو یکجا کرتا اور انہیں لے کر آگے چلتا۔ ایک زمانے میں پیپلز پارٹی کے پاس اچھے کارکن تھے' لیکن بدعنوانی' اقرباپروری اور کرپشن کی وجہ سے وہ بالکل ہی بددل ہو گئے۔

این ایچ: کچھ اسی طرح آپ کہہ رہے ہیں' جیسے مصر میں ناصر اور سادات کے درمیانی زمانے میں ہوا؟

اقبال احمد: جی ہاں۔ بالکل اسی طرح۔ لیکن ناصر نے مصر کو بنیادی طور پر بدل دیا تھا' انہوں نے بھٹو کی طرح خلا نہیں چھوڑا تھا۔

این ایچ: آپ نے ابھی عام لوگوں کی خاموشی کی بات کی ہے' اس کا سبب کیا تھا؟

اقبال احمد: خاموشی سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ لوگوں کے ذہن سیاسی نہیں رہے یا وہ لاتعلق ہو گئے۔ اسے یوں کہنا چاہیے کہ یہ عوام کے اجتماعی اور انفرادی احساسات ہیں۔ نہایت گہرے احساسات جو دبا دیئے گئے ہیں' بالکل ایسے ہی ہیں کہ اچانک پھٹ سکتے ہیں۔ باہر کے دباؤ کی وجہ سے یا کسی اندرونی بغاوت کے تحت اگر کوئی تبدیلی جلد رونما نہیں ہوتی تو ملک میں عوامی احساسات کے پھٹ پڑنے کا امکان موجود ہے۔

این ایچ: پاکستان کی ریاست میں بحران کے وہ کون سے اسباب ہیں' جو اسے ورثے میں ملے ہیں۔ آپ چاہیں تو آزادی کے بعد کی عمومی صورت حال کے حوالے سے اس پر گفتگو کر سکتے ہیں؟

اقبال احمد: سب سے پہلے تو ہمیں یہ اقرار کرنا ہوگا کہ پاکستان کو کئی طرح کے بنیادی بحرانوں کا سامنا ہے اور اب یہ ہوا کہ سارے بحران اکٹھے سامنے آ گئے۔ ہم ان بحرانوں کو اس طرح بیان کر سکتے ہیں:

(ا) ریاست کا جواز' (ب) ریاستی اقتدار' (ج) ادغام' (د) معیشت اور (ہ) خارجہ تعلقات۔

جواز کا بحران:

ان میں سب سے اہم جواز کا بحران ہے۔ جواز سے میری مراد اقتدار کے استعمال کا اختیار ہے' یعنی کوئی ریاست اور ایک سیاسی طبقہ کس حد تک آبادی کی اکثریت پر احکام نافذ کرنے یا بالادستی رکھنے پر قادر ہے۔ اس کے بعد جواز کے لئے بنیادی اقدار کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ نظریہ ہے اور احکام ہیں' جو حکمراں طبقے کی طرف سے صادر ہوتے ہیں اور آبادی کی اکثریت انہیں تسلیم کرتی ہے اور اکثریتی آبادی کی رضامندی بھی انہیں حاصل ہوتی ہے۔ معلوم نہیں' میں نے اس کی کس حد تک درست صراحت کی ہے' لیکن جواز میں یہی باتیں شامل ہیں۔ اب آپ پاکستان کو لیجئے' یہ ریاست 1947ء میں وجود میں آئی۔ اسے ہندوستان کے برصغیر سے کاٹ کر بنایا گیا۔ اس کی بنیاد مسلم علیحدگی پسندی پر رکھی گئی۔ جس کا بنیادی استدلال یہ تھا کہ ہندوستان کے برصغیر میں دو مختلف عوام ہزاروں سال سے رہتے آئے تھے۔ ہندو اور مسلمان اور انہی سے الگ کردو الگ قومیں وجود میں آئیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ دوسری عالمی جنگ سے پہلے' یعنی 37۔1936ء کے زمانے تک دوقومی نظریے یا تحریک پاکستان کو مسلم عوام کی حمایت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ پھر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کی منظوری کے بعد ہندوستان میں پہلے عام انتخابات ہوئے' ان میں مسلم لیگ کو جس نے تحریک پاکستان کی قیادت کی تھی' صرف 6.2 فیصد مسلم ووٹ ملے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمانوں کی اکثریت نے مسلم لیگی سیاست کی نہیں بلکہ انڈین نیشنل کانگریس اور یونینسٹ پارٹی کی حمایت کی تھی۔ 1937ء میں جب کانگریس نے صوبوں میں حکومتیں بنائیں تو پھر صورت حال بالکل ڈرامائی طور پر بدل گئی۔ کیونکہ مسلم عوام بالعموم یہ محسوس کرنے لگے کہ کانگریس پارٹی پر ہندو اشرافیہ کی بالادستی ہے اور وہ انہیں ملک کی معیشت میں اور اقتدار میں مناسب حصہ دینے کے لئے تیار نہیں۔ آپ تحریک پاکستان کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ مسلمانوں میں اس زبردست ابال کا سبب کیا تھا۔ پاکستان کی تحریک 1938ء اور 1940ء کے درمیانی عرصے میں اقلیتی مفادات پر مبنی ایک چھوٹے سے گروہ سے بڑھ کر ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت کی تحریک بن گئی۔ اب وہ صرف ایک علیحدہ ریاست کا نعرہ نہیں تھا اور نہ اس کے بارے میں تجریدی انداز سے سوچا گیا تھا۔ ایک عام مسلمان کے لئے اس کے معنی ایک ایسی ریاست کا

مطالبہ تھا' جس میں ان کے لئے اقتصادی اور سماجی انصاف ممکن ہوگا۔ سیاسی جمہوریت اور تہذیبی آزادی ہوگی۔ اس کی تہہ میں مسلمانوں کا یہ اندیشہ بھی شامل تھا کہ جب تک ان کی اپنی علیحدہ ریاست نہیں ہوگی۔ ہندو تاجر اور برطانوی کارپوریشنیں اور نوآبادیاتی دور کے ادارے ان پر اپنی بالادستی قائم رکھیں گے۔

این ایچ: تو کیا یہ انصاف اور برابری کا سوال تھا؟

اقبال احمد: جی ہاں۔ انصاف کا سوال تھا۔ اقتصادی انصاف اور تہذیبی آزادی کا سوال۔ مثال کے طور پر پاکستان کی تحریک سب سے پہلے اس علاقے سے اٹھی اور وہیں مقبول ہوئی' جواب بنگلہ دیش کہلاتا ہے۔ وہاں زیادہ تر زمیندار ہندو تھے۔ مسلمان کسان تھے' چنانچہ تحریک وہیں سے شروع ہوئی یعنی جہاں مسلم لیگ کی پہلی حکومت قائم ہوئی اور شروع میں ساری لڑائیاں وہیں کامیاب ہوئیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ بنگالیوں نے ہی اس ملک سے علیحدگی اختیار کرلی' جسے دراصل انہوں نے ہی بنایا تھا۔

میں یہ ساری باتیں اس لئے کر رہا ہوں کہ پاکستان کے قیام کے بعد پاکستان کے حاکم طبقے کو اپنے وجود کا جواز حاصل نہ ہوسکا۔ کیونکہ وہ اس نظریے پر کاربند نہ ہوسکا' ان اقدار پر اور پروگرام پر عمل پیرا نہ ہوسکا اور اس نے ریاست کا ڈھانچہ بھی اس طرح استوار نہیں کیا' جس سے ان امنگوں کی تشفی ہوتی جو پاکستان کی بنیاد تھے۔ سوچئے' دراصل ہمیں کیا ملا؟ 1947ء سے 1957ء تک پہلے دس سال میں اشرافیہ کی جانب سے یہی کوشش ہوتی رہی کہ اسلام کے نام پر ایک فوجی افسر شاہی' جاگیردارانہ نظام کو جائز اور برحق تسلیم کرالے۔ اس اشرافیہ کو پہلا دھچکا اس وقت لگا' جب 1953ء میں اس نے بنگال میں جہاں ملک کی نصف سے زیادہ آبادی رہتی تھی' انتخابات کرائے۔ پاکستان کے عوام نے بھاری اکثریت کے ووٹ سے مسلم لیگ کو اقتدار سے نکال باہر کیا اور نیشنل عوامی پارٹی کو منتخب کیا' جس کا وعدہ تھا کہ مولانا بھاشانی کی قیادت میں ایک سوشلسٹ پروگرام پر عمل کرے گی۔ مولانا بھاشانی مزدوروں اور کسانوں کے ایک مقبول لیڈر تھے' جسے حکومت (سرخ ملا) کہتی تھی۔

لہٰذا پہلا دور تو اس کوشش میں گزر گیا کہ اس ریاست کو ایک جعلی اسلامی نظریے کی بنیاد پر جائز ثابت کیا جائے کہ وہ نظریہ جس میں کوئی سماجی اور معاشی پروگرام تھا ہی نہیں۔ اسے جواز کبھی نہ مل سکا اور حکمران طبقہ حکمرانی کے جواز سے محروم رہا۔ اس کے پاس حکمرانی کا کوئی اختیار نہیں تھا' وہ بامعنی طور پر ریاستی اقتدار کو نافذ نہ کر سکی۔ ابتدا کے دو تین سال تک تو لوگ پرامید رہے' کیونکہ جب کوئی مسلمان کہتا کہ مجھے اسلامی ریاست چاہیے تو یہ کہنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے کہ میں ایک منصفانہ ریاست چاہتا ہوں۔ اس کے لئے ایک اسلامی ریاست کے معنی ہیں' ایسی ریاست جس کی نمایاں خصوصیات مساوات' عدل اور جمہوریت ہو۔ لیکن پاکستانی اشرافیہ اسلام کی تعریف ان خطوط پر نہ کر سکی۔ اس نے مزاحمت کی کہ اسلام میں کوئی سماجی یا اقتصادی متن شامل نہ ہونے پائے۔ لہٰذا ریاست کو اس کے وجود کا جواز نہ مل سکا۔ اس کے بعد دوسرا مرحلہ ایوب خان کا

فوجی قبضہ تھا۔ 1953ء کے انتخابات سے عوام کے توقعات کی نشاندہی ہوگئی تھی۔ پاکستان کی حکمران اشرافیہ اس سے خوفزدہ ہوگئی۔ چنانچہ 1953ء میں جب مشرقی پاکستان کی پارلیمنٹ توڑ دی گئی اور وفاقی حکومت نے وہاں گورنر کا حکم نافذ کر دیا' تو فوجی قبضے کا بندوبست کر لیا گیا تھا۔ جنرل اسکندر مرزا کو جو دفاع کے سیکرٹری تھے' مشرقی پاکستان کا گورنر بنایا گیا۔ پانچ برس بعد وہ پاکستان کے صدر بن گئے اور انہوں نے ایوب خاں کی سربراہی میں فوجی قانون نافذ کر دیا۔ 1953ء کے انتخابی نتائج حکمرانوں کے لئے خطرے کی گھنٹی تھے اب یہ بات صریحاً واضح ہوگئی تھی کہ یہ وہ اسلام نہیں جسے عوام چاہتے تھے اور اگر قومی انتخابات ہوئے تو وہ اسے مسترد کر دیں گے اور انہی حالات میں جب کہ عام انتخابات کی امید کی جا رہی تھی ایوب نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اس نے یہ قبضہ اس وقت کیا جب عوام نے سرکاری اسلام کے نظریے کو رد کر دیا تھا اور سماجی جمہوریت اور اقتصادی اصلاح کے لئے لوگوں کا دباؤ برابر بڑھ رہا تھا۔ یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ ایوب خان نے حکومت پر قبضہ کر لینے کے بعد اسلامی ریاست پاکستان کا لاحقہ ختم کر دیا اور اپنے دس سالہ دور حکومت میں پاکستان کا جواز ثابت کرنے کے لئے ''اسلام'' کا لفظ استعمال نہیں کیا۔

این ایچ: تو کیا انہوں نے قومیت کا نظریہ استعمال کیا تھا؟

اقبال احمد: اس طرح بھی نہیں۔ آپ اسے ترقی پذیر قوم پرستی کہہ سکتے ہیں۔ ایوب خاں نے قوم پرستی کا لفظ استعمال تو کیا' لیکن انہوں نے اقتصادی ترقی پر زیادہ زور دیا۔ ان کے اس نقطہ نظر کی عکاسی ان کی تصنیف فرینڈز ناٹ ماسٹرز سے ہو جاتی ہے' جو انہوں نے پاک امریکہ تعلقات کے موضوع پر لکھی تھی۔ وہ امریکی اتحاد میں شامل رہنا چاہتے تھے' لیکن ایک چھوٹے شریک کار کے طور پر ایک ماتحت کے طریقے سے نہیں۔ ایوب حکومت کا بنیادی نظریہ ترقی کا نظریہ تھا' اقتصادیات کے فروغ کا نظریہ تھا' یہ امریکہ کے آزاد ترقی کے نظریہ سازوں سے ماخوذ تھا۔ یعنی تجدد پسند نظریاتی دانشوروں کا۔ ایوب امریکہ کے انہی آزاد فکر ارکان پر بھروسہ کر رہے تھے کہ وہ پاکستان کے مستقبل کا خاکہ بنائیں گے اور اس کے لئے ہارورڈ ایڈوائزری گروپ جیسے ماہروں کی خدمات کرایہ پر حاصل کیں۔ اپنی تقریروں میں وہ بڑی فراخدلی سے والٹ روسٹو کی تصنیف اسٹیجز آف ڈیولپمنٹ (Stages of Development) کے حوالے پیش کرتے تھے۔ ان کی حکومت اقتصادی ترقی پر زور دے رہی تھی اور اس طرح عوام کی طرف سے حکمرانی کا جواز حاصل کرنا چاہتی تھی۔ ساتھ ہی ان کی حکومت متوسط طبقہ پیدا کر کے اسے توسیع دے رہی تھی' تا کہ اس سے طاقت حاصل کرے۔ اس طرح پہلے دس برسوں میں ہماری اشرافیہ نے اسلام کی نظریاتی گائے سے بوند بوند دودھ نچوڑا' لیکن اس نے بھی کام نہیں کیا۔ 1968ء میں جب ایوب حکومت ختم ہوئی تو وہ اس وقت حقیقتاً عشرہ ترقی منا رہے تھے۔ 1968ء میں جو عوامی شورش برپا ہوئی تھی' وہ چھ اذیت ناک مہینوں تک جاری رہی' بالآخر ان کی حکومت ختم ہوگئی۔

مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو اور مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے لیڈر شیخ مجیب الرحمان بنے' بھٹو ایوب خاں کے پرداختہ اور مجیب مسلم لیگ کی پیداوار' ان دونوں نے بڑی تیزی سے یہ بھانپ لیا کہ اسلامی گائے اور ترقیاتی گائے' دونوں کے تھن سوکھ چکے ہیں اور اب عوام کو ایسی حکومت چاہیے جس کی بنیاد مذہبی نعروں پر نہ ہو اور نہ ترقیات کے نعروں پر ہو' بلکہ ایسی حکومت ہو جس کی بنیاد عوام کی ضرورتوں کی تکمیل پر ہو۔ یعنی روٹی' کپڑا اور مکان۔ اس طرح ہم عوام پسند نعرے بازی کے زمانے میں آتے ہیں۔ یاد رکھئے کہ بھٹو خود بھی ایوب حکومت کی پیداوار تھا۔ اسے سیاست کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ حکومت نے پہلے تو اسے تجارت کا وزیر اور پھر وزیر خارجہ بنایا۔ اس وقت تک اسے پاکستان میں اس کی آبائی ریاست لاڑکانہ اور کراچی کے سوشل کلب سے باہر کوئی نہیں جانتا تھا۔ بھٹو کے عزائم بہت اونچے تھے' جہاں موقع دکھائی دیتا' اسے فوراً سمجھ لیتا۔ لیکن اس کے حصول میں جو بنیادی اور گہرے خطرات تھے' انہیں سمجھنے میں اسے دیر لگتی تھی۔ اس نے ایوب خاں کا ساتھ بالکل بر وقت چھوڑا' یعنی جب ان کی حکومت ختم ہوئی اس سے چھ سات مہینے پہلے۔ بھٹو نے اصلاح اور سوشلزم کے وعدے کی بنیاد پر حکمرانی کا جواز حاصل کرنا چاہا۔

اب ہم چوتھے دور میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ ہے ضیائی فوجی حکومت کا دور۔ اس کا سرے سے کوئی نظریہ نہیں' کوئی اصول نہیں' جن کی بنیاد پر وہ اپنی حکومت کو جائز قرار دے سکے۔ اسلامی ریاست کا تصور پہلے ہی کھوکھلا ہو چکا تھا۔ ترقی کے تصورات میں بھی کوئی دم نہیں رہا تھا۔ سوشلزم نے عوامی شعور میں خطرناک قسم کی تحریک پیدا کر دی تھی۔ بہر طور یہ بھٹو کے نام سے منسوب ہو گئی تھی اور اسے تو نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا وہ ایک بار پھر اسلامی گائے کی طرف واپس آ گئے اب اسے ایک دوسرا نام دے دیا ہے۔ اب وہ اسے نظام مصطفیٰ ﷺ کہتے ہیں' لیکن گدھے کو ہاتھی کہنے سے وہ ہاتھی نہیں ہو جاتا۔ دراصل اسلام کا یہ روپ جو اب پیش کیا جا رہا ہے' پہلے سے بھی زیادہ رجعت پسندانہ ہے' کیونکہ اس کا حوالہ محض ایک بنیاد پرست گروہ ہے۔ یعنی جماعت اسلامی۔ اب سے پہلے دور کا اسلام یعنی آئینی دور کا اسلام' کم از کم جدید اسلامی تحریک سے ماخوذ تھا۔ اس کا حوالہ محمد اقبال' سید احمد خاں اور شبلی نعمانی وغیرہ تھے۔ یہ جدید مسلمان مفکر تھے' ان کا کم از کم معاصر بورژوا اسلام تھا۔ فوجی حکومت بنیاد پرستی پر مبنی اسلام کو نافذ کرنا چاہتی ہے اور ایک ایسے ملک میں جو بنیاد پرستی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ لہٰذا پاکستان کا اصل بحران' اس کے جواز کا بحران ہے جسے نظریاتی صراحت کی ضرورت ہے' اسی پر مبنی اس کا تشخص ہے۔ کوئی سیاسی پارٹی' کوئی حکمران اشرافیہ' بائیں بازو کی ہو یا دائیں بازو کی یا درمیانہ راہ پر چلنے والی' ابھی تک کسی ایسے نظریے کی تعریف نہیں کر سکی' جس میں یکسانیت ہو' جو بر سر عمل ہو اور جو ملک کی تاریخ سے ہم آہنگ ہو' یا عوام کی امنگوں کے مطابق ہو۔ ایک ایسے ملک میں جہاں ایک قابل عمل نظریہ موجود نہ ہو یا ایسی سیاسی اقدار جو سب کے لئے قابل قبول ہوں' موجود نہ ہوں تو وہاں قومی تشخص کا بحران اور اس کے جواز کا بحران اور اس کی وجہ سے ریاستی اقتدار کا بحران پیدا ہو گا۔

MashalBooks.org

ریاستی طاقت کا بحران

آج پاکستان کا دوسرا بحران ریاستی طاقت کا بحران ہے۔ پاکستان کو ورثے میں ایک نوآبادیاتی ریاست ملی۔ اس کا تھوڑا رشتہ نوآبادیاتی دور سے پہلے کی ریاست خاص طور پر مغلیہ ہندوستان سے ملتا جلتا تھا' لیکن یہ بنیادی طور پر نوآبادیات کی پیداوار تھی۔ برطانوی ہند کی مسلح افواج اور جدید افسر شاہی اس کی ریڑھ کی ہڈی تھیں۔ پاکستان کے ریاستی ڈھانچے کا استحکام ایک طرح سے طاقت کے توازن کی بدولت تھا اور مسلح افواج اور افسر شاہی کے درمیان کسی قدر سماجی اور نظریاتی ہم آہنگی موجود تھی۔ چنانچہ 1947ء اور 1970ء کے درمیانی عرصے میں اگر غیر مستحکم حکومتیں قائم رہیں' اس کے باوجود افسر شاہی حکومت کا بندوبست چلاتی رہی اور مسلح افواج متحرک ہوتے ہوئے یہ ظاہر کرتی رہیں کہ وہ چست اور مستعد ہیں۔ افواج اور افسر شاہی کے درمیان اس توازن اور ہم آہنگی کی بدولت پاکستان میں فوجی آمریت کا تصور کسی قدر کند ہو گیا تھا۔ مثال کے طور پر ایوب خاں کی حکومت نہ تو اتنی ظالمانہ تھی اور نہ اس قدر ریک۔ وتنہا تھی جیسی ضیاءالحق کی حکومت ہے کیونکہ ایوب خاں کی حکومت میں فوج اور افسر شاہی کے درمیان نہایت قربت اور ہم آہنگی تھی اور دونوں مل جل کر کام کرتے تھے۔ جمہوری اداروں کی عدم موجودگی میں افسر شاہی فوجی حکومت کے کردار کو شہری طور طریقوں سے ہم آہنگ کرتی تھی۔ اب ان دونوں کے درمیان توازن بالکل ختم ہو گیا ہے' اس لئے نہیں کہ فوج بہت مضبوط ہو گئی ہے' بلکہ اصل بات یہ ہے کہ افسر شاہی بہت کمزور ہو گئی ہے۔ فوج اور افسر شاہی کے درمیان عدم توازن کا عمل بہت پہلے شروع ہو گیا تھا' لیکن اس کو مکمل کرنے کی ذمہ داری مسٹر بھٹو پر عائد ہوتی ہے۔

جب بھٹو برسر حکومت آئے تو انہیں ورثے میں ایک ایسی فوج ملی جو اپنا جواز کھو چکی تھی۔ اپنی اہلیت گنوا چکی تھی اور ٹوٹ چکی تھی۔ یہ وہ فوج تھی جس نے 1965ء میں ایک بے نتیجہ جنگ لڑی اور 1971ء میں جنگ ہار گئی۔ نوے ہزار کی تعداد میں اس کے افسر اور جوان' مشرقی پاکستان میں ہندوستانی حملے کے نتیجے میں قید کر لئے گئے تھے۔ یہ وہی فوج تھی جس نے بنگلہ دیش کو ہراساں کر رکھا تھا اور پاکستان کے بیشتر لوگوں کو اس کا علم تھا اور وہ بنگلہ دیش یعنی مشرقی پاکستان کے زیاں کا ذمہ دار فوج کو ہی قرار دیتے تھے۔ مزید یہ کہ یہ وہی فوجی حکومت تھی جس کے خلاف عام لوگوں نے 1968ء میں بغاوت کی تھی اور جو 1970ء تک مختلف حیلوں سے حکومت میں رہی اور جب یحییٰ خان نے انتخابی نظام میں کھیلا کیا' ان معنوں میں کہ انتخابات تو منصفانہ ہوئے لیکن فوج اس کے نتائج کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھی' تو اس کے نتیجے میں بنگلہ دیش قائم ہو گیا۔ یوں جب بھٹو برسر حکومت آئے تو اس وقت تک فوج بے توقیر' دل شکستہ' اپنے جواز سے محروم اور نہایت کمزور ہو چکی تھی۔ پاکستان کے لئے اس سے بہتر کوئی موقع نہ تھا کہ اس بدترین نوآبادیاتی اور

MashalBooks.org

نئے نوآبادیاتی ورثے سے جان چھڑا لے۔اس سے اچھا کوئی موقع نہ تھا کہ سول حکمرانی کو ایک ادارے کی طرح مستحکم بنائے‘ اس کی از سر نو تنظیم کرے‘ اسے پیشہ ورانہ خطوط پر چلائے اور فوج کو اس کی صحیح جگہ یعنی بیرکوں میں اور سرحدوں پر واپس بھجوادے۔لیکن بھٹو نے فوج کی ساکھ پھر جمادی۔اگرچہ اس طرح کی کوشش کی کہ فوج ان کے ذاتی اقتدار کی آلہ کار بن کر رہے۔انہوں نے فوج کے ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور نہ اس کے کردار اور کارکردگی کی از سر نو تشریح کی۔البتہ افسروں کی تطہیر کی اور ضیاء الحق جیسے افسروں کو جنہیں وہ اپنا وفادار سمجھتے تھے‘ اعلیٰ کمان کا مستحق قرار دیا۔

این ایچ: دوسرے الفاظ میں کیا وہ فوج اور افسر شاہی کی تشکیل نو کر کے ریاست کا ڈھانچا دوبارہ بنانا چاہتے تھے؟

اقبال احمد: بھٹو فوج کی ساکھ تو دوبارہ بحال نہ کر سکے‘ لیکن اس کی ایک امتیازی حیثیت ضرور بحال کر دی۔ ایک طرح سے بھٹو کو بھی 1972ء میں وہی مواقع میسر تھے‘ جس طرح آج ایران کے انقلاب کو حاصل ہیں۔بھٹو کو ریاستی ڈھانچے کی دوبارہ تشکیل کا موقع حاصل تھا‘ کیونکہ اقتدار کے مالک تھے‘ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔اسی طرح ریاستی ڈھانچے کو پھر سے قائم کرنے کا موقع تھا‘ لیکن انہوں نے یہ بھی نہیں کیا۔اسی طرح انہیں یہ موقع مل گیا تھا کہ ریاست کے موجودہ ڈھانچے میں انتہا درجے کا عدم توازن پیدا کریں اور یہ کام انہوں نے کیا۔ایک طرف تو انہوں نے مسلح افواج کو مستحکم بنایا اور دوسری طرف افسر شاہی کو خوفزدہ رکھا۔اسے تباہ تو نہیں کیا لیکن اسے اپنی مصلحت کے سانچے میں ڈھالا۔مثال کے طور پر انہوں نے حکومت میں آتے ہی دو ہزار اعلیٰ افسروں کو برطرف کر دیا۔ایک نیا نظام ”لیٹرل انٹری“ (براہ راست داخلے) کا شروع کیا گیا تا کہ اعلیٰ درجے کے افسروں کے درمیان داخلے اور تربیت کا معیار گھٹا دیا جائے‘ جو پہلے سے ہی بہت سخت تھا۔چنانچہ اس نئے نظام کے تحت سیاسی بنیاد پر تقرریاں ہوئیں اور سیاسی سرپرستی کا ایک نیا طریقہ رائج ہوا۔اس کے علاوہ افسر شاہی میں قومی سلامتی کے شعبے میں نہایت تیزی سے توسیع ہوئی۔ان کی تعداد کے ساتھ ہی اختیارات میں بھی اضافہ ہوا۔جس کی قیمت سول شعبے کو ادا کرنی پڑی۔مراد اس سے یہ ہے کہ فیڈرل سیکورٹی فورسز‘ مرکزی انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ اور محکمہ پولیس وغیرہ میں بڑی تیز رفتاری سے توسیع ہوئی۔جبکہ سویلین شعبے‘ یعنی انصاف‘ سماجی تعمیر نو‘ تعلیم اور صحت کے شعبے‘ عدم توجہ اور احساس محرومی کے شکار ہو گئے۔

بھٹو حکومت کا ایک اور المیہ بیان کر دوں۔ایوب خاں کے زمانے میں افسر شاہی نے فوجی حکومت کو سویلین طور طریقوں سے آشنا کیا تھا۔بھٹو نے سول حکومت میں سیکورٹی کے شعبے کی توسیع اور فوجوں کی دوبارہ ساکھ بٹھا کر اسے فوج کے کردار سے ہم آہنگ کر دیا۔نتیجہ یہ کہ مسلح افواج اور افسر شاہی میں طاقت کا شدید توازن پیدا ہو گیا۔بھٹو کی حکومت میں سول انتظامیہ اپنے دیرینہ قرینوں سے اور اخلاقیات سے محروم ہو

MashalBooks.org

گئی۔حکومت اور انتظامیہ کی بجائے وہ ذاتی اقتدار کا آلہ کار بن گئی۔

این ایچ: اس سے پہلے آپ نے بتایا تھا کہ طاقت کا توازن ہی نہیں بگڑا' فوج اور افسر شاہی کے درمیان ہم آہنگی بھی نہیں رہی۔کیا آپ اس کی وضاحت کریں گے؟

اقبال احمد: اس تبدیلی کے دوران فوج کے افسروں اور اعلیٰ سول عہدیداروں کے درمیان سماجی اور طبقاتی سطح پر جو ہم آہنگی تھی' وہ ختم ہو گئی۔ یہ بھٹو کی ذمہ داری نہیں تھی۔ مسلح افواج کے اندر افسروں کے درجے میں ان کا طبقاتی ڈھانچا تبدیل ہو گیا تھا۔اس وقت تک وہ بیشتر فوجی جو انگریزوں کے تربیت یافتہ' سینڈ ہرسٹ کے گریجویٹ' دوسری عالمی جنگ کے تجربوں سے گزرے ہوئے' جنہیں تمغے بھی ملے تھے اور جو بالعموم اوپر کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے' یعنی جاگیردار اور اشرافیہ کے لوگ تھے اب ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچ گئے تھے یا ملازمت سے نکالے جا چکے تھے۔ایسا بہت سا کام بھٹو کی حکومت میں ہوا' کچھ ایوب کے دور میں ہوا اور اب نوجوان افسروں کو تیزی سے ترقیاں دی گئیں۔ان افسروں کی بالکل مختلف تربیت ہوئی اور طبقاتی پس منظر بھی جداگانہ تھا۔وہ افسر جو 1970ء کی دہائی تک فوج میں کمان کر رہے تھے' وہ بورژوا طبقے سے آئے تھے۔ بیشتر راولپنڈی ڈویژن کے چار اضلاع یا مشرقی پنجاب کے درمیانہ کسان خاندانوں سے تھے۔ضیاءالحق اسی دوسرے گروہ سے تھے۔ یہ لوگ جنہوں نے ایک یا دو سال کالج میں پڑھا تھا' اعلیٰ درجے کے فوجی تربیتی اداروں میں کبھی نہیں گئے ۔وہ آزادی سے کچھ ہی دنوں پہلے قومی ایجی ٹیشن کے ہنگامہ پرور زمانے کے پروردہ تھے۔اس طرح کچھ سیاست سے متعارف ہو گئے تھے' وہ فوج میں اس وقت داخل کئے گئے جب برطانوی حکومت نے دوسری عالمی جنگ کے آخری برس میں بڑے پیمانے پر فوجی بھرتی شروع کر رکھی تھی۔یا انہیں فوج میں اس وقت داخل کیا گیا جب آزادی کے فوراً بعد افسروں کے درجے میں تیزی سے توسیع ہوئی۔ان میں سے بہت سے افسر عارضی طور پر بھرتی کئے گئے تھے اور بہتوں کو 1947ء میں پاکستانی فوج کے اندر باقاعدہ کمیشن دیا گیا ۔نہ صرف یہ کہ ان افسروں کا سماجی پس منظر گزشتہ نسل کے افسروں سے مختلف تھا بلکہ ان کی سیاسی تعلیم اور پیشہ ورانہ تربیت بھی مختلف انداز سے ہوئی ۔مثال کے طور پر یہ وہ افسر تھے' جنہیں توسیعی تربیت امریکی اداروں میں حاصل ہوئی۔ان کو شورش و فساد سے نبٹنے کی تربیت دی گئی اور کمیونسٹ دشمن' انقلاب دشمن نظریاتی انداز فکر ان کے ذہنوں میں بٹھایا گیا۔فورٹ براگ (Fort Bragg)' اس کی بہت اچھی مثال ہے' بھٹو نے ان میں سے بہت سے افسروں کو ترقی دے کر سینئر جرنیلوں کے اوپر بٹھا دیا۔میرا خیال ہے کہ جنرل ضیاءالحق کو تقریباً بارہ سینئر اور نہایت معتبر افسروں کے اوپر ترقی دی گئی' کیونکہ بھٹو نے ان کی مفروضہ وفاداری کے عوض انہیں چن لیا تھا۔

این ایچ: وہ بھی کیا المیہ تھا؟ ادغام کا بحران!

اقبال احمد: چنانچہ اب ہمیں پاکستان میں جو کچھ نظر آتا ہے' وہ یہ ہے کہ نوآبادیاتی ریاست جو ورثے میں

MashalBooks.org

ہمیں ملی تھی' اپنا سابقہ توازن اور اپنی معنویت کھو چکی ہے۔ ضیاء الحق نے اعلیٰ سول عہدیداروں سے اتحاد کر کے اور افسر شاہی کی اہمیت میں قدرے اضافہ کر کے اس عدم توازن کو کم کرنے کی کوشش کی ہے' لیکن یہ کوشش کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی' جیسا کہ میں نے پہلے کہا۔ پہلی بار ایسا ہوا کہ افسر شاہی نے فوجی افسروں سے پوری طرح تعاون نہیں کیا۔ ریاستی طاقت کے اس بحران میں اضافہ ادغام کے بحران کے باعث ہوا ہے۔ اس کا تعلق پاکستان میں قومیتوں کے سوال سے ہے۔ پاکستان میں چار قومیتیں آباد ہیں' پنجابی' پختون' سندھی اور بلوچ۔ آخری دو قومیتوں کو عملاً ریاستی ڈھانچے سے باہر رکھا گیا ہے۔ سندھیوں اور بلوچیوں کی تعداد' فوج میں بمشکل ایک فیصد ہے۔ وفاقی افسر شاہی میں ان کی تعداد بہت ہی معمولی ہے اور ملک میں تجارتی اور سرمایہ کاری شعبے میں ان کی موجودگی بمشکل نظر آتی ہے۔ برسر حکومت اشرافیہ کی جو نسلی ساخت ہے' اس سے اداروں کے عدم توازن میں اور بھی اضافہ ہوا ہے۔

این ایچ: سرمایہ دار طبقہ فوجی حکومت کو کس نظر سے دیکھتا ہے؟ کیا یہ بندوبست ویسا ہی ہے' جیسا کہ شام یا عراق میں ہے؟

اقبال احمد: جی ہاں۔ لیکن شام' عراق اور پاکستان میں فرق یہ ہے کہ مسلح افواج' افسر شاہی اور سرمایہ دار طبقہ' میرا مطلب یہ ہے کہ دولت مند طبقہ بڑی حد تک پنجابی ہے۔ یہ اس قومیت سے تعلق رکھتا ہے' جو پاکستان کی آبادی کا ساٹھ فیصد ہے۔ شام کی حکمران اشرافیہ الوایت (Alwite) محض ایک چھوٹی سی اقلیت کی نمائندہ ہے۔ کچھ یہی بات عراقیوں پر صادق آتی ہے' یہ ایک بنیادی فرق ہے' کیونکہ اس طرح پاکستان کے حکمرانوں کو ایک وسیع اور مضبوط حکومتی بنیاد مل جاتی ہے' اس بات کا موقع مل جاتا ہے کہ نسلی کشیدگی کو اپنے مفاد میں استعمال کریں اور اس میں اضافہ کریں اور اس طرح پنجابی اکثریت کی حمایت حاصل کریں۔ اور یہ بات علیحدگی پسندی کا خطرہ پیدا کر کے پاکستان کو توڑنے کا سبب بن سکتی ہے۔ لہٰذا حکومت جس قدر اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی ہے' اس قدر اس کے لیڈر پاکستان کے ٹوٹنے کا ہوا کھڑا کرتے ہیں۔ اس طرح یہ کہہ کر کہ قومی اتحاد کو خطرہ لاحق ہے' مزید مرکزیت پسندی اور اختیارات کے تحکمانہ استعمال کا جواز پیدا کیا جاتا ہے۔

این ایچ: ادغام کے بحران سے آپ کی مراد کیا ہے' کیا آپ مزید صراحت کریں گے؟

اقبال احمد: جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ پاکستان میں چار قومیتیں آباد ہیں۔ سب سے بڑا اور بالادست گروہ' یعنی تعداد میں سب سے زیادہ اور سیاسی اور اقتصادی طور پر سب پر حاوی پنجابی ہیں۔ جو آبادی کا تقریباً ساٹھ فیصد ہیں' ان کی تعداد کا تناسب فوج میں 80 فیصد' 80 سے 85 فیصد اونچے درجے کی افسر شاہی میں اور تقریباً 80 فیصد کاروباری اور سرمایہ دار طبقے میں ہے۔ وہ دولت کے مالک ہیں اور ملک میں طاقت کے تمام اداروں پر انہی کا قبضہ ہے۔ ان کی تعداد پانچ کروڑ ہے۔ اس کے بعد پختون آتے ہیں' یہ

علاقہ افغانستان اور روس کی سرحد کے قریب ہے۔ان کی آبادی 72 لاکھ پچاس ہزار ہے۔تیسری قومیت سندھیوں کی ہے جو تعداد میں دوسرے نمبر پر ہے۔ یہ ایک کروڑ 5 لاکھ سے دو کروڑ تک ہیں۔ اس کے بعد بلوچ ہیں۔

پاکستان کے قیام کے بعد ہی سے حکومت نے پختونوں کی علیحدگی پسندی کی تحریک کے امکان کا اظہار کیا۔ یہ خطرہ شمال مغربی سرحدی صوبے کی طرف سے پاکستان کو لاحق ہوتا ہے۔اس خطرے کے دو حصے ہیں۔اول یہ کہ پختون تحریک کو افغانستان کی حمایت حاصل ہے۔پختون باشندے بٹے ہوئے ہیں۔ان کی تقریباً آدھی تعداد پاکستان میں اور آدھی افغانستان میں ہے۔اس خطرے کا دوسرا جز روس کا مفروضہ خوف ہے۔پاکستان کے حکمران طبقے نے ''روسی خطرے'' کو اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ پختونوں کی تحریک کی مدد کر رہا ہے اور اس طرح پاکستان کی سالمیت کو تباہ کر رہا ہے۔تاہم حقیقت یہ ہے کہ ادغام کے حوالے سے پاکستان کے لئے کم از کم اندیشہ پختونوں سے ہے اور وہ اس لئے کہ تین اقلیتی قومیتوں میں پاکستان کے ساتھ پختون ہی سب سے زیادہ مدغم ہو چکے ہیں۔اس کی کچھ نشانیاں یہ ہیں۔پاکستان کی فوج کے افسروں میں پختون کوئی پندرہ فیصد ہیں اسی طرح ان کی نمائندگی افسر شاہی کے اونچے طبقے میں ہے۔پاکستان کے درمیانہ طبقے اور اوپر کے بورژوا طبقے میں ان کی خاصی تعداد ہے اور وہ باقی پاکستان میں پوری طرح مدغم ہیں۔دوسرے صوبہ سرحد پاکستان کے اندر اقتصادی طور پر پوری طرح مدغم ہے۔صوبہ سرحد کی تجارت اور مالی لین دین ساٹھ تا ستر فیصد پنجاب اور دیگر صوبوں کے ساتھ ہے۔ چنانچہ مشترک اقتصادی روابط پیدا ہو گئے ہیں۔تیسری بات یہ کہ پختونوں کی آدھی مرد آبادی اپنے صوبے سے باہر کام کرتی ہے۔ یہ لوگ پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔صرف کراچی میں تین لاکھ پختون کارکن موجود ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ پختون آبادی کا بڑا اہم حصہ گزر اوقات کے لئے پشتونستان سے باہر کی محنت پر انحصار کرتا ہے۔ان اسباب کی بنا پر پختون آبادی دوسرے صوبوں کے مقابلے میں پاکستان کے اندر بخوبی مدغم ہے۔اسے اپنی علیحدہ ریاست سے کم سے کم دلچسپی ہوگی۔

اب اس کا تقابل سندھ اور بلوچستان سے کیجئے۔سندھی پاکستان کی آبادی کا تقریباً 25 فیصد ہیں لیکن افسر شاہی کے اعلٰی طبقے میں ان کی نمائندگی تین فیصد سے زیادہ نہ ہوگی اور فوج میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ جوانوں میں بھی اور افسروں میں بھی۔تجارتی لحاظ سے یہ ملک کے اندر کوئی طاقت نہیں ہیں اور اپنے صوبے کے اندر تو اور بھی خراب حال ہیں اور ان کے اندر یہ احساس پایا جاتا ہے کہ پنجابیوں اور مہاجروں نے یعنی ہندوستان کے صوبوں سے آنے والوں نے ان پر قبضہ کر رکھا ہے۔سندھ کی آبادی میں غیر سندھیوں کا تناسب تقریباً 49 فیصد ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں اس سے بھی زیادہ یعنی 52 تا 55 فیصد ہے۔اگر دوسرا تخمینہ زیادہ صحیح ہے تو سندھ بیسویں صدی کی تاریخ میں وہ جگہ دوسرے نمبر پر ہوگی جہاں کی آبادی اپنے

ہی وطن میں اقلیت بنا دی گئی۔ پہلا مقام فلسطین کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سندھیوں میں کچلے جانے کا احساس بہت شدید ہے۔ اقتصادی طور پر ان کے ساتھ انہی کے صوبے میں امتیاز برتا جاتا ہے۔ آبپاشی کی سہولتوں میں اضافے سے سندھ میں خاصی زمین کاشت کے لئے تیار کی گئی ہے۔ یہ تقریباً ساری زمین پنجابی آباد کاروں کو دے دی گئی۔ کچھ غیر سندھی مہاجروں کو ملی اور بہت ہی کم سندھیوں کو۔ وسائل سے محرومی، امتیاز اور غیر مساوی ترقی کا تقریباً یہی قرینہ بلوچوں کے ساتھ برتا گیا ہے۔ پاکستان میں ان دونوں قومیتوں کے بڑے سنگین مسائل ہیں اور اسی لئے اب وہ جمہوری حکومت کے مطالبے میں سب سے آگے ہیں۔ پارلیمانی حکومت کے ہوتے ہوئے کچھ ان کی نمائندگی ہوگی، جس میں ان کے بورژوا بھی شامل ہوں گے۔ ان کی عددی قوت کا اندازہ اور ان کی شکایات کا سنجیدگی کے ساتھ ازالہ صرف ایک نمائندہ حکومت میں ممکن ہے۔ یہ اقلیتی قومیتیں، وفاقی طرز حکومت میں زائد صوبائی خودمختاری بھی چاہتی ہیں، کیونکہ کسی قدر خودمختاری کے لئے اور ایسی حکومت کے لئے جو جواب دہی بھی کرتی ہو، عدم مرکزیت کا ہونا بھی لازمی ہے۔

این ایچ: اس لئے آپ کے خیال میں قومیت کا مسئلہ سندھ اور بلوچستان میں، صوبہ سرحد کے مقابلے میں زیادہ سنگین ہے؟

اقبال احمد: جی ہاں۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ سندھ اور بلوچستان کے صوبوں میں شکایات کے ابھرنے کا زیادہ امکان ہے۔ میں اس لئے اس بات پر زور دے رہا ہوں کہ اس کا تعلق معیشت کے بحران سے اور بین الاقوامی تعلقات کے بحران سے بھی ہے۔ سندھ شدید اہمیت کا حامل ہوگا کیونکہ سندھی محسوس کرتے ہیں کہ وہ اپنی ہی زمین پر اقلیت بن گئے ہیں۔ پاکستان میں صرف وہی لوگ ہیں جن کی زمینیں دوسرے صوبوں کے آبادکاروں نے ہتھیا لی ہیں۔ دوسرے ایک نہایت ظالمانہ جاگیرداری حکمرانی ہے، یہ ایک غیر معمولی طور پر محروم صوبہ ہے۔ سندھ میں جاگیرداری نظام حسب سابق مسلط ہے اور یہاں اراضی کے نظام میں جو تبدیلی ہوئی ہے، اس سے غریب سندھیوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ تیسرے خلیج فارس کی ریاستوں سے اور باقی عرب ممالک سے شیوخ کی بڑی تعداد میں آمد بھی ان کے لئے مصیبت بن گئی ہے۔ لبنان کی خانہ جنگی کے بعد سے تیل کی دولت سے مالا مال عرب کراچی آنے لگے ہیں اور اب یہاں امارت اور غربت کا ایک نیا فرق ابھر کر سامنے آ رہا ہے۔ آخری بات یہ کہ مسٹر بھٹو کی پھانسی سندھ کی شہادت اور اس صوبے کے مصائب و آلام کی علامت بن گئی ہے۔ بھٹو ایک سندھی تھے، سندھ کے پہلے وزیراعظم تھے۔ اس زمانے میں بھی جب سندھی ان کے مخالف تھے، کم از کم انہیں یہ احساس تھا کہ بھٹو ایک سندھی ہیں۔ بہت سے سندھیوں کو یہ احساس ہے کہ انہیں پنجابی فوج نے قتل کیا، کیونکہ وہ ایک سندھی تھے۔ وزیراعظم تھے، سندھ میں ہراس اور اضطراب کے پسماندگی اور تنہائی اور غم و غصے کے جو احساسات پہلے سے موجود تھے، بھٹو کی پھانسی نے ان میں اضافہ کر دیا ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ سندھ کی سرحد ہندوستان سے ملتی ہے۔ اس کا ساحل خلیج فارس سے

MashalBooks.org

ملتا ہے اور اس کے طویل تاریخی رشتے صوبہ بلوچستان سے ملتے ہیں۔ بلوچ جو پاکستان کی دوسری ستم رسیدہ قومیت ہیں بیس سال سے بغاوت کی کیفیت سے گزر رہے ہیں۔ اگر موجودہ صورت حالات برقرار رہتی ہے اور فوجی حکومت اپنا تسلط قائم رکھتی ہے تو امکان یہ ہے کہ شورش سندھ سے شروع ہوگی۔ دراصل پاکستان کی مسلح افواج کی موجودگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ فوجی حکومت اس امکان سے باخبر ہے۔ انہوں نے سندھ میں اور اس کے آس پاس خاصی طاقت مرکوز کر رکھی ہے۔ اگر سندھ میں کوئی دھماکہ ہوتا ہے تو بلوچ ان کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ اور بلوچ اور سندھی علیحدگی پسند آپس میں مل گئے' جبکہ ان کی تعداد پاکستان کی کل آبادی کا 35 فیصد ہے' تو اس طرح کی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے' جو 71-1970ء میں بنگلہ دیش میں پیدا ہوئی۔

این ایچ: کیا اس کا مطلب ہوگا' زمینی رقبے کا 40 فیصد۔

اقبال احمد: اس کا مطلب ہوگا زمینی رقبے کا ساٹھ فیصد اور آبادی کا 30 فیصد۔ اس وقت یہ امکان ہوگا کہ اس شورش میں ہندوستان بھی شامل ہو جائے' روس پہلے ہی کسی حد تک ملوث ہے' امریکہ بھی اس میں ملوث ہے اور ایران چونکہ متاثر ہوگا' اس لئے اس کی طرف سے شمولیت کا امکان بہت زیادہ ہوگا۔ اس طرح پاکستان کے دونیم ہونے کا بھیانک اندیشہ اس طرح پیدا ہوگا' جیسے بنگلہ دیش میں پیدا ہوا تھا۔

این ایچ: اگر میں اسے مختصراً بیان کروں تو آپ گویا یہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان کی ریاست ابھی تک اپنی طاقت کو مربوط اور مدغم نہیں کر سکی۔ اس لئے ملک پر اور جغرافیائی حدود میں آبادیاں کے لوگوں پر اس کا تسلط ہے۔ کیا اس کا مقصد غالباً ملک کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا ہے؟

اقبال احمد: جی ہاں' میں یہی کہہ رہا ہوں۔ ایک بات اور وہ یہ ہے کہ ریاست ملک پر بہ اعتبار مجموعی اپنی بالادستی قائم کرنے میں ناکام رہی ہے اور اس کا اصل سبب ریاستی بورژوا طبقہ ہے' افواج اور سول افسر شاہی ہے' جنہوں نے ایک سیاسی عمل کو جاری ہونے نہیں دیا' جس کی بدولت طاقت کی منصفانہ تقسیم عمل میں آتی اور ترقی زیادہ ہموار اور مساوی طور پر ہوتی۔ پاکستان میں ادغام کے بحران کا اصل سبب یہ حقیقت ہے کہ ریاست میں فوج کی حکمرانی ہے اور اس میں مرکزیت بہت ہے۔ المیہ یہ ہے کہ یہی پاکستان کی سالمیت اور ایک ملک کے طور پر اس کے دفاع کو یقینی بنانے کا معاملہ تھا' جس کے لئے اتنے سال تک فوجی حکومت کی موجودگی کا جواز پیش کیا جاتا رہا اور امریکہ کے ساتھ معاہدوں کو جائز کہا گیا اور یوں ایک قومی سلامتی کی ریاست قائم کی گئی۔ تاہم یہ وہی ریاست کی "قومی سلامتی" ہے جس سے بالآخر خطرہ لاحق ہوا اور مشرقی پاکستان کے معاملے میں تو واقعی اس کے باعث پاکستان کی قومی سلامتی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ جب مغرب نواز "سیکورٹی اسٹیٹ" قائم کی گئی اور معاہدے کے مطابق حکومت کو مرکزیت کا پابند کیا گیا اور فوجی طرز کی سیاست کا آغاز ہوا تو ملک کو عدم تحفظ اسی وقت لاحق ہو گیا تھا۔

MashalBooks.org

معیشت کا بحران:

این ایچ: آپ نے معیشت کو پاکستان کا چوتھا بڑا بحران قرار دیا ہے۔ اقتصادی صورت حال کتنی خراب ہے؟

اقبال احمد: پاکستان میں اقتصادی بحران غالباً اتنا بنیادی ہے کہ پہلے ایسا نہیں تھا۔ مشرقی دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح اس ملک میں بھی اقتصادی بحران مستقل طور پر موجود رہتا ہے۔ تاہم ماضی میں پاکستان کی اقتصادیات کو جب بھی شدید بحرانی کیفیت درپیش ہوئی' اس نے محدود طور پر لیکن نہایت تیزی سے حالات پر قابو پا لیا۔ مثال کے طور پر 1950ء کے عشرے میں جب کوریا کی جنگ کے دوران کپاس کی مانگ بڑھ گئی تھی' پھر اس کے بعد اچانک مانگ ختم ہو گئی اور پاکستان کی معیشت شدید بحران میں مبتلا ہو گئی' لیکن ایوب کے دور میں اس بحران پر تیزی سے قابو پا لیا گیا۔ پھر 1972ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد عام طور پر قیاس کیا جاتا تھا کہ مغربی پاکستان چونکہ خاصا منافع وہاں سے کما رہا تھا اور اس کی اچھی پیداوار وہاں سے تھی' اس لئے مشرقی پاکستان کے خودمختار ہو جانے سے اس کی معیشت بکھر جائے گی' لیکن ایسا نہیں ہوا' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی معیشت بہت تیزی سے بحال ہو گئی۔ ان دو مثالوں کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ تیز رفتار بحالی کے بنیادی طور پر تین اسباب ہیں۔ ایک سبب خارجی ہے' یعنی بین الاقوامی منڈی میں پاکستانی پیداوار کے لئے قیمتیں پاکستان کے حق میں تھیں اور بین الاقوامی معیشت میں ترقی نے پاکستان کی معیشت کو تیز رفتار ترقی سے ہمکنار کیا۔ آج کل بین الاقوامی معیشت میں ترقی کا رجحان نہیں ہے' کساد بازاری چونکہ دنیا بھر میں ہے لہٰذا اس ماحول میں پاکستان کو اپنے مخصوص نوعیت کے مسائل کا سامنا ہے۔

دوسرا عنصر جو پاکستان کے لئے ہمیشہ مددگار رہا غیر معمولی بلکہ نہایت درجہ غیر معمولی نوعیت کا ہے اور وہ ہے جنوب اور جنوب مغربی ایشیا کے مزدور' جو نہایت جفاکش' ہنرمند' ذہین اور حوصلہ مند ہیں۔ میری اس بات کو قوم پرستی پر مبنی سمجھا جائے گا' لیکن ایسا نہیں ہے' یہ لوگ آج پورے خلیج فارس کے ملکوں میں اور یورپ میں چھائے ہوئے ہیں۔ ان علاقوں میں ہر دو مزدوروں میں سے ایک پاکستانی ہے۔ یہ ملک بڑی تعداد میں علاقوں کی مانگ کے مطابق مزدور پیدا کر رہا ہے۔ یہ متحرک اور محنتی مزدور پاکستان کی معاشی بحالی کے لئے بہت اہم ثابت ہوئے ہیں۔ آج ہمارے مزدور طبقے کی سب سے زیادہ ہنرمند اور ذہین آبادی پاکستان سے باہر کام کر رہی ہے۔ 1970ء اور 1978ء تک کا زمانہ پاکستان سے اس کے بہترین محنت کشوں کے بیرون ملک اخراج کا زمانہ تھا۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ مسٹر بھٹو معیشت میں ملازمت کے مواقع پیدا کرنے میں ناکام رہے اور دوسرے مشرقی وسطیٰ میں تیل پیدا کرنے والے ملکوں میں دولت کی فراوانی۔ انہوں نے وہاں سے جو دولت کما کے بھیجی وہ 1979ء میں 2 ملین ڈالر تھی' جو پاکستان میں زرمبادلہ کی کمائی کا اصل ذریعہ

MashalBooks.org

تھی۔تاہم زرمبادلہ کی یہ آمدنی ملک کی آئندہ تعمیر و ترقی کی قیمت پر ہوئی۔

تیسرا عنصر جواب سے پہلے بحرانی حالات میں پاکستان کی بحالی کا سبب بنا' یہاں کا نوجوان سرمایہ کار تھا' جو مختصر تھا لیکن خوب جم کر کام کرتا تھا۔ یہ طبقہ اپنی ساخت میں بہت حریص' منافع میں اضافے کے لئے بے چین' خطرہ لینے پر مستعد اور اپنے کارکنوں اور انتظامیہ کے نہایت جدید طور طریقوں کو استعمال کرنے پر آمادہ رہتا تھا۔مسٹر بھٹو نے ان جواں سال سرمایہ کاروں کو تباہ کر دیا اور ان کا کوئی متبادل پیش نہ کر سکے۔ ان کی قومیانے کی پالیسی سے یہی ہوا کہ ایک قوم پرستانہ اور محض نمونے کی اقتصادی منصوبہ بندی سامنے آئی' یعنی قومی ملکیت میں لینے کی اسکیمیں جن کی بناء پر پیداواری سرمایہ میدان سے نکل جاتا ہے اور ابھرتا ہوا نوجوان سرمایہ دار طبقہ محض ٹھیکے داروں' رابطہ کار اور لائسنس پر کام کرنے والا سرمایہ کار بن کر رہ جاتا ہے۔بھٹو کی اقتصادی پالیسیاں نہایت تباہ کن تھیں۔ان کے نتیجے میں کوئی نئی طاقت پیدا نہیں ہوئی۔ یہ مصر میں عبدالناصر اور انڈونیشیا میں سوئیکارنو یا شام میں بعث پارٹی کی کارکردگی سے ملتی جلتی تھیں۔ یعنی آپ معاشرے میں ابھرتی ہوئی سرمایہ دارانہ طاقتوں کو داخل ہونے سے تو روک سکتے ہیں' لیکن بورژوازی کو ختم نہیں کر سکتے' اس لئے کہ وہ درآمدی و برآمدی تاجر طبقہ بن جاتا ہے' جو کماتا اور خرچ کرتا ہے۔اس کی نظریں ٹھیکوں پر لگی رہتی ہیں' اثر رسوخ استعمال کرتا ہے اور تیزی سے دولت مند بننا چاہتا ہے۔وہ پیداواری عمل سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ پیداواری صنعتیں حکومت کے قبضے میں چلی جاتی ہیں' جس کے معنی یہ ہوئے کہ اب حکومت کے پاس اپنے پسندیدہ لوگوں کی سرپرستی کے زیادہ مواقع آ گئے ہیں۔اس طرح آپ نے نجی صنعت میں سرکاری افسروں کی نااہلی اور بددیانتی کو شامل کر دیا اور اس کے ساتھ ہی سرمایہ داری کے استحصال میں شریک رہے۔اس طرح سرمایہ کاری کرنے والا طبقہ یا تو اپنا کاروبار سمیٹ کر ملک سے باہر نکل گیا یا حکومت کا شریک کار بن گیا۔سرکاری ٹھیکوں اور لائسنسوں پر انحصار کرنے لگا۔یوں اس کی دولت میں اضافہ پیداوار سے نہیں بلکہ ہیرا پھیری اور دلالی سے ہوا۔اس طرح ہم نے محنت کشوں کی ایک نہایت بیش قیمت بنیاد گنوا دی۔سرمایہ کاری کرنے والا طبقہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔سرمایہ کاری کی بنیاد ختم ہو گئی۔اس کے ساتھ ہی بین الاقوامی ماحول' اقتصادی رجحانات سازگار نہیں رہے۔پاکستان میں معیشت کا بحران قطعی طور پر بنیادی ہے۔عملاً یہ تو سرے سے ختم ہو چکا ہوتا اور نوبت فاقوں تک پہنچ جاتی' لیکن کئی وجوہ سے ایسا نہیں ہوا۔ ادھر ایک کے بعد دوسری اچھی فصلیں ہوئی ہیں۔پاکستان کا کسان بہت محنتی ہے اور قدرت کی فیاضی پر اس طرح انحصار نہیں کرتا جیسے تیسری دنیا میں دوسرے کسان کرتے ہیں۔یہاں کا نہری نظام آبپاشی خاصا ترقی یافتہ ہے۔اس طرح پاکستان اپنی غذائی ضروریات کا صرف بیس فیصد حصہ باہر سے منگواتا ہے۔باقی اپنے ملک میں پیدا کرتا ہے اور دوسرا عنصر تارک وطن مزدوروں کی بھیجی ہوئی رقوم ہیں' جو سالانہ دو بلین تک پہنچ گئی ہیں۔اس کے باوجود ملک مقروض ہے۔اس کی سلامتی کی راہ بہت تنگ ہے' اور وہ عناصر جواب سے پہلے

MashalBooks.org

بحالی کی کوششوں میں معاون تھے ضائع ہو چکے ہیں۔

(”پیس اینڈ کلاس“ 1980ء)

MashalBooks.org

یہ پاکستان کے خدائی فوج دار

ضرب مومن کی مشقیں ختم ہو گئی ہیں۔ جس کسی نے ان مشقوں کے علاقے کو اور وہ بھی اس کی تیاری کے مرحلے میں دیکھا ہو، اس کے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس سے پاکستانی فوج کی سپاہانہ استعداد میں کیا اضافہ ہوا اور جس سیاسی اصول کی موزونیت کا امتحان کرنے کے لئے ان مشقوں کا فیصلہ کیا گیا تھا، وہ کہاں تک موزوں ثابت ہوا۔ لیکن بریگیڈیئر ریاض اللہ کو جو انٹر سروسز پبلک ریلیشنز کے نہایت مختی ڈائریکٹر ہیں، جس مشن پر فائز کیا گیا تھا، اسے انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ فوج کا یہ کردار کہ وہ پاکستان کے دفاع کا ادارہ ہے، داغ دار ہو گیا تھا۔ اب یہ کردار بڑی حد تک بحال ہو گیا ہے۔ فوجی مشقوں کا تذکرہ خبروں میں تھا، پھر دسمبر کے پورے مہینے میں اس پر کالم چھپتے رہے، اخبارات نے دنیا میں کہیں بھی کوئی فوجی مشق کی اتنی دور تک اور اتنی دیر تک تشہیر نہیں کی ہو گی۔

ذرائع ابلاغ کی اتنی گہری توجہ سے پاکستان کے سیاسی ماحول کے بنیادی پہلوؤں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ فوج ہمارے اعصاب پر مسلط ہے۔ ہمارے دشمن اس سے اتنا نہیں ڈرتے، جتنا ہم ڈرتے ہیں اور اس کی معقول وجوہ ہے۔ فوج، قومی بجٹ کا سب سے بڑا حصہ وصول کرتی ہے اور ہماری تاریخ کا بڑا حصہ اسی فوج کی حکمرانی میں ضائع ہو گیا۔ جرنیلوں نے نظم و ضبط، آزادی اور ترقی کے وعدوں پر اقتدار پر غاصبانہ قبضہ کیا۔ ملک میں بدانتظامی پیدا کی، پاکستان کی بالادستی کے سوال پر سمجھوتا کر لیا اور ترقی کے عمل کو بگاڑ ڈالا۔ فوجی حکومت کے تحت ملک کو شکست کھانی پڑی اور اس کے ٹکڑے ہو گئے۔ لوگوں کو جیلوں میں ڈالا گیا، انہیں کوڑے مارے گئے۔ ایذائیں دی گئیں، شہری آزادیوں کو سختی سے دبایا گیا۔ ایک وزیراعظم کو پھانسی دے دی گئی، آئین کو مسخ کیا گیا، مذہب کا غلط استعمال کیا گیا اور کلچر کو سفاکانہ طور پر پامال کیا گیا۔ سیاست میں فوج کی مداخلت کی اس رسوا کن تاریخ کو دیکھتے ہوئے اس پر حیرت ہوتی ہے کہ خبروں اور جائزوں کے پلندے فوج کی ستائش میں اور اس کے خوش اطوار چیف آف اسٹاف کی تعریف میں صرف ہو گئے۔ مرزا اسلم بیگ اور ان کے رفیقوں کو یہ بات سوچنی چاہیے، جنہوں نے تجربے پر توقع کی برتری کا مظاہرہ کیا۔ قوم نے جس امید سے ان مشقوں کی تعریف کی، وہ یہ تھی کہ اس رسم کے تحت فوجی لیڈر اپنے سپاہانہ پیشے کے ساتھ وفاداری کا عہد کریں گے اور بالآخر اس ناقابل اختلاف حقیقت کا اقرار کر لیں گے کہ سیاست اور سپہ گری، دونوں کا آپس میں جوڑ نہیں۔ ہمارے دورے کے آخری دن، جنرل بیگ نے واضح طور پر جذباتی انداز میں پاکستان کی ذلت آمیز شکست (1971ء) کا تذکرہ کیا۔ ”جب ہمارا آدھا علاقہ ہاتھ سے نکل گیا، ہمارے حوصلے

MashalBooks.org

پست ہو گئے اور قوم دو ٹکڑے ہو گئی۔" میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ جنرل بیگ اور ان کے رفقاء کیا یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس ہولناک تباہی کے اسباب' اس سے پہلے کی تیرہ سالہ فوجی حکمرانی میں پوشیدہ تھے۔ یہ تو مارشل لاء کی سیاست تھی' جس نے پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی بنیاد دتیار کی' فوج کی شکست اور ہندوستان کے آگے ہتھیار ڈالنے کی ذلت کی راہ ہموار کی۔ سیاست اور فوجی پیشے کے درمیان تعلق کے اہم سوال پر چند اعلیٰ فوجی افسروں نے گمراہ کن موقف اختیار کیا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو ملتان کے کور کمانڈر اور ضرب مومن کی مشقوں کے جنرل آفیسر کمانڈنگ لفٹیننٹ جنرل حمید گل نے ہم سے خطاب کیا۔ انہوں نے یہ اقرار کیا کہ اس اعلیٰ سطح کی یہ پہلی فوجی مشق ہے' نا ہم آئی ایس آئی کے سابق ڈائریکٹر جنرل نے اس تقریب کے انوکھے پن کو تسلیم نہیں کیا۔ انہوں نے اس بات پر زور دے کر کہا کہ یہ مشقیں تو ہوتی ہی رہی ہیں۔ "ہم اب بھی ہیں اور ہمیشہ سے ایک پیشہ ور فوج رہے ہیں۔" جب حاضرین نے ان کے اس بیان کو چیلنج کیا تو انہوں نے بڑے شدومد سے اپنا دفاع کیا اور کہا کہ اقتدار کو استعمال کرنے سے فوج کی پیشہ وارانہ اہلیت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ انہوں نے کہا: "صرف 289 افسر مارشل لاء کے فرائض میں شریک تھے۔" اور یہ کہ اس ادارے (فوج) کے خلاف جو جذبات پیدا ہوئے وہ صحیح نہیں۔

دوسرے افسروں نے بھی ایسے ہی بیانات دیئے' جس سے پتہ چلا کہ ان میں یہ احساس ہی موجود نہیں کہ فوج کے اندر پیشہ وارانہ اہلیت اس کی

قیادت اور مثالوں سے پیدا ہوتی ہے۔ افراد کی گنتی کرنے سے نہیں کہ ملک کا انتظام چلانے میں کون لوگ شریک تھے اور کون شریک نہیں تھے۔ جب اعلیٰ فوجی عہدیدار سیاست میں دخل دیتے ہیں تو اس طرح وہ اپنا حلف توڑ دیتے ہیں' اپنی پیشہ وارانہ اقدار کی خلاف ورزی کرتے ہیں' ماتحتوں کے لئے غلط مثال قائم کرتے ہیں اور ان بنیادوں کو مسمار کر دیتے ہیں' جن پر فوج کھڑی ہے۔ اس کی صحیح مثال یہ ہے کہ سڑے ہوئے سیبوں سے بھری ٹوکری میں باقی سیب بھی سڑنے لگتے ہیں۔

سیاست میں ملوث ہونے والے فوجی افسروں کی بیتا رنجی ناکامی کہ وہ اپنے ملکوں کا دفاع نہ کر سکے' ایک اور وجہ سے بھی ہے۔ اپنے عوام سے کٹ کر الگ ہونے کے بعد کوئی فوج اپنا حوصلہ قائم نہیں رکھ سکتی اور ایک مایوس' دل گرفتہ فوج لڑ نہیں سکتی۔ مشرقی پاکستان میں فوج نے بے بسی سے ہتھیار ڈال دیئے تھے' اس لئے نہیں کہ ایک برتر فوج سے مرعوب ہو گئے' بلکہ اس لئے کہ جن لوگوں کو بچانے کی ان سے توقع کی جاتی تھی' وہ انہی سے کٹ کر الگ ہو گئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جنرل بیگ فوج اور عوام کے درمیان ہم آہنگی کی بے پایاں اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ انہوں نے 13 ستمبر کو اخبارات کے ساتھ اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے صحافیوں سے کہا کہ وہ "فوج اور عوام کے درمیان مکمل ہم آہنگی اور مفاہمت پیدا کرنے میں مدد دیں۔"

صحافیوں نے جنرل بیگ کی اس اپیل کو ہمدردی کے ساتھ سنا اور ظاہر ہے کہ قوم کا جواب بھی مثبت

MashalBooks.org

ہوگا' لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کی اور ہماری کوششیں بھی اس وقت ضائع ہو جائیں گی' کوئی وردی والا' جب قومی سیاست میں مداخلت کرے گا۔ اس وقت یہ عذر بے معنی ہوگا کہ وہ نظم و ضبط' جمہوریت اور اسلام کے نام پر ایسا کرتا ہے یا قومی تحفظ کی خاطر کرتا ہے۔ دراصل قومی سلامتی کے نقطہ نظر سے ایک کمزور سول حکومت کو فوجی حکومت پر ترجیح دی جائے گی۔ فوج کو سوسائٹی کے ساتھ مفاہمت پیدا کرنے کے لئے ایک آئینی حکومت کی ضرورت ہوتی ہے' جو اسے اپنے عمل کا جواز مہیا کرے' لیکن جب فوج خود اقتدار سنبھال لیتی ہے' تو اس ادارے کے طور پر جس کا کام قوم کا دفاع ہے' اس کا آئینی جواز ختم ہو جاتا ہے اور اس کے بغیر فوج نہیں رہتی۔ جنرل بیگ نے فوج اور عوام کے درمیان افہام و تفہیم کے عمل کا آغاز کیا ہے۔ یہ ایک نئی بات ہو رہی ہے۔ یہ اچھا ہے یا برا' اس کا فیصلہ تو وقت ہی کرے گا۔ ہمارے اس گروپ میں بیس افراد شامل تھے۔ ان میں ایڈیٹر صاحبان اور مبصرین بھی تھے' جنہوں نے بے روزگاری' قید و بند اور جلاوطنی کا عذاب جمہوریت کے دفاع' اور فوجی حکومت کی مخالفت کی بنا پر جھیلا تھا۔ ان کی موجودگی سے یہ اشارہ ملتا تھا کہ اس امر میں سب متفق ہیں کہ فوج آئندہ ہمیں اپنے قبضے سے صاف رکھے گی اور بیرک تک ہی محدود رہے گی' جہاں رہتے ہوئے وہ دفاعی تربیت حاصل کرے گی۔

ان کے مشاہدات اور سوالات' یہاں تک کہ ان کے چٹکلوں میں بھی ایک محتاط توقع کا پتہ چلتا تھا۔ ان کی گفتگو نپی تلی' لیکن موافقت میں ہوئی تھی۔ بکتر بند گاڑی میں جاتے ہوئے ایک صحافی بولا: ''خاصی طاقت کا احساس ہوتا ہے یار' اگر کسی نے روکا نہ ہوتا تو میں سرحد پار کر گیا ہوتا'' ہمارے ایک رفیق بولے: ''اب تک تو یہ گفتار ہا کہ فوجی نڈر اور سر پھرے ہوتے ہیں' اب غالباً ان کے تحمل اور بردباری کا قصیدہ پڑھے گا۔'' چینی ساخت کے ٹی 59 ٹینک سے اترتے ہوئے کسی نے آئی اے رحمان سے پوچھا: ''کیسا لگا؟'' اس پختہ کار اور محترم صحافی نے جواب دیا: ''آپ لوگوں کو نیچے دیکھ کر بہت ترس آیا' مگر ہم کچھ نہیں کریں گے۔''

محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ ہم ابھی خطرے سے باہر نہیں نکلے۔ خطرہ فوج کے اندر بھی ہے' باہر بھی'' میں ان میں سے تین کا ذکر کروں گا۔ اول مسلح افواج کو قریب سے دیکھ کر فوج اور معاشرے کے درمیان جو طویل فاصلہ نظر آتا ہے' وہ حیران کن ہے۔ تقریباً ہر پہلو سے' یعنی تنظیم' نظم و ضبط' خواندگی کے معیار' فنی مہارت اور وسعت یاب وسائل کو دیکھتے ہوئے' فوج' پاکستانی معاشرے سے اگر پوری ایک صدی نہیں تو بیسیوں سال آگے ہیں۔ ہمارے تین دنوں کے دورے کو اس طرح پابندی سے برتا گیا' جیسے گھڑی کی سوئی کام کرتی ہے۔ تمام معلومات انگریزی میں فراہم کی گئیں' اس زبان میں ان کی دسترس اچھی اور بعض صورتوں میں شاندار نظر آئی۔ انہوں نے نقشے اور چارٹ کمپیوٹر پر دکھائے۔ ایسی سہولت تو ملک کے کسی اول درجے کے کالج میں بھی میسر نہیں ہوتی۔

MashalBooks.org

مختصر یہ کہ فوج کو ان تمام وسائل پر اول درجے کی دسترس حاصل ہے' جن سے فی زمانہ طاقت کا تعین ہوتا ہے۔ تشدد کے منظم استعمال پر اس کی مکمل اجارہ داری ہے۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب بھی ہماری سیاست میں بدنظمی ظاہر ہوئی تو اولوالعزم جرنیلوں نے باور کرلیا اور اپنے ماتحتوں کو بھی یقین دلا دیا کہ اس انتشار اور بدنظمی کو وہ نظم وضبط سے بدل دیں گے اور ملک کو فوجی چھاؤنی کی طرح چلائیں گے۔ مستقبل ہمیں ایسے حالات میں معاف نہیں کرے گا' کیونکہ بدنظمی سیاست کا اسی طرح معمول ہے' جیسے فوج کے لئے ڈرل۔ نہایت ترقی یافتہ سیاسی معاشرے بھی سیاست کے اس قانون سے مستثنیٰ نہیں۔ امریکہ میں سن 1960ء 1970ء کے عشروں کے واقعات' نسلی فسادات' طلبہ کے ہنگامے اور واٹر گیٹ اسکینڈل کو دیکھ لیجئے۔ 1980ء کے عشرے میں روس کے انتشار اور عدم استحکام کو بھی دیکھئے' جس طرح کا طرزِ عمل ہمارا تھا' اگر سیاسی بحرانوں کی صورت میں دوسری فوجوں کا طریقہ بھی وہی ہوتا تو دنیا بھر میں صرف فوجی حکمرانی ہوتی۔

دوسری بات یہ کہ طاقتوں کا وہ تناسب جس کے ہوتے ہوئے پاکستان میں فوجوں نے سیاسی مداخلت کی' وہ تو اب بھی نہیں بدلا۔ برطانیہ کی نوآبادیاتی حکمرانی نے ہمیں دو مخالف روایات سے آشنا کیا۔ ایک وائسرائے کا طرزِ حکمرانی' دوسرے جمہوریت۔ فوج اور افسر شاہی جن کا سربراہ وائسرائے تھا' وہ وائسرائے کی (شاہانہ) روایت کو آگے بڑھاتے تھے اور پھیلاتے تھے' اس روایت میں حاکمیت' مرکزیت اور سرپرستی کا انداز شامل تھا' جس کا آغاز دارالحکومت سے ہوتا تھا۔ نوآبادیات میں اسی روایت کو براہ راست طاقت' جاگیردار طبقے سے حاصل ہوتی اور اسے احکام بیرون ملک سے آتے تھے۔ اس کا مقابلہ ایک دوسری روایت سے تھا۔ اس کا محرک قومیت کا جذبہ تھا۔ شہری معاشرے کے ادارے' یعنی یونیورسٹیاں' ٹریڈ یونین اور ان سے بڑھ کر سیاسی پارٹیاں جمہوری روایت کے امین ہوتے تھے۔

ان علاقوں میں جو اب پاکستان میں شامل ہیں' تاریخی طور پر جمہوری روایت کمزور رہی۔ اس کے علاوہ بانیانِ ریاست کی جلد وفات نے ریاست کو اس کا جواز فراہم کرنے اور مستحکم بنانے والوں سے محروم کر دیا۔ اس سے سوا' امریکہ کے ساتھ سلامتی کے اتحاد کی بنا پر وائسرائے کی روایت کو زیادہ تقویت ملی۔ امریکہ کو ایک فرماں بردار نوآبادیاتی اشرافیہ کی ضرورت تھی' جو اس کے مفادات کو آگے لے کر چلے۔ برطانیہ کی پروردہ افسر شاہی اور فوج اس کام کے لئے نہایت موزوں ذرائع تھے۔ امریکی پالیسی کے دو بنیادی اصولوں سے ان کو مزید تقویت ملی' ایجنسی برائے فوجی امداد اور ملٹری اسسٹنس پروگرام (فوجی امداد کا پروگرام) چنانچہ جمہوری روایت پر وائسرائے کی بالادستی یقینی ہو گئی۔ ملک کا وقار اور عوام کی فلاح اس کی بھینٹ چڑھا دیئے گئے۔ ہمارے حکام اسلام کے نام پر چاہے کتنی چرب زبانی سے کام لیں' پاکستان کی سیاسی زندگی کی حدود امریکہ کی بالادستی ہی متعین کرتی ہے۔

تیسری بات: سیاست میں فوج کی مداخلت' خواہ موقع ہاتھ آنے پر اس کی ترغیب ملتی یا مایوس کن

حالات اس کے لئے مجبور کریں۔ ایوب خاں اور ضیاء الحق کے فوجی قبضے کے اسباب یہ تھے کہ سیاست دانوں نے ان کے لئے مواقع فراہم کر دیئے تھے۔ ہمارے موجودہ سیاست دانوں کا طرز عمل بھی اطمینان بخش نہیں۔ ان کی نا اہلی اور آپس کی تو تو میں میں نے پہلے ہی آرمی چیف آف اسٹاف کو یہ موقع فراہم کر دیا ہے کہ وہ بیک وقت دو کردار ثالث کا اور اقتدار کے لئے دلالی کا انجام دیں اور یہ بھی ہے کہ سیاسی طبقے کا ایک بڑا حصہ جو فوجی حکمرانی ہی کی پیداوار ہے، اقتدار میں فوج کی واپسی کا خیر مقدم کرنے کو تیار ہے۔

اس بات کا خطرہ موجود ہے اور آئندہ کچھ زیادہ دور بھی نظر نہیں آتا کہ موقع اور مایوسی دونوں مل جائیں اور پاکستان پر اچانک فوجی قبضہ ایک مجبوری بن جائے۔ اس فوجی قبضے کے لئے نیا تلا بہانہ فراہم کرنے میں ہمارے سیاست دانوں کی طرف سے کوتاہی کا امکان نہیں۔ باقی رہی مایوسی کی کیفیت تو اسے فوج خود ہی تیار کر لے گی۔ امریکی بندوقوں کے ذریعے ایک عالمگیر اسلامی انقلاب کا تصور جنرل ضیاء نے اپنی کج نگاہی سے باندھا تھا، وہ خواب فوج کے اعلیٰ افسروں کا پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے اور اب تو اسے یہ فوجی منطق بھی میسر ہے کہ اس طرح "علاقائی وسعت" (Strategic Depth) حاصل ہو جائے گی۔ یہ ایک غیر حقیقت پسندانہ مقصد ہے۔ میں نے یہ دلیل پہلے بھی کسی موقع پر پیش کی ہے کہ جب تک ہم اپنا راستہ نہیں بدلیں گے اور افغانستان میں سمجھوتے کا عمل پوری سنجیدگی کے ساتھ شروع نہیں کریں گے، ہماری اور ہمارے حلیفوں کی بے اندازہ قربانیاں ضائع ہوتی رہیں گی۔ سوویت روس نے افغانستان میں اپنا نقصان کم کر دیا ہے۔ امریکی اس لئے اپنا منافع نکال کر لے گئے۔ اب امکان یہ ہے کہ ملبہ پاکستان پر گرے گا، یعنی یہ پھر تنہا ہو کر رہ جائے گا۔ جو کام مشکوک نوعیت کا بتدریج اور مسلسل ہو رہا ہے، سول حکومت اس میں محض ایک خاموش فریق ہے، لیکن امکان یہ ہے کہ ناکامی کا ذمہ دار اس کو قرار دیا جائے گا۔

آخری بات یہ کہ جنرل ضیاء کی گیارہ سالہ حکومت نے ملک کو بدل دیا ہے۔ سیاسی لحاظ سے اب یہاں جتھہ بندی پہلے سے کہیں زیادہ ہے اور اس کا عکس کم از کم اعلیٰ فوجی کمان میں نظر آتا ہے۔ ضرب مومن کی فوجی مشقوں کو دیکھ کر ایک مبصر نے فوج کے بارے میں لکھا کہ خود اپنی رائے میں اسلام کی فوج ہے۔ پاکستانی فوج کی اپنے بارے میں یہ تعریف خود ان کے ناموں سے ظاہر ہے، جو ان مشقوں کے لئے اختیار کئے گئے۔ پہلے ان کے نام نومبر چنڈی کیپ، فائل اسٹون اور تیز گام ہوتے تھے یعنی سیکولر طرز کے اور موجودہ ناموں سے مختلف۔ یہ تبدیلی بھی خالی از علت نہیں۔ اس پر الگ سے بحث ہونی چاہئے۔ بہر حال اس بات کا امکان ہے کہ یہ افسروں کو سیاست میں مداخلت کے لئے کم نہیں بلکہ زیادہ مائل کرے گی۔

اس ملک کو خدائی فوج داروں کے عذاب سے اس وقت تک نجات نہیں ملے گی، جب تک افسروں کے دستے اجتماعی طور پر خود یہ محسوس نہ کریں کہ سیاست میں دخل اندازی سے فوج کی پیشہ ورانہ اہلیت کی نفی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے زمانے میں برسر اقتدار حکومت فوجوں نے شکست کھائی ہے۔ الجزائر سے

MashalBooks.org

ارجنٹائن تک اور پاکستان سے یوگنڈا تک ہر جگہ' اور مخالف سول حکومتوں کے ہاتھوں یہ شکستیں ہوئی ہیں اور اس حقیقت کو بھی بڑے احترام سے تسلیم کرنا ہوگا کہ ان فوجوں میں بھی جو تمام تر سیاسی ہوتی ہیں' یعنی نجات دہندہ افواج' ان کے اندر بھی سیاست کو فوج پر فوقیت حاصل ہوتی ہے اور کمانڈر سیاسی عہدیداروں کے تابع ہوا کرتے ہیں۔

("ڈان" 23 دسمبر 1989ء)

MashalBooks.org

فوج حکومت میں کیوں آتی ہے؟

فوجی کب اور کیوں حکومت کا تختہ الٹ دیتے ہیں؟ سوئے اتفاق سے پاکستان میں ایسی کئی کوششیں ہو چکی ہیں، کامیاب اور ناکام دونوں، لیکن اس پیچیدہ سوال پر پوری طرح غور و خوض نہیں کیا گیا۔ ایک اخباری کالم میں تو اس کا جواب دینا ممکن نہیں، تاہم یہاں چند مشاہدات پیش کرتا ہوں۔

سیاست میں فوجی مداخلت یقیناً اس وقت ختم ہو جاتی ہے، جب ملکی سیاست فوجیوں کے جنگ آزما طبقے کو پوری طرح سدھا لیتی ہے۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب شہری نظام اقتدار طویل مدت کے اندر اپنا جائز حق حکمرانی منوا چکا ہوتا ہے، جب حکومتیں اور سیاست داں آئین میں درج شدہ حکمرانی کے اصولوں پر اور ریاست کے مروجہ طور طریقوں پر کاربند رہتے آئے ہوں اور جب ملکی آبادی اپنے سول نظام حکومت کو بالعموم منصفانہ، موزوں اور بااختیار سمجھتی ہو۔

صاف اور صریح بات یہ ہے کہ یہی عمل پاکستان میں پروان نہ چڑھ سکا۔ ہم دونوں معاملوں میں ناکام رہے، یعنی ہمارا کوئی سیاسی نظام حکومت نہ بن سکا اور ایسے رہنما میسر نہ ہو سکے جو ایک سول نظام اقتدار پوری طاقت کے ساتھ نافذ کر سکتے اور جنگ جو طبقے کو سدھا کر رکھتے۔ ہمارے یہاں آزادی کے پہلے دس سال میں یہ ہوا کہ بابائے قوم جلد انتقال کر گئے۔ مسلم لیگ جس نے ملک کو قائم کیا، انتشار کا شکار ہو گئی۔ آئینی ڈھانچے کی تشکیل پر جھگڑے شروع ہو گئے اور ذہنی خلفشار پیدا ہو گیا۔ سیاست دانوں میں تو تکار ہونے لگی، اکثریتی آبادی کے صوبے (مشرقی پاکستان) کو الگ کر دیا گیا اور مغربی پاکستان سے جاگیردار طبقے نے فوج و افسر شاہی کے مٹھی بھر حکمرانوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا۔

ایوب خاں کا فوجی قبضہ اس خرابی حالات کا نتیجہ تھا۔ تاہم ان کی حکومت ابتدا میں اپنی معتدل مزاجی اور جدید رجحان کے باوجود وہ اصلاحات نافذ نہ کر سکی، جن کی اس ملک کو شدید ضرورت تھی۔ زمین، محنت اور سرمایے کا جو رشتہ نوآبادیاتی دور میں تھا، وہ بدستور برقرار رہا۔ ریاست میں حکمرانی کا وہی چلن تھا کہ حکومت کا عوام کے ساتھ کوئی بامعنی رابطہ نہ رہا اور نہ وہ ان کے آگے جواب دہ تھی۔ دلچسپ بات یہ کہ یہی گروہی طاقت 1953ء میں 1954ء، 1958ء اور 1977ء میں مداخلت کرتی رہی، اس کا مقصد عوام کی ابھرتی ہوئی طاقت کو جو حقیقی تھی یا نمایاں طور پر نظر آتی تھی، ہر مرتبہ دبانا ہوتا تھا۔ پاکستان کی جاگیردار اشرافیہ نے ہر مرتبہ اس کا خیر مقدم کیا اور فوجی حکومت سے تعاون کرتی رہی۔ یہی صورت حالات تھی جو یقینی طور پر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا سبب بن گئی۔

MashalBooks.org

عراق میں حکومتوں کے تختے الٹے تھے انہیں 1948ء کی جنگ میں اسرائیل کے ہاتھوں عربوں کی شکست کا گہرا صدمہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے سول حکومتوں کو الزام دیا کہ انہی کی کرپشن اور بدانتظامی کی وجہ سے فلسطین ہاتھ سے نکل گیا۔ اسی طرح فرانسیسی فوج کے جرنیلوں نے 1960ء میں جو بغاوت کی تو وہ پہلے ہی اس بات سے شدید مایوس تھے کہ الجزائر میں ایف ایل این (FLN) کو شکست دینے میں ناکام ہو گئے تھے اور اس ناکامی کا الزام حکومت کو دے رہے تھے ان کا خیال تھا کہ حکومت اگر ان کی اپنی ہوتی تو جنگ صحیح طرح لڑی جا سکتی تھی۔ پرتگال میں سالازار کی حکومت کا تختہ جن کرنیلوں نے الٹا تھا' وہ بھی اسی طرح انگولا' موزمبیق اور گنی بساؤ میں بے نتیجہ کارروائی سے مایوس تھے' لیکن انہوں نے صلح کی خواہش کی تھی' مزید جنگ سے انکار کیا تھا' چنانچہ ان نوآبادیات کو نتیجہ خیز گفتگو کے بعد خالی کر دیا۔

پاکستان کی فوج میں افسروں کی پہلی سازش کا انکشاف 1951ء میں ہوا۔ اس کا سبب بھی 1948ء میں کشمیر کی جنگ سے ان کی گہری مایوسی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مشرقی پاکستان کی ذلت آمیز شکست نے اٹک کے سازشی عناصر کو کارروائی پر اکسایا تھا اور تازہ ترین بے چینی میں بھی کشمیر کی صورت حال نے اضافہ کیا ہے۔ کشمیر کا المیہ اس اعتبار سے اور بھی اندوہناک ہے کہ ایک طرف سے ہندوستان کی سفاکانہ کارروائیاں ہیں اور دوسری طرف پاکستان کی خوفناک غلطیاں۔

جب نظریاتی خلفشار کا ماحول طاری ہو تو سازشی عناصر کے لئے یہ بہت سازگار ہوتا ہے۔ اقتدار کا زوال' قومی اداروں کی معمول کی کارکردگی میں پس و پیش کی کیفیت اور سیاست میں موقع پرستی کا استعمال' یہ ہیں اس ماحول کی خصوصیات۔ ان کی ملی جلی کیفیت' نظریاتی انتہا پسندوں کو اکساتی ہے۔ ان کی سرگرمی سیاسی مہم بازوں سے کم نہیں ہوتی۔ پاکستان ایک متضاد نظریاتی ماحول کی نہایت موزوں مثال ہے۔ ہمیں نظریے اور عمل دونوں میں بعض بنیادی سوالوں کو حل کرنا ہوگا۔ مثلاً ریاست اور مذہب کا تعلق' اختیارات اور جواب دہی کا معاملہ' انتظامیہ اور عدلیہ کا رشتہ۔ اس سے عدم استحکام کی جو صورت پیدا ہوتی ہے' اس سے سیاسی لیڈروں اور فوج کے غاصبوں کے اختیارات کی بدولت اضافہ ہوتا ہے' چنانچہ یکے بعد دیگرے آنے والی حکومتوں نے عدلیہ میں دخل اندازی کی ہے' انتظامیہ نے تحکمانہ انداز سے قوانین بدل دیئے اور سول ملازمت کے آداب و روایات کی خلاف ورزی کی اور افسر شاہی کے علاوہ فوج میں بھی ترقیوں اور تبادلوں کے معاملے میں ہیرا پھیری کی۔ جب اختیارات کا استعمال نہ صرف موقع پرستی کی بنا پر بلکہ قوانین کا احترام کئے بغیر' قومی مفادات اور اخلاقی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے کیا جائے تو بے دلی' مایوسی اور سول حکومت کے خلاف حقارت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں' اس طرح انتظامیہ کا سربراہ جو فرقہ وارانہ سیاست کی سرعام مخالفت کرے اور فرقہ پرست گروہوں میں شریک ہو جائے' ملک اور حکومت دونوں کو اتنا نقصان پہنچائے گا' جس کے اثرات دیرپا ہوں گے۔

MashalBooks.org

حالیہ دنوں میں بہت سے سیاست دانوں نے کہا ہے کہ فوجی سازش اب ایک قصہ پارینہ ہوئی۔ انہوں نے لامحالہ ایک ''ناموافق بین الاقوامی ماحول'' کا حوالہ دیا ہے' جس سے ان کی مراد بنیادی طور پر امریکہ کی ناپسندیدگی سے ہے' جو حتمی طور پر فوجی بغاوتوں کے خلاف ہے۔ اس انداز فکر سے اس گہرے احساس کی عکاسی ہوتی ہے جو امریکہ پر انحصار کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے' یعنی یہ بات ہے کہ امریکہ پاکستان کا مستقبل بنانے میں یہاں موجود ہے اور اس بارے میں اس کی اہلیت غیر معمولی اور ہمہ گیر ہے۔ واشنگٹن کو جہاں بھی اپنے مفادات نظر آتے ہیں' اس کا سلوک تمام آمروں کے ساتھ (سہارتو اور مبارک اس کی دو بڑی مثالیں ہیں) نہایت دوستانہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ماضی میں فوجی عزائم کو یقینی طور پر جس بات سے تحریک ہوئی اور تقویت ملی' وہ داخلی حالات تھے' غیر ملکی ترجیحات نہیں تھیں۔ لیکن اس سے بھی بری بات یہ ہے کہ ہمارے سیاست دان انہی حالات کو دوبارہ پیدا کرنے میں غیر معمولی اہلیت رکھتے ہیں۔ پاکستانی سیاست میں ایک اور فوجی مداخلت کے واضح امکانات کے بارے میں میری گفتگو کا غلط مفہوم نہ لیا جائے' اس کے برعکس فوجی افسروں کی خاصی بڑی اکثریت دوبارہ حصول اقتدار کے سوال پر بہت محتاط ہے۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ فوجی حکومتیں بھی کم از کم اس طرح ناکام ہوئی ہیں' جس طرح سول حکومتیں ناکام ہوئی ہیں اور یہ کہ اختیارات کے استعمال سے ملک کو جتنا فائدہ پہنچا' اس سے زیادہ فوج کو نقصان ہوا۔ ان میں سے بیشتر کو یہ بھی علم ہے کہ پیشہ ورانہ اہلیت اور سیاست کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں ہوتا اور فوجوں نے برسر اقتدار رہنے کی صورت میں ہمیشہ شکست کھائی ہے۔ بعض مواقع پر میری ملاقات جب فوجی افسروں سے ہوئی تو میں نے ان کے اندر اس خواہش کو ابھرتے ہوئے پایا کہ ان کے یہاں بھی ایک بلند قامت اور بڑی ساکھ والی سول قیادت ہوتی' یعنی ایسے مثالی مرد اور عورتیں جن کو ایک سپاہی سیلوٹ دیتے ہوئے فخر اور اعزاز محسوس ہوتا۔ جب قومی منظر پر ایسے لوگ آئیں گے تو کسی وردی پوش کا برسر اقتدار آنا ماضی کا ایک ناگوار افسانہ ہو چکا ہوگا۔

(''ڈان'' 12 نومبر' 1995ء)

ہندوستان کی جنونی کیفیت اور ہمارا انتخاب

نوجوان افراد' مستقبل جن کا ہے' بالعموم حق پر ہوتے ہیں' جبکہ صاحب اختیار بوڑھے' خواہ کھادی میں ہوں یا سوٹ میں' درست نہیں ہوتے۔ گزشتہ دنوں ٹوکیو کی شاہراہ پر ایک نوجوان ایک پلے کارڈ اٹھائے کھڑا تھا' اس وقت تک ہندوستان میں تین جوہری دھماکے کئے جا چکے تھے۔ نوجوان کا سوال تھا: ''جوہری دھماکے! پاگل ہو گئے ہو' کیا؟'' اس کے بعد دوسری طرف پانچ دھماکے ہوئے۔ چنانچہ وزیر خارجہ پاکستان کی حالت دیکھتے ہوئے صحیح کہا گیا تھا: ''بوکھلا گیا ہے۔''

یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ ہندوستان کے لیڈر اور ان میں بھی خاص طور پر بی جے پی (BJP) والے ہندوستان کو عظیم طاقت ظاہر کرنے کے لئے ایک جنونی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جوہری اسلحے کے ہوتے ہوئے ہندوستان کو اس کلب میں داخلے کا پروانہ مل جائے گا۔ جہاں وہ اس وقت نہیں ہے اور جہاں اسے ہونا ہی نہیں چاہیے' یہ دیکھتے ہوئے کہ یہاں کی پچاس کروڑ آبادی ناخواندہ ہے اور چالیس کروڑ باشندے غذا کی کمی کے شکار ہیں۔ اس کے علاوہ ایٹمی اسلحے کے ذریعے طاقت حاصل کرنے کی کوشش محض خام خیالی ہے۔ جیسے جیسے پیداوار کے طریقوں میں' علوم میں' ذرائع مواصلات میں تبدیلی آتی ہے' طاقت کی نوعیت بھی بدلتی جاتی ہے۔ ہمارے زمانے میں یہ تبدیلی انقلابی نوعیت کی ہے۔ جن لوگوں نے رسمی طور پر اقتدار کی باگ پکڑ رکھی ہے' ان کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ طاقت میں تبدیلی کن کن طریقوں سے آئی ہے۔

ایٹمی اسلحہ کو ہی لیجئے' جب اس کی ایجاد پہلی بار ہوئی تو اسے ایک جنگی ہتھیار سمجھا گیا اور نہایت بے رحمی سے ہیروشیما اور ناگاساکی پر اسے گرایا گیا۔ جوہری ترقی اور اس کی ملکیت کے ساتھ ہی امریکہ کی حیثیت ایک عالمی طاقت کے طور پر بلند ہوتی گئی اور ساتھ ہی یہ بات طے ہو گئی کہ ایٹمی اسلحہ طاقت کا ایک نیا جز ہے۔ اس کے استعمال سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ مکمل تباہی کا ہتھیار ہے' لہٰذا استعمال کے لائق نہیں' اس کے باوجود کہ ہنری کسنجر اور ہرمن کاہن' جیسے عقل کے دشمن کیا کہتے ہیں۔

پھر جب سوویت روس نے ہائیڈروجن بم کا تجربہ کیا تو دو مہیب عالمی طاقتوں کے درمیان اسے انتہائی دہشت ناک ہتھیار تسلیم کرتے ہوئے سمجھ لیا گیا کہ اسے استعمال نہیں کیا جائے گا' اس کی حیثیت ایک انتباہ کی ہوگی۔ عالمی طاقتوں کی آڑ میں لڑائیاں لڑی جا رہی تھیں' ایٹمی اسلحہ کی موجودگی نے ان پر درپردہ چھتری کا کام کیا۔ ان حقائق کی موجودگی میں اور یہ دیکھتے ہوئے کہ ان کا تعلق بڑی عالمی طاقتوں سے ہے' 1950ء کے عشرے کے دوران میں ایٹمی اسلحہ کو مکمل طور پر طاقت کی علامت سمجھا جانے لگا۔ یہ بات

امریکہ اور روس دونوں کے مفاد میں تھی کہ طاقت کے اس تصور کو برقرار رکھیں' لیکن تبدیلی کی الگ منطق ہوتی ہے' ایک اٹل منطق۔

تین ایسے واقعات رونما ہوئے کہ طاقت کے جزو لازم کے طور پر ایٹمی اسلحہ کی ساکھ گرتی چلی گئی۔ پہلے تو کیوبا اور ویت نام کے واقعات سامنے آئے۔ ان دو چھوٹی قوموں کے اندر آزادی کی جو تحریکیں اٹھیں انہوں نے مل کر انتہائی بھیانک ایٹمی اسلحہ کو سینیٹر فلبرائٹ کے الفاظ میں "ایک زخمی مفلوج دیو" بنا کر رکھ دیا۔ کاسترو کا انقلاب کامیاب ہوا اور اب تک برقرار ہے اور امریکہ کی ایٹمی طاقت کے باوجود برقرار ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ایٹمی اسلحہ کی موجودگی نے اس انقلاب کو ناکام بنانے کے سلسلے میں امریکہ کی اہلیت کو محدود کر رکھا ہے۔ ویت نامیوں نے یہ ثابت کر دیا کہ کسی ایٹمی دیو کو جنگی اعتبار سے زیر کیا جا سکتا ہے۔ فرانس نے اس کی مثال منفی انداز سے پیش کی۔ وہ یورپ میں امریکہ کی بالادستی کو چیلنج کرنے کے لئے ایٹمی تجربہ اور ایٹمی اسلحہ لے کر سامنے آ گیا۔

اس سے جڑی ہوئی ایک اور حقیقت سامنے آئی۔ اب دنیا بدل رہی تھی' اس طرح کی تاریخ میں پہلی بار سیاست معیشت نے اقتدار کے عنصر کے طور پر فوجی طاقت پر غلبہ پا لیا۔ یورپ میں فرانس جو ایک ایٹمی طاقت ہے جرمنی کے مقابلے میں' جس کے پاس ایٹمی طاقت نہیں' آگے نہیں نکل سکا۔ اسی طرح چین یا فرانس کے مقابلے میں جاپان دنیا میں کہیں زیادہ اثر و رسوخ کا مالک ہے۔ جنوبی افریقہ اور اسرائیل اس کے مقابلے میں مثالیں پیش کرتے ہیں۔ جنوبی افریقہ نے جب اپنے ایٹمی اسلحہ تباہ کر دیئے اور ایٹمی تجربوں سے ہاتھ اٹھا لیا تو عالمی سیاست میں اس کا وقار اور رسوخ بڑھ گیا۔ جبکہ اسرائیل کے پاس زبردست ایٹمی طاقت کے ہوتے ہوئے مشرق وسطیٰ میں اور اس سے باہر بھی اس کے اثر و رسوخ میں اور تحفظ میں بھی ذرا بھی اضافہ نہیں ہوا' حالانکہ امریکہ نے شرمناک طور پر اس صورت حال کو برداشت کیا اور اس کو تقویت بھی دی۔ اب رہی بات کہ 1998ء میں بھی ہندوستان کے لیڈر ایٹمی اسلحہ کی موجودگی کو طاقت کا لازمی عنصر سمجھ رہے ہیں اور اسے عالمی طاقت کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں تو اس بات سے ان کے ذہنی افلاس' عقل سے محرومی اور حاکمانہ طرز فکر کا پتہ چلتا ہے۔ عملاً ان پانچ ایٹمی دھماکوں سے ہندوستان کے عزائم کو دھچکا پہنچا ہے۔ جیسا کہ ہر سیاست دان کو اور گروہ کے سرغنہ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ طاقت ہمسایے میں اثر و رسوخ سے پروان چڑھتی ہے' وہ ملک جسے اپنے ہی علاقے میں اثر اور اختیار حاصل نہیں' عالمی طاقت کی حیثیت کا دعویدار نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان کی حیثیت جو اپنے ہمسایوں میں پہلے ہی بہت گر چکی ہے' اب اور زیادہ گر جائے گی۔ پہلے اس نے فیوژن بم' (Fusion Bomb) جس سے معلوم ہوا کہ اس کے پاس ایٹمی تجربہ کرنے کی اہلیت موجود ہے' پھر اس نے ایٹمی اسلحہ کی تیاری کے تجربے کئے۔ اس سے یہی ہوا کہ ہندوستان کے غیر ایٹمی ہمسایوں میں تشویش پیدا ہو گئی اور چین یا پاکستان کے ساتھ فوجی طاقت کے توازن میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔

اسی طرح یہ تجربے خواہ نفسیاتی طور پر تسلی بخش ہوں یا بی جے پی کے رہنماؤں کے جو خود کو غیر محفوظ پاتے ہیں‘ سیاسی طور پر نفع بخش ہوں‘ لیکن ہندوستان کے لئے اس کے نقصانات ان کے اندازے سے کہیں زیادہ ہیں۔ آنے والے برسوں میں ہندوستان کو یہ امید تھی کہ آٹھ فیصد شرح پیداوار کا ہدف پورا کر لے گا۔ اگر جاپان اور امریکہ سے ملنے والی دھمکیوں میں نصف صداقت بھی ہو اور ہندوستان پر بین الاقوامی پابندیاں‘ جن میں ٹیکنالوجی کی منتقلی پر پابندی بھی شامل ہے‘ عاید ہو گئیں تو شرح پیداوار کا معاملہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ آخری بات یہ کہ ان تجربوں کی بدولت دلی کی مقتدر انتظامیہ نے ہندوستان کو اسلحے کی دوڑ میں آگے لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ دوسرے درجے کی عالمی طاقتوں کے معاملے میں تیسری دنیا کا ایک ملک نسبتاً زیادہ آسانی سے ٹوٹ پھوٹ سکتا ہے۔

ایسے میں پاکستان کو کیا کرنا چاہیے؟ میرا مشورہ ہے‘ خوف اور گھبراہٹ میں مبتلا نہ ہو۔ کسی ردعمل کا مظاہرہ نہ کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قاضی حسین احمد جیسے لوگوں کی باتیں مت سنو‘ بے نظیر بھٹو جیسوں پر کان نہ دھرو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو یا تو اپنی لاعلمی کی وجہ سے یا غالباً موقع پرستی کے تحت‘ جس کا زیادہ امکان ہے‘ ابھی اور اسی وقت ایٹمی تجربے کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ اس اضطراری ردعمل کو متوازن رکھنے کے حق میں کچھ یقینی دلائل ہیں۔ ان پر غور کیجئے۔

اول ہندوستان فی الوقت نہایت منفی انداز میں دنیا کی توجہ کا مرکز ہے۔ حکومتوں کی سطح پر بھی اور عوامی سطح پر بھی اور اس بات کا امکان ہے کہ یہ کیفیت کچھ عرصے برقرار رہے گی۔ پاکستان کے دھماکے کی صورت میں ہندوستان پر سے یہ دباؤ فوری طور پر اٹھ جائے گا اور پاکستان کی طرف منتقل ہو جائے گا‘ جس کے نتائج نسبتاً زیادہ خراب ہوں گے‘ اس سے زیادہ جتنے ہندوستان پر ہیں۔ لہذا دہلی پر آنے والا بوجھ پاکستان کو نہیں اٹھانا چاہیئے بلکہ یہی وقت ہے کہ وہ سفارتی پھل کاری سے کام لے اور سارک کے اندر اور اس سے باہر بھی دنیا بھر میں بین الاقوامی طور پر مہم چلا کر ہندوستان پر دباؤ ڈالے اور ایک مدبرانہ انداز اختیار کرتے ہوئے‘ اس صورت حال سے کچھ فائدہ اٹھائے۔

دوم ایٹمی اسلحہ کی تیاری کے سلسلے میں پاکستان کے مقاصد ہندوستان کے مقاصد سے مختلف ہیں۔ دہلی کے جوہری پروگرام کو طاقت کے حصول سے اگرچہ یہ خواہش گمراہ کن ہے‘ جوڑا گیا ہے۔ اسلام آباد کا معاملہ اپنے تحفظ سے جڑا ہوا ہے۔ پاکستان نے ہندوستان کی ایٹمی طاقت کے خلاف اپنے تحفظ کے لئے ایک ڈھال بنائی ہے۔ اس کی ضرورت کا تقاضا تھا کہ دشمن کو کسی کارروائی سے باز رکھنے کے لئے بندوبست کرے اور بظاہر اس نے وہ بندوبست کر لیا ہے۔ میں نے ایک عمر اسلحہ کی حکمت عملی کا مطالعہ کیا ہے اور یہ بات جانتا ہوں کہ ہندوستان اپنے پانچ دھماکوں کے باوجود اس حقیقت کو بدل نہیں سکتا۔ سائنس دان اور ان کے انتظامی ماہر اپنی ایٹمی صلاحیت کا امتحان کرنا چاہتے ہیں۔ اب ہمیں اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہیے۔

MashalBooks.org

کیا اس وقت ہماری دفاعی اہلیت ایک ہفتہ قبل کے مقابلے میں کم ہو گئی ہے؟ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی ایماندار آدمی اس سوال کا جواب اثبات میں دے گا۔ سوئم پاکستان کے لئے ایک بڑا خطرہ یہ ہے کہ اس طرح وہ ہندوستان کے ساتھ اسلحہ بندی کی دوڑ میں شریک ہو جائے گا' جبکہ ہمارے مقابلے میں اس کے وسائل کہیں زیادہ ہیں۔ شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان ہم سے بھی اسی دھماکے کی توقع کرتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو ہم غلط راہ پر چل پڑیں گے۔ دفاعی حکمت عملی کے تحت اسلحہ بندی اور اس کی تیاری ایک نہایت مہنگا کام ہے' جسے سمجھنے کے لئے کسی معاشی استدلال کی ضرورت نہیں۔ دوسرے الفاظ میں جہاں اس کی بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے' وہیں اقتصادی فائدے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہیں کہ سیاسی حکمت عملی کے تحت اسلحہ سازی کے لئے بھاری سرمایہ لگانا پڑتا ہے' یہ ساری سرگرمی بڑی حد تک خفیہ رکھی جاتی ہے' جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس سے نہ تو اقتصادی منفعت حاصل ہوتی ہے اور نہ ٹیکنالوجی میں تیز رفتار ترقی آتی ہے۔ چنانچہ سوویت یونین اور اس کے حواری ملک' جیسے پولینڈ اور چیکوسلواکیہ نہایت حساس نوعیت کے اسلحہ بنانے والے ملک بن گئے' لیکن اقتصادی طور پر پسماندہ رہ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان ریاستوں اور ان کے معاشروں کی ترقی غیر مربوط انداز سے ہوئی اور آخر کار وہ ڈھیر ہو کر رہ گئے۔ پاکستان کو اس انجام سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ اسے ہندوستان کے برابر اسلحہ بندی اور اسلحہ سازی کی دوڑ میں شامل ہونے اور اس حال میں گرنے سے بچایا جائے۔ ہماری ضرورت تو ہندوستان کے ساتھ برابری نہیں بلکہ موثر امتناعی طاقت حاصل کرنا ہے۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ دفاعی منصوبہ بندی اور اسلحہ سازی کے باب میں کچھ تبدیلیاں کی جائیں' تاکہ اقتصادی ترقی کے لئے ایک مستحکم ماحول پیدا ہو جائے۔

آخری بات یہ کہ آج پاکستان کو جو بنیادی مسائل درپیش ہیں' وہ اقتصادی اور سماجی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ ہمارے مستقبل کا انحصار مستقبل کی حکمت عملی پر ہے' یعنی اقتصادی سست رفتاری اور سماجی انتشار کے ضمن میں' جو چیلنج درپیش ہیں' ہم ان سے کس طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ یہ دونوں ہماری ریاست اور معاشرہ کو درپیش ان بحرانوں کے مظاہر ہیں' جو ان کی بنیادی ساخت میں پیوست ہیں اور بحرانوں سے نپٹنے کا کوئی آسان حل موجود نہیں۔ اس نوعیت کے ماحول میں یہ امکان پایا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان پر بین الاقوامی پابندیاں نسبتاً زیادہ عائد ہوں۔ ہندوستان کی جو بھی کمزوریاں ہوں' وہ ہمارے مقابلے میں غیر ملکی امداد' قرضے اور ٹیکنالوجی پر زیادہ انحصار نہیں کرتا تھا اور اب بھی نہیں کرتا۔ ان دیگر اسباب کی بنا پر اسلام آباد کے لئے کہیں بہتر بات یہ ہوگی کہ ٹھنڈا ہو کر بیٹھے' سوچ بچار کرتا رہے اور دہلی نے جو مواقع فراہم کئے ہیں' ان سے فائدہ اٹھائے۔ کاش یہ دلیل اپنا کام کرے!

("ڈان" 17 مئی 1998ء)

MashalBooks.org

جب پہاڑ دم توڑ دیں

میں نے ٹیلی ویژن پر ایک تصویر دیکھی جو ایٹمی دھماکے سے اٹھنے والے بادل کی اس تصویر سے جس سے ہم مانوس ہیں' کہیں زیادہ بھیانک تھی۔ پہاڑ کا رنگ سفید ہو گیا تھا' میں یہ سوچ کر حیران ہوتا ہوں کہ قدرت نے خدا کی اس سب سے زیادہ حیران کن تخلیق نے کس قدر کرب محسوس کیا ہو گا۔ یعنی چغئی کا یہ عظیم پہاڑیوں دیکھتے ہی دیکھتے راکھ کا ڈھیر بن جائے گا اور پھر ہمارے یہاں' ہم جو اپنے پہاڑوں کی رفعت پر اتنا ناز کرتے ہیں۔

ہندوستان میں دائیں بازو کے کوتاہ اندیش لیڈروں نے اس کا آغاز کیا اور پھر پاکستان پر زور ڈالا کہ وہ اپنی ایٹمی صلاحیت کو سامنے لے آئیں' وہ یہ بات کبھی تسلیم نہیں کریں گے کہ انہوں نے ہندوستان کے خلاف اور اس کے ہمسایوں کے خلاف ایک جرم کا ارتکاب کیا ہے اور اس بھیانک غلطی' حکمت عملی یا منصوبے کی کامیابی کی حد تک اور سیاسی یا اقتصادی طور پر کوئی ایک فائدہ بھی تو حاصل نہیں ہوا۔ ایک ہندوستانی سائنس دان ڈاکٹر ونو دھوبائے نے سچ کہا کہ آر ایس ایس نے یہ دوسری مرتبہ گاندھی کو قتل کیا ہے۔ 1948ء میں انہیں جسمانی طور پر ہلاک کیا اور پچاس سال بعد ان کے ورثے کو مار ڈالا۔ ہندوستان ان ہلاکتوں کے اثرات کو آئندہ برسوں تک بھگتتا رہے گا۔ ہندوستان کو عالمی رائے عامہ میں ایک طرح کا ستائشی منصب حاصل رہا ہے' ایک پراسرار عقیدت کی حامل قدیم سرزمین نہایت کشادہ ظرف' وہ جگہ جہاں ہندو اور مسلمان' مسیحی اور بدھ کے ماننے والے اور زرتشتی آباد ہیں اور پھر البرٹ آئن سٹائن' ڈسمنڈ ٹوٹو اور مارٹن لوتھر کنگ کا روحانی وطن' بی جے پی حکومت نے اپنی ایک ہی ضرب میں ہندوستان کے اس عظیم ترین ورثے کو پاش پاش کر دیا اور اس کے علاوہ بھی۔

کئی عشروں کی باہمی تلخی اور نوک جھونک کے بعد ہندوستان کے تعلقات چین کے ساتھ' چین جو بلحاظ آبادی دنیا کا سب سے بڑا اور اقتصادی ترقی میں دیو ہیکل ملک ہے' گزشتہ چھ سال سے بہتر ہوتے جا رہے تھے' چین اور ہندوستان کے درمیان مفاہمت اس درجے پر پہنچ گئی تھی کہ چینی لیڈروں نے پاکستان کو' جو ان کا پرانا ساتھی ہے' یہ مشورہ دیا کہ ہندوستان سے اپنے تنازعے حل کرے۔ سابق وزیراعظم آئی کے گجرال نے چین اور ہندوستان کے درمیان پر جوش تعلق کو پاک و ہند تعلقات کے ضمن میں بطور مثال پیش کیا۔ جب وزیراعظم اٹل بہاری باجپائی نے بڑے فخر کے ساتھ پہلے تین ایٹمی دھماکوں کا اعلان کیا تو ایک اعلیٰ سطح کا چینی فوجی وفد ہندوستان میں موجود تھا۔ ان دھماکوں سے پہلے اور اس کے بعد بھی چین کے خلاف

MashalBooks.org

بیان بازی ہو چکی تھی۔ اس طرح خارجہ پالیسی میں ہندوستان کا سب سے بڑا واحد کارنامہ جسے دو عشروں کے دوران میں حاصل کیا گیا تھا' ایٹمی فیصلے کی طرح زمین میں دفن ہو گیا۔

ہندوستان میں پیداوار کی شرح تقریباً چار دہائیوں کے اندر سالانہ چار فیصد کی حد تک پست رہی ہے۔ اس پراسرار اور دیرپا یکسانیت کو دنیا بھر کے ماہرین اقتصادیات نے "ہندو شرح پیداوار" قرار دیا تھا۔ پھر کوئی ایک عشرہ پہلے اس نشیب نے اوپر کا رخ کیا یہاں تک کہ شرح پیداوار پچھلے سال 5ء7 فیصد کی حیران کن سطح پر پہنچ گئی۔ آزادی کے بعد سے امید کی لہر کبھی اس طرح دور دور تک نہیں پہنچی تھی۔ بین الاقوامی سرمائے نے اس میں سرمایہ کاری کے زبردست مواقع دیکھے۔ ماہرین اقتصاد کو توقع تھی کہ ہندوستان آئندہ عشرے کے دوران 7 فیصد شرح پیداوار برقرار رکھے گا اور ہندوستانی عوام کو اس اندوہناک افلاس سے جس میں وہ اب تک مبتلا تھے' نجات دلا دے گا۔ پوکھران کے اس بے آباد ویرانے میں یہ توقع بھی دفن ہو گئی۔ بین الاقوامی ماہرین اقتصادات یہ اندازہ کرتے ہیں کہ 31 مارچ کو ختم ہونے والے مالی سال میں ہندوستان کی شرح پیداوار 5ء7 فیصد کی متوقع شرح سے گر کر 5 فیصد رہ جائے گی۔ ان اندازوں کی بنیاد پابندیوں کے اثرات پر نہیں بلکہ سرمایہ کاری کے موسم میں ناگوار تبدیلی پر ہے۔

ان چند عبوری مدتوں کے سوا' مثلاً آئی کے گجرال کی مختصر مدت کی حکومت کو چھوڑتے ہوئے ہندوستان میں مختلف حکومتوں نے اپنے ہمسایوں کے سلسلے میں چنداں نازک احساسات نہیں رکھے۔ علاقائی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں سری لنکا' نیپال' مالدیپ اور بنگلہ دیش کے مندوب ہندوستان کی پالیسیوں کے سلسلے میں جس غیر ہمدردانہ رویے کا اظہار کرتے ہیں' اس سے بعض شرکاء کو بہت حیرت ہوتی ہے' لیکن میرا خیال ہے کہ ہمسایہ ملکوں کو اس سے زیادہ صدمہ اور غصہ اور کسی بات پر نہیں آیا ہو گا جتنا ہندوستان کے اس یک طرفہ اور اچانک فیصلے پر ہوا' جب اس نے 3 مثبت 2 ایٹمی دھماکے کئے اور یوں جنوبی ایشیا میں ایٹمی اسلحہ کے حصول کی دوڑ شروع کر دی اور بھیانک تباہی کا راستہ کھول دیا۔ ان کی تشویش اور برہمی بجا ہے کیونکہ فطری طور پر یہ ہو گا کہ جس طرح ہندوستان اور پاکستان ایٹمی تابکاری سے محفوظ نہیں ہوں گے' اسی طرح یہ ملک بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔

پاکستان میں عام طور پر یہ سنا جاتا ہے کہ ہندوستان علاقائی بالادستی حاصل کرنے کے درپے ہے۔ غالباً یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ برتری رضامندی سے حاصل کی جاتی ہے' کسی دباؤ کے تحت نہیں۔ دہلی کے تازہ ترین اقدامات بالادستی کے مفروضے کی تصدیق نہیں بلکہ اس کی نفی کرتے ہیں۔ پاکستان کے یہاں بھی بالادستی کے عزائم نہیں بلکہ مسٹر نواز شریف کی حکومت اتنی مہربان ضرور تھی کہ اس نے بلوچستان میں ایٹمی تجربے کرنے سے پہلے ہمسایہ ملکوں کو مطلع کر دیا تھا۔ ہر تاریخی وقت کی ایک اپنی ذہنی کیفیت ہوتی ہے' لیکن پوری انسانی تاریخ میں ترقی اور عظمت کے حصول کی کاوشوں کے درمیان ایک عنصر مشترک رہا ہے' کلچر کے

MashalBooks.org

تاریخ داں اس ایک عنصر کی وضاحت مختلف انداز سے کرتے ہیں۔ جیسے موقع شناسی' کشادہ قلبی اور رواداری اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے قبولیت۔ جہاں افکار میں تصادم نہ ہو' مختلف النوع اثرات' علوم' مذہب' نقطہ ہائے نظر اور معاشرتیں باہم یکجا نہ ہوں وہاں تہذیب کی نشو ونما نہیں ہوتی اور عظمت بچ کر نکل جاتی ہے۔ بی جے پی اور اس کے حلیف مذہبی عصبیت اور عدم رواداری اور اس بازو کے جس ماحول کو بڑھاوا دے رہے ہیں' وہ ہندوستان کے مستقبل کے لئے انتہائی نقصان دہ ہے۔ یہ پاکستان میں بھی ہے لیکن اس کے دیگر اسباب ہیں۔ قومیت پرستی کو ایٹمی نابکاری کی سان پر چڑھا کر اس ماحول کو مزید خراب کیا گیا ہے۔ ان ایٹمی تجربوں نے ہندوؤں کے حامیوں کو اور بھی زیادہ نفرت اور خوف میں مبتلا کر دیا ہے۔ ایک دوسرے کے مخالف بنیاد پرست فریقوں کا ردعمل ابھی تک ایک عادت کے تحت جوابی کارروائیوں تک رہے گا' لیکن اس سے بلاشبہ دائیں بازو کے جذبات کو بہت تقویت ملے گی اور انتہائی اقدامات میں اضافہ ہوگا۔ بی جے پی کے حامیوں نے ابھی حالیہ دنوں میں' جوہری تجربوں کے خلاف سائنس دانوں کے ایک جلسے پر حملہ کر دیا۔ آرٹسٹ ایم ایف حسین کے مکان پر دھاوا بول دیا اور ان کی بنائی ہوئی تصویریں تباہ کر دیں' امریکہ کی عائد کردہ پابندیوں کے جواب میں پیپسی اور کوکا کولا کے ٹرکوں پر مار دھاڑ کی اور ایک پاکستانی موسیقار استاد غلام علی کی محفل موسیقی درہم برہم کر دی۔ ہندوستان ٹائمز نے ایک اداریے میں لکھا ہے کہ "عدم رواداری کا ماحول پھیلتا جا رہا ہے۔" انڈین نیشنل کانگریس کے ایک لیڈر امبیکا سونی نے خبردار کیا ہے کہ اس طرح کی کارروائیاں اس ملک کے وجود کو ہی تار تار کر دیں گی۔ ادھر پاکستان میں سرکاری ٹیلی ویژن نے کج فہمی کے ساتھ اور بار بار کہا ہے کہ ایٹمی تجربوں کے مخالف غیر ملکی ایجنٹ ہیں۔

ہندوستان کے لیڈر طویل عرصے سے یہ سوچتے آئے ہیں کہ ایٹمی ہتھیار طاقت کی یقینی ضمانت ہیں۔ یہ بات ان کی سمجھ میں جلد ہی آ جائے گی کہ ان کی سوچ غلط ہے۔ میں نے پہلے ہی یہ کہا تھا (ڈان مئی 1998ء) کہ ہیروشیما اور ناگاساکی نے بتا دیا ہے کہ جوہری ہتھیار اخلاقی طور پر ناقابل استعمال ہیں۔ کوریا' کیوبا اور ویت نام نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ سیاسی اور فوجی ہر دو اعتبار سے استعمال کے لائق نہیں۔ 1960ء کے عشرے تک ایٹمی ہتھیاروں کی حیثیت' طاقت کے ایک اہم حصے کے طور پر باقی نہیں رہی۔ جرمنی اور جاپان جیسے دیو ہیکل ملکوں کا عروج' جن کے پاس کوئی ایٹمی ہتھیار نہیں اور سوویت یونین کا انہدام جو ایک ایٹمی سپر پاور ہے' ان حقائق نے یہ دکھا دیا کہ عالمی سیاست میں طاقت کے توازن کے لئے ایٹمی اسلحہ کی موجودگی ایک غیر اہم بات ہے۔ ایٹمی تجربوں کے کسی حمایتی نے میرے اس بیان کی تردید' نہ پاکستان میں کی ہے اور نہ پاکستان سے باہر کی ہے۔ پھر آخر ہندوستان کے حکمرانوں کو پانچ ایٹمی دھماکے کرنے کا خیال کیوں آیا؟ اور ہم یہ کیوں بڑے اصرار سے کہتے ہیں کہ پاکستان کے پاس ہندوستان کے پیچھے چلتے ہوئے اس اندھے کنویں میں چھلانگ لگانے کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا؟

MashalBooks.org

میں اور میری طرح بہت سے دوسروں نے بھی یہ دلیل دی ہے کہ پاکستان کے پاس بہترین راستہ یہ تھا کہ گومگو کی جس کیفیت کے ساتھ پچھلے دس سال سے کام چلتا آ رہا تھا اسی کو برقرار رکھتا۔ اب یہ ثابت کرنا ممکن نہیں رہا کہ اس وقت ہم صحیح تھے یا غلط تھے جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ ایک پہاڑ مر گیا۔ لیکن تاریخ تقاضا کرتی ہے کہ یہ بات درج کی جائے کہ وزیراعظم نواز شریف' جن کے ابتداً نیک ارادے تھے پاکستان کے اندر اور پاکستان کے باہر کی بعض طاقتوں کے دباؤ میں آ گئے۔ وہ کون سے اسباب تھے جنہوں نے پاکستان کو ایٹمی تجربوں پر آمادہ کیا۔ اس بارے میں ہمارا علم ابھی ناکافی ہے' لیکن اصل اسباب کی نشاندہی بخوبی ہو جاتی ہے۔ ان میں سب سے اہم بی جے پی کے رہنماؤں کے اشتعال انگیز بیانات تھے۔

ایسے بیانات بہت تھے' جن کا بیان یہاں ممکن نہیں۔ ان میں ایک تو ہندوستان کے وزیر داخلہ ایل کے اڈوانی کا یہ انتباہ تھا کہ پاکستان کو جنوبی ایشیا میں ہونے والی اس تبدیلی کو یاد رکھنا چاہیے کہ "ماحول کیا سٹریٹیجی" بدل گئی ہے۔ پھر وزیراعظم باجپائی کا بیان کہ ان کی حکومت کشمیر کے اس علاقے کو جو پاکستان کے قبضے میں ہے' زبردستی چھین لے گی' پھر امور کشمیر کی وزارت ایک ایسے متشدد وزیر داخلہ کے حوالے کر دینا جو بابری مسجد کے انہدام کا مشاہدہ بڑے جوش و خروش سے کر رہے تھے اور عملاً لائن آف کنٹرول کے قریب محدود پیمانے پر لیکن اشتعال انگیز کارروائی کرنا۔ پاکستان کے چیف آف آرمی اسٹاف نے محاذ سے واپسی پر یہ اندازہ لگا لیا کہ ہم درحقیقت ایک روائتی جنگ کو آہستہ آہستہ قریب آتے دیکھ رہے ہیں۔ جہاں تک میرے علم میں ہے ہندوستان نے ایسا کچھ نہیں کیا جس سے پاکستان کا اطمینان بحال ہوتا۔ یہ وہ تبدیلی حالات تھی جس کے سبب پاکستان کے حکام کو بدشگونی نظر آئی۔ اس میں اضافہ کوئی ایک دہائی پہلے پریسلرز میم سے ہوا' جس کے تحت پاکستان کی مسلح افواج کے لئے اسلحہ کا حصول ممکن نہیں رہا۔ محمد ضیاء الحق کے عشرہ حکومت میں ہماری افواج کا امریکی اسلحہ پر انحصار بہت بڑھ گیا۔ گزشتہ دہائی میں افواج کو نہ صرف اس ذریعے سے محرومی کا نقصان ہوا بلکہ بھروسے کے لائق فالتو پرزے اور آلات کی بھی قلت پیدا ہو گئی۔ پاکستان کو جلد اندازہ ہو گیا کہ ہندوستان کے ساتھ جنگ کی صورت میں حالات کا مقابلہ نہ کر سکے گا اور سنگین مسائل میں مبتلا ہو جائے گا۔ اس طرح کے جنگ جویانہ حالات میں یہ بات یقینی ہوتی ہے کہ فوجی رہنما دفاعی استعداد کو یقینی بنانے پر زیادہ سے زیادہ زور دیں' فوجی تجزیہ نگار اس بات سے ساری دنیا میں واقف ہوں گے۔

حیرت کی بات ہے کہ ان حالات میں اور اپنے ایٹمی اسلحہ کا تجربہ کر لینے کے بعد ہندوستان کے لیڈر زبانی طور پر اور جنگی انداز سے بھی اشتعال انگیزی میں سرگرم ہو گئے۔ واشنگٹن کے اعلیٰ عہدیداروں اور لیجسلیٹرز صاحبان نے بھی یہ بات محسوس کی ہو گی کہ جوہری اسلحہ کی ممانعت کے تحت ان کی عاید کردہ پابندیوں سے ایٹمی اسلحہ کی تیاری اور تجربوں کے معاملے میں اور بھی شدت اور تیزی آ گئی۔

جب معاملات اتنے گھمبیر ہوں' تو حکومت کو سیاسی امداد کی ضرورت تھی۔ اس کی بجائے پاکستان کے حزب اختلاف کے لیڈروں نے سوائے غنویٰ بھٹو کے' جن میں ایئر مارشل اصغر خاں اور سردار فاروق احمد خاں لغاری بھی شامل تھے' سڑکوں پر نکل کر نواز شریف کو طعنے دینے شروع کر دیئے اور مطالبہ کیا کہ وہ ایٹمی دھماکہ کر دیں۔ اس گروہ کی قیادت پہلے جماعت اسلامی کر رہی تھی' لیکن بعد میں یہ قیادت بے نظیر بھٹو نے اچک لی۔ اس قومی بحران کے اندران کو اپنی گرتی ہوئی سیاسی ساکھ کی بحالی کا امکان نظر آ گیا تھا۔ پاکستان کی سیاست میں جو گھناؤنی حرکتیں ہوتی رہی ہیں' مجھے نہیں معلوم کہ اس سے زیادہ گری ہوئی بات کبھی ہوئی کہ انہوں نے چرب زبانی سے کام لیتے ہوئے چوڑیاں اتار کر نواز شریف کی طرف پھینکیں۔ جی 8 کے ملکوں کا ردعمل بھی بہت نرم تھا' جنہوں نے ملے جلے انداز میں ہندوستان کے ایٹمی تجربوں کا اس طرح جواب دیا۔ اس سے پاکستان کا اندیشہ اور اکیلے رہ جانے کا احساس زیادہ بڑھ گیا۔ بالآخر ہندوستان کی طرح پاکستان کا جواب بھی اس جوہری کلچر اور اس کی امتیازی اہلیت اور بالادستی کے لئے ایک خراج عقیدت بن گیا' جس کے تصور کو مغرب نے سرد جنگ کے زمانے میں بڑی چابک دستی سے فروغ دیا تھا۔

ہندوستان اور پاکستان کے لیڈروں نے اب اس طاقت کو جو صرف خدا کے پاس تھی' اپنے اپنے تصرف میں لے لیا ہے' جیسا کہ دوسروں نے اس سے پہلے کیا کہ وہ پہاڑ کو قتل کر دیں' زمین میں بھونچال ڈال دیں' سمندر کے پانی کو کھولا دیں اور انسانیت کو تباہ کر دیں۔ میرا خیال ہے کہ جب اس شہ زوری کی نمائش اور خودستائی کا مرحلہ تمام ہوگا تب دونوں ملک پیچھے ہٹ جائیں گے اور اس وقت سوچیں گے کہ اس لرزہ خیز ذمہ داری سے کس طرح عہدہ برآ ہوں۔

(''ڈان'' '4 جون 1998ء)

جوہری دھماکے۔ نفع و نقصان

پاکستان کے ایٹمی تجربوں کے اثرات دفاعی یا خارجہ تعلقات سے زیادہ ملک کے داخلی حالات پر پڑ رہے ہیں اس صورت حال کی توقع تو کی جاتی تھی' لیکن اس کا دائرہ اثر کسی بھی شخص کے قیاس سے زیادہ ہے۔ وزیراعظم نے ۱۱ جون کو جس گھن گرج کے ساتھ تقریر کی تھی۔ اس میں وزن کتنا ہوتا' اس کا جائزہ تو قبل از وقت ہوگا۔ ظاہری طور پر ایک نام نہاد انقلاب ملک پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ابھی اس امر کا کوئی اشارہ نہیں ملا کہ قومی سطح پر جو فاصلہ ارادے اور عمل کے درمیان برابر بڑھتا جا رہا ہے' اسے پاٹنے کے لئے حکومت کے پاس کون سی تجویز ہے' ایسے میں لازمی طور پر یہی ہو سکتا ہے کہ ایٹمی تجربوں کے بعد سے اب تک قوم کو جو فائدے حاصل ہوئے ہیں اور جو نقصان پہنچے ہیں' ان کا عبوری جائزہ لے لیا جائے۔

لفاظی اور چرب زبانی زوروں پر ہے اور جذبات ابل رہے ہیں' لیکن ان کے باوجود پاکستان کی دفاعی صورت حال حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ چند سیاست دان اور تجزیہ نگار نہایت زعم سے یہ کہتے ہیں کہ ان دھماکوں سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان طاقت کا توازن (Strategic balance) تبدیل ہو گیا ہے لیکن اس کے پس پردہ جو حقیقت موجود تھی' اس میں بڑی حد تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ کوئی دس سال سے ایک خطرہ درپردہ طور پر یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ روایتی انداز سے ہونے والی جنگ میں ایٹمی اسلحہ استعمال کیا جا سکتا ہے' خاص طور پر ان دونوں برسر جنگ ملکوں میں سے اس ملک کی طرف سے جو روایتی طریق جنگ میں خود کو کمزور پاتا ہو۔ وہی مفروضہ اب کھل کر سامنے آ گیا ہے۔

یہ بات بحث طلب ہے کہ آیا پاکستان کی حفاظت کے سلسلے میں اس کے مفادات اس صورت میں زیادہ یقینی تھے کہ ابہام سے کام لیا جاتا یا اس طرح کہ ہندوستان کی پیروی کی جاتی اور پاکستان کی اہلیت کو علم نشرح کرایا جاتا۔ میں اب بھی اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ دہلی والوں کی اشتعال انگیزی سے قطع نظر ہندوستان کے ایک سوال کا جواب ایک کے بعد دو دھماکوں سے دے کر پاکستان کی سلامتی کے باب میں کوئی مفید کام نہیں ہوا۔ بہر حال اس موقف کو صحیح یا غلط ثابت کرنے کا کوئی طریقہ موجود نہیں۔ یہی کیا جا سکتا ہے کہ پہلے والا سچ ہی سچ رہتا ہے۔ اسی طرح کا ایک سچ یہ ہے کہ مشترکہ تباہی کے لئے ایک توازن' دونوں ملکوں کے درمیان موجود ہے' جس کے ہوتے ہوئے یہ امکان موجود نہیں کہ دونوں حریفوں میں سے کوئی ایک حریف ایک روایتی فیصلہ کن جنگ پر آمادہ ہو۔ پاک و ہند تصادم کی صورت میں روایتی طرز کے پیمانے کچھ اس طرح کے ہوں گے۔ (ا) دونوں فریقوں نے یہ فیصلہ کیا۔ لیکن نہیں کیا۔ کہ پرانے تنازعوں کو جاری رکھنے

MashalBooks.org

کی صورت میں کچھ نئے اور زیادہ بھیانک خطرات پیدا ہو گئے ہیں لہذا انہیں دور کرنے کے لئے تخلیقی ذہن اور تدبر سے کام لینا ہو گا۔ (۲) اس تنازعے کو جاری رکھیں گے' جس طرح اب تک جاری رکھا ہے تاہم بالواسطہ جنگ کے ذریعے' کمتر درجے کی شدت کے ساتھ اس طرح تخریبی کارروائیوں کے ذریعے ایک دوسرے کا خون بہاتے رہیں گے' جو پر تشدد ہو گی اور نہیں بھی ہو گی۔ (۳) دوسری صورت حال سے جو کشیدگی پیدا ہو گی' وہ محدود نوعیت اور مختصر وقفے پر مبنی روائتی جنگ یا جنگ کے خطرے پر منتج ہو سکتی ہے۔ اس کی مثالیں ۱۹۸۷ء اور ۱۹۹۰ء کے برسوں سے مل سکتی ہیں' جب کہ اچانک حملے اور جوابی حملے کے امکانات سامنے تھے اگرچہ اس خطرے نے باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار نہیں کی۔ (۴) ان تینوں صورت حال کا تقاضا ہے کہ جب تک دونوں فریق باہمی طور پر اسلحہ بندی کا فیصلہ نہ کر لیں اس وقت تک کے لئے ہر ملک میں اسلحہ کی نگہداشت کا ایک یقینی نظام قائم کیا جائے۔ بین الاقوامی سطح پر معائنے کا ایک نظام موجود ہے' جو اس امر پر نظر رکھتا ہے کہ آیا دو متحارب فریقوں میں تصادم کا خطرہ ایٹمی اسلحہ کے استعمال تک پہنچ گیا ہے۔ یہی وہ کیفیت تھی جس کے تحت ۱۹۹۰ء کے موسم گرما میں امریکہ نے پوری طاقت کے ساتھ سفارتی سطح پر مداخلت کی۔

جب سے ہندوستان اور پاکستان میں ایٹمی دھماکے کئے گئے ہیں' تب سے اب تک یہ بنیادی حقیقت پیدا نہیں ہوئی ہے کہ تنازع موجود ہے اور کسی بھی فریق نے اپنے پرانے موقف سے ہٹنا گوارا نہیں کیا تاکہ امن کی بامعنی گفتگو کا آغاز ہو سکے۔ کشمیر میں جدوجہد پاکستان کی مدد کے ساتھ جاری ہے۔ اسی طرح جدوجہد کو دبانے کے لئے ہندوستان کی فوج سختی سے کارروائی کر رہی ہے۔ جوہری تجربوں کے بعد سے ہندوستان نے وہاں اپنی فوجوں کی تعداد میں اضافہ کیا ہے۔ ڈھکے چھپے انداز سے جنگ جاری ہے۔ گیارہ جوہری تجربوں کے بعد پاکستان نے ہندوستان پر خوں ریز دہشت گردی کے دو الزامات لگائے ہیں' ایک بم دھماکہ کسی سینما گھر میں ہوا ہے۔ دوسرے میں ایک ریل گاڑی دھماکے سے اڑا دی گئی ہے۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ دونوں ملکوں کے درمیان جو لڑائی درپردہ طور پر جاری ہے اس کے نتیجے میں کسی موقع پر وہ روائتی تصادم کی صورت اختیار کر سکتی ہے جیسا کہ ۱۹۸۷ء اور ۱۹۹۰ء میں ہوا۔ البتہ اس امر کے شواہد ضرور موجود ہیں کہ ان دونوں ہمسایوں میں دشمنی کا جوالا وا پک رہا ہے' بڑی طاقتیں اس کے خطرے کو زیادہ تشویش سے دیکھ رہی ہیں۔

پاکستان کے اعلیٰ عہدیدار اور بہت سے مبصر بھی اس بات پر زور دیتے آئے ہیں کہ ایٹمی تجربوں سے یہ موقع فائدہ اٹھانے کا ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ بین الاقوامی سیاست میں کشمیر کا مسئلہ اب اولیت اختیار کر چکا ہے۔ یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن ہمیں چاہئے کہ اپنے اس کارنامے کی عملی یعنی سیاسی' اقتصادی یا فوجی قدر و قیمت کے بارے میں بھی معلوم کریں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ امریکہ نے اس کی اہمیت کا اقرار کیا ہے اور اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے بھی کہا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ بنیادی نوعیت کا ہے جس پر توجہ دینا نہایت ضروری ہے

لیکن اس کے باوجود انہوں نے پاکستان پر عائد پابندیوں میں نرمی نہیں کی ایسی پابندیاں جو ان کے مفاد میں ہیں یا ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان نے ادھر چند ہفتوں کے دوران میں سفارتی سطح پر نہایت فراست کا ثبوت دیا ہے۔ جنیوا میں اور سلامتی کونسل کے اجلاس میں پاکستان کے دفتر خارجہ نے جو گزارشات پیش کیں وہ نہایت شاندار تھیں۔ ان میں الفاظ کا انتخاب نہایت احتیاط اور قابل ستائش نفاست سے کیا گیا تھا۔ اس طرح ایٹمی تجربوں پر اسلام آباد کی جانب سے یک طرفہ طور پر پابندی کا اعلان بھی دانش مندانہ ہے۔ اس میں کچھ خرچ نہیں ہوتا لیکن بین الاقوامی رائے عامہ پر اس کا خوش آئند اثر پڑتا ہے۔ اس کے باوجود اس بات کا زیادہ امکان نہیں کہ ان لائق تعریف اقدامات سے بڑی طاقتوں کے رویے میں کوئی معنی خیز تبدیلی پیدا ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جنوبی ایشیا میں طاقت کا جو توازن موجود ہے اس میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی ہے اسی طرح عالمی معیشت اور سیاست میں ہندوستان اور پاکستان جو اہمیت رکھتے ہیں ان کے حوالے سے بھی کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔

اس صورت میں کہ دو دشمن ملکوں کے درمیان ایٹمی خطرے کا توازن موجود ہو اور ہندوستان اور پاکستان کے حوالے سے اس بات کو "برابر کی اسٹریٹیجی اور فوجی توازن" کے تصور سے الگ رکھ کر دیکھنا ہوگا تو ایسے میں ہر ایک ملک کی توجہ اس کی روایتی جنگی اہلیت پر ہوگی۔ یہی وجہ تھی کہ امریکہ اور روس دونوں نے سرد جنگ کے زمانے میں روایتی جنگ کے لئے فوجیں خاصی بڑی تعداد میں بھرتی کر رکھی تھیں اور انہیں ایک دوسرے کے قریبی ملکوں میں یعنی یورپ کے مغرب میں اور مشرقی یورپ میں استعمال کرتے تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کی جو منفرد صورت حال ہے اس میں یہی کلیہ زیادہ وثوق کے ساتھ لاگو ہوتا ہے کیونکہ اس سے پہلے یہ کبھی نہیں ہوا کہ دو دشمن ملک ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہوں ماحولیاتی طور پر اس طرح جڑے ہوئے ہوں اور ایٹمی اسلحہ بھی رکھتے ہوں۔

ایٹمی تجربوں سے پاکستان کی روایتی جنگی طاقت بہتر نہیں ہوئی ہے۔ اس کی حقیقی طاقت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے اس کے برعکس اس معاملے میں کم از کم جو بین الاقوامی پابندیاں عائد ہوں گی غالباً ان کا نقصان ہندوستان سے زیادہ پاکستان کو ہوگا کیونکہ ہندوستان کی صنعتوں کی بنیاد زیادہ وسیع زیادہ بڑی اور زیادہ متنوع ہے۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ ہندوستان نے اپنے حالیہ بجٹ میں معمول کے دفاعی مصارف میں چودہ فیصد اضافہ کر دیا ہے۔ جب کہ غیر رسمی طور پر اضافہ ۳۳ فیصد ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے فوجی صنعتی کمپلکس پر خرچ کی جانے والی رقم بھی شامل کر لی جائے۔ اس کے مقابلے میں پاکستان نے اپنے دفاعی مصارف میں آٹھ فیصد اضافہ کیا ہے۔ جس سے افراط زر کا حساب بھی بمشکل پورا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان کی صنعتی بنیاد بھی نسبتاً چھوٹی ہے لہٰذا اس بات کا امکان ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان فوجی طاقت کا فرق سال بسال بڑھتا جائے گا۔

MashalBooks.org

ایک لحاظ سے ایک نمایاں تبدیلی پاکستان کے حق میں ہوئی ہے اور وہ ہے شرق وسطیٰ میں اس کا واقع ہونا۔ شرق وسطیٰ کی حکومتیں اور ان کے عوام اسرائیل کی ایٹمی دہشت کے سائے میں سانس لیتے آئے ہیں اور اس بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔ اسرائیل ہندوستان نہیں ہے۔ یہ کسی بھی لحاظ سے ایک معمول کی ہم عصر ریاست بھی نہیں ہے۔ یہ اقوام متحدہ کا واحد ملک ہے جسے ابھی اپنی بین الاقوامی سرحدوں کا اعلان کرنا باقی ہے۔ ایک عظیم اسرائیلی ریاست کا قیام اب بھی اس کا اعلیٰ ترین مقصد ہے جس پر وہ کاربند ہے۔ فلسطین کی جتنی زمین عربوں کے تصرف میں رہ گئی ہے وہ اب تک ان پر اپنی بستیاں بسائے جا رہا ہے۔ اس کی سیاست کار آبادی کا ایک نمایاں حصہ اب تک یہ عزم رکھتا ہے کہ یروشلم کے مقدس اسلامی آثار کو تباہ و برباد کر کے رہے۔ اقوام متحدہ کے میثاق کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے وہ اب تک تین آزاد عرب ممالک کی زمینوں پر قابض ہے۔

پانی جس پر لاکھوں عرب شہریوں کی بقا کا انحصار ہے اسرائیل اب تک اس کا رخ موڑنے اور پانی کو بہا کر ضائع کر دینے کے درپے ہے۔ اس کے باوجود اسے امریکہ کا دلی تعاون اور پورا پورا تحفظ حاصل ہے۔ ایسے میں فطری بات ہے کہ محصور عرب باشندے اپنے نواح میں ایک مضبوط ایٹمی طاقت کے نمودار ہونے پر خوش نہیں ہوں گے۔ پاکستان کی جانب عربوں کے رویے میں تبدیلی کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ ہندوستان اور اسرائیل کے درمیان ایٹمی تعارف بڑھتا جا رہا ہے جس کے شواہد موجود ہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ پاکستان اس قابل نہیں کہ شرق وسطیٰ میں اپنی اس سودمند موجودگی سے کوئی نمایاں منفعت حاصل کرے۔ پاکستان کے حکمران بخوبی جانتے ہیں کہ انہوں نے اگر اس طرف ذرا سی بھی پیش قدمی کی تو ان پر امریکہ کا عتاب نازل ہو گا' ان کو معلوم ہو جائے گا کہ پابندی کے اصل معنی کیا ہوتے ہیں؟ حکومت پاکستان یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ چنانچہ یہ بھی ایک ناقابل حصول منافع ہے۔

ماحولیاتی تبدیلیوں کے علاوہ جو دیرپا نہیں ہوتیں' پاکستان کے ایٹمی طاقت ہونے پر ابہام کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اب اس کے باقاعدہ اعلان کے بعد اس کی سیاسی اہمیت میں کوئی نمایاں تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس کے مقابلے میں اندرون ملک اس کے منفی اثرات بہت زیادہ ہیں۔ چاغی میں تجربوں کے فوری بعد' تقریباً بیک وقت ہنگامی صورت حال کا اعلان کر دیا گیا' چنانچہ اب آئین کے تحت ملنے والے بنیادی حقوق معطل ہیں۔ صدر صاحب وہ اعلان پڑھتے ہیں جس کی توثیق بعد میں پارلیمنٹ نے کی' صدر صاحب نے "مسرت سے یہ اعلان کیا ہے کہ اس طرح کے دوران جس میں یہ حکم نافذ العمل ہے۔ آئین کے باب اول کے فقرہ 2 کے تحت تمام بنیادی حقوق کا نفاذ معطل رہے گا' جسے کسی بھی عدالت میں بشمول ہائی کورٹ' سپریم کورٹ میں چیلنج نہیں کیا جا سکے گا۔) اب شہریوں کے حقوق اور ان کی خلاف ورزی کے مابین اگر کچھ رہ جاتا ہے تو وہ مقتدر انتظامیہ کا حسن سلوک ہے۔ یہ انتہائی ظالمانہ اقدام ہے جسے جمہوری ریاستیں جنگ یا مکمل نزاع کے

MashalBooks.org

پیدا کردہ غیر معمولی حالات کے سوا کبھی اختیار نہیں کرتیں۔

ستم ظریفی یہ کہ یہ ہنگامی صورت حال پاکستان میں اس وقت نافذ کی گئی جب ملک کے اعلیٰ ترین منصب دار یہ دعویٰ کرر ہے تھے کہ پاکستان نے اپنے حریف کے مقابلے میں طاقت کا توازن حاصل کر لیا ہےاور اب قومی سلامتی کی یقینی ضمانت حاصل ہو گئی ہے۔ تو کیا اب ہم یہ فرض کر لیں کہ قومی طاقت اور ماحول کی بہتری کے سرکاری اعلان اس ملک میں شہریوں کے حقوق پر منفی اثر ڈالیں گے؟

شہریوں اور غیر ممالک میں مقیم پاکستانیوں کا سرمایہ جو غیر ملکی کرنسی میں تھا اسے قبضے میں لے کر من مانے طریقے سے مقامی کرنسی میں منتقل کر دیا گیا۔ اور وہ بھی خود وزیر اعظم کی یقین دہانی کی صریح خلاف ورزی کے بعد کیا گیا۔ یہ درست ہے کہ بینکوں میں ان کھاتوں کو منجمد کرنا ضروری تھا تاکہ بوکھلاہٹ کے عالم میں سرمائے اور نقد رقوم کی غیر ممالک میں منتقلی کو روکا جا سکے۔ لیکن ان کو روپے میں تبدیل کر دینے کا کیا جواز تھا' جس سے متوسط طبقے کے بکثرت شہریوں' غیر ممالک میں مقیم پاکستانیوں اور سرمایہ کاروں کو نقصان اٹھانا پڑا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ریاست کی ساکھ تباہ ہو گئی؟ حکومت جب تک اس بے انصافی کا جلد ازالہ نہیں کرتی' ریاست اور معاشرے کو نہایت طویل مدت تک اس غیر اخلاقی اور موقع پرستانہ رویے کے نتائج کا سامنا رہے گا۔

۱۱ جون کو وزیر اعظم نے قوم سے خطاب کیا۔ سرکاری ذرائع ابلاغ نے ان کے فیصلوں کو "انقلابی" قرار دیا' جس کی رو سے انہوں نے زرعی اصلاحات کے نفاذ' قرضوں کی اور ٹیکسوں کی وصولی اور کفایت شعاری پر مبنی بہت سے اقدامات کا اعلان کیا تھا۔ اس غیر معمولی تقریر پر گفتگو کی یہاں زیادہ گنجائش نہیں ہے۔

چار آسان سی یاددہانیاں ترتیب وار پیش خدمت ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اوپر سے آنے والے انقلابات ہر جگہ اور زمانے میں' آج تک ناکام ہوتے آئے ہیں۔ دوئم' اوپر سے نافذ کردہ اصلاحات کامیاب ہوتی ہیں بشرطیکہ ان پر گہری سنجیدگی سے غور کیا گیا ہو' اور ایک نظم اور ضابطے کے مطابق سے نافذ کیا گیا ہو۔ سوئم اصلاحات کے نفاذ کا تقاضا ہے کہ اس کی انتظامی مشنری منضبط' تھوڑے سے افراد پر مشتمل' مستعد' قواعد کی پابند اور تعاون کرنے والی ہو' اس طرح کی مشنری ہمارے یہاں ٹوٹ پھوٹ چکی ہے۔ تعداد کے اعتبار سے بھاری بھرکم ہے' بددیانت ہے۔ خود کو غیر محفوظ سمجھتی ہے اور بیزار ہے۔ چہارم' اصلاح' انقلاب اور جنگ اور ایسی ہر مہم کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ ایک ساتھ محاذ نہ کھولے جائیں اور بیک وقت بہت سے دشمن نہ بنائے جائیں۔ کیا کوئی فرد وزیر اعظم کے اتنا قریب ہے کہ ان کے اس قابل تعریف ایجنڈے کا جائزہ' مذکورہ اصولوں کی روشنی میں لے اور ان کے گرد سارے جی حضوریوں کی گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے صحیح بات وزیر اعظم کے گوش گزار کردے۔ بس وہی فرد واحد وزیر اعظم پر اور پاکستان پر (اگر وزیر اعظم

MashalBooks.org

اس کی گفتگو سن لیں تو) بچ بچ بڑا احسان کرے گا۔ (''ڈان'' 14 جون 1998ء)

MashalBooks.org

عقل حیران ہے!

کوئی ہجوم مشتعل ہو تو روحانی اقدار سب سے پہلے اس کے اشتعال کی زد میں آتی ہیں۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ نے کہا تھا کہ اختلاف میری امت کے لئے باعث رحمت ہے۔ اسلام کے مورخ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جس بات نے اسلامی تہذیب کو ایک عظیم تہذیب اور اتحاد کا نمونہ بنا کر پیش کیا' وہ اس کے افکار میں زیادہ سے زیادہ آراء کی شمولیت' نئے خیالات کو اپنے اندر قبول کرنے کی صلاحیت' علم کی تلاش کے لئے تجسس اور لگن' تیز طرز تعمیر' امور سلطنت اور فنون میں نیا پن اور ندرت ہے۔

اسلامی تاریخ کے نشیب و فراز سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ مسلم معاشرہ ایک خاص زمانے کے اندر نئے افکار' بشمول اختلافی خیالات کو قبول کرنے یا ان سے اجتناب برتنے میں کتنا کشادہ یا کتنا تنگ دل تھا۔ یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ اسلامی خلافت کی بالادستی اس وقت ساری دنیا پر تھی جب یورپ میں سائنسی اور صنعتی انقلاب کا آغاز ہو چکا تھا' لیکن پھر اسلامی معاشرت کو تیزی سے زوال آیا' کیونکہ عین اس وقت جب ذہنی کشادگی کی ضرورت تھی اس نے نئے تجربات پر اپنے دروازے بند کر لئے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ وہی لوگ جو بڑی شدومد سے اسلامی نشاۃ ثانیہ کی آرزو کرتے ہیں' وہی معاشرے میں اختلاف رائے اور بحث و تمحیص کے مخالف ہیں۔

یہ بھی ایک المیہ ہے کہ پاکستان میں ایٹمی تجربوں کی سب سے معقول کامیابی نے بھی بعض سماجی حلقوں میں ذہنی اطاعت کا مطالبہ شروع کر دیا ہے' جو سائنس کی ترقی کی بنیاد کے ہی منافی ہے۔ سائنس کا مطالبہ تو اس ماحول کی موجودگی ہے جس میں ناقدانہ تفتیش کا عمل ہو اور نئے خیالات اور مفروضوں کے درمیان سوال و جواب ہوتا ہے۔ اس ضمن میں اسلام آباد ہوٹل میں تین جون کا المناک واقعہ غور طلب ہے۔ میں اس پریس کانفرنس میں ایک منصف کے طور پر شامل تھا۔ جسے شباب ملی نے جو جماعت اسلامی کے نوجوانوں کا شعبہ ہے' جابرانہ طور پر منتشر کر دیا۔ جب ہی سے میں اس سانحہ پر غور کرتا آیا ہوں' مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ایسے رجحان کی علامت ہے کہ اگر اسے بڑھنے دیا جائے تو ملک کو شدید نقصان ہوگا۔ اس کے بعد جو اخباری اطلاعات اور اردو میں تبصرے سامنے آئے تو وہ حقائق نہیں بلکہ جذبات کی عکاسی شدومد سے کر رہے تھے۔

پریس کانفرنس کا اہتمام پاک و ہند عوامی فورم برائے امن و جمہوریت نے کیا تھا۔ میں نے پہلے اس میں شرکت سے معذوری ظاہر کی تھی' لیکن جب معلوم ہوا کہ پینل میں شریک آئی اے رحمن اپنی طبیعت کی خرابی کے باعث شرکت نہیں کریں گے تو میں آ گیا۔ کمرہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان میں صحافی بھی تھے

MashalBooks.org

جنہیں میں جانتا تھا کہ وہ خالصتاً اپنے پیشے سے وابستہ لوگ ہیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی پینل کے ارکان کو معاندانہ قسم کے تابڑ توڑ سوالوں کا سامنا کرنا پڑا' جن میں پینل کے شرکاء اور فورم کی وطن دوستی' ان کی صداقت اور مالی ذرائع کی حرمت کو چیلنج کیا گیا تھا۔ این جی او کے الفاظ اس طرح استعمال کئے گئے تھے' جیسے وہ کلمہ کفر ہوں۔ دو صحافیوں نے چیخ کر کہا کہ "تم پاکستان کے غدار اور ہندوستان کے دوست ہو' اس لئے یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ ہم تمہیں پاکستان دشمن پروپیگنڈے کی اجازت نہیں دیں گے۔" حاضرین نے شروع ہی سے یہ جتا دیا تھا کہ وہ سننے کے لئے نہیں' غل غپاڑہ کرنے کے لئے آئے تھے۔ ہمیں یہ چاہیے تھا کہ فوراً دست کش ہو جاتے' لیکن ایسا نہیں کیا۔ بلکہ اس شور شرابے میں جواب دینے کی کوشش کی' ایسے سوالوں کے جواب جنہیں بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ گویا ہم ایک با دلیل مناظرہ کرنے کے لئے بیٹھے تھے حالانکہ ہمارے سامنے ایک ہجوم تھا اور بس ہم لوگ' جن میں خواتین شامل تھیں۔ وہاں کوئی بیس منٹ تک رہے۔ یہاں تک کہ تشدد کی کارروائی باقاعدہ شروع ہو گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ جو طاقتیں اس ملک میں کام کر رہی ہیں' ہمارے انگریزی داں دانشوران کو سمجھنے میں ناکام رہے۔

ہم ہوٹل میں پورے دن کی کانفرنس کرنے کے لئے آئے تھے' جن میں نو این جی اوز شریک تھیں۔ ہمارا موضوع تھا ایٹمی اسلحے اور قومی سلامتی۔ ان دونوں وقوعوں میں کوئی تعلق نہیں تھا لیکن ان دونوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا گیا۔ کانفرنس کی کارروائی کے بارے میں جھوٹی خبریں پھیلائی گئی تھیں۔ چنانچہ ایسا لگتا تھا کہ ان صحافیوں میں بھی مخالفانہ جذبات بھڑک اٹھے تھے' جن سے ہم توقع کرتے تھے کہ اپنے پیشے کے آداب کا خیال کریں گے۔ ہم پر یہ الزام لگایا گیا کہ ہم نے اردو اخبارات کو گالیاں دی ہیں۔ چنانچہ جس اردو پریس کو ہم نے برا بھلا کہا تھا اب کیوں امید کر رہے تھے کہ وہ وطن دشمنی پر مبنی ہمارے خیالات سنیں گے۔ کانفرنس پر پاکستان دشمن اور ہندوستان دوست ہونے کے الزامات بھی لگائے گئے۔ ان الزامات میں کوئی صداقت نہیں تھی۔ میں نے اس کی تقریباً ساری کارروائی سنی تھی اور ایک لفظ بھی پاکستان دشمنی یا ہندوستان دوستی کا نہیں سنا تھا۔ کانفرنس سے خطاب کرنے والوں میں وہ افراد شامل تھے' جنہوں نے قبل ازیں پاکستان کی جانب سے اپنی ایٹمی صلاحیت کے مظاہرے پر اعتراض کیا تھا' لیکن آخر میں انہوں نے بھی تسلیم کر لیا تھا کہ یہ ایک مجبوری تھی اور ایٹمی دھماکے کے بعد ہونے والی صورت حال پر بحث کی تھی۔ مثال کے طور پر لیفٹیننٹ جنرل طلعت مسعود نے ان انتظامی اداروں کے سلسلے میں اپنی فکرمندی ظاہر کی تھی جن کا تعلق ایٹمی اسلحے کے تحفظ اور ناگزیر حالات میں اس کے استعمال سے تھا' یعنی کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم اور پرمیسو ایکشن لنکس۔ (Permissive Action Links)

ڈاکٹر محبوب الحق نے یہ دلیل دی کہ پاکستان پر عائد ہونے والی بین الاقوامی پابندیاں نہ تو سخت ہوں گی اور نہ موثر۔ انہوں نے حکومت کے "نہایت شاندار اقدامات" کی تعریف کی اور مزید اقدامات کی سفارش

کی۔ ڈاکٹر شاہ رخ رفیع خان اور عمر اصغر خاں دونوں معاشیات داں ہیں۔ وہ ڈاکٹر حق کے مقابلے میں نسبتاً کم پر امید تھے۔ ڈاکٹر سید ہارون احمد مشہور سائیکاٹرسٹ ہیں اور کراچی میں رہتے ہیں۔ وہ ایٹم زدہ ماحول کے طبی پہلوؤں پر گفتگو کر رہے تھے۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا تھا' لیکن پاکستانی اب تک بوجوہ ان سے بڑی حد تک بے خبر تھے۔

صرف ایک مقرر نے ہندوستان کے ہندی اخبارات کے ساتھ پاکستان کے اردو اخبارات کا تذکرہ کیا۔ خالد احمدؔ نے جن کا تعلق فرائیڈے ٹائمز سے ہے' اس بات پر نکتہ چینی کی کہ دیسی زبانوں کے اخبارات نے اس بحران پر کیا خامہ فرسائی کی ہے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ چند اخباری تبصروں سے قطع نظر بیشتر نے استدلال' تجزیے' یہاں تک کہ ایسی خبروں کو نظر انداز کر دیا' جو قومیت اور وطن دوستی کے جذبات کو ہوا دینے کے لئے تھیں۔ اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے انہوں نے بعض مضحکہ خیز حرکتوں کی مثالیں پیش کیں۔ مثلاً ایک کارٹون کا حوالہ دیا' جس میں اٹل بہاری باجپائی کو دکھایا گیا تھا کہ پاکستان کے ایٹمی دھماکے کی خبر سن کر انہوں نے دھوتی میں پاخانہ کر دیا' لیکن خالد احمد نے اردو یا ہندی پریس کو گالی نہیں دی' میں یہ سوچ کر حیران ہوں کہ اس نہایت سنجیدہ تنقید کو جس سے اردو اخبارات کو اختلاف کرنے کا پورا حق حاصل تھا' کانفرنس کے شرکا کی طرف سے گالی کیوں سمجھ لیا گیا۔ اخبار نے لکھا: ''وہ گالیاں دے رہے تھے۔''

خالد احمد کے بعد میں نے گفتگو کی میری تقریر کا بیشتر حصہ اس دلیل پر مبنی تھا کہ بی جے پی حکومت نے 11 مئی اور 13 مئی کو ایٹمی تجربے کر کے تخت غلطی کی' بلکہ جنوبی ایشیاء کے عوام کے ساتھ اور ان میں ہندوستان کے عوام بھی شامل ہے' ایک ''جرم'' کیا اور یہ کہ اس نے پاکستان کو بھی مجبور کیا کہ ایٹمی تجربہ کرے اور یہ کہ پریسلر ترمیم (Pressler Amendment) کے تحت پاکستان پر دس سال سے جو امریکی پابندیاں عائد ہیں' ان سے ہماری روائتی دفاعی صلاحیتوں پر برا اثر پڑا ہے' چنانچہ ان حالات نے پاکستان کو ایسے تجربے کرنے پر مجبور کر دیا۔ زبان اور ایٹمی طاقت کے درمیان جس منفی تعلق پر خالد احمد نے گفتگو کی تھی' میں نے بھی اس پر اپنی رائے دی۔ میرا استدلال یہ تھا کہ ہمارے زمانے میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو فروغ ہو رہا ہے' اس کے ساتھ ہی میں نے مالتھس کے ایک قول کا حوالہ دیا کہ یہ ترقی جیومیٹری کے حساب سے ہوتی ہے' جبکہ کلچر اور ذہنوں کے رویے ریاضی کے حساب سے ترقی کرتے ہیں۔ زبان بالعموم ان دونوں کے درمیان فرق کو واضح کرتی ہے۔ چنانچہ معروف امریکی شخصیات' ان کے سیاسی اور عام شہری بے تکلفی سے ''ہماری دھار دار ایٹمی تلوار'' کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور ہنری کسنجر نے ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کی بابت لکھا کہ ''پرچم بلند کرنے کا یہ جدید متبادل ہے۔'' اس حوالے سے میں نے کچھ مثالیں ہندوستان سے پیش کیں اور دو مثالیں پاکستان سے۔ زمانہ وسطیٰ کے ایک مسلمان فاتح کے نام پر میزائل کا نام رکھا گیا اور وزیر اعظم نے تصوف پر مبنی علامہ اقبال کے اس شعر کا حوالہ ایٹمی تجربے کے حق میں دیا۔

MashalBooks.org

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

یہ تمثیل گمراہ کن ہے' ایک جھوٹی خوش فہمی پیدا کرتی ہے اور روحانی تجربے کو ایک خوفناک دنیاوی حقیقت کے ساتھ جوڑ دیتی ہے۔ خدا کی محبت کی خاطر دلائل سے دست کش ہو جانا' جیسا کہ اقبال کے اس شعر کا مفہوم ہے' ایک خاص روحانی تجربہ ہے' اس کا اطلاق سیاسی فیصلوں پر جن میں ایٹمی ہتھیاروں کا استعمال بھی شامل ہے' نہیں ہونا چاہیے۔ زبان خیالات پر اور زاویہ نظر پر اثر انداز ہوتی ہے اور جبلتوں کی تشکیل کرتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم زبان کے استعمال میں بطورِ خاص احتیاط کی کوشش کریں۔ انگریزی اور اردو دونوں زبانیں' زمانہ حال کی صداقتوں کی روشنی میں استعمال کی جائیں۔ اس بات کو غلط انداز سے بیان کیا گیا اور غالباً ایسا دانستہ ہوا۔ مجھے یقین نہیں آیا' جب میں نے ایک اردو اخبار میں پڑھا کہ میں نے علامہ اقبال کو ایک "جذباتی شاعر" قرار دیتے ہوئے ان کی مذمت کی تھی اور وزیرِ اعظم کو لاعلم کہا تھا' یہ سب خواہ کچھ بھی ہو' صحافت ہرگز نہیں۔

چنانچہ شباب ملی کے کوئی دو درجن جوانوں نے جو اردو اور انگریزی میں بہت سے جھنڈے اور پلے کارڈ اٹھائے ہوئے تھے' دھاوا بول دیا اور چند ہی منٹ کے اندر "پریس کانفرنس" تتر بتر ہو گئی۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کے لئے پہلے سے منظم طور پر تیاری کی گئی تھی۔ انہوں نے ہمارے پیچھے نیم دائرہ بنا لیا اور نعرے لگانے لگے: "اللہ سپر پاور" اور غدار مردہ باد۔ ان میں کم از کم دو آوازیں قتل کر دو کے لئے بھی تھیں۔ بیٹھے ہوئے صحافیوں کی طرف سے الزامات آتے رہے اور ڈاکٹر اے ایچ نیر نے جواب دینا چاہا۔ اس کے بعد تو نہ میں الزام لگانے والوں کی گفتگو سن سکا اور نہ جواب دینے والوں کے جواب۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک صحافی نے نیر کو کرسی کھینچ کر ماری۔ شباب ملی نے اسے کارروائی کا آغاز سمجھا اور پٹائی شروع ہو گئی اور یہ ہنگامہ اس وقت ختم ہوا جب ہوٹل کے عملے نے مداخلت کی۔ اشتعال کے عالم میں شباب ملی والوں نے دوستوں اور دشمنوں کے درمیان تمیز بھی کھو دی۔ انہوں نے ایک بزرگ کو بہت بری طرح پیٹا' جنہوں نے "اللہ سپر پاور" کہنے کی بجائے "علی مولا" کا نعرہ لگا دیا تھا۔ ایک نوجوان صحافی جو انہی کی صفوں میں سے تھا' اس معصوم بڑے میاں کو بچانے کی کوشش میں ہاتھ آ گیا اور اس کی بھی پٹائی ہو گئی۔

اس واقعے کے بعد سے دو خیالات میرے ذہن پر حاوی ہیں۔ پہلے کا تعلق پاکستان میں صحافت کے پیشے کی صورت حال سے ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ وہ لوگ پاکستانی پریس کی ایک نہایت معمولی اقلیت کی نمائندگی کر رہے تھے' بیشتر کو ہمارے موقف کا اور ہماری سرگرمیوں کا علم نہیں تھا اور انہیں ہمارے بارے میں گمراہ کن باتیں بتائی گئی تھیں۔ لیکن ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہیں میں جانتا تھا اور پیشہ ور صحافی کی حیثیت سے ان کی عزت کرتا تھا۔ ان میں ایک نوجوان میرے ایک دوست کا بیٹا ہے۔ اس خیال سے کہ ان

MashalBooks.org

کی شہرت اور ان کا کیریئر داغ دار نہ ہو میں ان کے نام لینا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ ضرور خواہش رکھتا ہوں کہ انہوں نے ہماری باتیں سنی ہوتیں تو اس طرح انہیں پینل کے چار ارکان کے بیان میں کچھ اختلافی باتیں مل جاتیں' جن کی خبر بن سکتی تھی۔ اس سے عام لوگوں کو یہ سمجھنے میں بھی مدد ملتی کہ اس نوزائیدہ جمہوریت میں انکار اور اقرار کی حقیقت کیا ہے؟

دوئم: اس واقعے سے جماعت اسلامی کی فکری و سیاسی پختگی اور اس کے لیڈروں پر میرا اعتماد ہل گیا ہے' کیونکہ میں نے ان کو دانش اور سیاست دانوں کے اعتبار سے سنجیدہ لوگ سمجھا تھا۔ دراصل مجھ پر 1948۔49ء سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے رفیقوں کا ایک قرض چلا آ رہا ہے۔ اچھرہ (لاہور) میں مولانا صاحب ہمارے ہمسائے تھے' جب میں ان سے کوئی سوال پوچھنے جاتا تو وہ جواب میں اپنا وقت بڑی فراخدلی سے مجھ پر صرف کر دیتے۔ مولانا صلاح الدین اور نعیم صدیقی نے بھی اسلامیات کے مطالعے میں میری رہنمائی کی ہے۔ میں اسلامی تاریخ اور کلچر کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا اور مجھے معلوم ہے کہ انہوں نے یہ فیصلہ کرنے میں میری مدد کی۔ 3 جون کو ذاتی طور پر مجھے اس اندوہناک حقیقت کا علم ہوا کہ وہ پارٹی جو کسی زمانے میں نوجوانوں کو مطالعے کی ترغیب دیتی تھی' سوچنے اور استدلال کا درس دیتی تھی' اب انہیں توڑ پھوڑ کرنے والے شہ زور عناصر میں ڈھال رہی ہے۔ وہ ذہین لڑکے نظر آ رہے تھے' حرکت اور عمل کی قوت سے مالا مال' انہیں ضائع ہوتے دیکھ کر دکھ ہوا۔

پاکستان' دس کروڑ افراد کی ناخواندہ اکثریت کے ساتھ ایٹمی دور میں داخل ہو گیا ہے۔ اب اس کے اعلیٰ مراعات یافتہ پڑھے لکھے طبقے پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس ماحول کو نفرت اور تشدد سے پاک رکھیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ "عقل" اسی طرح محو تماشائے لب بام رہے۔

("ڈان" 11 جون 1998ء)

ہندوستان

MashalBooks.org

ہندوستان: اب کہ سرما گزر چکا ہے

جدید ہندوستانی تاریخ کا ایک دور تمام ہوا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی اکلوتی بیٹی نوآبادیاتی قوم پرست نسل کی آخری وزیراعظم تھیں۔ اس سیاسی طبقے نے جو مغرب کا تعلیم یافتہ تھا' عقائد میں آزاد خیال اگرچہ ہمیشہ جبلی طور پر نہیں اور ہندوستان کی سفاک اور پیچیدہ حقیقتوں سے باخبر تھا' اس نے ہندوستان کی سیاست پر اپنی بالادستی' پہلے برطانیہ کے مخالف اور بعد میں اس کے جانشین کے طور پر تقریباً نصف صدی تک قائم رکھی۔

اقتدار کا سودا کرنے والے اب ایک نئی نسل کے لوگ ہیں' انتخابی سیاست کے اکھاڑ پچھاڑ سے قدرے دور رہنے والے' جدید ہنر میں ماہر' حکمرانی کے لئے بے تاب' جنہیں انتظامی تدبیروں کی موزوں نسبت پر پورا بھروسا ہے اور جو جمہوری سیاست کے تنازعوں اور تاخیری رویوں سے بیزار ہیں۔ پرانے سیاست دانوں کی جگہ اب یہ لینے والے ہیں۔ چالیس سالہ راجیو گاندھی' طیارے کے پائلٹ اور سیاست سے متنفر' یہاں تک کہ 1980ء میں ان کے چھوٹے بھائی سنجے گاندھی کی وفات نے انہیں سیاست میں کھڑا کر دیا۔ راجیو کو نئی نسل سے وابستگی کا فائدہ حاصل ہے۔ انہوں نے اپنی انتخابی مہم میں ایک "نئے آغاز" کا نعرہ لگایا ہے' جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ وہ "نئے آغاز" کے لئے عام لوگوں کی شدید خواہش سے واقف ہیں اور خود ان کی ضرورت بھی یہی ہے کہ ماضی سے اپنا تعلق توڑ لیں' خاص طور سے حالیہ ماضی سے' جس کے وزن نے انہیں اچانک اقتدار کی بلندی پر پہنچا دیا۔

لیکن گزشتہ دسمبر میں انہیں جو انتخابی کامیابی حاصل ہوئی' کیا اس کے نتیجے میں وہ ایک مضبوط حکومت قائم کر لیں گے؟ دہلی میں یہی سوال میں نے ایک ممتاز سیاسی ماہر سے کیا۔ انہوں نے جو باتیں بڑے وثوق سے کہیں اور جن سے بہت سے غیر ملکی اور ملکی مبصرین متفق ہیں' بخوبی سمجھ میں آتی ہیں۔ اول یہ کہ راجیو کو انڈین نیشنل کانگریس کی پوری پوری حمایت اور اس پر کامل اقتدار حاصل ہے۔ یہ ہندوستان میں ایک ہی قوم پرست پارٹی ہے اور اس کا مقابلہ کرنے والی کوئی دوسری پارٹی حقیقتاً موجود نہیں۔

دوسرے یہ کہ مخالف پارٹیوں کے اندر تفرقہ پڑ چکا ہے' ان کے ایسے پروگرام نہیں جو کانگریس کے پروگرام سے مختلف ہوں' ان کے لیڈروں میں پھوٹ پڑ چکی ہے اور عام کارکن افراتفری میں مبتلا ہیں۔

تیسرے یہ کہ ہندوستان کی افسر شاہی' خاص طور پر اس کی وفاقی انتظامیہ' جو ملک کے اندر ایک سیاسی طاقت بن چکی ہے' ایک عرصے سے کانگریس کی وفادار چلی آ رہی ہے۔ ان کے نزدیک یہ پارٹی نہرو

MashalBooks.org

خاندان کا دوسرا نام ہے جس کی ماتحتی میں افسر شاہی 37 سال سے خدمت انجام دیتی آئی ہے۔ ان کے لئے اقتدار کی جائز وارث یہی پارٹی ہے اور حکمرانی میں تسلسل کی ضامن۔ لہٰذا افسر شاہی راجیو کے ساتھ پورا پورا تعاون کرے گی' جو ہندوستان میں کسی مضبوط حکومت کے لئے لازمی ہے۔

چوتھی بات یہ کہ مسلح افواج کے اعلیٰ افسروں نے بھی نہرو خاندان کے ساتھ اپنی گہری وفاداری کا عندیہ ظاہر کیا ہے۔ یکے بعد دیگرے آنے والی کانگریسی حکومتوں کے زمانے میں انہوں نے اچھا کام دکھایا ہے۔ چنانچہ برابر پھیلتے گئے ہیں اور دنیا کی چوتھی بڑی فوج بن گئے ہیں۔ مسز گاندھی نے خاص طور پر مسلح افواج کو کئی طرح کی برکتوں سے فیض یاب کیا ہے۔ اسے 1971ء میں پاکستان پر صریح فتح حاصل ہوگئی۔ ہندوستان ایک جوہری قوم بن گیا' زمین سے خلا میں پہنچ گیا اور فوج کے اندر اعلیٰ درجے کی جنگی ٹیکنالوجی آ گئی (اب ہندوستان اس قابل ہو گیا کہ دور مار راکٹ' بکتر بند گاڑیاں اور جدید ترین جنگی طیارے بنانے لگے) ایک ریٹائرڈ جنرل نے مجھے بتایا: ''ہم امریکیوں جیسے پکے تو نہیں' لیکن اچھے خاصے طاقتور بن گئے ہیں۔'' پانچویں بات یہ کہ ہندوستان کے کاروباری طبقے میں تیسری دنیا کے قدیم ترین اور نہایت ترقی یافتہ سرمایہ دار طبقے شامل ہیں اور انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ ان کے رشتے نہایت قریبی ہیں' اور تاریخی ہیں۔ اس تعلق کو خود مہاتما گاندھی نے جواز فراہم کیا تھا۔

لہٰذا نئے وزیراعظم بااثر لوگوں کی وفاداریوں اور ان کے تعاون پر بھروسہ کر سکتے ہیں' وہ ہندوستانی معاشرے کے اداروں اور سماجی طبقات پر انحصار کر سکتے ہیں۔ قرین امکان یہ ہے کہ ان کی پارٹی کو بھی ہندوستان کے دیہی بورژوازیوں اور درمیانہ طبقے کے کسانوں' خاص طور پر گنگا کے میدانی علاقے میں ہندی بولنے والے صوبوں کا تعاون حاصل رہے گا' وفاقی پارلیمنٹ کے ارکان کی آدھی تعداد انہی صوبوں سے منتخب ہو کر جاتی ہے۔

راجیو گاندھی سے وابستہ کچھ ذاتی خصوصیات بھی ہیں۔ ایک تو خود نہرو کا نام ہے اور حکمرانی کی جبلت بھی۔ ڈھائی سال تک وہ اپنی والدہ کے دائیں بازو بنے رہے۔ ان کی حیثیت ملک کے دوسرے سب سے طاقتور شخص کی تھی۔ کانگریس کی سربراہی کرتے ہوئے انہوں نے ہندوستان کی سیاست کا علم قریب سے حاصل کیا' ایسی غلطیاں بھی نہیں کیں' جو صریح طور پر سامنے آتیں اور نہ کٹر قسم کے دشمن بنائے۔ اس خوش آئندہ نقطہ نظر کو مزید تقویت انتخابی کامیابی سے حاصل ہوئی' جس نے 1957ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کی کامیابی کا ریکارڈ بھی توڑ دیا۔ ان کی بھاری کامیابی نے کم از کم پارلیمنٹ میں مخالفین کی حیثیت صفر کے برابر کر دی ہے۔ حزب اختلاف کے نہایت ممتاز اور پختہ کار لیڈر بھی انتخابات میں ہار گئے۔ طیارے کے کاک پٹ سے نکل کر راج سنگھاسن پر براجمان ہوا' گویا ہندوستان کا ایک رزمیہ تھا' جو انتخابات کے ہفتے میں دیکھا گیا۔

MashalBooks.org

بے چینی کے اسباب:

ہندوستان کے حقائق کو قریب سے دیکھیں تو بے چینی کے اسباب نظر آ جاتے ہیں۔ یہ وہ الیکشن تھا' جس میں مسائل نہیں اٹھائے گئے۔ حزب اختلاف کی پارٹیاں اور کانگریس بھی نعرے بازی سے آگے نہیں بڑھے۔ کانگریس نے کچھ اس طرح خود کو پیش کیا' گویا ایک بری حکومت بھی گوارا ہے' بجائے اس کے کہ سرے سے کوئی حکومت ہی نہ ہو۔ سبھی فریقوں نے تشدد برتا۔ اس میں بلوہ اور قتل بھی شامل تھا۔ ایک دور اندیش اور ہندوستانی دانش ور رجنی کوٹھاری نے اس موضوع پر علمی کام کیا اور اسے ہندوستانی سیاست میں ''ہمہ گیر جرم پرستی'' قرار دیا۔

تجزیہ کاروں اور انتخابی امور کے ماہروں کو گمان تھا کہ مسز اندرا گاندھی کو خاصا نقصان ہوگا اور یہ بھی ممکن تھا کہ پارلیمانی اکثریت ان کے ہاتھ سے نکل جائے' لیکن انتخابات کے قریب آنے تک وہ عوام کے لئے ایک شہید بن گئیں۔ ان کی موت کے سائے سے کانگریس نے بہت کمائی کی' ان کو دیوی بنا دیا۔ پوسٹروں میں اور ان کے لئے شائع ہونے والے مضامین میں انہیں ہندو دیوی بنا کر پیش کیا گیا۔ حزب اختلاف کی پارٹیوں کے پاس مثبت پروگرام نہیں تھا۔ انہوں نے سارا زور اندرا مخالف مہم پر لگا دیا' جس کا کوئی مقصد نہیں تھا۔

راجیو گاندھی کو اپنی کامیابی کا یقین تھا۔ ان کے لئے موقع تھا کہ کسی اندیشے کے بغیر بحث ومباحثے کا معیار اور سیاست کی زوال آمادہ اخلاقیات کی سطح بلند کرتے۔ اس کے بجائے ''اپنے نئے آغاز'' کے وعدوں کے باوصف انہوں نے ''قوم خطرے میں ہے'' کا اوچھا نعرہ طرح طرح کے پیرائے میں لگانا شروع کر دیا' جو ان کی والدہ کو بھی ہمیشہ بہت عزیز تھا اور ان کی پارٹی کے کارکنوں کو بھی جبر وتشدد کا رسوا کن رویہ اختیار کرنے سے کسی نے نہیں روکا۔ راجیو آسانی کے ساتھ حکومت میں آ گئے۔ اسی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کی سیاست میں کتنا بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے' کتنی عجلت کے ساتھ وہ وزیراعظم بنا دیئے گئے۔ اسی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مسز گاندھی کی حکومت میں ہندوستانی سیاست کے اندر اداروں کو اور ان میں کام کے طریقوں کو کتنا خراب کیا گیا ہے۔ اس کی بجائے ہندوستانی جمہوریت کی توانائی اس سے معلوم ہوتی' ان آخری انتخابات میں اوچھے پن' تشدد اور ذاتیات سے کام لیا گیا اور یہ باتیں گزشتہ سال کے اندر ہندوستانی سیاست کا کردار بن گئی ہیں۔

فرقہ پرست اور دائیں بازو کی پارٹیوں کو جو نقصان ہوا ہے' اس کی توضیح یہ کی گئی ہے کہ اس طرح قومی رائے عامہ میں اتحاد' سیکولرازم اور جمہوریت کے حق میں صحت مند تبدیلی کا پتہ چلتا ہے' لیکن کانگریس کی اس زبردست کامیابی کا ایک اور پہلو بھی ہے' جو نہایت منحوس ہے۔ راجیو نے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ ووٹ لینے

MashalBooks.org

کے لئے لوگوں کے ہمدردانہ جذبات کا استحصال کیا' مذہبی علامتیں اور رسوم کا استعمال کرتے ہوئے ہندی بولنے والے علاقوں میں جو دائیں بازو کی پارٹیوں کا گڑھ ہیں' ان کے فرقہ وارانہ جذبات کو بڑھکایا۔ انہوں نے دائیں بازو کے مخالفوں کے ووٹ چھیننے کے لئے کانگریس کو فرقہ واریت کا روپ دیا۔ ہندوستان ٹائمز کے ایک ایڈیٹر بریش کھوے لکھتے ہیں کہ ''راجیو گاندھی کی کامیابی نئی ہندوازم کی کامیابی ہے۔'' کانگریس کی حکومت مذہبی عصبیت کے آگے جس طرح گھٹنے ٹیکتی آئی ہے' اس سے ہندوستان کے مستقبل کو نقصان ہوگا جو مختلف قومیتوں اور مختلف مذاہب کے باشندوں کا ملک ہے اور اس سے برصغیر کے امن کو بھی صدمہ پہنچے گا۔

متعصب فرقہ پرستوں کی دلجوئی محض راجیو گاندھی کی اختراع نہیں ہے۔ کانگریس کی قیادت کا ایک بازو ہمیشہ سے فرقہ وارانہ سیاست کی طرف مائل رہا ہے اور بڑی حد تک اسی کی وجہ سے 1930ء کی دہائی میں مسلمان کانگریس سے مایوس ہوکر الگ ہونے لگے اور تحریک پاکستان کی حمایت کے لئے ماحول پیدا ہوگیا۔ (قیام پاکستان سے دس سال پہلے تک مسلمانوں کی بھاری اکثریت نے کانگریس کی حمایت کی تھی) پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کے والد موتی لال اہم اور غیر معمولی لیڈر تھے' کیونکہ علاوہ اور باتوں کے' وہ ہندی بولنے والوں کی کثیر آبادی سے نکلے تھے' لیکن وہ سیکولر اور فرقہ واریت کے مخالف تھے' لہٰذا قومی سیاست دان تھے۔

چونکہ مسز گاندھی کی حکومت میں کانگریس پارٹی مشرقی صوبوں میں کمزور ہوگئی۔ اس طرح وہ جنوب میں' پنجاب میں اور شمال میں کشمیر تک کمزور ہوتی گئی' لہٰذا بتدریج اس کا انحصار ہندی علاقے پر بڑھتا گیا۔ یہی وہ علاقہ تھا' جہاں مسز گاندھی کے قتل کے بعد' سکھوں کے مخالف فسادات پھوٹ پڑے' جن میں دو ہزار بے گناہ سکھوں کو ہلاک کردیا گیا۔ اس کے مجرموں کو سزا دینے میں حکومت نے جس محتاط رویے سے کام لیا ہے' اسی سے ظاہر ہے کہ کانگریس علاقائیت پر کس قدر انحصار کرنے لگی ہے۔

اندوہناک تفرقے:

اندرا گاندھی کو 1966ء میں جیسی کمزور سیاست ورثے میں ملی تھی' اس سے کہیں زیادہ کمزور اور تفرقوں میں بٹی ہوئی سیاست راجیو گاندھی کو ملی ہے۔ آج کا ہندوستان تکلیف دہ اور خطرناک طور پر آپس میں بٹا ہوا ہے۔ پنجاب پر عملاً فوج کا قبضہ ہے۔ کم وبیش یہی نقشہ کچھ فرق کے ساتھ آسام' کشمیر اور شمال مشرقی علاقوں کا ہے' جہاں ناگا اور میزو آباد ہیں۔ پنجاب اور آسام میں تو انتخابات بھی نہیں ہوسکے۔ مسز اندرا گاندھی نے جون 1984ء میں گولڈن ٹمپل پر فوج کشی کا جو فیصلہ کیا تھا' وہ نہایت غیر ذمہ دارانہ اور بے وقت تھا اور ساری کارروائی بھونڈے پن سے ہوئی۔

سکھ ہندوستان میں پوری طرح مدغم ہوچکے تھے' وہ ملک کی آبادی کا محض دو فیصد ہیں' لیکن فوج میں 20

فیصد ہیں۔ ہندوستان کی غذائی ضرورت کا 20 فیصد حصہ پیدا کرتے ہیں اور ہندوستانی سماج کے دیگر منطقوں میں بھی ان کا بڑا کردار ہے۔ ان کی مایوسی اور علیحدگی کو مسز گاندھی کی انوکھی ناکامیوں میں شمار کرنا ہوگا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ سکھوں کے خلاف "آپریشن بلیو اسٹار" شروع کرنے کے فیصلے میں ارون سنگھ اور ارون نہرو ان کے نہایت قریبی مشیر تھے۔ ان دونوں افراد کو حکومت میں جنرل سیکرٹری اور پارلیمانی سیکرٹری کے کلیدی عہدوں پر فائز کرنا سکھوں کے ساتھ مفاہمت پیدا کرنے کے سلسلے میں کوئی نیک شگون نہیں اور راجیو گاندھی کو ان سے مدد نہیں ملے گی۔ ہندوستان کے سیاسی مسائل میں ایک بنیادی مسئلہ وفاقی حکومت اور صوبائی حکومتوں اور اقلیتوں کے درمیان تعلق کی نوعیت کا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی نظر مستقبل پر تھی، انہیں تاریخی بصیرت حاصل تھی، وہ اقتدار کو مسلط کرنے سے زیادہ سیاسی عمل میں دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ جانتے تھے کہ اس برصغیر میں تہذیبوں اور سیاست کی تاریخی بنیادیں برادریوں اور ثقافتوں کے تنوع میں ہیں۔ قدیم موریہ اور گپتا سلطنتوں سے لے کر مغلوں کی حکمرانی تک مرکزی حکومت کے استحکام اور طاقت کا انحصار اسی بات پر ہوتا تھا کہ وہ طاقت کے مقامی مراکز کو اور ان کی اجتماعی زندگی کے مظاہر کو اپنے درمیان کہاں تک قبول کرتی ہے اور نظم اور باہمی مفاہمت کے دائرے میں ان کی جگہ بناتی ہے۔ اس نظام کی بدولت ہندوستان کی تہذیب میں اتحاد، تنوع اور ثروت مندی پیدا ہوئی۔

ایک حاکمانہ، مرکز پسند، اجنبی اور نو آبادیاتی ریاست کے قیام سے ہندوستان کے کلچر کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ نہرو اپنے تصورات کو ثابت قدمی کے ساتھ عملی جامہ نہیں پہنا سکا۔ ان کی پالیسیوں کی تشکیل میں یہ موقف کارفرما تھا کہ ریاستی حکمرانی کی مرکزیت سے نہ تو اتحاد پیدا ہوگا اور نہ استحکام آئے گا۔ ورثے میں ملنے والے اس موقف کو مسز گاندھی نے بتدریج ترک کر دیا۔ اپنے پندرہ سالہ دور حکومت میں انہوں نے مرکزیت کی شاہانہ روایت سختی سے اپنائی، جس کی انہوں نے بھاری قیمت ادا کی ہے۔ میزو اور ناگا لوگوں کے خلاف مسلسل دباؤ، پنجاب، کشمیر، کیرالہ، آندھرا پردیش اور آسام میں شورش، سکھوں میں علیحدگی کا احساس اور بالآخر مسز گاندھی کی اپنی موت۔ وفاق اور صوبوں کے درمیان تعلقات کی دوبارہ تقسیم اور اقلیتی قومیتوں کے حقوق کا از سر نو تعین۔ یہ ہندوستان اور آج کے پاکستان اور سری لنکا کی بھی لازمی ضرورتیں ہیں۔

وائسرے کی روایت کا ورثہ:

برطانوی حکمرانی نے جنوبی ایشیا میں دو مخالف سیاسی روایت چھوڑیں۔ حاکمیت اور افہام و تفہیم، وائسرائے کا تحکمانہ انداز اور جمہوریت۔ پہلی روایت کا سربراہ وائسرائے ہوتا ہے، نو آبادیاتی فوج اور افسر شاہی اس کے لئے ریڑھ کی ہڈی ہیں اور حکومت کی کارکردگی اس کی حاکمیت کا نفاذ ہے اور اضافی دولت کا بڑے نظم کے ساتھ اکٹھا کرنا ہے۔ قوم پرستی کی تحریک نے بڑی حد تک اس کی مخالف روایت کی ترجمانی کی۔

MashalBooks.org

یہ ہے عوام پسند آزاد خیال نمائندہ حکومت کی پابند اور وفاق کے اصولوں کی قائل۔ جہاں پاکستان میں فوج اور افسر شاہی نے امریکہ کے ساتھ معاہدے کر کے اپنی طاقت میں اضافہ کیا اور بانیان پاکستان کے انتقال کے بعد اقتدار پر قبضہ کر لیا' وہیں ہندوستان میں جمہوری روایت نے وائسرے کی شاہانہ روایت پر اپنی برتری قائم رکھی' جس کے مطابق مثالی طرز کی بورژوا جمہوریت قائم ہوئی' تاہم مسز گاندھی نے اداروں کا ساتھ چھوڑ دیا اور جمہوریت کے طور طریقے خاصے کمزور ہو گئے۔ انہوں نے خود ساختہ مشیروں کے محدود دائرے میں رہتے ہوئے انہی کے مشوروں کی مدد سے حکومت کی' اور وہ مسز گاندھی کے آگے جواب دہ ہوتے تھے۔ اکثر نہایت اہم فیصلوں سے بھی کابینہ کو باہر رکھا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف سطحوں پر رسمی اور غیر رسمی نوعیت کی ذاتی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ سال کی آخری دہائی میں ہندوستانی جمہوریت کی بنیادیں کھوکھلی ہونے لگیں اور ہندوستان کی سماجی زندگی کو سخت زوال آ گیا۔ رجنی کوٹھاری نے 1981ء میں اپنی دانشورانہ اور سچی کھری تحقیق میں ان تبدیلیوں پر بحث کی ہے۔ کوٹھاری صاحب دلی میں ترقی پذیر معاشروں کے مطالعاتی مرکز سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے ان مسائل سے بحث کی۔ دیہی علاقوں میں پولیس کی مدد سے نادار لوگوں کو بڑے پیمانے پر دہشت زدہ کرنا۔ کانگریس پارٹی میں ٹھگوں کو داخل کر کے شہروں میں سیاست کو وسیع پیمانے پر جرائم سے آلودہ کرنا۔ رشوت اور ناجائز لین دین کو ادارتی سطح پر رواج دینا اور پارلیمانی طریق کار کی بجائے آپس کی رائے شماری سے فیصلے کرنا۔

مسز اندرا گاندھی کے قتل کے بعد سکھ دشمن فسادات میں سفاکی کے مظاہرے ہی سے معلوم ہو گیا کہ ہندوستان کی سیاسی زندگی میں کتنا زوال آ گیا ہے۔ اس بات کے خاصے شواہد موجود ہیں کہ تشدد کے ان واقعات میں حکمران پارٹی کے نہایت اہم عناصر کی حوصلہ افزائی اور مدد شامل تھی۔ نہرو کی وفات کے بعد سے اب تک بیس سال کے اندر ہندوستان کے سماجی اور اقتصادی مسائل بد سے بدتر ہوتے آئے ہیں۔ ٹیکنالوجی کے چکاچوند کارنامے اور ہندوستان کا یہ چرچہ کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی اور غیر جانب دار جمہوریت ہے اور یوں اس کا بام شہرت پر پہنچنا' ایسی باتوں سے نہایت حقیقی سچائیوں سے لوگوں کی توجہ ہٹ جاتی ہے۔ 1966ء سے 1984ء کے درمیان جو اندرا کے سال تھے' ہندوستان کی آبادی میں 25 کروڑ کا اضافہ ہوا' جو برطانیہ کی کل آبادی سے چار گنا زیادہ اور امریکہ یا روس کی مجموعی آبادی سے بھی زیادہ ہے۔ اس کے 73 کروڑ کی آبادی کے آدھے شہری دس ڈالر سے بھی کم ماہانہ آمدنی پر زندہ ہیں۔ اس کے سات کروڑ تیس لاکھ شہری غربت کی سطح سے بھی نیچے یعنی ماہانہ چار ڈالر کی آمدنی پر گزر اوقات کرتے ہیں۔ ان کے جسمانی مصائب اور ذہنی پریشانیاں' تباہ شدہ زندگی کی علامتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی چار کروڑ بے روزگار شہروں میں ہجوم درہجوم آتے ہیں' یہ گویا انسانی ذخیرہ ہیں' جہاں سے بلوہ اور کشت وخون کرنے والے افراد اکثر حاصل کر لئے جاتے ہیں۔

ایک ایسے ملک میں جس کا دعویٰ ہے کہ دنیا بھر میں سائنس دانوں اور انجینئروں کی سب سے بڑی تعداد یہیں آباد ہے' آبادی کی ایک بھاری اکثریت ناخواندہ ہے۔ بہت سے بچوں کو اسکول میں داخلہ نہیں ملتا۔ مستقبل کا تصور کسی بھی لحاظ سے کیجئے' ہندوستان تاریخ کا سب سے خطرناک ٹائم بم نظر آئے گا' جو آئندہ کبھی بھی پھٹ سکتا ہے۔ اس بم کو ناکارہ بنانے کے لئے دور اندیشی' فراست اور ہمت درکار ہے۔ ترجیحات کو بدلنے کی بھی ضرورت ہے اور ہندوستان کی متنوع آبادی اور ریاست کے درمیان تعلق کو نئے سرے سے اور بھرپور انداز سے دوبارہ متعین کرنا بھی ضروری ہے۔

ایک طرف ہندوستان کی سرمایہ داری اور اس کا بالائی ڈھانچا ہے' اس سے کس قدر مختلف ہندوستان کا افلاس ہے۔ دو عالمی جنگوں کے درمیانی عرصے میں ہندوستان میں سرمایہ داری زبردست طریقے سے پھیلی' اس میں غیر معمولی توسیع ہوئی اور نوآبادیاتی ریاست میں اس نے کسی حد تک خودمختاری حاصل کر لی۔ ٹاٹا' برلا اور ڈالمیا جیسے بڑے کارخانہ دار خود کو بہت مختلف ظاہر کر سکتے تھے اور ان میں یہ اہلیت تھی کہ نوآبادیاتی نظام کی مخالفت میں قومی تحریک کے حامیوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات استوار رکھتے تھے۔ اپنے طور طریقوں اور سیاسی رویوں میں یہ سرمایہ دار طبقہ انیسویں اور ابتدائی بیسویں صدی کے جاپانی اور امریکی سرمایہ داروں سے بہت ملتا جلتا ہے۔ ہندوستان میں ایک مستحکم پارلیمانی نظام کی حمایت کے لئے ان کا کردار بہت نمایاں ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان کا سرمایہ دار طبقہ پھیلتا گیا اور اس نے کسی حد تک ایسی فنی مہارت اور وسائل حاصل کر لئے ہیں' جو تیسری دنیا میں منفرد ہیں۔ اب ہندوستان کا سرمایہ ترقی کے اس معیار پر پہنچ رہا ہے' جب اسے اپنے پھیلاؤ کے لئے یا تو اندرون ملک کی منڈی میں گنجائش چاہیے یا غیر ملکی منڈیوں میں توسیع کی ضرورت ہوگی اور ایک فوجی صنعتی کمپلکس کی تعمیر درکار ہوگی۔ پہلی ترجیح میں اسے اپنے منافع کی شرح نمایاں طور پر کم کرنی ہوگی اور ترجیحات بدلنی ہوں گی۔ دوسری صورت میں ریاست کے ساتھ شراکت کرنی ہوگی اور غیر ملکی اسلحہ ساز اجارہ دار کارخانہ داروں کے ساتھ اپنے تعلق کو مسلسل بڑھانا ہوگا۔ انیسویں صدی کے آخری زمانے میں اور بیسویں صدی کے شروع میں جاپان کے اندر ابھرتی ہوئی جمہوریت کو جو قیمت مذکورہ دوسری صورت میں ادا کرنی پڑی تھی' ہندوستان کو دوسری صورت میں بھی اس کا سامنا ہوگا۔ تاہم سال کے گزشتہ عشرے میں اسی طرح کا رجحان نظر آتا ہے۔ ریاست کی امداد سے اسلحہ سازی کی صورت میں غیر معمولی ترقی ہوئی ہے۔ اب ہندوستان اسلحہ فروخت کرنے والے دنیا کے دس بڑے ملکوں میں شامل ہے۔ مغرب کی نہایت حساس آلات اور اسلحہ بنانے والی کارپوریشنوں کے ساتھ مشترکہ پیداوار کی بنیاد پر اس کے معاہدے ہو چکے ہیں' غیر ملکی سرمایے کے حق میں قوانین میں لچک پیدا کی گئی ہے۔

اس عرصے میں ہندوستان کی نادار اکثریت اور اس کی بڑھتی اور پھیلتی ہوئی سرمایہ داری کے درمیان فرق بڑھتا جاتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان جو فاصلہ موجود ہے' اسے کم یا زیادہ کرنے میں ریاست کا

کردار فیصلہ کن ہوگا' ہندوستان کی کثیر آبادی نادار لیکن سیاسی طور پر بیدار آبادی' اس بات کو سمجھتی ہے۔ ایک صدی کے سیاسی عمل کے دوران میں بڑھتے ہوئے افلاس کے پیش نظر وہ امید کرتے ہیں کہ حکومت اس معاملے میں ان کی طرف سے ثالث بنے گی۔ مسز گاندھی اس حقیقت کو پوری طرح سمجھتی تھیں۔ 1960ء کے عشرے میں جب انہیں کانگریس کے بھاری بھرکم لیڈروں سے اقتدار چھیننا پڑا' تو انہوں نے ''غریبی مٹاؤ'' کا نعرہ لگایا اور انہیں ''مقتدر گروہ'' پر قابو پانے کے لئے خاصا تعاون مل گیا۔ وہ عہد جس کی اخلاقی حیثیت تھی اور لازمی سیاسی ضرورت بھی تھی' اب ایک مدت سے بھلایا جا چکا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ راجیو گاندھی کو اس نعرے سے کتنی وابستگی ہے اور کتنی بصیرت ہے کہ اس پر عمل کا آغاز کریں۔

(نیو سوشلسٹ' مارچ 1985ء)

MashalBooks.org

ہندوستان کا غیر یقینی مستقبل

اس میں ایک کشش تھی' حسِ مزاح تھی اور دوست بنانے کا ملکہ تھا۔ راجیو گاندھی کی ناوقت اور اندوہناک موت۔ اس کے خاندان اور اس کے دوستوں کا بہت بڑا نقصان ہے۔ تاہم ہندوستان کی موجودہ تاریخ میں یہ کوئی عہد ساز واقعہ نہیں۔ اس کی اہلیت کی آزمائش ہو چکی تھی۔ ہندوستان کی سیاست میں اس نے اپنا کردار ناکامی کے ساتھ ادا کیا۔ اگر وہ تامل ناڈو میں مہلک گلدستہ سے بچ جاتا تو یقیناً انڈین نیشنل کانگریس کو مسند اقتدار پر پہنچا دیتا لیکن یہ ماننے میں تامل ہے کہ وزیر اعظم کے عہدے پر اس کا دوسری بار تقرر پہلے دور حکومت سے کسی طرح بہتر ثابت ہوتا۔

وہ ایک گھریلو آدمی تھا' جسے سیاست کے مقابلے میں جہاز اڑانے سے جاز کی موسیقی سے اور ''گلوکاروں کے طائفے' بیٹلز سے زیادہ دلچسپی تھی۔ ۱۹۸۰ء میں جب اس کا چھوٹا بھائی طیارہ کے حادثے میں ہلاک ہوا' تو اس سانحے سے راجیو کی تقدیر بدل گئی۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی کا وارث تخت تو سنجے تھا اور وہ اس کا آرزومند بھی تھا۔ وہ اپنی قانونی حکومت کو خاندان سے باہر جانے نہیں دینا چاہتی تھیں۔ راجیو انڈین نیشنل کانفرنس کے جنرل سیکرٹری بن گئے۔ یہ وہ پارٹی ہے جس نے مہاتما گاندھی (راجیو کی ان سے کوئی قرابت نہیں تھی) اور راجیو کے پرنانا موتی لال نہرو اور نانا جواہر لال نہرو کی قیادت میں جو ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۴ء تک ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم تھے' ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی سربراہی کی تھی۔ ۱۹۸۱ء میں وہ پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے اور انہیں سائنس اور ٹیکنالوجی کا وزیر بنایا گیا۔ ۱۹۸۴ء میں جب ان کی والدہ کو ان کے مسلح محافظوں نے ہلاک کر دیا تھا' راجیو وزیر اعظم بن گئے اور ہر ایک کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ اب ایک پر شوق' سیاست دان بھی تھے۔ ان کو زبردست چیلنج درپیش تھے اور اتنے ہی زبردست مواقع بھی میسر تھے۔

ہندوستان طرح طرح کی ذات پات' زبان اور طبقے اور عقیدے کے تفرقوں میں بٹا ہوا ہے۔ چنانچہ یہاں پر پر عافیت انداز میں حکومت کرنا دشوار ہو گیا ہے۔ راجیو کی ماں نے ورثے میں ایک متنازعہ حکومت چھوڑی۔ کانگریس پارٹی جو ان کی حکومت میں جمہوریت اور قومی اتحاد کی نہایت موثر ضامن ہو سکتی تھی' خوشامدیوں سے بھر گئی' اس میں دھڑے بازی اور کرپشن پھیل گیا۔ جابرانہ طریق کار اور پارٹی کی سرپرستی کے زیر اثر ایسا ماحول پیدا ہو گیا جسے ایک ہندوستانی دانشور رجنی کوٹھاری نے بجا طور پر ''سیاست کو مجرمانہ خطوط پر چلانے کا'' نام دیا ہے' تحت پارٹی ٹکڑوں میں بٹ گئی اور بہت سے پرانے اور شہرت یافتہ لیڈر الگ

ہو گئے ۔مسز گاندھی کے دماغ میں ہندوستان کے لئے بین الاقوامی عزائم کا خناس سا گیا۔انہوں نے ایک جنگی اور صنعتی توسیعی کارخانے کی تعمیر پر جو ایک نہایت مہنگا اور سرمایہ طلب منصوبہ تھا' بھاری رقم لگا دی' اور اپنے "غریبی ہٹاؤ" وعدے پر خاک ڈال دی' ساتھ ہی ہمسایوں کے ساتھ تعلقات اور بھی خراب کرائے۔ ان سب کے سوا مسز گاندھی کے ہی دور حکومت میں ہندوستان کے وہ صوبے جو نسلی اعتبار سے اپنا الگ تشخص رکھتے تھے' یعنی پنجاب آسام اور کشمیر' صریح طور پر فیڈریشن سے دور ہوتے گئے ۔انہوں نے جون ۱۹۸۴ء میں امرتسر کے گولڈن ٹمپل کے مخالفوں کو باہر نکالنے کے لئے فوج بھیج دی' یہ سکھوں کا مقدس ترین مقام ہے ۔اس کارروائی کے نتیجے میں انہیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔اور ہندوستان کو ایسا زخم لگا جو اب تک رس رہا ہے۔

ہندوستان کو راجیو کی مشکلات کا تو اندازہ تھا۔اس کی جواں سالی' اس کا طرز تپاک اور بے داغ شخصیت کا تصور یقیناً اپنے اندر عام لوگوں کے لئے کشش رکھتا تھا۔ ہندوستان کی ریاستی انتظامیہ' اس کی نہایت طاقتور افسر شاہی' اس کی دفاعی افواج اور با اثر سرمایہ دار طبقہ ان سب کا خیال تھا کہ نہرو خاندان کی قیادت ہندوستان کے استحکام کی ضامن ہے۔ چنانچہ انہوں نے راجیو کی مدد کی۔اس کی یہ یقین دہانی کہ وہ معیشت کو آزاد کردیں گے' ٹیکنالوجی کی ترقی کو مزید فروغ دیں گے' وسائل کی منصفانہ تقسیم کو یقینی بنائیں گے اور کانگریس پارٹی کو ایک "فیوڈل گروہ" کی گرفت سے نجات دلائیں گے' ان باتوں کا دور دور تک اثر ہوا۔ چنانچہ ۱۹۸۴ء کے عام انتخابات میں کانگریس پارلیمنٹ کی ۵۴۵ نشستوں میں سے ۴۱۳ نشستیں جیت گئی۔ یہ اتنی بھاری اکثریت تھی جو ان کے ناما کو بھی جو ایک ممتاز شخصیت تھے حاصل نہیں ہوئی۔

راجیو کو جو فوائد حاصل تھے' شروع میں انہوں نے ان کو صحیح طرح استعمال کیا' ان کی آزاد معیشت کی پالیسی سے جو اگرچہ نہایت عبوری نوعیت کی تھی' پیداوار کی شرح میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ان معتدل مزاج سکھوں سے جنہیں ان کی والدہ نے قید میں ڈال رکھا تھا' راجیو نے سمجھوتے کئے اور مخالف طلبہ کو بھی قید سے رہائی دی۔سکھ چار سال سے اور طلبہ چھ سال سے قید تھے۔سکھوں کو پنجاب میں اور دوسرے مخالفین کو آسام میں شورش کے تعلق سے پکڑا گیا تھا' ان باغیوں کے ساتھ سمجھوتہ طے پایا' جو کئی برسوں سے ناگالینڈ اور میزورام کے دور افتادہ شمال مشرقی علاقوں کے لئے حق خود اختیاری کا مطالبہ کرتے آئے تھے۔اسی طرح کانگریس اور کشمیر میں برسر حکومت نیشنل کانفرنس کے مابین جو اختلافات موجود تھے' انہیں ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن جلد ہی یہ ثابت ہو گیا کہ مسز گاندھی کے چھوڑے ہوئے اثرات' کانگریس پارٹی کے اعلیٰ عہدیداروں کی سودے بازی بھاری افسر شاہی کا بوجھ اور بین الاقوامیت پر مبنی ہندوستان کے غیر حقیقی عزائم' ان سب کا پلہ راجیو گاندھی کی طبعی صلاحیت اور ذہانت کے مقابلے میں بہت بھاری تھا۔

راجیو مخالفین کے ساتھ سمجھوتہ کرنا چاہتے تھے' لیکن پارٹی کے سرکردہ لیڈروں نے ان کی مزاحمت

MashalBooks.org

کی انہوں نے جب سرعام کرپشن کی مزاحمت شروع کی تو اس سے بھی تشویش پیدا ہونے لگی۔ حکومت کے اعلیٰ عہدیدار جو برطانوی وائسرائے کی شاہانہ روایات کے وارث تھے انہیں راجیو کی یہ بات پسند نہیں آئی کہ وہ معیشت کو ضابطوں کی پابندی سے آزاد کر دیں۔ انہوں نے راجیو کے ٹیکنیکل ماہروں اور مشیروں کے بڑھتے ہوئے اثرات پر بھی شک کیا۔ بالآخر ریشہ دوانیوں کے ماہروں اور افسر شاہی کے ہتھکنڈوں نے اپنا کام کر دکھایا اور راجیو گاندھی کی سیاست میں جو ندرت تھی وہ جاتی رہی' رفتہ رفتہ وہی عناصر انہیں پرانے طریقوں کی طرف کھینچ کر لے گئے۔ انہیں نکتہ چینیوں کے ساتھ ہی اپنے قریبی لوگوں کی مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا' وہ بھی جو ان سے عمر میں چھوٹے تھے' جیسے ان کے عم زاد ارون نہرو اور وی پی سنگھ' جنہوں نے آئندہ پارلیمانی انتخابات میں انہیں شکست دی تھی۔ نتیجہ یہ کہ وہ شکی مزاج اور تند خو ہو گئے اور رفتہ رفتہ جی حضوریوں اور ان گھاگ سیاست دانوں پر بھروسا کرنے لگے جنہوں نے ان کی والدہ کی حکومت کو تباہ کیا تھا۔ پارٹی کی انتظامیہ نے جب ان کی اطالوی بیوی کو قیادت قبول کرنے کی دعوت دی تو اس سے ظاہر ہو گیا کہ اقتدار اب شخصی رنگ اختیار کرنے لگا ہے اور وہ دیوانہ پن نظر آنے لگا ہے' جو اندرا اور راجیو گاندھی کی حکومتوں کا کردار بن گیا۔

اندرا کے عزائم ہندوستان کو بین الاقوامی سطح پر لے جانے کے تھے یہی عزائم راجیو گاندھی کے بھی تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھی فوجی مصارف پر مبنی اندرا کے مہنگے منصوبوں پر عمل درآمد جاری رکھا اور حساس نوعیت کے ہتھیاروں کی تیاری کے لئے ہندوستان میں اہلیت مستحکم کی۔ اربوں اور کھربوں ڈالر پر مبنی ایسے پروگرام کی بدولت' جس میں نقد سرمایہ کاری ہوتی ہے' ہندوستان میں افلاس کی خلیج بڑھتی گئی۔ اس وجہ سے دفاعی انتظامیہ کا ایک بھاری بھرکم ڈھانچا تیار ہو گیا اور ہمسایہ ملکوں کے خلاف ان کی رعونت بھی بڑھ گئی۔ دفاع پر اس غیر معمولی خرچے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بدترین سیاسی بحران پیدا ہو گیا اور بالآخر پارلیمانی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ سویڈن کے اسلحہ ساز ادارے بوفورس سے پندرہ بلین ڈالر کے اسلحہ کی خریداری کے ضمن میں جو الزامات لگائے گئے اگرچہ ابھی تک ثابت نہیں ہوئے لیکن راجیو گاندھی کے کردار پر داغ ضرور لگ گیا جو ''مسٹر کلین'' (پاک دامن) مشہور تھے۔

جب ملک کے اندر تشویشناک حالات بڑھتے گئے تو راجیو نے ہمسایہ ملکوں سے نپٹنا چاہا۔ انہوں نے سری لنکا میں خانہ جنگی ختم کرانے کے لئے فوجی مداخلت کی اور ناکام رہے۔ جموں وکشمیر کی متنازعہ اور ہندوستان کی مقبوضہ ریاست میں جیسے جیسے بغاوت کی لہر بڑھتی گئی اسی طرح تشدد بھی نئے سرے سے بڑھتا گیا اس سے پاکستان کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات اور بھی زیادہ خراب ہو گئے۔ انہوں نے نیپال کے خلاف جو دوسرے علاقوں کے اندر محصور ہے' اقتصادی پابندی طویل عرصے کے لئے اور بطور سزا اس پر عائد کر دی جب اس نے چین سے اسلحہ خریدا۔ پھر تو جب ۱۹۸۹ء میں ہندوستان کے رائے دہندوں نے

MashalBooks.org

انتخابات میں کانگریس پارٹی کو شکست دے کر اقتدار سے بے دخل کرایا تو کسی کو اس پر حیرت نہیں ہوئی۔

آج ہندوستان کم و بیش اس جگہ کھڑا ہے جہاں اندرا گاندھی نے اسے چھوڑا تھا۔ معیشت پر جمود طاری ہے زرعی پیداوار میں ۲.۴ فیصد اور صنعتی پیداوار میں ۵.۴ فیصد سالانہ اضافے کے ساتھ ہندوستان انڈونیشیا اور پاکستان سے پیچھے ہے۔ اس کی ۸۵ کروڑ کی آبادی کی نصف تعداد افلاس کی سطح سے بھی نیچے زندگی گزار رہی ہے (یعنی آمدنی کی وہ شرح جس کی ایک بالغ فرد کو صحت مندی کے ساتھ زندہ رہنے کے لئے ضرورت ہے۔) ہندوستان کا بیرونی قرضہ چالیس بلین ڈالر تک پہنچ گیا ہے۔ وہ تیسری دنیا کے ملکوں میں تیسرا سب سے بڑا مقروض ہے اور اس کی برآمدات مجموعی قومی پیداوار کے تناسب سے پورے ایشیا میں سب سے کم ہیں۔

پنجاب میں جو ہندوستان کو اناج فراہم کرتا ہے مسلسل بغاوت کی وجہ سے ہر روز جانیں ضائع ہو رہی ہیں۔ بغاوت آسام تک پھیل گئی ہے اس کے علاوہ ہندوستانی فوج کشمیر کی متنازعہ وادی میں بغاوت کو دبانے کے لئے طویل عرصے سے اور بے نتیجہ طور پر الجھی ہوئی ہے۔ وہاں انسانی حقوق پامال کئے جا رہے ہیں جو ہندوستان کی رسوائی کا سبب ہیں اور اسی جگہ سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ بھی چھڑ سکتی ہے۔ آج ہندوستان کی تقریباً ایک تہائی مسلح افواج ملک کے اندر اپنے مخالفوں کے ہی درپے ہیں۔

فی الوقت غالباً سب سے اہم تبدیلی ہندوستان میں ہندو بنیاد پرست پارٹیوں کا حالیہ عروج ہے۔ انہوں نے نہایت صفائی سے ملک کو مذہبی خطوط پر تقسیم کر دیا ہے اور عملاً خانہ جنگی کے لئے حالات پیدا کر دئے ہیں جن میں ان کی کوشش یہ ہے کہ تاریخ میں ہونے والی آویزشوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے اور ان کا مطالبہ یہ ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کم کئے جائیں اور مسلم مساجد کو ہندو مندروں میں تبدیل کیا جائے۔ جون میں جب انتخابات مکمل ہوں گے تو متوقع طور پر بھارتیہ جنتا پارٹی جو ان میں سب سے بڑی ہے تیس تا پچیس پارلیمانی نشستوں پر کامیاب ہوگی۔ سیکولر پارٹیاں اگر آپس میں بٹی رہیں تو بی جے پی یقینی طور پر اپنے تناسب سے زیادہ اقتدار کی مالک ہوگی۔ اس کا منصوبہ یہ ہے کہ ہندوستان نے سیکولر رہنے کا جو عہد کر رکھا ہے اسے ختم کر دے اور مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کا وہ اعلیٰ ترین ورثہ جس پر ہندوستان کے اتحاد اور استحکام کی بنیاد ہے اسے غارت کر دیں۔

ہندوستان کے مختلف بحرانوں کو دیکھ کر بعض تجزیہ نگار بدترین نوعیت کی پیش گوئی کر رہے ہیں یعنی ایک وسیع طرز کی خانہ جنگی جس سے ہندوستان پارہ پارہ ہو جائے گا۔ ایسی مایوس کن باتیں قبل از وقت ہیں۔ ہندوستان کو مستحکم رکھنے کے وسائل موجود ہیں۔ اس کی تہذیب اور تاریخ کا تسلسل اور ایک قومی بورژوازی جو وسیع البنیاد اور سیاسی طور پر باشعور ہے اور اس کا مفاد ہندوستان کی سالمیت اور ترقی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کی کمزوری حد سے بڑھی ہوئی قوم پرستی میں تو ہے ہندوستان کے اتحاد سے وفاداری میں کمی کی بنا پر نہیں۔

MashalBooks.org

ہندوستان میں اس کا قدیم ترین اور تیسری دنیا کے اندر ایک انتہائی طاقت ور سرمایہ دار طبقہ بھی ہے جو امریکہ کے سرمایہ دار طبقے کی طرح تاریخی طور پر وفاق کی حکومتوں کا اور درمیانی راہ کے سیاست دانوں کا معاون رہا ہے اس کی دیوہیکل افسر شاہی ملک کے استحکام اور ساتھ ہی اس کے جمود کا سبب رہی ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس کی فوجی انتظامیہ اگر چہ معیشت پر بے وجہ بوجھ بنی ہوئی' لیکن وہ بھی حالات کو مزید خراب نہیں ہونے دے گی بلکہ خطرہ اس بات کا ہے کہ سیاست دان اگر اسی طرح ناکام ہوتے رہے تو فوج اندر گھس آئے گی جیسا کہ اس سے پہلے پاکستان میں ہو چکا ہے۔

یہ تازہ ترین سانحہ ہندوستان کے سیاست دانوں کو چونکانے کے لئے بہت ضروری تھا۔ جو لوگ ہندوستانی سیاست کے مرکز میں ہیں' جن میں سابق وزیراعظم وی پی سنگھ اور موجودہ وزیراعظم چندر شیکھر شامل ہیں۔ وہ مایوس سیاست دان ہیں' جو کانگریس سے منحرف ہو کر الگ ہو گئے۔ راجیو گاندھی کے جانے سے ممکن ہے کہ یہ لوگ اپنے پرانے ساتھیوں سے پھر آ ملیں' ہندوستان کے لئے ایک ہی متبادل راستہ رہ گیا ہے کہ آزاد خیال' سیکولر اور جمہوری عناصر کو مستحکم بنائے' بصورت دیگر اسے فوجی حاکمیت اور ابھرتی ہوئی فسطائیت کے لئے گھٹنے ٹیکنے ہوں گے۔

("ڈان" 26 مئی 1991ء)

ہم پھر آن ملتے ہیں

صبح بخیر! ہم جنوبی ایشیا کے ایوان ملامت میں پھر آن ملتے ہیں۔ یہاں ذہن پر جذبات کا غلبہ ہوتا ہے۔ تاریخ یا وہ گوئی کے آگے سپر ڈال دیتی ہے اور درندگی، زندگی سے گلے ملتی ہے تو لیجئے! پہلے ہم اپنا تعارف کرا دیں۔

نمستے۔ چونکہ میں ایک نسبتاً بڑے ملک اور ایک قدیم تر تہذیب کی نمائندگی کرتا ہوں اور ایک سیکولر جمہوریت کا مدعی ہوں اس لئے اصرار کرتا ہوں کہ پہلے مجھے متعارف کرایا جائے۔ میرا یہ پختہ ارادہ ہے کہ چار ہزار سالہ پرانی تہذیب کو الٹ کر رکھ دوں، جس کی تعمیر میں دراوڑوں نے اور آریاؤں نے ہندوؤں، بودھوں اور مسلمانوں نے ہن نسل والے ایرانیوں اور ترکوں نے، پھر مختلف یورپی اقوام اور عیسائیوں نے حصہ لیا اور اس کو صرف ایک علامت میں بدل دوں۔ کالی۔ ہم تاریخ کو مطالعہ کا مضمون نہیں سمجھتے اور نہ ماضی کی تفہیم چاہتے ہیں۔ ہم تو اسے جنگ کے ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں تاریخ کو لوہار کی طرح جلا کر اس پر ہتھوڑے چلا کر تلواروں اور نیزوں میں ڈھال لیتے ہیں۔

مسلمانوں کو پسند کرنے والے تاریخ دانوں سے 'آر ایس شرما' ڈی این جھا اور وہ ایک سازشی عورت رومیلا تھاپڑ ہے جس نے مغرب میں تعلیم پائی ہے اور انگریزی میں موٹی موٹی کتابیں لکھتی ہے، ان سب سے میرا کوئی رابطہ نہیں جیسا کہ میرے رفقا میں سے ایک رفیق آر کے ملکانی نے یہاں آنے والے ایک پاکستانی سے کہا تھا، ایسے مورخوں کے لئے ہندوستان میں کوئی استھان (جگہ) نہیں۔ ان کے مقابلے میں، میں ہندوستان کے ایسے گہرے عالموں جیسے جوزف ٹیفن تھیلر (Joseph Tieffenthalar) اور کونز ڈایلبٹ کو ترجیح دیتا ہوں۔ جن کا نام آپ نے غالباً نہیں سنا ہوگا' کیونکہ سچائی کو چھپانے کی ایک ہندو دشمن سازش اپنا کام کر رہی ہے۔ لیکن سچ بات یہ ہے کہ مجھے تاریخ پڑھنے سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں۔ میں تاریخ کو ایجاد کرنا اور اسے بہانا پسند کرتا ہوں۔ تاریخ تو وہ ہے جس پر عام لوگ یقین کرتے ہیں۔ میں پورے وثوق سے یہ جانتا ہوں کہ جب عوام مارچ کرتے ہیں تو گنبد ڈھائے جاتے ہیں لوگ ہلاک ہوتے ہیں اور یوں تاریخ تخلیق ہوتی ہے۔

میرے ساتھ چلنے والے ہندوستان کی دھرتی کے سچے بیٹے ہیں۔ ان میں سے بیشتر فاقہ زدہ، بے گھر اور ان پڑھ ہیں اور ان چھوٹی چھوٹی محرومیوں پر دل برداشتہ ہیں۔ ان کی برہمی بارود کی طرح ہلاکت خیز ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کو صحیح سمت میں موڑ دیا جائے۔ مجھ میں یہ صلاحیت ہے اور میرا ارادہ بھی

MashalBooks.org

یہی ہے کہ ان کا رخ دلت سکھ اور ان سب سے بڑھ کر مسلمانوں کی طرف موڑ دوں۔ یہی وجہ ہے کہ مال دار ہندوستانی خاندان جن میں ڈالمیا جی اور برلا خاندان کے لوگ بھی شامل ہیں اور جو پہلے اس چھوٹے مہاتما گاندھی کی مدد کرتے تھے اب اپنے پیسے سے ہماری مدد کرتے ہیں۔

اب چونکہ پیسے کی بات آ گئی ہے تو میں یہ صاف بتا دوں کہ ہم نے لاکھوں روپے کمائے ہیں' یاد رہے کہ تاریخی پوسٹر جن میں مسلمان بادشاہوں کو پنڈتوں اور راجاؤں کو ہلاک کرتے دکھایا گیا ہے' بیچ کر خاصی دولت کمائی ہے۔ اس طرح خاص جگہوں مثلاً اجودھیا میں رام جنم بھومی اور متھرا میں کرشن جنم بھومی پر مورتیاں بیچی ہیں۔ ان جگہوں پر ہمیں مسلمانوں کے صدیوں پرانے آثار ملے ہیں جو ہزاروں برس قدیمی ہندو دیوتاؤں کی پیدائش کی جگہیں ہیں۔ جب آپ مندر کے نوادرات میں کچھ اضافہ کر دیں تو یہ کاروبار خاصا نفع بخش ہو جاتا ہے۔ ان میں دکانداروں سے کمیشن کی رقم' اچھے باکروں کی رقم اور بیرون ملک مقیم ہندوؤں کے عطیات شامل ہیں۔ یہ ہندو بیشتر انجینئر اور ڈاکٹر میں' جو بھارت ماتا سے کٹ کر الگ ہو گئے تھے اب وہ ہمارے قدیم دیوتاؤں کی جائے پیدائش سے جو غاصبانہ طور پر ان سے چھین لی گئی تھی' خاص لگاؤ محسوس کرتے ہیں۔

ممکن ہے آپ یہ پوچھیں کہ ہم نے اس مرغی کو کیوں ذبح کر دیا جو سونے کا انڈا دیتی تھی۔ ہم نے بابری مسجد کو کیوں ڈھا دیا؟ اس معاملے کا تعلق طاقت سے ہے۔ اپنی اہمیت منوانے اور موقع سے فائدہ اٹھانے کی بات ہے' کوئی مردہ گھوڑے کو کہاں تک پیٹتا رہے۔ کامیابی کی خاطر اپنی طاقت اور حیثیت کا مظاہرہ کرنا ہی پڑتا ہے اور بابری مسجد کے انہدام کا کام تو ۱۹۴۶ء سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ ہم جو بی جے پی' شیوسینا اور بجرنگ دل والے ہیں' ہم نے ۱۹۸۶ء میں قومی شیلا پوجن کا آغاز کر کے اور ۱۹۹۰ء میں رام جیوتی کے ذریعے اس میں نئی روح پھونک دی۔ پھر ہم مسجد کو کب تک تباہ کیے بغیر رہ سکتے تھے؟ صحیح موقع آ گیا تھا جیسا کہ ہمارے ایک ساتھی گلاب پرجھر نے ایک مظاہرے کے موقع پر کہا تھا۔ دلی میں "ہجڑوں کی حکومت" ہے جہاں تک اسلامی ملکوں کا اور اقوام متحدہ اور ایسی دوسری طاقتوں کا تعلق ہے' بی بی سی کو دیکھ لو۔ انہیں کرسیوا سے کس نے روکا تھا؟

اس کے علاوہ میرے پیارے چھوٹے کاروبار کو ہمیں نہ کرنا پڑے گا اور بڑا کام شروع کرنا ہو گا خاص طور پر اس وقت جب کہ مواقع بھی بہت ہوں۔ ہمارے پاس متھرا ہے جو دلی سے زیادہ دور نہیں۔ راجندر پرشاد اور سردار ولبھ بھائی پٹیل جیسے کانگریس کے چند بڑے نیتاؤں کا بھلا ہو' وہاں عیدگاہ کے ساتھ ہی برلا جی کے روپوں سے مندر کا ایک کمپلکس پہلے ہی بنا دیا گیا تھا۔ اب ہم نے مسجد کے عین درمیان میں ذرا دائیں جانب ایک اور مندر بنا لیا ہے۔ یہ ہماری کرشن جنم بھومی ہے۔ یاتری یہاں برابر چلے آ رہے ہیں اچھا خاصا دھندا ہے اس میں نہایت شاندار سیاسی مواقع بھی ہیں۔

یہ کتنے شرم کی بات ہے کہ متھرا کے مندر کے اندر مغل اورنگ زیب کی بنائی ہوئی مسجد کے پچھواڑے سے جانا پڑتا ہے۔ انہدام کے لئے اب یہ ہمارا دوسرا نشانہ ہوگا۔ ہمارے ایسے کئی ہدف ہیں۔ بعض رفیقوں نے دو ہزار مسجدوں کی ایک فہرست بنائی ہے۔ اس کے علاوہ تاج محل بھی تو ہے، جس کے بارے میں ہمارے پاس یہ ثبوت ہے کہ یہ ایک ہندو راجہ کا تھا۔ جس پر شاہجہاں نے قبضہ کر لیا تھا تاکہ اپنی بیوی کو وہاں دفن کرے ہمارے کچھ نہایت بااثر دوست ہیں، جیسے کہ صیہونی رفقا، جنہوں نے نیویارک ٹائمز میں لکھا تاج محل کو حاصل کر کے اس کو راج محل کا نام دیں گے۔ جب شاہجہاں نے اس کی چوری کی تھی، اس وقت اس کا یہی نام رہا ہوگا۔

میں ابھی آپ کو اپنے پیچھے چلنے والوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ایک بار ان کو مشتعل کر دیا جائے اور ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکا دی جائے پھر تو وہ سچ مچ مہان بن جائیں گے۔ آگے بڑھتے ہوئے مرنے مارنے پر تیار۔ میرے پیارے کیا آپ کو معلوم ہے کہ جب سے ہم نے پوجن تحریک شروع کی ہے ہمارے لوگوں نے ہزاروں مسلمانوں کو قتل کیا ہے اور خود بھی سینکڑوں کی تعداد قتل ہوئے ہیں بڑی خوشی کے ساتھ ذرا بھی شکایت کئے بغیر، اور ہم لیڈروں میں سے ایک فرد بھی نہیں مارا گیا۔ اس میں سیاسی تعلیم اور تنظیم کی ضرورت ہوتی ہے ہم ہندوستان میں سب سے زیادہ منظم طاقت ہیں ہمارے میلے اور کارسیواؤں کو دیکھئے ہر ایک کی حیثیت ہماری سیاسی ایجادات کی طرح ہے ہماری تخلیقی اہلیت کا شاہکار ہم اپنی جنتا کو ایک مقصد دیتے ہیں، جس کے لئے جان لی جا سکتی ہے اور جان دی جا سکتی ہے وہ سنسکرت میں بھجن گاتے ہیں، وہ بھجن جن میں امن ومحبت کا پیغام ہوتا ہے لیکن وہ انہیں سمجھے بغیر اپنے دلوں میں نفرت بھر کے گاتے ہیں۔ یہ ہے فطرت سے بالا خیالی اور طلسمی باتوں کا کمال۔ اے ہٹلر صاحب اچھی طرح سمجھتے تھے ہم انہیں اپنی تہذیب پر غرور کرنا سکھاتے ہیں اور ان کے دلوں میں اس بات کے لئے شدید خواہش کرتے ہیں کہ ایک تہائی تہذیب کا تو بالکل صفایا کر دیں۔

اس کا انت (انجام) کیا ہوگا؟ جیسا کہ میں نے بتایا ہے سرکاری منصوبہ انتہائی خفیہ ہے۔ میرے ساتھی ملکانی صاحب (آر ایس ایس کے لیڈر آر کے ملکانی) نے ایک نام نہاد پاکستانی دانشور سے کہا تھا کہ ابھی سرکاری طور پر ہمارا اصرار تین مسجدوں پر ہے لیکن ایسی باتوں کی ایک اپنی منطق ہوتی ہے، سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کے تاریخی آثار میں سے آدھے آثار مسلمانوں کے ہیں، جو یا تو ہندوؤں سے چوری کئے گئے ہیں اور یا ہندوؤں کی مقدس جگہوں پر بنائے گئے ہیں۔ ان سب کو واپس لینا ہوگا یا ڈھا دینا پڑے گا۔ اس کے علاوہ خود مسلمان ہیں ایک اقلیت جس کی سب سے زیادہ ناز برداری کی گئی ہے یہ ہے ہمارے پیچھے میں پھانس۔ انہیں سیدھا کرنا پڑے گا۔ سکھوں اور دلتوں کے مسئلے سے ہم بعد میں نپٹ لیں گے۔

ان کے نتائج کیا ہوں گے؟ میرے پیارے! آپ بہت زیادہ پوچھ گچھ کر رہے ہیں آپ کے

خلوص پر بھروسہ نہیں کرتا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تمہارا بھی ختنہ ہو چکا ہے۔ٹھیک ہے بس آخری سوال میرا نام پوچھا ہے؟ پرانوں میں آیا ہے کہ نام ایک ذہنی حالت کا نام ہے تم مجھے اجودھیا کہہ لو۔

سلام علیکم ۔حالیہ تبدیلیوں نے سیاست میں ہمارے کردار کو بہت کم کر دیا ہے۔اس لئے میں اپنا تعارف بہت اختصار کے ساتھ کروں گا۔میں ایک ایسے ملک میں رہتا ہوں جس کا نام تم ظریفی سے کچھ ایسا ہے کہ میری بہترین کوششوں کے باوجود اسلام کے اعلیٰ ترین اصولوں کی پوری پوری پابندی سے عاجز ہے۔ چنانچہ ہمارے ملک کے حالات اچھے نہیں۔ ذرا ذرا سے چور دونوں ہاتھ اور کلائی لہراتے پھرتے ہیں۔ عورتیں نامحرم مردوں کے پہلو بہ پہلو چلتی پھرتی ہیں اور مغرب کی انگیخت پر انسانی حقوق کا مطالبہ کرتی ہیں اور حدود آرڈی ننس جو ضیاء صاحب مرحوم کے دورِ حکومت میں نافذ ہوئے تھے ان کے خلاف بولتی ہیں ۔حجاب سے کھلے عام انحراف کیا جا رہا ہے۔ڈوپٹہ لاپرواہی سے اوڑھا جاتا ہے اور کبھی کبھی بڑی ڈھٹائی سے عورت کے سر سے ڈھلک کر نیچے آ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ٹی وی پر ایسا ہوتا ہے۔اسلام دشمن طاقتیں ہندو و یہود اور امریکہ کی پشت پناہی کی بناء پر ہمارے ملک میں دندناتی پھر رہی ہیں اور حکومت نے نہایت غیر اخلاقی مطالبے کرتے ہیں اس وقت بھی وہ احتجاج کر رہی ہیں اور ایسے شناختی کارڈ کے اجرا کو روک رہی ہیں جس میں متعلقہ فرد کا مذہب لکھا ہوتا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ اس سے حکومت کا خرچ بہت بڑھ جائے گا لیکن ایسے روپے کا کیا فائدہ جسے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تفریق کی غرض سے خرچ نہ کیا جا سکے۔وہ کہتے ہیں کہ اس سے اقلیتوں کے خلاف امتیاز کیا جانے لگے گا' لیکن اسلام تو اقلیتوں کو تحفظ دیتا ہے لہٰذا اس حوالے سے امتیاز کا لفظ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری تقلید کرنے والے تعداد میں کم ہیں یہ بھی ایک وجہ ہے کہ ہم انتخابات میں کامیاب نہیں ہوتے۔ جب تک وہ ضیاء مرحوم جسے اسلام پسند آمر کی جانب سے صحیح طرح منظم نہ کئے جائیں' لیکن ہماری تنظیم زبردست ہے۔اس کے جوہر اس وقت کھلتے ہیں جب ملک میں بحران ہو اور عوامی جذبات ابال پر ہوں۔ ہمارے لوگ نادار ہیں۔کچھ تو تمہارے ہی ماننے والوں کی طرح بے گھر ہیں' لیکن جتنے ان پڑھ تمہارے یہاں ہیں' ہمارے یہاں اس سے زیادہ ہیں ان کے بھیجے میں خون کی گردش بہت تیز ہوتی ہے

بحران میں ان کا کردار نہایت عظیم ہوتا ہے تم نے انہیں اس وقت دیکھا ہو گا جب امریکیوں نے مکہ شریف پر حملہ کیا تھا اور انہوں نے امریکیوں کو ان کے سفارت خانے میں ہی جلا ڈالا تھا۔تم نے ان کی قربانی کا جذبہ اس وقت دیکھا ہوتا جب غدار رشدی نے اپنی شیطانی کتاب لکھی تھی اور تم کافر لیڈروں کی طرح ہم بھی بہت ہوشیار ہیں۔ہم میں قربانی کا اضافی جذبہ بھی ہے اس طرح کہ ہم اپنے مقلدوں کو شہادت پر فائز ہونے دیتے ہیں۔کبھی تم نے سنا کہ ہم اسلامی لیڈروں کے درمیان سے کسی نے عام آدمی سے اس کا یہ شرف چھین لیا ہو؟ واللہ قادیانی مخالف مہم شروع ہوئی' بدر اور شمس جہاد کا آغاز ہوا امریکی سفارت خانے کا

MashalBooks.org

معاملہ اٹھا' رشدی کی موت کا مطالبہ کیا گیا۔ افغانستان کے فاتحانہ جہاد کے گیارہ سال گزر گئے اور ہم میں سے کسی نے شہادت نہیں پائی۔

ہمارے مخالف ہم پر نفاق کا الزام لگاتے ہیں۔ اب وہ کہتے ہیں کہ ہم اسلام کے نام پر اسلام کی اہانت کرتے ہیں اور یہ کہ ہم نے پاکستان کو بدنام کیا اور ہندوؤں کو قتل کرنے اور مندروں کو جلانے کے لئے لوگوں کو بھڑکا کر ہندوستان میں بسنے والے مسلمان بھائیوں کے مفادات کو نقصان پہنچایا ہے یہ سراسر افترا ہے اور حقیقی اسلام سے ان کی ناواقفیت کا پتہ دیتا ہے۔ محمود غزنوی کی طرح میں بت شکن ہوں' بت فروش نہیں' مندروں کو تو منہدم ہونا ہی ہے' جس طرح مسجدوں کا تحفظ ضروری ہے' خاص طور پر جب بدلہ لینا مقصود ہو اور یہ موقع ہے عام لوگوں کو عمل کے لئے متحرک کرنے کا۔ اور جناب آخری بات یہ کہ جب موقع آتا ہے تو ہم تنہا نہیں ہوتے۔ تمام جماعتوں کے ذی حس سیاست دان ذوق وشوق سے ہمارے ساتھ مل جاتے ہیں میرا نام کیا ہے؟ موجودہ حالات میں آپ ہمیں موقع پرست سومناتی کہہ سکتے ہیں۔

("ڈان" 13 دسمبر 1992ء)

پاکستان کو بی جے پی کا چیلنج

وزیراعظم اٹل بہاری باجپائی نے ابتدا میں اپنے رویے سے یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ پاکستان کے ساتھ ہندوستان کے تعلق کو اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ ہندوستان کا ہاکی میچ دیکھنے آ نکلے۔ کھلاڑیوں کو انہوں نے خوش آمدید کہا۔ خاصی دیر تک میچ دیکھتے رہے' یہی کوئی آٹھ منٹ تک' یہاں تک کہ ان کی ٹیم نے گول کر لیا تھا۔ یہ ہیں واجپائی' ایک ہمہ صفت موصوف بڑوں سے دوستی رکھنا اور اپنے سے کمتر کے ساتھ شفقت سے پیش آنا انہیں اچھا لگتا ہے اور جتنا انہیں بہت پسند ہے۔

باجپائی انیس پارٹیوں کے ایک کمزور اتحاد کے سربراہ ہیں' جس میں بیالیس وزرا کی بھاری تعداد شامل ہے اور انہیں توقع ہے کہ اس میں اضافہ ہوگا۔ جس بلی کی انیس دمیں ہوں وہ زیادہ دنوں زندہ نہیں رہے گی اور اگر رہ گئی تو پھرتی سے دوڑ نہیں سکے گی' تاہم مسٹر باجپائی نے ذمہ داریاں تقسیم کرتے ہوئے دانش مندی اور جرات سے کام لیا ہے۔ وزارت خزانہ کے قلم دان کے لئے انہوں نے مرلی منوہر جوشی کو نظر انداز کیا جو بی جے پی کے ایک بڑے لیڈر اور معیشت سے وابستہ قوم پرست رہنما ہیں اور جنہیں راشٹریہ سیوک سنگھ بہت پسند کرتی ہے۔ باجپائی نے ان کے برعکس یشونت سنہا کا انتخاب کیا' جو پارٹی میں نسبتاً دیر سے شامل ہوئے ہیں اور معیشت میں آزادی پسند جو اس بات کی علامت ہے کہ داخلی اور خارجی دونوں میں وہ سرمایے کے ساتھ اعتدال کا رویہ رکھیں گے۔

ہوم منسٹر کے طور پر ایل کے اڈوانی کی ذمہ داری' جو بی جے پی کے صدر بھی ہیں' امن عامہ کا قیام ہوگا' ایک ایسے شخص کے لئے جو امن میں انتشار پیدا کرتا آیا ہو' یہ بڑا چیلنج ہوگا۔ مسٹر جارج فرنینڈس جنہیں اپنے اوپر قابو نہیں رہتا وزیر دفاع ہوں گے۔ امکان یہ ہے کہ وہ اخبارات میں طوفان اٹھاتے رہیں گے اور حتیٰ الامکان شور شرابے میں شامل رہیں گے۔ وزارت خارجہ کا قلم دان وزیراعظم نے اپنے پاس رکھا ہے جس سے ان کی دلچسپی کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ امور خارجہ کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔

اگر واجپائی حکومت نے اپنی قانونی میعاد کی آدھی مدت بھی پوری کر لی تو اندرون ملک اس کا گہرا اثر نظریاتی طور پر محسوس ہوگا جب کہ وہ ہندوستان کے خارجہ تعلقات پر قرار واقعی توجہ دیں گے۔ گذشتہ ہفتے سری لنکا میں ایک کانفرنس ہوئی۔ اس میں بہت سے ہندوستانی اسکالر بھی شامل تھے اور انہی میں اشیش نندے بھی تھے جو ہندوستان میں سب سے منفرد دانش ور ہیں' انہوں نے اس نکتے پر زور دیا کہ بی جے پی بتدریج اعتدال اور سیکولرازم کی طرف آ رہی ہے اور اس کا انحصار اپنے حلیفوں پر بڑھ رہا ہے اور ان کے فیصلے

MashalBooks.org

بی جے پی کو اپنا موقف نرم کرنے پر آمادہ کریں گے۔ کسی حد تک ان کی باتیں سمجھ میں آتی ہیں لیکن جہاں تک عملی سیاسیات کا تعلق ہے بی جے پی حکومت کا تسلسل تو برقرار رکھ سکے گی اور زیادہ سے زیادہ یہی اس کے امکان میں ہے اس کے لئے کوئی تبدیلی لانا ممکن نہیں ہوگا۔ اشیش نندے نے اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ علامتی نوعیت کی تبدیلیاں پیدا کریں گے۔''

ان کا اثر بہرحال نقصان دہ ہوگا۔ علامتی رویے اور محض دکھاوے کی باتیں لازمی طور پر قوموں اور لوگوں کی زندگیوں میں نمایاں فرق پیدا کرتی ہیں۔ جو واقعات عملاً رونما ہوتے ہیں اور جو پالیسیاں نافذ ہوتی ہیں' ان کے اثرات کو تو مخالف نوعیت کی پالیسیاں اختیار کر کے دور کیا جا سکتا ہے' لیکن علامتوں سے پیدا ہونے والے اثرات اس طرح دور نہیں ہوتے۔ علامتیں تہذیب کی تشکیل کرتی ہیں' نقطہ نظر' رویے اور شناخت بناتی ہیں۔ اس مشاہدے کی صداقت کا اقرار وہ لوگ کریں گے جنہوں نے زیڈ اے بھٹو کی عوام پسند کھوکھلی حکمرانی دیکھی اور ضیاء الحق کے اسلامائزیشن (اسلامی بنانے) کا عمل بھی دیکھا۔ عوام کے مفاد میں جتنے سنجیدہ بھٹو تھے اسلام کے ساتھ اتنے ہی سچے ضیاء الحق تھے۔ اصول کی بجائے موقع پرستی برتنے والے وہ دونوں ہی اپنے اپنے انداز سے ''معتدل مزاج'' تھے لیکن ان کی علامتی کارگزاریوں کے اثرات پاکستان کی سیاست اور اس کی تہذیبی زندگی کو برابر مسخ کرتے چلے آ رہے ہیں۔

ایک پارٹی کے طور پر بی جے پی دونوں خطرناک رویے ساتھ ساتھ لے کر چل رہی ہے' عوام پسندی اور فرقہ پرستی بھی۔ وہ ایک موثر اور بامقصد حکومت چلانے میں ناکام رہے گی لہٰذا اس ناکامی کی تلافی وہ علامتی مظاہرے سے کرے گی۔ اور چرب زبانی سے کام لیتے ہوئے ''ایک قوم اور کلچر'' پر تقریریں کرے گی۔ کوئی ستر برس پہلے اس بات کا اندیشہ رابندر ناتھ ٹیگور نے ظاہر کیا تھا کہ اس طرح کے علامتی مظاہر اس ملک پر تباہ کن اثرات ڈالیں گے جہاں مختلف ذات برادری' معاشرت اور مذہب کے ماننے والے لوگ آباد ہوں۔

ہندوستان کے ہمسایوں خاص طور پر پاکستان میں تشویش پائی جانے لگی ہے ان کی بے چینی میں اضافہ بی جے پی کے لیڈروں کے بیانات سے ہوا ہے کہ وہ اپنے جنگی ہتھیاروں میں ایٹمی اسلحہ کا بھی اضافہ کریں گے۔ ان کے بیانات میں تضادات بھی ہیں اس لئے صاف ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ چاہتے کیا ہیں۔ ہندوستان کا کوئی ہمسایہ ملک اس کے ایٹم بم کے زیر سایہ رہنا نہیں چاہے گا لہٰذا تمام ملکوں کی ذمہ داری ہے کہ اس خطرے کا سنجیدگی سے سامنا کریں اور جتنی تندہی اور خاموشی کے ساتھ ممکن ہو' اپنی تمام کوششیں دلی حکومت کو اس خطرناک راستے سے باز رکھنے کے لئے اختیار کریں۔ اس کا زیادہ خطرہ دوسرے ملکوں کی بہ نسبت پاکستان کو ہے کیونکہ ہندوستان کے ساتھ تنازعے جو ابھی حل نہیں ہوئے اس کے ہیں۔ اس کے علاوہ پرتھوی اور اگنی میزائل کے پروگراموں کو بروئے کار لانے سے پاکستان کا حفاظتی ماحول متاثر ہوگا جو ایٹمی

ہتھیاروں کی موجودگی کا لازمی نتیجہ ہے۔ پھر پاکستان ہی وہ تنہا ملک ہے جسے سوچنا ہوگا کہ وہ بھی کیا یہی راہ اختیار کرے۔

اس بات کی نہایت فوری ضرورت ہے کہ ہندوستان پر ایٹمی اسلحہ رکھنے کے خلاف دباؤ ڈالا جائے۔ اگر اس کو موثر ہونا ہے تو پھر یہ کام خاموشی کے ساتھ اور باضابطہ انداز سے کیا جائے۔ پاکستانی حکام کے حالیہ بیانات سے ایک بار پھر ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گھن گرج اور خاموش اثر انگیزی کے درمیان فرق کی پروا نہیں کرتے۔ اور تدبر اور پروپیگنڈے' پینترے بازی اور سیاست کے درمیان امتیاز نہیں کرتے ہمیں چاہیے کہ بڑی طاقتوں کو اپنی تشویش سے آگاہ کریں اپنے یقین کا اظہار کریں اور اس کا بہترین طریقہ خاموش سفارت اور حکمت آمیز سکوت ہوگا۔ شور شرابے اور دھمکیوں سے خوفزدگی اور جھگڑا ہونے کا پتہ چلے گا' پھر یہ مسئلہ جو نہایت فوری اور اہم ہے صرف جنوبی ایشیا کا ایک تنازعہ بن کر رہ جائے گا۔

پاکستان کی سلامتی کے لئے اس کی جو اہمیت ہے وہ اس بات سے کم نہیں ہو جاتی لیکن ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ ایٹمی طاقت بننے سے بی جے پی کا مقصد محض پاکستان کو ہدف بنانا نہیں ہے۔ دراصل اس کے لیڈر ہندوستان کے ان تھوڑے سے لوگوں میں شامل ہیں جو پاکستان کے قیام سے واقعی مطمئن ہیں۔ وہ مسلمہ طور پر کٹر فرقہ پرست ہیں اور خوش ہیں کہ انہیں کم از کم پچیس کروڑ مسلمانوں سے نجات مل گئی جو اب پاکستان اور بنگلہ دیش دو ملکوں کے درمیان بٹے ہوئے ہیں۔ ماضی کے حوالے سے دیکھیں تو ہندوستان کی تقسیم سے راشٹریہ سیوک سنگھ کا ایک خواب پورا ہو گیا اور وہ نہیں چاہیں گے کہ اسے توڑ ڈالیں۔ جہاں تک بالادستی کی طلب ہے یہ بخوبی معلوم ہے کہ یہ چیز ایٹمی یا کسی اور طرح کے بم سے حاصل نہیں ہو جاتی۔ بی جے پی کے لیڈر اپنے ایٹمی ہتھیاروں کا اعلان اس لئے کر رہے ہیں کہ اس طرح ان کو بڑی طاقتوں کی ایٹمی برادری میں داخلے کا پروانہ مل جائے گا اور اس کے لئے پاگل ہوتے جا رہے ہیں یہ بات خطرناک حد تک احمقانہ ہے لیکن ہے درست۔

بی جے پی کا یہ بہت پرانا عہد ہے کہ وہ ہندوستان کے جنگی ہتھیاروں میں ایٹمی اسلحہ کا اضافہ کرے گی اگرچہ اس میں داخلی طور پر کچھ رکاوٹیں ہیں۔ پاکستان کی طرح ہندوستان میں بھی رائے عامہ ایٹمی اسلحہ کے خلاف نہیں حکمرانوں کے درمیان اختلاف صرف اس پر ہے کہ اس کی موجودگی کے معاملے کو کسی حد تک بے یقینی کی کیفیت میں رکھا جائے۔ لیکن یہ ایسے اختلافات میں جنہیں حل کرنے کے آسان طریقے حکومتوں کے پاس ہوتے ہیں۔ مزید امکان یہ ہے کہ بی جے پی ایک کمزور اتحادی کے طور پر حکومت میں رہے گی اس لئے عوام کو روٹی پانی کا جو مسئلہ درپیش ہے اور اصلاح کی فوری اور سنگین ضرورت ہے اسے پوری کرنے میں ناکام ہوگی۔ وہ حکومتیں جو عوام کے مسائل حل نہیں کر سکتیں' وہ حب الوطنی میں پناہ ڈھونڈتی ہیں' لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ بی جے پی کے داخلی تقاضوں کو بیرونی محرکات کی مدد سے اعتدال پر لایا جائے' اور یہ مقصد

MashalBooks.org

علانیہ انتہا پسندی بیانات سے اور محاذ آرائی سے نہیں بلکہ خاموش تدبر پر حاصل ہوگا۔

ادھر کئی برس سے مسٹر باجپائی نے پاکستان میں دلچسپی لینی شروع کی ہے انہیں یقین ہے کہ ہندوستان کی بین الاقوامی سیاست میں اپنا کردار کامیابی کے ساتھ ادا کرنے کے لئے پاکستان کے ساتھ معمول کے اور محکم تعلقات قائم رکھنے ہوں گے۔ کئی سال پہلے انہوں نے خود مجھ سے کہا تھا: ''بڑی طاقتیں ہمارے اختلافات سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔'' ہندوستان کے وزیر خارجہ کی حیثیت سے انہوں نے پاکستان کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے جس پر جوش طریقے سے کوشش کی تھی اس سے خود پاکستانی حکام حیرت زدہ رہ گئے۔ اب کے پھر یہ امکان ہے کہ وہ تجارت اور ثقافتی تبادلوں کی بہتری کی خاطر پر جوش انداز سے کوشش کریں گے۔ اس کے باوجود یہ امکان نہیں کہ وہ پاکستان کی یا کشمیری کی شرائط پر اس مسئلہ پر کوئی مفاہمت کریں گے۔ ان کی حکومت ہندوستان کے آئین کی دفعہ ۳۷۰ کو اگر وہ چاہے بھی تو ختم نہیں کر سکتی۔ خود ہمارے یہاں انتظامیہ کی جو صورت ہے اسے دیکھتے ہوئے پاکستان کا جواب بھی وہی ہوگا۔ اس وقت پاک و ہند تعلقات اس نہج پر ہوں گے کہ اس کو صحیح طرح سمجھنے میں غلطیوں کا امکان بڑھ جائے گا۔

ہندوستان اگر اسلحہ بندی کرتا ہے تو پاکستان کو متبادل صورتوں کا جائزہ لینا ہوگا۔ اس صورت میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ پاکستان نے ذومعنویت کا جو قرینہ اختیار کر رکھا ہے اگر اسے ترک کر دیں تو حکمت عملی اور سیاسی طور پر اس کے کیا فائدے ہوں گے؟ اصل مقصد تحفظ ہے تو کیا ایٹمی اسلحہ رکھنے سے معلوم یا مفروضہ موجودگی کے خلاف طریقہ برتنے سے تحفظ بڑھ جائے گا۔ کیا پاکستان پر بڑی طاقتوں کا دباؤ اتنا ہی ہوگا جتنا دباؤ ہندوستان پر ہوگا؟ کیا ہم وہ دباؤ برداشت کرنے کے لئے آمادہ ہیں؟ اگر دونوں طرف اسلحہ بندی شروع ہوگئی تو اس کے نتیجے میں کس طرح کے اسلحہ کی دوڑ ناگزیر ہو جائے گی؟ کیا پاکستان' ہندوستان کے خلاف اسلحہ کی دوڑ میں شامل ہونے کی حیثیت رکھتا ہے؟ اگر ذومعنویت کا انداز اختیار کیا جائے تو کیا اسٹریجی کے علاوہ سیاسی اور اقتصادی طور پر اس کے فائدے ہوں گے اور اگر ہوں گے تو کون سے فائدے؟ اس موضوع پر گفتگو ممنوع سمجھی گئی ہے۔ حکام کا پاکستان شہریوں پر بڑا کرم ہوگا اگر وہ ان سوالوں پر مطلوبہ بحث مباحثے کا آغاز کریں۔

کشمیر پالیسی پر نظر ثانی کی بھی بڑی شدید ضرورت ہے۔ وادی کے اندر زمینی حقائق بہت بدل گئے ہیں۔ میں نے اخبار کے ان اوراق میں اس موضوع پر کئی بار اور تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ جنرل سندرجی کے بیانات اور حقوق انسانی کی خلاف ورزی پر ہندوستان کی ہیومن رائٹس تنظیم کے اعلانات ان حقائق کو بدل نہیں سکتے۔ قومی مفاد کا تقاضا ہے کہ ان کا مقابلہ کیا جائے لیکن فی الوقت پاکستان کے تحفظ کے لئے اس سے زیادہ اہم کوئی بات نہیں کہ افغانستان میں امن بحال ہو اور ایران کے ساتھ تعلقات بہتر ہوں۔ یہ وہ ہمسائے ہیں جن کے ساتھ پاکستان کی طویل سرحدیں ہیں اور ہمارے درمیان ثقافت' تاریخ اور عقائد

MashalBooks.org

کی مماثلتیں ہیں۔ ہم آہنگی ہماری جغرافیائی اور سیاسی ضرورت ہے اور ناگزیر ہے' حالیہ برسوں میں ہماری پالیسی کے سبب سے یا جس بات کو ہم پالیسی قیاس کرتے ہیں اس کی وجہ سے افغانستان کے ساتھ ہمارے تعلقات خراب ہوئے ہیں۔ پہلے کی طرح کے تعلقات جن میں تعاون کا ماحول ہو بحال ہونے لازمی ہیں' اس سے زیادہ ضروری کوئی بات نہیں کہ افغانستان میں اس عمل کا آغاز کرایا جائے۔

اس بات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب ہمارے افسر صاحبان روس کو افغانستان میں گھیر کر مارنے پر بہت ''واہ! واہ!'' وصول کر رہے تھے۔ بالآخر روس وہاں سے نکل گیا' امریکیوں نے افغانستان میں جو سرمایہ لگایا تھا منافع کے ساتھ وصول کر کے وہ بھی چلے گئے۔ اس بات کو دس سال ہو گئے اب افغانستان کے مجاہدین اپنے ملک کا اور اس کے لاچار باشندوں کا قیمہ بنائے جا رہے ہیں ہمارے حکام عیارانہ کارروائی اور لاحاصل نتائج کی موجودگی میں اس کی ذمہ داری تسلیم نہیں کرتے۔

ایک مذموم خانہ جنگی کے بارے میں دو ایسے حقائق ہیں' جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ افغانستان کے تعلق سے پاکستان ایک بالادست طاقت ہے' اس کے انتہائی طاقت ور' انتہائی فرقہ پرست اور شیعہ مخالف جنگجو فریق کو پاکستان کی حمایت حاصل ہے۔ ایران' ازبکستان اور روس کے ساتھ مل کر طالبان کے مخالف جنگ جوؤں کی مدد کر رہا ہے۔ اس طرح افغانستان کی جنگ جو معاشرت اور اس کی معیشت کے اندر جس کی بنیاد منشیات اور اسلحہ کی فروخت اور اسمگلنگ پر ہے خارجی اسباب بھی شامل ہو گئے ہیں اگر امن قائم کرنا مقصود ہے' تو ان رشتوں کو توڑنا پڑے گا۔ خرابیوں کا ذمہ دار دوسروں کو قرار دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

افغانستان اپنے مرکز سے محروم ہو چکا ہے۔ وہ لوگ جو روایتی مسلمان معاشروں میں الاہل والعقد کے طور پر پہچانے جاتے تھے اب باقی نہیں رہے۔ افغانستان میں امن بحال کرانے والے کوئی عناصر باقی نہیں رہے' اس کی ذمہ داری پاکستان اور ایران پر آتی ہے اور اس میں اقوام متحدہ ہر دو کے کام کو آسان بنانے کے لئے شامل ہے۔ امن کی بحالی کا عمل ایک بار پورے اخلاص کے ساتھ شروع ہو جائے تو اس کے بعد ہی امریکہ' یورپی اقوام اور جاپان کو آمادہ کیا جا سکتا ہے کہ افغانستان کی از سر نو تعمیر کے لئے کسی طرح کی با مقصد امداد فراہم کریں۔ الجزائر کے ایک قابل احترام سفارت کار لخدر ابراہیمی اقوام متحدہ کی جانب سے افغانستان میں امن بحال کرانے کے لئے آج اسلام آباد پہنچ رہے ہیں۔ اس طرح امن کی بحالی کا کھیل شروع ہو گیا ہے اب کیا یہ امید کی جائے گی کہ وزیر اعظم واجپائی اس مرتبہ پاکستان کو گول کرتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوں گے؟

(''ڈان'' 22 مارچ 1998ء)

گجرال سے گفتگو

آئی کے گجرال کے سیکرٹری نے ہندوستان کے سبکدوش ہونے والے وزیراعظم سے میری ملاقات کا وقت چٹ پٹ حاصل کرلیا۔ ہماری ملاقات 16 اپریل کی سہ پہر میں ان کے مکان واقع مہارانی باغ میں ہوئی' جو دلی کے مضافات میں ہے۔ یہ کشادہ رہائشی کمرہ ہے اس کی سادہ سی سجاوٹ ہے فرش پر کچھ قالین ہیں اور دیوار پر اصل پینٹنگز۔ ہندوستان کے متمول لوگوں کا سادہ رہن سہن اس شہر میں بھی جو دارالحکومت ہے ہمیشہ مجھے حیران کرتا رہا ہے۔ پاکستان کے بالائی طبقے کے پرتعیش رہن سہن کے مقابلے میں یہ کتنا مختلف ہے۔

گجرال صاحب کچھ دیر تک لاہور اور کراچی میں گزرے ہوئے دنوں کو یاد کرتے رہے جہاں انہوں نے پہلے اور پھر تقسیم کے ایک سال بعد تک قیام کیا۔ بڑی اچھی زندگی تھی' آرام دہ' نوجوان کی امنگوں سے بھرپور' بائیں بازو کی اور قوم پرستی کی سیاست' ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں میں یکساں محبتیں اور دوستیاں۔ ''ہم پنجابی بولتے تھے اور شاعری کثرت سے پڑھتے تھے اور رات گئے تک ادب اور سیاست پر بحث کرتے رہتے تھے۔'' گجرال نے اپنی یادداشت پر زور دیتے ہوئے کہا۔

گجرال صاحب اب تک اردو سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ اپنی گفتگو میں رنگ بھرتے ہوئے انہوں نے یہ مصرع پڑھا۔

لمحوں نے خطا کی تھی' صدیوں کی سزا پائی۔

یہ وہ موقع تھا' جب وہ پاک بھارت کشیدگی پر بات کر رہے تھے۔ آپ کو غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے وہ ایک ہندوستانی سیاست دان ہیں اور محب وطن ہیں' اس کے باوجود پاکستان' خاص طور پر پنجاب کے عوام کے ساتھ ان کی محبت نہایت پرخلوص محسوس ہوتی ہے۔ اور ان کی یہ خواہش کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان معمول کے تعلقات بحال ہو جائیں' مجھے مخلصانہ معلوم ہوئی' اس کے باوجود کہ ہندوستان کے قومی مفادات بھی انہیں عزیز ہیں۔ انہوں نے کہا اور ان کے بیان میں جذبے کی صداقت شامل تھی کہ میرے کسی بھی دوست میں جو ادھر سے آیا پاکستان کے خلاف جذبات موجود نہیں۔ ان میں سے کسی کے یہاں تلخی نہیں' جن میں تلخی تھی وہ جن سنگھ میں چلے گئے۔

گزرے ہوئے زمانے کو انہوں نے یاد کرتے ہوئے کہا: ۱۹۴۲ء میں ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک کے زمانے میں مجھے اپنے والد' والدہ اور بہن کے ساتھ گرفتار کرلیا گیا' لیکن پھر مجھے منٹگ چنگی کے

قریب بورسٹل جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ اس وقت میری عمر بائیس سال تھی۔ لیکن ڈاکٹر نے جب میرا معائنہ کیا تو میرے اٹھائیس دانت تھے اور ہمیشہ اتنے ہی رہے لیکن اس نے کہا کہ میں بالغوں کے ساتھ رہنے کے لئے ابھی نوعمر ہوں' چنانچہ بورسٹل بھجوا دیا۔ اس بات کو یاد کر کے گجرال صاحب بہت ہنسے' وہ اور ان کی بیوی دونوں فارمن کرسچیئن کالج کے گریجوئٹ ہیں اور میری مادر علمی بھی وہی کالج ہے۔ ''اب وہ کیسا ہے؟'' انہوں نے سوال کیا۔ اس کالج کیمپس سے جو ایک زمانے میں نہائت خوبصورت تھا میں ادھر اتفاق سے گزرا تھا' اس لئے جو بات سچ تھی وہ کہہ دی) کیمپس تو وہیں ہے لیکن ایک علمی خرابہ ہے' اس کا سبب مجھے معلوم ہے' بھٹو کی قومیائی پالیسی' ضیا کی اسلامیائی پالیسی اور انجام کار نہائت درجہ بے توجہی۔ میں نے زیرلب کہا۔

''میرے والد پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے ممبر تھے۔'' انہوں نے کہا'' گوہر ایوب خاں نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے اسمبلی کے رجسٹر پر میرے والد کے دستخط دیکھے تھے۔ ان کا نمبر ۴۹ واں تھا۔ ایسے پانچ ارکان اسمبلی پنجاب سے تھے اور اکیس یا بائیس مشرقی پاکستان سے۔ پاکستان کی آئین ساز اسمبلی میں کانگریس بلاک کے یہ چھبیس یا ستائیس ارکان تھے۔ انہی میں ایک بھیم سن سچر تھے' کلدیپ نیئر کے خسر۔ ''(میں نے پوچھا' پھر آپ کیوں نکلے رہے؟ انہوں نے جواب دیا: ''لیاقت نہرو پیکٹ نے بہت سے غیر مسلموں کو یقین دلایا تھا اور بہر طور میرے خاندان میں تو یہ بات محسوس کی جاتی تھی کہ تاریخ میں راجے بدلتے ہیں' پرجا نہیں بدلتی۔''

گجرال نے بتایا کہ وہ اس وقت کراچی میں تھے' جب مہاتما گاندھی کو قتل کیا گیا'' اور میں کبھی یہ نہیں بھولوں گا۔ اس دن شہر میں ایک آنکھ بھی خشک نہیں تھی۔'' پھر آپ نے چھوڑا کیوں؟۔ گجرال صاحب نے بتایا کہ ان کے والد اس کوشش کے لئے ہندوستان گئے تھے کہ ''یہاں سے جانے والے ہندوؤں اور سکھوں کو راستے کا تحفظ دلائیں۔ راجہ غضنفر علی خاں نے جو میرے والد کے دوست تھے' اپنے سیکرٹری کو میری تلاش میں بھیجا اور مجھے ہندوستان بھجوا دیا۔''

سابق وزیراعظم نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس سخت کوش زندگی کی روداد بیان کی' جو انہوں نے ہندوستان میں ایک رفیوجی کے طور پر گزاری تھی۔ کچھ عرصے تک دہلی کے قرول باغ میں ایک کمرے کے اندر تین کنبوں نے' جن میں گجرال کا کنبہ بھی شامل تھا' گزر بسر کی۔ اس کے بعد انہیں بابر روڈ پر دو کمروں کا ایک مکان الاٹ ہوا۔ لیکن چند ہی ہفتوں کے اندر آدھا مکان ایک بیوہ کو الاٹ کر دیا گیا۔ ''اس ایک کمرے کے مکان میں سات سال تک رہے۔'' گجرال کا تعلق ایک خوشحال گھرانے سے تھا۔ پاکستان میں بالائی طبقے کے ایک تارک وطن کے طور پر انہیں متروکہ املاک سے یقیناً بھاری معاوضہ ملتا۔ چنانچہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کے یہاں معاوضے کا اصول کیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ ''متروکہ املاک کا کمشنر ایک شخص ترلوک سنگھ تھا' اس نے ایک سادہ سا فارمولا اس جائیداد کی مالیت کے تعین کے لئے جو تارکین وطن چھوڑ کر

آ ئے تھے دیہات میں ایکڑ اور شہر میں شہری جائیداد کی فٹ کے حساب سے پیمائش کا وضع کیا تھا اور اس کے لئے دستاویزی ثبوت ضروری تھا۔ متروکہ جائیداد کی قیمت کا تعین چار اور ایک کے تناسب سے ہوتا تھا یعنی جو پہلے چار ایکڑ کا مالک تھا اس کا استحقاق ایک ایکڑ کا ہوگا۔ اسی حساب سے واؤچر جاری کئے گئے' جو قابل انتقال تو تھے لیکن کھلے بازار میں ان کی آدھی قیمت ملتی تھی' اس سے قطع نظر کہ آپ نے پیچھے کیا کچھ چھوڑا۔ آپ کو ملنے والی املاک کی آخری حد مقرر تھی" کیا اس سلسلے میں کرپشن بہت تھی اور بہت رعائتیں برتی گئیں۔؟" کچھ تو ہوئیں لیکن زیادہ نہیں۔" اس وقت میرے دل میں ایک عجیب سی خواہش نے سر اٹھایا۔ کاش ہمارے یہاں کوئی ایسا کالج یا کوئی ایسی یونیورسٹی ہوتی جہاں طلبا ایسے موضوعات پر ماسٹرز کا تھیسس لکھتے۔

آخر ہماری گفتگو ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات تک آ پہنچی۔ میرے لئے ایک بڑی حیران کن بات وہ تھی جو آخر میں سنی' ورنہ ہم جانے پہچانے طریقے سے اظہار خیال کرتے رہے۔ گجرال صاحب کا خیال ہے کہ پاک و ہند تعلقات میں بہتری کسی واقع کے طور پر ظہور میں نہیں آئے گی" یہ سب یقیناً ایک تدریجی عمل کے دوران ہوگا۔ جھٹکوں کے باوجود اور جھٹکے تو بہت آئیں گے' راستہ بالآخر کھل جائے گا۔ اگر حکومتوں نے ایسا نہ کیا تو خود لوگ کھول دیں گے۔؟ (تو کیا ان کا مقصد یہ بتانا ہے کہ رسمی مذاکرات لاحاصل ہیں۔" نہیں نہیں' ایسا نہیں' ہمیں مذاکرات جاری رکھنے چاہئیں۔ لیکن ذہن کو ناکامیوں کے لئے تیار رکھنا چاہیے کیونکہ ایسا اکثر ہوا ہے کہ مفاہمت ہوئی اور پیچھے ہٹ گئے' معاہدے ہوئے اور ناکام ہو گئے۔" سوال کیا' کیا آپ اس کی کوئی مثال دیں گے؟" بھٹو اور اندرا گاندھی نے لائن آف کنٹرول پر کشمیر کا تصفیہ منظور کر لیا تھا۔ بھٹو نے اس پر کچھ اور مہلت مانگی' اندرا نے کہا' ٹھیک ہے' ہم انتظار کر لیں گے۔"

میں نے جواب دیا' پاکستانی عہدیدار جو شملہ میں موجود تھے' ایسے کسی سمجھوتے سے انکار کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا" میں جانتا ہوں۔ میں اس بارے میں گجرال صاحب سے بحث کرنا نہیں چاہتا تھا' لیکن یہ بات بہت عجیب سی لگی کہ اندرا گاندھی جیسی' پختہ کار وزیراعظم ایسی کسی مفاہمت کو کسی شق میں درج کرائے بغیر یا کم از کم ایک یادداشت کے طور پر شامل کرائے بغیر اتنی آسانی سے جانے دیں گی۔

میں نے کہا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان 23 جون ۱۹۹۷ء کے سمجھوتے سے منحرف ہو رہا ہے جس میں جموں اور کشمیر کے مسئلہ کو دونوں ملکوں کے درمیان زیر بحث لانا طے ہوا تھا۔ انہوں نے کہا" اس مشترکہ بیان میں جن آٹھ مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے میری حکومت نے ان میں سے کسی ایک مسئلہ پر بھی بحث سے گریز نہیں کیا۔ آٹھوں مسائل ایک ہی عمارت میں آٹھ مختلف کمروں کے اندر آٹھ گروہوں کے درمیان بیک وقت زیر بحث لائے جا سکتے ہیں۔" مسٹر گجرال نے یہ فارمولا دہرایا زبان کے اس معمولی فرق کے ساتھ" بیک وقت کی جگہ ایک ساتھ ہی۔" کے الفاظ استعمال کئے ہندوستان نے کسی بھی مرحلے پر گریز

MashalBooks.org

نہیں کیا۔آئندہ ملاقات کے لئے بھی ہمارا وہی ایجنڈا ہوگا۔میں حیران ہوں پاکستان میں تو یہی کہا جاتا ہے کہ ہندوستان ایک سمجھوتے پر پہنچنے کے بعد اس سے پھر گیا۔"نہیں بلکہ پاکستان نے چند اہم صفات بھی اختراع کر رکھی ہیں جیسے (حقیقی) اور (با مقصد) کے الفاظ جو صرف راستے کے پتھر ہیں۔"

کیا آپ کے جانشین کے بھی یہی خیالات ہیں؟"جی ہاں۔آخر کیوں نہیں؟ یہ معاملہ پالیسی کا ہے افراد کا نہیں۔میری حکومت کی پالیسیوں سے واجپائی ناواقف نہیں' جب بھی پالیسی کے بارے میں کوئی بڑا معاملہ درپیش ہوا میں نے اس کی اطلاع انہیں دی اور ان سے مشورہ کیا۔کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ وہ خارجہ پالیسی' جسے حزب اختلاف کا تعاون حاصل نہ ہو' قابل عمل نہیں رہے گی۔اور یوں بھی ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔جب وہ وزیر خارجہ تھے اس وقت میں ماسکو میں سفیر تھا' جہاں انہوں نے تین مرتبہ دورہ کیا اور میرے ساتھ ٹھہرے۔"

جب میں نے دفتر خارجہ سے ردعمل معلوم کرنا چاہا تو ایک اعلیٰ افسر نے وثوق سے بتایا کہ ہندوستان نے 23 جون کے مشترکہ بیان سے اب اپنی پوزیشن بدل دی ہے۔مذکورہ افسر نے پارلیمنٹ میں واجپائی کے بیان کا بھی حوالہ دیا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ پاک و ہند مذاکرات سے جموں و کشمیر کے مسئلہ کو الگ رکھنا ہوگا۔انہوں نے کہا کہ نئی دہلی نے ایک نئی تجویز بھیجی ہے جو زیر غور ہے۔

اس کے بعد گجرال صاحب نے اس ضرورت کو تسلیم کئے جانے پر زور دیا کہ پاک و ہند تعلقات کو کشمیر کے سوال سے مشروط نہیں کرنا چاہئے۔انہوں نے کہا کہ ۱۹۹۳ء میں جب ان کی ملاقات وزیراعظم نواز شریف سے ہوئی تو یہی بات ان سے بھی کہی تھی۔"میں نے ان سے چین اور ہندوستان کی سرحد کا حوالہ دیا' وہاں ہمارے درمیان متنازعہ مسائل موجود ہیں۔اس کے باوجود ہمارے درمیان بات چیت ہوتی رہتی ہے کچھ دوسرے امور پر بات چیت۔کوئی بھی فریق ایک انچ زمین بھی چھوڑنے کی بات نہیں کرتا۔" گجرال صاحب نے کہا اور بتایا کہ نواز شریف کے ساتھ ان کے معاملات ٹھیک چل رہے تھے۔"میں حکومت میں گیارہ مہینے رہا۔ہماری چار مرتبہ ملاقاتیں ہوئیں' ہر ملاقات تپاک کے ساتھ اور گرمجوشی سے ہوئی اور مئی میں ہم نے یہ طے کیا کہ ۲۰۰۱ء میں آزاد تجارت کا ایک منطقہ قائم کریں گے' اس سے پہلے ۲۰۱۰ء کا سال طے ہوا تھا' جسے ہم نے کم کرایا۔"

میں نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان را اور آئی ایس آئی کی جانب سے بمباری اور سبوتاژ کے الزام اور جوابی الزام کا سوال اٹھایا' گجرال صاحب کسی قدر جوش میں آ گئے' انہوں نے کہا کہ ان کے خیال میں' پاکستان کی منتخب حکومت اپنی خفیہ ایجنسیوں پر قابو نہیں رکھتی۔(جس سے ان کا مفہوم یہ تھا کہ ہندوستان میں یہاں کے سول اداروں کی بنیادیں زیادہ گہری ہیں۔"اپنے زمانے میں' میں نے کبھی کسی ہمسایہ ملک کے خلاف کسی خفیہ کارروائی کی اجازت نہیں دی۔" اس وقت میں نے امریکی سی آئی اے کی

MashalBooks.org

مثال پیش کی جو قانونی حدود سے تجاوز کر کے ایسی کارروائیاں کرتی تھی' جن کی ''اجازت'' نہیں تھی۔ سرد جنگ کے ماحول میں اور جوہری ہتھیار کے خوف کی صورت میں خفیہ ایجنسیاں قدیم ترین جمہوریتوں میں بھی آزادانہ کارروائی کرنے کا اختیار رکھتی ہیں۔ میں نے کہا کہ ہندوستان میں جمہوری اداروں کی بنیادیں کیا امریکی اداروں سے بھی زیادہ گہری ہیں۔ گجرال صاحب نے جواب دیا' اب آپ جو نتیجہ چاہیں' نکالیں ۔'' تب انہوں نے اپنا سب سے زیادہ لرزہ خیز الزام عائد کیا۔ ''آئی ایس آئی نے گذشتہ فروری میں میرے قتل کا منصوبہ بنایا تھا۔ 23 اور 26 فروری کے درمیان ہندوستانی ایجنٹوں نے چھ افراد گرفتار کئے جن کے پاس کثیر مقدار میں آر ڈی ایس تھے' ایک کے پاس سوسائیڈ بلٹ (خودکشی کے لئے گولی) بھی تھی۔ آئی ایس آئی نے یہ منصوبہ ایک یورپی ملک میں بنایا تھا' یہ اس ملک کا خفیہ ادارہ تھا جس نے اس کا سراغ لگایا اور ہمیں خبردار کیا۔ اس وقت میں جالندھر میں انتخابی مہم میں مصروف تھا۔ جب وہ پکڑے گئے اس سے چوبیس گھنٹے پہلے مجھے اطلاع دے دی گئی تھی۔'' انہوں نے بتایا کہ اس کے بارے میں نواز شریف سے بات کی' جنہوں نے اس کی تفتیش کا وعدہ کیا۔ ''اس سے پہلے میں نے انہیں فون کیا تھا جب ہمارے آدمیوں نے ان کے پانچ آدمی شانہ بردار میزائلوں کے ساتھ پکڑے تھے۔'' (غالباً کشمیر میں ایسا ہوا تھا' لیکن میری درج کردہ عبارت اس بارے میں واضح نہیں) ''نواز شریف نے چھان بین کرنے کا وعدہ کیا تھا' پھر اس سے انکاری ہو گئے۔''

لیکن آئی ایس آئی کو کیا پڑی ہے کہ آپ کو قتل کرے؟

میرا خیال ہے کہ وہ انتخابات میں کھنڈت ڈالنا چاہتے تھے۔ ذرا خیال کرو کہ جنوب میں ایڈوانی مر جاتے ہیں اور شمال میں میں' پھر تو مکمل طور پر افراتفری پھیل جاتی۔'' ''کیا آپ کا خیال ہے کہ کوئمبٹور میں بھی آئی ایس آئی نے کارروائی کی تھی؟'' ''جی ہاں' میرے پاس اس کے مصدقہ شواہد موجود ہیں کہ وہ آئی ایس آئی کا ہی کام تھا۔''

جوہری اسلحہ دشمن کو خوفزدہ رکھتا ہے' اسے کوئی بھی فریق استعمال نہیں کر سکتا۔ اسے استعمال خواہ کوئی بھی کرے' ہوا دونوں طرف تباہی پھیلائے گی۔ ہم میں سے کوئی بھی جاپان کے خلاف امریکہ کی طرح نہیں ہے۔ جنگ کوئی حل نہیں' البتہ خفیہ جنگی کارروائیاں دونوں طرف تباہی پھیلاتی ہیں' ہمیں یہ نتیجہ قبول کر لینا چاہیے کہ ہم دونوں کو ایک ساتھ رہنا ہے۔ امن مسئلہ کا ایک ہی حل ہے۔ یہ وہ جذبات تھے جن سے میں اختلاف نہ کر سکا۔ یوں ہماری گفتگو اختتام کو پہنچی۔

(''ڈان'' 10 مئی 1998ء)

کشمیر

MashalBooks.org

کشمیر، ہندوستان کی شامت اعمال

کشمیر کا بین الاقوامی تنازعہ جو ابھی تک برقرار ہے، فلسطین کے سوال سے ملتا جلتا ہے۔ یہ تنازعہ 1947ء میں شروع ہوا اور تیس سال سے دنیا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان نے اس کے لئے دو جنگیں 1947ء اور 1965ء میں لڑیں جو بے نتیجہ رہیں۔ اس کے بعد جب 1971ء میں ہندوستان نے پاکستان کو بنگلہ دیش کے بحران کے دوران میں شکست دے دی تو اس مسئلہ کو اقوام متحدہ کے حوالے کر دیا گیا اور دنیا نے اسے بھلا دیا۔ گزشتہ ماہ جب ہندوستان کے خلاف اور کشمیر میں ہندوستان کی فوجی مداخلت کے خلاف احتجاجی مہم شروع ہوئی تو اس متنازعہ ریاست پر ایک بار پھر دنیا کی توجہ مرکوز ہو گئی۔ ہندوستان اور پاکستان پر اب پھر جنگ کا مہیب سایہ منڈلا رہا ہے اور طویل عرصے سے مبتلا کشمیری باشندے تشدد اور انتقامی کارروائی کا ہدف بنے ہوئے ہیں۔ کشمیر کے تنازعے کے اسباب غلامی اور اس کے بعد کے دور کی تاریخ سے پیوست ہیں۔ 1858ء کے بعد جب ہندوستان کو "تاج برطانیہ کی کالونی" قرار دیا گیا، اس کے بعد ہی سے نوآبادیاتی حکومت دوہرے انداز سے کام کرنے لگی۔ برصغیر کے سب سے بڑے حصہ پر براہ راست حکومت ہند کی عمل داری تھی۔ اس کے علاوہ "رجواڑوں کی ریاستیں" تھیں، جن کی عمل داری مقامی حکمرانوں یعنی مہاراجہ، راجہ، نواب اور نظام کے ماتحت تھی۔ اس کے عوض انہیں تاج برطانیہ کی بالادستی کو تسلیم کرنا ہوتا تھا۔ نوآبادیاتی ہند میں، کم از کم 560 ایسی ریاستیں تھیں۔ اپنی وسعت میں وہ مختلف تھیں، کچھ تو نہایت چھوٹی ریاستیں جو محض جاگیریں تھیں، دوسری بہت بڑی ریاستیں: میسور، حیدرآباد، جے پور اور کشمیر کی طرح۔ ان ریاستوں نے اپنا استحقاق برطانیہ کے حوالے کر دیا تھا کہ وہ ان کی طرف سے خارجہ حکمت عملی وضع کرے، دفاعی افواج تیار کرے اور بین الاقوامی تجارت کے معمولات انجام دے۔ ہندوستان پر برطانوی حکمرانی کی حدود کے اندر ان والیان ریاست کا منصب ذومعنی اور حفاظتی نظام (Protective System) کے مشابہ تھا۔ 1947ء میں آزادی کے موقع پر اقتدار کی اس ذومعنویت کا پورا پورا استعمال ہوا۔

آزادی کے موقع پر ہندوستان کو مذہبی خطوط پر تقسیم کیا گیا۔ شمالی اور مشرقی علاقوں میں، جہاں مسلمان اکثریت میں تھے وہاں پاکستان بن گیا۔ ہندوؤں کے اکثریتی علاقے حسب معمول ہندوستان میں رہے۔ (شہزادوں) نے اس وقت یہ دلیل پیش کی کہ ہندوستان سے برطانیہ کی واپسی کے بعد 'بالادستی" کے قانون کو ہندوستان اور پاکستان کی نوآزاد ریاستوں کے ساتھ تعلقات پر اثر انداز نہیں ہونا چاہیے۔ انہوں نے آزادی کا مطالبہ کیا۔ ہندوستان کے قوم پرست لیڈروں نے اور پاکستان نے بھی اس مطالبے پر

MashalBooks.org

اعتراض کیا اور کہا کہ برصغیر میں اس سرزمین کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں' جو نا قابل برداشت ہوگا اور یہ کہ ریاستی حکمرانوں کا انتخاب' ان ریاستوں کے باشندوں کی خواہش کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔

برطانیہ نے ان خلافی حیثیتوں کو اس حد تک قبول کیا کہ یہ بالادستی آزادی کے دن یعنی 15 اگست 1947ء کو ختم ہو جائے گی۔ گویا یہ بات طے تھی کہ دیسی ریاستوں کو اپنی آزادی کا انتخاب اس وقت تک کر لینا ہوگا' انہیں یہ اختیار دیا گیا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ریاستوں میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کر لیں' علاوہ ازیں انتقال اقتدار کے سمجھوتے میں یہ بات شامل تھی کہ سربراہان ریاست اپنا انتخاب کرتے وقت اپنے یہاں کے باشندوں کی خواہشوں کو ملحوظ رکھیں گے۔

بیشتر دیسی ریاستوں کے لئے ایک ہی قابل عمل انتخاب یہ تھا کہ جو ریاست جس ملک کی علاقائی حدود کے اندر واقع ہو' اسی کے ساتھ الحاق کر لے۔ آزادی سے پہلے چند ہفتوں کے اندر انہوں نے ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ الحاق کر لیا۔ لیکن ان میں تین استثنائی صورتیں پیدا ہوئیں' ایک معمولی اور دو بڑی صورتیں۔ ایک چھوٹی سی ریاست جوناگڑھ نے جس کا سربراہ مسلمان اور رعایا کی اکثریت ہندو تھی' پاکستان کے ساتھ الحاق کر لیا۔ سربراہ کے خلاف بغاوت ہو گئی۔ بغاوت کا بہانہ بنا کر ہندوستان نے حملہ کر دیا' نواب فرار ہو گیا۔ جوناگڑھ کو رائے شماری کے بعد ہندوستان کے وفاق میں شامل کر لیا گیا۔ رائے شماری میں بھاری اکثریت نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا تھا۔ کشمیر کے تنازعے میں جوناگڑھ کا پہلے رونما ہونے والا واقعہ بہت اہم قرار پایا۔ اقوام متحدہ میں یہ واقعہ ہندوستان پر آسیب بن کر سوار رہے گا۔

بڑی انتہائی صورتیں حیدرآباد اور کشمیر کی ہیں۔ دونوں اپنی وسعت کے اعتبار سے بڑی ہیں اور ان کا خیال تھا کہ آزاد رہنے کی حق دار ہیں۔ دیسی ریاستوں میں حیدرآباد سب سے بڑی ریاست اور اپنی وسعت میں تقریباً مصر کے برابر ہے' اس پر 17 صدی عیسوی سے مسلمان خاندانوں کی حکومت رہی ہے۔ نظام نے' جن کے بارے میں ایک زمانے میں مشہور تھا کہ دنیا کے سب سے دولت مند شخص ہیں' آزاد رہنا پسند کیا۔ یہ ایک غیر حقیقت پسندانہ فیصلہ تھا کیونکہ حیدرآباد جنوبی ہند کے عین وسط میں واقع ہے۔ اس کی رسائی سمندر تک نہیں اور یہاں بھاری تعداد ہندوؤں' یعنی ہندوستان کے حامیوں کی تھی۔ ہندوستان کی ایک ڈویژن فوج ستمبر 1948ء میں حیدرآباد میں داخل ہو گئی اور یوں نظام کی حکومت تمام ہوئی۔ ریاست کو ہندوستان میں شامل کر لیا گیا۔ کشمیر اپنے طول و عرض میں شام کے برابر ہے۔ وہاں مختلف صورت درپیش تھی۔ اس کے حکمران خاندان کو برطانیہ نے انیسویں صدی کے وسط میں تخت پر بٹھایا تھا۔ وہ ایک ہندو تھا اور وہاں تین چوتھائی سے زیادہ آبادی مسلمانوں کی ہے۔ اس کی تجارت اور آمد و رفت کے راستے پاکستان سے جڑے ہوئے ہیں۔ کشمیر شمال میں چین اور روس سے ملحق ہے اور محل وقوع کے لحاظ سے نہایت اہم' اس کے ساتھ ہی اپنی خوبصورتی کے لئے مشہور ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں کی نظریں اسی پر لگی ہوئی تھیں۔

مہاراجہ اس امید پر کہ شاید وہ آزاد رہ جائے کچھ وقت کے لئے خاموش اور الگ تھلگ رہا۔ ہندوستان اور پاکستان نے اسے فیصلہ کرنے کی مہلت دی اور عدم مداخلت (Stand Still Agreement) سمجھوتہ کرلیا۔

جب یہ افواہ پھیل گئی کہ مہاراجہ ہندوستان کے ساتھ الحاق چاہتا ہے تو کشمیر کے ضلع پونچھ میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ اس میں ملحقہ پاکستان سے قبائلی بھی اچھی خاصی تعداد میں شامل ہو گئے۔ حکومت پاکستان نے اس بات سے انکار کیا کہ اس بغاوت میں اس کا دخل ہے۔ لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حکومت نے پاکستانی رضا کاروں کی مدد کی اور براہ راست مداخلت سے باز رہنا ہی قرین مصلحت سمجھا تھا۔ 25 اکتوبر 1947ء کو باغی عناصر اور پاکستانی قبائلی سری نگر کے عقب میں پہنچ گئے جو کشمیر کا دارالحکومت تھا تو مہاراجہ نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا۔ حملہ آور قبائلوں سے دارالحکومت کو بچانے کے لئے ہندوستانی فوجی طیاروں کے ذریعے عین وقت پر سری نگر پہنچ گئے۔ جس طرح گزشتہ سال افغان مجاہدین کے درمیان کامیابی کا روشن امکان دیکھتے ہی آپس میں پھوٹ پڑ گئی تھی اسی طرح قبائلی بھی ٹکڑیوں میں بٹ گئے۔ پاکستان کی فوج جس کی قیادت برطانوی کمانڈر انچیف کر رہے تھے کھڑی رہی۔ دوسری طرف ہندوستانی فوج نے رضا کاروں کی فوج کو گھیرا۔ ایک خون ریز تصادم میں ان کا صفایا کر دیا۔ آخر کار 1948ء کے موسم گرما میں پاکستانی فوج کو مقابلے کا حکم دیا گیا۔ جب پاکستان نے ہندوستانی فوج کو پیچھے دھکیلنا شروع کیا اور دونوں کے درمیان جنگ یقینی نظر آنے لگی تو ہندوستان نے یہ قضیہ اقوام متحدہ میں پیش کر دیا۔ یکم جنوری 1949ء کو جنگ بندی ہوگئی۔

فلسطین کے قضیئے کی طرح اقوام متحدہ کے ثالثوں کی مدد سے کشمیر کے مسئلہ کو بھی حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے بعد بہت ساری قراردادیں منظور کی گئیں۔ سب کو نظرانداز کر دیا گیا۔ ان میں سب سے زیادہ اہم 1949ء کی قرارداد تھی جس میں کہا گیا تھا کہ وہاں اقوام متحدہ کی نگرانی میں رائے شماری کرائی جائے تاکہ کشمیر کے لوگوں کا عندیہ معلوم ہو۔ ان کو یہ اختیار ہوگا کہ ہندوستان سے الحاق کریں یا پاکستان سے الحاق کریں یا آزاد ریاست کے طور پر رہنا پسند کریں۔

رائے شماری کی کارروائیوں کے سلسلے میں ہندوستان نے عملاً اقوام متحدہ کی بہت سی تجاویز کو رد کر دیا۔ رائے شماری کے مراحل کی نگرانی کے لئے اقوام متحدہ نے ایڈمیرل نمٹز کو مقرر کیا تھا۔ اپنے فرض کی ادائیگی میں ناکامی کے بعد انہوں نے مایوس ہو کر استعفیٰ دے دیا۔ اس طرح اقوام متحدہ کے یکے بعد دیگرے کئی ثالثوں کی متعدد تجاویز ہندوستان کی طرف سے مسترد ہوتی گئیں۔ یہ تھے کینیڈا کے جنرل میکناٹن، آسٹریلیا کے سراوون ڈکسن اور امریکہ کے ڈاکٹر گراہم، جن کی تجاویز کو ہندوستان رد کرتا رہا۔ اس نے یہ موقف اختیار کیا کہ کشمیر نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کر لیا تھا اور اب قابل قبول حل ایک ہی رہ گیا ہے کہ

کشمیری علاقوں سے پاکستان اپنی فوجیں کلیتاً باہر نکال لے۔ جنوری 1957ء میں جب اس مسئلہ کو سلامتی کونسل میں پیش کیا گیا اور آخری بار پوری سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا گیا تو ہندوستان نے خود کو بالکل یکا و تنہا پایا۔ یہاں تک کہ روس نے بھی جو روایتی طور پر ہندوستان کا حمایتی تھا' اس نے بھی حمایت نہیں کی ہندوستان کی حیثیت اب یہ ہے کہ کشمیر ہندوستان کا حصہ ہے' لہٰذا اس میں اقوام متحدہ کو مداخلت کا کوئی اختیار نہیں۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے اس موقف کو تسلیم نہیں کیا۔ اگر ہندوستان نے کشمیریوں کا حق خود اختیاری مان لیا ہوتا تو یہ بات بالکل یقینی نہیں کہ انہوں نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا انتخاب کیا ہوتا۔ سال کی کئی دہائیوں سے شیخ عبداللہ کی کرشمہ ساز شخصیت کو کشمیر کی سیاست پر بالادستی حاصل رہی ہے' وہ بابائے جدید کشمیر ہیں۔ شیخ عبداللہ ان مسلمان لیڈروں میں شامل تھے' جنہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت اور ایک متحدہ آزاد ہندوستان کی حمایت کی تھی۔ وہ نہرو کے دوست اور انہی کی طرح گاندھی کے رفیق کار تھے۔ محمد علی جناح اور دوسرے پاکستانی لیڈروں کے ساتھ ان کے اچھے تعلقات کے بارے میں نہیں سنا گیا۔ اگر شیخ عبداللہ کو آزادی کے ساتھ انتخاب کا حق دیا جاتا تو زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ کشمیریوں کو ہندوستان کے ساتھ الحاق پر آمادہ کر لیتے اور اس کے ساتھ ہی کشمیر کے لئے ایک خاص طرح کی خودمختاری کا مطالبہ کرتے۔ یہاں تک کہ جن دنوں اقوام متحدہ میں اس مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی' انہوں نے اپنا یہ مقصد حاصل کرنے کی ایک ناکام کوشش کی تھی۔ اس دوران میں انہوں نے ہندوستان کی مداخلت کے خلاف مزاحمت کرنے والے کشمیریوں کے جوش و خروش کو ٹھنڈا کیا۔

کشمیریوں کے احتجاج کی شدت کم کرنے کے لئے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے مہاراجہ کو معزول کر دیا اور شیخ عبداللہ کو دعوت دی کہ کشمیر کے وزیر اعظم بن جائیں۔ اس عرصے میں شیخ نے ایک منتخب دستور ساز اسمبلی بنائی تھی۔ اس دستور میں کشمیر کی خودمختاری کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ اگست 1953ء میں مشہور ''شیر کشمیر'' کو معزول کر کے ہندوستان نے انہیں جیل میں ڈال دیا۔ اس کے بعد تو بڑے پیمانے پر سختی شروع ہو گئی۔ شیخ عبداللہ دس سال سے بھی زیادہ عرصے تک قید میں رہے۔ 1956ء میں ریاستی اسمبلی نے ووٹ کے ذریعے کشمیر کو ہندوستان کا ایک صوبہ قرار دے دیا۔ کئی سال بعد ایک اور شورش کے بعد جب شیخ عبداللہ کو رہا کیا گیا اور انہیں وزیر اعظم بنایا گیا تو ان میں بڑھاپے کی وجہ سے اتنی سکت اور اہلیت باقی نہیں رہ گئی تھی کہ اپنے بددیانت رفقائے کار اور اپنے بیٹے فاروق کو قابو میں رکھتے' چنانچہ شیخ کی ساکھ ختم ہو گئی اور عام لوگوں میں ان کو جو زبردست مقبولیت حاصل تھی' وہ بھی جاتی رہی۔

1990ء میں یہ مسئلہ اب اور طرح سامنے آیا ہے۔ اس سے قبل کشمیر کا مسئلہ اٹھانے میں پاکستان پہل کرتا تھا اور شدت کے ساتھ ہندوستان سے مقابلہ کرتا تھا۔ اس مرتبہ تمام تر مسئلہ کشمیریوں نے اٹھایا ہے اور اسے لے کر آگے چلے ہیں۔ ہندوستان کے مقبوضہ علاقے میں مخالفت کی لہر دور دور تک دوڑ گئی ہے اور

اسے عام لوگوں کا پر جوش تعاون حاصل ہے۔ اب جو مزاحمت کی تحریک لوگوں کی گھٹی ہوئی بے چینی کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے' اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے کوئی شیخ عبداللہ موجود نہیں اور حق خود اختیاری کے حصول کی جو امنگ پائی جاتی ہے' اسے دبانے کے لئے کوئی تدبیر نہیں رہی۔ شیخ کا بیٹا عبداللہ جائے عوامی شورش کا اصل نشانہ تھا' جبکہ اسے کشمیر کے وزیر اعلیٰ کے طور پر اسے برطرف کر دیا گیا۔

یہ تنازعہ جو ایک عرصے سے چلا آ رہا ہے' اس کے بڑے وسیع اور دور رس نتائج پیدا ہوئے۔ اس کے باعث پاکستان نے امریکہ سے فوجی اتحاد کیا۔ معاہدہ بغداد و سیٹو کے اتحاد میں شامل ہوا' دونوں ملکوں میں فوجی مصارف بڑھ گئے اور اسی وجہ سے ان کے درمیان جنگیں بھی ہوئیں۔ ان سب سے سوا بیچارے کشمیری عوام علاقائی تقسیم اور اقتصادی جمود کے جہنم میں' جہاں مزاحمت ہے اور تشدد ہے' بے بسی کی زندگی گزارتے آئے ہیں۔ تازہ بغاوت ایک یقینی صداقت کو واضح کرتی ہے' وہ یہ کہ عوام کا اجتماعی ارادہ جب ایک بار بروئے کار آ جائے تو اسے فوجی تشدد اور انتظامی تدبیروں سے دبایا نہیں جا سکتا۔ ہندوستان یہ حربے چالیس سال سے استعمال کرتا آ رہا ہے' لیکن کامیاب نہیں ہوا۔

ہندوستان کے پاس اب تین راستے ہیں' وہ مخالفت کو مسلسل کچلتا رہے' جس سے کشمیر میں بے اندازہ ظلم اور سفاکی پھیلے گی اور ہندوستان کی سیاست میں بھی آئے گی۔ دوسرے وہ پاکستان کو الزام دے اور مسئلہ کا حل جنگ میں تلاش کرے لیکن جنگ سے تو یہ مسئلہ پہلے بھی حل نہیں ہوا' آئندہ بھی حل نہیں ہوگا۔ آخری بات یہ کہ اسے ایک سیاسی مسئلہ مان لیا جائے' اس کا حل سیاسی ہوگا' جس کا مطلب ہے' جنگ کا خاتمہ' تشدد کا خاتمہ اور کشمیریوں کے حق خود اختیاری کا احترام۔ ان کا یہ حق تسلیم کیا جائے۔

یہ آخری تدبیر اختیار کرنا آسان نہیں ہوگا' اگرچہ اس کا فائدہ ہندوستان کو ہی ہوگا۔ وزیر اعظم وی پی سنگھ ایک صاحب کردار اور سوجھ بوجھ والے آدمی ہیں' وہ باہمت ہیں اور ایک مشترکہ حکومت کو چلا رہے ہیں' جو اپنی بقا کے لئے دائیں بازو کی ایک ہندو پارٹی' بھارتیہ جنتا پارٹی پر انحصار کر رہے ہیں اور یہ پارٹی حکومت پر دباؤ ڈال رہی ہے کہ کشمیر میں پہلے سے بھی زیادہ سخت اقدامات کرے' پچھلے دو برس سے دائیں بازو کی ان پارٹیوں کے اس اتحاد نے مسلمان دشمن مہم شروع کر رکھی ہے۔ مسلمان دشمنی کا بخار اب بھی اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ ہندو مسلم فسادات میں ہزاروں افراد مارے گئے ہیں۔ گاؤں جلا دیئے گئے ہیں اور قصبات کو تباہ کیا گیا ہے۔ ہندوستان کا سیاسی ماحول کسی طرح کی مفاہمت اور سمجھوتے کے لئے سازگار نہیں ہے۔ اسی طرح کی صورت حال پاکستان میں پائی جاتی ہے' جہاں وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کی کمزور حکومت' جسے اپنی سمت کا اندازہ نہیں' کو دائیں بازو کے مخالفین کے زبردست دباؤ کا سامنا ہے۔ اس وقت بڑا خطرہ ہے کہ ظلم' تشدد اور جنگ کا سلسلہ جاری رہے گا۔

("ڈان" 10 فروری 1990ء)

کیا ہندوستان اور پاکستان میں جنگ ناگزیر ہے؟

پاکستان کے صدر اور ہندوستان کے وزیر اعظم نے گزشتہ ہفتے دونوں ہمسایہ ملکوں کے درمیان متوقع جنگ کی افواہوں کو بیک وقت رد کرتے ہوئے گویا اس بارے میں یقین دہانی کرائی ہے۔ ان کی یہ بصیرت کہ جنگ کا نتیجہ انتہائی تباہ کن اور لاحاصل ہوتا ہے' اس امید کی علامت ہے کہ اس ہولناکی کو روکا جا سکتا ہے۔

اگر ایسا ہوتا ہے تو ہندوستان اور پاکستان کی چوتھی جنگ یقیناً انتہائی ہولناک ہوگی۔ دونوں ملکوں کی فوجیں اب زیادہ بڑھ گئی ہیں' ان کے پاس ہتھیار بہ افراط اور اتنے حساس نوعیت کے ہیں جو پہلے کبھی نہ تھے۔ امکان یہ ہے کہ وہ چھ ہفتے تک یا شاید اس سے زائد عرصے تک یہ جنگ کھینچیں گے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ہر فریق روزانہ کم سے کم تین سو سے لے کر چار سو کروڑ روپے تک خرچ کرے گا۔ مجموعی طور پر ان کی معیشت کے نقصانات اس سے کہیں زیادہ ہوں گے اور انسانی جان کی قیمت اور دوسرے نقصانات کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے بعد دونوں ملکوں کے حالات بحال ہونے میں کئی دہائیاں صرف ہو جائیں گی۔ اگرچہ ماضی میں دہلی اور اسلام آباد نے قدرے تحمل سے کام لیا تھا' یعنی طرفین نے ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں میں ایک دوسرے کی صنعتی تنصیبات کو جن میں دفاعی تنصیبات بھی شامل تھیں' تباہ کرنے سے احتراز کیا تھا' لیکن اب ایٹمی اسلحہ کے استعمال کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا۔

جنگ جب ایک بار شروع ہو جائے تو' اس کو بڑھانے میں اس کی اپنی منطق کام کرتی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے معاملے میں اس کا خاص طور پر اطلاق ہوتا ہے۔ دونوں فریق کچھ اس طرح دیکھ رہے ہیں کہ ان کی آئندہ جنگ فیصلہ کن اور آخری ہوگی۔ مزید یہ کہ زیادہ تر پاکستانی' جن میں کچھ ارباب اختیار اور اعلیٰ فوجی عہدیدار بھی شامل ہیں' یہ باور کرتے ہیں کہ ہندوستان نے پاکستان کے وجود کو ابھی تک تسلیم نہیں کیا۔ ابھی گزشتہ موسم گرما کی بات ہے' مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بااثر ہندوستانی یہ دلیل دے رہے ہیں کہ کشمیر اور پنجاب میں درپیش صورت حال ہندوستان کی اپنی بقا کا مسئلہ ہے' اس سے کم کوئی بات نہیں۔ ان دو انتہائی نوعیت کے اندازوں سے بوکھلاہٹ کا رویہ پیدا ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ ایک فریق اس مجبوری کے تحت کہ دوسرے فریق کے حملے سے بچنے کے لئے پہلے خود وار کر دے' ایٹمی ہولناکی ایک بہت بڑا خطرہ بن کر سامنے آتی ہے۔

اس مرتبہ جنگ کا سبب ہندوستان میں پایا جاتا ہے۔ پاکستان میں نہیں۔ اس کا تعلق کشمیر سے ہے اور اس حقیقت پر مبنی ہے کہ مستقبل قریب میں ہندوستان میں یکے بعد دیگرے کمزور حکومتوں کے برسر اقتدار

MashalBooks.org

آتے رہنے کا امکان ہے۔ کشمیر کا مسئلہ حل کرنے اور پاکستان کے ساتھ اپنے تنازعے طے کرنے کے لئے جس سخت نوعیت کے سیاسی فیصلوں کی ضرورت ہے' آئندہ حکومتیں اس کی اہل نہیں ہوں گی۔ ایک پرانی کہاوت ہے' جنگ کے معنی ہیں سیاسی عمل کو دوسرے انداز میں جاری رکھنا' لیکن یہاں جنگ کو سیاسی عمل کے طور پر جاری رکھنے کی کہاوت لاگو نہیں ہوتی۔ ہمارے زمانے میں جنگ' سیاست کی ناکامی کی علامت ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان خطرناک طور پر سیاسی ناکامی کی راہ پر چل پڑا ہے۔ ہندوستان 1991ء کے وسط تک کشمیر کی جدوجہد میں یقینی طور پر ہار گیا' جس طرح فرانس 1950ء میں الجزائر کو ہار چکا تھا اور امریکہ 1964ء میں ویت نام میں ہار گیا تھا۔ آزادی کی جنگوں میں نفع و نقصان کا حساب اس طرح نہیں کیا جاتا کہ علاقے پر قبضہ کس کا ہے؟ بلکہ اس کی پیمائش اس حساب سے کی جاتی ہے کہ جائز حق کس کا بنتا ہے اور متنازعہ علاقے میں لوگوں کے دل و دماغ پر حکمرانی کس کی ہے؟

یہی وجہ ہے کہ گوریلا جنگ کے ماہروں نے فوجی کارروائیوں پر سیاست کی برتری کو ہمیشہ اولیت دی ہے اور اپنی فوجی کارروائی کا تخمینہ اس طرح لگایا ہے کہ اس کا سیاسی نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ روایتی جنگ کی فتح و شکست کو انہوں نے اہمیت نہیں دی۔ ہمارے زمانے میں مسلح باغی حکمران کو جنگ میں شکست دینے کی بات نہیں سوچتے۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دشمن سے اس کے اقتدار کا جواز چھین لیں اور اپنے مقصد کو جائز ثابت کر دیں۔ یہ دونوں عمل ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں۔

حکمرانی کے جائز حق کا تعلق برسر اقتدار ریاست کی مقبولیت سے نہیں بلکہ براہ راست اس کے حق حکمرانی سے ہوتا ہے۔ جب اس کا جواز کمزور ہونے لگتا ہے اور حکمران ریاست اخلاقی طور پر اکیلی رہ جاتی ہے تو اس کی مسلح افواج آبادی کا نظم سنبھالنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ پیشہ ور سپاہی اس کام کو نہایت محنت طلب اور حوصلہ شکن سمجھتے ہیں۔

پیشہ ور فوجوں کا مقابلہ جب گوریلوں سے ہوتا ہے' جنہیں عام لوگوں کی امداد میسر ہوتی ہے تو وہ جنگ کو پھیلا دینے کا شر انگیز طریقہ استعمال کرتے ہیں۔ اس وقت شاطر دشمن نہ صرف فوجوں کو بے اثر بنا دیتا ہے' بلکہ ان کی تربیت اور تنظیم کی افادیت کی بھی نفی کر دیتا ہے۔ تب پیشہ ور فوجیں جو گوریلا لڑائی کی پرفریب چالوں میں پھنس چکی ہوتی ہیں' روایتی جنگ کے یقینی طریقوں کو بروئے کار لانے کی شدید خواہش کرتی ہیں' پھر یہ بھی کہ پیشہ ور سپاہیوں کا حوصلہ اس وقت برقرار نہیں رہتا' جب یہ محسوس کرنے لگیں کہ وہ ایک عوامی بغاوت کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ مجبوراً وہ خود کو یہ باور کرانے لگتے ہیں کہ ان کے مقابلے میں گوریلا تربیت یافتہ ہیں' ساز و سامان سے لیس ہیں اور کوئی غیر ملکی قیادت انہیں ہدایت دے رہی ہے اور یہ کہ بڑے پیمانے پر دہشت پھیلا کر وہ عوامی تعاون حاصل کرتے ہیں۔ ان کے اس یقین کے دو نتائج نکلتے ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف مدافعت کی کارروائی اور جنگ۔

دہشت گردی کے خلاف کارروائی کے نتیجے میں عام شہریت بہت پامال ہوتی ہےاور باغی جو پامردی کے ساتھ ڈٹے رہتے ہیں' ان کے پیچھے عام شہریوں کا تعاون ہوتا ہے' لیکن محکوموں کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے عوام پر سختی بلکہ سفاکی برتی جاتی ہے۔ فرانس کے ہاتھوں الجزائر میں اور امریکہ کے ہاتھوں ویت نام میں بھی سفاکی نسل کشی تک پہنچ گئی تھی۔ اس طرز عمل کا الٹا اثر ہوتا ہے۔ عوام مستقل طور پر ریاست سے الگ ہو جاتے ہیں۔

اب کہ حکمران ریاست کا اخلاقی طور پر کٹ جانا یقینی ہو جاتا ہے تو فوجی اور سول حکام جو بغاوت فرو کرنے میں لگے ہوتے ہیں' بتدریج اس بات پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ مفروضہ اصل "دشمن" کو کھینچ کر کھلی جنگ کے میدان میں لائیں۔ اس وقت ایک بغاوت جو مفروضہ طور پر جنگ کا سرچشمہ ہے اور جس کا کوئی سرا نظر نہیں آتا' اسے ایک خودمختار ریاست کے خلاف جنگ بنا دینا' شدید ضرورت بن جاتی ہے اور روایتی مقابلے کی یہی ایک صورت باقی رہ جاتی ہے' پھر وہ اس کا آغاز باغیوں کی "پرانی پناہ گاہوں" کی تباہی سے کرتے ہیں۔ جنگ کو آگے لے جانے کا عمل اس طرح شروع ہوتا ہے' جس کا نتیجہ اس ملک کے خلاف بھرپور حملے کی صورت میں نکلتا ہے' جس کے بارے میں قیاس کیا جاتا ہے کہ بغاوت کو جاری رکھنے میں اس کا تعاون شامل ہے۔

یہی وہ صورت حال ہے' جس کے تحت فرانس نے پہلے مصر اور بعد میں تیونس پر حملہ کر دیا تھا۔ یہی وہ مجبوری تھی جس کے تحت امریکہ نے پہلے تو شمالی ویت نام کے خلاف جنگ چھیڑ دی اور آخر کار کمبوڈیا پر حملہ کر دیا۔ ہندوستان بڑی تیزی سے اسی مرحلے کی طرف جا رہا ہے۔ درحقیقت کشمیر میں لائن آف کنٹرول کی دوسری طرف مفروضہ پناہ گاہوں پر محدود نوعیت کا حملہ شروع ہو چکا ہے۔

ان بڑھتے ہوئے تشدد آمیز اقدامات کو روکنے اور جنگ کو پھیلانے سے باز رہنے کا متبادل طریقہ سیاسی تصفیہ ہے' لیکن کسی حکومت کے مقابلے میں باغیوں سے مذاکرات کرنا حکومتوں کے لئے بہت سی دشواریوں کا سبب بن جاتا ہے' اس لئے خاص طور پر مضبوط حکومتوں کی موجودگی ضروری ہوتی ہے اور ایسے لیڈروں کی قیادت درکار ہوتی ہے' جو تاریخ کا شعور رکھتے ہوں تاکہ ایک غیر حکومتی حریف کے ساتھ کسی سمجھوتے پر پہنچ جائیں۔ الجزائر کی حریت پسند تنظیم ایف ایل این کے ساتھ سنجیدہ مذاکرات کرنے میں یکے بعد دیگرے کئی حکومتیں ناکام ہو گئیں' یہاں تک کہ جنرل چارلس ڈیگال برسر اقتدار آئے اور مذاکرات کے ذریعے فرانس کو الجزائر کی دلدل سے کھینچ کر باہر نکالا' جس طرح فرانس نے دوراندیشی کی تھی' ہندوستان کے لیڈر بھی وہی کریں تو بہتر ہوگا۔ الجزائر کوئی نوآبادی نہیں تھا' وہ فرانس کا ایک جزو لازم تھا۔ کشمیر کی طرح الجزائر بین الاقوامی سطح پر ایک متنازعہ علاقہ نہیں تھا۔ وہ فرانس کا ایک صوبہ اور اس کا ایک انتظامی محکمہ تھا۔ کوئی دس لاکھ نسلی فرانسیسی وہاں آباد تھے' اور ہزاروں عرب الجزائری فرانس کے ساتھ وفادار تھے' ان کے ساتھ وہ بہت سے

MashalBooks.org

فرانسیسی ''انتہا پسند'' بھی شامل ہو گئے تھے جنہیں فرانس کا یہ مہلک انجام نظر آ رہا تھا کہ الجزائر کو الگ کر دینے کی صورت میں اس ملک کا اقتدار ملیامیٹ ہو جائے گا۔ البتہ ڈیگال کی بصیرت نے جان لیا تھا کہ الجزائر کے باشندوں کی بھاری اکثریت کو دیکھتے ہوئے فرانس کی حکمرانی کا جواز ختم ہو چکا ہے اور یہ کہ اس نقصان کا ازالہ اب نہیں ہو سکتا۔ اس بدیہی حقیقت کا دلیرانہ اقرار کرنے سے فرانس کو فائدہ ہوا۔ اس طرح فرانس اس طرح کی ذلت آمیز شکست سے بچ گیا' جس کا سامنا امریکہ کو ویت نام میں کرنا پڑا۔ فرانس کا اخلاقی درجہ بلند ہو گیا۔ شمالی افریقہ کے عرب علاقوں سے اس کے تعلقات بہتر ہو گئے اور مغرب میں اس کے اثر و رسوخ کی توسیع ہوئی۔

لیکن ہندوستان کے سیاسی افق پر کوئی ڈیگال موجود نہیں' اس کے باوجود ہمیں کوئی ایسا طریقہ نکالنا ہو گا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان امن قائم رکھیں اور آفت رسیدہ کشمیریوں کو عافیت اور انصاف بہم پہنچائیں۔

(''ڈان'' 19 مئی 1991ء)

MashalBooks.org

کشمیر کا کشمیری حل

جنوبی ایشیا کا ایک مسئلہ ہے جس کی عمر دوسری عالمی جنگ کے بعد پیدا ہونے والے بیشتر مسائل سے زیادہ ہے۔ سرد جنگ کا زمانہ، ویت نام کی جنگ، امریکہ چین کشیدگی، جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز، عرب اسرائیل تنازعہ، ان سب سے زیادہ طویل المدت یہ مسئلہ ہے، جواب تک موجود ہے، یہ ہے کشمیر کا قضیہ۔ جو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی کا اصل باعث اور خود کشمیری عوام کے لئے لاتعداد مصائب کا سبب ہے۔

دو بڑی جنگیں ہو گئیں، ادھر ہندوستان اور پاکستان کی سرحد پر مسلح تصادم تقریباً مسلسل جاری ہے۔ کشمیریوں کی بغاوت کے سات سال ہو گئے اور ہندوستان کی حکومت ان کو برابر کچل رہی ہے۔ لیکن آفت زدہ کشمیریوں کی اس بے پایاں مصیبت نے نہ تو دہلی کو اور نہ اسلام آباد کو آمادہ کیا ہے کہ وہ اپنے موقف کو اس معاملے میں ہم آہنگ کریں۔

دہلی حکومت کا کہنا ہے کہ یہ مسئلہ حل ہو چکا، کشمیر ہندوستان کا اٹوٹ انگ ہے۔ وہ ہندوستان کے اس ''اندرونی معاملے'' میں پاکستان کی مداخلت پر اس کی مذمت کرتے ہیں اور وقتاً فوقتاً دھمکاتے رہتے ہیں۔ انہوں نے سات سال سے کشمیریوں کے حال پر ترس کھائے بغیر ان کی مزاحمت کو دبانے کی لا حاصل کوشش جاری رکھی ہے۔ ادھر اسلام آباد میں حکومت کا اصرار ہے کہ کشمیر ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے، جو حل طلب ہے اور اس کا تصفیہ رائے شماری کے تحت ہونا چاہیے۔ جس کے لئے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں ایک قرارداد 47 سال پہلے منظور کی گئی تھی۔ برسوں پرانی یہ صورت حال تبدیل نہیں ہوئی، اگرچہ دنیا بھر اور خود کشمیر میں بھی بہت نمایاں تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔

جہاں تک کشمیریوں کا تعلق ہے، دہلی اور اسلام آباد کے درمیان ایک خصوصیت مشترک ہے۔ دونوں ممالک کشمیریوں کی حقیقتوں کو اور ان کے مفادات کو اپنی مصلحتوں کے تابع سمجھتے ہیں۔ کشمیر کے سلسلے میں ان دونوں کے درمیان اس بنیادی اختلاف کو دیکھتے ہوئے، دونوں کے مواقف میں یہ یکسانیت اندوہناک ہے۔ سیاست کی اصطلاح میں اس کے یہ معنی ہیں کہ ہندوستان اس مسئلہ کو جیسا فی الوقت ہے، ویسا ہی رکھنا چاہتا ہے، یعنی اس وقت وہ اپنی پسند کے علاقے پر قابض ہے اور اس کی پالیسیوں کا مقصد یہ ہے کہ موجودہ علاقائی صورت حال قائم رکھے۔ دوسری طرف پاکستان کی حیثیت ایک ''انقلابی طاقت'' کی ہے، جو اس صورت حال کو بدل دینا چاہتی ہے۔

MashalBooks.org

کشمیراور فلسطین:

انیٹونو گرامچی (Antonio Gramsci) بیسویں صدی کے ایک بڑے نظریہ دان اور فلسفی ہیں۔ان کا کہنا یہ ہے کہ تدبر (ڈپلومیسی) اور جنگ کی حالت میں جو طاقتیں صورت حال کو بجنسہ برقرار رکھنا چاہتی ہیں' وہ 'موقف کی جنگ'' لڑتی ہیں۔یعنی بڑے صریح انداز میں اپنے دلائل طے کر لیتی ہیں اور اس پر ڈٹی رہتی ہیں۔ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کا موقف پہلے سے معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی کہ ان میں لچک کی گنجائش نہیں ہوتی۔اس کے برعکس ''انقلابی طاقتیں'' بہتر حیثیت میں ہوتی ہیں کہ 'تحریک کی جنگ جاری رکھیں' اپنی حکمت عملی میں لچک پیدا کرتی رہیں اور طے شدہ موقف پر قائم رہنے کی بجائے اسے بدلتی رہیں۔''

جب کوئی حکومت ایک انقلابی رویہ اختیار کرتی ہے' یعنی ایک مقررہ صورت حال کو بدلنا چاہتی ہے تو اس کے بعد اگر وہ بھی اسٹیٹس کو اپنا لے یعنی حالات کو جوں کا توں رکھنا چاہے تو اس طرح وہ اس فائدے سے جو اسے ابتداً حاصل تھا محروم ہو جاتی ہے اور پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ دشمن سے ہار جاتی ہے۔

اس کی مثالیں بہت ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال کافی ہوگی۔ یورپ کی جمہوریتوں نے عربوں کے فلسطین میں ایک یہودی ریاست قائم کرنے کی کوشش کی اور اس کے لئے مختلف محاذوں پر حرکت کی۔ لڑائی نہایت نازک انداز سے شروع کی' اس کے لئے انہوں نے بہت سوچ کر خطرات مول لئے اور اس طرح کبھی کبھی نہ صرف دشمنوں کو بلکہ دوستوں کو بھی حیرت زدہ رکھا اور یہودی ریاست ایک ایسی سرزمین پر قائم کر دی' جہاں یہودیوں کے پاس ایک ریاست کے قیام کا کوئی جواز موجود نہیں تھا۔عربوں نے موقف کی روائتی جنگ لڑی اور ہار گئے۔ 1949ء کے بعد صورت حال بدلی' انہوں نے انقلابی طریقہ اپنایا' یعنی اب کے اسرائیل کا مسلط کیا ہوا ''اسٹیٹس کو' رد کر دیا' لیکن عربوں کے طرف دار موقف کی لڑائی لڑتے رہے' اس میں پی ایل او کا فلسطین کے حریت پسندوں کی تنظیم بھی شامل تھی' یہاں تک کہ ایک مرحلے میں ان کے حوصلے پست ہو گئے اور غیرت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے انہوں نے اسرائیل کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔

یکساں کیفیتیں صرف قریب قریب ملتی جلتی ہوتی ہیں' کیونکہ دو تاریخی حالات بالکل ایک سے نہیں ہوتے۔اس کے باوجود عرب حکومتوں نے اپنے حق خود اختیاری کی لڑائی جس طرح لڑی ہے اور اسلام آباد کی حکومت نے کشمیر کے مسئلہ پر جو پالیسی اختیار کی ہے' ان میں خوفناک حد تک یکسانیت ملتی ہے' دونوں جگہوں پر گرم گفتاری بہت ہے۔جس میں حقائق کو سنجیدگی سے پرکھنے اور تجزیہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ عربوں کی طرح پاکستان میں بھی کوئی بھی اپنے مخالفوں کے وسائل' طریق کار اور ان کی حکمت عملی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔فلسطین ہو یا کشمیر' دونوں جگہ اپنے اپنے وسائل کو حرکت میں لانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اپنی لچک دار حکمت عملی اور قربانیوں کے بارے میں مفروضے قائم کر لئے جاتے ہیں۔سیاسی موقع پرستی' نجی عزائم پورا کرنے کی عجلت اور ملک کی اندرونی سیاست' نجی باتوں سے سیاست دانوں کی سرگرمیاں متعین

MashalBooks.org

ہوتی ہیں اور سرکاری اعلانات مرتب کئے جاتے ہیں اور پھر اس کو "پالیسی" تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ تدبر (ڈپلومیسی) کی حیثیت قانونی نوک جھونک کی ہوتی ہے اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کے حوالے ہی ڈپلومیسی سمجھ لئے جاتے ہیں۔ رویے میں تبدیلی کو پالیسی سازی سمجھا جاتا ہے اور اسے منوانے پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ دانش ور طبقہ یا تو انہی خوش آئند مفروضوں کو آگے بڑھاتا ہے یا خاموش ہو جاتا ہے۔

جب پالیسی پر بحث ہوتی ہے اور اسے مرتب کیا جاتا ہے تو سب کچھ بالکل فوجی مصلحتوں کے تحت سوچا جاتا ہے۔ اس وقت دشمن کے یا خود اپنے سیاسی اور اقتصادی معاملات کا غیر جذباتی انداز سے جائزہ نہیں لیا جاتا۔ یہ بھی نہیں دیکھا جاتا کہ جنگ کو جاری رکھنے کی خواہش کتنی ہے۔ اس وقت خوش فہمیاں' تجزیے کی جگہ لے لیتی ہیں۔ جوش وخروش کے اظہار کو بھی منصوبہ بندی اور حکمت سازی سمجھا جاتا ہے۔ فطری بات ہے کہ اس طرح غلط تخمینے لگائے جاتے ہیں اور جب لڑائی چھڑ جاتی ہے تو نتیجہ یا تو شکست ہوتا ہے' جیسا کہ عربوں کے ساتھ 1948ء اور 1967ء کی جنگوں میں ہوا اور 1972ء میں پاکستان کے ساتھ ہوا' جب اس کی ایک تہائی فوج نے ہندوستان کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور مشرقی پاکستان الگ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا یا ناموافق صورت حال میں پھنس جاتے ہیں۔ جیسا کہ 1965ء میں پاکستان کے ساتھ ہوا اور 1973ء میں مصر اور شام کے ساتھ ہوا۔ فلسطین اور کشمیر دونوں کے معاملے میں ایک قابل غور بات یہ ہے کہ متحارب فریقوں نے سپر پاورز کے کہنے پر اقوام متحدہ کی نگرانی میں جنگ بندی قبول کر لی اور اس کا خیر مقدم کیا۔ ظاہر ہے کوئی بھی فریق لڑنے پر تیار نہیں تھا۔ اس کے باوجود لڑائی بند ہو جانے سے امن کے لئے بامقصد مذاکرات کا نتیجہ نہیں نکلا۔ پی ایل او کے چپ چاپ ہتھیار ڈال دینے سے عربوں کے لئے غلط اندیشی اور لڑائی کا ایک شیطانی چکر شروع ہو گیا۔ مصر اور اردن کو صرف مساوی امن مل سکا اور شام اور لبنان ایک خطرناک الجھاوے میں پھنس کر رہ گئے۔ جنوبی ایشیا میں پاکستان اور ہندوستان' اپنے پرانے انداز سے چل رہے ہیں اور کشمیر اپنے تنازعے کے ساتھ ان دونوں کے بیچ میں پھنسا ہوا ہے۔

حقائق سے انکار

جب سے نہرو کی آزاد خیال' نوتشکیل حکومت نے ایک ظالم اور نفرت زدہ مہاراجہ ہری سنگھ کے انڈین آئین کے ساتھ الحاق کے فیصلے کو تسلیم کیا اور اس پر انحصار کرنا شروع کیا ہے' کشمیر میں ہندوستان کی مشکلات اور ناکامیابی بڑھتی گئی ہے۔ دہلی نے یہ تنازعہ اقوام متحدہ میں پیش کر دیا۔ اس کے بعد ہندوستان نے سلامتی کونسل کی اس قرارداد پر کاربند رہنے کا وعدہ کر لیا کہ کشمیر میں رائے شماری ہو گی اور کشمیریوں کو اجازت ہو گی کہ ہندوستان یا پاکستان' دونوں میں سے جس کے ساتھ چاہیں الحاق کا فیصلہ کریں۔ پھر اس نے اپنا عہد توڑ دیا۔

ان ابتدائی برسوں میں دہلی کا ایک ہی اثاثہ شیخ محمد عبداللہ کا تعاون تھا۔ شیخ عبداللہ اور ان کی پارٹی

MashalBooks.org

نیشنل کانفرنس' مہاراجہ کی نامقبول حکومت کی مخالفت کی بنا پر' کشمیر میں اراضی اور محنت کے شعبوں میں اصلاحات کے مطالبے کی وجہ سے کشمیری قوم پرستی کی علامت بن گئے تھے۔ جب وہ کشمیر کے وزیر اعلیٰ ہوئے تو 1950ء میں انہوں نے زرعی اصلاحات نافذ کیں' جس سے کشمیر کے نادار عوام کی بھاری اکثریت میں ان کی مقبولیت بڑھ گئی۔ لیکن جب انہوں نے زیادہ خود اختیاری کا مطالبہ کیا تو اس قومی ہیرو کو 1953ء میں قید کرلیا گیا۔ آزادی کے دو مختصر وقفوں کو نکال دیں تو وہ فروری 1975ء تک یعنی بائیس برس ہندوستان کے قیدی رہے۔ سال کے اس مہینے میں وزیر اعظم اندرا گاندھی کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد انہیں کشمیر کا وزیر اعلیٰ بنایا گیا۔

مسز گاندھی شیر کشمیر کے ناخن نکال لینے میں کامیاب رہیں' چنانچہ اب انہوں نے حکمران انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ اشتراک کرلیا تھا۔ اس دوسرے عرصہ حکومت میں شیخ کو اور ان کے جانشین فرزند فاروق عبداللہ کو صرف یہ آزادی حاصل تھی کہ کھلم کھلا مفاد پرستی کریں اور رشوت بٹوریں۔ اس سے کشمیریوں میں اشتعال پیدا ہوا اور انہیں سخت توہین محسوس ہوئی کہ ہندوستان نے ان کے پرغرور شیر کو کس طرح سدھالیا تھا۔ مزید یہ کہ انہیں نہ صرف یہ کہ حق خود اختیاری سے محروم رکھا گیا' جسے اقوام متحدہ نے تسلیم کیا تھا بلکہ اب وہ اپنی تاریخی کشمیر پارٹی (نیشنل کانفرنس) کو پارہ پارہ ہوتے ہوئے بھی دیکھ رہے تھے۔ گویا ان کے انفرادی تشخص پر ایک اور حملہ تھا اور جیسا کہ ان حالات میں ہوتا آیا ہے' ہندوستان کے تعلق سے کشمیریوں کی قوم پرستی میں مزید طاقت آ گئی۔

اس سیاسی بدنظمی سے قطع نظر ہندوستان نے کشمیریوں کی بیزاری کے اسباب معلوم نہ کئے جو ان کی تاریخ' معاشیات اور نفسیات میں پیوست ہیں۔ یہ مسئلہ فرقہ وارانہ نہیں ہے۔ حالانکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ پرست نظریہ ساز اس معاملے کو اس طرح دیکھیں گے۔ کشمیر میں نمایاں طور پر جو سماجی تبدیلیاں ہوئی ہیں' اس کے بعد ہی کشمیریوں میں بے چینی کی نئی لہر اٹھی ہے۔ شیخ عبداللہ اور بخشی غلام محمد کی حکومتوں نے کشمیریوں کو جاگیرداری کے تسلط سے آزاد کرایا اور ایک متوسط طبقے کے پیدا ہونے میں مدد دی۔ کشمیری نوجوانوں کی برابر بڑھتی ہوئی تعداد نے تعلیم حاصل کی' لیکن ان کی سماجی حیثیت پہلے ہی طرح رہی کیونکہ زرعی اصلاحات کے ساتھ کوئی بامقصد اقتصادی ترقی پیدا نہیں ہوئی اور تعلیم کی سہولتوں میں توسیع بھی بے حاصل رہی۔ عام طور پر بغاوتیں بالکل ناداروں سے نہیں بلکہ ان عناصر کی طرف سے شروع ہوتی ہیں جو تبدیلی سے توقعات وابستہ رکھتے ہیں۔

1989ء میں جو عام بغاوت شروع ہوئی اس کے اسباب کشمیر کے معاملے میں بے توجہی اور کشمیر کی سیاست کو بے ضمیری کے ساتھ استعمال کرنے کی کوششوں میں پیوست ہیں۔ اس کے باوجود ہندوستان اس علم بغاوت کا مقابلہ اس طرح کر رہا ہے' جو عام طور پر قابض حکومتیں کرتی آئی ہیں' یعنی بیرونی عناصر کی

MashalBooks.org

سازش کاالزام' شدید طاقت کا استعمال اور غیر قانونی ہتھکنڈے۔ اس کے علاوہ وہ حقیقت سے برابر انکار کر رہی ہے۔

کشمیر' تقسیم کے وقت:

حقیقت یہ ہے کہ نئی دہلی کی حکومت کا کشمیر کے عوام سے اخلاقی طور پر کٹ کر الگ ہو جانا' ایسی صورت حال ہے جواب تبدیل نہیں ہو سکتی۔ یہ تبدیل ہو سکتی تھی اگر ہندوستان کشمیر کے ساتھ اپنا رشتہ ایک مختلف انداز سے قائم کرتا' یعنی جس سے بامعنی طور پر کشمیریوں کے حق خود اختیاری اور ان کی امنگوں کی تشفی ہوتی' لیکن ہندوستانی حکومت ابھی اس طرف مائل نظر نہیں آتی' لیکن جو بات ہندوستان کے نقصان کی ہے کیا وہ ضرور پاکستان کے مفاد میں ہوگی؟ اس کا جواب ہے' جی نہیں۔ اگرچہ اسلام آباد میں پالیسی بنانے والے یہ جواب پسند نہیں کریں گے اور یہ کوئی انہونی بات بھی نہیں۔ مخالف ملکوں کے درمیان یہ بات بہت عام ہے کہ وہ ایک طرف کے نقصان کو دوسری طرف کا فائدہ سمجھ لیتے ہیں۔ اگرچہ تاریخ نے اس مفروضے کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ چنانچہ متحارب فریقوں کے نقصان اور فائدے شاذ ہی کبھی حاوی ہوتے ہوں' ان کا فیصلہ تاریخ' سیاست اور پالیسی کی بنیادوں پر ہوتا ہے' کشمیر کے معاملے میں ہندوستان کا ریکارڈ ناکامیوں سے بھرا ہوا ہے' لیکن ان میں سے کسی ایک سے بھی پاکستان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ پاکستان کی پالیسی کو جو نقصان پہنچا ہے' وہ اس کے اپنے نقائص کی وجہ سے ہے۔

کشمیر کے معاملے میں اسلام آباد کی پالیسی کی تین خصوصیات شروع میں ہی ظاہر ہو گئی تھیں۔ پہلی یہ کہ اگرچہ پاکستان کے پالیسی ساز جانتے ہیں کہ مسئلہ بنیادی طور پر سیاسی ہے' لیکن 1948ء سے ہی انہوں نے اسے فوجی طریقے سے حل کرنا چاہا۔ دوئم' اگرچہ فوجی نقطہ نظر حاوی رہا' لیکن ایک صحت مند خواہش یہ بھی رہی کہ اس کے لئے جنگ نہ کی جائے۔ تیسری بات یہ کہ کشمیر کے لئے حق خود اختیاری کی سرکاری پیروی کرتے وقت پاکستان کی حکومتوں اور سیاست دانوں نے ایسی پالیسیوں پر عمل کیا' جن میں کشمیر کی تاریخ اور تہذیب اور کشمیریوں کی امنگوں کو سرے سے نظر انداز کیا گیا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ کشمیر کے سلسلے میں پاکستان نے پے در پے اور نہایت سنگین طور پر غلط اندازے کئے۔ دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ کشمیر کے لوگوں نے بڑے اہم مواقع پر پاکستان سے لاتعلقی ظاہر کی۔ مثلاً 49۔1948ء میں 1965ء میں اور پھر 1990ء کی دہائی میں۔

پاکستان کی کشمیر پالیسی ناکام ہوتی رہی اور اس کے نقصانات بڑھتے گئے۔ 1948ء اور 1965ء کی جنگوں میں کشمیر کے سوال پر دوبارہ ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ پھر 1990ء کے عشرے میں ہلاکتوں کی تعداد بڑھتی آئی ہے۔ اسے خطرہ تھا کہ خدمتار کہ جنگ پر' جہاں اقوام متحدہ کی فوجیں نگرانی کر رہی

ہیں' ہلاکتیں ہوتی رہی ہیں اور دفاعی مصارف کا بوجھ کم نہیں ہوا ہے۔

کشمیر کی حالیہ تاریخ کا جائزہ لیں تو اسلام آباد کی ہولناک غلطیوں کو ان کے تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔ 1947ء-48 میں کشمیری مسلمانوں کو دونوں طرف سے کھینچا جا رہا تھا۔ ہندوستان کی تقسیم' اس کے بعد ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور کشمیر کی سیاسی معیشت جو پنجاب کے ساتھ جڑی ہوئی تھی ان سب باتوں سے پاکستان کی طرف ان کا جھکاؤ زیادہ تھا۔ تاہم کشمیری عوام کا نقطۂ نظر کشمیری قوم پرستی سے وابستہ تھا۔ جسے شیخ عبداللہ کی قیادت میں نیشنل کانفرنس نے ابھارا اور متحرک کیا تھا۔ شیخ صاحب ان لوگوں کی اور اس پارٹی کی طرف مائل تھے' جن کے ساتھ انہوں نے مل کر 1935ء سے سیاسی جدوجہد کی تھی' یعنی نہرو' ابوالکلام آزاد اور انڈین نیشنل کانفرنس۔ (وہ 1944ء تک محمد علی جناح سے نہیں ملے تھے) پھر مہاراجہ کی حکومت سے مسلمانوں کی عام نفرت کے باوجود کشمیری ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خوشگوار تعلقات موجود تھے۔

کشمیریوں کو ضرورت تھی کچھ وقت کی۔ ایک پرسکون عبوری زمانے کی تاکہ ایک دوگونہ صورت حال میں وہ کوئی فیصلہ کر سکیں۔ اس کا ان کو موقع ہی نہیں ملا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی احمقانہ عجلت کے باعث برصغیر کو تقسیم کر دیا گیا اور اقتدار کو پے درپے حیران کن حالات کے حوالے کر دیا گیا۔ ایسے پیچیدہ تفصیلی معاملات' جن کا تعلق دور کے علاقوں سے تھا' ان پر غور کرنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ مسلم لیگ کی قیادت بالخصوص اقتدار کی منتقلی کے مسائل میں الجھی ہوئی تھی' یعنی املاک کی تقسیم' خانہ جنگی اور تبادلہ آبادی کے مسائل۔ لیگ میں تجربہ کار لیڈروں کی بے حد کمی تھی اور ناتجربہ کار لوگ اپنی ناکافی اہلیت سے مسائل نپٹا رہے تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح مسلسل بیمار چلے آ رہے تھے۔

بحران اور مقابلے کے اس دور میں کشمیر پر پوری توجہ نہیں دی گئی' کچھ توجہ اگر کسی نے کی تو یہ وہ لوگ تھے جو کشمیری عوام کی امنگوں سے لاعلم اور بےخبر تھے۔ اس کی دوطرفہ نوعیت کا بھی انہیں علم نہ تھا۔ ان کی راہ میں جو غیرمعمولی خطرات اور ترغیبات تھیں' ان کا بھی کوئی ادراک نہیں تھا۔ غلام محمد جیسے خودغرض ملازم سرکار اور نوآبادیاتی حکومت کے اہلکاروں نے جو گورنر جنرل پاکستان کے عہدے تک پہنچ گیا تھا' اپنی کج فہمی کی بنا پر کشمیر کے مقابلے میں حیدرآباد (دکن) کے معاملے پر جس میں کامیابی کی امید نہ تھی اور جو اس کا مستحق بھی نہ تھا' زیادہ توجہ کی۔

ہندوستان کے وزیر داخلہ سردار ولبھ بھائی پٹیل نے جب حیدرآباد اور کشمیر کے معاملے میں ممکنہ لین دین کا بالواسطہ پیغام غلام محمد کو بھجوایا تو اس نے موقع کو گنوا دیا اور نظام حیدرآباد کے ساتھ نفع بخش سودے بازی میں مصروف رہا۔ پاکستان نے جوناگڈھ اور مناوادر کے الحاق کا بھی خیر مقدم کیا' حالانکہ ان دونوں ریاستوں میں (اور حیدرآباد میں بھی) آبادی کی اکثریت ہندو تھی۔ عملاً پاکستان نے تین مختلف موقف اختیار کئے۔ نظام حیدرآباد کی جانب سے آزادی کے حق کی تائید' جوناگڑھ کا یہ حق کہ وہ آبادی کی اکثریت کی منشا

کے خلاف پاکستان سے الحاق کا اختیار رکھتا تھا اور کشمیر کے عوام کا حق خود اختیاری۔ دہرا موقف اختیار کرنا سیاست کی عام روش ہے' لیکن جو ملک اس کے نتائج کو رد کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا' اس کو لازماً اس کا نقصان ہوتا ہے۔ نواب جوناگڑھ نے اپنی ہندو آبادی کو پاکستان کی ریاست میں لانے کی کوشش کی اور اس طرح مہاراجہ کشمیر کے لئے جہاں آبادی کی اکثریت مسلمانوں کی تھی' ایک مثال قائم کر دی کہ وہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کر لے۔ پاکستان کے پاس اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ نواب یا نظام کا دفاع کر سکے' نہ اس کا ارادہ تھا کہ مہاراجہ کو اس کے کئے کی سزا دے' نتیجہ یہ کہ ہندوستان نے جو دہرے معیارات پر کاربند تھا' اپنی باری آنے پر سب کچھ سمیٹ لیا۔

منافع کا کاروبار

پاکستان سے کچھ کم حماقتیں ہندوستان کی پالیسیوں میں بھی سرزد نہیں ہوئیں۔ کشمیر کے سوال پر اس کی اخلاقی تنہائی مسلمہ ہے۔ اب یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ وہ فوجی طریقوں سے یا سیاسی حرفت بازی سے اس حالت پر قابو پا لے۔ کشمیر کے مسلمانوں کے درمیان نئی دہلی کو اپنے وجود کا کوئی جواز دکھائی نہیں دیتا۔ ایک المیہ یہ ہے کہ کشمیر پر ہندوستان کا موقف جوں جوں ناقابل دفاع ہوتا جا رہا ہے' خود کشمیری اپنی آزادی کی منزل سے دور ہوتے جا رہے ہیں' اتنے دور تو وہ 1982ء سے 1992ء تک کے زمانے میں نہیں تھے۔

کشمیر میں پاکستان کا ملوث ہونا بالواسطہ ہے اور اس کی شمولیت کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس طرح ہندوستان اور کشمیر کے لیڈروں کے معاملے میں اس کا سیاسی موقف زیادہ لچکدار ہے اور اس میں زیادہ حکمت عملی برتنے کی گنجائش ہے۔ پاکستان میں باخبر اصحاب رائے کی جانب سے خیالات میں تدبر کا اظہار' نئی دہلی کے مقابلے میں زیادہ لچک دار موقف کا پتہ دیتا ہے۔ نئی دہلی میں دائیں بازو کی ہندوتوا کا وزن آزاد رائے رکھنے والوں کے کاندھے کا بوجھ بن گیا ہے۔ علاوہ ازیں مختلف اسباب کی بنا پر کشمیریوں کی زیادہ تعداد میں پاکستان کے لئے قبولیت' طاقت ور گروہوں کی طرف سے کشمیریوں کے لئے مادی امداد اور ان کے لئے بین الاقوامی تائید' ان سب وجوہ سے پاکستان اپنے اختیار کو اس سے کہیں بہتر انداز میں استعمال کرنے پر قادر ہے۔ جتنا بیشتر مبصر قیاس کرتے ہیں۔ البتہ "ہمارے اصولی موقف" کی تھکا دینے والی تکرار کے سوا اسلام آباد کے پاس کوئی ایسی قابل عمل پالیسی نہیں ہے' جسے وہ سودمند طور پر استعمال کر سکے۔ اس وقت تک پاکستان اور آزاد کشمیر کی حکومتوں نے کشمیر کے سوال پر بین الاقوامی حمایت حاصل کرنے کے لئے کروڑوں ڈالر خرچ کر دیئے ہیں۔ کشمیر کی سات سالہ بغاوت کے دوران اقوام متحدہ کی طرف سے استصواب کی سفارش اور اس کی حمایت میں اسلام آباد کی سرپرستانہ لابی سے بھی کسی طرح کا بین الاقوامی تعاون اسے حاصل نہیں ہوا۔ ساری کوششوں کے باوجود پاکستان کا حاصل صفر رہا ہے اور یہ سب کچھ سابق وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے

طویل عالمی دوروں اور پنجابی سیاست دان نواب زادہ نصر اللہ خاں کے زیر قیادت وفود کے باوصف ہوا' جو مستقل طور پر سفر میں رہتے ہیں۔

سلامتی کونسل نے چند ماہ قبل کشمیر کے مسئلہ کو اپنے ایجنڈے سے خارج کر دیا اور یہ محض پاکستان کی گزشتہ پرزور سفارش سے ہوا کہ یہ فیصلہ عارضی طور پر ملتوی کر دیا جائے۔ پاکستان نے زیادہ سے زیادہ جو کچھ حاصل کیا ہے' وہ محض یہ ہے کہ اسلامی ممالک کی تنظیم سے موافقت کی قراردادیں منظور کروالی گئیں۔ یہ تنظیم عالمی سیاست میں اتنی ہی با اثر ہے' جتنا ریگ زار عرب کا اونٹ۔ لہٰذا کشمیر کا مسئلہ پاکستان میں موقع پرستوں اور خیر خواہی تلاش کرنے والوں کے لئے' ان میں مذہبی عناصر بھی شامل ہیں اور سیکولر بھی' پارلیمانی ارکان بھی شامل ہیں اور نجی افراد بھی' ایک نفع بخش ذریعہ بن گیا ہے۔

حاصل یہ کہ پاکستان نیم دلی کے ساتھ ایک "موقف کی جنگ" لڑ رہا ہے' جس میں نجی شکوک بھی شامل ہیں۔ علامتی' خودستائی بھی اور گھٹیا موقع پرستی بھی۔ اس کی حمایت سے کشمیر کے اندر ہونے والی بغاوت کو متحدہ رکھنے' اسے تیز تر کرنے میں اور کامیاب بنانے میں کوئی مدد نہیں ملی۔ لہٰذا جو رکاوٹ کھڑی ہوگئی ہے' وہ مستحکم دکھائی دیتی ہے اور ہندوستان اور پاکستان کی روایتی لڑائی کی عدم موجودگی میں اس صورت حال کی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں' چونکہ اس نے جنگ کا حربہ اختیار نہیں کیا' لہٰذا اس کی پالیسی بس یہی رہ گئی ہے کہ ہندوستان کشمیر میں پھنسا رہے اور اس کا خون بہتا رہے اور ہندوستان کی پالیسی یہ ہے کہ کشمیریوں کا خون بہتا رہے اور جب ممکن ہو تو پاکستان کو ایک چرکا لگا دے۔

بٹی ہوئی مزاحمت

موجودہ صدی میں ہونے والی آزادی کی جنگوں سے ظاہر ہے کہ وہ بنیادی طور پر سات ابتدائی اور چار ثانوی اسباب کی بنا پر کامیاب ہوتی رہیں۔ بنیادی اسباب میں شامل ہے' اخلاقی قوت سے حکمرانوں کی بڑھتی ہوئی محرومی اور آزادی کی جدوجہد کے لئے عوام کی حمایت' ایک مضبوط اور متحدہ باغیانہ قیادت اور موثر تنظیم' سیاست کی بالادستی اور فوج کا سیاسی قیادت کے تابع ہونا' باغی تنظیم کی یہ اہلیت کہ وہ مقتدر انتظامیہ کے مقابلے میں بہتر انتظام پر قادر ہو' باغیوں کی جانب سے مقصد کا واضح ہونا اور اس پر مکمل اتفاق رائے' نظریے اور تحریک کے درمیان مکمل ہم آہنگی' آبادی کا موروثی کلچر اور آخر میں غیر ممالک سے ملنے والی مدد' جو بغاوت کو اخلاقی طور پر برقرار اور بین الاقوامی رائے عامہ کو متحرک رکھے۔ ثانوی عناصر میں طویل جنگ کو جاری رکھنے کے لئے ضروری انتظامات' جدوجہد کی سرزمین کا موافق ہونا' خوراک اور اسلحہ کی باقاعدہ بہم رسانی اور علاقے سے باہر کی پناہ گاہیں' جن پر بھروسا کیا جا سکے۔

تحریکیں عام طور پر وہی کامیاب ہوئی ہیں' جن کو اوپر بیان کی ہوئی بنیادی سہولتیں حاصل تھیں' نہ

کہ ثانوی خصوصیات۔افغانستان میں روسی مداخلت کے خلاف مجاہدین کی تحریک اس لئے کامیاب سمجھی گئی کہ اپنی منفرد حیثیت سے اسے ثانوی درجے کی خصوصیات بھرپور انداز سے حاصل تھیں' حالانکہ ابتدائی نوعیت کے اسباب اسے میسر نہ تھے۔تاہم ان کمزوریوں کی تلافی امریکہ' سعودی عرب' ایران اوران سب کے سوا پاکستان کی فراخدلانہ امداد سے ہوگئی۔اس کے باوجود جب سوویت یونین افغانستان سے نکل گیا تو مجاہدین ٹکڑیوں میں بکھر گئے اور جنرل نجیب اللہ کابل پر حکومت کرتے رہے۔ دہلی میں ایک سن رسیدہ مدبر نے کہا کہ 'وادی میں پاکستان کی خوفناک غلطیوں کا سبب یہ ہے کہ وہ افغانستان کے انوکھے تجربے کے حوالے سے کشمیر کی مخالف صورت حال کو سمجھ ہی نہیں سکا۔''

کشمیر کے موجودہ حالات پر نظر ڈالیں تو کچھ افسوسناک نتائج سامنے آتے ہیں۔ 1989ء میں جب وہاں بغاوت شروع ہوئی تو وہ بہت مقبول تھی۔اس کی جڑیں سیاست میں پیوست تھیں اورتحریک ایک بااثر پارٹی جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ کے گرد مرکوز تھی۔اب اس میں کوئی تیں گروہ شامل ہو گئے ہیں' جونظریاتی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور نہ صرف آپس میں مقابلہ کر رہے ہیں بلکہ ایک دوسرے کی کاٹ بھی کرتے ہیں' ایسے میں کہ بیک وقت سب آزاد ہیں۔ ہندوستان میں بغاوت کوفرو کرنے والی انتظامیہ نے میدان میں اپنے کھلاڑی بھی چھوڑ دیئے ہیں'ان میں سب سے زیادہ طاقت وراور بدنام گروپ وہ ہے جس کی قیادت کوکاپارے (Kuka Parray) کے پاس ہے۔اس نے کشمیریوں کے مضبوط مراکز میں جہاں مزاحمت کامیابی سے چل رہی ہے'نمایاں انداز سے اپنی جگہ بنائی ہے۔

مزاحمت کی تحریک میں فوجی عنصر اس قدر داخل ہوگیا ہے کہ مسلح گروہوں نے سیاسی عناصر پر اولیت حاصل کرلی ہے۔ 1989ء سے 1992ء کے دوران میں متوازی قیادتیں تیار کی گئی تھیں۔عدلیہ' پولیس اورانتظامیہ الگ الگ شعبے بنالئے گئے تھے'اب جب سے فوجی کارروائی میں شدت آئی ہے اور مزاحمتی گروہوں کی تعداد تیزی سے بڑھی ہے'مذکورہ شعبوں کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔

بظاہر جو کچھ بھی ہو'لیکن دراصل کشمیر کی مزاحمتی جدو جہد اپنے مقاصد کے معاملے میں بہت بٹی ہوئی ہے۔ پاکستان کا حامی گروہ ہے'اس کے ساتھ آزادی کے حامیوں کا گروہ ہے۔پھر اسلام پسند اوراس کے مقابل سیکولر عناصر ہیں ۔ان سب میں ہندوستان کی مخالفت کے سوا کوئی بات مشترک نہیں ۔ان کے درمیان تعاون اورعملی روابط اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔استثنائی حالتوں سے قطع نظر' مزاحمتی گروہ کے اندر چند نظریہ دان' جن میں سے کچھ پاکستان کی اسلامی پارٹیوں سے روابط رکھتے ہیں' کشمیریوں کے سیاسی کلچر کے منافی عمل میں سرگرم ہیں۔اس کلچر میں دنیاداری اورسب کو ساتھ ملا کر چلنے کا انداز ہے'اوراس کی بنیادیں اسلامی شریعت کے مقابلے میں صوفی مسلک میں پائی جاتی ہیں۔

کشمیریوں کے لئے اندرونی صورت حال حوصلہ شکن ہے'لیکن اتنی ہی حوصلہ شکن پاکستان سے

ملنے والی خبریں ہیں۔ کراچی میں تشدد، سرکاری تحویل میں لوگوں کا قتل، محلوں کے محاصرے، الزام عائد کرکے مقدمہ چلائے بغیر افراد کو قید میں رکھنا اور طاقتور گروہوں کی جانب سے بھتے کی وصولی۔ یہ سب آج کل وادی کے اندر کے تجربوں سے ملتی جلتی ہیں۔ اسلام آباد میں ایک ممتاز کشمیری دانشور نے جو پچاس سال تک پاکستان کا پرجوش طرف دار رہا ہے، تشویش کے لہجے میں بتایا کہ کشمیری پاکستان سے ٹوٹ کر دور ہو جاتے رہے ہیں۔ لسانی جھگڑے، کرپشن کی کہانیاں، فرقہ وارانہ تشدد کی وارداتیں اور سیاسی دھڑے بازی، ان سب باتوں کے پیش نظر پاکستان کو منتخب کرنے میں کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ اس کے علاوہ آزاد کشمیر کوئی ایسا نمونہ نہیں ہے جس کے لئے چالیس ہزار جواں سال کشمیریوں نے اپنی جانوں کی قربانی دی تھی۔

سری نگر کے ایک دانشور نے دہلی پہنچنے پر ایک بار کہا: ''ریاض کھوکھر صاحب (دہلی میں پاکستان کے ہائی کمشنر) جب کشمیر کی بات کرتے ہیں تو میں پلٹ کر کراچی کا حوالہ دیتا ہوں۔''

ایک خاتون پروفیسر کہتی ہیں: ''ہندوستان ہمارے لئے ایک خراب تجربہ ثابت ہوا۔ اب پاکستان بھی کچھ بہتر نہیں رہا۔ ہم تھرڈ آپشن (تیسری ترجیح یعنی آزادی) چاہتے ہیں۔''

اس طرح کشمیریوں کی امنگیں اب ایک نعرے کے گرد جمع ہو گئی ہیں۔ یہ ہے آزادی۔ پاکستان کے پالیسی سازوں اور کشمیر کی جدوجہد میں پاکستان کے طرف داروں کو یہ اعتراف کر لینا چاہیے کہ اس نعرے کے معنی ہیں ''اب کشمیری بولنے والوں میں رائے شماری کے مطالبے میں کوئی جوش و خروش نہیں رہا، کیونکہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہندوستان کی حکمرانی کے بدلے پاکستان کی حکمرانی قبول کر لی جائے۔''

پاکستان کے اندر اور پاکستان کے باہر بھی میں نے بہت سے کشمیریوں سے ملاقاتیں کیں، لیکن مجھے ایک بھی ایسا کشمیری نہیں ملا جو کشمیر کو 1947ء کا نامکمل ایجنڈا قرار دیتا ہو۔ ایک کشمیری دانشور نے جن کا تعلق سری نگر سے ہے، امریکہ میں دوران گفتگو کہا: ''مشرقی پاکستان خاصی خون ریزی کے بعد مغربی حصے سے الگ ہو گیا۔ قائداعظم کی مسلمان قوم اب تین آزاد ریاستوں میں بٹ گئی ہے، پھر وہ کون سا تقسیم کا نامکمل ایجنڈا رہ گیا ہے، جسے ہم کشمیریوں سے پورا کیا جائے گا۔''

اس کے علاوہ اگر کشمیر کسی روز معجزانہ طور پر پاکستان میں شامل ہو بھی گیا تو اس کے ساتھ بھائی چارہ اور یگانگت پیدا ہونے کا امکان بہت کم ہو گا، وہ اس لئے کہ کشمیر میں قوم پرستی سندھ، بلوچستان یا پختونوں یا اردو بولنے والوں کے مقابلے میں بہت گہری ہے۔ پاکستان کی ریاست میں وہ اسی حساب سے اپنی قومیت کا اظہار کرے گی اور اس سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ، جس کا پاکستان کے سیاست دان تصور کرتے ہیں۔ اس مرحلے میں داخل ہونے کے بعد پاکستان کو محسوس ہو گا کہ اس نے وہ جوتا پہن لیا ہے، جو پہلے ہندوستان کے پاؤں میں تھا۔

درحقیقت اس زبردست تصادم کے پہلے ایکٹ کے لئے اسٹیج تیار ہو گیا ہے۔ یہ ہے آزاد کشمیر،

جس کے بارے میں بیشتر کشمیری بولنے والوں کا خیال ہے کہ وہ پنجابیوں کے ماتحت ایک صوبہ ہے' جس نے "اصل کشمیریوں" کو اقتدار اور مراعات سے خارج کر رکھا ہے۔ بہت کم کشمیری اپنے آپ کو آزاد کشمیر سے منسوب کرتے ہیں۔ ایک ریٹائرڈ سرکاری افسر نے' جنہوں نے مظفر آباد حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر کام کیا ہے' کہا: "پاکستانی حکام نہایت اعلیٰ مدارج میں بھی کشمیر کی تاریخ اور کلچر سے اپنی خوفناک لاعلمی کا ثبوت دیتے اور یوں ہمارے زخموں پر نمک چھڑکتے ہیں۔ ان کی یہ لاعلمی ہمارے احساسات کو شدید صدمہ پہنچاتی ہے۔"

حضرت بل کی مسجد کے حوالے سے اس وقت ایک بحران پیدا ہوا' جب ہندوستانی فوج نے کچھ نوجوانوں کو پکڑنے کے لئے مسجد کا محاصرہ کر لیا۔ اس موقع پر کشمیریوں کو ایک بار پھر اس بات کا موقع ملا کہ اسلام آباد سے اپنی بیگانگی کے سوال پر غور کریں۔ سابق وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے اس دوران میں حضرت بل کے مقبرے کو بار بار "حضرت بال" کہا۔ ان سابق افسر اعلیٰ نے کہا: "میرا خیال ہے' وہ اس طرح سوچتی ہیں کہ مقبرے میں چونکہ حضور پیغمبر کا بال محفوظ ہے' اس لئے "حضرت بال" کہتے ہیں۔ حالانکہ "بال" کشمیری زبان کا ایک لفظ ہے' جس کے معنی ہیں ہمسائیگی۔ لوگ وہاں اپنی جانیں دے رہے ہیں اور موصوفہ یہ بھی نہیں جانتیں کہ اس لفظ کے معنی کیا ہیں اور اسے کس طرح بولتے ہیں۔"

نامکمل ایجنڈا

کشمیر کے حصے میں پاکستان نے جو غلطیاں کی ہیں' اس کا علم بتدریج لوگوں کو ہوتا جا رہا ہے۔ اگرچہ صحیح ادراک اب بھی نہیں۔ حال ہی میں ریٹائرڈ سول اور فوجی افسروں کی ایک تنظیم نے اسلام آباد میں مسٹر ایم پی بھنڈارا کو مدعو کیا۔ یہ صاحب پاکستان کے ایک ممتاز تاجر اور پارلیمنٹ کے سابق رکن ہیں۔ ان سے کہا گیا کہ کشمیر اور اس سے منسلک موضوعات پر کچھ گفتگو کریں' جو کچھ انہوں نے کہا' اس کا مختصر متن ایک مضمون کی صورت میں روزنامہ ڈان میں شائع ہوا۔ انہوں نے کہا: "کشمیر کا خون بہتے ہوئے دیکھنا' (جیسا کہ فی الوقت ہو رہا ہے۔) اخلاقی طور پر ایسا ہی ہے جیسے ٹریفک کے حادثے میں ایک شخص کو مرتا ہوا دیکھ رہے ہیں' کیونکہ ابھی پولیس کارروائی نہیں ہوئی۔" انہوں نے کہا: (کشمیریوں کے مصائب کم کرنے کے سلسلے میں اسلام آباد کی پالیسی کشمیریوں کی امنگوں سے ہم آہنگ ہونی چاہیے۔) انہوں نے مزید کہا: "پالیسی بنانے والوں کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے تحفظ اور فلاح پر ان کی پالیسی کے اثرات مجموعی طور پر کیا مرتب ہوتے ہیں۔ مسٹر بھنڈارا نے ہندوستانی صحافی کلدیپ نیر کے اس مشورے سے بھی اپنی دلچسپی کا اظہار کیا کہ ٹریسٹ (Trieste) قسم کا ایک حل تلاش کرنا چاہیے' جس کے مطابق خط متارکہ جنگ کے دونوں جانب دونوں کشمیروں کو زیادہ حق خود اختیاری تفویض کیا جائے۔

کشمیر کے سوال پر پاکستان میں عام طور پر اس طرح کی باتیں نہیں ہوتیں' چنانچہ امید کی جا رہی تھی کہ سابق سرکاری حکام مقررے اس مسئلہ پر خوب جرح کریں گے۔ اس کے بجائے ان کا ردعمل معتدل تھا۔ دانشوارانہ تھا اور وہ بالعموم مسز بھنڈارا سے متفق نظر آ رہے تھے۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے: ''کشمیر کے سوال پر ہماری سوچ اور چرب زبانی اب بہت پرانی ہو چکی ہے کشمیر کے حوالے سے تقسیم کے نامکمل ایجنڈے پر انہوں نے کہا: ''یہ دعویٰ جو بہ اصرار کیا جاتا ہے' کیا ہم نے اس کے عواقب پر کبھی غور کیا؟ اگر کشمیر کے ایجنڈے کو تقسیم ہند کے طریقے سے پورا کیا گیا تو اس وقت کیا ہوگا؟ کیا کشمیر کو مذہبی خطوط پر تقسیم کیا جائے گا؟ کیا تقسیم شدہ کشمیر میں غلط طرف پھنسے ہوئے لوگ اسی طرح بڑے پیمانے پر ہجرت کریں گے' اور اس طرح کشت وخون ہوگا؟ اس سے علاقے کے امن کو کتنا فائدہ پہنچے گا؟ اس سے پاکستان کے تحفظ میں کتنا اضافہ ہوگا؟''

ایک سابق فوجی افسر نے کہا: ''ہمیں اپنا ہوم ورک کرنا چاہیے' جو ہم نہیں کرتے۔ ہمارے مقابلے میں ہندوستان کا موقف کم جامد ہے۔ اب وہ کشمیر کو داخلی خودمختاری دینے کے لئے بھی تیار ہو رہا ہے۔ پریشان حال کشمیریوں کے لئے کسی وقت یہ تجویز زیادہ پرکشش ہو سکتی ہے۔ ہندوستان کی حکمران اشرافیہ کو کم نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ بڑی باریک بین ہے' پالیسی بنانا اور اسے نافذ کرنا اسے آتا ہے اور اس کا سیاسی نظام زیادہ مستحکم ہے۔

یہ باتیں 1997ء کی ہیں۔ اس طرح کے خیالات آج کل پاکستان میں عام ہیں' اگرچہ ان کو بڑے پیمانے پر پھیلایا نہیں جاتا۔

شرم اور اخلاقی بوجھ

کشمیر کے الجھے ہوئے مسئلہ کو حل کرنے کی جانب پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ تینوں فریقوں کی خواہشوں کو اور ان کے اندیشوں کو سمجھا جائے۔ یہ فریق ہیں' ہندوستان' پاکستان اور کشمیری۔ ہندوستان کی خواہش علاقائی تصرف ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ وادی میں اور جموں و لداخ پر اپنی حاکمیت قائم کی جائے۔ چین کے حوالے سے وہ اس علاقے میں اپنا تصرف برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ ہندوستانی حکومت محسوس کرتی ہے کہ وہ چین کے دوست پاکستان کو اس اہم مقام کو اپنے قبضے میں لینے کی اجازت نہیں دے سکتی۔

پاکستان کے عزائم بھی علاقائی نوعیت کے ہیں۔ اس کے عزائم کو مزید تقویت اس شدید احساس سے ملتی ہے کہ اس کے ساتھ بے انصافی کی گئی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن اور ان کے اہلکاروں نے ہندوستان کے لئے جموں اور کشمیر تک رسائی کا راستہ دینے کی سازش کی تھی۔ کشمیر میں ہندوستانی فوج کی موجودگی پاکستان کے لئے خطرناک ہو سکتی ہے' اس کے لئے اسے وسیع دفاعی بندوبست کرنا ہوگا۔ ہندوستان' پاکستان کے

دریاؤں کا جو اس کے لئے ایک جان کی حیثیت رکھتے ہیں' راستہ روک سکتا ہے۔ ہندوستان کے غیر قانونی قبضے کو چپ چاپ مان لینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے ایک بڑے ہمسایے کی دھمکیوں کے آگے سر جھکا دیا۔ مزید یہ کہ ہندوستان کے خلاف کشمیریوں کے احتجاج اور بغاوتیں پاکستان کو بھی یہ اجازت نہیں دیں گی کہ وہ کشمیریوں کے حق خود اختیاری کی وکالت سے دست کش ہو جائے۔

جہاں تک کشمیری بولنے والی اکثریت کا تعلق ہے' جس طاقت نے انہیں متحرک رکھا ہے' وہ بجا طور پر ان کا احساس مظلومیت ہے' ایک احساس جو کشمیریوں کی تاریخ میں پیوست ہے' لیکن جس میں اضافہ گزشتہ برسوں کے اندر ہندوستانی حکومت کے شدید تشدد کے باعث ہوا ہے۔ اس کی سیکورٹی فورس کی زیادتیاں اور کشمیر کی معیشت کی تباہی' ایسی نہیں کہ بھلا دی جائیں۔ مزید یہ کہ کشمیری قوم پرستی کی ایک مضبوط بنیاد اس کی ایک منفرد زبان اور کلچر ہے' مشترک تاریخی یادیں ہیں اور سب سے جداگانہ جغرافیائی اور ماحولیاتی کوائف ہیں۔ کشمیری بھی اپنے آپ کو منقسم اور منتشر قوم سمجھتے ہیں۔ یہ تصور ان کے اندر اتحاد اور آزادی کی امنگوں کو دوچند کر دیتا ہے۔

چونکہ کشمیری بولنے والوں کی بھاری اکثریت ہندوستان کے قبضے میں رہتی آئی ہے' اس لئے ہندوستان کو وہ اپنا ظالم آقا سمجھتے ہیں اور پاکستان کو اپنا قومی نجات دہندہ۔ تاہم ان کی امنگوں کا مرکز بڑی حد تک آزادی ہے۔ ان کی اس خواہش کی تشریح ''دو قومی نظریے'' کے تحت نہیں کی جا سکتی۔ وادی کشمیر قوم پرستی کے جذبے کی اٹھان کا علاقہ ہے۔ یہ ''کشمیریت'' کا گھر ہے۔ ہندوستان اسے دبا نہیں سکتا۔ پاکستان بھی اسے اپنے اندر جذب نہیں کر سکتا' لیکن بہر حال اسے اپنے اندر سموتا تو ہے۔

یہ تینوں فریق ایک دوسرے سے پیٹھ موڑ کر کسی اندھی گلی میں کھڑے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں یہ اہلیت ہے اور بظاہر وہ اس کے لئے آمادہ بھی ہیں کہ اس راہ میں غیر معین عرصے تک کھڑے رہیں۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مایوسی اور تھکن سے چور ہو کر وہ ایک دن پلٹ پڑیں اور ایک دوسرے سے دھینگا مشتی شروع کر دیں۔ کشمیری اس قضیے میں چونکہ سب سے کمزور فریق ہے' اس لئے سب سے نازک حیثیت اسی کی ہے۔ اب اس کا انتخاب مجبوری کا سودا ہوگا۔ یعنی یا تو وہ خود کو ہندوستان کے حوالے کر دے اور علامتی نوعیت کی جو بھی رعایتیں اسے اپنے ظالم سے ملتی ہیں' انہی پر قناعت کریں یا اپنی مزاحمت جاری رکھیں' خواہ وہ کتنی ہی منتشر صورت میں کیوں نہ ہو۔ تاریخ ستم زدہ عوام کی ایسی مثالوں سے بھری ہوئی ہے' جنہوں نے یہی کیا اور اس کے لئے بڑی بھاری قربانیاں دیں۔ شرم اور اخلاقی بوجھ ہمیشہ ظالموں کے حصے میں آیا ہے۔

معاشرے میں حکومت کرنا ایک چیز ہے اور ایک خلقت کو اپنے ظلم سے ہراساں رکھنا دوسری چیز۔ اگر کوئی شخص ان دونوں صورتوں کے درمیان فرق کو ملحوظ رکھتا ہے تو ہندوستان کی کشمیر پر حکمرانی ختم ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں اس کے پاس تین راستے ہیں۔ ایک یہ کہ اپنے ظلم کے ساتھ کشمیر پر مسلط رہے اور یہ

MashalBooks.org

امید کرنا جائے کہ ایک دن آئے گا جب کشمیری مدافعت ترک کر کے بالآخر اطاعت قبول کر لیں گے۔ دوئم کشمیری لیڈروں کے ساتھ ان کی شرائط کے ساتھ بات چیت کرے۔ تیسرے پاکستان کے ساتھ پوری سنجیدگی کے ساتھ مذاکرات کرے اور کشمیر کے باغیوں سے بھی بات کرے، جن کے تمام دھڑے جو آل پارٹی حریت کانفرنس کے تحت ہیں، متحد ہیں۔ ان کے علاوہ ایک چوتھا راستہ بھی ہے۔ یعنی ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک اور جنگ ہو۔ لیکن جہاں تک کشمیر کے تصفیے کا معاملہ ہے، یہ جنگ غیر حقیقت پسندانہ ہوگی۔

ہندوستان کی موجودہ پالیسی پہلے طریقے کا انتخاب ہے، جسے کچھ نیا پن دیا گیا ہے۔ اس کے تحت کشمیر کے لئے زیادہ خودمختاری کے مبہم وعدے کئے گئے ہیں اور یہاں دوبار انتخاب بھی ہو چکے ہیں۔ اگرچہ اس چال کو امریکہ کی مدد حاصل تھی، لیکن حریت کانفرنس کے کسی ایک لیڈر نے بھی اس میں دلچسپی نہیں لی۔ کیونکہ کشمیری لیڈر ہندوستان کے پرفریب وعدوں پر بھروسا نہیں کرتے اور پاکستان نے بھی اس انکار میں ان کی ہمت افزائی کی۔ دوئم، دو عاجلانہ انتخابات، ایک جون میں انڈین پارلیمنٹ کے لئے اور دوسرا ستمبر میں کشمیر کی قانون ساز اسمبلی کے لئے، ان دونوں میں فاروق عبداللہ وزیراعلیٰ کے عہدے پر واپس آ گئے۔ بوڑھے شیر (شیخ عبداللہ) کے یہ بیٹے جو اعتبار سے محروم ہونے کے ساتھ بڑھاپے کی طرف مائل ہیں، اپنی گزشتہ بددیانت حکومت کے تعلق سے اور اس لئے بھی کہ انہوں نے نئی دہلی سے گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔ عوام کی نظروں سے گر چکے ہیں اور لوگ ان سے شدید نفرت کرتے ہیں۔

ہندوستان کا انتخابی ڈھونگ چلنے والا نہیں، بلکہ جس طرح الجزائر اور ویت نام میں ہوا۔ ان انتخابات کے بعد چند ہی مہینوں کے اندر تلخی اور بیزاری کا ایک اور دور شروع ہو جائے گا۔ اس وقت امکان یہ ہوگا کہ پاکستان اور کشمیر کے لیڈروں کو سیاست اور تدبر میں زور آزمائی کا ایک اور موقع مل جائے۔ اب اگر وہ ایک اور موقع حاصل کرنے سے محروم رہے تو ان کے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھوں میں وہی پرانے اور غیر استعمال شدہ کارڈ ہوں گے۔ اس طرح کی ناکامیوں سے لیڈروں کو تو کوئی نقصان نہیں ہوا صرف عوام رنج اٹھاتے ہیں۔

موجودہ کمتر شدت کی جنگ اور بڑے پیمانے پر تشدد کے طریقے کشمیری عوام پر اپنا عذاب نازل کرتے رہیں گے۔ ہندوستان غیر معمولی عرصے تک اس جنگ کی سیاسی اور مادی قیمت ادا کرتا رہے گا۔ پاکستان کے غیر سفارتی ذرائع محدود ہیں۔ ہندوستان کے ساتھ جنگ کوئی نتیجہ خیز راستہ نہیں۔ کشمیر کے حریت پسندوں کو اسلحۂ افرادی قوت اور حوصلہ مندی میں کمی کا مرحلہ درپیش ہے اور مختلف اسباب کی بنا پر اسلام آباد کے لئے ممکن نہیں کہ اس کمی کی تلافی کر سکے اور امداد میں اضافہ کرتا رہے۔ کشمیر کے تنازعے کو اقوام متحدہ کی قراردادکی روشنی میں حل کرنا اب ایک بے نتیجہ فعل ہوگا۔ بین الاقوامی طور پر بھی اس تجویز کے لئے کوئی بڑی حمایت موجود نہیں۔ کشمیر میں قوم پرستی کی بنیادیں مضبوط ہوگئی ہیں لہٰذا بیشتر کشمیری پاکستان کے ساتھ

MashalBooks.org

الحاق کی بجائے آزادی کو ترجیح دیں گے۔

ہندوستان اور پاکستان دونوں نے ہی باقاعدہ مذاکرات کے ذریعے کسی سمجھوتے تک پہنچنے کا راستہ نہیں اپنایا۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ دونوں حریف اپنے پہلے سے طے شدہ موقف سے پیچھے ہٹیں۔ ایسا موقف جو انہوں نے پچاس سال پہلے اختیار کیا تھا اور تین بنیادی حقائق کو تسلیم کر لیں۔ پہلی بات یہ کہ کشمیر کا مستقبل' پاکستان ہندوستان اور کشمیری عوام کا باہمی تنازعہ ہے۔ اس کا وہی حل ہونا چاہیے جو تینوں فریقوں کو قبول ہو۔ دوئم مسئلہ کے یک طرفہ حل خواہ انہیں کتنی ہی شدت سے آگے بڑھایا جائے' کامیاب نہیں ہوں گے۔ کشمیر بہ لحاظ رقبہ اتنا بڑا اور کثیر آبادی کا علاقہ ہے اور محل وقوع کے اعتبار سے اتنا اہم ہے کہ اگر کوئی یک طرفہ حل پیش کیا گیا تو وہ زیادہ دنوں برقرار نہیں رہے گا۔ تیسری حقیقت یہ کہ ایک تاریخی اہمیت کے سمجھوتے کے فائدے' یہاں علاقائی قبضے کی بنا پر حاصل ہونے والی فائدوں سے اور فتح مندی کے غرور سے کہیں زیادہ ہیں۔

منقسم حاکمیت

ایسے ممالک جو جنگ سے اس طرح تباہ نہیں ہوئے جیسے دوسری عالمی جنگ کے خاتمے پر جاپان اور جرمنی تباہ ہوئے تھے' ان کے لئے ایک ذہنی کیفیت سے گزر کر دوسری طرح سوچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس کے لئے ایک عبوری عرصہ درکار ہوتا ہے' جس میں مفروضوں کو عمل کی کسوٹی پر پرکھا جائے' اعتبار سے کام لیا جائے اور سرحدوں سے باہر نکل کر معاہدے کئے جائیں۔ یہ طریقہ اس طرح کے خطرناک امن سے بہتر ہے' جو مصر' فلسطین اور اردن کے عربوں نے اسرائیل کے ساتھ سمجھوتوں میں حاصل کیا۔ جنوبی ایشیا کے لئے یہی بہتر ہے کہ قدم بہ قدم آگے بڑھا جائے' تاکہ صوبوں کو برداشت کیا جا سکے اور اس دوران میں فریقوں کے درمیان اعتماد بھی مستحکم ہوتا جائے۔

امن' خواہ وہ بتدریج ہو' اس کی بنیاد اصولوں پر ہونی چاہیے' جو مشترکہ طور پر تسلیم کئے گئے ہوں۔ ایک بنیادی اصول تو یہ ہے کہ مسئلہ کشمیر کی آخری فیصلہ کن طاقت کشمیر کے عوام ہیں۔ اگر کوئی سمجھوتا کشمیر کی ہزار سالہ تاریخ' اس کے کلچر اور جغرافیہ سے ہم آہنگ نہیں اور اس کی ان فطری خصوصیات کو بحال نہیں کرتا تو وہ کشمیری عوام کی امنگوں کی تشفی نہیں کر سکے گا اور نہ اس سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک پائیدار امن کے تقاضے پورے ہوں گے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ حاکمیت کا تصور پچھلے پچاس سال میں بدل گیا ہے' یہ تصور ابھی کچھ اور بدلے گا' جس کے تحت تقسیم شدہ حاکمیت' تقسیم شدہ سرحدوں کے ہم معنی قرار نہیں پائے گی۔

اگر یہ اصول سمجھ لئے جائیں تو تدبیر یہ ہونی چاہیے کہ ایک سمجھوتے پر تین مراحل میں عمل کیا

جائے۔ خود مختاری کھلی سرحدیں اور کشمیر میں تقسیم شدہ حاکمیت کے ساتھ اتحاد۔ ایک بندوبست کے مطابقت جموں اور لداخ کو نسبتاً زیادہ اختیارات دیئے جائیں۔ ہندوستان ان پر بالادستی کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ اسی طرح آزاد کشمیر کو خود مختاری اور اسلام آباد کی وفاقی حکومت سے آزادی دی جائے البتہ اس کی بالادستی بدستور باقی رہے گی۔ وادی میں جو "کشمیریت" کا مسکن اور تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے وادی کا دل ہے اُسے خود مختاری تفویض کی جائے۔

یہ آخری مرحلہ اس طرح سر کیا جائے کہ وادی یہ تین مقاصد پورے کر سکے۔ کشمیریت کی محافظ اور اس کی علامت نظر آئے کشمیر کے اتحاد کی ضامن ہو اور ہندوستان و پاکستان کے درمیان رابطے کا پل بن جائے۔ ابتداً وادی میں رہنمائی کی غرض سے اقوام متحدہ کی ٹرسٹی شپ قائم کی جائے تاکہ اس عرصے میں نئے انتظامات کو خوش اسلوبی سے چلانے کے لئے وقت مل جائے اور آبادیوں میں عدم استحکام اور کسی طرح کے فساد کا اندیشہ پیدا نہ ہو۔

اس طرح کے امن سمجھوتے کے خلاف تینوں فریقوں کے انتہا پسند اٹھ کھڑے ہوں گے۔ کٹر کشمیری قوم پرست اس پورے کشمیر پر جہاں تک مہاراجہ کی عمل داری ہے اپنی حکمرانی کا مطالبہ کریں گے۔ خواہ متعلقہ علاقے کے لوگ اس کو پسند کریں یا نہ کریں۔ اس طرح اسلام کے داعی یہاں ایک اسلامی ریاست قائم کرنا چاہیں گے۔ خوش قسمتی سے یہ لوگ تھوڑے سے ہیں اور ان کا انحصار حکومت پاکستان کی ایجنسیوں پر ہے۔

وہ عناصر جن کا نعرہ ہے: "کشمیر بنے گا پاکستان" وہ بھی بہت شور مچائیں گے لیکن خوش قسمتی سے اگرچہ اس حقیقت کا اقرار بہت کم ہی کیا جاتا ہے دانش مند اور دور اندیش لوگوں کی رائے جو پاکستان کی فوج اور افسر شاہی میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں بالآخر تسلیم کر لی جاتی ہے بشرطیکہ انہیں اپنے مخلصانہ خیالات کا موقع دیا جائے۔ یہی بات ہندوستان میں بھی صادق آتی ہے اگرچہ اس مرحلہ وار حل کی مخالفت سب سے زیادہ ہندوستان میں ہی ہوگی۔

ہندوستان ایک "سٹیٹس کو پاور" ہے۔ یعنی ایسی حکومت جو حالات کو بدستور قائم رکھنا چاہتی ہے اور تبدیلی سے سخت نفرت کرتی ہے۔ ہندوستان میں ہی دائیں بازو کی طاقت اقتدار قائم کر چکی ہے۔ ہندی بولنے والے علاقے میں یہ سب سے زیادہ طاقتور ہے جہاں کشمیر کا مسئلہ شدت اختیار کر چکا ہے۔ مزید یہ کہ ہندوستان میں وہ ارباب اختیار جو فیصلے کرنے پر قادر ہیں اُن سے یہ تقاضا کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کو ایک عظیم طاقت ہونے کا روپ دیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ بڑی طاقتیں دوسرے ملکوں خاص طور پر اپنے چھوٹے ہمسایوں کے ساتھ برابری اور یگانگت کے سمجھوتوں کے سلسلے میں چنداں حساس نہیں۔

پاکستانیوں اور کشمیریوں کے تدبر کا امتحان یہ ہوگا کہ ہندوستانی رائے عامہ کو اس سمجھوتے کے لئے

ہموار کریں اور بڑی طاقتوں اور بین الاقوامی رائے عامہ کو اس کے لئے تیار کریں اور ہندوستانی حکومت پر دباؤ ڈالیں کہ وہ اس دانش مندانہ اور پائیدار سمجھوتے کو مان لیں۔

یہ ایک مشکل چیلنج ہے' لیکن اس کام کے لئے یہی موزوں وقت ہے۔ سوچنے سمجھنے والے پاکستانی اور ہندوستانی یہ جانتے ہیں کہ تاریخ آگے کی طرف جا رہی ہے۔ تاریخ کے اس سفر میں جامد حکمت عملی بیکار ثابت ہوتی ہے۔ ہر اچھا سیاسی' انجینئر' معالج' فلسفی اور تاریخ داں جانتا ہے کہ جب کوئی حکمت عملی ناکارہ ثابت ہو جائے تو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور اب جنوبی ایشیا میں نئی صداقتیں تیزی سے اثر انداز ہو رہی ہیں۔ عالمگیریت کے نتیجے میں سرحدیں ٹوٹ رہی ہیں۔ قوموں کی سرحدوں سے باہر نکل کر اتحاد بن رہے ہیں۔ اب دشمنوں کے ساتھ بھی تجارت کرنی پڑتی ہے' اس سے قومی سرحدوں سے گزر کر طاقت کے مراکز پیدا ہو رہے ہیں اور ریاستوں کی خودمختاری رکاوٹ نہیں بنتی۔ جنوبی ایشیا کی حکومتیں بھی اس عمل میں خوشی سے شریک ہو رہی ہیں۔

وزرائے اعظم بڑے فخر سے یہ دعوے کرتے ہیں کہ مفاہمت کی دستاویز حاصل کرنا بھی ان کا ایک کارنامہ ہے۔ وہ غیر ملکی سرمایہ کاری کے ضمن میں اعداد و شمار پیش کرتے ہیں' بین الاقوامی تجارتی معاہدوں پر دستخط کرتے ہیں اور علاقائی تعاون کے معاہدوں میں شریک ہوتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان سارک اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے رکن ممالک ہیں۔ انہوں نے گیٹ (ٹیکس اور چونگی کے عالمی معاہدے) اور جنوبی ایشیا میں فری ٹریڈ آرگنائزیشن کے مسودوں پر بھی دستخط کئے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ تعاون کے ان اجتماعات میں بھی ایک دوسرے کے خلاف آستین چڑھا لیتے ہیں' نئے حقائق ان کو یگانگت کے سمجھوتوں کی طرف لے جاتے ہیں' اور تھکی ہوئی جبلتیں اور مفاد پرستی انہیں پہلے جیسی کشیدگی پیدا کرنے اور زہر افشانی کے لئے مجبور کرتی ہے۔ ایک ہاتھ مستقبل کی طرف بڑھتا ہے' جبکہ دوسرا ہاتھ جو ماضی میں پھنسا ہوا ہے' لپک کر پہلے ہاتھ کو قلم کر دیتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں کے سیاسی وجود کی یہ غیر فطری اٹھان' اس کا سب سے نقصان دہ پہلو ہے۔ یہ خرابی مسلسل بڑھتی جائے گی' جب تک دونوں حکومتیں اس علاقے میں ماحول کی فطری نشوونما کا اہتمام نہیں کرتیں اور یہاں پیداوار' تجارت اور کلچر کو ترقی کرنے نہیں دیتیں۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ معمول کے آدمی بنیں اور خوشحال زندگی گزاریں تو عناد کی جگہ امن قائم کرنا ہوگا۔ جہاں خلیج ہے' وہاں پل بنانا ہوگا۔ زخموں پر مرہم رکھنا ہوگا' فاقے کا تدارک خوراک سے کرنا ہوگا۔ یہ کام شروع کرنے کے لئے کشمیر بہترین جگہ ہے' صرف اس لئے نہیں کہ پاک و ہند تنازعے میں اس کی مرکزی حیثیت ہے۔ بلکہ ہماری تاریخیں' ہماری تہذیبیں اور ہمارے مذاہب سب کشمیر میں آ کر مل گئے ہیں' ہمارے دریاؤں کے مخرج وہیں ہیں' ہمارے پہاڑ وہیں ملتے ہیں اور ہمارے خواب وہیں دفن ہیں۔

("ہمال" نومبر 1996ء)

MashalBooks.org

افغانستان

MashalBooks.org

خونی کھیل

دوسری عالمی جنگ کے بعد سے اب تک افغانستان پر روس کا حملہ اس کو سب سے مہنگا پڑا۔ ایک کروڑ 50 لاکھ کی آبادی کا یہ نادار پہاڑی خطہ جہاں محض گلہ بان' کسان اور تاجر آباد ہیں ایران' روس اور چین سے گھرا ہوا ہے۔ افغانستان پر حملے کی یہ طویل ترین مدت ہے۔ روس نے یہاں قیام امن کی جو مہم شروع کی' اس کے نتیجے میں لاکھوں افراد ہلاک ہوئے اور افغانستان کی کوئی ایک تہائی آبادی مہاجر بن گئی اور امریکہ افغانیوں کی اس مزاحمت کو سہارا دیتے ہوئے درپردہ سب سے منظم اور مہنگی جنگ جاری رکھے ہوئے ہے۔ 1970ء کے اوائل میں امریکی سی آئی اے نے لاؤس اور کمبوڈیا میں جو سرمایہ لگایا اور جال پھیلایا تھا' اس کے بعد دوسری مثال یہ افغان جنگ ہے' امریکہ نے روسی فوجوں پر حملہ آور کسی گوریلا فوج کو پہلی بار مدد دی ہے۔

واشنگٹن پوسٹ کی اطلاع کے مطابق ان مقدس جنگ لڑنے والے مجاہدین کو امریکہ نے صرف 1987ء کے مالی سال میں 66 کروڑ ڈالر کی فوجی امداد فراہم کی ہے' جو نکاراگوا کے کنٹرا س باغیوں کو دی جانے والی کل امریکی امداد سے بھی زیادہ ہے لیکن کنٹرا س کو دی جانے والی امداد کے برعکس' افغان جنگ لڑنے والوں کی ڈھکی چھپی امداد کا معاملہ کانگریس میں زیر بحث نہیں آیا' بلکہ اکثر یوں بھی ہوا کہ امریکی انتظامیہ نے جتنی رقم کی درخواست کی تھی' کانگریس نے اس سے زیادہ رقم خرچ کر دی۔

دو عالمی طاقتوں کا افغانستان کے معاملے میں اس طرح دوبدو جنگ کرنا' کوئی پہلی بار نہیں ہوا' برطانیہ اور روس نے 1837ء سے 1907ء تک سرحد میں جنگ کی تھی۔ شمال مغرب کا وہ برطانوی علاقہ اب پاکستان کا حصہ ہے۔ برطانوی افسروں نے ان پہاڑی لڑائیوں کو "بڑے کھیل" (Great Game) کا نام دیا تھا۔ انگریز مصنف رڈیارڈ کپلنگ نے اپنی تصنیف "کم" (Kim) میں اس اصطلاح کو مقبول بنا دیا۔ افغانستان آج بھی بڑی طاقتوں کے لئے کھیل کا میدان بنا ہوا ہے۔ البتہ اس مرتبہ کھلاڑی پہلے سے بہت زیادہ ہیں اور کھیل بھی پہلے سے زیادہ ہلاکت خیز ہے۔ "اس بزکشی میں ماسکو اور واشنگٹن کے درمیان افغانستان کی حیثیت بچھڑے کی ہے۔) یہ فقرہ کابل یونیورسٹی کے ایک سابق ڈین اور پشاور میں افغان مرکز اطلاعات کے ڈائریکٹر پروفیسر سید بہاؤالدین مجروح کا ہے۔ انہوں نے کہا: "جایئے اور تماشا دیکھئے۔ ہم اسے پاکستان میں لے کر آئے ہیں۔ اب آپ افغانستان کو اور اس جنگ کو کہیں بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔" چنانچہ ہم اپنے چند افغان دوستوں کے ساتھ کوئی دو ہزار تماشائیوں کے ہجوم سے جا ملے

MashalBooks.org

خیبر کی پہاڑیوں کے نشیب میں واقع پشاور کے کچے میدان میں تماشا دیکھ رہا تھا۔اس کھیل کو سمجھنا ہو تو امریکی فٹ بال کا تصور کیجئے' جسے گھڑ سوار کھیل رہے ہیں' کسی حفاظت کے بغیر کوئی ضابطے اور اصول نہیں۔ کھلاڑیوں کی تعداد بھی طے نہیں اور گیند کی جگہ ایک سربریدہ بچھڑا ہے۔ وزن اس کا پچاس سے سو پونڈ ہوگا۔ اب کرنا یہ ہے کہ بچھڑے کو اٹھا کر گول تک لے جانا۔ یہ فاصلہ عام طور پر ایک میل ہوتا ہے' اس کھیل میں ٹیمیں نہیں کھیلتیں بلکہ اس میں کامیابی کا انحصار ہر کھلاڑی کی مہارت اور اس کے گھوڑے پر ہے۔

وہاں تقریباً ایک سو گھوڑے تھے' یہ تعداد خلاف معمول کم تھی۔ان میں بھی اچھے پلے ہوئے اور تربیت یافتہ تقریباً ایک درجن ہی تھے۔ یہ گھڑ سوار جب گزرتے تو مجمع سے آواز آتی: (ماشاء اللہ) وہ چپ اندازاں کہلاتے تھے یعنی ماہر کھلاڑی۔گھڑ سوار جب کھیل شروع ہونے سے پہلے قطار میں کھڑے ہو گئے تو چپ انداز کچھ آگے اور باقی ان کے پیچھے کھڑے نظر آئے' چار افراد پگڑیاں باندھے ایک بچھڑے کا دھڑ اٹھائے آئے اور اسے بیچ فرش پر رکھ کر پیچھے ہٹ گئے۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں کھیل شروع ہونے کا اعلان ہوا۔اللہ اکبر کا فلک شگاف نعرہ بلند ہوا۔گھڑ سوار سرپٹ دوڑے' جیسے رنگ اڑ رہے تھے۔ چند سیکنڈ کے اندر کچھ گھڑ سوار کنارے ہو گئے اور کچھ تیزی سے بیچ میں آ گئے اور مردہ بچھڑے تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ گھڑ سوار آگے اور پیچھے' ایک دوسرے سے الجھتے' دھکا دے کر آگے نکلنے کی کوشش میں شور کرتے' دھول کے بادل میں چھپ گئے تھے۔ اچانک یہ کیفیت ختم ہوگئی اور ہمیں وہ حرکت صاف نظر آ گئی۔ ماہر کھلاڑیوں کے اس مقابلے میں ہمیں یہ منظر نظر آیا کہ ہر ایک کے ساتھ گھڑ سواروں کا ایک دستہ لگا ہوا ہے۔ ہر ایک کھلاڑی کے گرد ٹیمیں مدد کے لئے آ گئی تھیں' ہم نے دیکھا کہ جب ایک سوار بچھڑے کے قریب پہنچتا ہے تو وہ اپنے سر اور شانوں کو جھکاتا ہے' ایک ہاتھ میں گھوڑے کی باگ ہوتی ہے۔کوڑے کو اپنے دانتوں کے درمیان پکڑے رہتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے بچھڑے کو اچک لینا چاہتا ہے۔ اسی لئے اس کھیل کا نام بزکشی ہے' یعنی بکرے کو کھینچ لینا۔انیسویں صدی کے کسی سال میں بکرے کی جگہ بچھڑے نے لے لی سوار کو دھکے لگتے ہیں' وہ دھکے لگنے سے ایک طرف ہو جاتا ہے۔ اس کے پیچھے تیزی سے جو گھوڑے آ رہے ہیں' ان کے بوجھ کی وجہ سے وہ گر بھی جاتا ہے' اس کے ہاتھ گھوڑے کے سموں کی چوٹ سے پس جاتے ہیں' ان میں جو سوار سب سے پھرتیلے ہیں اور جن کے گھوڑے بہترین تربیت یافتہ ہیں اور جن کے درمیان صحیح میل ہے' بس وہی بچھڑے کو چھین کر لے جانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اگر یہ مقابلہ پھوہڑپن کے ساتھ ہو تو بچھڑے کے گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں' اس وقت جج کے لئے جیت ہار کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ پھر اس دوران میں ہم نے دیکھا کہ ایک کھلاڑی گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا آ رہا ہے' مردہ بچھڑا اس کی بغل میں ہے۔کوڑے کو اس نے اپنے دانتوں کے درمیان پکڑ رکھا ہے' خون کی دھاریاں اس کے چہرے پر سے بہہ رہی ہیں۔ پھر وہ اپنے حریفوں کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے' چند ہی منٹ بعد وہ پلٹ کر واپس آتا ہے

اور تماشائیوں کے نعرہ تحسین کے درمیان بچھڑے کو ایک دائرے میں' پہلے دائرے کے قریب رکھ دیتا ہے۔ اب ایک بار پھر سب اس لکیر پر پہنچ جاتے ہیں' جہاں سے کھیل شروع ہوا تھا۔ یوں کھیل دوبارہ شروع ہوتا ہے۔

اس شام ہم آپس میں اس مشابہت پر گفتگو کرتے رہے' جو اس کھیل اور وہاں کے کلچر میں نظر آئی۔ بزکشی کا کھیل ایک ایسے کلچر کی عکاسی کرتا ہے' جس میں جسمانی حوصلے اور انفرادی اہلیت پر غیر معمولی زور دیا گیا ہے۔ اس میں مقابلہ کسی روک ٹوک کے بغیر ہوتا ہے' گویا یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ اس چھینا جھپٹی اور مزاجی کیفیت سے نظم و ضبط کی صورت پیدا ہو گئی۔ ہمارے ایک افغان دوست نے کہا: "بات محض اتنی ہی نہیں ہے' کچھ اور بھی ہے۔ یہ کھیل کھیلا ہی نہیں جا سکتا' جب تک اس پر بازی لگانے والے نہ ہوں۔ اس میں بڑی لاگت آتی ہے' انعامات ہوتے ہیں' چپ اندازوں کو اور گھوڑوں کے مالکوں کو معاوضہ دینا ہوتا ہے' اچھے گھوڑے بہت کم لوگوں کے پاس ہوتے ہیں' اس لئے بھاری معاوضہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایسا کھیل ہے کہ اس پر صرف دولت مند لوگ کچھ داؤ پر لگا سکتے ہیں' وہ نہ ہوں تو کھیل بھی نہیں ہو گا۔ اس میں دوسروں کی احتیاج بھی شامل ہوتی ہے۔ یہی کیفیت اس جنگ کی ہے۔ باہر والوں نے اپنی اپنی ٹیموں پر بازی لگا رکھی ہے اور ہم ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں۔"

ایک اور شخص بولا: "کمیونسٹ اور بنیاد پرست افغانستان پر اس طرح جنگ کر رہے ہیں' جیسے یہ کوئی مردہ وجود ہوں' وہ کہتے ہیں' اس کے دو رخ ہیں۔ میں کہتا ہوں' غلط ہے۔ یہ پورے بارہ نہیں بلکہ بیس یا پچاس چپ انداز تمام طرف سے آ سکتے ہیں اور سب اپنے اپنے لئے کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے مصائب کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں۔"

اسی سال 11 فروری کو پشاور میں پروفیسر مجروح بھی قتل کر دئیے گئے۔ وہ مزاحمت کرنے والوں میں معتدل مزاج شخص تھے' ان کا موقف یہ تھا کہ اس تنازعے کا تصفیہ بات چیت سے ہو جانا چاہیے۔

افغان لوگوں کی سرگزشت زیادہ تر ان کے مخالفوں نے لکھی ہے اور ان کی تعریف بھی بڑی مجبوری سے کی ہے۔ ارل آف رونالڈ شے نے جو برطانیہ کی رائل جیوگرافیکل سوسائٹی کے صدر تھے' 1924ء میں پاکستان اور افغانستان کے درمیان سرحدی علاقے کے بارے میں لکھا: "ایک سرحدی افسر کی زندگی بڑی سخت ہے۔ وہ ہر روز موت کے دہانے پر اپنی زندگی گزارتا ہے' لیکن ان صریح دشواریوں کے باوصف یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ ان لا انتہا میدانوں کے اندر کوئی ایسی طاقت ضرور ہے' جس نے ان لوگوں کے اندر جو یہاں قسمت سے آباد ہیں' غیر معمولی جوش و خروش پیدا کر دیا ہے۔" افغانستان کے منفرد کلچر کی اساس پہاڑوں کی فلک بوس چوٹیاں ہیں اور پانی کی نایابی ہے۔ قراقرم کے پہاڑی سلسلے نے جو شمال سے جنوب تک چھ سو میل پر پھیلا ہوا ہے' ملک کو تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک طرف پامیر کا پہاڑ ہے' جو ہمالیہ کے سلسلے میں

MashalBooks.org

شامل ہے اور جس میں سو سے زیادہ چوٹیاں ہیں' جو بیس سے پچیس ہزار فٹ تک بلند ہیں۔ اپائیز پہاڑ چین اور سوویت وسطی ایشیا کے ساتھ ساتھ شمالی علاقے پر چھایا ہوا ہے' اس کے جنوب میں لق ودق ریگستانی سلسلے ہیں' جو دشت مرگ (موت کے صحرا) ہیں۔ افغانستان کا موسم دو انتہائیوں کے درمیان ہے۔ گرمی کے موسم میں زبردست تپش' صحراؤں میں گردش کرتے ہوئے گرد کے طوفان اور سردی کے موسم میں شدید سردی اور ہوائیں انتہائی خوفناک۔ اس پتھریلی زمین میں اتنا کم سبزہ اگتا ہے کہ انتہائی سخت جان جانور ہی زندہ رہ سکتے ہیں۔ رینی ڈالٹ کابل میں فرانس کے ایک سابق سفیر تھے' انہوں نے 1937ء میں لکھا کہ ہندوکش چاند کے ویرانے کی طرح ہے' جیسے یہ سرزمین ماقبل تاریخ کے دور سے تعلق رکھتی ہے اور اب تک منتظر معلوم ہوتی ہے کہ حیوانی زندگی یہاں ظہور کرے' یا پھر اس کے خاتمے کا اعلان سنا جائے۔" لیکن افغانستان ایک حیرت کدہ بھی ہے۔ روح پر سے ایک 'سفاک بدصورتی اور اذیت' کا احساس جاتا رہتا ہے' جب ناقابل بیان خوبصورتی اس کے مقابلے میں سامنے آتی ہے۔ سر اولف کیرو شمالی مغربی سرحدی صوبے کے گورنر اور "دی پٹھان" نامی کتاب کے مصنف تھے' وہ لکھتے ہیں "کشیدے کے اس نمونے کا تانا بانا گویا یہاں کے باشندوں کے جسم اور روح میں بھی سمو گیا ہے' جو یہاں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں' بہت کچھ ناگوار ہے' لیکن بیشتر شوخ رنگ میں ہے کہ اسے دیکھ کر دم بخود رہ جاتے ہیں اور کبھی کبھی تو آنسو نکل آتے ہیں' درد کے آنسو۔"

افغانستان کی بیشتر بستیاں صرف تنگ پہاڑی' پگڈنڈیوں سے جڑی ہوئی ہیں۔ سردیوں میں ادھر سے گزرنا ممکن نہیں رہتا۔ ان حالات میں گاؤں اور قبیلے کی خودمختاری یقینی ہو جاتی ہے۔ افغان معاشرہ ایسی ہی بستیوں سے مل کر بنا ہے اور قدیم زمانے سے یونہی چلا آ رہا ہے' ان کی ساری توجہ اپنے اندر کے حالات پر ہوتی ہے' اس سے ایک قومیت کی تشکیل نہیں ہونے پاتی۔ ہر گاؤں اور ہر قبیلے کی بڑی مضبوط وفاداریاں اپنے خاندان اور گروہ کے افراد کے ساتھ ہوتی ہیں۔ ان کی سیاست کا مرکز اپنی قریب ترین برادری ہوتی ہے۔ سارے اختیارات خان کو حاصل ہوتے ہیں جو قبیلے کا سردار یا ایک دینی پیشوا ہوتا ہے۔ گاؤں یا قبیلے سے باہر بیشتر افغان ایک دوسرے کو اجنبی جانتے ہیں اور شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ باہر کے شخص کو یا تو کسی طرح کی مدد اور تواضع کا مستحق سمجھا جائے یا دشمن سمجھتے ہوئے اس سے ڈرا جائے یا پھر اس کے ساتھ جنگ کی جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ محسن اور مہربان ہو' اس صورت میں اسے تحفظ دیا جائے اور اس کا استحصال کیا جائے۔

جس طرح جغرافیہ نے ان کو سماجی طور پر ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے' اسی طرح بنجر معیشت نے وسائل تک رسائی کے لئے ان کے اندر وحشیانہ مقابلے کی حس بیدار کر دی ہے۔ پوری افغان تاریخ میں یہی نظر آتا ہے کہ اپنی برادری اور قبیلے سے باہر نکل کر اگر کبھی باہمی تعاون کی صورت نظر آتی ہے تو وہ دفاعی معاہدہ ہوتا ہے اور ایسا صرف اس وقت ہوتا ہے جب تمام فریقوں کی آزادی کسی خارجی دشمن یا ایک مداخلت

MashalBooks.org

کار حکومت کی وجہ سے خطرے میں نظر آئے۔ عجیب بات ہے کہ افغانستان میں بغاوتیں کسی جاگیردار یا ظالم قبائلی سردار کے خلاف نہیں بلکہ خارجی حملہ آور کے خلاف ہوئیں اور مرکزیت پیدا کر کے اصلاح نافذ کرنے والی طاقت کی مخالفت میں ہوئیں۔ اس طرح جب سوویٹ روس نے فوجی مداخلت کی اور ایک کمیونسٹ حکومت کی مدد کی جو مرکزیت نافذ کرنا اور اصلاح لانا چاہتی تھی تو ایسا کرتے وقت اس نے بغاوت کے دو تاریخی اسباب کو چھیڑ دیا تھا۔

انیسویں صدی میں جب برطانیہ اس ملک کے اندر داخل ہوا اور اس کے شاہی اقتدار نے اس ناکام مہم میں بری طرح منہ کی کھائی تو روس اس کیفیت کو چپ چاپ دیکھتا رہا۔ کیمبرج ہسٹری آف دی برٹش ایمپائر نے اس حملے کو "ایک بھیانک غلطی" قرار دیا ہے۔ دوسروں نے رائے دینے میں قدرے کم مروت برتی ہے۔ ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ آکلینڈ نے اس حملے کا حکم دیا تھا۔ اس دور کے مبصروں نے آکلینڈ کو "ڈھل مل یقین" اور "پھسڈی قرار دیا۔ لارڈ آکلینڈ نے خود بھی تسلیم کیا ہے کہ افغانستان کے خلاف برطانیہ کی پہلی جنگ ایسی بھیانک تباہی تھی، جس کی تاریخ میں کم ہی مثال ملے گی۔ لارڈ پامرسٹن اس زمانے میں برطانیہ کے وزیر خارجہ تھے۔ ان کے سیاسی حریفوں نے الزام لگایا کہ انہیں روسوفوبیا (روس کا خوف) کا مرض لاحق ہو گیا تھا، چنانچہ وہ اپنی مہم پر چل پڑے۔ اس کا تباہ کن نتیجہ آسیب کی طرح ان کی ساری زندگی پر طاری رہا۔

ایک روسی مورخ نفتلا خلفن (Naftla Khalfin) نے اپنی کتاب (British PlotsAgainst Afghanistan) مطبوعہ 1981ء میں برطانیہ کی ناکامی کی کہانی لکھی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ اکتوبر 1938ء میں لارڈ آکلینڈ نے اعلان کیا کہ "شاہ شجاع جو افغانستان میں حکمرانی کے لئے برطانیہ کے امیدوار ہیں، ملک میں داخل ہوں گے۔ غیر ملکی مداخلت اور ایک جعلی قسم کی مخالفت کو روکنے کے لئے ایک برطانوی فوج ان کی حمایت کے لئے ساتھ ہو گی۔" ایک انگریزی مہم جو فوج، جس میں پچاس ہزار سے زائد جوان شامل تھے اور جس کا شاندار نام آرمی آف انڈس رکھا گیا تھا، قلات پہنچ گئی، جو اب پاکستان میں شامل ہے۔ ایک انگریز افسر نے مقامی حکمران پر رعب جمانے کے لئے بڑے غرور سے کہا کہ اس کی فوج ایک گولی چلائے بغیر کابل میں داخل ہو گئی۔ خان آف قلات نے یہ بات خاموشی سے سن لی۔

افسر نے کہا: "آپ نے کوئی جواب نہیں دیا، شاید آپ اپنے خیالوں میں گم ہو گئے۔"

خان نے جواب دیا: "ہاں میں سوچ رہا ہوں کہ آپ لوگ ملک میں داخل تو ہو گئے، لیکن وہاں سے نکلیں گے کیسے؟" برطانوی افسر کو یاد آیا کہ خان کی پیش گوئی سن کر اس کے بدن میں تھرتھری دوڑ گئی تھی۔ "اس گھڑی کا انتظار کرو، جب تمہارے فوجی دستوں پر تھکن اور بیماری طاری ہو گی۔ اس وقت تک طویل اور پریشان کن مارچ کے باعث وہ تھک کر چور ہو چکے ہوں گے اور پھر فوجی سپلائی نہیں رہے گی اور اس وقت کا

انتظار کرو جب وہ جگہ جگہ جنگ چھیڑ چکے ہوں گے اور اس وقت کا انتظار کرو جب وہ افغان تلواروں کی تیزی کو اپنے وجود پر محسوس کریں گے۔"

دسمبر 1840ء تک برطانیہ کو صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ بڑا کھیل (Great Game) اس نے جیت لیا ہے۔ برطانیہ نے طے کر لیا تھا کہ وہ افغان حکمران دوست محمد خاں کو تخت سے اتار دے گا۔ چنانچہ خان نے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور اسے جلاوطن کر کے برطانوی ہند بھیج دیا گیا تھا۔ برطانیہ کے پٹھو شاہ شجاع نے تخت شاہی پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس وقت لارڈ آکلینڈ نے لندن کو اطلاع دی کہ تاج برطانیہ کے سفیر سر ولیم ہے میکناٹن (Sir William Hay Macnaghten) "ایک دیانت دار اور دوست حکومت بنانے کے اہل ہو جائیں گے اور اس بکھرے ہوئے جنگی ملک کو اپنے ڈھب پر لگا لیں گے۔" لیکن جس وقت لندن میں فتح کا ڈنکا بج رہا تھا برطانوی فوج کو افغانستان میں غارت کیا جا رہا تھا۔

1841ء کے مہینے نومبر اور دسمبر میں کابل میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ وہاں مقیم برطانوی گیریزن محاصرے میں آ گئی۔ بہت سے برطانوی افسر اور ان کے ساتھ میکناٹن بھی قتل کر دیئے گئے۔ بالآخر برطانوی فوج نے کابل میں محاصرہ توڑا اور ہندوستان کی طرف پسپا ہونا شروع کیا۔ کارل مارکس نے جو نیویارک ٹریبون کا نامہ نگار تھا' اپنے قارئین سے اس کا حال یوں بیان کیا ہے۔

"جلال آباد کی دیواروں پر متعین پہرہ داروں نے دیکھا کہ ایک شخص پھٹی ہوئی برطانوی یونیفارم پہنے ایک مریل خچر پر سوار' درماندہ اور زخمی حالت میں چلا جا رہا تھا' یہ تھا ڈاکٹر برائیڈن۔ تین ہفتے قبل جو پندرہ ہزار فوجی کابل سے جا چکے تھے ان میں سے ایک ہی شخص باقی رہ گیا تھا' وہ بھوک سے جاں بلب تھا۔"

ایک مریل خچر پر سوار ایک زخمی ڈاکٹر کی تصویر کی بڑی اشاعت ہوئی اور کچھ عرصے تک یہی یقین کرتے رہے کہ برطانیہ اور افغانستان کی جنگ کا تنہا بچ جانے والا ڈاکٹر برائیڈن ہی تھا۔ لیکن انگریز جب انتقام لینے پر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ ان کے دو ہزار سپاہی اور مداری کابل کی گلیوں میں بھیک مانگ رہے تھے۔ اس چار سال کے عرصے میں بہت سی اموات' مصائب اور ذلت کا ذائقہ چکھنے کے بعد آخر انگریز کو افغانستان سے نکلنا پڑا اور دوست محمد خاں پھر تخت پر واپس آ گیا۔

وہ بڑا کھیل یا گریٹ گیم' برطانوی اقتدار میں توسیع کے ساتھ بدستور جاری رہا' ہندوستان میں اور ایران میں بھی اور روسی وسطی ایشیا میں مزید اندر تک گھس گئے۔ پہلی انگریز افغان جنگ سے لے کر دوسری عالمی جنگ چھڑنے تک برطانیہ نے افغان پاکستان سرحد کے دونوں طرف آباد پشتون قبائل کے خلاف سو سے زیادہ فوجی کارروائیاں کیں۔ نومبر 1878ء میں برطانیہ اور روس کی رقابت کے نتیجے میں برطانیہ نے ایک اور حملہ کیا اور ایک بار پھر تباہ کن شکست سے دوچار ہوا۔ ملکہ وکٹوریہ کے زمانے تک انگلینڈ کے لئے

MashalBooks.org

افغانستان، اپنے خطرات اور مصائب و آلام کے ساتھ ایک بوجھ بن گیا تھا۔ سفید فام انسان پر بوجھ۔ ونسٹن چرچل نے 1897ء کی قبائلی جنگ میں ایک "بہتر نسل کے صوبیدار" (Subaltern of horse) کے طور پر حصہ لیا تھا۔ گلیڈسٹون کے آدمیوں کی مدافعت کی، جنہوں نے قتل عام کیا تھا اور گاؤں جلا دیئے تھے۔ جنہوں نے غالباً یہ قیاس کیا تھا کہ قبائلی لوگ ایک باقاعدہ جنگ جو فوج تھے اور باقی آبادی امن پسند قانون کی پابند اور زندگی کے معمولات میں مصروف رہنے والی تھی۔ حالانکہ اس کی تحریر کے مطابق یہاں، ہر باشندہ ایک سپاہی ہے، اس دن سے جب وہ اتنا بڑا ہو کہ ایک پتھر اٹھا سکے اور زندگی کی اس آخری ساعت تک جب اتنی طاقت رہ جائے کہ وہ رائفل کی لبلبی دبا سکے۔" آخرکار انگریز اس نتیجے پر پہنچے کہ افغان اچھے گاہک نہیں بن سکتے۔ ان کی علیحدگی پسندی کی تاریخ ہے، شورش ان کے کلچر کا حصہ ہے۔ اس لئے ان کو تابع کرنے کی بجائے انہیں مالی مدد دے کر راضی رکھنا بہتر ہوگا۔

افغانستان کے لوگوں کا صدیوں سے یہ معمول رہا ہے کہ سفر، تجارت اور لڑائیوں سے بمشکل گزر اوقات کے اسباب پیدا کرتے آئے ہیں۔ 1929ء کے سال تک افغانستان کی بمشکل دو یا تین فیصد زمین زیر کاشت تھی۔ 1960ء کی دہائی کے بعد سے یہ ہوا کہ بہت سے ترقیاتی منصوبے کے نتیجے میں یہ تعداد پندرہ فیصد ہو گئی۔ شاہراہ ریشم نے دو صدی قبل مسیح سے چین اور ہندوستان کی تہذیبوں کو مصر، یونان اور اٹلی کے ساتھ جوڑے رکھا ہے۔ اس شاہراہ سے قافلے افغانستان کے پرخطر موسم اور تنگ راستوں سے گزر کر آتے ہیں۔ فرانس کے ماہرین آثار قدیمہ نے 1940ء میں دو زیر زمین کمروں کا سراغ لگایا جو غالباً گودام تھے۔ بدھ فن کے نادر نمونے، پیالے، برتن جن پر وارنش کی ہوئی تھی، جو ہن خاندان کے عہد حکومت میں چین سے حاصل کئے گئے تھے، ہاتھی دانت کے منقش نمونے جو قدیم ہندوستان کے تھے، حلب کے شیشے کے برتن اور ایک بڑا پیالہ جس پر ایلیڈ کی مشہور داستان کا ایک منظر دکھایا گیا تھا۔ یہ تمام چیزیں دستیاب ہوئیں۔ جنگ آزما دستے اجرت لے کر اس راہ سے گزرنے والے قافلوں کی جان و مال کی حفاظت کرتے تھے۔ خانہ بدوش، جن کی تعداد 1978ء تک افغانستان کی آبادی کا چھٹا حصہ تھی، ان راستوں پر جانے آنے والے مسافروں کی رہنمائی کرتی تھی، انہیں اس کام کا علم بھی ہوتا تھا اور مہارت بھی۔ وہ قبائل جو اس راستے کے علاقے پر اپنا تصرف رکھتے تھے اور پہاڑی دروں پر جن کا قبضہ تھا، وہ نجی تاجروں اور حکومتوں سے بھی چنگی وصول کرتے تھے۔ شہر کے اندر تاجر انہیں کھانا، پانی اور بار برداری کے لئے جانور مہیا کرتے تھے۔ صرف چھوٹے شہری مراکز پر، جہاں راستے آ کر ملتے تھے یا چوراہوں پر مثلاً قندھار، ہرات، غزنی، مزار شریف اور پشاور میں حکومت کا اختیار چلتا تھا۔ باقی ان صبر آزما تجارتی راستوں پر انسانی تاریخ کے ہر دور میں اور ہر جگہ جنگی قبائل کا قانون چلتا تھا۔ ان خانہ بدوش جنگ جوؤں کے لئے سب سے خوفناک بات ایک مرکزی حکومت ہوتی ہے، جو ان پر اپنی حاکمیت چاہتی تھی۔ اس دوسرے ہزاریئے کے وسط میں تجارتی شاہراہوں کا

خیال بہت پھیل گیا تھا' جس پر مسلمان بادشاہوں اور تاجروں کا قبضہ تھا' پھر مغرب کی سرمایہ داری کے عروج کا زمانہ آیا۔ مشرق کی جانب آمد و رفت کے بحری راستے کھل گئے۔ مغرب اور مشرق کے درمیان تجارت پر ہالینڈ' فرانس اور برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنیوں کی اجارہ داری قائم ہونے لگی۔ افغان اب اس کاروبار سے نکل گئے۔ لیکن یہ ہوا کہ نوآبادیاتی حکمرانی سے محفوظ رہے اور بہت حد تک بین الاقوامی سرمایہ دارانہ معیشت سے بھی بچے رہے' صرف دوسری عالمی جنگ کے بعد افغانستان میں روس اور امریکہ کی امداد کے ساتھ معیشت کو جدید خطوط پر چلانے کا آغاز ہوا۔

روس کے حملے سے تباہی تو ہوئی' لیکن اس کے باوجود افغانستان کی تجارت بحال ہو گئی' کیونکہ اس کی بدولت اشیائے صرف اور غیر قانونی اشیا کی زبردست تجارت بھی خاص طور پر پاکستان کے راستے سے کھل گئی۔ گزشتہ برس کے شروع میں اسٹیٹ بینک کے ایک اندازے کے مطابق 82 بلین روپے مالیت کا سامان یا سالانہ چار بلین 670 ملین ڈالر کا سامان پاکستان کے راستے ملک میں آیا اور یہاں سے باہر نکالا گیا۔ یہ پاکستان کی مجموعی قومی پیداوار کے آٹھویں حصے کے برابر ہے۔ اس زیر زمین معیشت کا اصل مال منشیات اور ان کے بعد اسلحہ ہے۔ تجارتی سرگرمیوں کا مرکز پشاور ہے۔ افغان پھیری والے روسی ماکولات بیچتے نظر آتے ہیں اور ڈبوں میں بند مچھلی' پنیر' جام' جیلی' روس اور مشرقی یورپ کے ملکوں سے یہاں بازار میں فروخت کے لئے چلی آ رہی ہیں۔ اس جنگ کی وجہ سے فرانسیسی' ناروے کے لوگ' امریکی' انگریز اور سعودی باشندے پشاور آ گئے ہیں اور یہاں سے مشرقی جرمنی کے کیمرے اور دوربینیں' روس کے اسکارف اور اونی سوئٹر' سوئٹزرلینڈ کی گھڑیاں اور جاپان کے کیلکولیٹر ذوق وشوق سے خریدتے ہیں۔ ایک پاکستانی کسٹم افسر نے بتایا کہ مغربی یورپ اور جاپان سے جو درآمدی مال افغانستان کے لئے کراچی کے راستے آتا ہے' پہلے درہ خیبر میں اس کا معائنہ کرتے ہیں' پھر افغانستان بھیجتے ہیں۔ لیکن آج کل بہت سے ٹرک سرحد پار کرتے ہی اپنا سامان اتار دیتے ہیں اور ان کا مال فوراً پاکستان اسمگل ہو جاتا ہے۔ کسٹم آفیسر کا بیان ہے کہ سرحد پر ہمارا کوئی اختیار نہیں۔ یہاں ٹریفک بہت ہے اور یہاں پشاور میں تو کچھ بھی نہیں۔ دیکھنا ہے تو باڑہ یا لنڈی کوتل جا کر دیکھئے۔ باڑہ' پشاور سے پندرہ میل شمال میں دھول سے اٹا ہوا ایک میدان ہے' جسے ایک تنگ سی شکستہ سڑک تقسیم کرتی ہے۔ یہاں سینکڑوں دکانیں ہیں' جہاں مال فروخت ہوتا ہے۔ دکانوں پر ٹین کی چھت پڑی ہے اور گرم موسم میں دھوپ سے بچنے کے لئے چادریں پھیلا دی جاتی ہیں۔ یہاں اسی طرح کی آمد و رفت دیکھنے میں آتی ہے جو سرحد کے کسی بھی چھوٹے سے دیہی بازار میں دیکھی جا سکتی ہے۔ وہی چھکڑے' گدھے' بکریاں اور اکادکا گائیں۔ ان کے ساتھ جھولدار کپڑے اور بھاری پگڑ پہنے مسلح لوگ' البتہ رکاوٹوں کے ساتھ ٹیوٹا اور سوزوکی گاڑیوں کا جمگھٹا۔ متوسط طبقے کے لوگ سستے سامان کی خریداری کے لئے یہاں دور دور لاہور تک سے آتے ہیں۔ باڑہ میں سمگل کیا ہوا مال بہت سستا ہے۔ لیکن افغان سرحد سے آگے جائیں تو قیمتیں

MashalBooks.org

چڑھتی جاتی ہیں۔ سرحد کے ساتھ قبائلی علاقے کی بلیک مارکیٹیں' جہاں افغان مہاجر کثیر تعداد میں رہتے ہیں' خریداری کا مقبول مرکز بن گئی ہے۔ شمالی پاکستان سے لوگ بڑی تعداد میں یہاں آتے ہیں' نئی نئی چیزیں حیران کن حد تک یہاں فروخت کے لئے رکھی ہوتی ہیں۔ کپڑے' آرائش کے سامان اور اسلحہ' لیکن زیادہ مانگ گھریلو استعمال کی اشیاء کی ہے' مثلاً روسی استریاں' ایئر کنڈیشنر' ٹوسٹر' گیس کے چولہے' مشرقی جرمنی کے ریفریجریٹر' ٹیلی ویژن' سٹریو وغیرہ۔ نوجوان ملازم بھاری ڈبے اٹھا کر گاڑیوں تک لے جاتے ہیں اور خریدار کار میں ان کے لئے جگہ بناتے ہیں۔

اسلحہ کی سب سے بڑی کھلی مارکیٹ کے طور پر اب لبنان کی جگہ پاکستان نے لے لی ہے۔ معلوم ہوا کہ لندن کے ایک ٹیلی ویژن گروپ کو باڑہ مارکیٹ میں ایک بلوپائپ میزائل مل گیا' یہ برطانیہ کا بنا ہوا میزائل ہے' جو سی آئی اے نے مجاہدین کو دیا تھا۔ باڑہ میں دستیاب بیشتر اسلحہ کم ترقی یافتہ ہے۔ ہم نے وہاں برطانیہ کے بنے ہوئے لی انفیلڈ 303 دیکھے' جو دوسری عالمی جنگ کے زمانے کے تھے' ایک امریکن ایم دیکھا اور بہت سی اے کے 47 رائفلیں' چین کی بنی ہوئی۔ ان ہتھیاروں کی قیمت ایک ہزار سے پندرہ سو ڈالر کے درمیان تھی۔ خیبر کی بنی ہوئی مقامی لی این فیلڈ رائفل جو کسی زمانے میں قبائلی پٹھانوں کا خاص ہتھیار ہوتی تھی' چالیس سے پچاس ڈالر کے اندر فروخت ہو رہی تھی' یعنی جنگ سے پہلے اس کی جو قیمت تھی' اس سے دو سو فیصد کم قیمت پر۔ اب پورے ملک میں ایک خفیہ کاروبار بندوق کو کرایے پر دینے کا نکل آیا ہے۔ باثر گاہک اس سے بڑے ہتھیار یہاں تک کہ اینٹی ایئر کرافٹ بیٹری بھی کرایے میں لے سکتے ہیں۔ طورخم' میران' پارہ چنار اور چمن' سیاحت اور تجارت کے ایسے مراکز ہیں' جہاں گہما گہمی رہتی ہے۔ راستوں کے ساتھ چائے خانے کھل گئے' خچروں اور گھوڑوں کی تجارت بھی زوروں پر ہے۔ بس مالکان مجاہدین کو اجرت لے کر مطلوبہ جگہ پہنچاتے ہیں۔ عظیم شاہراہ ریشم جزوی طور پر دوبارہ کھل گئی ہے صدر کارٹر نے کہا کہ روس کا یہ حملہ دوسری عالمی جنگ کے بعد دنیا کے امن کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ 23 جنوری 1980ء کو انہوں نے اپنی پالیسی کا اعلان کیا جو اب کارٹر ڈاکٹرن کے نام سے مشہور ہے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ (کسی بھی بیرونی طاقت کی جانب سے خلیج فارس کے۔ علاقے پر اپنا تسلط حاصل کرنے کی کوشش کو امریکہ کے اہم مفادات پر حملہ تصور کیا جائے گا اور اس حملے کا کسی بھی ضروری طریقے سے جواب دیا جائے گا اور اس میں فوجی طاقت بھی شامل ہے۔

سوویت فوجی دستوں نے دسمبر 1979ء میں جب پہلی بار افغان سرحد پار کی تو امریکہ میں بہت سے مبصرین نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ کسی بڑے منصوبے کی طرف پہلا قدم ہے۔ یہ پہلی بار ہوا کہ سوویت دستے ایک ایسے علاقے میں داخل ہوئے' جس پر سرخ فوج نے دوسری عالمی جنگ کے آخر میں قبضہ نہیں کیا تھا۔ صدر کارٹر نے قومی سلامتی کے مشیر بریزنسکی کا یہ بیان فوراً تسلیم کر لیا کہ یہ حملہ اس پورے علاقے کے لئے

MashalBooks.org

خطرے کا موجب ہے۔ انتظامیہ کے معاونوں کو اب یاد آ رہا ہے کہ کارٹر نے جب روسی فوجوں کے افغانستان سے نکل جانے کا مطالبہ کیا اور سوویت لیڈر بریژنیف نے اس کا جو 'گمراہ کن' جواب دیا' کارٹر اس سے تقریباً مشتعل ہو گئے۔

اس حملے کے بعد کے دنوں میں یہ قیاس آرائی ہو رہی تھی کہ اس علاقے میں روس کے مقاصد کیا ہیں؟ بیشتر اندازوں میں سخت تشویش شامل تھی۔ بہت سے ماہروں نے یہ نتیجہ نکالا کہ جس طرح عظیم روسی حکمران پیٹر کو گرم پانی تک پہنچنے کی آرزو تھی' بریژنیف بھی وہی آرزو رکھتے ہیں۔ ناموافق پہاڑی دروں سے گزر کر سوویت یونین' جب افغانستان میں داخل ہو گا' جو ہر طرف خشکی سے گھرا ہوا ہے تو بالآخر یہ ممکن ہے کہ وہ خلیج فارس میں آ جائے' حالات کا تقاضا اس کے بعد یہ ہو گا کہ وہ پاکستان پر یا پھر ایران پر حملہ کر دے گا۔

نکسن بریژنیف مفاہمت جو پہلے ہی ختم ہونے کو تھی' روس کی مداخلت سے اس کا خاتمہ اور قریب آ گیا۔ اس سے عالمی حالات پر انتہا پسندانہ نقطہ نظر رکھنے والوں کی مزید تائید ہو گئی۔ اس سے چند ماہ بعد انتخابی معرکہ گرم ہونے والا تھا' جس میں روس کے ساتھ رویے میں نرمی اور امریکہ کے دفاع سے غفلت جیسے مسائل اٹھائے جانے کا امکان تھا اور مخالف انتخابی امیدوار غالباً رونالڈ ریگن ہوں گے۔ یہ سوچ کر کارٹر نے سالٹ دو (2) کا معاہدہ' جس پر سینٹ میں غور کیا جا رہا تھا' واپس لے لیا' پھر یہ اعلان کیا کہ امریکہ ماسکو اولمپک کا بائیکاٹ کرے گا۔ اس کے ساتھ ہی فوجی دفاع کا ایک بڑا منصوبہ تیار کر لیا' جس میں ریپڈ ڈپلائمنٹ فورس کی تشکیل بھی شامل تھی' جسے خاص طور پر خلیج فارس میں استعمال کیا جانا تھا' انتظامیہ نے درخواست کی کہ سی آئی اے کو اپنی خفیہ کارروائی کرنے کی اجازت دی جائے اور اس کے لئے پاکستان کو چار سو ملین ڈالر (40 کروڑ ڈالر) کی رقم بطور امداد پیش کی' جسے پاکستان کے فوجی حکمران جنرل ضیاء الحق نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ یہ ''مونگ پھلی کے چند دانے'' ہیں۔ اس طرح افغانستان اچانک امریکہ کے لئے عالمی سیاست کا مرکزی نقطہ بن گیا۔

اگرچہ روس اس حملے کے بعد بلاشبہ امریکہ کی طرف سے نکتہ چینی کی امید رکھتا تھا' لیکن واشنگٹن نے جس پر زور انداز میں اپنا ردعمل ظاہر کیا' اس سے روسیوں کو ضرور حیرت ہوئی ہو گی۔ امریکہ افغانستان کو بظاہر روس کے دائرہ اثر میں دے کر مطمئن نظر آنے لگا تھا۔ ٹرومین کی انتظامیہ کی طرف سے کابل کی سفارت میں اس کے نائب سربراہ نے بعد میں یہ لکھا تھا کہ ''اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے افغانستان میں ہرگز کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔'' سابق اسسٹنٹ سیکرٹری آف اسٹیٹ جارج سی میگی کو یاد ہے کہ افغان سفیر متعینہ واشنگٹن شہزادہ نعیم نے 1951ء میں یہ تجویز رکھی تھی کہ اگر امریکہ نے کچھ تھوڑی سی فوجی امداد نہیں دی تو پھر انہیں اس کے لئے روس سے بات کرنی پڑے گی۔ میگی لکھتے ہیں' میں نے فوراً فون اٹھایا اور اپنے سیکرٹری سے کہا کہ روسی سفارت خانے کا فون نمبر دے۔ فون نمبر ایک کاغذ پر لکھ کر میں نے شہزادے کو دے دیا۔ اس پر ہم

دونوں قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ آئزن ہاور کے زمانے میں بھی وزیر خارجہ جان فاسٹر نے امریکی اسلحہ کے ضمن میں افغانستان کی گزارش کو ٹال دیا تھا۔ اس وقت جنوب مشرقی ایشیا ٹریٹی آرگنائزیشن (سیٹو) میں پاکستان کی حیثیت مرکزی تھی اور متنازعہ سرحدی علاقے کے حوالے سے پاکستان اور افغانستان کے درمیان کشیدگی اپنے عروج پر تھی۔

امریکہ کے مقابلے میں افغانستان کے ساتھ روس کی دلچسپی خاصے طویل عرصے سے برقرار ہے۔ لینن کے برسر اقتدار آنے کے بعد روس کی فوجی اور اقتصادی امداد جس ملک کو سب سے پہلے ملی' وہ افغانستان تھا۔ 1920ء کے عشرے میں روس کے انجینئروں نے افغانستان میں ٹیلی فون کی لائنیں بچھائیں اور ماسکو اور کابل کے درمیان فضائی رابطہ قائم کیا۔ روس کے ارادوں سے افغان شک وشبہ میں مبتلا ہے' تاہم برطانیہ جب 1947ء میں ہندوستان سے نکلتے ہوئے یہ علاقہ چھوڑ گیا اور امریکہ نے یہاں بہت زیادہ دخیل ہونے میں کوئی دلچسپی نہیں لی تو جنوبی ایشیا میں افغانستان کا وہی حال ہوا جو فن لینڈ کا تھا۔ اندرون ملک اسے یہ آزادی حاصل تھی کہ اپنے روایتی ادارے برقرار رکھے اور خارجہ امور میں اس نے روس کے مفادات کے لئے اپنے یہاں گنجائش رکھی تھی۔ افغانستان کے لئے روسی امداد سال بہ سال کم وبیش ہوتی رہی اور کچھ یوں نظر آتا ہے کہ پاکستان کو امریکہ سے ملنے والی امداد کے مطابق ملتی تھی۔ 1955ء میں جب ڈلس نے امریکہ اور پاکستان کے درمیان باہمی تحفظ کا معاہدہ کیا تو اس کے جلد ہی بعد روسی لیڈروں' نکولائی' بلگانن اور نکاخر وشچیف نے افغانستان کا دورہ کیا اور اس کی امداد میں اضافہ کر دیا' جو بیشتر فوجی امداد تھی' اب روسی اثر تیزی سے بڑھنے لگا تھا' جب امریکہ نے 1965ء کو پاک و ہند جنگ پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے پاکستان کی امداد میں زبردست تخفیف کر دی تو روسیوں نے بھی افغانستان کی امداد کم کر دی۔ افغانستان میں 1953ء اور 1964ء کے درمیان سردار احمد داؤد خاں وزیراعظم تھے' چنانچہ انہوں نے روس کی امداد سے اصلاحات نافذ کیں۔ کابل میں ایک یونیورسٹی نے پہلی بار چند دانشوروں کی تربیت کا آغاز کیا اور ملک کے چند حصوں میں عام تعلیم کے نفاذ کی ابتدا کی گئی۔ داؤد کے برادر نسبتی محمد ظاہر شاہ 1933ء سے افغانستان کے بادشاہ تھے۔ 1963ء میں انہوں نے داؤد کو اچانک برطرف کر دیا۔ دس سال بعد داؤد نے ان کا تختہ الٹ دیا اور دوبارہ اقتدار میں آ گئے۔ انہوں نے بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ اپنے برادر نسبتی کو انہوں نے روم بھجوا دیا۔ (جہاں وہ اب تک ہیں) اور ان کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ داؤد کے برسر حکومت آنے میں چند فوجی افسروں کی مدد شامل تھی' جنہوں نے بعد میں افغان کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ داؤد کی واپسی میں ببرک کارمل کا بھی ہاتھ تھا' وہ بائیں بازو کے ایک مشہور اور معقول سیاست دان تھے اور ان کا تعلق بالائی طبقے کے ایک خاندان سے تھا۔ (چھ سال بعد جب روسیوں نے حملہ کیا تو کارمل کو افغانستان کا صدر بنا دیا) کریملن کی قیادت داؤد حکومت کے ابتدائی برسوں میں صورت حالات سے بہر طور مطمئن تھی۔ اس عرصے

میں روس کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہوا اور افغانستان' تجارت اور اسلحہ کی سپلائی کے ضمن میں روس کا ایک سرکردہ شریک کار بن گیا۔

افغانستان کا ایک اسلامی قبائلی معاشرہ ہے' اس میں چار بڑی قومیں اور بہت سی چھوٹی چھوٹی قومیں آباد ہیں۔ شہری آبادی مختصر سی ہے۔ سالانہ فی کس آمدنی دو سو ڈالر سے کم' تعلیم کی شرح دس فیصد' متوقع اوسط عمر 38 سال' گویا جدید مفہوم میں یہ ایک قوم نہیں ہے۔ سوشلسٹ انقلاب کے لئے ناموزوں اور اس کا یہاں امکان بھی نہیں تھا۔ واشنگٹن کے سیاسی تجزیہ نگار اور ماسکو میں پارٹی کے نظریہ ساز اس بات میں دونوں کا اتفاق رائے تھا۔ داؤد نے بادشاہت کو ختم کر کے اس ملک کے جواز کی ایک علامت تو ختم کر دی تھی' جس نے افغانستان کو ایک ریاست کے طور پر 1747ء سے' جب اس کا قیام عمل میں آیا' یکجا رکھا تھا' پھر اقتدار پر قبضے کے لئے ایک فوجی سازش کر کے۔ حالانکہ افغانستان میں اس طرح کی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے ملک کی سیاست کو سرے سے بدل دیا۔ اب دو کھلاڑی آمنے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے' اور ملک کی تقدیر اب نہ تو تمام تر سوویت یونین کے ہاتھ میں رہ گئی تھی' نہ امریکہ کے ہاتھ میں اور نہ افغانستان کے روایتی حکمرانوں کے ہاتھ میں۔

تیس افراد نے جن کا تعلق مختلف مارکسی مطالعاتی گروپس کے ساتھ تھا' 1965ء میں پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی افغانستان کی بنیاد رکھی' نور محمد ترہ کی جو ایک پشتون خانہ بدوش کے بیٹے تھے' انہوں نے واشنگٹن کے افغان سفارت خانے میں پریس اتاشی کی خدمات سرانجام دی تھیں' پارٹی کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے اور ببرک کارمل کو بھی قیادت میں ایک منصب مل گیا۔ پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی جو اپنی تنظیم اور نظریے میں مارکسی تھی اور نیم خفیہ جماعت کے طور پر کام کر رہی تھی' نہ تو جمہوری تھی اور نہ لوگوں میں مقبول تھی۔ اس کے بعد کے دس برس میں چند سو افراد اس سے متاثر ہو کر اس میں شامل ہوئے' اور وہ بھی سب دانش ور طبقے کے لوگ تھے۔ اساتذہ' سرکاری عہدیدار' طلبہ اور سب سے اہم فوجی افسر' جن میں سے اکثر نے سوویت یونین میں تربیت پائی تھی' چونکہ پارٹی میں کسان یا مزدور نہیں تھے' اس لئے کریملن نے اسے چنداں اہمیت نہیں دی' لیکن اس بے تعلقی کے باوجود سوویت لیڈر اس کی راہنمائی کی کوشش سے باز نہیں آئے۔ ستمبر 1965ء میں جب پارلیمانی انتخابات کا وقت قریب آیا تو ترہ کی اور کارمل اپنے آٹھ انتخابی امیدواروں کی خاطر مالی تعاون حاصل کرنے کے لئے ماسکو گئے۔ پارٹی کے چار امیدوار جیت گئے' ان میں کارمل شامل تھے۔ ترہ کی اور حفیظ اللہ امین جو ان کے بڑے گہرے شاگرد تھے' ہار گئے۔ ایک سابق وزیر داخلہ کے بیان کی رو سے افغان خفیہ پولیس نے یہ نتیجہ نکالا کہ ''ڈیموکریٹک پارٹی کے لیڈر روسی سفارت خانے کے اندر روسی خفیہ پولیس کے عناصر کے تابع' ان کے امداد یافتہ اور ان کے احکام کے براہ راست پابند تھے۔'' فنی اعتبار سے خفیہ پولیس کی وہ رپورٹ بالکل درست تھی' لیکن عملاً جو کچھ ہو رہا تھا' رپورٹ میں وہ بات آنے سے رہ گئی

MashalBooks.org

تھی۔ اول یہ کہ نظریاتی طور پر اس انتہائی غیر منظم کمیونسٹ پارٹی میں سخت تفرقہ پڑ گیا تھا۔ کارمل اقتدار حاصل کرنے کے لئے تراکی کو چیلنج کر رہے تھے۔ پارٹی کے قیام کے دو سال سے کچھ مدت بعد ہی ڈیموکریٹک پارٹی دو دھڑوں میں بٹ گئی تھی۔ ہر دھڑا اپنے اخبار کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ تراکی کا گروہ خلق کہلاتا تھا۔ اس میں زیادہ تر دیہی علاقوں کے پشتون تھے لیکن ان کا دعویٰ تھا کہ وہی لینن کے نظریے سے وابستہ محنت کشوں کی پارٹی ہیں۔ کارمل کا دھڑا پرچم کہلاتا تھا۔ اس میں سوویت یونین کے لئے دلچسپی زیادہ تھی' کیونکہ وہ ایک وسیع تر قومی جمہوری محاذ کے طور پر مروجہ نظام کے اندر کام کرنے کا قائل اور اسی تعلق سے اپنے آپ کو پیش کر رہا تھا۔ روسی خفیہ پولیس کے ایک سابق میجر نے جو بھاگ کر مغربی طاقتوں سے مل گئے تھے 1982ء میں یہ دعویٰ کیا کہ کارمل کئی سال تک روسی خفیہ ادارے کے جی بی کا ایجنٹ رہ چکا تھا اور کہا کہ "اس پر بھروسا کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے مشورے مان لے۔"

اس نے کولمبیا یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری لی تھی۔ سوویت حملے سے ذرا پہلے کابل میں ایک امریکی سفارت کار نے امین کے بارے میں اطلاع دیتے ہوئے کہا کہ وہ "اپنے اندر تمام تر محبت اور رفاقت ہے" اور بتایا کہ ان خوبیوں کے ہوتے ہوئے یہ اندازہ کرنا مشکل ہوگا کہ ایسا شخص غالباً چھ ہزار سیاسی مخالفوں کے قتل کا براہ راست ذمہ دار ہے۔) ببرک کارمل کا بھی ایک جان نثار شاگرد تھا۔ میڈیسن کا سابق طالب علم نجیب اللہ۔ ہر ایک کے معاملے میں یہی ہوا کہ افغانستان کی صدارت حاصل کرنے کے لئے شاگرد نے اپنے سرپرست کو برطرف کر دیا۔ فی الوقت نجیب اللہ صدر ہیں۔

داؤد کے فوجی قبضے کے بعد روسی ایجنٹ پارٹی کے دو دھڑوں کو آپس میں جوڑنے میں ناکام رہے۔ ڈیموکریٹک پارٹی کے رہنماؤں کی توجہ ریاست کا تختہ الٹنے کی بجائے' جس کا انہوں نے عہد کر رکھا تھا' پارٹی کے اندر اپنے حریفوں کو ٹھکانے لگانے پر لگی رہی۔ ان کے درمیان اختلافات ذاتی تھے' نظریاتی نہ تھے۔ ایک بڑا اختلافی مسئلہ یہ تھا کہ پارٹی کے اخبار میں پیشانی پر اس کا نام کس رنگ میں لکھا جائے۔

تاہم پارٹی کے یہ رہنما 1978ء میں ملک پر قبضہ کرنے میں کامیاب رہے۔ افغان انقلاب جو ممکن نہ تھا' یقیناً ایک اور فریق کی شمولیت کے بغیر کامیاب نہ ہوا ہوتا اور وہ تھے شاہ ایران۔ نکسن اور کارٹر کے صدارتی دور میں امریکہ نے ایران کا خیر مقدم ایک معاون کے طور پر کیا' جو امریکہ کی براہ راست شمولیت کے بغیر اس علاقے میں اس کے مفادات کے لئے کام کرتا رہے گا۔ اس انتظام کے تحت شاہ کو اربوں ڈالر کی مالیت کے جدید ترین ہتھیار فراہم کر دیئے گئے تھے اور اس کی اس طرح حوصلہ افزائی کی گئی کہ جدید دور کا کسریٰ آئندہ وہی ہوگا۔ بین الاقوامی امن سے متعلق کارنیگی انڈاؤمنٹ ہے' اس میں جنوبی ایشیائی امور کے ماہر سلیگ ہیریسن ہیں۔ انہوں نے مئی 1979ء میں واشنگٹن پوسٹ میں لکھا کہ "وہ بریژنف نہیں' بلکہ شاہ ایران تھے' جن کے ایک عمل کا تسلسل محمد داؤد کے خاتمے پر منتج ہوا۔" انہوں نے لکھا کہ "1974ء کے اوائل

سے ایران نے امریکہ کے حوصلہ دلانے پر بھرپور کوشش کی کہ کابل کو بھی اس اقتصادی اور حفاظتی ادارے میں شامل کرلیا جائے جس کا مرکز تہران میں ہوگا۔ اس میں پاکستان ہندوستان اور خلیج فارس کی ریاستیں شامل ہوں گی۔" شاہ ایران نے کابل کو دو بلین ڈالر کی امداد جو دس سال پر محیط ہوگی پیش کی۔ یہ اس رقم سے بھی زیادہ تھی جو افغانستان نے دوسری عالمی جنگ کے بعد سے غیر ملکی امداد کے طور پر وصول کی تھی۔ شاہ نے داؤد کو ترغیب دی کہ پاکستان کے ساتھ اپنے تعلقات درست کرلیں' اپنے فوجی افسروں کو تربیت کے لئے مصر اور ہندوستان بھیجا کریں اور روس پر انحصار کم کردیں۔ شاہ نے داؤد کو یہ مشورہ بھی دیا کہ اس علاقے کے دوسرے ملکوں سے بھی تعلقات بہتر بنائیں اور ان ملکوں میں چین بھی شامل ہے۔ اگست 1976ء میں وزیر خارجہ کسنجر نے کابل میں داؤد سے ملاقات کی اور اس ملاقات کے فوراً بعد ایک اخباری پیغام جاری کردیا گیا۔ ظاہر ہے کہ داؤد کو نئے دوستوں کی تلاش تھی' کیونکہ اسلام آباد کی حکومت نے 1973ء میں افغان حکومت کو ہراساں کرنے کے لئے مجاہدین کی تربیت اور انہیں اسلحہ کی فراہمی شروع کردی تھی۔

اس کے ساتھ ہی داؤد نے داخلی سیاست میں بائیں بازو کے اثرات کو کم کرنے کی تدبیریں کیں۔ انہوں نے 1977ء میں ایک نیا آئین پیش کیا' جس میں صرف ایک سیاسی پارٹی کی گنجائش رکھی گئی تھی' اور وہ ان کی اپنی پارٹی تھی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے سرکاری انتظامیہ اور فوج سے ڈیموکریٹک پارٹی کے مشتبہ ارکان کو نکالنا شروع کردیا۔ انہوں نے سرکردہ کمیونسٹ دشمنوں کو وزیر داخلہ اور وزیر دفاع مقرر کیا۔ اب پارٹی کے دھڑوں نے جو آپس میں متصادم تھے بے چینی کے ساتھ خود کو متحد کیا اور تیاریاں شروع کردیں۔ تراکی کی سرکاری سوانح عمری کے مطابق فوج کو استعمال کرتے ہوئے "حکمران طبقہ کے تختہ الٹنے کے لئے آسان راستے سے اقتدار چھین لینے" کی تیاریاں۔

ڈیموکریٹک پارٹی نے 19 اپریل 1978ء کو اپنے ایک لیڈر کے جنازے کا جلوس نکالا' جسے غالباً داؤد کے حکم پر ہلاک کیا گیا تھا۔ جب پندرہ ہزار لوگوں کا جلوس کابل کی گلیوں سے "امریکی سامراج مردہ باد" کا نعرہ لگاتے ہوئے گزرا تو بائیں بازو کی طاقت کا یہ مظاہرہ دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ ایک ہفتہ بعد انہوں نے تین رہنماؤں کو گرفتار کرلیا' یہ تھے تراکی' امین اور کارمل۔ ان کے خلاف غداری اور سازش کرنے کے الزامات تھے' دوسرے دن صدارتی محل کے ساتھ فوجی ٹینک آ کر لگ گئے' اس دوران میں دوسرے یونٹوں نے ڈیموکریٹک پارٹی کے رہنماؤں کو رہا کرالیا۔ صدر داؤد مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے' ان کے افراد خاندان محل کے اندر قتل کردیئے گئے۔

اس فوجی قبضے میں افغان فوج کے تقریباً ایک تہائی افسر وہ تھے جنہیں روس میں تربیت دی گئی تھی۔ تاہم افغانستان میں یا اس سے باہر کسی بھی صاحب اقتدار کو فوجی بغاوت کا امکان نظر نہیں آیا۔ تراکی نے بڑے فخر سے کہا کہ "ہمارے انقلاب کی خبر نے دونوں سپر پاور کو یکسر حیران کردیا۔" روسی سفیر جنہیں بالکل یہ

MashalBooks.org

علم نہ تھا کہ فوجی بغاوت کا عمل جاری ہے' 27 اپریل کی صبح وزیر خارجہ کے دفتر کے باہر بیٹھے' ڈیموکریٹک پارٹی کے رہنماؤں کی گرفتاری پر احتجاج کر رہے تھے۔ (دوسرے روز انہوں نے اپنا احتجاجی مراسلہ تراکی کو دیا' جو افغانستان کے نئے صدر بن چکے تھے اور ایک پاکستانی صحافی راجہ انور کی اطلاع کے مطابق جوان کی چشم دید تھی' ''دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔'' جب ببرک کارمل کو ایک باغی افسر نے قید سے رہا کرایا اور انہیں ایک ٹینک پر سوار کرایا تو اس وقت انہیں یہ بالکل اندازہ نہ تھا کہ انہیں کہاں لے جایا جا رہا تھا۔ دوسرے روز وہ تراکی کے نائب وزیر اعظم تھے۔ صدارتی گارڈ کا کمانڈر ڈیموکریٹک پارٹی میں کارمل کے گروہ کا رکن تھا' وہ اپنے ساتھیوں کے خلاف محل کا دفاع کرتے ہوئے مارا گیا۔ روسی خبر رساں ایجنسی تاس حکومت پر ڈیماکریٹک پارٹی کے اس قبضے کو تین دن تک فوجی بغاوت ''قرار دیتی رہی۔'' اسے ایک عوامی انقلاب کا نام نہیں دیا۔ سوویٹ لیڈر اگر اس کے پیچھے ہوتے تو اسے یقیناً یہی نام دیتے۔ لیکن سوویٹ یونین نے نئی حکومت کو فوراً منظور کر لیا اور اس کے فوراً بعد کابل سے امریکی سفارت خانے واشنگٹن کو یہ پیغام دیا۔ ''آخر روسیوں نے یہ 'گریٹ گیم' (بڑا کھیل) جیت لیا ہے۔''

اپریل 1978ء میں انقلابی حکومت نے اقتدار سنبھال لیا۔ اس کی کابینہ میں پارٹی کے دونوں دھڑوں کو مساوی نمائندگی دی گئی۔ روسیوں کی کوشش تھی کہ دونوں حریفوں کو متحد رکھیں' لیکن ان کی کوششوں کے باوجود فوراً تفرقہ پڑ گیا۔ تین مہینے کے اندر پرچم کے لیڈروں کو نکال باہر کیا گیا۔ کارمل کو چیکوسلواکیہ کا سفیر بنا کر باہر بھیج دیا گیا۔ اس دھڑے کے دوسرے لیڈروں کی تقرری بھی ملک سے باہر کر دی گئی۔ کئی ایک گرفتار ہوئے اور انہیں پھانسی دے دی گئی۔ خلق کے اندر امین اور تراکی کے درمیان اقتدار کے لئے شدید کشمکش بڑھتی گئی' تاہم دسمبر میں وہ دونوں دوستی' اچھی ہمسائگی اور تعاون کے معاہدے پر ایک ساتھ دستخط کرنے کے لئے ماسکو گے۔ معاہدے کی ایک شق یہ تھی کہ افغانستان سوویٹ یونین سے فوجی امداد مانگ سکے گا۔

پرانے روسی مشیر جو افغانستان میں مقیم تھے' افغان حکومت ان کے مشوروں کے برخلاف ایسی راہ اختیار کرتی گئی' جس سے لوگوں میں مزاحمت سر اٹھا سکتی تھی۔ وہ روائتی جھنڈا جو سبز' سیاہ اور سرخ رنگ کا تھا اسے ہٹا کر لال جھنڈا لگا دیا گیا۔ ناتجربہ کار اور خودسر سرکاری افسروں نے ضرورت سے کہیں بڑھ چڑھ کر زرعی اصلاح نافذ کرنی چاہی' جس کے خلاف مزاحمت ہوئی۔ قرابت پرست دیہی آبادی میں مزید مخالفت اس وقت ہوئی' جب نئی نئی باتیں دیکھنے میں آئیں' یعنی مشترکہ طریق تعلیم اور جہیز پر قانونی حدود وغیرہ۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انقلابی لیڈروں نے انقلاب کے نام پر افغان معاشرے کے ہر حصے کو مشتعل کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

1978ء - 79 کے موسم سرما کے آنے تک تقریباً ہر صوبے میں مسلح مزاحمت شروع ہو چکی تھی۔

1978ء میں اسلامی بنیاد پرست گوریلا دستے جو 1973ء اور 1976ء کے درمیان داؤد کے خلاف کارروائی کر چکے تھے پانچ ہزار کی نفری کے ساتھ افغانستان میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد مسلح فوجی بغاوتیں شروع ہوگئیں جسے افغان فوج کے نوآموز سپاہی دبانے میں ناکام رہے۔ ان میں سے بیشتر کو جب حکم دیا گیا کہ مخالفوں پر جو اپنے ہی لوگ تھے گولی چلائیں تو وہ بھڑک اٹھے اور مزاحمت کرنے والوں سے مل گئے۔ جاتے جاتے اسلحہ بھی ساتھ لے گئے۔ اسدآباد کے صوبائی دارالحکومت میں متعین افغان فوج کے دستوں نے ایک ساتھ بغاوت کر دی اور ساتھ چھوڑ گئے۔ مارچ 1979ء میں ہرات میں بغاوت ہوگئی۔ ہرات ایرانی سرحد کے قریب ایک قدیمی شہر ہے یہاں شیعہ فرقے کے لوگ رہتے ہیں اور ان میں خمینی کے انقلاب نے زبردست جوش وخروش پیدا کر رکھا ہے۔ ان ایران دوست باغیوں نے حکومت کے طرف داروں اور روس کے مشیروں کی تلاش میں ایک ایک گھر کی تلاشی لی۔ تقریباً ایک ہزار افراد جن میں بہت سے روسی مشیر اور ان کے اہل وعیال بھی شامل تھے قتل کر دیئے گئے۔ جوابی کارروائی کے طور پر شہر کے کچھ علاقے بالکل تباہ کر دیئے گئے۔ جون 1979ء میں تہران ریڈیو کے ایک نشریے میں ایک بزرگ آیت اللہ کی یہ اپیل شامل تھی کہ افغانستان کے عوام کمیونسٹوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں چنانچہ ہزارہ جات کے علاقے میں شیعہ آبادی نے ایک بار پھر بغاوت کر دی۔

اس وقت تک امریکہ نے یہ نتیجہ نکال لیا تھا کہ سوویت رہنما ڈیموکریٹک پارٹی کی قیادت کی جگہ ایک متبادل بندوبست کا منصوبہ تیار کر رہے ہوں گے۔ کابل کے امریکی سفارت خانے نے وسط جولائی میں یہ خبر دی کہ اعلیٰ سطح کے ایک روسی مشن کو جس کی سربراہی خاص سفیر واسیلی سفرونچک کر رہے ہیں "انقلابی تبدیلی" لانے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے کیونکہ "موجودہ حکومت کو عوام کی حمایت حاصل نہیں اور ملک کا کنٹرول اس کے ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے۔" لیکن افغان امور کو درست کرنے کے معاملے میں روس کو محض اس قدر کامیابی ہوئی کہ خلق کے اندر تفرقے میں اور بھی تلخی پیدا ہوگئی۔ اس سازش کی نہایت مکمل تفصیل جو ترہ کی اور امین کے زوال اور روس کے حملے کا سبب بنی رحیہ انور کی کتاب "ریولیوشن اینڈ بحرانز ان افغانستان" ہے جنہوں نے اس سازش میں شریک بہت سے افراد اور ان میں کابینہ کے کئی وزرا بھی شامل تھے کے انٹرویو کئے اور ان کے خاندان کے لوگوں سے بھی باتیں کیں۔ انور نے لکھا: 4 نومبر 1979ء کو ترہ کی ہوانا کے دورے پر روانہ ہوئے۔ ان کی غیر حاضری میں ان کے ایک حمایتی نے جن کا نام سروری تھا امین کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ تاہم سروری نے غلطی یہ کی کہ اس منصوبے پر عمل کرنے کی ذمہ داری اپنے بھانجے کے سپرد کر دی۔ انہیں یہ علم ہی نہیں تھا کہ وہ نوجوان روسی خفیہ ایجنسی کے جی بی کے لئے کام کر رہا تھا۔ اس وقت تک روسیوں کے پاس امین کو راستے سے ہٹانے کے لئے نسبتاً کم سخت تدبیریں موجود تھیں اور اسے اس سازش کی خبر دے دی گئی۔ اس روز کے بعد سے روس کی خیر سگالی پر امین کا یقین پختہ ہوگیا اور ترہ کی کی

MashalBooks.org

تقدیر سربمہر کر دی گئی۔

اس دوران میں ترہ کی دورے سے واپسی پر ماسکو میں روسی وزیر خارجہ اینڈری گرومیکو سے ملاقات کے لئے رک گیا۔ وہاں انہیں مشورہ دیا گیا کہ امین کو جلاوطن کر کے کارمل کو اپنا نائب بنا لیں' لیکن امین' اپنے قتل کے منصوبے کو ناکام بنا چکے تھے اب ان کا کوئی ارادہ ملک چھوڑنے کا نہیں تھا۔ جس دن ترہ کی واپس کابل پہنچے' محل میں ان دونوں لیڈروں کے درمیان زبردست جھگڑا ہوا۔ دونوں لیڈروں کو ایک دوسری ملاقات کے لئے تین دن بعد بلایا گیا۔ اس مرتبہ روسی سفیر کو ان کے اختلافات دور کرانے کے لئے ثالثی کا فریضہ ادا کرنا تھا۔ امین اس امید کے ساتھ کہ ترہ کی سے علیحدگی میں ملاقات ہو جائے گی' ذرا پہلے پہنچ گئے۔ سیڑھیاں چڑھ کر جب وہ ترہ کی کے کوارٹر کی طرف جانے لگے تو پہرہ داروں نے گولی چلا دی' لیکن امین لڑھک کر سیڑھیوں سے نیچے آ گئے اور بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی شام ان کے حکم سے کابل کے تمام کلیدی مقامات پر ٹینک کھڑے کر دیے گئے اور ترہ کی کو گرفتار کر کے ان کے کوارٹر میں پابند کر دیا گیا۔ تین دن بعد امین کے حکم سے افغان انقلاب کے بانی کو قتل کر دیا گیا۔ اب روسیوں پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ وہ افغان رہنما جسے برزنیف نے گلے سے لگایا تھا' اپنی جان دے چکا اور اس کا حریف جس سے روسی نجات پانے کی کوشش میں تھے برسر اقتدار تھا۔ اگرچہ امین نے مخالفوں کو مطمئن کرنے کے لئے تیزی سے اقدامات کئے' مذہبی آزادی دینے کے وعدے کئے اور اس کے بعد روس کی فوجی امداد میں بھی مزید اضافہ ہوا' لیکن نہ تو وہ بغاوت کو دبا سکے اور نہ بڑے پیمانے پر سیاسی مدد حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ اب وہ دباؤ کم کرنے کی خاطر حکمت عملی سے کام لینے پر آمادہ ہوئے اور امریکہ اور پاکستان دونوں سے مراسم پیدا کرنا چاہا' لیکن اس کے ساتھ ہی وہ روس سے مزید امداد طلب کر رہے تھے۔ جولائی کے مہینے تک افغان فوج میں پندرہ سو فوجی مشیر مقرر کئے جا چکے تھے اور ان کی حفاظت کے لئے کابل کے قریب روس کی ایک ایئر بورن بٹالین تعینات کر دی گئی تھی۔ نومبر کے آخری دنوں میں امین نے روسیوں سے کہا کہ کابل کو بچانے کے لئے وہ دس ہزار سپاہی بھجوائیں تاکہ وہ دیہی علاقوں میں باغیوں پر حملہ کر کے افغان فوجوں کو رہا کروا سکے۔ 29 نومبر اور 5 دسمبر کے درمیان' اضافی روسی بٹالین کو ہوائی جہازوں کے ذریعے افغانستان پہنچا دیا گیا۔ ان میں سے ایک بٹالین نے وسط دسمبر میں اس کلیدی سرنگ کو بچانے کے لئے کارروائی شروع کر دی جو سوویت کو جاتی تھی۔

اس مرحلے میں امین نے پاکستان کی طرف رجوع کیا۔ انہوں نے صدر ضیاء کو کابل آنے کی دعوت دی تاکہ متنازعہ سرحد کے سوال پر پاکستان کی شرائط کے تحت معاملہ طے ہو جائے' اس کے عوض پاکستان' افغان مزاحمت کو مدد دینا بند کر دے گا۔ انہوں نے یہاں تک کہا کہ ایک امریکی سفارتی عہدیدار نے نجی گفتگو میں مفاہمت کی بات بھی کی۔ امریکی صحافیوں سے اپنے انٹرویوز میں انہوں نے امریکہ سے امداد کی اپیل کی اور وعدہ کیا کہ "افغانستان میں کوئی فوجی اڈہ قائم نہیں ہونے دیں گے۔" وسط

MashalBooks.org

دسمبر میں ضیاء نے امین کے دعوت نامے کے جواب میں اپنے وزیر خارجہ کو ان کے پاس بھیجنے کی آمادگی ظاہر کی۔ امین اس پر خوشی سے جھوم اٹھے اور روسیوں سے انہوں نے کہا کہ اب اپنی فوجوں کی نقل و حرکت بند کر دیں۔ چند امریکی تجزیہ نگاروں نے قیاس کیا ہے کہ امین ایک افغان ٹیٹو تھے یا کم از کم روسیوں کی ان کے بارے میں یہی رائے تھی' لیکن پاکستان کے وزیر خارجہ نے اچانک 22 دسمبر کو اپنا دورہ کابل منسوخ کر دیا' اس پر امین نے ضیاء کے خلاف لڑنے والے پاکستانی منحرفین کو اسلحہ کی پیش کش کی اور یہی پیش کش ایران میں خمینی سے لڑنے والے بلوچ باغیوں کو بھی کی۔ ان سب باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ امین اپنی حکومت کو بچانے کے لئے جنگ کا دائرہ پھیلانا چاہتے تھے۔ اس امکان کے پیش نظر کہ اس طرح تو پورے علاقے میں عدم استحکام پیدا ہو جائے گا' روسیوں کو یقیناً پریشانی لاحق ہوئی ہوگی۔

27 دسمبر کو روسی فوجوں نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ سرحد پار کی اور حالات پر قابو پانے کے لئے کارروائی شروع کر دی۔ اسی شام تک ایک روسی دستہ وزارت دفاع کے قریب ایک محل میں پہنچ گیا' روسی مشیروں نے ''حفاظتی اسباب'' کے تحت امین سے پہلے ہی درخواست کی تھی کہ اس میں منتقل ہو جائیں۔ پرانی اقامت گاہ کے برعکس اس محل میں حفاظتی دیواریں نہیں تھیں۔ یہ محل بالکل ہی ناقابل دفاع تھا۔ وہاں پہنچنے سے ایک دن پہلے امین پر ایک اور قاتلانہ حملہ ہوا تھا اور وہ اس میں بچ نکلے تھے۔ یہ ایک حساس نوعیت کی سازش تھی' جو یقیناً لفٹیننٹ جنرل پاپوٹن نے تیار کی تھی' وہ روس میں داخلہ امور کے پہلے ڈپٹی منسٹر تھے۔ ربعہ انور بتاتے ہیں کہ وہ سازش کیسے ناکام ہوگئی۔ صدارتی اقامت گاہ میں روسی باورچی ملازم تھے۔ ظاہر ہے کہ افغان صدر' دوسرے افغانیوں کے مقابلے میں انہیں زیادہ قابل اعتماد سمجھتا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ باورچی امین کے لئے دوپہر کے کھانے میں کچھ نشہ آور اشیا ملا دیں اور وہ بے ہوش ہو جائیں۔ اس طرح ان کو سوویت میڈیکل کور (طبی دستے) کی سپردگی میں دے دیا جائے گا' جہاں وہ روسی فوجی امداد کے لئے شکرگزاری کا اعلان کریں گے' پھر ان سے کہا جائے گا کہ یا تو مستعفی ہو جائیں یا پھر تراکی کے قتل کے الزام میں گرفتاری اور مقدمے کے لئے تیار ہو جائیں' لیکن امین نے کھانا بہت کم کھایا تھا اور جلد ہی ہوش میں آ گئے۔ انہوں نے اپنی بیوی سے کہا: (پریشان مت ہو' سوویت فوج ہمیں بچانے کے لئے آ رہی ہوگی۔'' یہ بات انہوں نے اس سے چند ہی منٹ پہلے کہی تھی' جب ایک سوویت دستہ جس میں تاجک سپاہی شامل تھے محل میں پہنچا۔ اس کے بعد امین کو اپنی میز پر مردہ پایا گیا' گولی ان کے سر کے پار ہوگئی تھی۔ یہ ذمہ داری جنرل پاپوٹن کے سپرد کی گئی تھی کہ افغان صدر کی برطرفی کا کوئی نہایت پوشیدہ حربہ استعمال کریں۔ اس واقعہ کے جلد ہی بعد وہ بھی ہلاک ہو گئے۔ غالباً اپنے ہی ہاتھوں سے۔

افغانستان پر فوری حملے کی صورت یوں پیدا ہوئی کہ ملک کا داخلی خلفشار کریملن کے نظریے کے مطابق اور بریژنف کے الفاظ میں جس کا اظہار انہوں نے دو ہفتے بعد کیا'' سوویت ریاست کی سلامتی کے

MashalBooks.org

لئے سنگین خطرے کا باعث بن گیا تھا۔" روس کی وسط ایشیائی مسلم جمہوریتوں کے ساتھ افغانستان کی سرحد لگتی ہے جو ایک ہزار میل لمبی ہے۔ ان جمہوریتوں میں تاجک' ازبک اور ترکمان آباد ہیں اور انہی قومیتوں کے لوگ افغانستان میں بستے ہیں۔ 1978ء میں روسیوں کے خلاف دوشنبہ میں جو سرحد کے قریب روس کا ایک شہر ہے' تاجک لوگوں نے بلوہ کر دیا تھا۔ 1979ء کے اواخر میں ایران میں خمینی کے انقلاب نے اس پورے علاقے میں اسلامی قوم پرستی کو بہت ہوا دی تھی۔ 4 نومبر کو تہران میں امریکی سفارت خانے کے اندر امریکیوں کو یرغمال بنا لیا گیا تھا' اس سے امریکہ کی فوجی کارروائی کا امکان بڑھ گیا تھا' یہ جگہ سوویت یونین کی سرحد سے ایران کے اندر چند سو میل کے فاصلے پر ہے۔

اب روسیوں کے لئے دو ناپسندیدہ باتیں منتخب کرنے کے لئے رہ گئی تھیں۔ ایک تو یہ کہ ایک ایسے ملک کو جوان کی سرحد پر واقع ہے اور جو بیس سال سے زائد عرصے تک ان کے حلقہ اثر میں رہ چکا ہے' اسے معاملات خود سلجھانے دیں اور جس کا سوویت دشمن اسلامی بنیاد پرستوں کے ہاتھوں میں چلا جانا عین قرین امکان ہے۔ اس صورت میں اسے قدامت پرست عرب ممالک' چین اور امریکہ کی حمایت حاصل ہوتی رہے گی۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ حملہ کر دیں۔ مختصر یہ کہ کریملن کی سیاسی حکمت عملی کی ناکامی کا فوری جواب یہی ہو سکتا تھا۔ 25 جون 1979ء کو کابل میں ایک اعلیٰ امریکی سفارت کار سے باتیں کرتے ہوئے سفیر ونچک نے اس بات سے اتفاق کیا تھا کہ روس کا حملہ جس کے بارے میں پہلے سے قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں "معاملات کو بہت الجھا دے گا اور اس سے سوویت امریکی تعلقات کو نقصان پہنچے گا۔" کابل میں اسی سفارت کار سے مشرقی جرمنی کے سفیر نے بھی کہا تھا کہ روس کی حملہ آور فوج کے خلاف پوری افغان قوم اسی طرح اٹھ کھڑی ہوگی' جس طرح انیسویں صدی میں وہ برطانیہ کے خلاف اٹھی تھی۔ کابل میں روس اور کمیونسٹ بلاک کے سفارت کار روسی کارروائی سے پیدا ہونے والے خطرات کو جانتے تھے' اس سے معلوم ہوا کہ کریملن کے پاس ماہرانہ مشورے کی کمی نہیں تھی' بس یہ ہے کہ انہوں نے مشوروں کو نظر انداز کر دیا۔ حملے کے وقت امریکہ میں بریژنیف ڈاکٹرن (Brezhnev Doctrine) پر خاصی بحث ہوئی' اس پالیسی کا آغاز اس وقت ہوا جب سوویت ٹینک چیکوسلواکیہ سے واپس آنے لگے۔ 1968ء میں کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری الگزینڈر ڈوبے نے چیکوسلواکیہ پر اپنی اصلاح کا تجربہ کیا تھا۔ اب افغانستان میں مداخلت کا مطلب یہ ہوگا کہ روس گویا یہ اعلان کر رہا ہے کہ وہ اپنی فوجوں کے ساتھ مشرقی یورپ کے حلقہ اثر سے باہر بھی سوشلسٹ انقلاب کا "دفاع" کرنے پر آمادہ ہے۔ سوشلسٹ ملکوں کو پیچھے ہٹنے سے روکنے کے لئے فوجی طاقت کا استعمال روس کا معمول بن گیا ہے اور یوں امریکہ کی دونوں سیاسی پارٹیوں کے اندر انتہا پسندوں کے اس موقف کی تصدیق ہوگئی ہے کہ روس علانیہ طور پر ایک توسیع پسند طاقت ہے۔ جس طرح میونخ کو پر دلدہی کے احمقانہ رویے کا اثر ہوا اور پرل ہاربر پر حملہ ہو گیا اسی طرح افغانستان سوویت روس کی بے حساب

حرص وہوس اور غیر یقینی طرزِ عمل کا استعارہ بن گیا۔

اب کہ آٹھ سال گزر چکے ہیں' یہ بات بظاہر صاف ہوگئی ہے کہ افغانستان میں روس کے مقاصد ہمیشہ بہت محدود تھے۔ پہلی بات تو یہ کہ چینیوں نے جو موقف تبت میں اختیار کیا' اس کے برعکس روسیوں نے کبھی بھی افغانستان پر اپنی بالادستی کا دعویٰ نہیں کیا' نہ انہوں نے اسے اپنا تابع بنانے کے لئے بہت زیادہ وسائل استعمال کئے۔ بظاہر انہیں چند مہینوں کے بعد ہی علم ہوگیا تھا کہ ان کی فوج بھاری امداد کے بغیر مدافعت کو دبا نہیں سکے گی۔ دوئم اس حملے کے بعد چند ہفتوں کے اندر روسی لیڈروں نے سوویت فوجوں کو واپس بلانے کے معاملے پر اصولی اتفاق کر لیا تھا۔ یہ ایسا وعدہ تھا جو انہوں نے مشرقی یورپ کے سلسلے میں بھی نہیں کیا تھا۔ سوئم سوویت حکمت عملی سے گزشتہ آٹھ سال کے اندر ایسی کوئی علاقائی توسیع کی علامت ظاہر نہیں ہوئی' جس کا روس کے حملے کے وقت امریکہ میں اس قدر اندیشہ کیا جاتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ پاکستان پر فوجی دباؤ میں اضافہ ہوا ہے' لیکن بظاہر اس کی وجہ یہی ہے کہ اس طرح مجاہدین کو امداد دینے کے سلسلے میں پاکستان کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ ایران کے معاملے میں روس کی پالیسی بہت محتاط رہی ہے۔

کریملن کو امید تھی کہ افغانستان کو "بچانے" کے سلسلے میں فوجی کارروائی کا مرحلہ مختصر عرصے میں طے ہو جائے گا' روسیوں نے شاید یہ باور کر لیا ہو کہ اتنی شدید عداوت جو ابھر کر سامنے آئی ہے تو اس کا سبب افغان حکمران پارٹی کی انقلابی پالیسیاں نہیں بلکہ امین کا ذاتی رویہ ہو۔ انہوں نے یقیناً سوچا ہوگا کہ کارمل ایک سیدھا سچا اور لوگوں میں مقبول شخص بھی ہے' اس لئے اس کی وجہ سے زیادہ عوامی تعاون حاصل ہوگا۔ جس طرح صدر کینیڈی کو 1963ء میں یہ یقین دلایا گیا تھا کہ نگوڈینہ ڈیم کی برطرفی اور اس کے ساتھ ہی امریکی فوجی مشیروں کی زیادہ تعداد میں موجودگی سے ویت نام کے مسائل حل ہو جائیں گے' اسی طرح روسیوں کو یہ خوش فہمی لاحق ہوگئی تھی کہ امین کی برطرفی اور روسی فوج کی موجودگی سے انقلابی حکومت کو استحکام حاصل ہو جائے گا۔

بھاری تباہی اور انسانی مصائب و آلام کے باوجود افغانستان کی جنگ کو ویت نام یا کوریا کی جنگ کے مقابلے میں ایک محدود کارروائی کہا جائے گا۔ سوویت یونین نے شروع ہی سے چار سیاسی مقاصد پر اپنی توجہ مرکوز کی تھی۔ پہلا مقصد یہ کہ سوویت یونین سے کابل تک جانے والی سڑک کے ساتھ شمال کے میدانوں اور پہاڑی علاقوں پر اور افغانستان کے دوسرے بڑے شہروں اور ان کو ملانے والی سڑکوں پر اپنا کنٹرول رکھنا۔ دارالحکومت کے قریب بھاری افغان فوج کا ایک بڑا اڈہ ہے اور اس پورے علاقے میں روس کے سپاہی گشت کرتے رہتے ہیں۔ شمالی علاقے میں مزاحمت نمایاں طور پر نظر آتی ہے' لیکن اسلامی تنظیموں کی باہمی رقابت کے باعث ان کی مزاحمتی طاقت کم ہو جاتی ہے۔ سوویت یونین کا دوسرا مقصد ایران کے مقابل مغربی سرحد کی نگرانی کرنا ہے' روسیوں نے سرحد کے ساتھ بھاری فوج لگا رکھی ہے۔ لیکن حملے کے لئے اسے شاذ ہی

MashalBooks.org

کبھی استعمال کیا جاتا ہو۔ تیسرا مقصد' ایک مستقل کوشش یہ ہے کہ پاکستانی سرحد کے قریبی شہروں کے راستوں پر اپنا کنٹرول رکھنا اور مجاہدین کے لئے ساز و سامان کی فراہمی میں فضائی حملوں اور کمانڈو چھاپہ ماروں کے ذریعے رکاوٹ ڈالنا۔ چوتھا مقصد: روسی' افغانستان میں شہری سہولتوں کی تنصیب اور اس کی حفاظت کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ فوجی دستے سرکاری تنصیبات' گوداموں اور ہسپتالوں وغیرہ کے گرد پہرے دے رہے ہیں' جن پر حملے اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہاں جنگ کے چار خطے ہیں' جو افغانستان کے بمشکل بیس فیصد علاقے پر مشتمل ہیں' لیکن ستر فیصد خوراک یہیں پیدا ہوتی ہے۔ باقی ملک میں اگرچہ جنگ کے اثرات محسوس کئے جاتے ہیں' لیکن یہاں کے لوگ اسے چنداں اہمیت نہیں دیتے۔ افغانستان کا بیشتر حصہ اب تک مقامی خانوں اور ملکوں کے ماتحت اسی طرح ہے' جیسے صدیوں پہلے تھا۔ یہ مقامی سردار روس کی موجودگی کے خلاف ہیں اور اگرچہ مزاحمت کرنے والوں کے ساتھ ان کا رویہ ہمدردانہ ہے' لیکن وہ مجاہدین کے اثر سے آزاد ہیں۔

روسی ذرائع ابلاغ نے حملے کے تقریباً دو سال بعد یعنی ستمبر 1981ء تک جنگ میں کسی روسی سپاہی کی ہلاکت کی خبر نہیں دی تھی اور سوویت اخبارات نے جنگ کے پہلے پانچ سال کے اندر اس امر کی کوشش کی تھی کہ افغانستان میں روسی فوجی اقدامات کو کم سے کم ظاہر کرے اور یہ تاثر دے کہ روسی فوجی دستے افغانستان میں صرف فوجی تربیت دینے کے لئے ہیں' جو بات امریکہ کے لئے ویت نام میں درست تھی' اسی طرح روسیوں نے بھی ابتدا میں یقین کر لیا تھا کہ ان کی فوجوں کو لڑنا نہیں پڑے گا۔ افغانستان میں ان کی فوجوں کی موجودگی سے ہی افغان فوج کے ارادوں میں پختگی آ جائے گی اور ان کے حوصلے بلند ہو جائیں گے' لیکن جب فوج میں بھرتی ہونے والے رنگروٹ جوق در جوق بھاگنے لگے تو افغان فوج سکڑ کر رہ گئی۔ اب اس قدر بے یقینی آ گئی تھی کہ روسی مشکوک یونٹوں کے سپاہیوں سے رات کے وقت اسلحہ واپس لے لیتے اور رائفل اور مشین گن صرف دوسری صبح دے دیتے تھے۔ پانچ سال کی جنگ کے بعد ایک لاکھ پندرہ ہزار سے کچھ زائد روسی فوج' جسے تیس ہزار سپاہیوں کی اضافی مدد بھی حاصل تھی' روسی سرحد کے قریب صرف بیس فیصد دیہات اور شہروں پر غیر یقینی کنٹرول حاصل کر سکی تھی۔ رات کے وقت وہ سارے علاقے یہاں تک کہ بڑے بڑے شہر بھی باغیوں کے قبضے میں ہوتے تھے۔ خود کابل بھی گوریلوں کے راکٹوں سے محفوظ نہیں تھا۔ روسی فوجی جب وطن واپس آتے تو شکایت کرتے "وہاں چلنے پھرنے کے لئے کوئی محفوظ جگہ نہیں۔"

لاکھوں روسی سپاہی جن میں بیشتر نئے بھرتی ہونے والے رضاکار شامل تھے' افغانستان میں خدمت انجام دے چکے ہیں۔ دس ہزار سے زائد لڑائیوں میں قتل ہو چکے ہیں۔ روسیوں نے اپنے فوجی مقاصد محدود کر دیئے ہیں اور اپنی حکمت عملی میں ترمیم کر دی ہے۔ انہیں امید ہے کہ اس طرح ان کے سپاہی کم ہلاک ہوں گے' لیکن پینٹاگون (امریکہ کے فوجی ہیڈ کوارٹر) کے تجزیہ کاروں کو یقین ہے کہ ان کے یہاں

MashalBooks.org

ہلاک اور زخمی ہونے والوں اور جنگ کے علاوہ مرنے والوں کی تعداد اب بھی چار سے پانچ ہزار سالانہ ہے اور بیشتر اموات دشمن کی گولی سے زیادہ پیچش' ہیضے اور ناقص طبی نگہداشت کے سبب ہوتی ہیں۔ پینٹاگون اور سی آئی اے کے متعدد مبصر افغانستان کو بغور دیکھ رہے ہیں' کیونکہ دوسری عالمی جنگ کے بعد اب اس طویل جنگ کے ذریعے پہلی بار سوویت فوج کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ پینٹاگون کے سراغ رساں تجزیہ کار کہتے ہیں کہ تجربے کی بدولت سوویت فوج اب پہلے سے زیادہ مستعد ہو گئی ہے' لیکن یہ بھی بتاتے ہیں کہ روس کی کارکردگی نے انہیں متاثر نہیں کیا۔ افغانستان میں روسی سپاہیوں کے حوصلے پست ہیں۔ شراب اور منشیات ان کے لئے سنگین مسئلہ بن گئی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ روسی طریقے اب متروک یا ناموزوں ہو کر رہ گئے ہیں۔ فوجیوں میں ڈھیلا پن اور ڈسپلن کا فقدان ہے' لیکن کچھ دیگر مبصرین مثلاً محکمہ دفاع میں سراغ رسانی کے ماہر ایلی کراکوسکی کہتے ہیں کہ ان مسائل کے باوجود اور اس کے باوصف کہ باغیوں کو زیادہ حساس نوعیت کے ہتھیار مل گئے ہیں اور روسیوں نے رفتہ رفتہ مخالفوں کی صف میں رخنے ڈال دیئے ہیں۔ ایک اور پرانے اسپشلسٹ جن کا تعلق پینٹاگون سے ہے' یہ کہتے ہیں کہ افغانستان میں روسیوں نے جو کام اپنے ذمے لے رکھا ہے' اسے دیکھتے ہوئے' ان کے پاس نفری ہمیشہ بہت کم رہی ہے۔ ان کا اندازہ ہے کہ کسی بھی روز جنگ کے لئے تیس ہزار جنگجو بھیجے جا سکتے ہیں' جو ایک ایسے ملک میں جو تکساس کے برابر ہے' کچھ بڑی تعداد نہیں۔ روس کے پاس کوئی بیس ہزار مسلح فوجی ہیں اور وہ ضرورت محسوس کرتے تو اس سے زائد فوجی دستے بھی جنگ کے لئے بھیج سکتے تھے۔

جب روسی فوجوں نے افغانستان میں مداخلت کی تو مغرب میں اس وقت یہ پیش گوئی کی گئی کہ روس کے اطاعت گزار عوام کو جنگ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جائے گا' بس حکومت کے مفاد میں جھوٹ بولا جائے گا اور کریملن کو پوری آزادی حاصل ہوگی کہ افغانستان کو رام کرنے کے لئے جو بھی چاہے کرے پھر نہ تو ملک کے اندر مخالفت کا سامنا ہوگا اور نہ دنیا بھر میں ہونے والی نکتہ چینی سے کوئی پریشانی لاحق ہوگی۔ لیکن یہ سب کچھ نہیں ہوا۔ آٹھ سال گزرنے کے بعد جنگ کے اثرات روس کے معاشرے میں وسیع پیمانے پر محسوس کئے جا رہے ہیں۔ آرمینیا' جورجیا' یوکرین اور دوسری جمہوریتوں میں افغانستان میں فوجی ملازمت کے خلاف مظاہرے ہو چکے ہیں۔ چالیس سے پچاس لاکھ تک افغان مہاجر ہو چکے ہیں اور جنگ کے بہیمانہ کردار کا اثر خود روسی فوجیوں پر بھی ہوا ہے' ملک میں واپس آنے والے سپاہی بالکل یقینی خبریں لے کر آتے ہیں' چنانچہ روسی شہری اب جنگ کے بارے میں بہت زیادہ باخبر ہو چکے ہیں اور اس بارے میں اخلاقی نوعیت کے سوالات اٹھاتے ہیں' ایسے ہی سوالات جن سے امریکہ کو ویت نام کی جنگ کے زمانے میں پریشانی لاحق ہوا کرتی تھی۔ وہ روسی شہری بھی جو افغانستان پر حملے کے سرکاری موقف کو درست مانتے ہیں یعنی یہ کہ یہ جنگ پاکستانی اور امریکی جارحیت کا نتیجہ ہے' وہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ اس جنگ کی کوئی حد نظر نہیں آتی' خود

MashalBooks.org

گورباچوف کے الفاظ میں یہ ایک "رستا ہوا گھاؤ" ہے کیونکہ اس سے روس اکیلا ہوتا جا رہا ہے اور اس کے سبب سے ملک کے اندر اصلاح کے عمل میں تاخیر ہو رہی ہے۔ گزشتہ آٹھ برسوں کے اندر ہر سال اقوام متحدہ میں ایک قرارداد منظور کی جاتی ہے جس میں افغانستان پر روس کی مذمت ہوتی ہے۔ ایسے الفاظ میں کہ ویت نام جنگ کے زمانے میں امریکہ کے خلاف بھی ایسی مذمت نہیں کی گئی تھی اور اب دنیا کی 123 اقوام نے اس مذمتی قرارداد کی توثیق کر دی ہے۔ افغانستان پر حملے کی وجہ سے روس کے تعلقات نہ صرف امریکہ سے خراب ہوئے بلکہ چین' ایران اور دوسرے اسلامی ملکوں سے بھی تعلقات میں بگاڑ پیدا ہو گیا۔ کریملن میں قیادت نے چونکہ یہ فیصلہ کیا کہ افغانستان میں فوج کی تعداد کو محدود رکھا جائے' اس لئے روس کا سیاسی نقصان اتنا زیادہ نہیں ہوا' جتنا امریکی قیادت کو ویت نام کی جنگ میں ہوا' پھر بھی وقت گزرنے کے ساتھ نقصان بڑھتا جاتا ہے۔ آٹھ سال کے عرصے میں چار قومی قیادتوں کے تحت سوویت روس کے مقاصد بتدریج کم ہوتے گئے اور اس کی حکمت عملی میں اصلاح پیدا ہوئی۔

برزنیف کے زمانے میں' سوویت فوج افغانستان کے دیہات میں تلاشی اور تباہی کی مہم' بڑے پیمانے پر جاری رکھتی تھی۔ جن دیہات کے بارے میں شک پیدا ہوا کہ گوریلوں سے رابطہ رکھتے ہیں' ان پر بمباری کی گئی اور ان کے پانی اور خوراک کے ذخائر دانستہ تباہ کر دیئے گئے' تاکہ گوریلے جہاں پناہ لے کر بیٹھے ہیں' وہاں سے نکل جائیں۔ 1980ء میں قندھار میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ یہ افغانستان کا دوسرا بڑا شہر ہے' ساتھ ہی ہرات اور جلال آباد میں بغاوت ہو گئی۔ کئی شہر پورے ہفتے بھر تک باغیوں کے کنٹرول میں رہے' یہاں تک کہ روسی فوجوں نے وہاں سے انہیں نکالا۔ روسیوں نے 1982ء میں اور پھر 1984ء میں کابل سے 45 میل شمال کی جانب پنج شیر کی وادی میں ایک بڑا حملہ کیا۔ یہ وادی مزاحمت کا زبردست مرکز تھی' لیکن روسیوں کی کوشش ناکام ہو گئی۔ اپریل 1983ء میں روس کے بمبار طیاروں نے ہرات پر تابڑ توڑ بمباری کی' جس میں بہت سے شہری ہلاک ہوئے۔ اسی کے ساتھ روس کے سیاسی مشیر کابل میں اصلاحات کے نفاذ کا مشورہ دے رہے تھے تاکہ انقلابی حکومت عام لوگوں کے لئے قابل قبول ہو جائے۔ کیونکہ اس وقت تک چالیس لاکھ سے زیادہ افغانی گھروں کو چھوڑ کر نکل گئے تھے' جن میں سے تیس لاکھ پاکستان کے کیمپوں میں تھے' جہاں سے مزاحمتی جنگ کے لئے بڑے پیمانے پر رنگروٹ بھرتی ہو رہے تھے۔ آج انہی میں سے بہت سے مہاجر سرحد پار کرتے جا رہے ہیں اور آ رہے ہیں۔ ان کے پاس گوریلوں کے لئے سامان ہوتا ہے۔ کبھی کبھی وہ ٹرکوں اور گاڑیوں میں چھپ کر جاتے ہیں' لیکن زیادہ تر خچر یا اونٹ پر سواری کرتے ہیں۔ روسیوں کو اس بات کا اندازہ تاخیر سے ہوا کہ ان کے حملے شہری آبادی پر جیسے جیسے وحشیانہ ہوتے گئے' ان کی مشکلات میں بھی اسی تناسب سے اضافہ ہوتا گیا۔ افغان جنگجو روایتی طور پر اپنے کنبے کے علاقے سے زیادہ دور نہیں جاتے۔ انہیں لازماً اپنے بیوی بچوں کی حفاظت کرنی ہوتی ہے' اتنے بہت سے کنبوں کو

مہاجر کیمپوں میں بھیج کر روسیوں نے نادانستہ طور پر مجاہدین کو ان کی گھریلو ذمہ داریوں سے آزاد کرا دیا تھا اور انہیں نہایت قوی اور آزاد دشمن بنا لیا تھا' جو بے روک ٹوک کہیں بھی جا سکتا تھا۔ مجاہدین نے خود بھی اس عمل میں تیزی پیدا کی۔ سوویت روس کے حملے سے پہلے ہی انہوں نے کمیونسٹ حکومت کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا تھا اور مقررہ رسم کے مطابق اپنے کنبوں کو جائے امان' یعنی پاکستان پہنچا دیا تھا۔ یہ تعداد میں کوئی چار لاکھ 70 ہزار تھے۔ 1981ء کے وسط تک پاکستان میں 25 لاکھ مہاجر پہنچ چکے تھے' اس کے بعد آئندہ سات برسوں میں مجموعی اضافہ صرف چار لاکھ کا ہوا۔

جب یوری اینڈروپوف سوویت کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری بنائے گئے تو 1982ء میں اس وقت تک روس کی جلد کامیابی کے امکانات ختم ہو چکے تھے۔ لہٰذا فوجی حملوں اور بمباری میں کمی کر دی گئی اور روسیوں نے وہ حکمت عملی اختیار کی' جس پر وہ پہلے سے' لیکن تعطل کے ساتھ عمل کرتے آئے تھے۔ روسی مشیروں نے اس بات پر اصرار کرنا شروع کیا کہ افغان حکومت اصلاح کے معاملے میں سنجیدگی سے کام کرے' کابل کے تاجروں کے ساتھ اپنے تعلقات بحال کرے اور حکومتی طریقے تبدیل کرے۔ کے جی بی نے افغان خفیہ پولیس کی نئے سرے سے تنظیم کی اور اسے مستحکم بنایا۔ اب غیر روایتی جنگ کے طریقوں پر زور دیا جانے لگا۔ یعنی دھوکے سے وار کرنا' دشمن میں اپنے آدمیوں کو داخل کر دینا' ان کے علاوہ رشوت اور قتل کی وارداتیں۔ افغان مزاحمت کو زیر کرنے کے یہ طریقے تھے۔ بہت سی صورتوں میں روسی' مقامی کمانڈروں سے مفاہمت پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے' اب طرفین کے درمیان زیادہ کشادگی پیدا ہو گئی اور جنگ کی خبروں کی بجائے جورات کے نشریوں میں سنی جاتی تھیں' اب مقامی سطح پر ہونے والی جنگ بندی کی خبریں آنے لگیں۔ اینڈروپوف کے زمانے میں یہ بھی ہوا کہ قبائلی رقابتوں اور مجاہدین کے درمیان ہونے والی مفادات کی لڑائیوں کو سیاسی حکمت عملی کی خاطر زیادہ استعمال کیا جانے لگا۔ اس کے بعد جب شہروں پر حملہ ہوتا یا روسی قافلوں پر شب خون مارا جاتا تو پھر اس کی مزاحمت ہوتی تھی۔

ادھر امریکہ میں روس کے مظالم کی کہانیاں اخبارات اور جرائد کے اندر وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں۔ نومبر 1985ء کے ریڈرز ڈائجسٹ میں ایک انوکھی خبر شائع ہوئی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ زائن جن نام کے ایک دس سالہ ننھے چرواہے کو گھاس میں گڑیا جیسی کوئی چیز ملی اور پھر دھماکے سے اس کے دونوں ہاتھ اڑ گئے۔ آرتھر بونر ایک 65 سالہ ریٹائرڈ ٹیلی ویژن جرنلسٹ ہیں۔ انہوں نے 1985ء اور 1986ء میں ٹائمز کے نامہ نگار کے طور پر افغانستان کے سات دورے کیے۔ انہوں نے کوئی ساڑھے تین ہزار میل کا سفر کیا اور پورے ملک میں گھومتے رہے' انہیں یاد آیا کہ ایک "کھلونا بم" پیالے کی شکل کا' انہیں بھی دکھائی دیا تھا۔ کچھ دوسرے لوگوں نے بتایا کہ انہوں نے چند مہلک نمونے اسی وضع کے دیکھے تھے' چھوٹے پستول کی طرح کے یا گھوڑے کی نال جیسے۔ یہ دھوکے والے بم پہاڑوں کے دروں میں جنگ کے ابتدائی برسوں میں پھینکے گئے

تھے۔ آج کل اتنے ہتھیار تقسیم نہیں ہوئے جتنی اس نوع کی کہانیاں شائع کی گئیں۔

روس پر نسل کشی کا الزام لگاتے ہوئے مجاہدین نے اس سلسلے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس طرح کی چشم دید اطلاعات ہیں کہ کسی علاقے میں گوریلوں کے حملے کے بعد انہوں نے نہتے دیہاتیوں سے انتقام لیا اور یوں جنگی جرائم کے مرتکب ہوئے۔ 13 ستمبر 1982ء کو ایک ایسے ہی موقع پر افغانستان میں امریکہ کے ایک سابق سفارت کار بروس ایمسنٹ نے "مستند حوالوں" سے بتایا کہ روسی فوجیں کابل سے 35 میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں گھس گئیں اور وہاں کے 105 باشندوں کو جن میں بچے اور عورتیں بھی شامل تھیں ایک سرنگ میں ٹھونس کر سب کو ہلاک کر دیا۔ ایسے ہی ایک اور موقع پر روسی حملے کے بعد سویڈن کے ایک عہدیدار نے جو گوریلوں کی قید میں تھا' بتایا کہ 'روسی سپاہیوں نے چھ دیہات میں جہاں بھی کسی زندہ وجود کو دیکھا' اس پر گولی چلا دی' انسان' مرغیاں' خچر' جو بھی نظر آیا' پھر جو کچھ بھی قیمتی نظر آیا' اسے لوٹ لیا۔" لیکن پینٹاگون کے حکام اس الزام پر یقین نہیں کرتے کہ روسی' جان بوجھ کر ملک کو تباہ کر رہے ہیں۔ یہاں بھی Belgian Body Syndrome کام کر رہا ہے۔ پینٹاگون کے ایک عہدیدار نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ان کا اشارہ برطانیہ کی پروپیگنڈہ مہم کی طرف تھا' جبکہ پہلی عالمی جنگ کے زمانے میں امریکہ کے اندر جرمن باشندوں کے خلاف جذبات بھڑکائے جا رہے تھے۔ 1980ء کے اوائل میں اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ (امریکہ) نے روسیوں پر بار بار الزام لگایا کہ وہ کیمیائی ہتھیار استعمال کر رہے ہیں۔ امریکہ کی ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق صرف 1982ء میں افغانستان پر (کئی درجن کیمیاوی حملے) ہوئے جس کے نتیجے میں تین سو جانیں ضائع ہوئیں۔ ایمسنٹ نے بتایا کہ مغرب کے نامہ نگاروں نے پشاور میں ایک ہسپتال کے ڈائریکٹر اور کم از کم ایک روسی بھگوڑے سپاہی نے اپنے چشم دید بیانات میں کیمیاوی ہتھیاروں کے باضابطہ استعمال کی گواہی دی ہے۔ تاہم روسی اس بات سے انکار کرتے ہیں' وہ رضاکار ڈاکٹر اور نرسیں' جو افغانستان کے اندر مجاہدین کی امداد میں مصروف رہتے ہیں' ہمیں ان سے بات چیت کرنے کا موقع ملا اور ان سب نے بتایا کہ سرنگوں اور ہوائی حملوں سے عام لوگوں اور جانوروں کو تو ہم نے ہلاک ہوتے ہوئے دیکھا' لیکن گیس کے حملوں سے ہلاک ہونے والوں کا سراغ نہیں ملتا۔

روسیوں نے اپنی جنگی حکمت عملی کو اینڈروپوف کی سفارتی کوششوں کے ساتھ جوڑ دیا اور مزاحمت کو ختم کرنے کی کوشش کیں۔ اقوام متحدہ میں سیاسی امور کے انڈر سیکرٹری جنرل ڈیگو کارڈووز جو امن کے مسئلہ پر مذاکرات کے ذمہ دار ہیں' یہ کہتے ہیں کہ روسیوں نے افغانستان سے نکلنے کا فیصلہ 1983ء میں کر لیا تھا' لیکن پھر روس کی سیاسی حکمت عملی اینڈروپوف کی بیماری کے دوران میں معطل رہی اور یہی کیفیت ان کے جانشین کانسٹنٹین چرنکوف کے زمانے میں بھی رہی۔ چرنکوف کے دور میں روس کی فوجی حکمت عملی بظاہر بہت سخت ہو گئی تھی' لیکن یہی انتشار کا شکار اور غیر موثر تھی۔ روسیوں نے اسپیشل کمانڈو یونٹ زیادہ استعمال کئے اور

جہاں بھی مزاحمت کے مرکز کی موجودگی کا شک ہوا' وہیں ان یونٹوں نے کارروائی کی۔ رفتہ رفتہ انہوں نے مشتبہ جگہوں پر اور فوجی سپلائی کے راستوں پر تباہ کن حملے کئے' اس کے لئے انہوں نے گوریلا مخالف دستے اور ہیلی کوپڑ گن شپ استعمال کئے۔

تاہم مجاہدین کو 1986ء سے برطانیہ اور امریکہ سے بلو پائپ اور اسٹنگر میزائل مل رہے ہیں اور ان کی موجودگی میں ہیلی کوپڑ کا استعمال بہت مہنگا پڑتا ہے۔ مجاہدین نے دعویٰ کیا ہے کہ میزائلوں کی مدد سے روس کے چار سو سے زیادہ طیارے تباہ کئے جا چکے ہیں۔ یہ تعداد سوویت یونین میں طیاروں کی سالانہ تیاری کے لئے ایک تہائی کے برابر ہے۔ یہ تعداد مبالغہ آمیز ہو سکتی ہے' پھر بھی اس میں شک نہیں کہ مجاہدین کے حوصلے میزائلوں کی موجودگی میں بہت بلند ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے ہوتے ہوئے روسیوں کو ایک بار پھر اپنی حکمت عملی بدلنی پڑی۔ طیاروں کا استعمال کم کر دیا گیا اور چونکہ فضائی امداد زیادہ یقینی نہیں رہی' اس لئے روس اور افغانستان کی زمینی فوجوں کے لئے شب خون کا خطرہ بڑھ گیا ہے اور ان کی جارحانہ کارروائیاں کم ہو گئی ہیں۔

روسی حملے کے باعث سینکڑوں منتشر گوریلا دھڑے کمیونسٹوں کے خلاف ایک متحدہ قومی طاقت بن گئے ہیں اور ایک سال سے کچھ زائد مدت میں مجاہدین اسی ہزار کل وقتی جنگ جو سپاہی بن گئے ہیں' جنہوں نے غیر معمولی فوجی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ پینٹاگون کے تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ مجاہدین "پختگی" حاصل کر کے ایک موثر جنگی طاقت بن گئے ہیں' اس کے باوجود ان کی مزاحمت کے حوالے سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ایک فوج ہیں۔ یہ ایک ہزار پانچ سو الگ الگ "محاذوں" کا مجموعہ ہیں' جن میں ایک لاکھ پچاس ہزار گوریلے شریک ہیں۔ مجاہدین یک جہتی تو دکھاتے ہیں' لیکن ان کی اپنی صفوں کے اندر زبردست مقابلہ ہوتا ہے' کم از کم ایک درجن گوریلا گروپ ایک ہی علاقے میں ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ ہر گروہ کی اپنی قبائلی رکنیت یا نسلی وابستگی ہوتی ہے' پھر ان میں مزید تفریق سیاسی وابستگی کی بنا پر ہوتی ہے۔ مجاہدین کی گیارہ جماعتیں ہیں۔ سات پاکستان میں اور چار ایران میں۔ یہ دھڑے روسی فوجوں کے حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے متحد ہو جاتے ہیں' لیکن جوابی حملے کے لئے شاذ ہی کبھی متحد ہوتے ہوں۔ اس کے برعکس' جب ان پر دشمن کا دباؤ نہ ہو' تو ان میں آپس کا تنازعہ اور بڑھ جاتا ہے۔ کمانڈروں کا بیان ہے کہ جب ایک گروپ پاکستان سے اسلحہ لے کر اپنے مرکز کی طرف جا رہا ہو تو اس کا امکان زیادہ ہے کہ دشمن کی بجائے کوئی حریف دھڑا ہی اس پر حملہ کر دے۔ حزب اسلامی پارٹی جس کے قائد گلبدین حکمت یار ہیں' سب سے بڑی مزاحمتی جماعت ہے اور سب سے زیادہ اسی پر الزام آتا ہے کہ وہ دوسرے گروپوں سے ان کے ہتھیار چھین لیتی ہے۔ مجاہدین کے درمیان تشدد کی اور بھی قسمیں ہیں۔ اسلامی سوسائٹی جمعیت کے نہایت مقبول کمانڈر ذبیح اللہ کو 1984ء میں قتل کر دیا گیا تھا۔ جمعیت کا مرکز شمال کا نہایت اہم علاقہ ہے۔ کہا گیا ہے کہ انہیں ایک حریف جماعت نے

MashalBooks.org

قتل کیا۔ دو سال بعد ایک مقبول حزب کمانڈر محمد سلیم کو قتل کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قتل ان کی اپنی پارٹی کے ارکان نے کیا' کیونکہ جمعیت کے کمانڈر احمد شاہ مسعود نے جب ایک متحدہ کمان بنانے کی دعوت دی تھی تو محمد سلیم نے اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ مختلف دھڑوں کی آپس کی لڑائی کے نتیجے میں مجاہد بڑے پیمانے پر الگ ہو جاتے ہیں ۔لندن میں انسٹی ٹیوٹ آف اسٹریٹجک اسٹیڈیز کی اطلاع کے مطابق ذبیح اللہ کے قتل کے بعد ان کے بیشتر لوگوں نے حکومتی ملیشیا میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔

مجاہدوں کے درمیان عدم اتحاد کے باعث اور ایک مشترکہ حکمت عملی کے نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے کمانڈر اپنی فوجی کارروائیوں کو صرف اپنے اپنے علاقے کے دفاع تک محدود رکھتے ہیں ۔فرانس کے ایک دانشور اولیور رائے افغانستان کا چھ مرتبہ دورہ کر چکے ہیں' وہ لکھتے ہی: ''مزاحمتی طاقتوں نے جنگی حکمت عملی کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے فوجی دستوں سے کام نہیں لیا۔ روسی اپنے دستوں سے کس طرح کام لیتے ہیں اور کیا حکمت عملی اختیار کرتے ہیں' اسی سے مزاحمت کرنے والوں کی فوجی سرگرمیوں کا تعین ہوتا ہے' وہ اسی وقت لڑائی میں شامل ہوتے ہیں' جب انہیں روسی فوجی دستے اپنے علاقے میں نظر آتے ہیں۔ جب مقابل صرف حکومت کی فوج ہو تو طرفین کے درمیان مفاہمت از خود پیدا ہو جاتی ہے۔''

فوجی مبصروں نے مجاہدین میں فنی مہارت اور تربیت کی کمی کو خاص طور پر درج کیا ہے۔ اگرچہ افغان فوج کے بہت سے تربیت یافتہ سابق افسر مزاحمت کرنے والوں سے آ ملے ہیں اور ان میں سے بیشتر نے اپنی خدمات بھی پیش کی ہیں' لیکن مجاہدوں کی طرف سے ان پر دروازے بند ہو چکے ہیں۔ ''اسلامی بنیاد پرستوں کی تنظیمیں سب سے زیادہ سرگرم ہیں۔'' یہ بات روس میں تربیت یافتہ ایک میجر نے بتائی جو 1978ء میں افغانستان کی دفاعی منصوبہ بندی کونسل کے رکن تھے اور اب پاکستان میں پناہ گزین ہیں۔ ایک اور افسر نے کہا: ''وہ ہم پر بھروسا نہیں کرتے۔ ہمارے اور کمانڈروں کے درمیان ایک سماجی فاصلہ قائم ہے۔ ان کو جنگ سے دلچسپی ہے' جو ان کے نزدیک عزت کا اور اسلام کا معاملہ ہے۔ ہمارے خیالات کا اور ڈسپلن اور تنظیم کا ان کے یہاں کوئی مصرف نہیں۔ ان کی رائے میں جدید طریق جنگ کے معنی ہیں' جدید ہتھیاروں سے لڑائی لڑنا اور بس۔'' توپ خانے کے ایک افسر نے جس کی تربیت امریکہ میں ہوئی تھی' اس بیان سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ مزاحمت کی یہ لڑائی انتہائی قبائلی نوعیت کی ہے۔ ایک پیشہ ور فوجی کا نقطہ نظر یہ قائدین سمجھتے ہی نہیں۔ یہ مجاہدین اپنے روسی حریفوں کی طرح اتحاد کی ضرورت پر تو بہت باتیں کرتے ہیں' لیکن انہیں متحد کرنے کی ہر کوشش کا نتیجہ ان کے درمیان اور بھی زیادہ شدید تفرقے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اطلاع یہ ہے کہ سعودی عرب اور سی آئی اے نے متحارب دھڑوں کو متحد کرنے کی بہت کوششیں کی ہیں ۔اسی طرح جب روسی مشیروں نے افغانستان پر حملے سے قبل ڈیموکریٹک پارٹی کے دھڑوں کو آپس میں ملانے کی کوششیں کی تھیں' لیکن یہاں بھی نتیجہ وہی نکلا' یعنی ناکامی۔ جب امداد کی خفیہ فراہمی کے معاملے میں

MashalBooks.org

رائے لی جاتی ہے تو اعلیٰ امریکی حکام کانگریس کو یہ بتاتے ہیں کہ مجاہدین کے کمانڈر مل کر کام کر رہے ہیں اور ان کی سرگرمیوں کا آپس میں رابطہ ہے۔ ان کی ایک پسندیدہ مثال احمد شاہ مسعود ہیں' جنہوں نے 1986ء میں شمال کے چار صوبوں میں ایک متحدہ کمان بنانے کے سلسلے میں خاصی کامیابی حاصل کی ہے' لیکن اب کہ حالیہ مہینوں میں روس کے افغانستان سے نکل جانے کا واضح امکان نظر آنے لگا ہے' مجاہدین کی آپس کی لڑائیوں میں شدت آ گئی ہے۔ جس طرح پاکستان میں مقیم افغانیوں کے درمیان قتل ہونے لگے ہیں' جن کے محرکات سیاسی ہوتے ہیں۔ مجاہدین کے درمیان تفرقہ اتنا زیادہ ہے کہ وہ جنگ نہیں جیت سکیں گے' لیکن وہ اتنا پھیل گئے ہیں کہ ہار بھی نہیں سکتے۔ سویت روس کے سامنے ایک ہزار سے زیادہ الگ الگ فوجیں کھڑی ہیں' وہ ایک مرکزی کمان پر بھروسا نہیں کرتیں' جن کو صرف کر دینا ممکن ہے' بلکہ ان کا انحصار ہزاروں الگ الگ لیڈروں کی پیش قدمی پر ہے اور لاکھوں مجاہدین کی بہادری پر ہے۔ افغان جنگ کر رہے ہیں' کیونکہ غیرت کے اصول نے ان کے اندر جنگ کا ولولہ شامل کر دیا ہے اور ان کی مذہبی ذمہ داری کا بھی یہی تقاضا ہے کہ کسی مقدس جنگ (جہاد) میں حصہ لیا جائے۔ قرآن میں ہر مسلمان کو یہ تاکید کی گئی ہے کہ فساد کا مقابلہ کرنے اور خیر سگالی پھیلانے کے لئے اور وہ ضروری نہیں کہ جنگ ہی کے ذریعے ہو' سخت محنت سے کام لے۔ صوفی فلسفیوں نے لکھا ہے کہ بصیرت حاصل کرنے اور جذبات پر قابو پانے کی ذاتی کوشش بھی جہاد کی ایک صورت ہے۔ فی زمانہ ایران کے آئیت اللہ کا کہنا ہے کہ اقتصادی ترقی کے لئے جدوجہد بھی ایک جہاد ہے۔ اسلام میں توسیع پسندی کے دور سے ہی اس لفظ کو بالعموم برائیوں کے خلاف جنگ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے لئے جنگ کرنا ایک دینی فریضہ ہے' جب ایک بار لڑائی شروع ہو جائے تو اس میں حصہ لینا فرض ہوتا ہے۔

فروری 1988ء میں گورباچوف کے اعلان کے بعد ہی سے جس میں ایک مشترکہ حکومت کے قیام سے پہلے ہی روسی فوجوں کے انخلا کا عندیہ شامل تھا روسیوں نے اس اندیشے کا اعلانیہ اظہار شروع کر دیا تھا کہ اگر افغان حکومت کو یوں چھوڑ دیا گیا تو بہت خون ریزی ہوگی۔ ان کی یہ تشویش کوئی معمولی بات نہیں۔ وہ پرانے اطوار کہ تشدد کو کس طرح حد میں رکھا جائے' افغانستان کی دس سالہ جنگ میں افغانیوں نے بھلا دئیے ہیں' ان روایتی طور طریقوں کی بنیاد مشترکہ اقدار اور رواج پر تھی' انقلاب جنگ اور جلاوطنی نے ان اقدار کو کمزور کر دیا ہے' اس کے علاوہ نظریات کے تصادم اور حصول اقتدار کے لئے مسلح سیاسی تنظیموں کے عزائم میں' جن کے درمیان کوئی مفاہمت ممکن نہیں' قدیمی نسلی اور قبائلی تفرقے بھی شامل ہو گئے ہیں۔ افغانیوں کے دستوں میں جس کا تعلق غیرت سے ہے' بدل یعنی انتقام کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر کسی قبیلے کا فرد دشمن کے ہاتھوں مارا گیا ہے تو انتقام کی صورت میں اس کا ''قرض'' چکانا لازمی ہے اور یہ سلسلہ ایک سے دوسری نسل تک چلتا رہتا ہے۔ اس قرض کی ادائیگی میں وقت اور فاصلے رکاوٹ نہیں بنتے۔ جب تک صلح نہ ہو

جائے اور زر تلافی ادا نہ کر دیا جائے۔ اس وقت تک پشاور یا کابل میں ہونے والے نقصان کا بدلہ کئی سال بعد نیویارک یا ماسکو میں چکایا جا سکتا ہے۔

افغانستان کی گوریلا جنگ نے نمایاں طور پر نجی کاروبار کا جال بھی پھیلا رکھا ہے۔ آرتھر بونر نے اپنی کتاب "افغانیوں کے درمیان"

(Among The Afghans) میں مجاہدین کے حالات زندگی بیان کئے ہیں' وہ لکھتے ہیں کہ پرانے زمانے کے مطابق اب افغان ایک بار پھر پہاڑی دروں اور سڑکوں پر قبضہ جما کر رقم کما رہے ہیں۔ گوریلا کمانڈر ایک دوسرے سے چنگی وصول کر رہے ہیں۔ انہوں نے لکھا کہ "راستے کو حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ ہر حصہ کسی ایک کمانڈر یا کمانڈروں کی متحدہ جمعیت کے ماتحت تھا۔ مسافروں کے لئے اور باربرداری کے لئے راہداری کا کرایہ مقرر تھا۔ حالانکہ بظاہر مختلف علاقوں کی شرحوں میں کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا۔" بونر نے جہاد کے لئے افغانیوں کی بڑی پر اثر مثالیں پیش کی ہیں' وہ ان کا ذوق وشوق کے ساتھ لڑائی میں حصہ لینا اور مرنے کے لئے آمادگی کا جذبہ۔ جب ایک قافلہ جنگ کے علاقے میں جمع ہوتا ہے تو ایک منشی خاندانوں سے آئے ہوئے خطوط پڑھ کر سناتا ہے' جس میں بیٹوں کی پیش کش شامل ہوتی ہے۔ "ہم ایک غریب کنبے کے لوگ ہیں' ہماری تھوڑی سی زمین ہے' براہ کرم جہاد میں لڑنے کے لئے ہمارے سب سے چھوٹے بیٹے کو قبول کیجئے۔) ایک دیہاتی ملا دوسری سفارش کرتا ہے: "یہ ہے صادق مصطفٰی کا بیٹا۔ وہ سچا ہے اور اللہ کی خدمت بجالانا چاہتا ہے۔" جب کوئی شخص مجاہدین کے ساتھ شامل ہوتا ہے تو اس بات کا امکان ہے کہ وہ اپنا اسلحہ خریدے' جسے وہ اسلحہ خانہ سے لے سکتا ہے۔ ہماری ملاقات ایسے خاندانوں سے ہوئی' جنہوں نے اپنے بیٹے کے لئے روسی ساخت کا اسلحہ خریدنے کی خاطر زیورات بیچ دیئے تھے۔

پاکستان میں ترش مزاج لوگ کہتے ہیں کہ افغان جہاد کا کاروبار اسلحہ اور ہیروئن سے چل رہا ہے' جو پاکستانی اس ناجائز دھندے میں شریک نہیں' ان کی بھی سمجھ میں آتی ہے' کیونکہ افغان جہاد سے ان کے ملک میں کرپشن' نشہ خوری اور جرائم کی لعنتیں آئی ہیں۔ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ (امریکہ) کے منشیات سے متعلق بیورو کے مطابق افغانستان میں 1986ء میں پانچ سوٹن افیون پیدا کی گئی' دو سال پہلے کے مقابلے میں مقدار تقریباً چار گنا زیادہ تھی۔ 1987ء میں افغانستان میں پوست کی زبردست فصل تیار ہوئی اور چند ماہروں کا اندازہ ہے کہ اب ایشیاء میں ہیروئن کا واحد سب سے بڑا ذریعہ افغانستان ہے۔ افغانستان میں حکومت کے تقریباً سب مخالف' جن کے پاس زمین کے بڑے بڑے قطعات ہیں' پوست کی کاشت کرتے ہیں اور اس کی پیداوار گندم' مکئی اور پھلوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ حال ہی میں آنے والے جن مہاجروں سے میں نے باتیں کیں' انہوں نے بتایا کہ پوست کی کاشت والے علاقوں میں غذائی اجناس کی قلت ہو گئی ہے۔ شہروں کی طرف تبادلہ آبادی کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ ننگر ہار' پاکستان سے متصل افغانستان کا

مشرقی صوبہ اور پوست کی کاشت کا مرکز ہے۔ لیکن افغانستان کے تمام علاقوں میں جانے والوں نے بتایا کہ ہر جگہ شمال میں بدخشاں مغرب میں ہرات اور جنوب میں قندھار میں سفید اور نارنجی پھولوں کی لہلہاتی ہوئی فصل نظر آئی۔ پاکستان میں نارکوٹکس کنٹرول بورڈ کے حکام کا اندازہ ہے کہ افغانستان کے 29 میں سے تیرہ صوبوں میں پوست کی کاشت بنیادی فصل کے طور پر ہوتی ہے۔ برنز کا بیان ہے کہ افیون کے وسیع وعریض کھیت احمد اکبر کی ملکیت ہیں جو نیشنل اسلامک فرنٹ سے وابستہ ایک کمانڈر ہیں۔ پشاور میں یہ ایک نہایت طاقتور مزاحمتی گروہ ہے۔ (اس تنظیم کے سربراہ پیر سید احمد گیلانی ایک روایت پرست اور معتدل مزاج شخص اور ایک بڑے مذہبی سلسلے کے سربراہ بھی ہیں۔ کمانڈر علی احمد ایک بنیاد پرست جمعیت سے تعلق رکھتے ہیں ان کے پاس کوئی سو ایکڑ اراضی ہے۔ 1986ء میں اسے پوست کی کاشت کے لئے استعمال کیا گیا۔ دونوں کمانڈروں نے برنز کو بتایا کہ انہیں (جہاد کے لئے) رقم چاہیے۔ اس وقت یونس خالص افغان مجاہدین کے اسلامی اتحاد کے چیئرمین تھے۔ اس اتحاد میں سات پارٹیاں شامل تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ گزشتہ نومبر میں اسلامی قانون کے مطابق انہوں نے پوست کی کاشت کی ممانعت کر دی تھی اور فوجی کمانڈروں سے کہا کہ اس حکم پر سختی کے ساتھ عمل کرائیں۔ قائدین اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ افغانستان میں بڑے پیمانے پر افیون کی کاشت ہوتی ہے۔ اسلام آباد میں امریکی سفارت خانہ ان کے اس انکار کی تصدیق کرتا ہے۔ 1985ء کی ایک رپورٹ میں سفارت خانے نے دعویٰ کیا ہے کہ ''اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ افغان حریت پسند مجاہدوں نے اپنی کارروائیوں کو جاری رکھنے کے لئے منشیات کے کاروبار میں ایک حکمت عملی کے طور پر شرکت کی ہو'' لفظی اعتبار سے یہ بیان تقریباً صحیح ہے۔ یہاں تک تو کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ نارکوٹکس سے حاصل ہونے والی رقم گوریلا سرگرمیوں کے لئے استعمال میں لائی گئی۔ صاف بات ہے کہ افیون کی کاشت سے مجاہدین کے مقصد کو کوئی مدد نہیں ملتی۔ افغانستان میں خوراک کے وسائل میں کمی سے ان کا انحصار حکومت پر بڑھ جاتا ہے جو خوراک باہر سے درآمد کرتی ہے اور شہروں کو کنٹرول کرتی ہے۔ اس کے علاوہ پوست کی کاشت کے علاقے میں کاشت کار اور ڈیلر (خریدار) دونوں کاروبار میں استحکام اور محفوظ باربرداری کی یقین دہانی چاہتے ہیں۔ چنانچہ مجاہدین پر دباؤ پڑتا ہے کہ اس معاملے میں حکومت کو مفاہمت کے لئے تیار کریں۔

گوریلا کمانڈر اسلحہ اور مطلوبہ سامان کی فراہمی کے لئے اکثر پاکستان جاتے آتے رہتے ہیں۔ منشیات کے کاروبار کے سلسلے میں ہم نے چار کمانڈروں سے گفتگو کی۔ منشیات کی تجارت کی موجودگی کا ہر ایک نے اقرار کیا لیکن اس میں ذاتی شمولیت سے انکار کیا انہوں نے بتایا کہ افیون کی فصل کی قیمت جو کاشت کار لگاتا ہے 45 یا 55 ڈالر فی پونڈ ہوتی ہے۔ عملاً اس کی صفائی وغیرہ پاکستان میں ہوتی ہے لیکن اب کہ لڑائی دب گئی ہے اور بہت سے علاقوں میں ایک غیر اعلانیہ جنگ بندی نظر آتی ہے افیون کو صاف کرنے کا

سارا کام رفتہ رفتہ افغانستان ہی میں ہونے لگا ہے۔ ملک سے باہر اسے مجاہدین پہنچاتے ہیں' جو پاکستان آزادی کے ساتھ اور ایران نسبتاً کم آزادی کے ساتھ جاتے آتے رہتے ہیں۔ افیون کی کھیپ ایک بار پاکستان پہنچ جائے پھر وہ ایک پیچیدہ کاروبار کے تحت غائب ہو جاتی ہے۔ تاجر' اسمگلر اور سرکاری حکام کے درمیان گم ہو جاتی ہے۔ حال ہی میں معزز پاکستانی خاندانوں کے افراد' جن میں آکسفورڈ اور کیمبرج کے گریجویٹ بھی شامل تھے ہوائی اڈے پر منشیات کی اسمگلنگ کے الزام میں پکڑے گئے۔ جون 1987ء میں جنرل ضیاء الحق نے ناروے کے ایک صحافی سے کہا کہ منشیات کے خلاف جہاد میں وہ مجرموں کے لئے موت کی سزا تجویز کریں گے' اس کے بعد تو پورے ملک میں یہ لطیفہ پھیل گیا کہ صدر اپنے جنرل اسٹاف کو صفحہ ہستی سے مٹانا چاہتے ہیں۔ پاکستان میں اس شک وشبہ کا بالعموم اظہار کیا جاتا ہے کہ جنگ سے جو آمدنی ہو رہی ہے' وہی اس کے سمجھوتے میں ایک رکاوٹ ہے۔

افغانستان کی مزاحمتی تحریک' جسے سعودی عرب اور امریکہ سے مالی امداد مل رہی ہے' تاریخ میں ایک مثال ہے کہ اتنا سرمایہ کسی تحریک کو نہیں ملا۔ اس کے باوجود افغانستان کے بیشتر گوریلا اسلحہ' خوراک اور ادویہ کی قلت سے دوچار ہیں۔ مجاہدین اپنی مشکلات کو حیرت ناک استغناء کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ آرمڈ فورسز جرنل انٹرنیشنل کے ستمبر 1987ء کے شمارے میں ایرن کارپ نے لکھا کہ ستمبر 1986ء اور اگست 1987ء کے دوران میں پاکستان کو 1150 اسٹنگر اور بلو پائپ فضا میں مار کرنے والے میزائل مزاحمتی لڑائی میں استعمال کے لئے بھیجے گئے تھے۔ ان میں سے حقیقتاً 863 میزائل افغانستان میں کمانڈروں تک پہنچے۔ ان میں سے کم از کم 60 پکڑے گئے۔ اس کی پہلی کھیپ صرف مزاحمتی فوج کے بنیاد پرست شعبے کے لئے تھی۔ یعنی ان تین گروپوں کے لئے جن کے سربراہ حکمت یار' خالص اور ڈاکٹر سید برہان الدین ربانی ہیں۔ خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ مجاہدین کے درمیان بنیاد پرستوں کو روایت پرستوں (اعتدال پسندوں) پر برابر ترجیح دی جاتی ہے۔ روایت پرست نیشنلسٹ اسلامک فرنٹ کے ایک کمانڈر نے جو نہایت کامیاب جنگ آزما ہیں' ہمیں بتایا کہ انہوں نے کبھی کوئی اسٹنگر نہیں دیکھا۔ کچھ عرصہ پہلے پاکستانی انٹیلی جنس کے ایک افسر نے ہم سے درپردہ اس تشویش کا اظہار کیا کہ امریکیوں کو جس روز اپنے افغان گاہکوں کی اصل حقیقت معلوم ہو جائے گی' جنگی امداد کے سلسلے میں ان کی گرم جوشی باقی نہیں رہے گی۔ پشاور میں ساتوں مزاحمتی گروپوں کے سرکردہ ارکان جنہیں خفیہ طور پر نصف بلین ڈالر سالانہ کی امداد ملتی ہے' امریکہ کے بارے میں اپنے احساسات چھپا کر نہیں رکھتے۔ گلبدین حکمت یار کو جن کی مجاہدین تنظیم کو سی آئی اے سے سب سے زیادہ مالی امداد ملتی ہے' امریکہ کے خلاف اپنی نفرت کا کھلم کھلا اظہار کرتے ہیں' لیکن اس معاملے میں وہ اکیلے نہیں ہیں۔ ڈاکٹر ربانی کے دفتر کے باہر ایک پوسٹر لگا تھا' جسے ایک امریکی رپورٹر نے 1982ء میں دیکھ لیا تھا۔ پوسٹر میں یہ پیغام درج تھا:

MashalBooks.org

''ہمارے معاملے میں فتح مند امریکہ اور خون خوار روس' دونوں ایران اور افغانستان کے عظیم انقلاب کے دشمن ہیں۔''اور اس پر ربانی کے دستخط تھے۔ یونس خالص گزشتہ نومبر میں واشنگٹن میں مزاحمتی گروپوں کے اتحاد کے سربراہ کے طور پر مقیم تھے'وہ ایک عالم دینیات ہیں اور جنگ آزمائی کے لئے شہرت رکھتے ہیں۔ہم نے ان سے سوال کیا کہ وہ کون سی سب سے اہم بات ہے جو امریکیوں کو افغان جنگ کے بارے میں معلوم ہونی چاہیے اور انہوں نے بلا تامل جواب دیا: ''آپ ایک مادہ پرست ملک ہیں' آپ کے لیڈر کو چاہیے کہ آپ کو ہاتھ میں لے اور روحانیت کا راستہ دکھائے۔''

افغانستان ایک اسلامی ملک ہے' یہاں دیہات میں مذہب کا غلبہ ہے۔ روائتی طور پر اسلام اور افغانوں کی قبائلی رسوم ساتھ ساتھ چلی آئی ہیں' ان کی رسوم ظہور اسلام سے پہلے کی ہیں اور سیکولر ہیں۔اگر چہ کبھی کبھی دونوں متصادم بھی ہوتی ہیں۔مثال کے طور پر رواجاً عورت جائیداد کی وارث نہیں ہو سکتی' جبکہ اسلامی قانون کا تقاضا ہے کہ عورت کو وراثت میں اس کا حصہ دیا جائے۔رواج یہ ہے کہ خون کا بدلہ خون ہے اور یہ معاملہ غیرت کا ہے' جبکہ مذہب میں اس کی ممانعت ہے۔ روائتی طور پر قبائلی سرداروں کی عمل داری میں اسلام اور سیکولر قوانین ہم آہنگ رہے ہیں۔ ان سرداروں میں قبیلے کے سربراہ' خان اور ملک اور ساتھ ہی قبائلی اسمبلیاں بھی ہیں' جنہیں جرگہ کہا جاتا ہے۔ روایت پرست مسلمان اپنے آباواجداد کی طرح زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔بڑے بڑے قطعات کے مالک ان میں سب سے زیادہ طاقتور ہیں' مروجہ سماجی معمولات میں کسی تبدیلی سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔

دوسری طرف اسلامی بنیاد پرستی ہے' جس پر مصر کی اخوان المسلمون کا بڑا غلبہ ہے۔ یہ بیسویں صدی کی صورت حال ہے اور ایران میں خمینی کی تحریک کی پیدا کردہ ہے' جس طرح امریکہ میں' مسیحی بنیاد پرستی کے کچھ آثار ملتے ہیں' اس طرح یہ بھی کسی بڑی سماجی تبدیلی کے لئے قدیم صحیفوں میں سند تلاش کرتی ہے۔جدید نظریہ افغانستان کے ماضی سے متصادم ہے' لہٰذا وہ جدید نظریے کی تائید میں صحائف کے زمانے کے ایک خیالی زریں دور کا حوالہ دیتے ہیں۔بنیاد پرستی کے نظریے کی تہہ میں ملائیت موجود ہوتی ہے' لیکن یہ چیز افغانستان کے مفاد کے خلاف ہے۔اس ملک میں کوئی مذہبی حکومت یا ایک مرکزی ریاست کبھی نہیں رہی' لیکن بنیاد پرست اس بات پر تلے ہوئے ہیں کہ ان دونوں کو نافذ کریں۔

افغان معاشرے میں بنیادی تفرقہ سرمایہ داری اور کمیونزم کا نہیں بلکہ روایت اور جدت کا ہے۔ بنیاد پرست بھی بہت حد تک کمیونسٹوں کی طرح ہیں اور انہی اسباب کی بنا پر جو ان میں مشترک ہیں' دونوں افغانستان میں حکومت نہیں کر سکتے۔اس تحریک کے رہنماؤں میں جہاں کچھ اپنے مبلغ ہیں' انہی میں بہت سے سیکولر تعلیم کی پیداوار ہیں اور پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر' فنی ماہر' انجینئر اور سرمایہ کار ہیں۔گلبدین حکمت یار نے جن کا بنیاد پرست گروہ سیاسی طور پر انتہا پسند ہے' انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی ہے۔کمیونسٹوں کی طرح

MashalBooks.org

بنیاد پرست بھی زیادہ تر دیہی خاندانوں سے نکل کر آئے ہیں اور کابل یونیورسٹی میں جدید دنیا سے متعارف ہو کر اپنے نظریے میں تبدیل ہو گئے۔ دائیں بازو کے آزاد خیال عناصر اور بائیں بازو کے آزادی پسند دونوں اپنی اپنی جگہ خود کو افغانستان کا نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہر فریق اپنے نظریے کو روایتی اقدار کے خلاف ایک چیلنج اور وطن عزیز کو قدامت سے نکال کر جدید عہد میں لے جانے کا ذریعہ سمجھتا ہے۔

جس دن سے روسیوں نے افغانستان پر حملہ کیا' امریکہ کی سفارتی حکمت عملی یہ تھی کہ رائے عامہ کو دنیا بھر میں روسیوں کے خلاف متحرک کرے اور اس کے ساتھ ہی یہ کوشش تھی کہ اس میں امریکہ کی شمولیت کم سے کم نظر آئے۔ امریکی حکومت کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے گزشتہ نومبر میں ہم سے کہا تھا: ''افغانستان میں ہماری دلچسپی صرف اس لئے ہے کہ روس وہاں موجود ہے۔'' انیسویں صدی کے برطانوی مدبروں کا ڈھکا چھپا پیرایہ میں بیان یہی تھا کہ روسی افغانستان پر ''اپنی بالادستی'' قائم کر رہے ہیں' جبکہ وہ خود اپنی فوجیں بین الاقوامی سرحدوں کو پار کر کے ان علاقوں کو بھیج دیتے تھے جو پہلے روس کی عملداری میں تھے اور اس طرح وہ خود ضابطہ شکنی کرتے تھے۔ امریکی تشویش جس بات سے پیدا ہوئی' وہ افغانستان پر حملہ نہ تھا' بلکہ مستقبل کے امکانات پر تھی۔ جس روز روس نے افغانستان پر حملہ کیا' بس اسی روز افغانستان آئندہ امکانات کا مرکز بن گیا۔

یہ بات بہت عجیب معلوم ہوگی کہ رونالڈ ریگن کی انتظامیہ جو انتہائی شدید کمیونسٹ دشمن ہے' اس نے وسطی امریکہ میں اس ''شر کی مملکت'' کے کردار پر اتنی زیادہ توجہ صرف کی ہے' جہاں روسی محدود فوجی امداد دے رہے ہیں اور جو افغانستان سے بھی زیادہ ہے' جہاں روسی خود عام لوگوں کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ امریکی انتظامیہ کے ایک عہدیدار نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے ہم سے کہا: ''امریکی لیڈروں نے ایک بار اپنے غم و غصے کا اظہار کر دیا تو اس کے بعد کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی' کیونکہ حملہ تو خود اپنے منہ سے بولتا ہے۔'' سویت یونین اپنے آپ کو ناوابستہ قوموں کا سب سے بڑا معاون سمجھتا آیا ہے اور اب وہ ایک نادار اور ناوابستہ مسلمان ملک کے خلاف جنگ کر رہا ہے۔ افغانستان کے مستقبل میں امریکہ کی دلچسپی جتنی زیادہ ظاہر ہوگی۔ روس لوگوں کی توجہ اپنے حملے کی طرف ہٹانے میں اسی قدر کامیاب ہوگا۔ یہ بات امریکہ کے مفاد میں ہرگز نہیں کہ شمال اور جنوب کی آزادی کو شرق اور مغرب کے تصادم کی صورت میں بدل دے۔ افغانستان کی مزاحمتی جنگ میں امریکہ اور سعودی عرب کی حمایت کا سب کو علم ہے لیکن ٹیکنیکل طور پر امداد در پردہ ہے اور نظریاتی اعتبار سے پاکستان کی اس میں شرکت سوویت یونین کے لئے کم اشتعال کا باعث ہوگی' بشرطیکہ اس کا سرکاری اعلان نہ ہو۔ جس بات کو دنیا بھر کے بڑے بڑے اخبارات نے شائع کر دیا اسے ''خفیہ'' رکھنے کا مقصد ''ممکنہ انکار'' کو برقرار رکھنا تھا۔ اسی وجہ سے جنگ کے ابتدائی برسوں میں سی آئی اے نے بھاری قیمت کے عوض غیر امریکی ہتھیار خریدے یہاں تک کہ خفیہ فیکٹریوں میں روسی اسلحے سے

MashalBooks.org

ملتے جلتے ہتھیار تیار کروائے۔ اس طرح اگر روس امریکہ کی براہ راست مداخلت پر علانیہ احتجاج کرتا ہے تو صدر جواب میں کہہ سکتے ہیں: ''اسے ثابت کرو۔'' انہی باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے امریکہ نے امن کے مذاکرات میں اپنا کردار کم سے کم رکھا ہے۔

پاکستان نے افغانستان کی مزاحمت میں امریکہ کی شمولیت کو یقینی بنانے کے لئے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ یہ مزاحمت تو روسی حملے سے چھ سال پہلے شروع ہو گئی تھی، وہ اس طرح کہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان ایک سرحدی تنازعہ طویل عرصے سے چلا آ رہا تھا۔ داؤد نے جو ایک پشتون تھے، جب کابل میں دوسری بار اقتدار سنبھالا تو انہوں نے پاکستان کے پشتونوں کی دوبارہ حوصلہ افزائی کی اور ترغیب دی کہ وہ پاکستان سے الگ ہو کر اپنے بھائیوں کے ساتھ افغان پرچم تلے آ جائیں۔ اس مرحلہ میں حکومت پاکستان نے جوابی حملہ کیا اور پشتونوں کی ایک گوریلا تحریک منظم کی، تاکہ افغان حکومت کو ہراساں کیا جائے۔ یونس خالص نے بتایا کہ وہ 1973ء میں پاکستان گئے تھے تاکہ ایک مدافعتی طاقت داؤد کے خلاف منظم کریں۔ داؤد کو وہ خطرناک حد تک جدید بلکہ کمیونسٹ قرار دیتے تھے۔ دو بالکل مختلف پاکستانی حکومتوں نے ایک ذوالفقار علی بھٹو کی سول حکومت نے اور دوسرے ضیاء الحق کی فوجی حکومت نے افغان مدافعت کو پہلے کابل پر دباؤ ڈالنے کا ایک وسیلہ سمجھا، پھر پاکستان کے ساتھ امریکی وابستگی کو جو اکثر کمزور پڑتی جاتی تھی، اسے مستحکم بنانے کا ذریعہ سمجھ لیا۔ امریکہ افغانستان کے معاملے میں جس قدر آگے بڑھتا گیا، پاکستان کی حیثیت کمیونزم کے خلاف جنگ میں اسی قدر ناگزیر ہوتی گئی اور پاکستان کو امریکی امداد اسی تیزی سے آتی گئی۔ پاکستان کی انٹر سروسز انٹیلی جنس کا ادارہ ادھر چند برسوں میں بہت پھیل گیا ہے اور اس کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہوا ہے، اسلحہ کی تقسیم اسی ادارے کے ہاتھ میں تھی۔ یہ فیصلہ جنرل ضیاء الحق کے ہاتھ میں تھا کہ کس مزاحمتی تنظیم کو کس طرح کا اسلحہ اور کتنی مقدار میں دیا جائے۔ ضیاء نے 1979ء میں اقتدار پر قبضہ جمایا، اس وقت تک انہیں دائیں بازو کی صرف ایک بنیاد پرست جماعت، جماعت اسلامی کی حمایت حاصل تھی۔ اب اس نے اسلحہ کی فراوانی کی بدولت افغان مزاحمت کے سلسلے میں اسلامی عناصر کو متحد کیا ہے اور انہیں مضبوط بنایا ہے اور زیادہ جدید اور سیکولر عناصر کو اس کی قیمت ادا کرنی پڑی ہے، لیکن جب سے امریکی اسلحہ کی کھیپ پہلے سے زیادہ آنے لگی ہے اور پچھلے دو برس میں تو یہ اضافہ صاف نظر آنے لگا ہے تب ہی سے امریکہ کے خفیہ ادارے کے عہدیداروں کی ذمہ داری اسلحہ کی تقسیم کے سلسلے میں بہت بڑھ گئی ہے۔ پاکستان میں ایک جرنلسٹ کے بقول "یہ لوگ جنگ کو یومیہ طور پر جاری رکھنے میں اب پہلے سے زیادہ مصروف ہو گئے ہیں۔"

امریکہ کی خفیہ فوجی امداد کے پروگرام کو مختلف سمتوں میں جاری رکھا گیا ہے، کیونکہ اس کے مقاصد سے اعلیٰ حکام کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ امریکی حکام کا شروع سے ہی یہ خیال ہے کہ روس کا حملہ ایک بھیانک غلطی تھی اور اس سے امریکہ کو فائدہ ہوا ہے۔ جنگ کا جلد خاتمہ ابتدا سے ہی ممکن دکھائی دیتا تھا۔

MashalBooks.org

مزید یہ کہ واشنگٹن کے نزدیک جنگ کے خاتمے کا معاملہ ترجیحی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ کارٹر کی انتظامیہ میں برزنسکی اس متوقف میں پیش پیش تھے کہ "روسیوں کا لہو بہنے دو" اور ریگن کی انتظامیہ میں اس کے سب سے بڑے وکیل ولیم کیسی تھے' جو سی آئی اے کے سابق ڈائریکٹر تھے' لیکن اس معاملے میں سی آئی اے کے اندر خاصے اہم نوعیت کے اختلافات تھے۔ سی آئی اے کے سابق ڈپٹی ڈائریکٹر جان میک موہن کا خیال تھا کہ کسی خفیہ فوجی کارروائی میں امریکی اسلحہ کی فراہمی ایک تو غلط بات ہے' دوسری خطرناک بھی ہے۔ اس پروگرام کا مقصد کیا مخالفوں کو بات چیت کے لئے آمادہ کرنا تھا یا اس کو شروع کرنے کا بنیادی مقصد روسیوں کو مزہ چکھانا تھا؟ اس کے جو بھی جوابات ہوں گے' اسی سے خفیہ امدادی کارروائی' اسلحہ کی نوعیت اور اسے وصول کرنے والوں کے انتخاب پر اختلاف ہوگا۔

کانگریس نے افغانستان کی گوریلا جنگ کو آزادی کی جنگ قرار دیا ہے۔ اسے اس اخلاقی دوغلے پن سے کوئی سروکار نہیں' جو نکاراگوا میں کنٹراز کے باغیوں کی امداد سے متعلق ہے اور بہت سے کانگریس کے ارکان جنہوں نے نکاراگوا میں خفیہ امریکی جنگ کی مخالفت کی اب افغان کی امداد کو اپنے سینے سے لگا لیا ہے اور کمیونزم کے خلاف اپنی جنگ میں اپنی استقامت کا ثبوت دیا ہے۔ سینیٹر والم ویلپ نے 1983ء میں افغان پالیسی پر ضبط وتحمل کو بالائے طاق رکھنے کا پرزور مطالبہ کیا اور کہا: "کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسی موہوم پالیسی ہے۔" افغان مزاحمت کے دوسرے حامیوں نے دعویٰ کیا کہ امریکہ "افغانیوں کو بس اتنی ہی امداد دے رہا ہے کہ لڑتے رہیں اور مرتے رہیں۔ اتنی نہیں کہ کامیاب ہو جائیں۔" انہوں نے ایک مشترکہ قرارداد پیش کی جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ "افغان عوام کو اپنی آزادی کی خاطر موثر طور پر جنگ کرنے کے لئے اتنی مادی امداد فراہم کی جائے جسے امریکہ مناسب خیال کرتا ہے۔" سینٹ کی خارجہ امور کی کمیٹی' اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور سی آئی اے کے ایک اجلاس میں شاہدوں نے اپنے اس انتباہ کو ایک بار پھر دہرایا کہ امریکہ کی بڑھتی ہوئی شمولیت پاکستان کو خطرے میں ڈال دے گی اور میری لینڈ کے سینیٹر چارلس میتھیاس قرارداد کو ناکام بنانے کے لئے تقریباً ایک سال تک لڑائی لڑتے رہے' جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ٹونکن گلف ریزولیوشن کی روایت کے مطابق یہ قرارداد مزاحمت کے لئے کھلا لائسنس فراہم کرتی ہے۔ 1984ء میں جب صدر ریگن کنٹرا اس کی مدد کے لئے کانگریس سے 24 ملین ڈالر کی ادائیگی کا مطالبہ کر رہے تھے' اس وقت سی آئی اے کو افغان جنگ کے لئے تیس ملین ڈالر حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس کے جلد ہی بعد ٹیکساس کے نمائندے چارلس ولسن جو اس سے پہلے بھی کئی بار پاکستان جا چکے تھے اور ایک بار تو مجاہدین کے ساتھ سرحد پار کر کے افغانستان بھی چلے گئے تھے' انہوں نے کہا کہ یہ امداد تو بہت ہی کم ہے۔ "ویت نام میں 58 ہزار مارے گئے تھے' یہ روسیوں پر ہمارا قرض ہے۔" چنانچہ تنہا انہی کی کوششوں کے نتیجے میں پینٹاگون کے بجٹ میں چالیس ملین ڈالر مزید شامل کئے گئے کہ انہوں نے افغانستان کے اندر ایک خفیہ

MashalBooks.org

جنگ کس دھوم دھام سے لڑی ہے۔ افغانستان پر قرارداد اکتوبر 1984ء میں منظور ہوئی' اس کے بعد اپریل میں صدر ریگن نے قومی سلامتی کے فیصلے کے مسودہ 1441 اپنے دستخط سے منظور کیا' جس میں کہا گیا تھا کہ روس کو افغانستان سے "ہر ممکن ذریعے سے" نکال باہر کیا گیا۔ کانگریس کی انٹیلی جنس کمیٹی میں خفیہ بحث و مباحثے کے بعد افغانستان کی جنگ میں مزید امداد کی تجویز منظور کر لی گئی۔ مجاہدین کو حساس نوعیت کے اسلحے کی فراہمی جو ممنوع تھی' وہ ختم کر دی گئی۔

"دی بلیڈرز" (روس کا خون بہنے دو) کی پالیسی کے حامی' جنہیں واشنگٹن میں سبھی جانتے ہیں ابھی حال تک انہی کی بات بالعموم سنی جاتی تھی۔ خارجہ پالیسی کے عہدیدار جنہیں نظریے پر زیادہ اصرار ہے' مثلاً دفاع کے سابق سیکرٹری رچرڈ پیرل ایران کو ایک نہایت شدید اور خطرناک جنگ کی سرزمین سمجھتے ہیں' یہاں جنگ کا خاتمہ اس طرح ہونا چاہیے کہ روسیوں کو ایک سبق مل جائے۔ روسی افغانستان میں ہار برداشت نہیں کر سکتے اور اس کی ایک نظریاتی توضیح ہے' تاریخ ان کے ساتھ ہے' کمیونسٹ حکومت اپنے تعارف میں ہی "ترقی پسندانہ" ہے اور "بلیڈرز" (جن کا ارادہ ہے کہ روس کا خون بہتے ہی رہنا چاہیے) جنہیں اپنے نظریے پر اصرار ہے' وہ بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں' ممکن ہے ایک دوسرے راستے سے۔ روسی بے ضرور تھے کہ کہیں سے نہیں نکلے۔ جس جگہ کو انہوں نے "سوشلسٹ" قرار دیا اور اسے کمیونسٹ پارٹی کی حکمرانی میں لیا' وہاں سے اپنی فوجیں کبھی نہیں نکالیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ روسی تصفیے کے لئے بات چیت پر کبھی آمادہ نہیں ہو سکے۔ امریکہ کو افغانستان میں زیادہ سے زیادہ یہی کامیابی ہو سکی کہ وہ مزاحمتی جنگ کو یقین کے ساتھ جاری رکھے اور اس میں روسی خاصی بڑی تعداد میں مارے جائیں۔ چنانچہ مجاہدین کو جس قدر زیادہ جدید اسلحے فراہم کئے جائیں' اتنا ہی اچھا ہوگا۔ جنگ جب تک یونہی جاری رہے گی' اس سے دنیا پر روسیوں کی سفاکی واضح ہوتی جائے گی۔ سوویت یونین کی کمزوری بھی ظاہر ہوگی اور امریکہ کے ارادے کی پختگی بھی۔

مجاہدین کے لئے امداد ہی تھا امریکہ کا بنیادی موقف' جسے بعد میں ریگن ڈاکٹرن کا نام دیا گیا۔ دنیا بھر میں اسے بہت شہرت ملی یعنی کمیونسٹ دشمن گوریلوں کو خفیہ امداد جو نکاراگوا' انگولا' کیمو چیا اور افغانستان میں وہاں کی مسلمہ حکومتوں کے خلاف جنگ کر رہے تھے۔ بیشتر صورتوں میں یوں بھی ہوا کہ امریکہ جس حکومت کا مخالف ہوتا' اسے تسلیم بھی کرتا اور ساتھ کے ساتھ اس کا تختہ الٹنے کے لئے امداد بھی دیتا۔ "امریکی سفارت خانے کا ایک شیل (اسلحہ خانہ) کابل میں اب تک کام کر رہا ہے) ریگن ڈاکٹرن کیمونزم کے خلاف عالمی جنگ میں ایک نظریاتی اعلان تھا' جس کا مقصد گوریلا سیاست کے عالمگیر کھیل میں امریکہ کو ایک کھلاڑی کے طور پر مستحکم بنانا تھا۔ 1960ء اور 1970ء کی دہائیوں میں روسیوں نے جو کچھ کیا اور جس طرح وہ قومی آزادی کی جدوجہد میں حوصلہ افزائی کر رہے تھے اور بائیں بازو کے کامیاب انقلاب میں اخلاقی امداد دے رہے تھے اب امریکہ بھی اسی طرح کرے گا۔ 1980ء کے عشرے میں وہ دائیں بازو کی گوریلا تحریکوں کو بڑھاوا

MashalBooks.org

دے گا اور انہیں امداد فراہم کرے گا۔ لیکن امور خارجہ کے بہت سے ماہروں اور بغاوتوں کو کام بنانے والے پختہ کار افراد کو اس پالیسی کی کامیابی میں شک تھا' کیونکہ انہیں اندازہ تھا کہ یہ تقابل کتنا پر فریب ہے۔ امریکی فوجی امداد کے لئے جن چار ملکوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک ملک میں بھی آزادی کے لئے لڑنے والوں کی کامیابی کا امکان نہیں' اصل سوال یہ ہے کہ روسیوں کو ہراساں کرنے اور محض "جھنڈا لہرانے" کی جو قیمت ادا کی جا رہی ہے اور اس میں مزید ملوث ہونے کے جو امکانات ہیں' کیا یہ قیمت اس کے لئے مناسب ہے؟ فوج کے اندر ایک اجلاس میں جب یہ فیصلہ کیا گیا کہ انگولا میں بائیں بازو کی حکومت کے خلاف لڑنے والے گوریلوں کو اور مجاہدین کو اسٹنگر میزائل' جن پر امریکہ کا نشان ہو' بھیجے جائیں تو اس فیصلے کے ہفتہ بھر بعد جان میکس نے سی آئی اے سے استعفیٰ دے دیا۔

اسٹنگر بھیجنے کے فیصلے کو کانگریس میں بہت سراہا گیا' کیونکہ اس کے استعمال سے یقینی تھا کہ روس مزاحمت کی کوششوں کو کچلنے میں ناکام رہے گا۔ 1984ء اور پھر 1985ء میں روس کی فوجی کارروائیوں کے نتیجے میں مدافعتی کوششیں ناکام ہوتی نظر آتی تھیں' لیکن جب زیادہ حساس نوعیت کے ہتھیار پاکستان کے ذریعے مدافعت کاروں کو پہنچنے لگے تو یہ امکان بھی بڑھ گیا کہ یہ اسلحے کسی اور جنگ میں بھی کام آئیں گے اور اس کا روپیہ کسی غیر ذمہ دار کی جیبوں میں جائے گا۔ اکتوبر 1987ء میں امریکی اسٹنگر میزائل کے ٹکڑے دو ایرانی گن بوٹس کے ملبے میں پائے گئے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ افغان باغیوں کے خلاف ایک سرحدی جھڑپ میں ایرانیوں نے ان سے چھین لئے تھے اور یہ بات تو یقینی تھی کہ بعد میں انہی کے ہاتھ بیچ دیئے تھے اور بہت سے ہتھیار خاصی بڑی مقدار میں' اگرچہ مقدار کا علم نہیں' افغانوں کو فراہم کئے گئے' لیکن عالمی منڈیوں میں پہنچ گئے۔ افغانستان میں سی آئی اے کی خفیہ کارگزاری بہت مہنگی ثابت ہوئی ہے اور اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہتھیار جو بیشتر روسی ساخت کے ہیں' ان ملکوں سے حاصل کئے گئے ہیں' جنہیں ماضی میں روس سے امداد ملتی تھی' مثلاً مصر کو یہ امداد میسر تھی یا پھر اسلحہ کے تاجروں سے خریدے گئے۔ جیسا کہ ایران اور کنٹرا کے معاملوں میں ہوا' کروڑوں ڈالر بھاری سودا اور دلال کی فیس کے ساتھ جعلی حسابات بھی غائب کر دیئے گئے۔

کانگریس کے بعض ارکان محسوس کرتے ہیں کہ امریکی خارجہ پالیسی کا ایک نہایت اہم اور اعلانیہ مقصد بھی افغان جنگ میں کام آ گیا ہے۔ گزشتہ آٹھ برس کے بیشتر زمانے میں امریکہ نے غیر ملکی امداد کے قانون کی 669 شق کو معطل رکھا ہے۔ اس شق کا مقصد ایٹمی اسلحہ کے پھیلاؤ کو روکنا ہے' پھر بھی امریکہ نے اس عام شک و شبہ کے باوجود کہ پاکستان خفیہ طور پر ایٹم بم بنا رہا ہے' اس کی امداد جاری رکھی ہے۔ اس اندیشے کے تحت کہ جب جنگ ختم ہوگی تو پاکستان پر ایٹمی پروگرام ترک کرنے کے لئے دباؤ پڑے گا' گزشتہ دسمبر میں ایک قانون منظور کر کے حکومت پاکستان کو یقین دلایا گیا کہ امریکی امداد کے جاری عمل میں رکاوٹ ڈالنے کے لئے آئندہ دو سال تک ایٹمی مسئلہ نہیں چھیڑا جائے گا۔ امریکی انتظامیہ کو تاکید کی گئی کہ یہ یقین

MashalBooks.org

دہانی پاکستان کو پہنچادی جائے تاکہ اس درپردہ جنگ میں پاکستان کا تعاون یقینی ہو جائے۔

ڈیگو کارڈویز ایک پیشہ ور ثالث ہیں۔ وہ ایکوڈور کے ایک وکیل ہیں' جنہوں نے اپنا بیشتر عرصہ ملازمت اور بین الاقوامی اداروں کی خدمت میں گزارا ہے۔ وہ پچھلے چھ سال سے جنیوا' ماسکو' کابل' اسلام آباد اور واشنگٹن کے درمیان جاتے آتے رہے ہیں۔ اس دوران میں ان کی کوشش یہ رہی کہ ان چار اصل فریقوں کے درمیان مسائل کی تفہیم کے ساتھ ان کے درمیان اختلافات کم کرائیں' یہ ہیں امریکہ' سوویت یونین' پاکستان اور افغانستان کی حکومتیں۔ جنیوا کے مذاکرات میں صرف پاکستان اور افغانستان رسمی طور پر شریک ہوئے ہیں' لیکن ماسکو اور واشنگٹن سے برابر مشورہ ہوتا رہا ہے۔ مجاہدین نے سرکاری طور پر ان مذاکرات کی مذمت کی ہے اور ایران نے اپنے آپ کو الگ رکھا ہے۔ جنیوا میں کارڈویز لیگ آف نیشنز کے پرانے محل میں کانفرنس کے دو متصل کمروں کے درمیان پیغام لے کر جاتے آتے رہے' کیونکہ افغان اور پاکستان عہدیدار ایک ہی کمرے میں بیٹھنے کو تیار نہیں تھے۔ سمجھوتے کے خطوط بڑی احتیاط سے متعین اور وکیلوں کی زبان میں چار الگ الگ دستاویزات کی صورت میں خوبصورت چرمی فولڈر کے اندر رکھے گئے ہیں۔ کارڈویز نہایت باثر اور پروقار مسودہ نویس ہیں' سمجھوتے کو آگے بڑھانے میں انہیں ذومعنی الفاظ کے استعمال پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ ان کی رجائیت ناقابل شکست ہے اور مزاج کی رجائیت اس طرح کے کاموں میں بہت ضروری ہے اور پاکستان کے سفارتی حلقوں میں انہیں اندھیری سرنگ کے آخری سرے پر روشنی کی کرن قرار دیا جاتا ہے۔

امریکہ نے اقوام متحدہ کی ثالثی کی رسمی طور پر توثیق کر دی' لیکن افغانستان میں جنگ کے خاتمے کے لئے اس نے پہلے تین سال تک مذاکرات میں کسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ 1985ء میں جنیوا میں اعلیٰ سطح کی بات چیت کے بعد واشنگٹن نے اپنا اعلانیہ موقف بدلنا شروع کیا۔ اسی سال 13 دسمبر کو نائب وزیر خارجہ جان وہائٹ ہیڈ نے اعلان کیا کہ امریکہ اس سمجھوتے پر ایک ضامن بننے کے لئے تیار ہے۔ انتہا پسندوں نے یہ امید لگا رکھی تھی کہ امریکہ' متحدہ مجاہد گروپوں کو ایک جلاوطن حکومت کے طور پر تسلیم کرے گا' لیکن یہ امید اس وقت پاش پاش ہو گئی جب مزاحمتی رہنما اور صدر ریگن کے درمیان ایک ملاقات کی خبر کی بہت تشہیر ہوئی' جس میں جلاوطن حکومت کو تسلیم کرنے کا خیال حتمی طور پر رد کر دیا گیا۔

جن تین اصولوں پر یہ امن قائم ہوا تھا' ان میں سے تین پر تو عملاً تین سال پہلے ہی عمل ہو چکا تھا۔ (پانچواں اصول 1986ء میں طے ہوا تھا' جس میں درج تھا کہ اقوام متحدہ اس سمجھوتے پر عمل درآمد کی نگرانی کرے گی۔) دستاویز میں پہلی بات یہ شامل تھی کہ کوئی فریق مداخلت نہیں کرے گا' دوسرا اصول یہ کہ اس سمجھوتے کو بین الاقوامی ضمانت حاصل ہوگی۔ تیسری بات یہ کہ مہاجر بہ حفاظت واپس آ جائیں گے۔ پاکستان اور افغانستان کی حکومتوں نے 1985ء میں ان تینوں سمجھوتوں کو تسلیم کر لیا تھا۔ ایران نے امن

MashalBooks.org

مذاکرات کی علانیہ مذمت کی تھی۔ سمجھوتے کی چوتھی شق‘ جس میں روسی فوجوں کی واپسی کے وقت کی صراحت شامل تھی‘ اس نے مشکل پیدا کی تھی‘ لیکن اس سال ماہ فروری میں سوویت یونین نے دس ماہ کے اندر افغانستان سے کلیتاً نکل جانے کی تجویز پیش کر دی اور 15 مئی کی تاریخ مقرر کی‘ جب سے اس عمل کا آغاز ہوگا۔ امریکہ کے اصرار کو تسلیم کرتے ہوئے گورباچوف نے اقرار کیا کہ وہ روس کی آدھی فوج کو نوے دن کے اندر افغانستان سے نکال لیں گے اور انخلا کا سارا عمل 10 مارچ 1989ء تک مکمل ہو جائے گا۔ سوویت یونین نے افغانستان سے واپسی کے عمل کو مشروط رکھا ہے‘ شرط یہ ہے کہ مزاحمت کرنے والوں کو باہر سے مدد دینے کا سلسلہ بند کیا جائے۔ یہ اصول سمجھوتے کے مسودے میں تسلیم کیا گیا ہے۔

سوویت یونین نے امریکہ اور پاکستان کو چھ سال تک اس معاملے میں الجھائے رکھا کہ افغانستان میں ایک مشترکہ حکومت قائم کی جائے۔ اس کی طرف سے فوجوں کے انخلا کی یہ پیشگی شرط تھی۔ امریکی حکام نے شروع سے ہی کارڈویز پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ امریکہ اس طرح کے سمجھوتے میں شامل نہیں ہوگا۔ گزشتہ دسمبر میں گورباچوف نے واشنگٹن کا دورہ کیا‘ اس کے بعد ایک اعلیٰ امریکی عہدیدار نے ہمیں بتایا کہ بڑی طاقتوں کو افغانستان میں حکومت سازی کے کاروبار میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔ جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے‘ اس کا ایک ہی مسئلہ تھا‘ روسی فوجوں کا انخلا۔ یہی موقف حکومت پاکستان نے چھ سال تک اختیار کئے رکھا‘ جسے وہ عدم مداخلت کا اصولی موقف قرار دیتے ہیں۔ ان کے کہنے کا مقصد ہے‘ افغانیوں کو اپنے معاملات خود طے کرنے دیجئے۔ واشنگٹن اور اسلام آباد میں بھی اس موقف کو غیر اختلافی سمجھا گیا کیونکہ یہ بات ناقابل یقین تھی کہ روس‘ کابل میں ایک دوست حکومت کے قیام کی یقین دہانی حاصل کئے بغیر افغانستان سے نکل جائے گا‘ لیکن فروری میں روسیوں نے اعلان کیا کہ اب وہ اپنے انخلا کے لئے کسی قابل قبول حکومت کے قیام کی شرط نہیں لگائیں گے۔

روس کے اس موقف کی تبدیلی سے پاکستان نے بھی اپنا موقف بدل دیا۔ واشنگٹن کے بلیڈرز (جن کا موقف تھا کہ روس کا خون بہتے رہنا چاہیے) کی طرح پاکستان کے بلیڈرز یعنی اس کے فوجی اور خفیہ ایجنسی کے اعلیٰ افسروں نے جنگ بند کرنے سے زیادہ جنگ کو جاری رکھنے میں اپنا مفاد وابستہ کر رکھا تھا۔ امریکہ اور پاکستان کے اس موقف کے آگے کہ روسی فوجیں نکل جائیں‘ روس کا پسپائی اختیار کرنا اور کسی سیاسی تصفیے کے بغیر ایسا کرنا ضیاء کو یہ پاکستان کے ساتھ صریحاً بدعہدی معلوم ہوئی۔ اسلام آباد میں اخبارات کے مدیروں سے باتیں کرتے ہوئے انہوں نے کہا: امریکہ اور روس نے ایک سمجھوتہ کر لیا ہے۔ کوئلے کی دلالی میں ہم نے اپنے منہ کالے کر لئے۔ ایک ایسی مشترکہ حکومت قائم کئے بغیر‘ جس میں مجاہدین‘ مہاجر اور حکمران ڈیموکریٹک پارٹی کے ارکان شامل ہوں‘ روس کا افغانستان سے انخلا ملک کو انتشار‘ خون ریزی‘ نزاجیت اور خانہ جنگی کی راہ پر لے جائے گا۔‘‘ ان حالات میں پاکستان میں مقیم لاکھوں مہاجروں کو اپنے وطن واپس

MashalBooks.org

جاتے ہوئے نا مل ہوگا۔

ضیاء کی تشویش سمجھ میں آتی ہے' جب کہ افغانستان کے اندر وسیع پیمانے پر کوئی سمجھوتا نہ ہوا' ایسا سمجھوتا جس کی حمایت بڑی طاقتیں بھی کریں' اس وقت تک اس علاقے میں کوئی امن قائم نہیں ہوگا اور پاکستان اگرچہ جنگ سے بھاری رقم وصول کرتا رہے گا' لیکن اس کے تباہ کن اثرات بھی محسوس کرے گا۔ یعنی جرائم' نشہ خوری اور تشدد جو منشیات کی تجارت کے ثمرات ہیں اور مہاجرین کا مسئلہ اور بڑے بڑے شہروں میں بم پھٹنے کے حادثات' بہر حال خبر یہ ہے کہ انخلا سے پہلے' کابل میں ایک عبوری مشترکہ حکومت کے قیام پر ضیاء نے اصرار کرنا چھوڑ دیا ہے' البتہ ان کی شرط یہ ہے کہ روسیوں کے نکل جانے کے بعد کارڈویز کابل میں ایک ایسی حکومت کے قیام کے لئے "نجی کوشش" جاری رکھیں۔

لیکن مذاکرات کے ذریعے افغان جنگ کے خاتمے کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ ادھر جنیوا میں مذاکرات جاری ہیں' لیکن آخری مرحلے میں نظر یہ آتا ہے کہ ایک صرف کانگریس میں ہی مجاہدین کے حمایتی نہیں ہیں' اس کے علاوہ دائیں بازو کے سرگرم عناصر ہیں اور شکی مزاج کالم نگار بھی ہیں' جو اس سمجھوتے کے خلاف اپنے قلم سے یلغار کئے ہوئے ہیں۔ کانگریس میں مجاہدین کے دو سب سے مضبوط حمایتی ایک تو چارلس ولسن ہیں' جن کا تعلق ٹکساس سے ہے' دوسرے سینیٹر گارڈن ہمفری ہیں' جو نیو ہمپ شائر سے آئے ہیں' ان دونوں نے جنیوا سمجھوتوں کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ یہ تو افغان "حریت پسندوں" کو سرے سے بیچ دینا ہوا' اس لئے کہ سمجھوتے میں یہ تو کہا گیا ہے کہ مجاہدین کو امداد بند کی جائے' لیکن سوویت روس کی طرف سے کوئی یقین دہانی نہیں کی کہ وہ کابل حکومت کو امداد بند کر دیں گے۔ ہمفری نے جنیوا سمجھوتوں کو 'ناشائستہ' "مفسدانہ" اور "خطرناک" قرار دیا ہے۔ ولسن نے کہا کہ سمجھوتے کے مسودے پر دستخط کرنے کی کوئی ضرورت نہیں' کیونکہ روس تو "شکست خوردہ" ہے اور اس کی فوجوں کو تو افغانستان سے بہر طور نکلنا ہی پڑے گا۔

اکثریتی لیڈر رابرٹ بائرڈ کی قیادت میں 77 سینٹرز کا اختلاف ریکارڈ پر موجود ہے' جنہوں نے سمجھوتوں کی مخالفت کی اور صدر ریگن نے دعویٰ کیا کہ ایسی کسی یقین دہانی کا ذاتی طور پر انہیں علم نہیں' حالانکہ اس کا اعلان 1985ء میں ہو چکا تھا۔ یقین دہانی یہ کہ امریکہ ان سمجھوتوں کی ضمانت دیتا ہے۔ ریگن نے بائرڈ کو لکھا کہ کابل کی حکومت کو امداد کی بندش کے برابر ہی امریکہ کی امداد ہوگی۔ روس نے مساوی توازن اصول کو تقریباً اسی دلیل کے تحت' جو امریکہ نے اختیار کی ہے' ماضی میں رد کر دیا تھا۔ (تسلیم شدہ حکومتوں کو امداد فراہم کرنا خود مختار حکومتوں کا مسلمہ حق ہے۔ گوریلوں کو اسلحہ مہیا کرنا جو حکومت کے خلاف لڑ رہے ہوں۔ عام طور پر تہذیب کاری سمجھا جاتا ہے۔ تقریباً سات سال کے مذاکرات کے دوران امریکہ نے کسی بھی موقع پر افغانستان میں ایک حکومت کی جانب سے دوسری حکومت کی امداد کا سوال نہیں اٹھایا۔ جنیوا میں جلد سمجھوتے

کی امید جب ختم ہونے لگی تو سوویت یونین نے واشنگٹن کے بعض تبصروں کی پیش گوئی اور توقع کے عین مطابق اعلان کیا کہ وہ سمجھوتے کے بغیر ہی اپنی فوج کو افغانستان سے نکال لے گا' لیکن کب اور کیسے؟ اس کا انتخاب وہ خود کرے گا۔

روس کے یک طرفہ طور پر نکل جانے کا مفہوم یہ نہیں کہ اس طرح جنگ بند ہو جائے گی' اس کے معنی ہوں گے' ایک نئی طرح کی جنگ۔ ایک مشترکہ حکومت کے بارے میں سیاسی سمجھوتے کے ساتھ جواب بھی ممکن ہے' افغانستان میں برابر جنگ ہو رہی ہے۔ یہ مجاہدین اور روس سے تعاون کرنے والوں کے درمیان انتقامی نوعیت کی جنگ ہے اور مزاحمتی تحریک میں شامل مختلف دھڑوں کی باہمی جنگ بھی ہے۔ پشاور میں ہونے والے مزاحمتی گروپوں کے متحدہ اجلاس میں گل بدین حکمت یار کو اتحاد کا چیئر مین منتخب کیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنے اس عہد کا اعلان کیا ہے کہ وہ اس وقت تک جنگ بند نہیں کریں گے جب تک افغانستان میں ایک بنیاد پرست نظام قائم نہیں کر لیتے۔ انہوں نے کہا کہ اگر پاکستان نے اپنے دروازے بند کر دیئے تو وہ اپنی جنگ ایران سے جاری کریں گے۔ (انہوں نے ڈینگ مارتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ سوویت روس کی مسلم جمہوریتوں کو بھی آزاد کرائیں گے) لیکن کسی ایسے سیاسی سمجھوتے کے بغیر جو امریکہ اور روس دونوں کے لئے قابل قبول ہو افغانستان کی جنگ نہایت خونین جنگ ہوگی۔ یہ عالمی طاقتوں کے درمیان دوطرفہ "پراکسی وار" ہوگی (یعنی اصل لڑنے والے ممالک پیچھے رہیں گے اور ان کی طرف سے دوسرے اپنا خون بہائیں گے) مجاہدین کو در پردہ مدد ملتی رہے گی اور روس کابل کی حکومت کو مشورہ' امداد اور جنگی اسلحہ مہیا کرتے رہیں گے۔ واشنگٹن میں عام طور پر کہا جا رہا ہے کہ کمیونسٹ حکومت' روسی فوجوں کی روانگی کے بعد برقرار نہیں رہے گی۔ مجاہدین' سیاسی طور پر کمزور ہیں اور حکومت مضبوط ہے' اس سے زیادہ مضبوط جس کا واشنگٹن میں قیاس کیا جاتا ہے' لیکن ان کا دعویٰ غالباً درست ہے۔

افغان حکومت نے اپنے اقتدار کو برحق قرار دیئے جانے کی خاطر کوششیں شروع کر دی ہیں' انہوں نے گوریلا لیڈروں کو جنگ بندی' عام معافی' خوش آئند دعووں اور رشوت کے ذریعے اپنے ساتھ ملانے کی کوششیں تیز تر کر دی ہیں۔ چند مقامی کمانڈروں نے جن میں سے کچھ رہنما حکمت یار کے وفادار تھے (جو ایک انتہا پسند بنیاد پرست لیڈر ہے) حکومت کے ساتھ تعاون کرنے میں اپنی دلچسپی ظاہر کر دی ہے۔ ایک نئے آئین میں مقامی انتخابات' عوام کی منتخب پارلیمنٹ' مقامی قبائلی لیڈروں کے لئے مناسب خودمختاری کا اہتمام کیا گیا ہے۔ لیڈروں کو فراخدلانہ مالی معاوضوں کی بھی حوصلہ افزا پیش کش کی گئی ہے۔ ایک ہزار سے زیادہ مساجد تعمیر کی گئی ہیں یا انہیں نئے سرے سے تعمیر کیا گیا ہے۔ مذہبی اداروں کی زمینوں کو ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ کمیونسٹوں کی عمل داری میں بازار اسی طرح آزادانہ خرید و فروخت کے لئے کھلے ہیں' جیسے کہیں اور ہوں گے۔ کارنیگی انڈاؤمنٹ برائے عالمی امن

(Carnegie Endowment For International Peace) کے رکن سلیگ ہاریسن نے ابھی حال ہی میں 1984ء میں کابل کا دورہ کیا۔ ان کا بیان ہے کہ وہاں کمیونسٹ ارکان کی ایک بڑی جمعیت 45 ہزار پر مشتمل اب بھی یقین رکھتی ہے کہ ایک ناخوشگوار ماضی کے باوجود صرف ان کی پارٹی ہی ملک کو جدید زندگی کی راہ پر لے جا سکتی ہے۔ افغانستان جیسے ملک میں جو اس قدر گروہوں میں بٹا ہوا ہے اور ایک ایسے معاشرے میں جہاں سیاسی وابستگی رکھنے والا شخص صرف بہت سے خاندان اور قبیلے کی وفاداری پر بھروسا کر سکتا ہے' اتنی بڑی تعداد کوئی معنی رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ متوسط طبقے کے بہت سے لوگ اگر چہ کمیونسٹوں کے زبردست مخالف ہیں' لیکن وہ جتنا روسیوں سے نفرت کرتے ہیں' اسی قدر بنیاد پرستوں سے بیزار ہیں۔

امریکہ میں افغانستان کی جنگ کو سیاسی سطح پر محض کمیونزم کے خلاف صحیح جنگ سمجھا جاتا ہے۔ کم ہی امریکی اس بات سے واقف ہوں گے کہ "آزادی کے لئے جنگ کرنے والوں" میں نہایت اہم عناصر' جن کی اس قدر مدد کی جا رہی ہے' وہ ہیں جو ایران کے ان بنیاد پرستوں سے حیرت انگیز طور پر ملتے جلتے ہیں' جن کی امریکہ میں مختلف قسم کی شہرت ہے۔ بیشتر امریکیوں کو یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ 1959ء کے باہمی تحفظ کے معاہدے کے تحت امریکہ اس بات کا پابند ہے کہ پاکستان پر حملے کی صورت میں وہ "مناسب کارروائی کرے گا اور اس میں مسلح افواج کا استعمال بھی شامل ہے۔" اس طرح کا حملہ جس کو روس نے ابھارا اور اس کی تنظیم کی کوئی دو سال سے جاری ہے۔ جنوری 1986ء میں پی آئی اے کے پشاور آفس میں ایک بم دھماکہ ہوا' جس میں کئی افراد ہلاک ہوئے اور اس کے بعد ہی سے بموں کی دھماکے کی وارداتیں بہت سے بڑے شہروں میں ہو چکی ہیں۔ ان کے بارے میں فرض کیا جاتا ہے کہ یہ کارروائی روس کی نگرانی میں ہونے والی خفیہ افغان پولیس کی ہے۔ اس میں جو پیغام ہے' وہ بالکل واضح ہے' پاکستان ایک کمزور ریاست ہے اور روس اس سے زیادہ نقصان پہنچانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ روسی طیارے سرحد کے ساتھ برابر فضائی حملے کرتے رہتے ہیں۔

افسوس ناک بات یہ ہے کہ جنوبی ایشیا میں یقینی امن کے قیام کو ریگن انتظامیہ نے اولیت نہیں دی۔ اس کا اولین مقصد یہ رہا ہے کہ روس کو نیچا دکھائے اور اسے افغانستان سے اپنی فوجیں نکالنے پر مجبور کرے۔ فوج کا انخلا تو اب یقینی ہے اور یہ کابل میں ایک ایسی حکومت کے قیام کے بغیر ہوگا جو کمیونسٹوں یا بنیاد پرستوں کی بالادستی سے آزاد اور عام لوگوں کے لئے زیادہ قابل قبول ہو۔ اگر چہ روسیوں کے جانے کے بعد جنگ ایک نئے دور میں داخل ہو جائے گی۔ یہ جنگ کتنی تباہ کن اور کس قدر سفاکانہ ہوگی' اس کا انحصار بیرونی طاقتوں کی مرضی پر ہوگا۔ جنیوا معاہدہ میں ایک ایسے لازمی طریق کار کی گنجائش موجود ہے' جس میں روس اور امریکہ کا تعاون شامل ہو اور اس طرح افغانستان کی تعمیر نو ہو اور اس علاقے میں دیرپا امن قائم ہو۔ امریکہ اور روس کے تعلقات کے درمیان یہ نہایت اہم موقع' جواب سے پہلے پیدا نہ ہوا تھا' موجود ہے کہ یہ دونوں ایک

MashalBooks.org

مثبت مشترکہ کارروائی کے امکانات پر عمل کریں۔ بصورت دیگر ایک خونیں کھیل دوبارہ شروع ہو جائے گا اور پھر روسی فوجیں نکل رہی ہیں اور لبنان جیسا آسیب افغانستان پر منڈلاتا ہوا نظر آتا ہے۔ لبنان بھی پرامن ہوتا تھا' لیکن وہ بھی دوسروں کی لڑائی میں اسی طرح پھنس گیا تھا۔

تحریر: اقبال احمد اور رچرڈ جے بارنٹ

"نیویارک" 11 اپریل 1988ء)

MashalBooks.org

افغانستان: اب جنگ بندی ضروری ہے

خوست کی جنگی چھاؤنی پر مجاہدین کا قبضہ بلاشبہ افغان مدافعتی جنگ آزماؤں کی فتح ہے لیکن جب تک اس کوشش سے افغان جنگ کسی سیاسی حل کی طرف نہیں جاتی 'یہ نہایت نقصان دہ (فتح) ہوگی۔ خوست چونکہ کابل اور جنوب مغربی صوبوں کے درمیان رسد پہنچانے والی سڑک کے قریب واقع ہے' اس لئے اس کی بڑی جنگی اہمیت ہے۔ لیکن اس جنگ کی اہمیت فوجی سے زیادہ تعیناتی ہے۔ پاکستان کی سرحد کے نواح میں' حکومت افغانستان کی اس سرکاری چوکی کو فتح کرنے کی کئی کوششیں مجاہدین نے یکے بعد دیگرے کئی بار کیں' لیکن ناکام رہے۔ اس طرح خوست پر کابل کا قبضہ اس کی اپنی طاقت سے زیادہ مجاہدین کی کمزوری ظاہر کرتا تھا۔ اب یہ تاثر دور ہو چکا ہے۔

مدافعت کاروں کے لئے اس میں ایک سیاسی فائدہ بھی ہے۔ خوست پر قبضے کے بعد مجاہدین کا رویہ اب سے پہلے کنڑ جیسے قصبات پر قبضے کے مقابلے میں بہت مختلف تھا۔ قیدی پکڑے گئے لیکن بہ یک قلم انہیں قتل نہیں کیا گیا۔ بڑے پیمانے پر کسی لوٹ مار کی خبر نہیں سنی گئی۔ اور تھوڑے سے جو شہری' اس وقت علاقے میں رہ گئے تھے' ان کی بے حرمتی نہیں کی گئی' افغان عبوری حکومت کے صدر صبغت اللہ مجددی نے فوری طور پر انٹرنیشنل ریڈ کراس کو خوست بلا بھیجا اور انہیں زخمیوں اور اسیروں تک پہنچنے کی اجازت دی۔ نتیجہ یہ کہ افغانستان کے تعلق سے مجاہدین کا تشخص بہتر ہوا ہے اور عالمی سطح پر اس کی بڑی ضرورت بھی تھی۔ یہ فائدے جو حاصل ہوئے ہیں' ان کے نتیجے میں مجاہدین کے لیڈروں اور ان کی اصل مددگار حکومت پاکستان کے درمیان دو مخالف رویے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اب وہ اپنی جنگی اہلیت اور باہمی اشتراک کی صلاحیت کی بنا پر اپنے اندر زیادہ اعتماد محسوس کریں گے۔ اس لئے فیصلہ کن کامیابی کی خاطر اپنی جدوجہد برقرار رکھیں گے۔ اس سے یہ ہوگا کہ زبان سے تو سیاسی تصفیے کی اہمیت کا اقرار کریں گے' لیکن جنگی تیاریاں نئے سرے سے شروع کر دیں گے۔ دوسری طرف ان کا یہ اندازہ بھی ہو سکتا ہے کہ سیاسی تصفیے کے حصول میں اب کے اگر وہ ناکام رہے تو بعد میں شاید بہت تاخیر ہو چکی ہوگی۔

حکومت پاکستان کے 'افغان سیل' کا ایک اجلاس اسلام آباد میں ۳ اپریل کو ہوا۔ ان تین مہینوں میں یہ ان کا پہلا اجلاس تھا' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکام خوست کی شکست کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ صدر غلام اسحاق خان اور وزیراعظم نواز شریف دونوں اس موقع پر موجود تھے۔ ان کی گفت و شنید کا نتیجہ معلوم نہیں ہو سکا لیکن پشاور اور اسلام آباد سے افغانستان اور پاکستان کے لیڈروں کے جو بیانات جاری ہوئے ہیں ان سے

MashalBooks.org

یہ اشارہ ملتا ہے کہ مذکورہ دونوں طریقوں کو آپس میں ملا کر چلنے کا رجحان غالب ہے۔ اگرچہ بعض ذرائع کے مطابق سیاسی حل کی تلاش پر زیادہ زور دیا گیا ہے لیکن عملاً یہ فارمولا کام کرتا نظر آتا ہے کہ لڑائی کا جواب لڑائی سے دیں گے اور بات چیت کا جواب بات چیت سے۔

یہ ایک معروف اور آزمودہ فارمولا ہے کہ ایک طرف سفارت کار بات چیت میں مصروف رہتے ہیں دوسری طرف متحارب فریق اپنی اپنی سودے بازی کی اہلیت کو مستحکم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے افغانستان میں یہ فارمولا قابل عمل نہیں۔ بیک وقت فوجی اور سیاسی طاقت کے استعمال کی حکمت عملی وہاں کام کرتی ہے جہاں ایک جامع مقصد ہو' ایک مرکزی خیالات اور تنظیمی ڈسپلن ہو اور مربوط قیادت ہو۔ مجاہدین میں کسی ایسے منصوبے میں' جس کے اندر دونوں رویے شامل ہوں' بالآخر جنگ کی منطق حاوی ہو جائے گی اور پاکستان اور افغانستان دونوں کے لئے جو ایک ذرا موقع اس تباہ کن جنگ کے حصار سے نکلنے کے لئے باقی رہ گیا ہے وہ بھی ضائع ہو جائے گا۔

وہ زبردست مفادات جو مختلف ذاتی نوعیت کے عزائم میں پیوست ہیں' نفع اندوزی' نظریہ اور مفروضہ حکمت عملی' یہ ساری باتیں جنگ کی منطق کو تقویت دیتی ہیں۔ اس بات کا پوری طرح اندازہ نہیں کیا جاتا کہ افغانستان کے جنگ جویانہ کلچر میں ابھرنے والے گوریلا کمانڈر ایک نئی اشرافیہ بن گئے ہیں' جن کے اقتدار کو جنگ کے بند ہو جانے سے خطرہ لاحق ہوگا۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ جس فارمولے کا نصف حصہ سیاسی ہے' اس کو تقویت دینے کی بجائے وہ اسے سبوتاژ کر دیں گے۔ فوجی کارروائی کو مسلسل جاری رکھنے سے سیاسی عمل کو تقویت نہیں ملے گی' بلکہ اسے سبوتاژ کر دیا جائے گا۔ اس میں انہیں پاکستان' افغانستان اور بیرون ملک سے بھی مالی اور سیاسی طور پر مقتدر طاقت ور عناصر کی حمایت حاصل ہو جائے گی۔

افغان جنگ کے نتیجے میں ایک نہایت نفع بخش بین الاقوامی تجارت' یعنی منشیات' اسلحہ اور دیگر ممنوعہ اشیا کی تجارت کی راہ کھل گئی ہے۔ اس سے پاکستان اور افغانستان کی غالب آبادی کی قیمت پر کچھ لوگ اپنی جیبیں بھر رہے ہیں۔ یہ بااثر مافیا بھی جنگ کے خاتمے کو اپنے مفادات کے لئے نقصان دہ سمجھتی ہے۔ ایک طرف مزاحمتی فریق ہے دوسری طرف "جہاد انٹرنیشنل انکارپوریشن"' ان دونوں کو گذشتہ دو برس کے اندر جنگ کی شدت میں کمی کے بعد اپنی طاقت اور منافع میں تخفیف کا تجربہ ہوا ہے۔ فوجی مہم کے تیز ہونے سے ان دونوں میں نئی توانائی آسکتی ہے۔ یہ مہمل بات ہے کہ اسلحہ اور زرمبادلہ کی جنگ لڑنے والوں کو اللہ کے بندوں میں اپنے دوست مل گئے ہیں۔

پاکستان اور اس سے قدرے کم مشرق وسطیٰ کی اسلامی پارٹیوں اور حکومتوں نے افغانستان میں اپنے نظریاتی اور سیاسی مفادات داؤ پر لگا دیے ہیں۔ ان سب کے اپنے جماعتی اور نظریاتی مقاصد ہیں۔ وہ جنگ میں اس لئے شریک نہیں کہ پاکستان یا افغانستان کے قومی مفادات کا تعین اور ترجمانی کر رہے ہیں۔

MashalBooks.org

اس کے باوجود افغان مزاحمت اور پاکستانی انتظامیہ ان دونوں کے اندر ان کے حلقہ ہائے اثر اور معاونین موجود ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے جنگی کیمپ بدر اول اور دوئم نے حالیہ جنگ میں رضاکار بھیجے ہیں۔ جماعت کے سربراہ قاضی حسین احمد نے ۱۴ اپریل کو حزب اسلامی کے سربراہ گلبدین حکمت یار کے ساتھ خوست کا دورہ کیا۔ ان کا یہ اعلان کہ کابل پر حملہ کیا جائے اقوام متحدہ میں پاکستان کے سفیر جمشید مارکر کی نمائندگی کے بالکل منافی تھا۔

یہ نظریاتی پارٹیاں، کسی سیاسی سمجھوتے کی قائل نہیں بلکہ مکمل کامیابی کے درپے ہیں۔ لیکن بیشتر نظریاتی گروہوں کی طرح وہ حقیقت اور خواب کے درمیان تمیز نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ جنگ ہوتی رہے تو ان کے مفادات، جنگ ختم ہونے کے مقابلے میں بہتر طور پر پورے ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ اسلحہ حاصل کر سکتے ہیں، اپنے کیڈر کی جنگی تربیت کر سکتے ہیں، بیچارے درماندہ مہاجروں میں پروپیگنڈہ کر سکتے ہیں اور جہاد کرنے کے لئے سرمایہ جمع کر سکتے ہیں۔ سفارتی کوششوں کو تقویت دینا تو دور رہا، زیادہ امکان یہ ہے کہ وہ اسے سبوتاژ کر دیں گے۔ جنگ کے پھیلنے سے یہ ہوگا کہ وہ قوم کے مفادات کو اپنے نظریاتی مقاصد کے تابع بنائے رکھیں گے۔

جنگ کی منطق کو غیر متوقع کوششوں سے بھی تقویت ملتی ہے۔ یہ ہیں افواج پاکستان کے اعلیٰ عہدیدار اور قدرے کم پاکستان کی افسر شاہی۔ ان میں سے چند پاکستانی جماعت اسلامی اور حکمت یار کی افغان حزب اسلامی جیسی جماعتوں کی طرف نظریاتی میلانات رکھتے ہیں لیکن بیشتر قومی تحفظ کے اسباب کے تحت، جن پر وہ پورے اخلاص سے یقین رکھتے ہیں، مجبور ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کی حکومت میں اس بات پر ثبت یقین کیا جاتا تھا کہ افغان مجاہدین کی کامیابی کی صورت میں پاکستان Strategic depth یعنی اپنی سرحدوں کے لئے زمینی وسعت حاصل کرے گا۔ ۱۹۸۸ء میں جنرل اختر عبدالرحمن (مرحوم) سے ایک ملاقات میں، یہ بات میں نے پہلی بار سنی۔ اس وقت میں نے یہ دلیل دی اور اب بھی یہی کہتا ہوں کہ وہ فضول خیال ہے۔ ہم ایک سایے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں، جو بالآخر ہمیں بے پناہ اندھیرے میں پہنچا دے گا۔

اگر ہماری ضرورت زمینی وسعت ہے تو اسے فوجی نہیں بلکہ سیاسی امکانات میں تلاش کرنا چاہیے۔ ہم افغانستان میں یہ زمینی وسعت اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتے جب تک یہ نہ ہو کہ اسے فتح کر لیں اور اس پر حکومت کرنے لگیں۔ جن سے آپ یہ سودا کر رہے ہیں، وہ آپ کا مقصد پورا نہیں کر سکیں گے صرف اس بنا پر کہ اقتدار اگر انہیں مل بھی گیا تو وہ ہمیشہ زندہ نہیں رہیں گے۔ ایسی باتوں کا فیصلہ فانی انسان نہیں بلکہ تاریخ اور جغرافیہ کرتے ہیں۔ درحقیقت ایک فیصلہ کن جنگی کامیابی کی تلاش میں ہم افغان عوام کے لئے زیادہ مصائب پیدا کریں گے اور پاکستان کے حصے میں زیادہ مہاجر، اسلحہ، منشیات اور عدم تحفظ کا احساس، یہ سب پہلے سے زیادہ آئیں گے۔

MashalBooks.org

۱۹۸۷ء اور ۱۹۹۰ء کے زمانے میں حکومت پاکستان اور افغان مدافعتی فریق نے یہ شاندار کامیابی حاصل کی کہ فتح کے امکان سے اپنے لئے شکست چھین لی۔ اب تو کوئی کامیابی سامنے نظر نہیں آتی۔ لیکن پھر وہی طاقتیں' جنہوں نے پاکستان کو ایک موافق سیاسی سمجھوتے کے لئے جو ملک کے دیرپا مفاد میں تھا' فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دیا' مستعدی سے کام کر رہی ہیں۔ اگر کسی سیاسی تصفیے تک پہنچنا ہے تو ان عناصر کو غیر جانب دار بنانا ہوگا یا کم از کم ان کے کردار اور اثر و رسوخ میں تخفیف کرنی ہوگی۔ اس سے پہلے کہ کسی سیاسی تصفیے کی امید پیدا ہو' جنگ کا خیال ترک کرنا ہوگا۔ صرف اس بنا پر ایک ایسی جنگ بندی کا حصول جو اقوام متحدہ کی نگرانی میں ہو' تدبر کا پہلا مرحلہ ہونا چاہیے۔ افغانستان میں قیام امن کے لئے اس کی حیثیت سنگ بنیاد کی ہوگی۔

ممکن ہے یہ جنگ بندی بار بار ٹوٹے۔ لیکن کوئی مضائقہ نہیں' کیونکہ اس کا مقصد جنگ کے طریقے کو کمزور کرنا اور بنیادی طور پر جنگ آزمائی کے خیال کو مسترد کرنا ہوگا۔ وہ اس لئے کہ افغانستان کا کوئی فوجی حل ممکن نہیں۔ مجاہدین آپس میں پہلے سے زیادہ بٹے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ تنہا جمعیت اسلامی جس کی ایک متحدہ کمان تھی' دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ دو ہفتے قبل شمالی افغانستان میں احمد شاہ مسعود اور جمعیت کے سربراہ برہان الدین ربانی کے درمیان لڑائی چھڑ گئی۔ امریکہ' جو مدافعتی جنگ آزماؤں کا اصل مالیاتی معاون تھا' اپنا منافع لے چکا اور جہاد میں جتنی سرمایہ کاری کی تھی' اس کا بڑا حصہ واپس لے گیا۔ سعودی اور کویت اس کی پیروی کریں گے۔

ایک اہم بات یہ کہ جنگ آزما نظریے یعنی مارکسزم اور بنیاد پرستی' دونوں افغان کلچر سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ افغانستان ایک متنوع اور ملی جلی آبادی کا ملک ہے۔ ایک مرکزی اور وحدانی حکومت پر مبنی نظریہ اسے موافق نہیں آتا۔ اس ملک کے چاروں طرف دیگر بڑے ہمسایہ ملک بھی ہیں' جو ایک دوسرے کو یہاں کی خارجی اور دفاعی پالیسیاں بنانے نہیں دیں گے۔ سوویت یونین کو جو سبق سیکھنے میں ہم نے اس کی مدد کی تھی' وہ ہم خود بھول گئے۔

(''ڈان'' 7 اپریل' 1991ء)

MashalBooks.org

ایک سرزمین، بے ساز و آواز

میں اس مستقبل کا قیاس کر رہا ہوں، جو ہمارے زمانے کے مدعیان اسلام کے ذہنوں میں ہے۔ یہ خوفناک ہے اور دنیا میں کہیں بھی عملاً نظر نہیں آتا۔ آج ہم افغانستان کے دو شہروں پر نظر ڈالتے ہیں۔

قندھار ایک قدیمی شہر ہے اور کئی لحاظ سے افغان جمالیات کا مرکز ہے۔ لیکن اب فن تعمیر کا ایک لق و دق ملبہ ہے۔ اس کی روح یہیں کسی ڈھیر کے اندر دبی ہوئی ہے۔ اس شہر کی تباہی کا آغاز بڑی حد تک کمیونسٹ حکومت اس کے روسی سرپرستوں اور ان کے مخالف مجاہدوں کے درمیان جنگ کے دوران میں ہوا۔ ''فتح'' کے بعد مجاہدین نے اسے لوٹا ہی نہیں بلکہ انہوں نے تقریباً بیشتر افغانستان سے اس کی آئندہ توقعات اور مسرت کی تلاش میں ان کی رجائیت چھین لی۔ قندھار کا تاریخی شہر جو کسی زمانے میں اپنے شاعروں اور داستان گویوں کے لئے شہرت رکھتا تھا، اب اس شہر میں موسیقی ممنوع ہے۔ کھیل پر پابندی ہے۔

طالبان میں سے کئی ایک جن کی قندھار پر حکمرانی ہے، ایک لڑکے کو بازار میں کھینچ کر لے جا رہے تھے۔ لڑکے کی گردن میں رسی تھی اور اس کے ہاتھ اس کی صفا چٹ کھوپڑی پر دھرے تھے۔ اس نے ایک ''اسلامی قانون'' کی خلاف ورزی کی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ اسے گیند کھیلتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ طالبان کی حکومت میں فٹ بال کھیلنا منع ہے جس طرح باسکٹ بال، والی بال اور دوسرے کھیل ہیں، جن میں جسم حرکت کرتا ہے۔ میں کسی طالبان رہنما سے نہیں ملا، اس لئے میں نہیں جانتا کہ ان کے دعویٰ کے بموجب اس ممانعت کا سبب کیا ہے؟ عام لوگ اور ان میں وہ بھی شامل ہیں جنہیں علم ہونا چاہیئے، یہ کہتے ہیں کہ طالبان کی تشویش کا سبب اخلاقیات ہے، صریح الفاظ میں جنسی اخلاقیات اور ان کا استدلال، قیاس کی رو سے وہی ہے جس کے تحت عورتوں کو بے پردہ باہر نکلنا ممنوع ہے۔ گیند کھیلتے ہوئے لڑکے مردوں میں ناواجب طور پر تحریص پیدا کرتے ہیں۔

اسلام آباد اور لاہور میں مجھے دوستوں نے مقامی واقعات پر مبنی قصے سنائے جن سے اندازہ ہوا کہ میں نے جو کچھ افغانستان میں دیکھا وہ تمام تر گلیشئر نہیں ہے بلکہ اس کا صرف ایک چھوٹا سا سرا ہے۔ ان میں سے ایک واقعہ کا تعلق ایک مشہور مولانا سے ہے جنہیں عمران خان پر اعتراض ہے کہ کرکٹ کی گیند اپنی ران پر رگڑتے ہیں جو جنسی طور پر شہوت انگیز ہے۔ ان مولاناؤں کا اندراج پلے بوائز میگزین کے شہوانی چہروں کے درمیان ہونا چاہیے تھا۔ بہر حال کرکٹ کے بیان سے یاد آیا کہ جنس کے معاملے میں ایک طرح کا تقابل انگلش پبلک سکولوں اور ہمارے دینی مدارس کے درمیان ہو سکتا ہے۔ جنس کے حوالے سے دونوں کے اندر

MashalBooks.org

نہایت گہرائی میں پیوست احساس جرم اور خلجان پایا جاتا ہے اور ان دونوں میں خیالی محبت اور انکار کا قرینہ انتہا درجے پر ہے اور یہ مفروضہ کہ اپنی خواہش کو دبانے اور خفیہ رکھنے سے ان کا شمار پاکیزہ لوگوں میں ہوگا۔

لیکن ہیرو (Harrow) اور دینی مدارس کے درمیان بہت سے امتیازات بھی ہیں۔ ایک تقابل تو بنیادی ہے۔ انگلش پبلک اسکولوں میں طلبہ کے اندر جو منکسر مزاجی جبراً داخل کی جاتی ہے اس کے اثرات عبوری مدت کے لئے ہوتے ہیں' یہ تو بلوغت کے جوشیلے پن کو لگام دینے کے لئے ہوتا ہے۔ اگرچہ بعض نوجوان (لڑکوں) پر اس کے اثرات گہرے ہوتے ہیں' جس کی مثال نہایت ماہر عکاس جون لی کارلے (John Le Carre) کے ناولوں میں ملتی ہے۔ دوسری جانب 'مدرسے' میں اس کا مقصد ایک نظریے کا دائمی نفوذ ہوتا ہے۔ ایک طرز زندگی کا نفوذ۔ مین بازار میں ایک دو طالبان سے جو اپنی گود میں کلاشنکوف رکھے بے فکر سے بیٹھے تھے طہارت اور تعزیر (یعنی پاکیزگی اور سزا) ان کے نصاب کے بنیادی مضامین تھے۔ انہوں نے پشاور میں تعلیم پائی تھی۔ طالبان زیادہ تر ہمارے ہی مدارس' خاص طور پر جمعیت العلمائے اسلام کے تحت چلنے والے مدارس کی پیداوار ہیں۔

میں نے کوئی درجن بھر افراد کو سر سے پاؤں تک برقعے میں دیکھا' لیکن ان تین دنوں میں قندھار کے اندر ایک عورت نظر نہیں آئی۔ عورتوں کا دفاتر میں کام کرنا منع ہے' چند ایک جو غیر ملکی ایجنسیوں کے لئے کام کرتی تھیں انہیں بھی حکم ہوا ہے کہ گھروں میں رہیں۔ ایسا ہی ایک حکم جلال آباد میں نافذ کیا گیا ہے۔ جون میں جب میں وہاں پہنچا تو دوسرے دن شوریٰ نے تمام غیر ملکی ایجنسیوں کو طلب کیا اور پشتو میں ان کو ایک طویل لیکچر دیا۔ جو سننے والوں کی سمجھ میں نہیں آیا البتہ ایک ترجمان نے اس کا خلاصہ سمجھا دیا۔ وہ یہ تھا کہ تم لوگ افغان عورت کو اپنے دفاتر میں ملازم نہیں رکھو گے اور اگر ایک نامحرم سے ملنے کا امکان ہو تو اپنے منصوبوں میں بھی عورت کو ملازم نہیں رکھو گے۔ ایک پشتون لیڈی ڈاکٹر کسی غیر ملکی ایجنسی میں کام کرتی تھی' اس نے بڑے رنج کے ساتھ بے بسی میں اپنا سر ہلا دیا۔

قندھار والوں کے مقابلے میں جلال آباد کے حکام قدرے نرم خو ہیں۔ شوریٰ کے ارکان کا انتخاب مختلف پارٹیوں سے ہوتا ہے جن میں مولانا یونس خالص کی حزب اسلامی سب پر حاوی ہے یہاں کا گورنر حاجی قدیر عبدالحق کا بھائی ہے جو خالص گروپ کا سب سے بااثر کمانڈر رہے۔ گورنر اور شوریٰ دونوں کے اتفاق رائے سے اسکولوں کو کھلا رہنے دیا گیا ہے' جو تعداد میں بہت تھوڑے سے ہیں۔ دوسری جانب طالبان نے مذموم علوم کی تعلیم سے بچانے کیلئے تمام اسکولوں پر پابندی لگادی ہے' خوش قسمتی سے یا بدقسمتی سے انہوں نے اس کا متبادل پیش نہیں کیا۔ غیر ملکی عورتیں جلال آباد میں کام کرتی ہیں اور گاڑی میں جاتے ہوئے بھی دیکھی گئی ہیں۔ قندھار کے مقابلے میں یہاں زیادہ برقع پوش عورتیں شاپنگ کرتے ہوئے دیکھی گئی ہیں۔

قندھار کے بازار سے گزرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ دکانیں ملبوں پر کھڑی ہیں جو کسی زمانے میں اینٹوں

MashalBooks.org

سے اور سرخ مٹی کے ساتھ بنی ہوئی فن تعمیر کا منفرد نمونہ رہی ہوں گی۔ انہیں دیکھ کر مراکش یاد آ گیا' جہاں ہم نے ایک بار نغمہ وساز سے مزین بڑے آرام کے دن گزارے تھے۔ دکانوں میں بجلی کے چھوٹے موٹے سامان تلے اوپر رکھے تھے' ان میں ٹرانسسٹر ریڈیو بھی تھے' لیکن کوئی ریڈیو چل نہیں رہا تھا۔ یہ بازار موسیقی سے خالی ہیں' جسے قندھار میں ممنوع قرار دیا گیا ہے' گھروں کے اندر بھی اور باہر بھی۔ مکانوں پر برابر چھاپہ پڑتا ہے اور لوگوں کو موسیقی سننے پر سخت سزائیں دی جاتی ہیں۔ میرے ساتھ کے مکان کا چوکیدار گانا سنتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ اسے بری طرح مارا پیٹا گیا۔ وہ اپنے ٹرانسسٹر اور ''شیریں افغان نغمے'' کے ٹیپ سے محرومی کو شدت سے محسوس کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جلال آباد کے حاکم موسیقی پر ناک بھوں تو چڑھاتے ہیں لیکن اس سے بیزاری کو اس شدت سے عملاً نافذ نہیں کرتے۔ ممنوعہ گانوں کو میں نے کئی بار چپکے سے سنا۔ لیکن قندھار میں کبھی نہیں۔ (ایک مسلمان ملک سے آئے ہوئے بین الاقوامی ماہر نے کہا' جہنم کے بھی درجات ہوتے ہیں۔)

اسمگلنگ یہاں صاف طور پر جرم نہیں ہے' دونوں شہروں میں کھلم کھلا ہوتی ہے اور خوب ہوتی ہے۔ قندھار میں آپ ٹائروں سے لادے ہوئے ٹرک اور شیشے اور بجلی کے آلات ایران سے کوئٹہ کی جانب لے جاتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ سمگلنگ کے سامان کی مقدار جو جلال آباد سے تورخم جاتے ہوئے دکھائی دیتی ہے' قندھار سے زیادہ ہے۔ یہ تجارت بظاہر طرفین کی ملی بھگت سے ہوتی ہے' اگرچہ متوازن اور مساوی ہرگز نہیں۔ جلال آباد میں دستیاب تقریباً تمام غذائیں' کپڑے اور گھریلو استعمال کے سامان پاکستان سے جاتے ہیں۔ قندھار کے مقابلے میں کاروں کی سمگلنگ بظاہر جلال آباد میں نہایت تیزی سے ہوتی ہے۔ جلال آباد میں' میں نے چار ''پارک'' دیکھے اور قندھار پاکستان سرحد پر ایک (پارک) نظر آیا۔ ہر پارک میں سینکڑوں نئی کاریں کھڑی تھیں۔ بعضوں پر کویت' امارات کی لائسنس پلیٹ لگی تھی۔ ایک مالک نے بتایا کہ کوئی بھی شخص پاکستان میں پاکستانی لائسنس پلیٹ کے ساتھ ایک سوک گاڑی ڈیڑھ لاکھ روپے میں منگوا سکتا ہے جو پاکستانی قیمت سے نصف کے برابر ہے۔ بڑی گاڑی پر اس سے بھی زیادہ بچت ہوگی۔ ایک ریلیف ورکر (امدادی کارکن) کا کہنا کہ ''تاجر طالبان کی مدد کرتے ہیں جیسا کہ وہ جلال آباد میں کرتے آئے ہیں۔ وہ تجارت اور املاک کو تحفظ دیتے ہیں۔''

تجارت میں واحد سب سے بڑی شے منشیات ہیں لیکن جو کچھ سنا جاتا ہے اور جن کے شواہد ہیں' نہایت کثیر دولت جسے کمایا نہیں گیا چند ہاتھوں میں مرکوز ہے' اگرچہ نظر نہیں آتی۔ حقیقت یہ ہے کہ افغانستان ایک ایسے تاریک ملک کی تصویر پیش کرتا ہے' جسے اس کے تمام مادی' اخلاقی اور انسانی وسائل سے محروم کر دیا گیا ہے۔ افغانستان کے مشرق اور جنوب میں آباد تقریباً سارے دانشور ملک چھوڑ کر باہر جا چکے ہیں۔ جلال آباد اور قندھار میں جو چند پڑھے لکھے لوگ ملے وہ غیر ملکی ایجنسیوں میں کام رہے تھے' ہاسٹل میں رہتے تھے

اور ہفتے کے ہفتے اپنے اپنے کنبوں سے ملنے کے لئے پشاور یا کوئٹہ جاتے رہتے تھے۔ وہ احباب اور خاندان جنہیں میں جانتا تھا یورپ یا شمالی امریکہ جا چکے تھے۔

پھر بھی یہی دو شہر ہیں جو مجاہدین کے درمیان ایک نامبارک جنگ کا شکار ہونے والے ہزاروں بے یار و مددگار لوگوں کی پناہ گاہیں ہیں۔ یہ لوگ کابل اور نواحی بستیوں سے نکل کر جلال آباد اور قندھار کے آس پاس دھوپ میں تپتے ہوئے بے رحم قطعات پر آباد ہو گئے ہیں۔ آپ ان کے بدحال کیمپوں کو جو پاکستان کو جانے والے راستے پر واقع ہیں' دیکھ سکتے ہیں۔ اپنی گاڑی کو چھوڑ دیجئے اب آپ بنجر تپتی ہوئی زمین پر کھڑے ہیں' سر پر دہکتا ہوا سورج ہے اور آپ کے اردگرد نہایت خوبصورت بچے۔ بجھے ہوئے چہرے بدلباس' فاقہ زدہ' اس کے باوجود ذہانت سے چمکتی ہوئی آنکھیں اور اپنی ذات کا وہ غرور جو انہیں ہاتھ پھیلانے نہیں دیتا۔ کچھ مرد بے تعلقی سے دور کھڑے ہوئے اس منظر کو دیکھ رہے ہیں اور مداخلت نہیں کرتے۔ لیکن عورتیں کہیں نظر نہیں آتیں ظاہر ہے وہ ان چھوٹے چھوٹے تھوروں میں بند ہوں گی' جنہیں بھس اور گندھی ہوئی مٹی سے بنایا گیا ہے۔ ''سلام علیکم''۔ یہ سننا تھا کہ بچوں کے چہرے دمک اٹھے۔ ایک لڑکا پوچھتا ہے۔ ''آپ کو پانی چاہیے؟''

ان کا یہ مثبت انداز ایک فیض رساں ماضی کی دین ہے۔ وہ اسلام جو اس طرح کا سخت گیر نہ تھا' جیسا کہ ہمارے زمانے کے مدعیان اسلام پیش کر رہے ہیں اور یقیناً اس میں ایسی نفع اندوزی اور صارفیت بھی نہ تھی' جواب ہے۔ تو پھر دیکھئے کہ ان بچوں کا مستقبل کیا ہو گا؟ جوان شدائد کے درمیان پروان چڑھ رہے ہیں' جو جدید تعلیم کے اثرات سے ''آلودہ'' نہیں ہوئے' جن کی زندگی میں نہ کھیل ہے نہ موسیقی۔ میرے ذہن میں وہ الفاظ گونج رہے ہیں' جو مسجد میں ایک بوڑھے نے طالبان کے متعلق کہے تھے۔ ''ان کی پرورش گھپ اندھیرے میں موت کے درمیان ہوئی ہے' وہ غضب ناک اور جاہل ہیں اور ہر اس چیز سے نفرت کرتے ہیں جو زندگی میں مسرت اور سکون لاتی ہے۔''

(''ڈان'' 23 جولائی 1993ء)

MashalBooks.org

افغانستان کی موجودہ صورت حال

افغانستان کی حکومت کی مذمت بجا طور پر کی گئی اور اس سے نقصانات کے ازالے کا مطالبہ کیا گیا' کیونکہ کابل میں پاکستان کے سفارت خانے پر حملہ اس کی شہ پر ہوا تھا۔ جس ہجوم نے سفارت خانے پر حملہ کیا۔ ایک پاکستانی کو ہلاک کر دیا اور کئی ایک کو زخمی کیا اور انہی میں سفیر قاضی ہمایوں بھی شامل تھے' اس کا یہ فعل نہ تو غیر متوقع تھا اور نہ بے ساختہ البتہ ہمارے قومی محافظ خطرے کے پیش نظر غفلت میں مبتلا رہے۔

جب طالبان نے ۳ ستمبر کو شندند کے فوجی ہوائی اڈے پر قبضہ کیا' تو کابل حکومت نے اس پر فوراً پاکستان کی شراکت کا الزام لگا دیا۔ دو دن بعد جب ہرات بھی طالبان کے تصرف میں چلا گیا تو کابل حکومت کے عائد کردہ الزامات میں انتقام کا اشارہ بھی ملتا تھا۔ ہمارے عہدیدار اس پر بھی بے پرواہ بیٹھے رہے۔ سفارت خانے پر حملے سے بیشتر پروفیسر برہان الدین ربانی کے افراد خاندان اور ان کے معاونین جو پشاور اور اسلام آباد میں رہتے تھے پاکستان سے جا چکے تھے۔ ہمارے حکام جن کی نظریں ہر طرف ہوتی ہیں ان کے یوں چلے جانے سے اس وقت تک لاعلم رہے یہاں تک کہ حکومت پاکستان نے ان کو اور افراد خاندان کو ملک بدر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگر ہماری حکومت' حکومتی کاروبار سے کوئی علاقہ رکھتی ہے تو قومی تحفظ سے متعلق خبروں سے لاعلمی اور کوتاہی کے بارے میں گہری چھان بین ضرور ہوگی اور ذمہ دار افراد کی نشاندہی کی جائے گی۔

پاکستانی سفارت کی اس خلاف ورزی پر جس غم و غصے کا بالعموم اظہار کیا گیا ہے وہ بالکل جائز ہے لیکن غم و غصے کا اظہار ہی قضیے کا بدل نہیں ہو سکتا۔ پھر اس امر کے پیش نظر کہ ہم نے افغانستان میں کتنی بھاری سرمایہ کاری کی ہے ہمارے اظہار افسوس سے ہی ہماری پالیسی کی ناکامی کی تلافی نہیں ہو جاتی۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ صدر برہان الدین ربانی اور ان کے وزیر دفاع احمد شاہ مسعود کے ساتھ ہمارے تعلقات میں کتنی بڑی تبدیلی آئی۔ ہم نے ۱۹۷۳ء میں افغانستان کا جو منصوبہ (Game Plan) تیار کیا اور اس پر عمل شروع ہوا' ان کے سب سے پرانے رنگروٹوں میں یہ دونوں افراد شامل تھے۔ اس کے منصوبہ ساز وزیراعظم زیڈ اے بھٹو اور ان کے مشیر برائے سرحدی امور جنرل نصیر اللہ خاں بابر شامل تھے۔ جو فرنٹیئر کور کے کمانڈر اور اس کے بعد صوبہ سرحد کے گورنر ہوئے اور اب پاکستان کے وزیر داخلہ ہیں۔ میں نے یہ کہانی ۱۹۸۵ء میں جنرل بابر کی زبانی سنی جو ایک دانشور کی تحقیق کے سلسلے میں اس کی اعانت کے معاملے میں خاصا غور کرتے آئے تھے۔ اس زمانے میں جنرل ضیاء الحق ایک کامیاب جہاد آغاز کرنے کا سہرا واجب طور پر

MashalBooks.org

اپنے سر لے رہے تھے۔ جنرل بابر کے انکشاف سے ضیاءالحق کے دعووں کی ہوا نکل گئی۔ اس کا مختصر بیان کچھ یوں ہے:۔

جب جنرل محمد داؤد خاں نے پختونستان تحریک شروع کروائی' تو مسٹر بھٹو اور ان کے معاونین نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہوئے افغانستان میں اسلامی شورش برپا کرنے کی ابتدا کی۔ اس وقت مخالف گروہ دو تھے' جن میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ کمیونسٹ تھے اور دا عیان اسلام تھے۔ ان سے رابطہ پیدا کیا گیا اور وہ خاصے شکرگزار دکھائی دیئے کہ انہیں ایک سرپرست مل گیا۔ وہ پاکستان آ گئے جہاں ان کے لئے تربیتی کیمپ کھولے گئے۔ جب وہ تیار ہو گئے تو ایک اسلامی شورش کا آغاز پنجشیر کی وادی میں کر دیا گیا' جو اب تک ربانی اور مسعود کا گڑھ ہے۔ مجاہدین نے جو چھاپے مارے وہ جنگی اعتبار سے بری طرح ناکام رہے۔ اس ناکامی کے باوجود جنرل داؤد کو اشارہ مل گیا چنانچہ انہوں نے پاکستان کے ساتھ مفاہمانہ رویے کا اظہار کیا۔ اس کے بعد شاہ ایران نے اپنی سرپرستی میں نہایت محتاط انداز سے ہمارے درمیان تعلقات بہتر بنانے کی ابتدا کی۔

باغی عناصر ہمارے یہاں بنام معاونین (Proxies) کے طور پر یہیں مقیم رہے۔ پاکستان سودے بازی کے لئے انہیں استعمال کر سکتا تھا۔ اسلام آباد کی پناہ میں آنے والے باغیوں میں گلبدین حکمت یار اور عبدالرؤف سیاف تھے' جنہوں نے بعد ازاں وہابیت اختیار کر کے اپنا نام عبدالرب رکھ لیا۔ معاملات یہاں تک پہنچے تھے کہ ضیاءالحق نے مسٹر بھٹو کے سیاسی بحران کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک سپاہی کا عہد توڑ دیا۔ آئین کی خلاف ورزی کی اور فوجی بغاوت کی۔ جب ۱۹۷۸ء میں ثور انقلاب ہوا تو امریکہ کی سی آئی اے نے فطری طور پر' اطلاعات حاصل کرنے اور اسلامی انقلابیوں سے بغاوت حاصل کرنے کے لئے جس پہلے شخص سے رابطہ پیدا کیا' وہ جنرل نصیراللہ بابر تھے' جنہوں نے ممکن حد تک ان کی مدد کی۔ ڈکٹیٹر ضیاء نے اور دیگر مواقع کی طرح یہاں بھی مسٹر بھٹو کی چھوڑی ہوئی پالیسی پکڑ لی اور اسے منطقی انتہا تک پہنچا دیا۔

برسبیل تذکرہ میں بتاتا چلوں کہ مسٹر سیاف' کابل حکومت میں شامل واحد پختون مجاہد لیڈر ہیں لیکن معاہدے افغانستان میں بھی راتوں رات بدل جاتے ہیں۔ وقتی فائدے کے لئے پارٹیاں اور عقیدے بدلنا (انگریزی محاورے میں ہارس ٹریڈنگ اور ڈاگ ایٹنگ) صرف پاکستانیوں کا اجارہ نہیں۔ لہٰذا آئندہ دنوں میں اگر عبدالرب سیاف وفاداریاں تبدیل کر دیں تو آپ کو حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ ہوگا کہ افغانستان میں بڑھتا ہوا نسلی افتراق شدید تر ہو گیا ہے۔

یہ کہانی اپنے اندر جو سبق رکھتی ہے' انہی کی بنا پر میں نے اسے بیان کیا ہے۔ ایک سبق تو یہ ہے کہ پالیسی کے جمع وخرچ کا حساب متعلقہ ملکوں اور قوموں کے تخمینوں کی بنیاد پر کرنا چاہیے۔ نہ کہ افراد اور گروہوں کی وفاداریوں پر۔ کیونکہ افراد اور گروہ اپنی وفاداریاں تبدیل کر سکتے ہیں اور کرتے بھی ہیں۔ اس

طرح وہی افراد اور پارٹیاں جن کی مماثلت ہم نے پچیس سال تک کی اب ہمارے مخالف ہو گئے ہیں اور شکایت کرتے ہیں کہ ہم ان کے بدترین دشمن بن گئے ہیں۔ پاکستانی ذرائع ابلاغ اور سرکاری بیانات میں ربانی اور مسعود کو موقع پرست بتایا جاتا ہے جو احسان فراموش ہو گئے ہیں اور پاکستان کے مخالف اور ہندوستان کے طرف دار ہو گئے ہیں۔ یہ نتیجہ نکالنا بھی گمراہ کن ہے کیونکہ اس سے ایک معقول پالیسی مرتب کرنے میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے۔

تعلقات میں یہ تلخی بتدریج پیدا ہوتی آئی ہے۔ افغانستان کے امور سے واقف کئی افراد نے پہلے ہی نتائج کے بارے میں متنبہ کر دیا تھا۔ چند ہفتے قبل میں نے انہی اوراق میں یاد دلایا تھا کہ مذکورہ تنبیہوں کے جواب میں ہمارے اعلیٰ ترین حکام کا وضاحتی ردعمل کیا تھا' لیکن اپنی پسند کے افراد کو پالنے کی پالیسی بدستور چلتی رہی۔ آج طالبان' حکمت یار اور دوستم پر انحصار ہے گویا ان جنگی سرداروں کی مجموعی طاقت کے ساتھ ہمارے معاہدے ہی ایک قابل عمل پالیسی ہو گی۔ ابھی حال ہی میں ایک نہایت پرانے فوجی نے جو سوچ بچار کرتا رہتا ہے اپنے اس اندیشے کا اظہار کھل کر کیا۔ "اگر عبدالرشید دوستم ساتھ چھوڑ گئے تو ہماری افغان حکمت عملی کا کیا بنے گا۔؟" ان کا اندیشہ درست تھا' طالبان حکمت یار بنیاد جس پر ہم ڈانواڈول طریقے سے ٹکے ہوئے ہیں اس وقت ڈھے جائے گی جب ہمارے سابق کمیونسٹ جنگجو سردار اپنا موقف بدل دیں گے اور وہ ایسا کر سکتے ہیں' افغانستان کے معاملے میں ازبکستان کے داخلے کے باوجود اس تنازعے میں اور بھی پیچیدگی پیدا کر رہا ہے۔

پاکستان کے پالیسی سازوں کی پرانی عادت ہے کہ پالیسی کی بجائے ہیرا پھیری اور تدبر کی جگہ چالبازی سے کام لینا چاہتے ہیں وہ فوری فوائد پر نظر رکھتے ہیں اور کسی پالیسی کے دوررس نتائج شمار نہیں کرتے۔ یہ رجحان اندرون ملک پالیسی کی توسیع ہے جس کے تحت ملک اور ریاست پر مرتب ہونے والے دیرپا اثرات سے صرف نظر کرتے ہوئے افراد اور گروہوں کا تعاون خریدا جاتا ہے یہی وجہ تھی کہ ایک چھوٹی سی وقتی ضرورت کے تحت انجمن سپاہ صحابہ کے لیڈر مسٹر اعظم طارق کو جو نفرت کا زہر پھیلاتے آئے ہیں' حاکم کے ایک اشارہ ابرو کی بدولت جیل سے نکال کر پارلیمنٹ میں پہنچا دیا گیا۔ قانون کی عملداری کو خطرے میں مبتلا اقلیتوں کو اور معاشرے میں امن و عافیت کو اس کی کیا قیمت ادا کرنی پڑی' اس کی پروا نہ کیجئے۔ پھر کیا اسے محض سوئے اتفاق کہا جائے گا؟ کہ دو ہفتے بعد ایک چودہ سالہ لڑکی اور اس کے اسکول کی پرنسپل کو توہین رسالت کے قانون کے تحت ہراساں کیا جا رہا ہے؟ گھٹیا موقع پرستی کا یہی ذہنی رویہ ہماری خارجہ پالیسیوں میں بھی نظر آتا ہے۔

مثال کے طور پر ہمارے موجودہ سیاسی اقدامات کو لیجئے' نقصان کے باوجود اور وہ ہے طالبان کی حمایت ہماری یہی مدد لے کر وہ قندھار پر قابض ہوئے جس کے بعد انہوں نے فوراً موسیقی اور کھیلوں کو غیر

MashalBooks.org

اسلامی قرار دیتے ہوئے ان پر پابندی لگا دی۔ ہم تو بس شطرنج کی بساط پر اپنا ایک مہرہ بڑھانا چاہتے تھے۔ لیکن افغانستان میں ہماری حیثیت وہی ہے جو امریکہ کی پاکستان میں ہے۔ جس کے تحت ہمارا چھوٹے سے چھوٹا کوئی عمل زبردست اہمیت اختیار کر لیتا ہے چنانچہ یہی کابل میں ہوا اور تہران میں' تاجکستان اور روس میں بھی' یعنی وہ ممالک جو پاکستان کی پالیسی کو تشویش کی نظروں سے دیکھتے ہیں' جو ان کے خیال میں افغان ریاست پر تنہا پشتونوں کے قبضہ پر اور ریاست پر اپنی بالا دستی چاہتا ہے۔ اس مہینے میں طالبان کی ڈرامائی کامیابیوں نے جس میں ہرات کا قبضہ بھی شامل ہے جو ایران کی سرحد پر واقع فارسی بولنے والوں کا علاقہ ہے ایران اور تاجکستان کی تشویش میں اضافہ کر دیا ہے اور اب روس کی دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ دوستم کے ہماری طرف آنے سے مسائل میں اضافہ ہی ہوا ہے' جب تک ہم اپنی پالیسی میں ترمیم نہیں کریں گے اور پاکستانی کے وزیر خارجہ کے دورہ تہران کو اس جانب ایک قدم سمجھنا چاہیے' اس وقت تک ہم شمال اور مغرب میں اپنے لئے صرف دشمن ہی پیدا کریں گے۔

ایک نہایت اعلیٰ افسر جو ازبک ڈکیٹر اسلام کریموف کے دوست ہیں یہ کہتے ہیں۔ ازبکستان کو ہم سے کبھی غلط فہمی نہیں ہوگی اور وہ ہماری پالیسی کی ہمیشہ حمایت کرے گا۔ ازبک جنگجو عبدالرشید دوستم نے حال ہی میں طالبان سے جو تعاون کیا ہے' تہران اور دوشنبہ میں اسے پاکستان اور ازبکستان کے درمیان مفاہمت سمجھا جا رہا ہے۔ تاجکستان کے تاجک' افغانستان میں تقریباً چالیس لاکھ تاجک باشندوں کے ساتھ یگانگت کا رشتہ رکھتے ہیں۔ ازبک سے ان کی خفگی اور اندیشے تاریخی نوعیت کے ہیں' اس لئے ربانی کی جمعیت' تاجکستان کی مدد پر صرف اس وقت تک انحصار کر سکتی ہے' جب دوستم کو ازبکستان کی مدد حاصل رہے۔ اس طرح کے معاہدوں کی فوجی اہمیت بہت کم ہوتی ہے۔ ایسے معاہدوں سے افغانستان میں پھیلتی ہوئی خانہ جنگی' پہلے سے زیادہ علاقائی کشیدگی اور پاکستان کی سماجی اور سیاسی زندگی میں مزید تخریب کے اندیشوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔

سیاسی زندگی جتنی مسخ یہاں نظر آتی ہے کہیں اور نہیں ہوگی۔ منشیات' اسلحہ' فرقہ واریت' تشدد اور جرائم' ہم کو ہر روز ان کا تجربہ ہوتا ہے۔ خرابیاں اس سے بدتر بھی ہو سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر طالبان کی کامیابیاں اس ملک کو مزید نقصان پہنچائیں گی۔ پاکستانی مدارس کی پروردہ یہ نوجوان نسلیں یہاں اپنا رابطہ رکھتی ہیں اور ہر طرف پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کی پاکستانی حلیف حرکت الانصار وجود میں آ چکی ہے اور پھل رہی ہے۔ طالبان کی طرح یہ بھی نہایت شدید شیعہ دشمن ہیں اور ان کا اسلامی منصوبہ ایسا ہے کہ نبی پاک ﷺ خود بھی اس کو یقیناً خلاف اسلام قرار دیتے۔ یہ کرایے کی لڑائی اور ہیرا پھیری کی سیاست ہمیشہ اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔ اگر اس طرح چلتے رہے تو امن قائم نہیں ہوگا اور افغانستان میں ہماری کوئی جگہ نہیں ہوگی' بلکہ اس یقین کے ساتھ جس طرح دن کے بعد رات آتی ہے' ناکامی ہمارا مقدر ہوگی اور ہم ہاریں گے نہ صرف اپنے آپ کو

MashalBooks.org

بلکہ اس سے بھی زیادہ پاکستان میں جو کچھ رہ گیا ہے اسے بھی یعنی شائستگی اور تہذیب۔

MashalBooks.org

سراب کے بعد

مسٹر اعظم طارق پاکستان میں نہایت متشدد فرقہ پرست جماعت سپاہ صحابہ کے لیڈر ہیں۔ طالبان کے ایک مجلّے میں ان کا ایک خط شائع ہوا ہے' جس میں وہ اپنے نظریاتی بھائیوں کی حالیہ کامیابیوں سے وجد کے عالم میں نظر آتے ہیں۔ ان کی اس سرشاری میں پاکستان کی قومی سلامتی سے وابستہ منتظمین بھی شریک ہیں۔ لیکن ان کے اسباب غیر نظریاتی ہیں۔ پاکستان کی افغان پالیسی کا منتہائے مقصود جنرل ضیاءالحق کے زمانے سے بھی حکمت عملی پر مبنی وسیع علاقے (Strategic depth) پر رہا ہے۔ یعنی جنگ کے دنوں میں پسپا ہوتی ہوئی فوج کے لئے اس وسیع علاقے کی موجودگی جہاں وہ پناہ لے سکے اور دشمن کا مقابلہ کرے۔

طالبان نے حالیہ برسوں میں اپنی مطلب براری کے لئے گلبدین حکمت یار کو آلہ کار کے طور پر چھوڑ دیا ہے۔ ان کی تازہ کامیابیوں' خاص طور پر مزار شریف پر قبضے نے' گو یہ شہر شمالی افغانستان کا اعصابی مرکز ہے' پاکستان کو اپنے مقصد سے بہت قریب کر دیا ہے۔ یعنی اگر اسٹریٹجک ڈیپتھ جیسی کوئی چیز جو بعض فوجوں کے ذہنوں میں پائی جاتی ہے' حقیقی دنیا میں کوئی وجود رکھتی ہے تو اس کا کوئی وجود نہیں۔ فوج کی دانش میں یہ تصور ہی سرے سے ناپید ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس سے آپ کی مراد ایک ایسی جگہ کی موجودگی ہے جہاں ایک شکست خوردہ فوج پناہ لے سکے۔ طالبان کی کامیابی سے حالت بہتر تو کیا ہوتی' اس سے پاکستان کی سیاسی اور علاقائی نوعیت کی مصیبت میں اضافے کا اندیشہ بڑھ گیا ہے' اس کے کئی اسباب ہیں اور نہایت محکم اور یقینی ہیں' مثال کے طور پر درج ذیل امکان پر نظر ڈالیے۔

قومی تحفظ کی ایک بنیادی ضرورت یہ ہے کہ ہمسایوں کے ساتھ متعلقہ ملک کے اچھے تعلقات ہوں۔ اگر کوئی ملک اتنا بدنصیب ہے کہ ہمسایہ اس کا مخالف ہے تو اس کی سلامتی کے بہترین اندازے اس طرح پورے ہو سکتے ہیں کہ آس پاس کے دوسرے ہمسایوں سے بہترین تعلقات رکھے۔ پاکستان کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ ہندوستان کے ساتھ ایک معاندانہ رشتے کے نتیجے میں پیدا ہوا' ہندوستان جو ایک بڑی آبادی کا ملک اور وسائل سے مالا مال ہے۔ اس دشمنی میں کمی کے آثار نظر نہیں آتے اور اب کہ ایٹمی اسلحہ کی دوڑ شروع ہو گئی ہے اور درپردہ جنگ بھی جاری ہے۔ دشمنی میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ صوبوں میں اور لسانی نسلی آبادیوں میں جو بے چینی پیدا ہوئی ہے' ان سے پاکستان کے خلاف ایک ڈھکی چھپی جنگ کا اندیشہ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ ایسے نازک دور میں ملک کو اس علاقے میں دوستوں کی ضرورت ہے۔ علاقائی صورت حالات پرانی دوستیوں کو

MashalBooks.org

مستحکم کرنے اور نئے دوست بنانے کے لئے سازگار ہیں' اس کی بجائے' اسلام آباد حقیقی دوستوں کو اور انہیں جو اچھے دوست ہو سکتے ہیں' اپنے آپ سے دور کر رہا ہے۔

ابھی حالیہ دنوں تک پاکستان کے ایران اور چین کے ساتھ ہمیشہ اچھے تعلقات تھے۔ پچھلے سال کی دہائی میں وسط ایشیا کے اندر نئی ریاستیں پیدا ہوئیں' جس سے پاکستان کے لئے قومی' تجارتی رفیق اور شریک اور معاون پیدا ہوئے اور ان کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ سرد جنگ کے خاتمے کے ساتھ روس سے عناد بھی جاتا رہا اور دوستانہ علاقائی رابطوں کا یقینی امکان پیدا ہوا۔ افغانستان تو طویل مدت سے دردسر بنا ہوا تھا' لیکن وہ ضرر دشمن تھا' جس کے شمال مغربی سرحدی صوبے پر کچھ علاقائی دعوے تھے' جو زیادہ تر پشتو بولنے والوں کا صوبہ ہے۔

افغانستان میں روس کی مداخلت اور کمیونسٹ دشمن مجاہدین کے لئے پاکستان کی حمایت سے کابل کے ساتھ اسلام آباد کے معاندانہ تعلقات ختم ہو گئے اور پورے افغانستان پر اس کا اثر ورسوخ پھیل گیا۔ یہ ایک فائدہ مند بات تھی' لیکن اس فائدے کو پاکستان نے اپنے لئے نقصان دہ بنا لیا۔ پاکستان کی افغان پالیسی' یعنی سراب کی جستجو نے جس کا نام اسٹریٹجک ڈیپتھ رکھا گیا ہے' اس ملک کو اپنے پرانے معتمد حلیفوں سے دور کر دیا اور نئے دوستوں پر اپنے دروازے بند کر دیئے۔ اس کی قومی سلامتی کے منتظمین نے دراصل تاریخی اہمیت کے مواقع ضائع کر دیئے اور پاکستان کی سلامتی کے لئے بہت سے مسائل پیدا کر دیئے۔

اسلام آباد طالبان کو مدد دے رہا ہے اور تہران اس کے اعلانیہ خلاف ہے۔ ایران کے سابق صدر ہاشمی رفسنجانی نے جو ایک منصف مزاج شخص ہیں' گزشتہ ہفتے اپنے جمعہ کے خطبے میں کہا تھا: ''پاکستان کے ساتھ ہمارا ایک معاہدہ تھا کہ افغانستان کا مسئلہ جنگ کے ذریعے حل نہیں کیا جائے گا۔ اب کچھ اور ہو رہا ہے اور ہم یہ منظور نہیں کریں گے۔'' اس بیان کے بعد سینکڑوں ایرانیوں نے تہران میں پاکستانی سفارت خانے کے سامنے زمانہ وسطی کے جنونی طالبان کے خلاف مظاہرہ کیا' جنہوں نے گیارہ ایرانی سفارت کاروں کو یرغمال بنا لیا تھا اور بامیان کے شہری علاقے پر' جہاں کی بیشتر آبادی شیعہ ہے' بے رحمی کے ساتھ بمباری کی۔ ایران کے وزیر خارجہ کمال خرازی نے مزار شریف پر طالبان کے قبضے کو ''علاقے کے لئے خطرہ'' قرار دیا۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں اس کی تائید کے لئے ایک قرارداد پیش کی گئی' روس نے اس سلسلے میں ایک انتباہ جاری کیا۔ ازبکستان اور تاجکستان نے اس صورت حال سے نبٹنے کے لئے طالبان کی پیش قدمی کے آگے اپنے دفاعی مورچے مضبوط کرنے شروع کئے۔

پاکستان کے دفتر خارجہ نے اس کا جواب یہ دیا تھا کہ ایک اعلان نامہ اپنی بے گناہی اور افغانستان میں اپنی غیر جانب داری کا جاری کیا' جس میں سخت زبان استعمال کی گئی تھی۔ نیویارک کے یو این ہیڈکوارٹر میں کسی ایک سفارت کار نے بھی اس دعویٰ پر یقین نہیں کیا۔ اگر دنیا بھر میں کسی ملک کی ساکھ بگڑ جائے تو یہ

خارجہ پالیسی کا کوئی کارنامہ تو نہ ہوا۔ اس کے علاوہ تردیدی بیان پالیسی کا بدل نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایران پاکستان کا ہمسایہ اور روایتی طور پر ایک دوست ملک رہا ہے' لیکن اب پاکستان نے جو طالبان کو آگے بڑھایا اور اس کی سرپرستی کی ہے' تو اس لئے ایران مایوس ہو کر کنارہ کش ہو گیا ہے۔ روس ایک بڑی طاقت ہے' وہ بھی احتجاج کر رہا ہے۔ ازبکستان' تاجکستان اور کرغیز کی آزاد ریاستوں نے جو کبھی امداد اور رہنمائی کے لئے پاکستان کی طرف دیکھتی تھیں اب اندیشے میں مبتلا رہتی ہیں۔ پاکستان اخلاقی اور سیاسی لحاظ سے یک و تنہا رہ گیا ہے' یہ وہ صورت حال ہے جس میں وہ طالبان کا شریک ہے اور طالبان دنیا کے سامنے اسلام کا نہایت مسخ شدہ اور ناگوار چہرہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ابھی یہ ممکن نہیں کہ اس سیاسی علیحدگی کے نتائج کو صراحت کے ساتھ بیان کیا جا سکے' لیکن پاکستان کو گزشتہ پانچ عشروں سے جس عدم تحفظ کا احساس پریشان کر رہا ہے اور جو اس کے مصائب و آلام کا سبب بنا ہوا ہے' موجودہ صورت میں تو اس میں مزید اضافہ ہوگا۔

1980ء میں جب محمد ضیاء الحق نے بڑے فخر کے ساتھ پاکستان کو سرد جنگ کے زمانے میں (فرنٹ لائن اسٹیٹ) بنا کر پیش کیا تھا' تب ہی سے اس کی افغان پالیسی کی لائی ہوئی مصیبت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس پالیسی کی قیمت ابھی سے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے۔ یہ اسلحہ' ہیروئن اور دندناتے ہوئے مسلح متعصب گروپ' سب اس پالیسی کا حاصل ہیں اور ان میں مختلف انداز سے اضافہ ہوگا۔ طالبان نے جو غیر یقینی فتوحات حاصل کی ہیں' انہیں باقی رکھنے کے لئے اسلام آباد طالبان کی ضرور مدد کرے گا۔ اب اس میں کامیابی ہوتی ہے یا نہیں ہوتی' لیکن یہ بہت مہنگی ذمہ داری ہوگی۔ اتنی مہنگی کہ ہم اس کا بوجھ برداشت کرنے کے لئے اس وقت بھی بمشکل تیار نہیں۔ طالبان کی فتوحات نے ان کے مخالفوں کو پوری طرح ختم نہیں کیا۔ وہ اپنی جگہ موجود ہیں اور ان کی سرپرستی کرنے والے بھی حاضر ہیں لہٰذا امکان یہ ہے کہ ایک طویل جنگ ہوگی (ایسی جنگ جس میں اصل قوتیں پس پردہ ہوتی ہیں' اور ان کے پٹھو لڑتے ہیں) طالبان کو برسراقتدار رکھنے کے لئے کئی بلین خرچ ہوں گے' وہ بھی یہ فرض کرتے ہوئے کہ ہم ایران اور روس یا ان دونوں ملکوں کے ساتھ کسی بڑی جنگ میں شامل نہیں ہوں گے۔

افغانستان کی تعمیر نو کے لئے ایک محتاط اندازے کے مطابق چالیس بلین ڈالر کی ضرورت ہوگی۔ اتنی بھاری رقم کا بندوبست تو ہم خود اپنے لئے نہیں کر سکتے تو پھر طالبان کو کون مدد دے گا کہ ان کا کاروبار چلتا رہے۔ اسلام آباد میں سیاسی حکمت عملی کا خواب دیکھنے والوں کو اس حالت میں ڈالر سے لدے پھندے شہزادے' امارات کے شیوخ' امریکی تیل کے قارون' صنعت کار' تاجر ترکمانستان سے کراچی تک مختلف ملکوں سے گزرتی ہوئی مہیب پائپ لائن بچھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ جھوٹے اور مہلک خواب دیکھنے والے اور دکھانے والے ہیں' جیسے 1965ء میں آپریشن جبرالٹر کی حمایت میں مدد دینے والے یا امریکہ کا دیوہیکل ساتواں جنگی بیڑا جو مشرقی پاکستان کی مدد کو پہنچ رہا تھا' یہاں تک کہ بنگلہ دیش بن گیا۔

MashalBooks.org

پاکستان کو ایک بار پھر خوش فہمیوں کے ریشمی جال میں کسا جا رہا ہے اور ایک بار پھر فیصلہ کرنے والے تو نہیں' لیکن عوام اس کی بھاری قیمت ادا کریں گے۔ کسی بڑی طاقت کو جو وسائل درکار ہیں' پاکستان ان وسائل کے بغیر ہی اس کھیل میں شامل ہو گیا ہے۔ ایٹمی بھی اور غیر ایٹمی بھی ۔ یہ بوجھ اٹھانا تو بڑی طاقتوں کے لئے بھی مشکل ہو رہا ہے۔ پس اللہ ہماری مدد کرے۔

طالبان کے ساتھ پاکستان کی قربت اندرون ملک بھی بہت مہنگی بلکہ تباہ کن ہے۔ صحیح ہو یا غلط' بن لادن کے معاملے میں ہمارا ملوث ہونا بھی اس سلسلے میں غور طلب ہے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ طالبان اسلام کی تاریخ میں انتہائی رجعت پرست سیاسی تحریک ہیں۔ ایسے جنگی سردار جو موسیقی اور کھیلوں پر بھی پابندی لگا دیں' داڑھی کے بال ترشوانے پر سخت سزائیں دیں۔ زنانہ سواریوں کو ٹیکسی میں لے جانے پر ٹیکسی ڈرائیور کو کوڑے ماریں' بیمار عورتوں کو مرد معالج سے علاج کرانے سے روک دیں اور لڑکیوں کو اسکول اور عورتوں کو کام پر جانے کی ممانعت کر دیں' وہ افغانستان کو اپنے روایتی اسلامی طرز زندگی کی جانب واپس آنے سے روک رہے ہیں اور یہ وہ باتیں ہیں جن کی خبریں مغرب کے ذرائع ابلاغ برابر نشر کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ اخلاقیات' جمالیات' انسان دوستی اور روایتی مسلمانوں کے صوفیانہ احساسات اور خود ماضی کے افغانیوں کی روایات سے نابلد ہیں۔ ان کو ''زمانہ وسطیٰ کے لوگ'' قرار دینا' جیسا کہ تہران میں احتجاجی مظاہرین نے کہا تھا' حافظ اور سعدی' رابعہ بصری اور منصور حلاج' امیر خسرو اور حضرت نظام الدین کے زمانے کی سخت توہین ہے۔ طالبان ایک نئی بیماری کی علامت ہیں' ایک سماجی سرطان کی طرح ہیں' جس کے ابھار کو اگر نہیں روکا گیا تو سبھی اسلامی معاشرے تباہ ہو جائیں گے۔ یہ بیماری پھیل رہی ہے اور یہ سرطان پاکستان کے جسم کے ساتھ اگر اس طرح لگا رہا تو طالبان اسے مہلک طور سے آگے پھیلائیں گے۔ افغانستان کے ہم عقیدہ لوگوں کے لئے سپاہ صحابہ کے لیڈروں کا تہنیتی پیغام اس بڑھتے ہوئے خطرے کی ایک علامت ہے۔

اسلام آباد میں پالیسی سازوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ طالبان کی حکومت میں افغانستان' پاکستان کا مستقل دوست ہوگا۔ اسٹریٹجک ڈیپتھ کا خیال اس مفروضے پر قائم ہے۔ یہ بھی محض خوش فہمی ہے۔ امکان اس بات کا ہے کہ اگر وہ برسر اقتدار رہے تو وہ پلٹ کر پاکستان کی طرف آئیں گے اور اپنی مخصوص ''اسلامیت'' کو پختونستان کی نئی تحریک کے ساتھ جوڑ دیں گے۔ میں ان میں سے چند ایک سے مل چکا ہوں اور دیکھ لیا ہے کہ ان کی اسلامی کھال کے نیچے قومیت پرستی کا خون موجیں مار رہا ہے۔ یہ فرض کر لینا احمقانہ بات ہوگی کہ پاکستان کی احسان مندی کی وجہ سے وہ اپنے عزائم پورے کرنے سے باز رہیں گے۔ پرانی وفاداریاں' نئی ترغیبات کے راستے میں کم ہی رکاوٹ بنتی ہیں' پھر یہ بھی کہ جب مقامی دشمنوں کا خطرہ کم ہوگا تو حکومت پاکستان کے خلاف ان کا غصہ بڑی شدت کے ساتھ بڑھ جائے گا' کیونکہ پاکستان اس وقت ان کی امیدوں کے مطابق مدد دینے کے قابل نہیں رہے گا۔ نسلی قوم پرستی اور مذہب کا دو آتشہ لوگوں کو یقیناً

حرکت میں لائے گا۔ اسلام آباد نادانستہ طور پر سال کے آئندہ عشرے میں ایک مضبوط پختونستان تحریک کی تجدید کے لئے اسٹیج تیار کر رہا ہے۔

افغانستان میں طالبان کے تسلط سے جو نقصانات ہو سکتے ہیں ان کو روکنے کے لئے ابھی کچھ وقت شائد باقی رہ گیا ہے۔ ہماری دلچسپی اس بات میں ہے کہ وہاں عام طور پر امن قائم ہو' جو افغانستان کے ہمسایہ ملکوں کے لئے بھی اس قدر پسندیدہ ہو' جتنا ہمارے لئے۔ ہمارے مستقبل کا تقاضا یہ ہے کہ افغانستان میں ملی جلی حکومت ہو' جس میں تمام گروہ شریک ہوں' کیونکہ صرف اسی طرح نسلی بنیادوں پر علاقوں کے حصول کی خواہش اور اسی کے لئے کوشش' تسکین پا سکتی ہے۔ اگر ہمیں اپنے ہمسایے میں ایک مذہبی حکومت کے ساتھ ہی جینا ہے تو اچھا ہو گا کہ ہم ایک روشن خیال حکومت کے ساتھ رہیں' نہ کہ ایک وحشیانہ حکومت کے ساتھ۔ اس کے علاوہ افغانستان کو زندہ رہنا ہے تو وہاں ایک ایسی حکومت کی ضرورت ہے' جسے بین الاقوامی امداد ملتی رہے۔ طالبان کو تو نہیں ملے گی۔ اس بات کا امکان نہیں ہے کہ اسلام آباد میں افغان پالیسی بنانے والے ان دلائل پر کوئی توجہ دیں گے۔ پاکستان میں اختلافی نقطہ نظر کو ہمیشہ نظر انداز کیا گیا ہے اور اس کے نتائج المناک ثابت ہوئے ہیں۔ عقل سے کام لیتے ہوئے ایوب خاں نے کچھ پس وپیش کیا تھا' لیکن پھر 1965ء میں دانش مندی کے مشوروں کو نظر انداز کر دیا۔ یحیٰی خاں اور ذوالفقار علی بھٹو کو 1971ء میں آنے والی تباہی سے متنبہ کیا گیا تھا' لیکن انہوں نے اسے سازش قرار دیا اور آدھا ملک گنوا بیٹھے۔ ابتدا میں مسٹر زیڈ اے بھٹو کی ناکامیوں پر جو دوستانہ تنقید کی گئی تھی' اسے انہوں نے رد کر دیا' جس مجلّے میں تنقید شائع ہوئی تھی اسے بند کر دیا اور اس وقت تک حکومت کرتے رہے تا آنکہ ایک غاصب نے جو انہی کا منتخب کیا ہوا تھا' حکومت کا تختہ الٹ دیا اور انہیں پھانسی دے دی۔ اپنی بھیانک غلطیوں کا خمیازہ انہیں ذاتی طور پر بھگتنا پڑا۔ کیونکہ دوسروں کی غلطیوں کی قیمت ملک اور ملک کے عوام ہی ادا کرتے ہیں۔ لیکن بالکل سامنے کی باتیں بھی انہیں نظر نہیں آتیں اور کان سننے سے معذور ہوتے ہیں۔ پھر حیرت نہ ہو گی اگر وہ "اسٹریٹجک ڈیپتھ" کے بارے میں سوچتے ہیں۔

("ڈان" 23 اگست 1998ء)

خانہ جنگی

MashalBooks.org

عورتوں سے جنگ آزمائی

یہ بیماری تو دنیا بھر میں ہے۔ دنیا کا کوئی ملک اس سے محفوظ نہیں لیکن پاکستان میں عورتوں پر تشدد کی وبا مستقل ہے اور بظاہر اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان پر ہونے والے مظالم کا بہت تھوڑا سا حصہ اخبارات میں راہ پاتا ہے۔

میرے پاس ۲۱ فروری کا روزنامہ ڈان ہے اس کے صفحہ سات پر یہ خبر شائع ہوئی ہے۔ سکھر میں تین عورتوں کو جن کے نام خبر میں درج نہیں قتل کر دیا گیا۔ دس سالہ بی بی مہناز کو جمعہ کے دن اغوا کیا گیا' اس کی بے حرمتی کی گئی اور قتل کرنے کے بعد جنگل میں پھینک دیا گیا۔ حاکم زادی کو اس کے دیوروں' شمو اور چھیر نے قتل کرایا۔ کہاں قتل کیا گیا' یہ نہیں بتایا گیا۔ فہمیدہ کو روہڑی میں ارشاد منگی نے قتل کیا۔ راولپنڈی میں ثمینہ مشتاق کو اس کے شوہر خالد ندیم نے سرکلر روڈ پر گولی مار دی۔ وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گئی۔ یہ تو محض ایک جھلکی ہے' اس ماحول کی جو عورتوں کی مظلومیت کے واقعات سے بھرا ہوا ہے۔ عورتوں کے خلاف مختلف نوعیت کے جرائم کرنے والے افراد بڑی حد تک سزا پائے بغیر بچ نکلتے ہیں۔ ان میں غریب کسان اور معمولی پولیس مین سے لے کر قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے معزز ارکان تک سبھی شامل ہیں۔ اکثر اوقات مظلومیت کی شکار عورت کو ہی سزا دی جاتی ہے اور اس پر سماجی بندشیں لگائی جاتی ہیں۔ ایک بیوی مار پیٹ کے بعد جب اپنے والدین کے گھر بھاگ کر پہنچتی ہے تو اس سے بالعموم یہ کہا جاتا ہے کہ اپنے شوہر کے پاس واپس جائے۔ بہر حال ایک نیک چلن بیوی سے یہ امید کی جاتی ہے کہ جسمانی سختیوں کو' مار پیٹ کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرے۔ کوئی بات اس امید کے برعکس بھی ہو سکتی ہے' اس کی تائید نہ مروجہ رواج سے ہوتی ہے اور نہ کسی معاشی صورت حال سے۔ مار پیٹ سے جان بھی چلی جاتی ہے۔ پاکستان میں حقوق انسانی کے کمیشن کی سالانہ رپورٹ برائے ۱۹۹۳ء میں درج ہے کہ گھریلو تشدد کے جو واقعات اس سال کے دوران میں درج کئے گئے وہ چار سو تھے جن میں سے نصف تعداد ہلاک ہو جانے والی بیویوں کی تھی۔ دیہات میں جو عورتیں ایسے ظالمانہ رشتے میں بندھی ہوئی ہیں ان کے لئے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ اور بڑے شہروں میں بھی بچاؤ کا موقع کم ہی نکلتا ہے جہاں ایدھی ٹرسٹ اور کراچی میں اپنا گھر جیسے ادارے موجود ہیں' جو ستم رسیدہ عورتوں کو پناہ دیتے ہیں' ہمارے شہروں میں ایسی سہولتیں نہایت کم یاب ہیں۔ چند شہروں میں حکومت نے ایسی پناہ گاہیں کھولی ہیں' جنہیں دارالامان کا پرشکوہ نام دیا گیا ہے۔ یہ جگہیں حقوق انسانی کی سالانہ رپورٹ کے مطابق ''اکثر اوقات عورت کو قانون کی جانب سے قید میں رکھنے کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔ ایک ایسے ہی

MashalBooks.org

مرکز میں جہاں 45 عورتیں موجود تھیں' ایک موقع پر سترہ عورتوں کی رہائش کی درخواست ہائی کورٹ میں داخل کی گئی۔ سات عورتوں کو رہا کر دیا گیا اور باقی عورتوں سے کہا گیا کہ مجسٹریٹوں کو درخواست دیں۔"

جنوبی امریکہ میں غلامی کے موضوع پر ادبی تخلیقات زمانہ قدیم سے موجود ہیں ان سے ظاہر ہے کہ ابتلا کے جال میں پھنسے ہوئے ستم زدہ لوگ واہموں کی دنیا میں سکون پاتے ہیں' یا پھر کبھی کبھار بغاوت کر بیٹھتے ہیں۔ پاکستان میں پچھلی نصف صدی کے دوران جو گھڑی میں گذری' مگر کوئی تاریخی یا سماجیاتی تحقیق اس سلسلے میں نہیں ہوئی۔ ستم رسیدہ عورتوں کے رویے کیا ہوتے ہیں؟ اس سلسلے میں ہمیں بہت کم معلوم ہے۔ اگر کچھ پتہ چلتا ہے تو وہ ایک ہولناک حقیقت کی محض جھلکیاں ہوتی ہیں' وہی حقیقتیں جو ہمارے معاشرے کے مقدس نہاں خانوں میں یا ہمارے شعور میں پوشیدہ ہیں۔

کوئی 10 برس پہلے اکبر بلوچ نے ان عورتوں کا احوال ایک سفاکانہ سچائی کے ساتھ لکھا جو سندھ کی جیلوں میں قید کاٹ رہی تھیں۔ ایک دو کے سوا وہ ساری عورتیں قتل کے جرم میں گرفتار کی گئی تھیں اور انہیں عمر قید کی سزا ہوئی تھی' ان میں سے بیشتر نے اپنے جرم کا اعتراف کیا تھا۔ قتل ہر ایک نے کیا تھا' چوری سے' زہر دے کر یا دھڑ لے کے ساتھ کلہاڑی یا چھرے کا وار کر کے' اپنے کسی قریبی عزیز' باپ بھائی' دیور یا شوہر کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اس قتل کے پیچھے ایک زندگی تھی' صدمے اور مظلومیت سے بھری ہوئی زندگی جیسے انہیں خیالی دنیا میں سکون ملتا تھا' اور پھر ایک شدید خواہش' جوش جنون کے تحت اس کی گرفت سے باہر نکل جانے کی خواہش۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کا ہے۔ پاکستان میں عمر قید کی سزا کاٹنے والی عورتیں تعداد میں اتنی کم نہیں ہیں' جتنا کوئی قیاس کرے گا۔ پورے ملک میں ان کی تعداد کیا ہوگی؟ اس کا مجھے علم نہ ہو سکا لیکن ۱۹۹۳ء میں صرف ملتان جیل میں ایسی قیدی عورتوں کی تعداد پندرہ تھی۔

عورتوں پر تشدد کی ایک عام شکل زنا بالجبر ہے جو دنیا بھر میں موجود ہے۔ لیکن اس اسلامی جمہوریہ میں تو یہ ایک وبا بن گئی ہے۔ حقوق انسانی کے کمیشن نے ایک تخمینہ لگایا ہے۔ ۱۹۹۳ء کے سال میں اوسطاً ہر تین گھنٹے بعد ایک عورت کی بے حرمتی کی گئی اور ہر روز عورتیں اجتماعی طور پر پامال کی گئیں۔ ان میں سے نصف تعداد یا تو نابالغ لڑکیوں کی تھی یا کمسن بالغ لڑکیوں کی۔ جن لڑکیوں سے زنا کیا جاتا ہے فوراً بعد ان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ کمیشن کی رپورٹ میں اس طرح شکار ہو جانے والی بچیوں کی عمریں پانچ سے پندرہ سال بتائی گئی ہے۔ اس میں بہت سے مثالیں ان مالکان اراضی سیاست دانوں اور پولیس افسروں کی ہیں' جنہوں نے عورتوں سے اور ان میں نابالغ لڑکیاں بھی شامل ہیں زنا کیا۔ جیسا کہ قاعدہ ہے یہ جرم ایک یا کئی افراد کی مدد سے یا ان کے علم میں کیا جاتا ہے دوسرے الفاظ میں یہ جرم ایک فرد کی جبلت کا مظہر نہیں بلکہ اس کا ارتکاب ایک سماجی حوالہ بھی رکھتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں عورتوں کے خلاف تشدد میں جو سفاکی پائی جاتی ہے اس کی نشاندہی میرے لئے بہت تکلیف دہ ہے کیونکہ اس سلسلے میں لامحالہ کچھ ذاتی معلومات بھی آ جائیں گی۔

MashalBooks.org

پاکستان میں متوسط اور بالائی طبقے کے لوگ اپنی خوشحالی کے جزیروں میں رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے گرد ایک اچھی محفوظ زندگی کے حوالے سے خوش فہمی کا حصار کھینچ رکھا ہے۔ ایک بات جو بہت سے والدین جاننا ہی نہیں چاہتے یہ ہے کہ اس گرے ہوئے بددیانت اور منافق معاشرے میں خود ان کے بچوں کی زندگیاں بھی یکسر محفوظ نہیں۔ امریکہ میں بطور مدرس میں نے متمول طبقے کے ان بچوں کی جراحتوں کو دیکھا ہے۔ غیر ملکی یونیورسٹی کے نسبتاً آزاد اور خود آگاہ ماحول میں جب انہیں کوئی قابل اعتماد مشیر یا پیشہ ور مستند کونسلر مل جاتا ہے تو وہ اکثر اپنے زخم کھول کر دکھا دیتے ہیں۔ ان بڑے بڑے خاندانوں سے آنے والی ایک حیران کن تعداد ان لڑکیوں کی ہے جو اپنی ابتدائی اور حساس عمر میں جنسی عمل کا نشانہ بنائی گئیں اور ایسا کرنے والا کوئی عم زاد یا سوتیلا بھائی' کوئی کم عمر چچا یا گھر کے ملازم ہوتے۔ پھر جیسا کہ رواج ہے انہوں نے اس ذلت کو خاموشی کے ساتھ برداشت کیا۔ یہ سب ستم زدہ تھیں۔

پاکستان میں عورتوں کے خلاف تشدد کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ اگرچہ یہ بہت عام ہے اور دور تک پھیلا ہوا ہے لیکن اس کی پوری اطلاع سامنے نہیں آتی اس کا پوری طرح تجزیہ نہیں کیا جاتا اور اس سماجی برائی کا ازالہ نہیں کیا جاتا۔ ایک ایسے کلچر میں جہاں عورت کی عزت اور عصمت کو بہت اہمیت دی جاتی ہو۔ جنسی تشدد کی اس عام صورت حال کو آپ کیا کہیں گے اور اس کی توضیح کیا کریں گے؟ اور یکے بعد دیگرے آنے والی حکومتوں نے اس مسئلہ سے جو بے اعتنائی برتی ہے اس کی وضاحت کیسے کریں گے؟ ان سوالوں کے جواب تلاش کرتے ہوئے ہم لامحالہ ایک دوسرے اہم مسئلہ تک پہنچ جائیں گے اور ہماری توجہ اس پر مرکوز ہو گی یعنی پاکستان میں گذشتہ دس برسوں پر محیط سیاست اور مذہب کا اشتراک عمل۔

جیسا کہ انسانی حقوق کے کمیشن کی رپورٹ میں اس کی نشاندہی کی گئی ہے عورتوں پر تشدد داشتہ افراد کی بدکرداری نہیں جتنا معاشرے کا سماجی اور سیاسی مزاج' جس کی گرفت اتنی سخت ہے کہ ہم اسے مذہب اور قانون کی رو سے جائز قرار دینے لگتے ہیں۔ محمد ضیاءالحق کے دور حکومت میں ریاستی طاقت اور خود ساختہ اسلامی پارٹیوں کا اشتراک عمل اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ اس آمریت کے دور میں انتہائی ظالمانہ اور امتیاز پر مبنی قوانین نافذ کئے گئے۔ حدود کے قوانین نے زنا کے جرم پر سزا کو ناممکن بنا دیا ہے بلکہ جسے زنا کا شکار بنایا گیا اسی کو سزا دینے کا امکان پیدا ہو گیا۔ صفیہ بی بی' ایک کمسن لڑکی کے ساتھ زنا کیا گیا اور جب اس کا حمل ٹھہر گیا تو اسلام کی آڑ لے کر ایک ڈرامہ رچایا گیا اور صفیہ بی بی کو سزا دی گئی۔ چونکہ وہ نابینا تھی' اس لئے وہ نہ تو اپنے مجرم کو پہچان کر اس کی نشاندہی کر سکتی تھی اور نہ ہی بے حرمتی کرنے والے مجرموں کے خلاف ثبوت کے طور پر "چشم دید" گواہ پیش کر سکتی تھی اور نہ اپنی بے گناہی ثابت کر سکتی تھی۔ اس کو سنگسار کئے جانے کی سزا دی گئی۔

اس بہیمانہ عدالتی فیصلے کے خلاف عام لوگوں نے سخت احتجاج کیا۔ اس کے باوجود وہ قوانین' جن کے تحت سزا دی گئی تھی' برقرار ہیں۔ جس نے انہیں نافذ کیا' اس کے اٹھ جانے کے چھ سال بعد بھی'

پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کے پانچ سال بعد بھی۔ انصاف کے منافی یہ قوانین معاشرے میں نابرابری اور بے انصافی کو برقرار رکھتے ہوئے اب تک مسلط ہیں۔ آج پاکستان کی جیلوں میں مقید عورتوں کی 70 سے 80 فیصد تعداد انہی غیر منصفانہ حدود قوانین کے تحت سزا یا فتگان کی ہے۔ زنا کا الزام عورتوں پر لگا دینا سب سے آسان کام ہے۔ مرد جو اس کے سب سے بڑے مجرم ہیں بمشکل ہی اس میں سزا پاتے ہوں۔ مثال کے لئے ہم حقوق انسانی کے کمیشن کی ایک نہایت جرات مندانہ رپورٹ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ پنجاب میں ۱۹۹۴ء میں ۷۸۵ عورتیں جیلوں میں بند تھیں ان میں سے ۳۸۷ عورتیں زنا کے الزام میں قید کی گئی تھیں۔ پاکستان میں قوانین اور مروجہ اداروں نے عورت کی بے توقیری کو جائز قرار دیا ہے وہ محض حدود کے قوانین ہی ہیں نہیں جو قانون' جمہوریت اور مذہب کی تضحیک کرتے ہیں بلکہ اور بھی مختلف صورتیں ہیں جن سے عورتوں کو مساوی سے بھی کم حیثیت دی جاتی ہے۔ ہمارے قوانین وراثت میں ان کے ساتھ امتیاز کیا جاتا ہے۔ دیت اور قصاص کے قوانین نے انہیں آدھی حیثیت دی ہے۔ ہماری سیاسی پارٹیوں نے انہیں نمائندگی کا حق نہیں دیا لیکن ان سے ووٹ لیتی ہیں۔ قومی اسمبلی کے ۲۱۷ ارکان میں عورتوں کی تعداد صرف ۴ ہے۔ سینٹ کے ۸۷ ارکان میں عورت صرف ایک ہے اور چار صوبائی اسمبلیوں میں عورتیں صرف تین ہیں۔ مزدور پیشہ عورتوں کے حقوق کے باب میں عالمی ادارہ محنت نے ۹ کنونشن منظور کئے ہیں' پاکستان نے صرف ایک پر دستخط کیا ہے جو زچگی کی چھٹی کے متعلق ہے۔ یکے بعد دیگرے آنے والی حکومتیں جن میں ایک خاتون وزیراعظم کی حکومت بھی شامل ہے اقوام متحدہ کے اس کنونشن کی توثیق اب تک نہیں کرسکیں جو عورتوں کے خلاف امتیاز اور تفریق کی تمام صورتوں کے خاتمے سے متعلق ہے۔

تعلیم یافتہ اور ذی حس شہری--یاست دانوں کی بات نہیں-- تبدیلی اور اصلاح کے محرک ہوتے ہیں۔ زندہ اور متحرک معاشروں میں وہی احتجاج کی تحریک منظم کرتے ہیں' اور ترقی کی مہم چلاتے ہیں اور معاشرے کے جسم میں صحت مند تازہ خون دوڑاتے ہیں۔ پاکستان میں عورتوں کی ایک توانا تحریک موجود ہے اور یہ بڑی امید افزا بات ہے۔ المناک بات یہ ہے کہ یہ ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی ہے اور معاشرے کے اوپری طبقے تک محدود ہے' لیکن اس سے بھی زیادہ المناک بات یہ ہے کہ دانشور مردوں کی طرف سے عورتوں کی اس تحریک میں کوئی منظم شمولیت نظر نہیں آتی' یہ تحریک جو عورتوں نے سماجی تبدیلی کے لئے جاری کی ہے۔ ۸ مارچ کو خواتین کا قومی دن منایا جائے گا۔ میں امید کرتا ہوں کہ وہ دن مسلمان عورتوں کے ساتھ مردوں کی یکجہتی کا بھی دن ہوگا۔

(''ڈان'' 23 فروری 1994ء)

ایک شہر کا قتل

ایک بدبو' نہائت تیز سارے وجود میں چبھ جانے والی' ہوائی اڈے پر اترتے ہی ہمارے خیر مقدم کے لئے موجود تھی۔ بارش کا پانی سڑ رہا تھا۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے تھے اور کھلے مین ہول سے ابلتے ہوئے غلیظ پانی نے شہر کو نکاسی آب کی کھلی نالیوں کے جال میں بدل دیا تھا۔

مسافروں کے ٹرمینل سے باہر ہماری ملاقات اچانک مسٹر حسن جعفری سے ہو گئی کراچی کے اس تباہ کن ماحول میں بھی ان کے چہرے پر مسکراہٹ برقرار تھی۔ انہوں نے سواری کی پیشکش کی' جسے ہم نے بخوشی قبول کر لیا۔ جب میں نے ایئر پورٹ پر شدید بدبو کی شکائت کی تو انہوں نے بے پروائی سے کہا' "اوہ! لوگ اس کے عادی ہو جاتے ہیں۔) البتہ انہوں نے چند حقیقی "مسائل" کا ذکر کیا۔ "لوگ سڑک پر بجلی کے جھٹکوں سے ہلاک ہو رہے ہیں۔ ابھی چار افراد پچھلے ہفتے ہلاک ہوئے۔" انہوں نے بجلی سے ہلاک ہونے والوں کے اعداد و شمار جو پچھلے سال کے تھے پیش کئے۔ چنانچہ ہم نے قیاس کیا کہ متعدد جانوں کی ہلاکت کے الزام میں کوئی شہری بلدیہ کے خلاف مقدمہ دائر کرے گا۔

بدبو کے متعلق انہوں نے صحیح کہا تھا۔ میں اس کا عادی ہو گیا' لیکن "مسائل" جو لوگوں کے ہی پیدا کئے ہوئے تھے' اپنی جگہ موجود رہے۔ اس سے ایک روز پہلے سہ پہر کے وقت بارش ہو گئی جس سے شہر کی سڑکوں پر جہاں نکاسی کا کوئی انتظام نہ تھا' سیلاب آ گیا۔ بعض علاقوں میں جہاں پچھلے ہفتے کی بارش کا پانی جمع تھا' گھٹنے تک پانی ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ کاریں گڑھوں سے ٹکرا کر' مین ہول میں پھنس کر اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں الجھ کر سڑک پر بند ہو گئی تھیں۔ زینب مارکیٹ سے میریٹ ہوٹل تک دو میل سے کم کا فاصلہ طے کرتے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ لگ گیا۔ عجیب بات تھی کہ لوگ اس پر بھی بڑے تحمل سے ایک دوسرے کی مدد کر رہے تھے۔ بعض نے تو ہمارا جواب مسکراہٹ سے دیا۔ ایک عزیز نے اس صبر و قناعت کی توجیہ اس طرح کی کہ "زندگی بالعموم یہاں بہت مشکل ہے۔ بارش نے مشکلات میں تھوڑا سا اضافہ کر دیا ہے اور بس۔"

انہوں نے حقیقت حال کو ذرا کم کر کے بیان کیا تھا۔ انہی عزیز نے جو ایک جواں سال ماہر تعمیرات ہیں' یہ واقعہ بیان کیا کہ انہیں غیر ملکی کمپنیوں کے ایک گروپ کو ڈیزائنوں کے سیٹ دینا تھے۔ "ڈیزائن تیار تھے لیکن ہم ان کے پرنٹ نہیں نکال سکے۔ ہم نے بجلی کی بحالی کے لئے اکٹھے پانچ گھنٹے انتظار کیا۔ اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک پرنٹ نکلا اور بجلی چلی گئی۔ ایک سیٹ نکالنے میں ہمیں چھ سے آٹھ گھنٹے لگ جاتے ہیں۔" میں نے تشویشناک لہجے میں پوچھا: "تم نے بار بار بجلی جانے کی شکائت ان سے کیوں نہیں کی؟" انہوں نے

جواب دیا: انہیں کیا پروا۔ انہیں صرف اپنے کنٹریکٹ سے دلچسپی ہے کہ اس سے کیا پیدا ہو رہا ہے۔ اسے پیدا کرنے میں، مجھے جو مسائل درپیش ہوتے ہیں، ان سے کوئی دلچسپی نہیں۔'' میرے اس عزیز کی بیوی جو ایک ڈایزائنر ہیں، کہتی ہیں ان کی ورکشاپ میں گذشتہ تین ہفتوں کے اندر بمشکل تین گھنٹے کے برابر کام ہوا ہے۔ ان کا پرنٹر جو لانڈھی میں رہتا ہے، اکثر کام پر آنے سے رہ جاتا ہے کیونکہ سواری نہیں ملتی۔ ان میں سے چند ایک کچے مکانوں میں رہتے ہیں۔ بارش میں وہ مکان ڈھے گئے، اس پر بار بار بجلی کا فیل ہونا۔ وہ عزیزہ کہتی ہیں کہ ہم شاید زیادہ اچھے رہیں گے، اگر تمام جدید چیزوں سے، مثلاً بجلی، بسیں، ٹیلیفون وغیرہ سے چھٹکارہ پالیں۔ ہم انہی سہولتوں پر تکیہ کرتے ہیں، لیکن ہماری حکومت کو یہ نہیں معلوم کہ یہ چیزیں کس طرح مہیا کی جائیں اور ان کی تنظیم کیسے ہو۔''

ان کے جانے کے بعد میں صورت حالات پر غور کرتا ہوں، وہ سب کے سب بڑے ذہین، فعال اور محنتی اور اپنے پیشوں سے وابستہ نوجوان ہیں۔ بالکل ویسے ہی نوجوان، جن پر کوئی بھی ملک اپنی تیز رفتار ترقی کے لئے انحصار کرتا ہے۔ وہ لاہور سے چل کر کراچی آئے۔ تعلیم یافتہ اور پر جوش نوجوانوں کے لئے کراچی میں بڑی کشش ہے۔ انگریزی روزناموں کے پچاس فیصد سے زیادہ خریدار اس شہر میں رہتے ہیں، لیکن وہ یہاں اس طرح ضائع ہو رہے ہیں جیسے ملک کے دوسرے حصوں کے نوجوان ضائع ہو رہے ہیں۔ ان کا شدید احساس محرومی سمجھ میں آتا ہے۔ کچھ تو ملک چھوڑ کر باہر چلے جاتے ہیں اور وہاں کامیاب رہتے ہیں۔ کچھ دوسرے نوجوان مایوس ہو جاتے ہیں، وہ اپنا وقار گنوا بیٹھتے ہیں اور جلدی سے دولت مند بننے کے لئے غیر پیداواری لوگوں سے مل جاتے ہیں۔

میریٹ ہوٹل کے کیفے ٹیریا میں ایک امریکی جو کسی کاروباری دارے کا بڑا عہدیدار تھا اپنے مقصد میں ناکامی کی شکایت کر رہا تھا۔ وہ ایک بین الاقوامی کمپنی کے لئے جس کے ساتھ بہت سی کمپنیاں شامل ہیں کام کر رہا تھا اور یہاں سرمایہ کاری کے امکانات کا جائزہ لینے آیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میرے چیئرمین نے پاکستان میں چند اوپر کے لوگوں سے ملاقاتیں کیں، ان افراد نے چیئرمین کو یقین دلایا کہ یہ جگہ سرمایہ کاری کے لئے نہائت مناسب ہے لہٰذا میں یہاں آ گیا'' پھر آپ نے یہاں آ کر کیا محسوس کیا؟ میں نے پوچھا۔ جواب دیا ''پاکستان کے سرکاری سیلز مین چرب زبان ضرور ہوں گے، لیکن یہاں لا کر اپنا سرمایہ لگانے کی بجائے میں اسے گلف آف میکسکو میں ہی ڈبو دوں گا۔'' بیشتر امریکی تاجروں کی طرح یہ شخص اپنی مدلل گفتگو میں نہایت حقیقت پسند تھا۔ بہتر ہو گا کہ سردار فاروق احمد خاں لغاری ایک بار پھر شیر کے شکار پر جانے سے پہلے اس کی باتیں سن لیں۔ اس نے کہا:

''گارمنٹس فیکٹریوں کی نمائندگی کے حوالے سے یہاں جو سامان دستیاب ہے ان میں پہلے لیبر آتی ہے، ان میں کام کرنے کی صلاحیت ہے، زیادہ سکھانا نہیں پڑے گا۔ ٹھیک ہے، ہم اپنی مشینیں یہاں لائیں

گے۔ڈائزین بھی لائیں گے' سپروائزر کوتربیت دیں گےلیکن یہاں تو سارے وقت چھٹی لگی رہتی ہے۔۱۴۹ دنوں کی چھٹیاں تو خودحکومت نے دے رکھی ہیں۔ان میں وہ چھٹیاں بھی جوڑ لؤ جو ہر ملازم کوایک سال کے ختم ہونے پر ملتی ہے۔کم سے کم دو ہفتے تو ہوتی ہے۔کچھ دن بیماریوں میں نکل جاتے ہیں' پھر ٹیلیفون ہے جو اکثر صحیح طرح کام نہیں کرتا۔پھر امن عامہ کی مشکلات اپنی جگہ ہیں۔جس دن میں یہاں پہنچا' تو کیا دیکھا کہ مسلح سپاہی ہر طرف گھوم رہے تھے۔گاڑیوں پر بندوقیں نصب تھیں اور وہ ہر آنے جانے والے کی تلاشی لے رہے تھے۔میری نہیں۔جب میں اسلام آباد کے پھیرے سے واپس آیا تو یہاں افراتفری مچی ہوئی تھی۔یہ شہر تھوڑی سی بارش بھی برداشت نہیں کرسکتا۔'' میں نے بیچ میں ٹوکتے ہوئے کہا۔لیکن آپ اپنا کارخانہ ملک میں کہیں اور بھی لگا سکتے ہیں' شمال میں بھی۔''ٹھیک ہے۔''اس نے جواب دیا''لیکن آپ کے پاس اگر سمندر نہیں تو ملک بھی آپ کے لئے نہیں۔نہیں جناب کسی تاجر کی کتاب میں یہ نہیں لکھا۔''

کراچی میں رہتے ہوئے پانچ مایوس کن دنوں میں' یہ اور ایسی ہی دوسری باتیں سننے کے بعد مجھے اس بیوقوف آدمی کی کہانی یاد آ گئی جو کبھی بچپن میں سنی تھی۔لالچ نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی' چنانچہ اس نے ہر روز سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو بہت سے انڈے ایک ہی بار حاصل کرنے کے لئے ذبح کردیا۔

کراچی پاکستان کا واحد بڑا شہر' تجارت کا دارالحکومت اور دنیا کی طرف کھلنے والا دروازہ ہے۔ پاکستان کی کل سرکاری آمدنی کا تقریباً چالیس فیصد یہیں سے جاتا ہے۔اس لحاظ سے وہ سب سے زیادہ ٹیکس دینے والا شہر ہے۔۹۳۔۱۹۹۲ء میں وفاق کو ملنے والے براہ راست ٹیکس کی آمدنی ۶۶۸ ۳ بلین تھی۔اس میں کراچی کا حصہ ۳۱ بلین تھا۔پاکستان میں یونیورسٹی گریجوئیٹس کی جس قدر تعداد ہے'ان میں سے پچاس فیصد کراچی کے شہری ہیں۔مردوں میں خواندگی کا تناسب ملک کے کل خواندہ افراد میں سب سے زیادہ کراچی میں ہے۔یہ کوئی ۶۵ فیصد ہے۔اسے اس بات پر فخر ہے کہ کارکن عورتوں کی سب سے زیادہ تعداد بھی یہیں ہے۔عورتوں اور مردوں کی لیبر فورس کا سب سے بڑا مرکز کراچی ہے۔پورے ملک سے ہر سال پانچ لاکھ کارکن کراچی آرہے ہیں۔اس لئے یہاں کی آبادی بھی بے تحاشا بڑھ رہی ہے۔یعنی پانچ تا سات فیصد سالانہ جب کہ بنیادی شہری سہولتیں پورے سال میں اس کو بمشکل آدھی رفتار سے مہیا ہوتی ہیں۔

پاکستان میں یہ ایک اقتصادی اور سماجی ترقی کا انجن ہے' جسے ایک منظم لوٹ مار اور سوچی سمجھی بدنظمی کے ذریعے تباہ کیا جارہا ہے۔شہر کے سیاست دان' صوبائی وڈیرے' قومی رہنما' اعلیٰ افسران یہاں تک کہ فوجی لیڈر جس طرح اس شہر کو غارت کررہے ہیں اسے بیان کرنے کے لئے ایک دفتر چاہیے۔کراچی ٹیکسوں کی صورت میں جو کچھ دیتا ہے قومی اور صوبائی حکومتیں' بمشکل اس کا عشرعشیر اس شہر پر لگاتی ہیں۔کراچی میں حکومت اور سیاست کے اندر جو تضادات ہیں اسے دیکھ کر باہر سے آنے والا حیران رہ جاتا ہے۔یہاں میں

اس کی ایک مثال دوں گا۔ قاعدے کے مطابق پاکستان میں اختیارات منصفانہ طور پر تقسیم نہیں ہوئے یہاں وفاق اور صوبوں کی حکومتوں میں مرکزیت ہے۔ انتظامی اختیارات کا ملغوبہ ہے' ہر ایک دوسرے کے اختیارات پر حاوی نظر آتا ہے' نتیجہ یہ کہ کراچی میونسپل کارپوریشن ہے تو ایک' لیکن سکرات کے عالم میں ہے۔

اختیارات کی یہ عدم مرکزیت مجھے اتفاقی معلوم نہیں ہوتی۔ کوئی شہر ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہو تو اسے اپنے مقصد کے لئے استعمال کرنا اور لوٹنا ہوتا ہے۔ اردشیر کاؤس جی' اخبار کے انہی کالموں میں' سیاست دانوں اور افسر شاہی کی لوٹ کا کچا چٹھا لکھ رہے ہیں کہ وہ کس طرح زمین لوٹ رہے ہیں اور اس شہر کو دوسرے کئی طریقوں سے برباد کر رہے ہیں۔ اپنی ہوس زر کی تسکین کے لئے وہ یہاں لسانی کشیدگی کو ہوا دیتے ہیں اور یہاں جو اپنے آپ کو بدلنے کی اور تجدید نو کی جو خواہش پائی جاتی ہے' اسے ختم کر دیتے ہیں۔ کراچی میں سماجی اور رفاہی تنظیمیں جو نہایت متحرک ہیں تعداد میں اتنی ہیں کہ پورے ملک میں کہیں اور نہیں ہوں گی لیکن کرپشن کی کثرت اور بے توجہی کے رویے ان کی کوششوں پر حاوی ہو جاتے ہیں۔

اس نہایت سرگرم اور متحرک شہر میں گھوم کر آپ یہ سب کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ کراچی مرنے سے انکار کر رہا ہے لیکن اس کی زندہ رہنے کی خواہش میں زندگی سے بے پروائی کا اندوہناک عنصر بھی شامل ہے۔ اس نے پاکستان کی پہلی غیر جاگیردارانہ سیاسی پارٹی کو جنم دیا جو اس دقیانوسی سیاسی ماحول میں شہریوں کے مفادات کی نمائندگی کر سکتی تھی۔ اس کی بجائے اس نے فرقہ وارانہ نہج اختیار کر لی۔ ایک نیا فسطائی طریقہ اپنا لیا اور شخصیت پرستی کو اپنا نظریہ بنا لیا۔ اب ان جدید صنعت کاروں کا ٹھکانا بن گئی ہے' جو یہ جانتے ہیں کہ رقم کیسے بنائی جائے۔ ٹیکس کیسے بچایا جائے' اور اپنے مخصوص مفادات کا تحفظ کس طرح کیا جائے؟ جیسے کہ ابھی انہوں نے ہڑتال اور لاک آؤٹ وغیرہ سے کیا۔ وہ ہر طرح سے سرمایہ دار ہیں سوائے' اس ایک بات کے کہ وہ اپنے شہر کا تحفظ اور اس کی تعمیر نہیں کرتے۔

یہاں کا دانشور' عوام کے احساس محرومی' تشدد' اغوا' رشوت اور زبردستی بھتے کی وصولی کی اتنی کہانیاں سناتا ہے جو ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ ان کہانیوں سے ظاہر ہے کہ کراچی ایک چھوٹی سی دنیا ہے' اس ملک سے ذرا سا آگے۔

("ڈان" 17 جولائی 1994ء)

کراچی کا تشویش انگیز پیغام

گذشتہ ہفتے ہم نے پاکستان کی کشمیر پالیسی پر جس گفتگو کا آغاز کیا تھا' میں نے چاہا کہ یہ سلسلہ پھر وہیں سے شروع کروں' لیکن میں لکھ نہیں سکا۔ مجھ پر یہ واجب ہو گا کہ پہلے کراچی میں ہونے والی خوں ریزی پر لکھوں۔ کراچی' جو پاکستان کا تجارتی دارالحکومت ہے ریاست کی آمدنی کا بنیادی وسیلہ ہے۔ یونیورسٹی گریجوئٹس کی اکثریت کا شہر ہے اور جہاں ملک کی تقریباً آٹھ فیصد آبادی رہتی ہے۔

جب میں نے کشمیر پر لکھنے کی کوشش کی تو ایک اندوہناک حقیقت میرے ذہن پر حاوی ہو گئی۔ صرف گذشتہ ہفتے' کشمیر سے زیادہ کراچی کی خانہ جنگی میں لوگ ہلاک اور زخمی ہوئے۔ یہ تقابل گمراہ کن ہو سکتا ہے لیکن دونوں کے درمیان یکسانیت چونکا دینے والی ہے۔ کشمیر کی طرح کراچی میں بھی ایک ریاست اپنے شہریوں سے برسر جنگ ہے۔ پاکستان کے سرکاری حکام بھی اپنے سیاسی مخالفوں کو اسی طرح دہشت گرد قرار دے کر مسترد کر رہے ہیں' جیسے ہندوستان کشمیر میں کر رہا ہے۔ سندھ اور اسلام آباد کی حکومتیں بھی فوجی کارروائی کو ٹھیک اسی طرح ایک مسئلہ سیاسی حل سمجھتی آئی ہیں جس طرح ہندوستانی حکومت کا رویہ کشمیر میں ہے۔ کشمیر کی طرح یہاں بھی اذیت ناکی اور خوں ریزی کی کوئی حد نظر نہیں آتی۔ کراچی کی خوں ریزی کو دیکھتے ہوئے کشمیر کے مسئلہ پر پاکستانی لیڈروں کی گرم گفتاری' یہاں کے لوگوں کو غیر ملک سے زیادہ کچھ اپنے ہی ملک کی بات لگتی ہے۔

ہمارے حکام کے بیانات اور کراچی میں ان کی پالیسیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہاں خانہ جنگی کے بنیادی اسباب کو سمجھنے سے یکسر قاصر ہیں۔ یہ جنگ ایسے حالات میں ہو رہی ہے جس کی کوئی منطقی اور ظاہری وجہ نہیں۔ کراچی میں دس سال سے جو حالات کی خرابی پائی جاتی ہے' اس پر کسی کمیشن کی کوئی رپورٹ نہیں آئی۔ اور نہ کسی سے یہ کہا گیا کہ اس بحران کے حل کے لئے کوئی سفارش پیش کرے۔ ایسا بحران جو ریاست کی بنیادوں کو ہی کھوکھلا کر رہا ہے۔ یہ ایسا المیہ ہے جس سے بنیادی طور پر اغماض برتا گیا۔ چنانچہ وہ اصل حقائق بھی دستیاب نہیں جن سے کراچی کے حالات کی خرابی کا پتہ چلتا۔ اس کے باوجود کراچی کے المناک حالات کا سایہ مستقبل پر پڑ رہا ہے اور جب تک اسے بنیادی طور پر درست نہیں کیا جاتا یہ ایک سنگین اور مستقل مرض کے طور پر موجود رہے گا۔ یہ دلیل دینا کہ یہ مسئلہ صرف ایک شہر میں ہے یا یہ کہ شہر کے بیس میں سے کتنے اضلاع تک محدود رہے' ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ کینسر کا ہونا کوئی بڑی سنگین بات نہیں کیونکہ وہ جسم کے صرف ایک حصے میں ہے۔ وہ حالات جنہوں نے کراچی کو موجودہ حالات کے دہانے تک پہنچا

دیا پاکستان کے دوسرے شہروں میں بھی کم وبیش ظاہر ہونے لگے ہیں۔ان اسباب میں سے چند درج ذیل ہیں:۔

کراچی میں بڑھتی ہوئی آبادی اور بنیادی شہری سہولتوں کے درمیان جو فاصلہ پہلے تھا' وہ برابر بڑھتا گیا۔گذشتہ تیس برسوں میں شہر کی آبادی ایک اندازے کے مطابق سالانہ پانچ فیصد کی شرح سے بڑھتی گئی۔۱۹۵۰ء میں شہر کے اندر دس لاکھ افراد رہتے تھے۔۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی ۵۴ لاکھ اور ۱۹۹۵ء میں ایک اندازے کی رو سے نوے لاکھ سے ایک کروڑ کے درمیان پہنچ گئی۔اس تناسب سے بنیادی رہائشی ضرورتیں جیسے مکان' پانی بجلی اور شفاخانے اندوہناک حد تک کم رہ گئے۔شہری سہولتوں کی فراہمی کی رفتار سالانہ دو فیصد سے بھی کم تھی۔ یہ اعداد و شمار بھی گمراہ کن ہوں گے کیونکہ بنیادی سہولتوں کی فراہمی پر زیادہ تر سرمایہ متمول لوگوں کی آبادی پر لگایا جاتا ہے کراچی کے شہریوں کی اکثریت زندگی کی بنیادی ضرورتوں کے حصول کی خاطر آپس میں ہی مقابلہ کرتی رہتی ہے۔یہ لوگ شہر میں اس طرح رہ رہے ہیں جیسے پریشر کوکر میں رہتے ہوں۔ جب اس کا ڈھکن کسی سیاسی پارٹی کی گھپلے بازی سے اچانک کھل جاتا ہے تو اندر کی بھاپ بڑی شدت کے ساتھ باہر پھٹ پڑتی ہے۔باقی سب باتیں مساوی ہیں۔ پھر حالات کے خراب تر ہونے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔اندازہ کیا جاتا ہے کہ ۲۰۱۰ء تک کراچی کی آبادی دو کروڑ چار لاکھ ہو چکی ہو گی۔

کراچی میں معیشت بالائی سطح پر زیادہ ہے اور انتظامیہ میں مرکزیت ہے اس سے بے روزگاری اور نوجوانوں میں خاص طور پر مایوسی پیدا ہوتی ہے حالت یہ ہے کہ بے روزگاروں کی تعداد سرکاری اندازے کے مطابق بھی دستیاب نہیں۔خیال کیا جاتا ہے کہ تیس فیصد مرد بے روزگار ہیں۔ یہ وہی بے روزگار نوجوان ہیں جو کراچی میں ایسی دہشت گرد تنظیموں کی اصل طاقت ہیں جن کا نعرہ یہ ہوتا ہے: ''ماریں گے' مر جائیں گے'' لیکن پاکستان کی کسی بھی حکومت نے ایسے معاشی اور سماجی پروگرام پر عمل نہیں کیا' جس کا مقصد ایک طرف پیداوار میں اضافہ اور روزگار کی فراہمی ہوتی' دوسری طرف آمدنی وسیع البنیاد ہوتی اور یہ سب کچھ اس امر کے باوجود ہے کہ پاکستان ایک مثالی ملک ہے جہاں مختلف پیشوں کی بنیاد پر مستقل ترقی کا امکان موجود ہے۔وہ تجربہ جسے عالمی بینک نے شہری ترقیاتی منصوبوں میں سب سے زیادہ کامیاب قرار دیا ہے کراچی میں کیا گیا' عالمی بنک کا بیان ان حکومتوں کے لئے سرزنش ہے جو ترقیاتی پروگراموں پر رقم ضائع کرتی آئی ہیں۔

شہر کے طول و عرض میں لسانی بنیادوں پر جو فسادات ہوتے آئے تھے اپریل ۱۹۸۵ء میں اورنگی ان میں سب سے آگے تھا۔ایک پختون ٹرک ڈرائیور کی گاڑی کے نیچے ایک بچی شازیہ زیدی ہلاک ہوگئی جس کے بعد فسادات پھوٹ پڑے تھے۔ میں نے سب سے پہلے ۱۹۸۷ء کے اوائل میں ڈاکٹر اختر حمید خاں سے ملاقات کی' جنہوں نے انتہائی ذہانت سے کام لیتے ہوئے اورنگی پائلٹ پروجیکٹ تیار کیا تھا۔پھر لسانی خوں ریزی کی پے در پے وارداتوں کے بعد جب میں ان سے ملا تو آخری فساد دو ماہ پہلے ہی ختم ہوا

MashalBooks.org

تھا۔ خان صاحب اوران کے رفقائے کاراس وقت اورنگی کے دس لاکھ باشندوں کی تباہ حال معیشت اور بدحال زندگی کو نئے سرے سے مرتب کرنے میں مصروف تھے۔ میں ان کی غیر معمولی کامیابی پر آئندہ تفصیل سے لکھوں گا۔ اس وقت تو میں چند خاص نکات کا تذکرہ کروں گا۔ (۱) یہاں ایک نہایت موثر نظام گندے پانی کی نکاسی کے لئے کام کررہا ہے۔ اسے یہیں کے لوگوں نے بنایا ہے جو سستا بھی ہےاور کارآمد بھی۔ اس سے ہوا پاکیزہ اورگلیاں صاف ستھری رہنے لگی ہیں۔ اس کامیابی نے یہاں کے لوگوں میں ایک احساس تفاخر پیدا کیا ہےاوروہ اس بستی کواس طرح صاف رکھنے کا ارادہ کئے ہوئے ہیں۔ (۲)اورنگی کے تقریباً ستر فیصد بچے اسکول جاتے ہیں' جواس ملک میں خواندگی کی سب سے بڑی شرح ہے۔ (۳)اورنگی میں بے روزگاری کی شرح کم ہے' کیونکہ یہاں کے باشندوں کی ایک چوتھائی تعداد یا تو اپنا روزگار خود کرتی ہے یا یہیں ہونے والے چھوٹے موٹے کاروبار سے وابستہ ہے۔ (۴) ۱۹۸۸ء کے بعد سے اب تک اورنگی میں کوئی بڑا فساد نہیں ہوا۔ ترقیاتی امور کے ماہر اس پروجیکٹ کو دیکھنے کے لئے غیر ممالک سے آئے۔ لیکن پاکستان کے اعلیٰ اور مقتدر لوگوں میں سے کسی نے یہاں آنے اوراس سے کچھ سیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ ایک اور ملاقات میں' میں نے خان صاحب سے پوچھا' آخر یہ لوگ یہاں کیوں نہیں آتے؟ ان کا سادہ سا جواب تھا۔ ''یہ عام لوگوں کی کم خرچ اسکیم ہے۔ اس سے پیسہ نہیں پیدا کیا جا سکتا۔'' کراچی میں جو دولت پیدا ہوتی ہے اسے سیاست دان اور اعلیٰ سرکاری عہدیدارلوٹ کر کھا جاتے ہیں اور یہ شہر بھوکا رہ جاتا ہے۔ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے خزانوں میں ساٹھ فیصد سے زیادہ سرمایہ جاتا ہے لیکن یہاں شہری سہولتوں کی فراہمی پر اس کا ایک نہایت حقیر حصہ خرچ کیا جاتا ہے۔ مزید خرابی یہ کہ کراچی کی اراضی اوردوسرے وسائل ارباب اقتدار کی حرص اور ہوس کے ہاتھوں ایک کے بعد دوسری حکومت کے تحت لٹ رہے ہیں۔ آبادی میں اضافے کے ساتھ زمین کی قیمتیں بھی بڑھتی رہی ہیں۔ مقتدر لوگوں کی ہوس میں بھی اسی حساب سے اضافہ ہوا ہے۔

ڈاکٹر اختر حمید خاں اور ماہر تعمیرات عارف حسن نے کہ ان کا تعلق بھی اورنگی پائلٹ پروجیکٹ سے ہے وہ پہلے تجزیہ نگار تھے جنہوں نے ۱۹۸۰ء کے وسط میں عوام کو باخبر کیا کہ زمین پر ناجائز قبضے اور شہری سیاست میں جرائم کی شراکت کے درمیان کیا رشتہ ہے؟ اس عمل کا آغاز ذوالفقار علی بھٹو کے زمانے میں ہوا۔ اوراس میں تیزی ضیاءالحق کے آمریت کے دور میں آئی۔ کسی مقتدر شخص نے اس نکتے پر توجہ نہیں دی۔ لیکن ایسی ہولناک خبریں کثرت سے سنی جارہی ہیں کہ سیاست دانوں اور اقتدار کے حواریوں کا منظم جرائم پیشہ گروہ کس طرح لوٹ مار میں مشغول ہے۔ اس لئے کراچی کے بیچارے لوگوں نے مسلح گروہوں کی پناہ حاصل کرلی' جن میں سے کچھ تو حکومت سے جڑے ہوئے تھےاور کچھ اس کے مخالف تھے۔ ایسے حالات میں کہ روابط تیزی سے تبدیل ہورہے ہیں' لائسنس یافتہ دہشت گردوں اور لائسنس کے بغیر دہشت گردی کرنے والوں کے درمیان ان کی اخلاقی حیثیت کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا غیر ممکن ہے۔

جمہوری طرز حکومت کے اصولوں کے برعکس پاکستان میں طاقت مرکز اور صوبوں کی حکومتوں میں مرکوز ہے۔ لوکل گورنمنٹ یہاں کمزور ہیں، ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی ہے یا ان کا وجود ہی سرے سے ختم کر دیا گیا ہے۔ اس طرح کراچی کے شہریوں کو نہایت موثر انداز سے حق رائے دہی سے محروم کر دیا گیا ہے۔ یہ دنیا کا ایک ہی بڑا شہر ہو گا، جہاں زیادہ تر زمانوں میں کوئی منتخب میئر نہیں رہا۔ ۱۹۹۲ء سے ایک بھی اب تک نہیں اور مس بھٹو نے نیوز ویک سے انٹرویو میں کس آسانی سے پلک جھپکے بغیر کہہ دیا کہ آئندہ برسوں میں بھی نہیں ہو گا۔ جب کہیں ایک میئر ہوتا ہے تو وہ میئر کے ایوان میں بیٹھتا ہے۔ وہ ہمارے ٹام ٹیکس مثلاً چونگی جمع کرتا ہے اور شہر کی پولیس ہو یا پانی کی فراہمی یا بجلی کی تقسیم، وہ کچھ بھی کنٹرول نہیں کرتا، یہاں کی زمین پر پیدا ہونے والے اناج کی فصل بھی نہیں۔ لیکن میں نے دنیا کا کوئی اور دوسرا شہر نہیں دیکھا، جیسا کراچی ہے جہاں اتنی بدنظمی اور حکومت کا غیر عقلی، غیر جمہوری اور من مانا طریقہ رائج ہو۔ ظاہر ہے کہ کسی بڑے شہر کے باشندے اگر منظم ہوں تو شہری زندگی میں اتنا اندوہناک زوال آنے ہی نہیں دیں گے۔

جب ایک طرف عوام کا احساس محرومی اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہو اور انہیں اپنی ناطاقتی کا شدت سے احساس ہو، اس کے ساتھ ہی دوسری طرف سرکاری اور غیر سرکاری طاقت رکھنے والے بے دریغ اپنی ہوس کی تسکین میں مصروف ہوں تو ایسے ماحول میں تشدد کے واقعات مستقل صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ افغان جنگ کے نتیجے میں ۱۹۸۶ء کے زمانے میں تشدد کی سلگتی ہوئی آگ کو بھڑکانے والے دوسرے عناصر بھی آ گئے۔ یہ لسانی اور فرقہ وارانہ جماعتیں تھیں، سیاسی معیشت (منشیات) کا عنصر تھا۔ اور ٹیکنالوجی (اسلحہ) تھی۔ ضیاء کی آمریت کے زیر سایہ ایم کیو ایم دوہری طاقت کے ساتھ ابھر کر آ گئی۔ سیاسی طاقت اور شہ زوری۔ اس کے درمیان رخنے ڈال کر اسے کمزور کرنے کی چالوں سے کچھ وقتی فائدہ تو حاصل ہو سکتا ہے لیکن اس طرح کی کارروائیوں سے حکومت خود جرم میں شامل ہو جاتی ہے اور ریاست کی آئینی حیثیت کمزور ہوتی ہے ایسے حالات کا فوجی حل کوئی نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سیاسی سمجھوتوں میں دوہرے پن کا رویہ ترک کیا جائے اور قانون کی حکمرانی رائج کرنے کا عہد کیا جائے۔ جس میں کسی سمجھوتے بازی کی گنجائش نہ ہو۔

اس وقت جو بات خطرے میں ہے وہ پاکستان کی ریاست کا جواز اور اس کا استحکام ہے۔ کراچی اس معرکے کا پہلا میدان ہے۔ یہاں ریاست کی طاقتیں کمزور ہوتے ہوئے ملیشیا کی سطح پر آ گئی ہیں، البتہ سب سے طاقت ور ملیشیا۔ دوسری جگہوں پر بھی حریف گروہ سامنے آ رہے ہیں۔ یہ ہیں فرقہ پرست طاقتیں، ڈاکو اور نجی مسلح گروہ یا ملیشیا۔ کراچی میں ریاست جرائم میں پوری طرح ملوث ہے ان جرائم میں بھی جو عوام کے خلاف ہیں۔ یہ کیفیت دوسری جگہوں پر بھی نظر آ رہی ہے لیکن ابھی اسے پختہ ہونے میں وقت لگے گا۔ کراچی میں پولیس کے آدمی اور ڈاکو کے درمیان فرق دھندلا گیا ہے۔ جہاں تک اور جگہوں کا تعلق تو یہ حال اس جوان دلہن سے پوچھیے جس کے سپاہی شوہر کو اسلام آباد میں قتل کر دیا گیا۔ کراچی والوں کو جمہوریت کا

MashalBooks.org

تجربہ کچھ اس طرح ہوا کہ پہلے تو انہوں نے اسے محض ڈھکوسلہ سمجھا اور پھر ایک المیہ۔ میں نے جو دوسری جگہیں دیکھیں، یہ احساس وہاں بھی تقویت پا رہا ہے۔ کشمیر کی طرح کراچی میں بھی زندگی گھناؤنی، سفاکانہ اور غیر یقینی ہو چکی ہے، باقی رہے ملک کے دوسرے حصے تو ان کے بارے میں آپ ہی بتائیں گے۔

(”ڈان“ 28 مئی 1995ء)

MashalBooks.org

کراچی کی جنگ کے بعد

کراچی کی جنگ ختم ہونے کو آئی ہے۔ ایک سیاسی حل کے لئے ایم کیو ایم کی تاخیر سے آمادگی اور حکومت کی طرف سے محتاط رویہ کہ بات چیت بھی اور جنگ بھی' یہ دو علامتیں ہیں۔ ایک تیسری بات ایم کیو ایم کی قیادت اور کارکنوں میں کمی اور چوتھی بات' ایک انتہائی غم انگیز علامت وہ بے پایاں اذیت ہے جو کراچی کے بیچارے شہری ایم کیو ایم اور حکومت دونوں کے ہاتھوں برداشت کر رہے ہیں۔ سکون کے لئے ان کی بیتابی سمجھ میں آتی ہے۔

اس کے اختتام تک پہنچنے کے لئے پانچ واضح خطوط نظر آتے ہیں۔

اول' حکومت نے ایم کیو ایم (الطاف) کو فوجی طور پر کچل ڈالا ہے۔ دوئم' ایم کیو ایم اب تک جس طرح برقرار ہے' وہ یا تو کچھ عرصے کے لئے ختم ہو جائے گی یا ایک ایسا ادارہ بن کر رہ جائے گی' جو سرے سے مفلوج ہوگا' جس کے ارکان کچھ آزردہ نوجوان ہوں گے' انتقام اور تشدد پر آمادہ۔ سوئم۔ اس "فوجی حل" سے کوئی سیاسی فائدہ حاصل نہ ہوگا' ایسا حل جو انسانی اور سیاسی زندگی کے زیاں کی تلافی کر سکے۔ اس کے برعکس جو محدود فوائد حاصل ہوں گے۔ "فوجی حل" کی لائی ہوئی ذمہ داریاں' اس سے زیادہ ہو سکتی ہیں۔ چہارم' اس کے بعد جو حالات پیدا ہوں گے' ان کا بھاری مطالبہ یہ ہوگا کہ اب زیادہ تدبر اور جمہوری نظام حکومت سے کام لیا جائے اور ان کی پاکستان میں پہلے ہی قلت ہے۔ پنجم' چونکہ اصلاح اور تعمیر نو کی جگہ اندیشہ یہ ہے کہ زیادہ سنگ دلی اور کرپشن کا دور دورہ ہوگا اس لئے یہ ملک ایک بار پھر اپنے ہاتھوں کے لگائے ہوئے زخم کا شکار ہوگا اور اس مرتبہ پہلے کے مقابلے میں بحالی زیادہ دیر طلب ہوگی۔

ایم کیو ایم (الطاف) کی مسلح محاذ آرائی' پیش بینی کے مطابق طاقت گنوا بیٹھی ہے۔ بس یہ ہے کہ بیشتر مبصر جس مدت کی توقع کرتے تھے اس سے پہلے ہی' یہ سب کچھ ہو گیا۔ تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ مسلح جدوجہد شہر کے اندر کامیاب ہوئی ہو جب تک کہ اس کی پشت پر اس سے بڑی جدوجہد جو نواحی دیہات میں ہو رہی ہو' کارفرما نہ ہو۔ چین کے کمیونسٹوں نے یہ سبق شنگھائی میں سیکھا' چنانچہ ماؤ نے اس وقت تک شہر میں کوئی نمایاں پیش قدمی اس وقت تک نہیں کی جب تک اس کے گوریلا دستوں نے' شہر کا پوری طرح محاصرہ نہیں کر لیا۔ جب انہوں نے بیجنگ اور شنگھائی پر پوری طرح قبضہ کر لیا' تب دوسرے علاقے ان کے لئے تر نوالہ بن گئے۔ اسی طرح فیڈل کاسترو اور چی گویرا نے اپنی لمبی دوڑ کو ہوانا اور سینٹیاگو تک ہی محدود رکھا۔ جس طرح عام شورش ماسکو اور سینٹ پیٹرز برگ میں' اکتوبر 1917ء میں ہوئی یا تہران اور تبریز میں

۱۹۷۸ء میں ہوئی' سیاسی طور پر پختہ کار لوگ اس سے کمتر صورت حال میں شہر کے اندر رکاوٹیں کھڑی نہیں کرتے اور نہ آگ لگاتے پھرتے ہیں اور جب ایسا کرتے ہیں تو اس کی بھاری قیمت دینی پڑتی ہے۔

شہر کے اندر لڑی جانے والی بیسویں صدی کی سب سے بڑی جنگ ایف ایل این نے لڑی تھی۔ جنگ الجزائر جس کے تذکرے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں' جسے لاکھوں افراد نے گیلو پونیکر وو (Gilo Pontecorvo) کی کلاسیکی بنیادی فلم میں دیکھا۔ ایف ایل این کو الجزائر کے عوام کی بھرپور حمایت حاصل تھی اور یہ ایک انقلابی تنظیم تھی' جو سوئس گھڑیوں کی طرح کام کرتی تھی۔ فرانسیسی فوج نے بھاری قیمت تو ادا کی' لیکن بالآخر دو سال سے بھی کم مدت کے اندر' اس نے الجزائر میں ایف ایل این کی طاقت کو توڑ دیا۔ الجزائر نے شہر کے اندر وقت سے پہلے جنگ چھیڑنے کی بہت بھاری قیمت ادا کی تھی' اس میں اس کے انقلابی عمل کی غلط اندیشی شامل تھی۔ لیکن آخر کار ایف ایل این نے الجزائر کو آزادی کی منزل تک پہنچا دیا کیونکہ دیہی علاقوں میں اس کی فوجیں مستعد کھڑی تھیں اور وہ فرانس کے ساتھ نہایت ذہانت کے ساتھ بات چیت جاری رکھتے ہوئے سیاسی لڑائی برابر جیت رہا تھا۔

اس سے کمتر درجے کی تحریکوں کو ایسی قیمت نہیں ملی۔ ٹوپاماروز (Tupamaros) کے نوجوان نہائت تعلیم یافتہ' ذہین اور معاملہ فہم تھے' لیکن سی آئی اے نے اپنی ریشہ دوانی سے اور یوراگوئے حکومت کی اپنی سفاکی سے ان سب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ کوسٹا گورس (Costa Gavras) کی تاثراتی فلم اسٹیٹ آف سیج' (State of Siege) میں آپ ان کی شاندار منصوبہ بندی' اور کام کے نفیس طریقوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ یہ ماری گیلا (Mariguella's) کے شہری گوریلے تھے' جن کی جڑیں برازیل کے پس ماندہ طبقوں میں پیوست تھیں' خاص طور پر ساؤ پالو (Sao Paulo) جیسے شہر میں' لیکن وہ بھی آدھے سال کے اندر اور بھی زیادہ آسانی کے ساتھ' عام گرفتاریوں' ایذا رسانیوں' گھر گھر تلاشیوں اور رہائشی بستیوں میں چھاپوں کے ذریعے ختم کر دی گئی۔ یاد رہے کہ تحت گیر فوجی حکومتوں نے برازیل اور یوراگوئے میں سفاکانہ کارروائی کا سیاسی جواز بغاوت فرو کرنا بتایا تھا۔ ناکام شہری جنگوں کی تاریخ میں ایک استثنا آئی آر اے کی جدوجہد ہے۔ اس نے تاریخ میں طویل ترین مسلح محاذ آرائی کی مثال پیش کی ہے۔ اس مثال پر ہم گفتگو بعد میں کریں گے۔

ناکام شہری تحریکوں کے ان مقابر میں ایم کیو ایم کا مقام کہاں ہے؟ میرے حساب سے بہت کم حیثیت ہے۔ پچھلے چار مہینوں میں اس نے ناکافی حکمت عملی' بصیرت میں کمی اور گھروں میں چھپ کر وار کرنے کی ذہنیت کا ثبوت دیا ہے۔ گھروں سے نکل کر وہ قریبی پولیس والوں' مقامی حریفوں اور بے گناہ راہگیروں پر وار کرتی ہے۔ اس کی ناکامیابی بے اندازہ ہے۔ یہ انقلابی جماعت نہیں ہے اور صاف ظاہر ہے کہ مسلح بغاوت کے بالکل ابتدائی اصولوں سے بھی نابلد ہے۔ یہ ایک طرح کا ملغوبہ ہے' پارلیمانی' لسانی' مسلح

غنڈہ گردی اور زبردستی رقم بٹورنے کی کارروائی ان سب کا ملا جلا ملغوبہ جس کے سیاسی مقاصد پوری طرح واضح نہیں بلکہ شخصیتوں کی اطاعت کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے اور اس احساس کے تحت کہ وہ ستم رسیدہ ہیں۔

اس طرح کی تنظیموں کی ساخت میں اوپر کا ڈھانچا نہایت سخت اور ذیلی ادارے ساخت میں نرم ہوتے ہیں۔ کمزوروں کو ڈرانے دھمکانے اور ڈھل مل یقین لوگوں کو ہراساں کرنے کی حد تک یہ کامیاب رہتی ہیں۔ لیکن ایک ریاست جو اپنے ارادے میں محکم ہو اور بے رحم بھی اس کے آگے ٹوٹ جاتی ہیں۔ صریح طور پر طے شدہ سیاسی مقاصد اور مرکزی نکات جب سامنے نہ ہوں تو یہ چاٹ مسالے جیسی ملی جلی سیاست چلاتی ہیں۔ چنانچہ ایم کیو ایم نے سات سال کے اندر انتخابات میں حصہ لیا اور ان میں جو اہم ترین تھا اسی کا بائیکاٹ کیا؛ اخبارات کو اپنی مخالف خبروں کی اشاعت سے ڈرا دھمکا کر روکا؛ جن صحافیوں نے ان کی بات نہیں سنی ان کو مارا پیٹا؛ یہاں تک کہ ایدھی ویلفیئر ٹرسٹ پر بھی حملہ کیا جو آج کراچی کی غالباً ایک ہی تنظیم ہے جو زخمیوں کی جان بچاتی ہے اور مرنے والوں کو شمار میں لاتی ہے۔ گلی کوچوں میں ایک طویل عرصے تک طاقت آزمائی کی وجہ سے ایم کیو ایم نے ملک کو سارے ہوش مند لوگوں کو اپنے آپ سے دور کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ ایسی جماعتیں جو سیاسی پروگرام کی پابندی اور رائے دہندوں کی شمولیت کی بجائے، شخصیت پرستی پر یقین رکھتی ہیں؛ طویل جدوجہد میں زیادہ عرصے تک سرگرم اور ثابت قدم نہیں رہتیں۔ ان کے لیڈر اور عام کارکن دباؤ پڑنے پر ٹوٹ جاتے ہیں۔ مخالفوں سے سودا بازی کر لیتے ہیں اور اپنے سربراہ اعلیٰ کی نقل کرتے ہوئے خود سربراہ بن جاتے ہیں۔ شخصیت پرستی کی سیاست میں "حقیقیوں" کی تعداد لازماً بڑھتی جاتی ہے۔

آئی آر اے اور ایم کیو ایم کا تقابل شاید کچھ سبق آموز ہو۔ آئی آر اے کی طرح ایم کیو ایم ایک لسانی تنظیم ہے جس کا مقصد ایک خاص کمیونٹی یا گروہ کی شکایات کا ازالہ کرنا ہے۔ آئی آر اے کی طرح اس نے بھی پارلیمانی سیاست کو منظم تشدد کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ آئی آر اے کی طرح یہ بھی چندہ اکٹھا کرنے میں سرگرم ہے؛ رضاکارانہ بھی اور جبری بھی۔ اس کے بعد ان دونوں کے درمیان فرق سامنے آتے ہیں۔ آئی آر اے کی قیادت ایک ادارے کے تابع ہے؛ شخصی نہیں۔ ایک ایسی حقیقت جس کے متنوع نتائج ہیں۔ اس پارٹی کی ایک سیاسی شاخ ہے شین فین (Sinn Fein) جو فوجی شاخ پر اپنی گرفت رکھتی ہے؛ اس پر ڈسپلن نافذ کرتی ہے اس کی وفاداری کسی فرد کے ساتھ نہیں بلکہ ایک سیاسی پروگرام اور ادارے کے ساتھ ہے۔ اس وجہ سے اس نے آئرلینڈ کے دانش وروں کی حمایت حاصل کر لی ہے۔ اس کے حمایتی متوسط اور بالائی طبقوں کے لوگ بھی ہیں۔ (اس کے مقابلے میں اردو بولنے والے دانشور اور تعلیم یافتہ طبقے بڑی حد تک ایم کیو ایم سے دور رہے ہیں) اگر کوئی آئرلینڈ کا لیڈر ملک سے فرار ہوا (اگرچہ میرے علم میں ایسی کوئی نمایاں شخصیت نہیں) یا جیل چلا گیا ہو تو اس کی غیر حاضری سے نہ تو اس تنظیم میں تفرقہ پڑا؛ نہ ان کے حوصلے پست ہوئے نہ تنظیم میں

بھی پیدا ہوئی۔ آئی آر اے کے کارکن اپنے عہد میں ثابت قدم رہے' چنانچہ انہوں نے جیل میں بھوک ہڑتال تا مرگ کی۔ ان کی اس خود اختیاری اذیت اور کلفت نے ساری دنیا کے ضمیر کو بیدار کر دیا۔

ایسی شہری تنظیموں کے درمیان جنہوں نے ریاست سے مسلح جنگ کی' ایم کیو ایم کمزور اور بے اثر معلوم ہوتی ہے۔ جب فوج نے آپریشن کلین اپ شروع کیا تو کم از کم اس وقت ایم کیو ایم نے اپنی کمزوری کا صحیح اندازہ کیا اور کھل کر مقابلہ کرنے سے گریز کیا' اس طرح اس نے اپنے بہت سے وسائل بچا لئے' لیکن اس وقت اپنی طاقت کو بروئے کار لانے میں ناکام رہی جب اس نے پاکستان کی تاریخ کے سب سے زیادہ صاف ستھرے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔ اس نے اپنی سیاسی کمزوری ظاہر کر دی اور جب اپنے جلاوطن لیڈر کی سہولت کے بموجب' برسوں بعد پیدا ہونے والے بہترین سیاسی مواقع ضائع کر دیئے تو اس طرح سیاست میں شخصیت پرستی کی قیمت ادا کر دی۔

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایم کیو ایم پر خاصی مار پڑ چکی ہے' کبھی کبھار غرانے کے بعد' اس کا امکان زیادہ ہے کہ وہ اپنے زخم چاٹتی رہے گی اور کچھ عرصے بعد خاموشی سے کراچی واپس آ جائے گی' لیکن صرف اس صورت میں کہ حکومت اس کے بیانات کو جو خود اس کی تسکین کے لئے ہوتے ہیں' خوش دلی سے سن لے گی چنداں اہمیت نہیں دے گی۔ اس امکان سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے مایوسی ہوتی ہے اور اس کی بھی وجہ ہے کیونکہ متعلقہ حکومتوں نے اب تک ان اسباب کو سمجھنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جن کے ہوتے ہوئے پاکستان کی سب سے زیادہ خواندہ اور متمدن پاکستانی کمیونٹی ایم کیو ایم جیسی خیال پرست تحریک کے پیچھے چل پڑی۔

تیز رفتار سماجی ترقی کے زمانے میں حکومت کو جو چیلنج درپیش ہوتے ہیں' ان سے نپٹنے کے اہل عام طور پر ایسے لیڈر نہیں ہوتے جن کا جاگیردارانہ پس منظر ہو اور جو معاشرہ کے پیداواری عمل میں شامل نہ ہوں۔ وہ دنیا کو طاقت کی رنگین عینک سے دیکھتے ہیں' سیاسی عمل کے حوالے سے نہیں اور نسلی برتری کے زعم میں' نہ کہ شہریت کی بنیاد پر اور جدید نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ جاگیردارانہ پس منظر میں۔ پاکستان کے دیگر سیاست دانوں کے برعکس بے نظیر بھٹو دوہرے ورثے کی مالک ہیں' جاگیردارانہ اور جدید فکر دونوں کی' جیسا کہ ایک بار ئین بروما (Ian Buruma) نے لکھا تھا' ہارورڈ اور لاڑکانہ' کراچی اور دیہی سندھ ان سب کا مرکب۔ پاکستان کے شہری امید رکھتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ کم از کم اب وہ ایک جدید رہنما ہونے کے ناطے کراچی کے چیلنج کا سامنا کریں گی۔ اس میں کئی پیش قدمی درکار ہوگی۔ (۱) ریاستی انتظامیہ کو لاقانونیت کے جراثیم سے پاک کرنا اور طاقت کے ناجائز استعمال کو روکنا جو کراچی میں بہت ہے۔ (۲) کراچی کے لوگوں کو رائے دہی کے عمل میں شریک کیا جائے تاکہ کراچی ایک خود انتظامی شہر بن جائے۔ (۳) ہر سمت میں تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے درمیان افتراق کو دور کرنا اور خدمتی اداروں کی منجمد مشنری کو حرکت میں لانا۔

MashalBooks.org

جب حکومت قانون شکنی کرنے لگے

میں نے گذشتہ ہفتے (ڈان ۱۷ اگست) اسی کالم میں اس سوال پر گفتگو کی تھی کہ حکومت کیا واقعی کراچی کا بحران ختم کرنا چاہتی ہے اور اگر وہ اس سلسلے میں واقعی سنجیدہ ہے تو اسے ایک تین نکاتی پالیسی پر فوراً عمل کرنا ہوگا۔ (۱) قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں سے لاقانونیت اور اختیارات کے غلط استعمال کا رویہ ختم کرنا ہوگا۔ (۲) کراچی کے شہریوں کو ان کا حق رائے دہی دینا ہوگا اور انہیں یہ اختیار دینا ہوگا کہ اپنی ایک منتخب اور بااختیار شہری حکومت قائم کریں۔ (۳) کراچی کی بڑھتی ہوئی آبادی اور بنیادی شہری سہولتوں کے درمیان اور وہ سہولتیں جو بالکل ناکارہ اور زوال آمادہ ہیں بڑھتے ہوئے بھیانک فاصلے کو ختم کیا جائے۔ پہلا سوال جس کا تعلق قانون کے محافظوں کے ہاتھوں قانون کی بے حرمتی سے ہے میں اس وقت اس کی وضاحت کروں گا۔

سیاست کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ قانون کی عمل داری اور ریاست کے حق حکمرانی کے درمیان ایک فطری تعلق پایا جاتا ہے' جب حکومتیں قانون توڑتی ہیں تو وہ ریاست کی بنیادوں پر ہی ضرب لگاتی ہیں اور شہری زندگی کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ اس کے باوجود حکومتیں' اور ان میں جمہوری حکومتیں بھی شامل ہیں اکثر اوقات قانون توڑتی ہیں' خاص طور پر اس وقت جب جنگ ہو رہی ہو یا ملک اندرونی خلفشار میں مبتلا ہو۔ جمہوری ملکوں میں اخبارات اس طرح کی قانون شکنی کا پردہ چاک کرتے ہوئے بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں' حزب اختلاف غلط کار حکومت پر کڑی نظر رکھتی ہے۔ عدلیہ فوراً مداخلت کرتی ہے' خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دیتی ہے اور قانون کی عملداری کو باقاعدہ نافذ کرتی ہے اور اکثریوں بھی ہوتا ہے کہ جب پبلک کا احتجاج عام ہو جائے تو قانون شکنی کے واقعات کی چھان بین اور اس کے ذمہ داروں کو سزا دینا لازمی ہو جاتا ہے۔

فرانس کی فوجوں نے الجزائر میں جب فوجی کارروائی کی تو اس دوران میں قیدیوں کو حراست میں رکھتے ہوئے ایذائیں پہنچائی گئیں اور ان کو قتل بھی کیا گیا۔ جب ہنری ایلغ نے اپنی دستاویز (سوال یہ ہے (The Question) لکھی جس میں اپنے اوپر ہونے والے سارے مظالم بے کم و کاست بیان کر دیے تو اس وقت تک جمیلہ بوپاشا کی سرگذشت بھی عام ہو چکی تھی پھر لاربی بن ایم ہیدی کو جیل میں ہلاک کیا جا چکا تھا۔ ان سارے واقعات کے ہوتے ہوئے فرانس میں آزاد خیال رائے عامہ اس وقت تک خاصی بیدار ہو چکی تھی۔ اس کے نتیجے میں جو چیخ و پکار ہوئی۔ اس سے فرانسیسی حکومت کے رویے پر کچھ زیادہ اثر نہیں پڑا'

MashalBooks.org

لیکن پھر یہ ہوا کہ فرانسیسی حکومت اپنے داخلی کھوکھلے پن کے ہاتھوں ڈھے گئی' چنانچہ مرمت اور صفائی کا آئندہ کام چارلس ڈیگال کو کرنا پڑا۔ اس میں اعلیٰ عہدیداروں کے خلاف عدالتی کارروائی اور سزائیں بھی شامل ہیں اور ان سزا پانے والوں میں جنرل رول سلان بھی شامل تھے۔ ویت نام کی جنگ کے زمانے میں امریکہ کے طالب علموں' دانشوروں اور پادریوں نے ویت نام میں امریکی حکومت کے مظالم کے خلاف اور اس امر پر بھی کہ ان کی حکومت نے اپنے یہاں بھی جمہوری اصولوں سے انحراف کیا' زبردست احتجاج کیا۔ جلد ہی ذرائع ابلاغ کی آواز بھی اس احتجاج میں شامل ہوگئی۔ پھر قانون کے اداروں کے اعلیٰ حکام بھی ضمیر کی پاسداری کی خاطر اپنی نوکریاں داؤ پر لگا کر ریاست کے ساتھ اپنی وفاداری کا عہد نباہتے ہوئے اس احتجاج میں شامل ہو گئے۔ پھر حکومت نے اپنا منہ چھپانے کے لئے اس طرح سہارا ڈھونڈا کہ لیفٹیننٹ کیلی پر مائی وائی کے وحشیانہ قتل میں حصہ لینے کے جرم میں مقدمہ چلا دیا۔ امریکہ کی حکومتی انتظامیہ کی جانب سے قانون کی بے حرمتی اس وقت انتہا پر پہنچ گئی جب واٹر گیٹ کا اسکینڈل سامنے آیا۔ تب رچرڈ نکسن کو استعفیٰ دینا پڑا۔ ان کے نائبین پر مقدمہ چلایا گیا' ان میں وہائٹ ہاؤس کے چیف آف اسٹاف رابرٹ ہالڈ مین اور اٹارنی جنرل جان مچل بھی شامل تھے۔ تطہیر کے اس عمل سے امریکی ریاست اور امریکی جمہوریت کو بہت فائدہ پہنچا' لیکن یہ سب کچھ محدود طور پر اور تاخیر سے ہوا۔

پاکستان چالیس سال سے حکمرانی کے جواز سے محروم چلا آ رہا ہے۔ وہ ریاست جو ۱۹۴۷ء میں قائم ہوئی تھی اس کا نصف حصہ وفاق سے ٹوٹ کر الگ ہو گیا۔ اس کے بعد سے ملک میں کبھی پارلیمانی حکومتیں قائم ہوئیں' کبھی فوجی آمریتیں حکمران بن گئیں۔ ایک ریاست جو اتنی کمزور ہو اتنے بڑے پیمانے پر اور پارلیمانی حکومت کے زیر سایہ قانون کی حکمرانی کی توہین نہیں کر سکتی۔ موجودہ صورت حال میں حکومت کی جانب سے قانون اور آئین سے انحراف کا مطلب یہ سمجھا جائے گا کہ یہ نہ صرف انسانی حقوق میں مداخلت ہے اور یقیناً مواخذے کے قابل ہے بلکہ ریاست اور جمہوریت کی بنیادوں پر بھی راست حملہ ہے۔ لیکن کراچی میں بھی نہایت وسیع پیمانے پر یہ خلاف ورزیاں ہوتی آئی ہیں اور جب پاکستان میں انسانی حقوق کی انجمن نے اور ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اس سلسلے میں اپیلیں کیں تو سندھ اور مرکز دونوں کی حکومتوں نے جنرل محمد ضیاء الحق کے زمانے کی یاد تازہ کرتے ہوئے ہر مرتبہ انکار میں بیان دے دیا کہ کوئی خلاف ورزی نہیں ہوئی۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ ایم کیو ایم کے خلاف لڑائی لڑتے ہوئے سندھ اور پاکستان کی حکومتوں نے ایم کیو ایم حقیقی کے گروپ کی علیحدگی میں برابر حصہ لیا۔ اس گروپ کے لیڈر اور اس کے رضاکار ایم کیو ایم کے تشدد آزما شعبے میں سب سے زیادہ جابر اور سفاک شمار ہوتے تھے۔ کراچی میں جو بات عام لوگوں کے علم میں ہے اور جس کی تصدیق اخبارات اور حقوق انسانی کی انجمنیں بھی کرتی ہیں کہ ایم کیو ایم (الطاف) کی طرح ایم کیو ایم حقیقی بھی دہشت گردی اور جبری بھتہ خوری میں شامل ہے لیکن حکومت ایک گروپ کو تو

MashalBooks.org

برداشت کر رہی ہے اور دوسری کو نشانہ بنا رہی ہے اور یہ ایسی حقیقت ہے جس سے حکومتی اختیارات کی کوئی قدر باقی نہیں رہتی کیونکہ اس طرح وہ قانون کی محافظ نہیں بلکہ جرائم میں شریک بن جاتی ہے۔ باخبر ذرائع کا کہنا ہے کہ مشین گنوں سے لیس پک اپ پر سوار لانڈھی میں گشت کرتے ہوئے حقیقی ادھر نظر نہیں آتے اور جبری رقوم کی وصولی کا کاروبار وہ جس شدومد سے چلا رہے تھے اس میں بھی قدرے کمی ہوئی ہے۔ یہ اچھا ہوا لیکن حکومت کی حیثیت کی بحالی کے لئے محض اس قدر کافی نہیں۔ اگر بے نظیر بھٹو اور ان کے وزیر داخلہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی طرف سے قانون کے احترام کا جو دعویٰ کیا جا رہا ہے عام لوگ اس پر یقین کرنے لگیں تو انہیں ایم کیو ایم حقیقی سے اپنا تعلق ختم کرنا ہوگا اور انہوں نے مبینہ طور پر جو جرائم کئے اور جن کے بارے میں دور تک کہا جا رہا ہے ان کی بنیاد پر مجرموں کے خلاف مقدمہ چلانا ہوگا۔ ریاست کے اقتدار کی بحالی کے لئے جو چند اقدامات ضروری ہیں' ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

غیر جانبدار مبصر نیز وہ لوگ بھی جو کراچی میں حکومت کی زیادتیوں کا شکار ہو چکے ہیں' اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ رینجرز اور پولیس والے پابندی کے ساتھ اور وسیع پیمانے پر عام شہریوں کو ہراساں کرتے ہیں' ان پر اجتماعی جرمانے لگاتے ہیں' ان سے رقم اینٹھتے ہیں' اقبالی بیانات جبری طور پر لیتے ہیں عورتوں کی بے آبروئی کرتے ہیں' اجتماعی طور پر گرفتاریاں عمل میں لاتے ہیں' پولیس حراست میں موجود لوگوں کو ایذا دیتی ہے اور قتل بھی کر دیتی ہے۔ بعض مثالوں میں تو خود حکومت نے ان زیاتیوں کی گواہی دی ہے۔ چنانچہ ایمنسٹی کی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق تین "گمشدہ" افراد جن میں ایم کیو ایم کے سینیٹر زاہد اختر بھی شامل تھے ریاست کی (تسلیم شدہ) حراست سے نکل کر سامنے آ گئے اور انہیں سرکاری ٹی وی چینل پر اس طرح دکھایا گیا کہ دہشت گردی کے بہت سے واقعات کا اقرار کر رہے تھے۔ اسٹالن کے بدترین دنوں کی یاد آ گئی اور سر گھومنے لگا۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ حکومت کے حکام قانون اور اخلاقیات کی بنیادی اور معمولی باتوں سے بھی کس قدر بے نیاز ہیں۔

پھر کچھ دوسرے معاملات ہیں' جیسے سبزواری اور فاروق دادا کے ساتھ سلوک' جن کی تقدیر کچھ الجزائر کے لاربی بن ایم ہیدی سے ملتی جلتی ہے۔ ان کے لئے پبلک کا ردعمل سامنے آیا' یہاں تک کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے حکومت کی توجہ ان کی طرف مبذول کرائی۔ ایمنسٹی کی اپیل کے جواب میں وفاق کے نائب وزیر قانون نے ہر طرح کی زیادتیوں سے انکار کیا اور ایمنسٹی پر جانب داری برتنے کا الزام لگایا۔ اس طرح کے تردیدی بیانات سے ملک میں اور بیرون ملک بھی بھٹو حکومت کی حیثیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

کراچی کے ایک حالیہ دورے میں میں نے فاروق دادا کے بارے میں معلوم کرنا چاہا۔ حکومت کے اس دعوے پر شک کرنے کے واضح اسباب موجود ہیں کہ فاروق دادا اور اس کے تین ساتھی پولیس مقابلے میں مارے گئے۔ ہمسایوں اور خاندان کے افراد کا بیان ہے کہ انہیں مبینہ پولیس مقابلے سے دو دن

قبل گرفتار کیا گیا تھا۔ حکومت کا یہ دعویٰ کہ دونوں طرف سے گولیوں کا شدید مقابلہ ہوا' اس لئے درست نہیں کہ اس واقعے کا کوئی گواہ موجود نہیں۔ وہ سوزوکی وین جس کی نمائش حکومت نے کی اتنے آدمیوں کے لئے اور اس اسلحہ کے ساتھ جسے دکھایا گیا' بہت چھوٹی تھی۔ تاہم اس معاملے میں اور ایسے ہی ہزاروں معاملات میں حقیقت حال کبھی واضح نہیں ہوگی جب تک ذمہ دارانہ انداز سے عدالتی تفتیش نہ ہو۔ انصاف کے تقاضے اس وقت تک پورے نہیں ہوں گے جب تک یہ محاسبہ نہ ہو کہ کون لوگ پکڑے گئے اور کن کو سزائیں ہوئیں یا رہا کردیے گئے۔

شہر کے گنجان آباد اضلاع میں شورش کو دبانے کی مہم جس انداز سے جاری رہی ہے وہ سرکاری کارروائی کا سب سے تشویشناک پہلو ہے۔ یہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ فرانس نے الجزائر میں اور امریکہ نے ویت نام میں اپنی مہمیں جاری رکھی تھیں کہ "تلاش کرو اور تباہ کردو" یا جس طرح پاکستان نے مشرقی پاکستان میں اپریل' مئی اور جون ۱۹۷۱ء کے مہینوں میں "پولیس" کارروائی کی تھی۔ اب وہ تمام افسر اور اہلکار جو برسر عمل ہیں اردو بولنے والے تمام شہریوں کو اپنا صحیح ہدف جانتے ہیں۔ محلوں کے محاصرے اور تلاشی کے دوران میں اکثر اوقات گھروں کو لوٹ لیا گیا اور بارہ سال سے ۶۵ سال کی عمر تک جو بھی مرد پائے گئے انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ مارا پیٹا گیا' بعض افراد کو شدید ایذا دی گئی اور خوش نصیب وہ تھے جنہیں چھوڑ دیا گیا ان میں سے بیشتر کا تعلق کم آمدنی والے طبقے سے تھا' جن کے تہی دست خاندانوں نے پندرہ ہزار روپے تک رشوت دی۔ پولیس مارنے پیٹنے کے بعد لسانی تعلق سے بھی اہانت کرتی اور گالیاں دیتی رہی ہے۔

کتنے معصوم شہری سرکاری ایذا دہی اور لسانی تضحیک کے شکنجے میں کسے گئے؟ ایک ذمہ دارانہ تفتیش کے بغیر اس کا ہمیں کبھی علم نہیں ہوگا اور نہ حکومت اپنے لگائے ہوئے زخموں پر اندمال کا مرہم رکھ سکے گی۔ کراچی کے متاثرہ علاقوں میں جب سر راہ چلتے ہوئے لوگوں سے پوچھا گیا۔ ان میں ڈاکئے اور ایمبولینس ڈرائیور شامل تھے تو معلوم ہوا کہ ان کے ساتھ رامپور' بھوپال' یو پی' بہار یا ان سے بھی بدتر صورت میں ایم کیو ایم والا سلوک کیا گیا۔ اس سارے عمل کا نتیجہ واضح تھا۔ مقصد یہ تھا کہ ایم کیو ایم کو ہتھوڑے مار کر کچل ڈالا جائے۔ لیکن اس عمل نے سیاسی طور پر ایم کیو ایم کو زیادہ وسیع پیمانے پر اور پہلے سے زیادہ تعداد میں اپنے حمائتی فراہم کر دیئے ہیں' جو حکومت کے خلاف غم و غصے سے بھرے ہوئے ہیں۔ جب تک حکومت اس رجحان کا رخ موڑنے کے لئے ہوش مندی سے کام نہیں لے گی اس ملک میں نفرت اور تشدد کی فصل لہلہاتی رہے گی۔

اپنے گذشتہ مضمون میں' میں نے اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ ایم کیو ایم سیاسی طور پر اور تشدد کے استعمال میں ایک ناقص اور نااہل تنظیم ہے میرا اندازہ اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔ لیکن کراچی کے ایک حالیہ دورے میں مجھ پر ایک اور حقیقت جو نہایت تشویش انگیز ہے واضح ہوئی اور وہ یہ کہ ایم کیو ایم کی ناکامی اور

MashalBooks.org

اندھی فوج گردی سے تو سندھ اور پاکستان کی حکومتیں بھی بازی لے گئیں۔ جب تک انہوں نے اپنا رخ نہ بدلا پاکستان کا المیہ شدید تر ہوتا جائے گا۔

(''ڈان'' 27 اگست 1995ء)

نوشتۂ دیوار

کچھ ہی دنوں پہلے' کچھ دردمند دوست ہاتھ آئی لینڈ کے ایک مکان میں کراچی کے بحران پر بات چیت کر رہے تھے۔ جب تک وہ سوالات اٹھاتے رہے' میں لبنان کے بارے میں سوچتا رہا۔ کراچی کے مقابلے میں ایک چھوٹا اور زیادہ جدید شہر' جہاں پاکستان سے زیادہ بہتر طور پر حکومت کی جا سکتی ہے۔ تو بیروت سے ہی بات شروع کرتے ہیں جہاں یہ سب کچھ ہوا۔

کراچی 1980ء میں جتنا بڑا تھا' بیروت 1970ء میں اس سے چھوٹا تھا اور اب بھی سوائے اس کے طول وعرض کے چھوٹا ہے۔ وہ شرق کے عرب کا تجارتی دارالحکومت تھا۔ یہ ایک بڑی آبادی کا علاقہ تھا' جہاں نہایت مختلف لوگ پرامن طریقہ سے زندگی گزار رہے تھے' تا آنکہ کچھ اندرونی اور کچھ بیرونی طاقتوں نے رفتہ رفتہ ان سب کو ایک دوسرے کے خلاف صف آراء کر دیا' یہ ایک بڑھتی ہوئی آبادی کا علاقہ تھا جس میں شہری سہولتیں تیز رفتار شرح آبادی کے مقابلے میں رینگ رینگ کر چل رہی تھیں۔ یہاں بے خانماں فلسطینیوں نے پناہ لی تھی' جن کو پہلے تو خوش آمدید کہا گیا' بعد میں ان کا وجود مقامی لوگوں کو کھلنے لگا۔ یہ وہ شہر تھا' جہاں اسلحہ اور منشیات ہمسایہ ملکوں کی جنگوں کے نتیجے میں فراوانی سے گردش کر رہی تھیں۔ یہ وہ مقام تھا جہاں سیاست دانوں کے ذہن تشدد پر آ کر اٹک گئے تھے اور دہشت' سیاست پر حاوی ہو گئی تھی۔ ان سب کے سوا' کراچی کو نسبت پاکستان سے ہے' اس طرح بیروت وہ شہر تھا' جہاں لبنان کی ریاست اور معاشرے کے مرکزی تضادات آ کر مل گئے تھے' فساد اسی جگہ سے پھیلا' پھر اس نے قانونی طور پر نہیں' لیکن عملاً پورے لبنان کی ریاست کو تباہ کر دیا۔

مجھے یاد آتا ہے کہ 1986ء کا سال تھا' جب میں سات سال بعد کراچی آیا اور یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ پہلے والے بیروت سے یہ کس قدر ملتا جلتا ہے' جہاں اسی طرح کے طوفان کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ لاہور کے ایک روزنامے میں میرے دو مضامین جن میں آئندہ حالات سے متنبہ کیا گیا تھا' شائع ہوئے' لیکن آمر حکومت نے انہیں نظر انداز کر دیا۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ''جمہوریت پسند'' بھی انہیں نظر انداز کرنے میں اتنے ہی مستعد نکلے۔ خرابی رفتہ رفتہ بڑھتی گئی اور کراچی اب حیران کن حد تک 1977ء کے بیروت سے ملتا جلتا نظر آنے لگا ہے۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کا احوال ناظم حاجی صاحب سے پوچھئے' جو سٹیزن اینڈ پولیس لیژن کمیٹی (شہری' پولیس رابطہ کمیٹی) کے چار بانیوں میں سے ایک ہیں اور جنہوں نے زبردست رفاہی خدمت انجام دی

MashalBooks.org

ہے۔ وہاں کمرے میں جو لوگ بیٹھے تھے انہیں میرا جواب پسند نہیں آیا۔ اول جس طرح بیروت میں ہوا کہ سیاسی تشدد اور محاذ آرائی آپس میں مل گئے' اسی طرح کراچی میں بھی عناصر مجرمانہ دہشت گردی اور نجی مہم جوئی کے ساتھ جڑ گئے ہیں۔ سیاست اور جرائم کے درمیان فاصلہ دھندلا کر رہ گیا ہے اور مٹا جاتا ہے۔ عدم تحفظ کے مختلف واقعات کے علاوہ جو افراد اور خاندانوں کو درپیش ہوتے آئے ہیں' اندیشہ یہ ہے کہ یہی عمل ریاست اور معاشرے پر کہیں دیرپا اثرات نہ مرتب کرے۔ سیاست اور جرائم کی حدیں واضح طور پر نظر آنی چاہئیں' کیونکہ ریاست اور معاشرے دونوں کے اتحاد اور ہم آہنگی کی بنیاد اسی پر ہے۔

دوئم بیروت کی طرح کراچی میں بھی مسلح جتھہ بندی کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ جب یہی کام مختلف گروہ کریں تو تشدد تیزی سے پھیلنے لگتا ہے' اس وقت فوجی جتھے خاص طور پر شہری علاقوں میں ظاہر ہونے لگتے ہیں جو برابر دہشت گردی میں سرگرم رہتے ہیں۔ نسلی اور لسانی برادریاں جو پہلے ہی غیر مطمئن ہوتی ہیں نادار بستیوں کے مکین' بے روزگار نوجوانوں کے لشکر اور اسکولوں سے بھاگے ہوئے لڑکے' ان سب کو اپنی محرومیوں اور مایوسیوں کے نکاس کا راستہ مل جاتا ہے اور یہ سب مل کر کارروائیاں کرتے ہیں' انہیں جتھہ بندی میں شامل ہونے سے اپنی طاقت کا احساس ہوتا ہے اور یہ نفع بخش ہے۔

کراچی میں مسلح جتھہ بندی ایک منطقی سی بات ہے اور اس نے یہاں جڑ پکڑ لی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بعض علاقوں میں نوجوانوں کے گروہوں نے جو خود کو ایم کیو ایم کے جوان بتاتے ہیں' اس کے کنٹرول سے نکل کر اپنے طور پر کارروائیاں شروع کر رکھی ہیں۔ اسی طرح غیر اردو والوں کے مسلح جتھے بھی نکلتے آ رہے ہیں' مجرموں کے ایسے گروہ بھی پھیل رہے ہیں جن کی سرپرستی مجرموں کی مافیا کرتی ہے۔

سوئم' جب مسلح جتھے نکلتے آ رہے ہوں تو دور تک پھیلتے ہیں۔ شہر میں گنجائش محدود ہوتی ہے اور زیادہ سے زیادہ علاقے پر قبضے کے لئے مقابلہ بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ دعویدار نئی جگہوں پر اپنا تسلط جمانے کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔ فوجی جتھے ابتدا میں بڑی حد تک بیروت کے جنوب تک ہی مرکوز تھے لیکن انہوں نے رفتہ رفتہ پورے شہر پر قبضہ جما لیا۔ یہاں تک کہ مغربی بیروت کے آس پاس کا علاقہ جہاں ملی جلی لسانی نسبت رکھنے والی اشرافیہ رہتی تھی' وہ بھی ان کے تصرف میں چلا گیا۔ وزیراعظم بےنظیر بھٹو کراچی میں معمول کے حالات کی موجودگی پر خاصہ زور دیتی رہی ہیں اور یہاں آنے والے صحافیوں اور زعماء کو یہ بتاتی ہیں کہ کراچی کے چودہ اضلاع میں سے صرف پانچ تشدد سے متاثر ہیں۔ اب اگر ایسا ہو بھی تو ایسا ہمیشہ نہیں رہے گا' اگر یہ بحران اسی طرح باقی رہا' اور اگر حکومت نے اسے صرف تشدد سے حل کرنا چاہا تو یقیناً اسی طرح رہے گا اور کراچی میں تشدد کی لہر کلفٹن اور ڈیفنس تک پھیل جائے گی۔ پھر یہ ہو گا کہ متمول مکانوں کے آگے ریت کی بوریاں تلے اوپر دھری ہوں گی۔ دروازوں پر مسلح گارڈ ہوں گے اور بجلی کے نجی جنریٹر ہوں گے اور کراچی کی سوتی ملوں کا سارا نفع برنکس (Brinks) اور ایس ایم ایس کی محافظ ایجنسیاں بٹور کر لے جائیں گی۔

MashalBooks.org

چہارم، جب شہر کے ماحول میں منظم تشدد جگہ بنا لے اور طویل عرصے تک برقرار رہے تو ریاست کی سالمیت اور استحکام کی بنیادیں کھوکھلی ہونے لگتی ہیں۔ بیروت میں یہ عمل بڑی تیزی سے ہوا کیونکہ ریاست کے مخالف خاص طور پر فلانگی اور پی ایل او پولیس سے کہیں بہتر طور پر مسلح تھے اور فوج خود لسانی بنیاد پر آپس میں بٹ گئی تھی۔ کراچی میں یہ عمل بتدریج ہو رہا ہے۔ اتنا مخالف عناصر کے الگ ہونے کی وجہ سے نہیں، جتنا سرکاری کوتاہ اندیشی اور کرپشن کی وجہ سے جو متشددانہ کارروائیوں اور کرپشن کی وجہ سے لازماً پیدا ہوتی ہیں۔ کراچی میں جو علاقے دہشت اور تشدد سے متاثر ہوتے ہیں، ان میں نجی مسلح دستوں اور ریاستی فوجیوں کے درمیان فرق پہلے ہی دھندلا گیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ زیادہ تر شہری اب سیاسی اور نجی فوجی دستوں سے کہیں زیادہ قانون نافذ کرنے والی طاقتوں سے خوفزدہ رہنے لگے ہیں۔ یہاں تک کہ ڈیفنس، کلفٹن اور پی سی ایچ ایس جیسے متمول علاقوں میں رات گئے پولیس کو ڈاکہ ڈالتے ہوئے اکثر سنا گیا ہے۔ یہ وہ حقائق ہیں جو حکومت کے تردیدی بیانات سے بدل نہیں جاتے۔

پنجم، ریاست کے زوال میں ایک بنیادی تبدیلی اس وقت آ جاتی ہے، جب خاندان اور برادریاں اپنے تحفظ کے لئے نجی اور سیاسی مسلح جتھوں سے مدد مانگتی ہیں۔ یہ تبدیلی یقینی طور پر کراچی میں معمولی آمدنی والے علاقوں میں رونما ہو چکی ہے، جہاں شہر کی زیادہ تر آبادی رہتی ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ پاکستان کی خفیہ ایجنسیاں اور اس کی وزارت داخلہ کراچی میں بدلتی ہوئی اس صورت حال کی اہمیت سے اور اس کے کیف و کم سے واقف ہوں گی اور اس کیفیت سے بھی جو اس سے کمتر درجے میں سندھ کے دوسرے شہروں میں پائی جاتی ہے اور اگر وہ باعلم ہیں تو انہوں نے اپنی اطلاعات سے صدر پاکستان اور وزیراعظم اور ان کیا کابینہ کے ارکان کو بھی باخبر رکھا ہو گا۔

ششم، ریاستی اختیارات سے مسلح انکار اور لاقانونیت کا منطقی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہی بات شہر سے نکل کر پورے ملک میں پھیل جاتی ہے، جسے خود حکومتیں اور قوم کے مقتدر لوگ نظر انداز کرتے ہیں اور اس کا خمیازہ جھیلتے ہیں۔ 1977ء میں تریپولی کے مقتدر لوگوں نے جہاں سنیوں کی بالادستی تھی، بیروت کے بحران کو لاپروائی سے دیکھتے ہوئے نظر انداز کر دیا۔ یہاں تک کہ تشدد کی لہر خود تریپولی تک پہنچ گئی۔ کراچی کے معاملے میں لاہور اور اسلام آباد کی اشرافیہ کا رویہ اس سے بھی زیادہ بے نیازی کا ہے اور واقعی حیران کن ہے۔ لیکن کراچی کے اپنے صاحب اختیار لوگ کچھ اس سے بہتر نہیں۔ جس طرح آج کراچی میں ہو رہا ہے، اس طرح بیروت میں وہاں کی تاجر اور پیشہ ورانہ استعداد رکھنے والے مقتدر افراد ابھرتے ہوئے بحران پر بروقت توجہ نہ دے سکے، گویا ان کی ذمہ داری صرف اپنے اور افراد خاندان کے تحفظ تک محدود تھی۔ انہوں نے ریت کی بوریوں اور مسلح محافظوں پر بھی بھروسا نہیں کیا بلکہ جان بچانے کے لئے تریپولی، دمشق، قاہرہ اور قبرص چلے گئے۔ ٹھیک اسی طرح اسلام آباد اور لاہور میں آج کل وہ قیمتی گاڑیاں نظر آ جاتی ہیں، جن پر کراچی

MashalBooks.org

کی نمبر پلیٹ لگی ہوتی ہیں' لیکن بد قسمتی سے فرار مسائل میں اضافہ ہی کرتا ہے۔

ساتواں نکتہ یہ ہے کہ دیر تک رہنے والی منظم دہشت گردی کے نتیجے میں شہر اور شہری معاشرہ لسانی بنیادوں پر تقسیم ہو جاتے ہیں۔ لبنان کے بحران میں ابتداً صرف ایک فرقہ وارانہ جماعت ملوث تھی' جس نے پیری جمائل (Pierre Gemayel) اور اس کے بیٹے بشیر کی فسطائی اور انتہائی ذاتی نوعیت کی قیادت کے سائے میں میرون فرقے کو سمیٹ لیا تھا' جب بیروت کا بحران طول پکڑنے لگا اور فرقہ پرستی بڑھنے لگی تو یہ کیفیت پورے لبنان میں پھیل گئی اور پورا ملک فرقہ وارانہ فسادات کے دہکتے ہوئے الاؤ میں جلنے لگا۔

کراچی کا بحران ریاست اور ایم کیو ایم کے باہمی تصادم کے نتیجے میں شروع ہوا۔ یہ وہی پارٹی ہے جس کا کردار اپنی خصوصیات میں فلانگی آبادی سے ملتا جلتا ہے' لیکن شکر کا مقام ہے کہ اس میں وہ شدت نہیں اور اب سندھ میں پاکستان پیپلز پارٹی کا رویہ عملاً ایک فرقہ پرست سیاسی تنظیم کا سا ہے۔ کراچی کے اس بحران میں فرقہ وارانہ تنازعے ابھی پوری طرح داخل نہیں ہوئے' لیکن فرقہ وارانہ جذبات یقیناً سر اٹھا رہے ہیں۔ مزید بری بات یہ ہوئی کہ خود حکومت ایم کیو ایم پر دباؤ ڈالنے کے لئے فرقہ وارانہ تفرقوں کو بڑھاوا دے رہی ہے۔ اس کی ایک مثال میجر جنرل نصیر اللہ خاں بابر کا یہ علانیہ اور بے بنیاد الزام ہے کہ ایم کیو ایم کراچی میں "لسانی تطہیر" (یعنی دوسری زبانیں بولنے والوں کے خلاف کارروائی) میں ملوث ہے۔ اسی طرح حکومت سندھ کی یہ ناجائز اور ناشائستہ کوشش جس کے تحت وہ ایم کیو ایم کو ہزارہ سے آنے والے کئی افراد کے قتل کا ملزم قرار دے رہی ہے' تفرقہ اندازی کی دوسری مثال ہے۔ لیکن ان سب سے زیادہ اندوہناک ثبوت اردو بولنے والے شہریوں کے ساتھ پولیس اور رینجرز کا نہایت افسوسناک سلوک ہے۔ فرقہ پرستی' منظم دہشت گردی کی طرح وہ دیمکیں ہیں جو ریاست اور معاشرے کی بنیادوں کو چاٹ جاتی ہیں' جب نجی اور سیاسی گروہ علاقیت اور فرقہ پرستی پھیلانے لگیں تو یہ معاشرے کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ انہیں سختی سے مسترد کر دیں اور ریاست پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ایسے عناصر کو قانون کی حدود میں رکھیں' انہیں آگے نہ بڑھنے دیں۔ لیکن جب ریاست خود فرقہ واریت میں ملوث ہو جائے تو وہ ریاست کی بنیادوں پر ضرب لگاتی ہیں۔ بنگال میں جس طرح منہ کی کھانی پڑی' اس سے پاکستان کی انتظامیہ کو کم از کم یہ ایک سبق ضرور سیکھنا چاہیے تھا' شہریوں کو اس بات پر اصرار کرنا چاہیے کہ وفاق اور صوبے کی حکومتیں اس بارے میں احتیاط سے کام لیں اور اس کے بجائے پاکستان میں مختلف آبادیوں کے درمیان یگانگت پیدا کرنے اور اسے فروغ دینے کی ہر امکانی کوشش کریں جس طرح بے نظیر بھٹو کی پہلی حکومت میں جسٹس فخر الدین جی ابراہیم نے اس کی بہت اچھی مثال پیش کی تھی۔

اب ایک آخری نکتہ: داخلی خلفشار طول پکڑ جائے تو لامحالہ باہر سے بھی مداخلت ہوتی ہے اور کبھی تو حملہ بھی ہو جاتا ہے۔ لبنان کے بحران میں اسرائیلی تمام عرصہ مداخلت کرتے رہے' پھر 1978ء میں جنوبی

MashalBooks.org

لبنان پر حملہ کر دیا اور پھر 1982ء میں پورے ملک پر حملہ کر کے بیروت کو تقریباً تباہ و برباد کر دیا۔ اسی صورت حال کا تجربہ پاکستان کو 72-1971ء میں ہوا جب اس کی مسلح افواج کے کمانڈر نے مشرقی پاکستان میں ہندوستان کی فوج کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور اس منظر کو ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا۔ ایک گانے کے بول ہیں:

''آخر وہ کب سیکھیں گے۔''

(''ڈان'' 17 ستمبر 1995ء)

MashalBooks.org

شانتی نگر، جو ایک قصبہ تھا

مسلمانوں کے ایک جنونی گروہ نے 6 فروری کو شانتی نگر کے بے سہارا عیسائیوں کے خلاف جو دہشت ناک کارروائی کی، اس کی اخباری رپورٹیں ایک سی ہیں۔ غارت گروں نے تیرہ چرچ توڑ پھوڑ ڈالے اور سینکڑوں مکانات تباہ کر دیئے، لیکن اکثریتی آبادی کے ایک حصے نے اقلیتی فرقے کے ہم وطنوں پر جو مظالم توڑے، اعداد و شمار سے اس کی شدت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

شواہد سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس ظالمانہ کارروائی کی تیاری میں اور لوگوں کو بھڑکانے میں خانیوال ضلع پولیس بھی شامل تھی۔ کچھ دوسرے بھی شریک جرم تھے کہ وہ ڈیوٹی پر کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ کچھ دوسرے لوگوں کے بارے میں اطلاع ہے کہ انہوں نے لوٹ مار میں اپنا حصہ بٹایا۔ یہ وحشت زدگی صرف اس وقت ختم ہوئی جب قانون نافذ کرنے کے لئے فوج آ گئی۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے یہ فرقہ وارانہ تشدد کا بدترین واقعہ ہے، جو حالیہ دنوں میں پیش آیا۔

ایک ایسے معاشرے میں جو اخلاقیات کا پابند ہو، ایسے الم انگیز سانحے کے بعد اخبارات میں اور معاشرے کے تعلیم یافتہ حلقوں میں خود تنقیدی اور اپنی روح کے محاسبے کا عمل شروع ہو چکا ہوتا۔ حکومت اور سیاسی پارٹیوں کی جانب سے ہم یہ توقع کرنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ علامتی طور پر اور حقیقی معنوں میں بھی ایسی تدبیر کرتے، جس سے متاثرہ لوگوں کا اعتماد بحال ہوتا، اقدار پر یقین مستحکم ہوتا اور قانون کی عملداری ازسرنو قائم ہوتی، لیکن کسی طرح کی تشویش اور فکرمندی کے شواہد موجود نہیں۔ وفاقی اور صوبائی حکومتوں میں سے کسی ایک سیاسی عہدیدار نے بھی اس قصبے کا معائنہ نہیں کیا، جسے بدنصیبی سے شانتی نگر کہا جاتا ہے... شانتی نگر، جائے امن۔ کسی ممتاز رہنما نے خواہ منتخب ہو یا غیر منتخب، مناسب نہیں سمجھا کہ وہاں جاتا اور ان خوفزدہ، ستم رسیدہ لوگوں کی دلجوئی کرتا، جن کے سوا اس سے بھی زائد مکانات جلا دیئے گئے، جن کی املاک لوٹ لی گئیں اور عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ صرف ایک جماعت کے لیڈر یعنی جماعت اسلامی کے قاضی حسین احمد نے علانیہ طور پر ان مظالم کی مذمت کی۔

اب ہماری انسانیت پر اثبات کا فریضہ اور ملک کے ضمیر کے تحفظ کی ذمہ داری صحافیوں پر چھوڑ دی گئی اور پاکستان میں حقوق انسانی کے کمیشن کے دلیر اور جفاکش رہنماؤں پر۔ کمیشن کی ٹیم کے چھ ممتاز وکیلوں نے 10 فروری کو شانتی نگر کا دورہ کیا اور یہ خبر دی کہ" 1989ء میں ہونے والے چک سکندر کے احمدی دشمن فسادات کے بعد سے اب تک یہ ایسے فسادات تھے جن کی مثال نہیں ملتی۔ اس میں پوری شہری آبادی کو لوٹا

MashalBooks.org

گیا اور تباہی مچائی گئی۔ ان میں جزوی طور پر 1947ء میں تقسیم کے موقع پر ہونے والے فسادات کی یاد تازہ ہوگئی۔" حقوق انسانی کے کمیشن نے جو پانچ نکاتی سفارشات پیش کی ہیں ان میں سے دو میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ حکومت "ہائی کورٹ کے ایک جج کے ذریعے اس سانحے کی تحقیقات کا مطالبہ تسلیم کر لے۔" اور اس کے بعد فسادیوں کو سزا اس طرح دی جائے کہ آئندہ ایسے عناصر کے لئے عبرت آموز ہو۔ دوئم حقیقی معنوں میں جبہ اور شانتی نگر کی دونوں برادریوں کی آبادکاری بڑے پیمانے پر کی جائے۔ امید کی جاتی ہے کہ وفاق اور پنجاب کی نومنتخب حکومتیں ان سفارشات پر تیزی سے عمل کریں گی۔

حقوق انسانی کے کمیشن کی اطلاع یہ ہے کہ "اس کے کارکن جب اس تاراج بستی سے واپس ہوئے تو انہوں نے جو کچھ دیکھا اور سنا تھا اس سے بالکل ہل کر رہ گئے تھے۔ اس سانحے میں آئندہ کے لئے جو بدشگونی نظر آ رہی تھی، وہ اس سے بھی خوفزدہ تھے۔" جو لوگ اس وقت برسراقتدار ہیں اور جو آئندہ اقتدار میں آنا چاہتے ہیں انہیں اس "بدشگونی" کے بارے میں سوچنا چاہیے۔

پہلی بات تو یہ کہ بظاہر دین کی توہین کے جھوٹے الزام سے اس تباہ کن سانحے کا آغاز ہوا۔ اس وقت یہ دعویٰ کیا گیا کہ 5 فروری کے اول وقت میں قرآن مجید کے کچھ جلے ہوئے اوراق شانتی نگر سے کلومیٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی سرراہ مسجد کے قریب ملے اور اس پر ایک مسیحی نام لکھا تھا، جس کے بارے میں قیاس کیا گیا کہ قرآن مجید کی توہین کرنے والے کا تھا۔ اس علاقے کی مساجد نے لاؤڈ اسپیکروں سے دین داروں کو للکارنا شروع کر دیا کہ مسلح ہو کر نکل آئیں۔ کمیشن کی رپورٹ میں کہا گیا کہ "چند گھنٹوں تک یہ سلسلہ جاری رہا، جس کے دوران میں آس پاس کے علاقوں سے لوگ اکٹھا ہو گئے۔ اس ہجوم نے جو خاصے جوش میں تھا، خانیوال میں کئی چرچ توڑ پھوڑ ڈالے۔"

"دوسری صبح 6 فروری کو غارت گری دوبارہ شروع ہوئی جب ایک ہجوم پہلے جبہ اور پھر خاص شانتی نگر کی طرف روانہ ہوا۔" بظاہر یہ منظم کارروائی تھی۔ لوگوں سے کہا گیا کہ اپنے گھروں سے نکل آئیں، اس کے بعد انہیں لوٹا گیا، جلایا گیا اور مویشی چوری کر لئے گئے۔ اسی صبح خانیوال کے خاص چرچ سینٹ جوزف اور اس سے متصل بچوں کے ہاسٹل میں توڑ پھوڑ مچائی گئی۔ کمیشن کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ "ہاسٹل کے سامنے بچوں کی کتابوں کے اوراق جن میں اسلامی نصاب میں شامل آیات بھی شامل تھیں، بکھرے پڑے تھے۔"

اس سے یہ صاف سبق ملتا ہے کہ اہانت دین کا قانون نہ صرف انصاف کے بنیادی اصولوں کے منافی ہے بلکہ قانون کو مسخ کر کے اسے ایک ایسا ہتھیار بنا دیتا ہے جو مخالف فرقے کے لوگوں کو ہراساں کرنے اور نجی اور اجتماعی سطح پر انتقامی کارروائی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس شکار ہونے والوں میں ایک بے گناہ حافظ سے لے کر جسے ایک جنونی مجمع نے زندہ جلا دیا تھا، پاکستان کے انتہائی مشہور عالم ڈاکٹر اختر حمید

خاں بھی شامل ہیں' جو توہین مذہب کے غیر مصدقہ الزامات کے تحت کئی سال کی عدالتی چارہ جوئی اور قتل کی دھمکی برداشت کرتے رہے اور جنہیں طرح طرح سے ہراساں کیا گیا۔ حقوق انسانی کے کمیشن کے اس خیال سے اتفاق کرنا ہی پڑے گا کہ یہ بات ایک بار پھر ثابت ہو گئی کہ مذہبی جنون پھیلانے اور مفسد عناصر کو شہ دینے میں توہین مذہب کا قانون انتہائی طاقت ور ہے۔ ہزاروں جانوں کی قیمت پر اور بہ اعتبار مجموعی قومی تشخص کی پامالی پر یہ سبق حاصل ہوا ہے۔" اس قانون کو فوراً منسوخ کیا جانا چاہئے اور اس کی منسوخی کا یہی وقت ہے۔

اب دوسری بات: شانتی نگر میں ہونے والی غارت گری کا انتہائی تشویشناک پہلو ریاستی انتظامیہ کی کئی گونہ ناکامی ہے۔ یہ شک کرنے کے صریح اسباب موجود ہیں کہ اس فساد کو منظم کرنے میں خانیوال پولیس کا عملہ شامل تھا۔ شانتی نگر کے رہنے والوں نے یاد دلایا کہ خانیوال صدر کے اسٹیشن ہاؤس آفیسر عزیز الرحمٰن ڈوگر نے 17 جنوری کو شانتی نگر کے ایک شہری ایوب کے گھر پر چھاپہ مارا اور الزام لگایا کہ وہ جوئے کا اڈہ چلاتا ہے' اس چھاپے میں اسے کچھ نہیں ملا' چنانچہ مایوسی کے عالم میں اس نے گھر میں رکھی ہوئی ایک بائبل کو ٹھوکر ماری۔ گھر کے مالکوں نے اس واقعے کی شکایت درج کرائی۔ چنانچہ ایس ایچ او کو معطل کر دیا گیا' لیکن وہ فرار ہو گیا اور جاتے جاتے دھمکی دے گیا کہ شانتی نگر کے لوگوں کو سبق سکھا کے رہوں گا۔ جس طرح ایک موٹر سائیکل سوار توہین دین کے الزام کی تشہیر کرتا پھر رہا تھا اور اس مہم کو مساجد کے لاؤڈ اسپیکروں سے جس طرح پھیلایا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ساری شرانگیزی ایک منصوبے کے تحت تھی' تاہم اصل حقیقت تو عدالتی تحقیق سے ہی سامنے آئے گی۔

فرقہ وارانہ اشتعال انگیزی کے لئے خانیوال کے حالات 5 فروری کو بالکل موزوں تھے۔ اس کے نواح میں ہی کبیر والہ کی بستی ہے۔ یہ پاکستان کی "اسلامی" تنظیموں میں سب سے زیادہ شہ زور تنظیم انجمن سپاہ صحابہ کی جائے پیدائش ہے۔ اس ضلع سے ایک مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی انجمن کی طرف سے قومی اسمبلی کے انتخابات میں امیدوار تھے' لیکن اس سے پہلے کہ مولانا مسلم لیگ کے ریلے کو پیچھے دھکیلتے لاہور سیشن کورٹ کے بم دھماکے میں بدقسمتی سے ہلاک ہو گئے۔ مزید تلخی اس وقت پیدا ہوئی جب پارٹی لیڈر اعظم طارق الیکشن میں ہار گئے۔ تاہم جب دوبارہ ووٹ گنے گئے تو انہیں منتخب قرار دے دیا گیا۔ جب عیسائیوں پر حملے کا موقع آیا تو مولانا کا جلال زوروں پر تھا۔

خانیوال کے سرکاری اہلکاروں کو علم ہونا چاہئے اور کم از کم ان اندوہناک واقعات کے بعد تو ضرور معلوم ہونا چاہیے تھا کہ کشیدگی اپنی انتہا پر ہے۔ لیکن انہوں نے پیش بندی کے طور پر کچھ نہیں کیا اور پھر تشدد کا سامنا کرنے کے لئے کوئی بھی آگے نہیں آیا۔ ڈپٹی کمشنر اور سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے دفاتر سے چند ہی میل کے فاصلے پر لاؤڈ اسپیکروں پر لوگوں کو تشدد اور ہنگامہ آرائی کے لئے بلایا جاتا رہا' لیکن وہ سب بیٹھے جمائیاں

MashalBooks.org

لیتے رہے۔ اس بربریت کے دوران میں ایک موقع پر پولیس آ گئی۔ کچھ پولیس والے اس میں شریک ہو گئے' دوسرے کھڑے تماشا دیکھتے رہے اور چند ایک موقع سے فرار ہو گئے۔ ڈی سی اور ایس ایس پی کے دفاتر سے کچھ ہی دور سینٹ جوزف چرچ اور بچوں کا ہاسٹل واقع ہیں' لیکن ضلعی انتظامیہ بالکل مفلوج تھی اور غارت گری ہوتی رہی۔ عجیب بات ہے کہ حقوق انسانی کے کمیشن کی ٹیم اس بات سے بہت "متاثر" ہوئی کہ ڈی سی صاحب نے اس المیے پر اپنی تشویش کا اظہار کیا ہے اور ظلم کا نشانہ بننے والوں سے ہمدردی کی ہے۔ کمیشن نے انتظامیہ کی تعریف کی ہے کہ اس کے ضلع نے متاثرین کو امداد دی ہے اور ہر طرح اطمینان دلایا ہے اور اس امداد کی بھی بہت تعریف کی ہے جو ملنے ہی والی ہے۔ کمیشن نے اچھے ڈی سی صاحب کی بے عملی کی ایک طرح سے صفائی پیش کر دی ہے' ایس ایس پی عمرہ کرنے گئے ہوئے تھے اور پھر ڈی سی صاحب نے خاصی صراحت کے ساتھ یہ بیان کیا کہ ایک مذہبی جنونی نے کس طرح ان کے ہی پیش رو کو دفتر کے باہر دن دہاڑے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا' جو لوگ ریاستی اقتدار پر براجمان ہیں' کیا انہیں معلوم نہیں کہ ان حقائق سے کتنی بدشگونی ظاہر ہو رہی ہے یا پھر وہ خاموش کیوں ہیں؟

اس المیے سے تیسری اور ایک انتہائی سنگین بصیرت سامنے آتی ہے' جو اس خطرناک عبوری دور کے حوالے سے ہے' جس سے یہ ملک اور اس کا معاشرہ گزر رہے ہیں۔ 5 اور 6 فروری کو شانتی نگر میں جو ہولناک کارروائی ہوئی' اس میں نہ کوئی بات روایتی تھی اور نہ صحیح معنوں میں جدید' پندرہ ہزار افراد پر مشتمل اس کالونی کو سالویشن آرمی (نجات دہندہ فوج) نے 1912ء میں آباد کیا تھا۔ جبکہ ساٹ مرلہ سکیم کے تحت کوئی اسی برس پہلے آباد ہوا تھا۔ اس تمام عرصے میں کرسچین کالونی اور مسلمان ہمسایے پر امن طریقے سے ساتھ رہتے آئے تھے۔ ان میں کوئی فرقہ وارانہ کشیدگی پہلے کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی' لیکن ادھر حالیہ برسوں میں کاروباری مفادات یہاں تیزی سے داخل ہوئے ہیں' جس سے یہاں کی معیشتوں کا ایک دوسرے پر انحصار بڑھ گیا ہے۔ معاشی مقابلہ اس علاقے میں بہت بڑھ گیا ہے۔ نئی رقابتیں پیدا ہوئی ہیں اور نئے عزائم نے سر اٹھایا ہے۔ پرانے طور طریقے زوال پذیر ہیں' لیکن ان کی جگہ نئے اور قابل عمل طور طریقے نہیں آ سکے۔

اس مسلسل تبدیلی کے ماحول میں لوگوں کو رہنمائی کے لئے ایسی قیادت درکار ہے جو فہم و فراست رکھتی ہو۔ مضبوط انتظامی صلاحیت کی مالک اور منصف مزاج ہو اور جسے سماج میں اپنی اہمیت اور شراکت کا احساس ہو۔ جب یہ خوبیاں ناپید ہوں تو عام لوگ آسانی کے ساتھ چرب زبان فرقہ پرستوں کی چالبازیوں کا شکار ہو سکتے ہیں' جو اختلافی نظریوں پر چلتے ہیں اور نفرت اور خوف کو عقیدہ بنا کر بیچتے ہیں۔ ایسے عبوری زمانے میں سیاست کو بالادست ہونا

چاہیے۔ روشن خیالی پر مبنی قوانین کی منظوری لازمی طور پر ہونی چاہیے اور ساتھ ہی یہ بات کہ اپنی سلامتی اور ترقی کے لئے اچھا نظم و نسق ہونا نہایت ضروری ہے۔ ("ڈان" 18 فروری 1997)

تشدد کی بنیادیں

آج پاکستان میں تیزی سے پھیلتی ہوئی تشدد کی لہر اس ملک کا انتہائی سنگین سماجی مسئلہ ہے۔ کوئی ہفتہ بلکہ اکثر کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب تشدد کا کوئی خوفناک واقعہ کا نہ ہو۔ اس سے عوام کے اس اعتماد کو صدمہ پہنچتا ہے کہ حکومت اپنے شہریوں کی حفاظت کی اہل ہے اور یہ واقعہ ہمیں یاد دلا دیتا ہے کہ اس ملک میں شائستہ رہن سہن کے آداب شدید طور پر زوال آمادہ ہیں۔ سرکاری حکام اس وقت علاج کے طور پر پہلے سے زیادہ سخت اقدامات کا اعلان کرتے ہیں' جب کہ عام لوگ تشویش کے ساتھ اس کے اسباب پر غور کرتے ہیں' جن کی تہہ میں بے حسی اور سفا کی پائی جاتی ہے اور جس کی ایک مثال لاہور کے ایک قبرستان میں عزاداروں کا بہیمانہ قتل ہے۔ یہ مضمون ایک فرد کے خیالات کا حاصل ہے جس نے پاکستان میں حالیہ تشدد کے بنیادی اسباب کی تلاش کی ہے۔

میں اپنی بات سادہ سے پانچ مشاہدات سے شروع کرتا ہوں۔ اول۔ جنگ اور جارحانہ حملوں سے قطع نظر جن کی توضیح بین الاقوامی قوانین میں کر دی گئی ہے' تشدد کی نو مختلف شکلوں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے' جو دنیا بھر میں بہت عام ہیں۔ ان کی شدت اور ظاہر ہونے کے مواقع وقت اور جگہ کو دیکھتے ہوئے مختلف ہو سکتے ہیں' لیکن یہ ہیں' گھر کے اندر تشدد' مجرمانہ تشدد' سرکاری تشدد' لسانی و نسلی تشدد' کسی عقیدے پر مبنی تشدد' سیاسی تشدد' (جس کا محرک احتجاج ہو) مذہبی اور فرقہ وارانہ تشدد' دہشت گردی اور انقلاب کے نتیجے میں رونما ہونے والا تشدد۔ تشدد کی یہ صورتیں بعض اوقات ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں۔ مثلاً سرکاری تشدد اپنی اصل میں اتنا ہی دہشت خیز ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ انقلابی نوعیت کا اور مجرمانہ انداز کا تشدد۔ اس کی مثالیں ہمیں قاتلوں کے اس دستے میں ملتی ہیں' جو سرکاری طور پر تیار کیے جاتے ہیں یا غیر ممالک میں کی جانے والی خفیہ کارروائیوں میں نظر آ جائیں گی۔ اسی طرح فرقہ واریت پر مبنی تشدد' دہشت گردی میں بدل جاتا ہے' جیسا کہ پاکستان میں تسلسل کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے۔ انقلابی تشدد میں تقریباً ہمیشہ یہ تینوں عوامل احتجاج' دہشت گردی اور جنگ مل جاتے ہیں۔

دوم یہ کہ تشدد کی ان تمام صورتوں میں صرف ایک صورت یعنی انقلاب کے نتیجے میں رونما ہونے والا تشدد پاکستان میں فی الوقت موجود نہیں۔ انقلابی تشدد' تشدد کی دیگر تمام صورتوں سے اس بنا پر مختلف ہے کہ اس سے مروجہ نظام کو بدلنا مقصود ہوتا ہے اور اس کے تحت کارروائی منتخب انداز سے معاشرتی اور نفسیاتی طریقے کے تحت کی جاتی ہے۔ تشدد کی باقی آٹھ صورتیں نہ صرف پاکستان میں موجود ہیں بلکہ گذشتہ بیس سال کے اندر ان کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ تاہم یہ بات بھی پیش نظر رکھئے کہ انقلابی نوعیت کے تشدد کے حالات

MashalBooks.org

پاکستان میں ۱۹۸۰ء کے بعد سے بڑھتے آئے ہیں۔ اس کا آغاز جہاد سے ہوا جس کی بنیاد بین الاقوامی طور پر رکھی گئی۔ ممکن ہے کہ ہم ایک منظم تشدد کے دروازے تک آ پہنچے ہوں جس کا مقصد نظام کی تبدیلی ہو اور اس کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ اگر یہ رونما ہوا تو اس بات کا امکان نہیں کہ یہ تشدد اپنی نوعیت میں کسی اختیار اور نظم کے تابع ہوگا' جیسا کہ اس سے پہلے چین' ویت نام کی سیکولر انقلابی تحریکوں میں دیکھا گیا۔ یا جس کا اظہار الجزائر کی جدوجہد آزادی میں ہوا' اس بدنظمی اور اختیارات کو سمجھ کر استعمال نہ کرنے کا سبب پاکستان میں انقلابی تشدد کو برتنے والے غالب عناصر یعنی یہاں کی مذہبی اور دائیں بازو کی تنظیمیں ہوں گی۔ جنہوں نے اپنے یہاں تشدد کے حربوں کی کوئی نظریاتی یا عملی حدود متعین نہیں کیں۔ ان تمام ملکوں نے جہاں عناصر انقلابی مقاصد کے حصول یعنی نظام کی تبدیلی کی خاطر تشدد کے طریقے برت رہے ہیں ان کا انداز کسی تفریق اور امتیاز سے بالا ہے اور وہ اپنی طاقت کو نہایت بے تکے اور بے ہنگم طور پر برت رہے ہیں۔ موجودہ افغانستان' الجزائر' مصر اور بتدریج پاکستان میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔

سوم' تشدد کی مختلف صورتیں جو آپس میں مل گئی ہیں اور جو پاکستان میں طاقت پکڑتی جا رہی ہیں' اس سے تاریخی طور پر یہ اشارہ مل رہا ہے کہ یہاں ریاست روبہ انحطاط ہے۔ اپنے وجود کا جواز اور اپنی نظریاتی اساس کھو رہی ہے اور اس کے ادارے حکمرانی کے ارادے اور اہلیت دونوں سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ تشدد پسند گروہ کمزور ہوتی ہوئی ریاست کے حریف بن کر ابھر رہے ہیں۔ اس طرح تمام ملکوں میں جہاں یہ صورت حال پائی جاتی ہے' ریاست حاکمیت کی صفات سے رفتہ رفتہ محروم ہوتی جاتی ہے اور نراجیت میں طاقت کا عنصر شامل ہو جاتا ہے' یہ طاقت مختلف مسلح گروہوں کو منتقل ہو جاتی ہے۔ جنگجو سردار ابھرتے ہیں' نراجیوں' غیر قانونی گروہوں اور لٹیروں کے گروہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ محفوظ سے پرخطر تک اگر ہم ایک تا دس کا پیمانہ مقرر کریں تو میرے اندازے کے مطابق پاکستان موجودہ ریاستوں کے درمیان چھٹے اور ساتویں درجے پر آتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ اس درجے پر آ کر رک نہیں گیا بلکہ خطرناک طور پر آگے سرک رہا ہے اور خطرے کے اس نقطے میں داخل ہونے کو ہے جہاں اس ریاست کو اور اس کی آبادی کو معمول کی زندگی تک واپسی میں کئی نسلیں درکار ہوں گی۔ جب وہ خطرناک درجہ جہاں سے آگے مکمل تباہی ہے' قریب ہو تو ریاست اپنی سلامتی کے لئے داخلی عوامل سے زیادہ بیرونی عوامل پر انحصار کرنے لگتی ہے' وہ صورت حال حالیہ برسوں میں لبنان' صومالیہ' روانڈا اور لائبیریا میں پیدا ہو چکی ہے۔

چہارم جب ریاستی ادارے کمزور ہونے لگیں اور عام تشدد اور خلفشار کا ماحول پیدا ہونے لگے اور اس صورت حال کا مقابلہ بروقت اور بامعنی انداز سے چیلنج سمجھ کر کیا جائے تو جواب میں حکمرانی کے ادارے بنتے ہیں اور حکمت عملی وضع کی جاتی ہے اور یہ ادارے دیرپا اور مستعد ہوتے ہیں۔ بامعنی ردعمل سے مراد عام طور پر یہ ہے کہ تشدد کی بنیادوں کو صاف اور صریح انداز میں دیکھ لیا جائے اور پر تشدد عناصر کے کردار کو سمجھ لیا

MashalBooks.org

جائے۔ اس کا یہ تقاضا بھی ہے کہ جو لوگ بڑھتی ہوئی دہشت گردی سے نمٹنے کے لئے ریاست کی تادیبی طاقت کو سختی سے استعمال کرنے پر زور دیتے ہیں' ان کی بھی تربیت کر کے انہیں قابو میں کیا جائے۔

ہندوستان میں مغلیہ حکمرانی کی آخری صدی اور برطانوی عملداری کے ابتدائی برسوں میں برصغیر جنوبی ایشیا ان تجربوں سے گزر چکا ہے۔ اس چیلنج کا مقابلہ مغلوں نے تدبیر اور جدید انداز سے نہیں کیا' چنانچہ ناکام ہو گئے۔ انگریزوں نے زمانہ حاضر کے انداز کے مطابق ادارے قائم کئے۔ احتیاط اور سمجھ بوجھ کے ساتھ ضابطے نافذ کئے اور اس طرح ایک ایسی ریاست کی بنیادیں رکھیں جو ایک صدی سے زائد عرصے تک برقرار رہا۔

ان باتوں کو دیکھتے ہوئے یہ تجویز سمجھ میں آتی ہے کہ پاکستان کو دو طرفہ پالیسی بیک وقت اختیار کرنی چاہئے۔ یہ پالیسی احتیاط سے بنائی جائے اور ضابطے کے ساتھ اس پر عمل ہو۔ اس میں شامل اصلاح کا پروگرام ہے' جس کا مقصد معاشرے سے تشدد کے بنیادی اسباب کا خاتمہ ہو' ساتھ ہی تحفظ اور سراغ رسانی کے لئے جو ایجنسیاں کام کر رہی ہیں ان کو بہتر بنایا جائے اور انصاف بہتر انداز سے نافذ ہو۔ انتہائی سخت قوانین کی منظوری سے جیسے دہشت گردی کے خلاف حالیہ قوانین کی منظوری اور ماورائے عدالت ہتھکنڈے کو چپ چاپ قبول کرنے سے مسئلہ کے حل میں مدد نہیں ملے گی۔

پنجم' پوری انسانی تاریخ میں تشدد کو بالادستی قائم کرنے اور تنازعہ اور بے اطمینانی کو حتمی طور پر ختم کرنے کے لئے حربے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اگرچہ بہت سے معاشروں میں تشدد اور اسے برتنے کے سلسلے میں سماج کا رویہ نمایاں طور پر تبدیل نہیں ہوا ہے لیکن جدید ٹیکنالوجی نے تشدد کے طریقوں کے استعمال اور نتائج کے باب میں روایتی تناسب کو بڑی حد تک بدل دیا ہے۔ وہ ممالک اور معاشرے جو اپنے روایتی طور طریقوں اور جدید حقائق کے درمیان فاصلے کو دور نہیں کرتے' وہ اپنی تباہی کے خطرے کو دعوت دیتے ہیں۔ افغانستان اس کی ایک مثال ہے۔

افغانستان کا معاشرہ ایک جنگ جو معاشرہ تھا' جہاں قبائل کے درمیان طاقت کے توازن' افراد کی سماجی بہتری' طاقت کا ایک سے دوسری طرف منتقل ہونا' یہاں تک کہ سیاسی معیشت کا تعین اس بات سے ہوتا تھا کہ مختلف گروپ اور افراد تشدد کے حربے برتنے پر کتنے قادر ہیں۔ ثور انقلاب' اس کے خلاف مذہبی بغاوت اور اس میں سپر پاور کے شامل ہو جانے سے افغانستان کے اندر اسلحہ کا ماحول بدل گیا۔ جنگ جویانہ کلچر کے طریقے اور معاشرے کی جبلت وہی رہی اور اس کا رشتہ جدید ٹیکنالوجی کے ساتھ جڑ گیا۔ نتیجہ اس ملک کی عملاً پوری تباہی ہے حالانکہ اس ملک نے کئی پرتشدد چیلنج دیکھے اور پھر بھی سلامت رہا اور ان میں تین نو آبادیاتی جنگیں اور آپس کی لاتعداد جھڑپیں شامل ہیں۔ اس طرح کا عمل پہلے لبنان اور اس کے بعد صومالیہ اور روانڈا میں دیکھا گیا۔

MashalBooks.org

کلچر اور تشدد

ہمارے معاشرے میں کلچر اور تشدد کے درمیان رشتے موجود ہیں۔ خاص طور پر جاگیرداری نظام اور تشدد کا باہمی تعلق۔ چند پیر صاحبان کو چھوڑ کر باقی سارے جاگیرداری نظام کی بنیاد شاید ہی کہیں نظریے پر ہوگی۔ ایسا بھی نہیں کہ یہ نظام سرمایہ داری نظام کی طرح پیداواری اہلیت میں اضافے سے توانائی حاصل کر رہا ہو۔ جاگیرداری نظام کا تعین دوسری باتوں کے علاوہ تشدد کے استعمال میں اس کی قدرت پر ہے۔ اس نظام سے وابستہ افراد مسلسل پر تشدد حربے استعمال کرتے ہیں' اس سلسلے میں کبھی کبھی مقامی رسوم و رواج کا لحاظ کر لیتے ہیں اور قانون کو تو ہمیشہ کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ ہر باری یہ بات جاتا ہے اور جیسا کہ کوئی ساٹھ سال پہلے ہاری کمیشن نے اس کی صریح نشاندہی بھی کی زمین کے مالک اور اس کے کسانوں کے درمیان رشتے کا تعین تشدد سے ہوتا ہے۔ کسی بھی تجربہ کار ضلعی افسر سے پوچھ لیجئے' وہ آپ کو بتائے گا کہ سندھ' پنجاب' سرحد اور بلوچستان کے باثروت جاگیرداروں کے اندر قانون اور لاقانونیت اور مہذب رویے اور تشدد کے درمیان فرق اس بات سے پیدا ہوتا ہے کہ حکومت کی طاقت کتنی ہے اور اس کا ارادہ کیا ہے۔ قانون کا پابند جاگیردار ایک متضاد بات ہے۔

معاشی اصطلاح میں جاگیرداری' معاشرے کی دیگر طاقتوں میں سے ایک طاقت ہے اور یقیناً بالا دست طاقت نہیں' لیکن اس نے صدیوں تک جس کلچر کی پرورش کی ہے' وہ تو بہتر طور موجود ہے۔ ایک بالا دست طاقت کمزور ہو کر ختم ہو جاتی ہے' لیکن اس کا کلچر تقریباً ہمیشہ برقرار رہتا ہے اس کی ایک مثال پاکستان اور ہندوستان ہیں' جہاں نوآبادیاتی کلچر نے نہایت مضبوطی کے ساتھ اپنی گرفت قائم رکھی ہے' حالانکہ نوآبادیاتی تسلط باقی نہیں رہا۔ یہاں جاگیرداری اور نوآبادیاتی کلچر کی موجودگی کو اس طرح دیکھا جا سکتا ہے کہ نوآبادیات کے خاتمے کے بعد اس کی اشرافیہ (elite) ان متبادل اقدار اور آداب کو فروغ نہ دے سکی جو ایک نئے کلچر کی بنیاد ثابت ہوتے۔ اس چیلنج کو پاکستان کے چھوٹے سے دانش ور طبقے نے جو نہایت خرچیلا ہونے کے ساتھ مغرب سے مرعوب اور محتاط بھی ہے' بڑی حد تک نظر انداز کیا ہے۔ اس ملک کا دانش ور طبقہ تو جاگیرداری نظام پر خوب برستا رہتا ہے اور ہر خرابی کا غصہ اس پر اتارتا ہے' لیکن جہاں تک میرے علم میں ہے اس سلسلے میں یہ سمجھنے کی ایک بھی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی کہ پاکستان میں جاگیردارانہ اقتدار کی حدود اور اس کی نوعیت کیا ہے؟ نتیجہ یہ کہ یہاں دو کلچر' جاگیردارانہ اور نوآبادیاتی دونوں کی مکمل بالادستی قائم ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ انہی کے طور طریقے اور اقدار بڑی حد تک سوسائٹی کے طور طریقے اور اقدار ہیں۔

جاگیرداری کلچر کی کارفرمائی کی ایک غیر معمولی مثال یہ ہے کہ بیسویں صدی کے آخری عشرے میں پاکستان کے حقوق انسانی کے کمیشن نے نجی جیلوں کو زبردستی کھلوایا ہے اور پورے پورے کنبوں کو غلامی سے نجات دلائی ہے' جن کے افراد کو زنجیر میں باندھ کر رکھا جاتا تھا' ایذا دی جاتی تھی' عورتوں کی بے آبروئی اور

بچوں کا استحصال ہوتا تھا اور اس ضمن میں نمایاں بات یہ ہے کہ یہ رہائیاں ریاستی اختیار کے تحت روبہ عمل نہیں آئیں۔ یہ کام ایک پرائیویٹ تنظیم نے کیا۔ ریاست کی اس بڑے پیمانے پر ناکامیاں اور اس کے بالا دست حکام کی بے عملی سے ہی جاگیرداری نظام ہمارے معاشرے میں برقرار ہے۔

یہ کہنا تو بہت عام سی بات ہوگی لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ یہ اقدار کسی ایک طبقے کا ورثہ نہیں بلکہ یہ تو پوری سوسائٹی کا ورثہ ہیں۔ جب تک خود ریاست اپنے قوانین نافذ نہیں کرے گی اور جب تک دانش ور طبقہ عدم تشدد کی اقدار کو پوری تندہی سے فروغ نہیں دے گا' تشدد کا کلچر برقرار رہے گا۔ بلکہ سماجی تبدیلیاں جیسے جیسے تیزی سے بدلیں گی' سماج کو کنٹرول کرنے کے روایتی طریقے بتدریج بے اثر ہوتے جائیں گے۔ ریاستی مشینری زنگ آلود ہو کر ناکام ہو جائے گی اور اس طرح تشدد مختلف شکلوں میں ظاہر ہو کر زیادہ طاقت سے پھیلے گا۔

ہمارے کلچر میں تشدد نے روایتی طور پر ایک مرکزی اور ممتاز حیثیت اختیار کر لی ہے ہماری سماجی زندگی میں اس کے متعدد مظاہر ہیں' میں یہاں صرف تین کا ذکر کروں گا۔ اول' وہ اہمیت جو ہم انتقام کو دیتے ہیں۔ دوم' عورتوں کے خلاف تشدد جو برقرار ہے۔ تیسرے بچوں سے بدسلوکی۔

غالباً پاکستانیوں کی غالب اکثریت انتقام کو ایک فطری جذبہ سمجھتی ہے۔ ہماری سماجی' سیاسی اور خاندانی زندگی میں بڑی حد تک نہ صرف یہ کہ اسے معمول کی بات سمجھا جاتا ہے بلکہ اس کو ایک فرد کی شخصیت' اس کی عزت اور خاندان' برادری اور قبیلے کی غیرت کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص انتقام لیتا ہے تو اس کے دوست اور رشتے دار اس کے ساتھ یک جہتی ظاہر کرتے ہیں۔ جب کہ اس کے مخالفین عام طور پر انتقام لینے والے سے بدلہ چکانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں' جہاں تک مجھے علم ہے' اب تک انتقام کے نتیجے میں ہونے والے قتل کے سالانہ اعداد پاکستان میں مرتب نہیں کئے گئے۔ اگر ایسا کیا جاتا تو یہ تعداد ہزاروں میں پہنچتی۔ کسی ایک دن پر نظر ڈالئے آپ کو اس کے شواہد مل جائیں گے۔

سندھ میں' دیگر قبائلی وارداتوں کے علاوہ' جن اور جتوئی' کلاری اور کاموزا' بھانیو اور بروہی' مگسی اور ناپور قبیلوں کے درمیان خون ریزی کی ہولناک خبریں' تفصیل کے ساتھ اخبارات میں چھپتی رہی ہیں۔ عجیب بات ہے کہ مگسی اور ناپور قبیلوں کے درمیان لڑائی پچیس سال پہلے' ناپوروں کی ایک عورت کے قتل کے بعد شروع ہوئی' تازہ ترین لڑائی کی آگ بھڑکی تو دونوں طرف سے بندوقیں نکل آئیں اور دوطرفہ فائرنگ کے نتیجے میں ایک معصوم لڑکی ہلاک ہوگئی۔ اس طرح کی ایک قبائلی جھڑپ جو بھانیو اور بروہیوں میں چھڑ گئی' پچھلے تین سال کے اندر کم از کم پچاس جانیں تلف ہوگئیں۔ جتوئی اور میہر قبائل کے تنازعے میں بھی اس طرح پچاس افراد کام آ گئے۔ یونہی ہفتے کے ہفتے تشدد کے کلچر کے شواہد سامنے آتے رہتے ہیں۔ تازہ ترین انتقامی کارروائی کلپر قبیلے کے خلاف نواب اکبر بگٹی کی جانب سے اور بظاہر حکومت کی چشم پوشی کے ساتھ

ہوئی۔ اس قدر یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ کلپڑوں کا سردار اپنے قبائلیوں کے ساتھ اگرچہ بے گھر بے در پھیر رہا ہے لیکن بگٹیوں کے خلاف انتقامی کارروائی کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔

جہاں تک گھریلو تشدد کا تعلق ہے' ہمارے دیہی معاشرے میں آبادی کا ایک بڑا حصہ بیویوں کی پٹائی کو مردانگی کی بات سمجھتا ہے۔ شہر میں رہنے والوں خاص طور پر محنت کشوں اور نچلے درمیانہ طبقے کے لوگوں میں یہ روش عام ہے اور بالائی طبقے کے تعلیم یافتہ کنبوں میں بھی ایسا ہوتا ہے۔ اگست ۱۹۹۷ء میں ایک کمیشن آف انکوائری فار ویمن کی رپورٹ جو نہایت متوازن اور پر مغز ہے' شائع ہوئی تو معلوم ہوا کہ عورتوں کے ساتھ بدسلوکی اور مار پیٹ پاکستانی معاشرے میں بہت عام سی بات ہے۔ یہ سلوک نہ صرف شوہر بلکہ شوہر کے خاندان کے دوسرے افراد بھی بیوی کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ اس میں طمانچے مارنا' پیٹنا' ایذا دینا' جسمانی اعضا کو کاٹنا اور قتل تک شامل ہے۔ اس سے بآسانی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تشدد کی یہ صورتیں بالعموم اتنی نفرت کی بنا پر نہیں' جتنا ان کا تعلق عادت اور رویے سے ہے۔ لوگ عام طور پر تشدد کو سماجی اور نجی مقاصد کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

زنا اور خاص طور پر اجتماعی زنا کی وارداتیں ملک میں تیزی سے پھیلتی جا رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا زیادہ نوٹس لیا جا رہا ہو لیکن صرف لاہور میں ۱۹۹۷ء کے ابتدائی نو مہینوں میں ۱۰۰ سے زائد عورتوں کی بے حرمتی کی خبریں آئیں۔ ان میں اٹھائیس وارداتیں عورتوں کی اجتماعی بے حرمتی کی ہیں۔ حسب معمول پولیس نے ان میں صرف ۳۵ وارداتوں کی رپورٹیں درج کیں۔

اس صورت حال میں یہ بات بھی شامل ہے کہ زنا کی شکار ہونے والی عورت اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کی اطلاع دینے سے ڈرتی ہے' چنانچہ حقوق انسانی کی تنظیموں کا اندازہ ہے کہ اخبارات میں جتنی وارداتوں کی خبریں شائع ہوتی ہیں اصل تعداد ان سے ڈھائی تین گنا زیادہ ہے یہ اندازہ بھی کچھ کم ہی ہوگا کیونکہ قریبی عزیزوں اور گھر کے ملازموں کے ہاتھوں لڑکیوں کی جو بے حرمتی ہوتی ہے' اس کی شکایت وہ اپنے والدین تک سے نہیں کر سکتیں۔

عورتوں کے گروپ اور حقوق انسانی کا کمیشن بڑی کاوش اور جانکاہی سے عام عورتوں کے خلاف مجرمانہ کارروائیوں کی دستاویزات مرتب کرتے آئے ہیں۔ حقوق انسانی کمیشن کا اندازہ ہے کہ ملک گیر سطح پر پاکستان میں ہر تین گھنٹے کے اندر ایک عورت کی عصمت پامال ہوتی ہے اور تقریباً اتنے ہی نابالغ' بالغوں کی ہوس کا شکار ہوتے ہیں۔ زیادہ تر یہ بھی ہوتا ہے کہ ارتکاب جرم سے پہلے یا اس کے بعد ان پر وحشیانہ تشدد کیا جاتا ہے۔ معاشرے میں زنا کے ساتھ بے آبروئی اور شرم کا جو تصور وابستہ ہے۔ اس کی بنا پر بعض خواتین تو خودکشی کر لیتی ہیں۔ سندھ' بلوچستان' صوبہ سرحد اور جنوبی پنجاب میں کاروکاری جیسی رسموں کو جنہیں مسلمہ طور پر جائز تسلیم کیا جاتا ہے' عزت کی بحالی کا بھی ایک ذریعہ سمجھا گیا ہے۔ انہی میں ایک اور طرح کی ہولناکی کا

MashalBooks.org

اضافہ ہوا ہے اور وہ ہے چولہا بھڑکنے سے جل جانے کے واقعات جن کی تعداد ہسپتال میں اندراجات کی بنا پر ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ وہ حقائق جن سے جاگیرداری کلچر کے بارے میں میرے دلائل کی تصدیق ہوتی ہے یہ ہیں۔ (۱) اسی فیصد ہولناک جرائم عورتوں کے خلاف دیہی علاقوں میں ہوتے ہیں۔ اور بیس فیصد شہروں میں ہوتے ہیں۔ (۲) جنسی حملوں کا شکار ہونے والی زیادہ تر عورتیں محنت کش طبقے کی ہیں' بچے چونکہ ابتدا سے ہی تشدد ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور اسے مردانہ طرز عمل کا ایک لازمی جزو سمجھتے ہیں لہذا مرد ہوں یا عورتیں جوں جوں بڑے ہوتے ہیں' تشدد کو معمول کی بات سمجھتے ہیں' بلکہ اپنا مطلب نکالنے کے لئے یا دوسرے کا رویہ تبدیل کرنے کے لئے تشدد کو ایک موثر ذریعہ سمجھتے ہیں اور اسے ترجیح دیتے ہیں۔ گھریلو تشدد کے خلاف قوانین نہ ہونے کے برابر ہیں اور پولیس ایسے معاملات کو ٹال جاتی ہے اور ان کے خلاف شکایت کے اندراج کی حوصلہ شکنی کرتی ہے۔

بچوں کے خلاف وحشیانہ سلوک تو عورتوں کے ساتھ بدسلوکی سے بھی زیادہ عام ہے۔ ہمارے بچوں کی تربیت کا مرکزی نکتہ ہی یہ ہے کہ چھڑی ہاتھ سے رکھ دو اور بچوں کو بگڑنے دو۔ اس تصور پر عمل درآمد اسکولوں میں' گھروں ہی کی طرح بلکہ اس سے کم نہیں ہوتا۔ چند عشرے پہلے جو صورت تھی' اس کے مقابلے میں اب بالائی اور متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ گھرانوں میں بچوں کو جسمانی سزا دینے کی شکایت کم ہو گئی ہے۔ البتہ معاشرے کے دوسرے طبقوں میں یہ بہت عام ہے۔ مختلف طبقات اور شہروں اور دیہات کے درمیان ایسی شکایات کا تناسب کیا ہے؟ اعدادوشمار کی عدم موجودگی میں یہ بتانا مشکل ہے۔ بہت سے دیگر اسباب کی بنا پر لاطینی امریکہ کے ملکوں میں جو تحقیق کی گئی ہے ان کی روشنی میں بھی' میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شہر کے مزدور طبقے میں' نچلے درمیانہ طبقے میں اور بازاری لوگوں کے اندر بچوں کے ساتھ بدسلوکی اور مجرمانہ طرز عمل بہت عام ہے۔ دینی مدرسوں میں جن کی تعداد میں گزشتہ دو عشروں کے درمیان زبردست اضافہ ہوا ہے بچوں کو ہر روز ایک معمول کی طرح نہایت سخت بلکہ غیر انسانی جسمانی سزا دی جاتی ہے۔ حقوق انسانی کے کمیشن نے اس طرح کی مثالیں بھی طشت ازبام کی ہیں کہ کس طرح بچوں کو زنجیروں میں باندھ کر رکھا جاتا ہے اور مہینوں تک بلکہ مسلسل کئی سال تک رکھا جاتا ہے۔

پاکستان میں تشدد اور جرائم کی اتنی بڑی شرح کو اگر بڑھنے سے روکنا ہماری حکومت کا مقصود ہو تو اسے چاہئے کہ ان کے انسداد کے لئے قوانین منظور کرے اور انہیں سختی کے ساتھ نافذ بھی کرے۔ قوانین بہر طور پر جرم و سزا کے درمیان محض رابطے کے لئے نہیں ہوتے۔ قوانین شہریوں کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے اخلاقی رویے اور طرز عمل کے معیارات مقرر کرتے ہیں لیکن برسراقتدار حکومتوں کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ تقریباً ایک عشرے کی نمائندہ حکومتوں میں سے کسی ایک نے بھی ایک آمر کے نافذ کردہ قوانین حدود' قصاص' ودیت اور توہین رسالت کے قوانین کو مسترد نہیں کیا۔۔ جن کی بدولت ہمارے معاشرے میں

MashalBooks.org

عورت اور اقلیتوں کی حیثیت گر گئی ہے' رجعتی رویوں کو فروغ حاصل ہوا ہے اور قتل' جارحانہ حملوں اور فرقہ وارانہ فسادات کو تحریک ملتی آئی ہے۔

اس حکومت میں یا گذشتہ حکومت میں بھی کسی ایک عہدیدار نے بھی دوران گفتگو ان قوانین کی تائید نہیں کی۔ اس کے برعکس سبھی نے جیسا کہ ہر ذی فہم اور انسان دوست شخص کرے گا' ان قوانین کو معاشرے کے لئے نقصان دہ اور ناپسندیدہ قرار دیا۔ اس کے باوجود موجودہ حکومت جو آئینی ترمیمات کو منسوخ کرنے کے لئے مطلوبہ تعداد سے بھی زیادہ اکثریت رکھتی ہے' عورتوں کے بارے میں پیش ہونے والی نہایت معقول تجاویز میں سے کسی ایک کو بھی منظور کرنے میں ناکام رہی ہے۔ یہ تجاویز سپریم کورٹ آف پاکستان کے ممتاز جج' مسٹر جسٹس اسلم زاہد کی سربراہی میں قائم ہونے والے تحقیقاتی کمیشن نے مرتب کی تھیں۔ اس ناکامی کا مطلب ہے موقع پرستی کے آگے ذمہ داری سے بچتے ہوئے سپر ڈال دینا' یہ ایسی صورت حال ہے جو سیاست میں ہر جگہ عام ہے۔ لہذا ذمہ داری اول و آخر ہم پر آن پڑتی ہے حکومت کی بے عملی سے دوسری باتوں کے علاوہ ایک اور حقیقت سامنے آتی ہے یعنی دائیں بازو کے مذہبی گروہوں کے زبردست دباؤ کے مقابلے میں ایک منظم رائے عامہ تیار کرنے میں ہماری ناکامی۔ یہ مذہبی گروہ اسلام کے بارے میں فرضی اور دقیانوسی قسم کے تصورات رکھتے ہیں' ہمارے معاصر اسکالر اسلام ازم' قرار دیتے ہیں' جو نہ تو مذہب کے اصولوں کے مطابق ہیں اور نہ معاشرے کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔

عقیدہ اور تشدد

اسلام ازم کی تشدد پسندی ساری دنیا خاص طور پر اسلامی دنیا میں تشویش کا باعث بنی ہوئی ہے۔ کئی ملکوں مثلاً الجزائر اور مصر میں مختلف فرقوں اور عقائد رکھنے والوں کے درمیان خانہ جنگی کی صورت درپیش ہے اور افسوس یہ کہ ان ملکوں میں باجبروت حکومتیں قائم ہیں۔ ان ملکوں کے درمیان پاکستان کئی حیثیتوں سے ایک امتیازی درجہ رکھتا ہے۔

۱۔ ایک بین الاقوامی تحریک کے طور پر جہاد کا آغاز یہیں سے ہوا۔

۲۔ الجزائر اور مصر کے برعکس یہاں پارلیمانی طرز حکومت قائم ہے اور یہاں ۱۹۸۸ء سے اب تک چار مرتبہ انتخابات ہو چکے ہیں جن میں اسلامی پارٹیوں کے ووٹوں کا تناسب برابر کم ہوتا آیا ہے۔

۳۔ الجزائر اور مصر کے برعکس جہاں سنی اکثریت حاوی ہے' پاکستان مختلف النوع آبادی کا ملک ہے جہاں غیر سنی کل آبادی کے ایک چوتھائی ہیں۔ علاوہ ازیں سنیوں میں بھی شریعت کی بنیاد پر اختلافات موجود ہیں۔ اس کی ایک نمایاں مثال بریلویوں اور دیوبندیوں کا باہمی تنازعہ ہے' جو تشدد پر ختم ہوتا آیا ہے' جہاں اس بنیاد پر یہاں تشدد کے واقعات پھیلتے رہے ہیں۔ اس وقت تک ہم نے سنیوں اور شیعوں کی باہمی دہشت گردی

دیکھی ہے اور یہ بھی دیکھا کہ سنیوں کے دھڑے عیسائیوں اور احمدیوں کے خلاف برسر پیکار ہیں اور بریلوی دیوبندی تنازعے میں قتل و غارت گری ہو رہی ہے۔

۴۔ ”یوں کہنا چاہئے کہ پاکستان اسلامیت“ کی وہ ریاست ہے جو اس محاذ پر سب سے آگے ہے۔ افغانستان میں جنگ جاری ہے اور اس کے کئی طرح کے اثرات پاکستان کی داخلی صورت حال پر مرتب ہو رہے ہیں۔

۵۔ پاکستان نظریاتی طور پر ایک متضاد سیاسی ملک ہے۔ یہاں اسلام سے تعلق کی سیاسی راگنی نے ارباب اقتدار کی ساکھ کو سہارا دیا ہے۔ ان کی عشرت کوشیوں اور مغرب کی تقلید کی روش کی پردہ پوشی کی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اسلامیوں کی نظریاتی اقلیت نے اس مقتدر اشرافیہ پر اپنی کڑی گرفت قائم رکھی ہے جو اخلاقی طور پر کمزور اور غیر محفوظ ہے۔ یہ ہے وہ صورت جس سے پتہ چلتا ہے کہ انتہا پسند مذہبی گروہ اگرچہ اقلیت میں ہے اور رائے دہندوں نے اسے ہمیشہ مسترد کیا ہے اس کے باوجود اس کا دبدبہ باقی ہے۔

اسلام آباد میں مصری سفارت خانے میں بمباری کے بعد سے میکلوڈ روڈ کے حالیہ قتل عام تک اس ملک میں انتہا پسند اسلامی دہشت گردوں کے ہاتھوں لاتعداد معصوم لوگ ہلاک ہو چکے ہیں۔ لیکن ان سانحوں کے باوجود نہ تو اس ملک میں کسی اثر کا پتہ چلتا ہے اور نہ ان پر کوئی اثر ہوتا ہے جن کی پالیسیوں کے نتیجے میں اس نام ”نہاد اسلامی دہشت گردی“ کا بیج بویا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ”جہاد انٹرنیشنل“ نام کی یہ عالمگیر تحریک ایک نیا روپ ہے ایک جدید بین الاقوامی گروہ کا جس کے بانیوں میں امریکہ، پاکستان، سعودی عرب اور اسرائیل کی حکومتیں شامل ہیں۔ یہ عقیدہ کہ جہاد یعنی مسلح جدوجہد کے ذریعے کامیابی حاصل کی جائے اور جو بیسویں صدی کے آخری ربع حصے میں پایا جاتا تھا۔ اسے افغانستان میں امریکہ کی شروع کی ہوئی کمیونسٹ دشمن مہم سے ایک نئی توانائی ملی۔ اسرائیل کے حملے اور لبنان پر اس کا تسلط مغربی کنارے (West Bank) اور جولان پر اس کا مسلسل قبضہ یہ ہیں وہ واقعات جن سے مسلح کارروائی کے تصور کو ایک اخلاقی جواز مل جاتا ہے اور اسے مزید طاقت حاصل ہوتی ہے۔

امریکہ میں اسلامیوں کی جانب سے مغربی کنارے، غزہ اور جولان پر اسرائیل کے قبضے کے خلاف مزاحمت اور نیویارک انٹرنیشنل ٹریڈ سنٹر کو بم سے اڑا دینے کی مبینہ سازش جیسے واقعات نے ذرائع ابلاغ اور دوسرے پروپیگنڈہ بازوں کو شہ دی ہے کہ سیاسی مقاصد کے تحت مسلمانوں کو رسوا کریں اور اسلام کو مغربی مفادات بلکہ خود اسلامی تہذیب کے لئے خطرہ بنا کر پیش کریں۔ ان کی یہ تحریک نہایت درجہ مشکوک ہے۔ کیونکہ وہ عربوں کی مزاحمت کی مذمت کرتے ہوئے ایک وسیع علاقے پر اسرائیل کی جارحانہ کارروائیوں کو معاف کر دیتے ہیں، جسے خود امریکہ کی امداد حاصل ہے۔ یہ اس لئے بھی مشکوک ہے کہ امریکہ اور یورپ آج جن گروہوں اور افراد کو ڈھٹائی کے ساتھ ”اسلامی بنیاد پرست“ کہتے ہیں اور ان پر لعن طعن

MashalBooks.org

کرتے ہیں ان کو پھیلانے اور تقویت دینے کا تاریخی کردار ماضی میں انہوں نے ہی انجام دیا تھا۔ امریکہ اور یورپ کے ممالک' مطلب نکل جانے کے بعد بڑی حد تک الگ ہو گئے لیکن جن لوگوں کے درمیان انہوں نے تشدد آمیز نظریاتی مہم کا آغاز کیا تھا' وہ مسلسل اس کی بھاری قیمت ادا کر رہے ہیں۔

"جہاد" نے اب سے پہلے کبھی اس صدی میں تشدد کی یہ صورت اختیار نہیں کی تھی اور اس کا موجودہ "اسلامی" اور "بین الاقوامی" کردار نہیں بنا تھا۔ بیسویں صدی مسلمانوں کی سیکولر "غیر مذہبی" جدوجہد کی صدی تھی۔ عثمانیوں نے اپنی آخری جنگ خالصتاً دنیوی مقاصد کے تحت لڑی تھی۔ وہ اپنی زمین بوس ہوتی ہوئی سلطنت کو بچانا چاہتے تھے۔ خاص طور پر شرق وسطی میں جہاں ان کے دشمن بڑی حد تک مسلمان ہی تھے۔ سعد زغلول کے عروج سے عبدالناصر کے انتقال تک مصریوں کی قومی تحریک سیکولر' واضح طور پر عرب اور اپنے کردار میں مصری ہی رہی۔ عراق' شام' فلسطین' لبنان کی قومی تحریکوں پر بھی یہ بات صادق آتی ہے۔ ترکوں نے اپنی آزادی نہایت بے لاگ قسم کی سیکولر ازم کے پرچم تلے حاصل کی۔ ایران کے قوم پرستوں نے جدوجہد کی اور اس صدی کے اوائل میں بلجیم کے نمونے کا آئین بنایا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی نیشنل ازم جس کی مخالفت علما کی اکثریت نے کی' مطالبہ پاکستان کے خطوط متعین کئے اور پاکستان بنا لیا۔ ان سب تحریکوں سے دوسری مسلمان اقوام میں کچھ ہمدردی کا جذبہ تو اٹھا جو انہی کی طرح اپنی آزادی کے لئے نوآبادیاتی نظام کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے' لیکن پان اسلام ازم کا مقصد تو کسی کے بھی پیش نظر نہیں تھا۔

جہاد' بمعنی جدوجہد جو عربی کے فعل جد) سے ماخوذ ہے' نوآبادی تسلط کے خلاف آزادی کی تحریکوں میں مسلمانوں کا ایک پسندیدہ لفظ رہا ہے۔ جب میرے بھائی کو قوم پرستی کا ایک پرچم لہرانے پر اسکول سے نکال دیا گیا تو ہمارے گاؤں میں اس کا خیر "مقدم مجاہد" کے لفظ سے کیا گیا' یعنی جدوجہد کرنے والا۔ مغرب میں الجزائر کے قوم پرستوں نے فرانس کے خلاف مسلح جدوجہد کی اور اس مہم میں نہایت صبر آزما سات سال گزرے' انہیں مجاہدین کہا گیا اور ان کے خبرنامے کو المجاہد کا نام دیا گیا۔ اس اخبار کی ادارت کچھ عرصے تک فرانز فینس (Frantz Fennon) نے کی جو ایک غیر مسلم تھے۔ اور اس جدوجہد کی قیادت ایک سیکولر تنظیم نے کی جس کا نام قومی محاذ آزادی (National Liberation Front) تھا۔ تیونس میں قومی جدوجہد کی قیادت حبیب بورقیبہ نے کی جو نہایت کٹر قسم کے سیکولر تھے اور جنہیں بہر حال مجاہد الاکبر کے لقب سے یاد کیا گیا۔ ۱۹۷۸ء کے ایرانی انقلاب میں جہاد کا لفظ کبھی کبھی تحریک کو بڑھاوا دینے کے لئے سنا گیا' لیکن شاہ کے خلاف بغاوت کی علامت لفظ انقلاب تھا۔ ایران کی انقلابی حکومت نے برسر اقتدار آنے کے بعد جہاد سازندازی کا آغاز کیا۔ جہاد کا لفظ تعمیر نو کے لئے تھا اور جو تحریک عمل کی علامت تھا۔ صرف ایک موقع سے قطع نظر یعنی جب افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف جنگ شروع ہوگئی' جہاد کا لفظ بیسویں صدی میں ہمیشہ قومی' سیکولر اور سیاسی اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوتا آیا ہے۔

MashalBooks.org

اس صدی میں پہلی مرتبہ مسلم قوموں کی جدوجہد آزادی میں اسلامی پارٹیاں جو "بے دین کمیونزم" کے خلاف تھیں، جھنڈے لے کر نکلیں۔ جن کا عہد تھا کہ تشدد سے دشمن کو نکال باہر کریں گی اور جن کا عزم افغانستان میں ایک "اسلامی ریاست" کا قیام تھا۔ ان کے یہاں جہاد کا مفہوم عین اپنے کلاسیکی معنی میں دینی تھا۔ ستم ظریفی یہ کہ ان کی پشت پناہ مغربی طاقتیں تھیں، حالانکہ آزادی کی کسی تحریک میں ایسا نہیں ہوا۔ امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے مجاہدین کو تقریباً دس بلین ڈالر کا اسلحہ اور سازوسامان فراہم کیا۔

اس جہاد میں انہوں نے مجاہدین کی بے پایاں طاقت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کو اعتبار بخشا اور ان کے ذرائع ابلاغ ان کی شان و شوکت اور چمک دمک کو خوب نمایاں کیا۔ ایک واقعہ خاص طور پر یاد رہے گا کہ افغانستان کے کٹر اسلام پسندوں نے جب وائٹ ہاؤس میں حاضری دی تو صدر رونالڈ ریگن نے انہیں دنیائے اسلام کا ویسا ہی قائد قرار دیا" جیسے ہماری ریاست کے بانی" تھے۔ اس طرح امریکی اور یورپی ذرائع ابلاغ نے افغانستان کی جنگ کو ۱۹۸۰ء کے عشرے کی سب سے بڑی خبر بنا کر ابھارا اور پیش کیا۔ غیر ملکی اخباری نمائندوں نے مجاہدین کی ولولہ انگیز کامیابیوں کی خبریں نکالنے کے لئے ہندوکش پہاڑ کا کونہ کونہ چھان مارا چونکہ تیسری دنیا کے ملکوں میں مغربی ذرائع ابلاغ کو بڑا معتبر سمجھا جاتا ہے اور اسے بڑی اہمیت دیتے ہیں لہٰذا افغان جنگ کے متعلق اس کی خبروں نے مسلمان نوجوانوں کو بہت متاثر کیا۔ ذرائع ابلاغ کے درمیان مقابلہ اتنا سخت تھا کہ کولمبیا براڈ کاسٹنگ (CBS) نے اسلام اور اشتراکیت کے درمیان جنگ کا ایک اسٹیج تیار کرایا اور اس کی فلم بندی کے لئے بھاری رقم صرف کی۔

افغانستان میں روس کی مداخلت کے ایک ہی سال کے اندر اس کی جدوجہد نے پین اسلام ازم جہاد کی راہ اختیار کر لی۔ سیکڑوں بلکہ ہزاروں مسلمان نوجوان الجزائر، فلپائن، سوڈان اور سنکیانگ جیسے دور دراز مقامات سے چل کر پشاور اور طورخم پہنچنے لگے، جہاں انہوں نے اسلحہ کے استعمال کی تربیت، مختلف اسلامی پارٹیوں کی تحت ہدایت کے تحت حاصل کی اور نظریاتی طور پر نہایت پختہ ہو گئے اور جہاد فی سبیل اللہ کا کم و بیش ذائقہ بھی چکھا۔ امریکی حکومت اور اس کی سرپھری مخبر ایجنسی کو اس سارے عمل میں ایک سرد جنگ جاری رکھنے کا موقع مل گیا۔ یعنی اشتراکیت کے خلاف شہ زور اسلام پسندوں کی محاذ آرائی۔ اگر سوویت یونین اچانک ختم نہ ہو گیا ہوتا تو ممکن ہے کہ امریکہ اس تاریخی تحریک جہاد سے اب تک فائدہ اٹھا رہا ہوتا۔

افغانستان کی جنگ امریکی امداد اور تعاون سے جو پر تشدد پان اسلامی کردار اختیار کرتی جا رہی تھی، اس کا ہمیں علم تھا لیکن کسی بھی ملک نے مثلاً الجزائر نے یا مصر نے دور دراز کے علاقے میں ہونے والی جنگ کے اندر اپنے شہریوں کی شرکت پر احتجاج نہیں کیا۔ پاکستان ان کا خیر مقدم کر رہا تھا جب کہ دوسرے بے تعلقی سے یہ سب دیکھ رہے تھے اور جب افغان بغاوت اپنے انجام کو پہنچی تو سب نے اپنے منہ پھیر لئے۔ مثلاً ۱۹۸۶ء میں یہ بات میرے علم میں آئی کہ مصر کی مخبر ایجنسی پشاور میں موثر طور پر موجود ہے اور بھرپور

MashalBooks.org

معلومات اس ضمن میں اکٹھا کر رہی ہے کہ جہاد میں آبادی کے کس حصے کا کیا تناسب ہے۔ انہوں نے صورت حالات پر محض نظر رکھی تھی۔ امریکہ بہر حال مددگار بھی تھا اور فیض رساں بھی۔ لہٰذا ان کے کام میں مصری مداخلت نہیں کر سکتے تھے اب الجزائر اور قاہرہ سے پاکستان کو اس مفہوم کے مطالبے موصول ہونے لگے کہ ان کے شہریوں کو واپس بھیجا جائے۔ وہ بھی اس وقت جب امریکہ افغانستان میں اپنی سرمایہ کاری کا پورا پورا منافع کما چکا تھا۔ نتیجہ یہ کہ الجزائر اور مصر میں واپس جانے والوں پر اچھی طرح عذاب توڑا گیا۔ لیکن ان ملکوں کی حکومتوں نے ہزاروں کی تعداد میں جو مسلح دہشت گرد تیار کئے اور اب تک تیار کر رہی ہیں ان سے نجات پانے کے لئے یہ ملک کس سے درخواست کریں؟

جہاد کو بین الاسلامی رخ دینا تاریخ میں ایک نئی صورت حال ہے۔ زمانہ وسطیٰ کی زبردست صلیبی جنگوں کے بعد سے اب تک جہاد نے تہذیبی، نسلی، لسانی اور علاقائی حدود کو پار نہیں کیا تھا۔ پان اسلام ازم نے ایک تحریک کے طور پر نہایت مختصر عرصے کے لئے انیسویں صدی میں سر اٹھایا، اس وقت جمال الدین افغانی اور سید احمد شہید جیسے نظریہ ساز اس کا پرچم لے کر نکلے تھے۔ اس تحریک کے عروج کا دور وہ تھا جب ہندی مسلمانوں نے خلافت عثمانیہ کو بچانے کے لئے تحریک خلافت کا آغاز کیا۔ اس کے رہنما علی برادران اپنی تحریک کو جہاد کا نام دیتے تھے۔ لیکن اس میں تشدد کا عنصر شامل نہ تھا، اس کی امداد گاندھی جیسے غیر مسلم صلح جو بھی کر رہے تھے، قائداعظم نے تو اس کو پسند نہیں کیا اور بعد میں پاکستان قائم کیا۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس تحریک میں پان اسلام ازم کی گونج نہ ہونے کے برابر تھی اور اس کو عربوں، ایرانیوں اور ترکوں نے بھی یکساں طور پر رد کر دیا، ان کے نزدیک یہ خالصتاً ہندوستانیوں کی اختراع اور ان کے ذہنی خبط کی آئینہ دار تھی۔

مسلمان دانشوروں کی ایک نہایت معمولی تعداد کے اندر پان اسلام ازم کے تصور کو ایک موہوم خواہش کی حیثیت حاصل رہی۔ کچھ شاعروں اور جدید مصنفوں کے یہاں جن میں محمد اقبال شامل ہیں اس کے اثرات نمایاں ہوئے۔ مسلمانوں کی برادری کے اندر یگانگت کا احساس جس پر اسلام ازم کی اساس ہے، فلسطین اور بوسنیا وغیرہ کے ہم مذہب لوگوں کے ساتھ اتحاد کی صورت میں ظاہر ہوتا آیا ہے۔ اس کے باوجود مسلم عوام کی قومی جدوجہد ہمیشہ قومی ہی رہی ہے اور اس میں پان اسلام ازم کو اتحاد کے ایک رسمی جذبے کی حیثیت حاصل رہی۔

اس کے مقابلے میں افغانستان کی جنگ کے ساتھ پان اسلام ازم، مالیاتی، تہذیبی، سیاسی اور عسکری اعتبار سے بھرپور طاقت بن کر عالمی سطح پر سامنے آئی، جس کا باہمی رابطے اور تعارف کے ضمن میں ایک موثر نظام مرتب ہو گیا۔ کئی طرح کے ادارے، مدارس، اسلامی یونیورسٹیاں، ٹریننگ کیمپ اور کانفرنسوں کے مراکز پاکستان میں اور دوسری جگہوں پر بھی قائم ہو گئے۔ اس میں کمائی کے بے اندازہ مواقع تھے لہٰذا اسلحہ اور منشیات کے تاجر بھی اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے لئے شامل ہو گئے۔ اسلحہ سونے، دین اور دنیا

کے کاروبار سے وابستہ نفع اندوزوں کا ایک غیر رسمی لیکن غیر معمولی ادارہ بن گیا۔

جہاد میں بین الاقوامی شراکت سے نہ صرف اسلامی گروہوں کے درمیان رابطے مستحکم ہوئے بلکہ اس نے روایتی انداز سے کام کرنے والی پارٹیوں کو بھی اسلحہ بندی کی راہ پر لگا دیا۔ پاکستان میں اس کی ایک مثال جماعت اسلامی ہے۔ افغانستان میں ملوث ہونے سے پہلے یہ ایک روایتی انداز کی پارٹی تھی، جس میں کارکنوں کے درجے ہوتے تھے ان کے کام کا فکری انداز تھا اور مسلح زور آزمائی کی بجائے سیاسی عمل میں جرح و بحث اور احتجاج اس کا معمول تھا۔ آج پاکستان میں افواج پاکستان اور رینجرز کو چھوڑ کر غالباً یہ سب سے زیادہ جنگ جو جنگ آزما اور مسلح دستوں پر مشتمل پارٹی ہے۔ ۴۹۔ ۱۹۴۸ء میں اس کے نظریاتی سربراہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے کشمیر میں جہاد کے تصور کو دینی لحاظ سے مسترد کر دیا تھا۔ آج انہی کی جماعت کشمیر میں اپنی مسلح مداخلت کا ڈھنڈورا کرتی پھرتی ہے۔ امریکی حکومت اور اس کے ذرائع ابلاغ تو مسلمانوں کے مسلح ابھار کا ذمہ دار ایران کو قرار دیتے ہیں کہ ان کے خیال میں اس کا آغاز وہیں سے ہوا لیکن دراصل مسلح اسلامی جہاد کی نشو ونما ضیاء الحق کے پاکستان میں ہوئی اور امریکہ کے سرمائے اور سی آئی اے کی مدد سے ہوئی۔ حالیہ برسوں میں روایتی انداز کی دوسری پارٹیاں مثلاً جمعیت العلمائے اسلام بھی طالبان کے ساتھ رابطے اور کشمیر میں اپنے ملوث ہونے کی بنا پر اپنی تنظیم فوجی خطوط پر کرنے لگی ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے فرقہ وارانہ مسلح گروہ، سپاہ صحابہ، لشکر جھنگوی، حرکت الانصار، سپاہ محمد، لشکر طیبہ اور انجمن سرفروشان اسلام ابھر کر آ گئے ہیں۔ ان کا وجود معاشرے کے لئے بھی اتنا ہی خطرے کا موجب ہے جتنا ریاست کے لئے۔ ان سب کی ساخت فرقہ واریت کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ دوسری زیادہ پرانی مذہبی جماعتوں مثلاً جماعت اسلامی اور جمعیت العلمائے اسلام نے اسلامیت کا جو تصور وضع کیا یہاں فرقہ وارانہ تنظیموں کا تصور ان سے بہت دور کا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کے مقاصد انہی جماعتوں سے وابستہ ہیں اور انہیں اپنی بقا کے لئے مطلوبہ طاقت ہمسایہ ملکوں میں ہونے والی ان جنگوں سے میسر آتی ہیں جو اسلام کے نام پر لڑی جا رہی ہوں۔

جہاد انٹرنیشنل کی پیدائش کے ساتھ ہی ایک اور صورت حال پیدا ہوئی، جس کے پاکستان پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ایران کے پرجوش نوجوانوں نے تہران میں امریکی سفارت کاروں کو یرغمال بنا لیا۔ یرغمالیوں کے معاملے نے بحران کی صورت اختیار کر لی اور بہت طول کھینچا۔ اب سیاسی اور اسلامی کی دو الگ الگ توضیحات کی گئیں اور ان دونوں کے درمیان مقابلے کی صورت پیدا ہو گئی۔ ایک کا آغاز سعودی عرب نے اور ۱۹۸۸ء کے زمانے تک عراق نے کیا اور دوسرے کی مدد ایران نے کی۔ امریکہ اس صورت حالات میں ملوث تو ہوا لیکن اس کی منطق لازماً ایک علاقے تک محدود رہی۔ ایران کے اسلامی انقلابی امریکہ کو ایک ملوکیت سمجھتے ہوئے اس کی مخالفت میں کسی سمجھوتے پر تیار نہیں تھے۔ انہوں نے بادشاہت کو بھی حکمرانی کی

MashalBooks.org

غیر اسلامی وضع قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا تھا۔ اب سعودی عرب کی قدامت پرست امریکہ نواز بادشاہت کو ایران سے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ ریاض نے فوراً ایران کی اس نئی اسلامی توجیہ کا مقابلہ کیا اور اس نیک کام میں کویت کی طرح خلیج کے شیوخ نے اس کی امداد کی۔ جب ۱۹۸۱ء میں صدام حسین کی سیکولر حکومت نے ایران کے خلاف جنگی مہم شروع کی، جس کی ایک نظریاتی ساخت تھی۔ پھر تو اسلامی تنظیمیں دنیا بھر میں جہاں جہاں بھی تھیں ایک یا دوسرے دھڑے میں شامل ہو گئیں۔

لبنان، پاکستان اور افغانستان جیسے سنی شیعہ آبادیوں کے ملے جلے ملک میں اس بدلتی ہوئی صورت حال کا سب سے زیادہ اثر ہوا، کیونکہ اس طرح فرقہ وارانہ گروہوں اور فرقہ پرست افراد کو پرانی عداوتیں بھڑکانے کا نیا موقع ہاتھ آ گیا۔ نہ تو امریکہ اور نہ سعودی عرب اور عراق نے اس وقت شیعہ سنی منافرتیں بھڑکانے کا ارادہ کیا ہو گا۔ ان کی دلچسپی تو اس بات میں تھی کہ ایران کے بڑھتے ہوئے اثر کا توڑ کرنے کے لئے اپنے خاص طرز کے قدامت پرستانہ اسلام کو آگے بڑھائیں۔ لیکن مقامی طور پر ایران دشمنی آسانی کے ساتھ شیعہ دشمنی میں بدل گئی۔

لبنان، پاکستان اور افغانستان جیسے سنی شیعہ آبادیوں کے ملے جلے ملک میں اس بدلتی ہوئی صورت حال کا سب سے زیادہ اثر ہوا، کیونکہ اس طرح فرقہ وارانہ گروہوں اور فرقہ پرست افراد کو پرانی عداوتیں بھڑکانے کا نیا موقع ہاتھ آ گیا۔ نہ تو امریکہ اور نہ سعودی عرب اور نہ عراق نے اس وقت شیعہ سنی منافرتیں بھڑکانے کا ارادہ کیا ہو گا۔ ان کی دلچسپی تو اس بات میں تھی کہ ایران کے بڑھتے ہوئے اثر کا توڑ کرنے کے لئے اپنے خاص طرز کے قدامت پرستانہ اسلام کو آگے بڑھائیں۔ لیکن مقامی طور پر ایران دشمنی آسانی کے ساتھ شیعہ دشمنی میں بدل گئی۔

پاکستان میں اس عمل کا ایک نتیجہ سپاہ صحابہ کا قیام ہے۔ سب سے پہلے اس کی بنیاد سعودیوں نے رکھی پھر ان کے ساتھ عراق شامل ہو گیا۔ دہشت گردی اور اس کے جواب میں جو دہشت گردی ہوئی، اس کے تسلسل میں ایرانی سفارتکار اور تربیت کے لئے آنے والے افراد، امریکی کاریگر اور مساجد و امام بارگاہوں میں عام لوگ اور ابھی حالیہ دنوں میں قبرستان میں موجود عزادار ہلاک کئے جا چکے ہیں۔ بقائے روح کی یہ جنگیں اس خواہش تک جا پہنچتی ہیں کہ جسم کتنی زیادہ تعداد میں گرائے گئے۔

ماضی اور مستقبل میں پھنسے ہوئے

اس میں شک نہیں کہ یہ اسلامی گروہ بندی اور فرقہ وارانہ تنظیم سازی بڑی حد تک افغانستان کے "فاتحانہ جہاد" کے نتیجے میں ہوئی ہے جسے نہایت جوش و خروش سے پھیلایا گیا اور اسے مسلح کر کے بین الاقوامی سطح پر فروغ دیا گیا۔ اس طرح ایران اور اس کے مخالفوں کے درمیان ایک در پردہ جنگ شروع

MashalBooks.org

ہوگئی۔تاہم یہ یادر ہے کہ اگر پاکستان'الجزائر'مصر'سوڈان'لبنان یا فلسطین کی سرزمین فرقہ واریت کے لئے زرخیز نہ ہوتی تو بین الاقوامی اسباب کی اگائی ہوئی یہ فصل اس قدر لہلہا کر تیار نہ ہوتی۔اسلام ازم کے پھیلاؤ اور اس کی نشو ونما کا تعین مقامی اسباب کے تحت ہوتا ہے۔جیسا کہ پاکستان میں ضیاءالحق کے دورِ حکومت اور الجزائر میں فوجیوں کی حکمرانی سے ظاہر ہے۔لبنان اور فلسطین میں اور سوویت مداخلت کے دوران افغانستان میں جہاد کا نعرہ غیر ملکی تسلط کے خلاف مزاحمت کی آواز بن گیا۔

جہادازم جیشل اور ایران اور اس کے مخالفین کے درمیان محاذ آرائی کو ایسے وقت فروغ حاصل ہوا' جب پاکستان کا ماحول مذہبی سرگرمیوں کے لئے خاص طور پر سازگار تھا۔جنرل محمد ضیاءالحق نے "اسلامائزیشن" کا آغاز کر دیا تھا' جس سے اقلیتوں اور خاص طور پر شیعوں میں بے چینی پیدا ہوگئی تھی۔اس کا ایک ردعمل تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کی صورت میں سامنے آیا' جس کا مطالبہ تھا کہ شیعوں پر انہی کی فقہ کا نفاذ ہونا چاہئے۔ان کا مطالبہ قابل فہم تھا تاہم اس سے کٹر قسم کے سنی تشویش میں مبتلا ہوگئے۔

پاکستان میں مختلف فرقوں اور عقائد رکھنے والے لوگ آباد ہیں۔ایسے ماحول میں اس تجویز کو کہ اس کی ریاست اس کے قوانین اور اداروں کی تشکیل مذہبی احکام کے مطابق ہونی چاہئے لازماً تفرقے اور امتیاز پھیلانے کا باعث سمجھا گیا۔بھٹو نے جس طرح احمدیوں کو اقلیتوں کے زمرے میں ڈال دیا تھا' ضیاءالحق کے اسلامائزیشن نے بھی اس ملک کو تفرقے میں ڈال کر مختلف عقائد کے لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کر دیا۔ایک مسلم سوسائٹی میں لازماً یہی ہونا تھا کیونکہ ہماری تاریخ صدیوں سے دینی تنازعوں اور اکثر خوں ریز تصادم میں مبتلا چلی آرہی ہے۔اور یہ وہ نکتہ ہے جسے آج کے سیاست دان بھی نہیں سمجھ سکے جو خود اپنی آنکھوں سے گذشتہ پندرہ سال سے بے نتیجہ خوں ریزی کا منظر دیکھ رہے ہیں۔

مذہبی فرقہ بندی اسلامائزیشن کا لازمی نتیجہ تھی۔سب سے پہلے تو یہ بالکل سامنے کی بات ہے جسے ہمارے سیاست دانوں اور فوجیوں کی کئی نسلیں دیکھنے سے معذور رہیں۔وہ یہ کہ جب ریاست فروغِ دین کی دعویدار بنتی ہے تو یقیناً یہ تنازعہ اٹھے گا کہ کس فرقے کی شریعت نافذ ہو۔دوسری بات یہ کہ جب مذہب کو کھلم کھلا سیاست میں داخل کیا جائے گا تو مذہب رائج الوقت سکہ بن جائے گا۔ایسے میں ہر شخص آزاد ہوگا کہ مذہب کو لوگوں کا تعاون حاصل کرنے کے لئے استعمال کرے اور اپنے حقیقی اور طاقتور حریفوں کو اس کی مدد سے نیچا دکھائے۔اس بیان کی تصدیق کے لئے قومی اور مقامی سیاست میں نئے آنے والوں کی تعداد کو شمار کیا جاسکتا ہے' جن کی آمد ضیاءالحق کے اسلامائزیشن کے بعد شروع ہوئی اور جنہوں نے مذہب کو اپنے مفاد میں استعمال کیا۔آج کے سب سے زیادہ زہریلے اور نفرت پھیلانے والے افراد اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

MashalBooks.org

جب مذہب ایک بار سیاسی سکہ بن جائے اور مضبوط سکہ تو اسے سیاسی میدان میں جائز و ناجائز ہر طرح استعمال کیا جائے گا۔ جو لوگ سیاست میں آگے آنا چاہتے ہیں لیکن جن کے پاس کوئی سیاسی سرمایہ نہیں مثلاً وسیع قطعات اراضی' جدید اور اعلیٰ تعلیم' صنعتی ادارہ خاندانی روابط امکان ہے کہ وہ سیاست کو زیادہ اور نہایت شدت سے استعمال کریں گے۔ چنانچہ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ سپاہ صحابہ اور اس کی شاخ لشکر جھنگوی جھنگ میں پیدا ہوئیں۔ وہاں شیعہ جاگیردار روایتی طور پر مقتدر چلے آ رہے ہیں۔ بہرطور' اقتصادی تبدیلیوں کے تحت گذشتہ چار عشروں میں ایک نیا درمیانہ طبقہ پیدا ہوا ہے' جو روایتی ارباب اقتدار سے مقابلہ کرنے پر مجبور ہے' چنانچہ سپاہ صحابہ کے نئے مڈل کلاس لیڈر' پرانوں کو مسند اقتدار سے ہٹانے کے لئے بے چین ہیں۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں جو نظریاتی ماحول پیدا ہوا اس نے ان لیڈروں کو اپنے حریفوں کے خلاف شیعہ دشمنی اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ نفرت کے نظریے میں یہ بات شامل ہے کہ اس کی شدت برابر بڑھتی رہے۔ نتائج ہمارے سامنے ہیں۔

کچھ دوسرے اسباب جو زیادہ نمایاں نہیں ہمارے سامنے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم موجودہ مسلم معاشروں کے ماضی اور ان کے مستقبل کے درمیان تعلق کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے۔ پوری تاریخ میں ان کے درمیان ایک ربط افسوسناک طور پر موجود ہے۔ اس کو تفصیل کے ساتھ ناقدانہ انداز سے پرکھتے ہیں وہ ماضی کی بامعنی اور پائیدار قدروں کو قریب لاتے ہیں۔ وہ لوگ جنہیں پر اعتماد ہوتا ہے وہ سنجیدگی کے ساتھ اور ناقدانہ احترام ملحوظ رکھتے ہوئے ماضی سے تعلق پیدا کرتے ہیں وہ اس کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کی اقدار' جمالیات اور اسالیب کو' جن کی بدولت پہلے کی تہذیبیں عظمت سے ہم کنار ہوئیں' سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں یا اس کے برعکس اگر زوال پذیر ہوئیں تو اس کے اسباب بھی جاننا چاہتے ہیں۔ وہ گذشتہ تہذیبوں کی باقیات کو محفوظ کر لیتے ہیں' جو اقدار قدر و قیمت رکھتی ہیں' ان کو اپنے اندر شامل کرتے ہیں اور اجتماعی اور انفرادی دونوں طرح گذشتہ واقعات اور تصورات سے توانائی حاصل کرتے ہیں۔

اس کے برعکس' وہ اقوام اور حکومتیں جن کے ذہنوں میں مستقبل کا عکس غیر یقینی ہوتا ہے' ماضی سے بھی ان کا تعلق کچھ اور بگاڑ لئے ہوئے ہوتا ہے۔ وہ زندہ تاریخ سے دور بھاگتے ہیں' اس کے سبق سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں ماضی کی تنقیدی تحقیق سے بچتے ہیں' ماضی کے ورثے کو نظر انداز کر دیتے ہیں' لیکن اس کے ساتھ ہی اپنا ایک نیا خیالی ماضی بناتے ہیں' جو بہت چمک دار اور پر شکوہ ہوتا ہے اسی ماضی کے ڈھانچے پر وہ اپنے زمانے کے تعصبات اور نفرتوں کا ملمع چڑھاتے ہیں۔ اس سچائی کی مزید تصدیق جنوبی ایشیا کی دینی سیاسی تحریکوں اور مسلمانوں کی تحریکوں کے مشاہدے سے ہوگی۔

اس علاقے میں دائیں بازو والے ہندو اور مسلمان دونوں تاریخ کو اس طرح دیکھتے اور پیش کرتے ہیں جس سے فرقہ وارانہ منافرت پھیلے۔ چنانچہ بہت سے مسلمان سالہا سال تک مغل بادشاہ اورنگ

MashalBooks.org

زیب کو ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار اور اس کی برکات کی علامت سمجھتے رہے۔ دوسری طرف ہندو قوم پرستوں نے مرہٹہ سردار شیواجی کو مسلمانوں کی حکمرانی کے خلاف ہندوؤں کی مدافعت کی علامت بنا کر پیش کیا۔ دراصل وہ دونوں ہندوستانی ریاست کے زوال کی بھونڈی تصویریں تھیں' جن کا اپنے ماضی سے کوئی رشتہ نہ تھا' ان کا وجود ریاستی زوال کی طرف اشارہ کر رہا تھا اور ہندوستان میں یورپی سلطنت کے عروج کا آغاز تھا۔ اس ضمن میں' ابھی حال ہی میں بابری مسجد کا واقعہ سامنے آیا اور یوں تاریخ فرقہ وارانہ کرشمہ سازی کا شکار ہوگئی۔

۱۹۹۰ء کے موسم گرما میں اپنی ریسرچ کے سلسلے میں' ایودھیا اور متھرا گیا' ان دنوں شہ زور ہندو جماعتیں' بی جے پی' وی ایچ پی' آر ایس ایس اور بجرنگ دل بابری مسجد کو ڈھا دینے اور اس کی جگہ ایک مندر بنانے کی تحریک چلا رہی تھیں' ان کا دعویٰ تھا کہ رام چندر جی دو ہزار سال پہلے عین اس جگہ پیدا ہوئے تھے۔ میری ریسرچ اسی سلسلے میں تھی۔ اس مہم کے دو پہلو میرے لئے حیران کن تھے۔ ہندو بت پرستوں نے جو اپنے ماضی کو واپس لانا چاہتے تھے' ہندوستان میں مسلم حکمرانی کے دور کے مبینہ مظالم پر مبنی مطبوعات اور (تعلیمی مواد) کا ایک انبار وہاں لگا رکھا تھا' اور اس میں ہندوؤں کی مزاحمت پر مبنی مواد بھی تھا۔ کتابوں کے علاوہ رنگین پوسٹر بھی تھے' جن میں مفروضہ مظالم کی نہایت باریک تفصیلات اور ہندوستان میں ہندو مسلم تصادم کی ولولہ انگیز روداد دکھائی گئی تھی۔ آڈیو کیسٹ پر جو درجنوں کے حساب سے تیار کئے گئے تھے' گانوں میں اور نثری عبارت میں بھی وہ روداد موجود تھی۔ ڈھیروں کے حساب سے جو زہرافشانی تاریخ کے نام پر کی گئی تھی' اس کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ شکر ہے کہ ہندوستان کے سرکردہ تاریخ دانوں میں سے ممتاز شخصیتوں نے تاریخ کے اس رجعتی مواد کی مذمت کی ہے' اس بات کا ذکر جب میں نے بی جے پی کے ایک نظریہ ساز ایم آر ملکانی سے کیا تو انہوں نے ان مورخوں کے خلاف فتویٰ صادر کرنے میں ذرا مروت سے کام نہیں لیا بولے۔ ''ان ہسٹوریئنز کے لئے ہندوستان میں کوئی استھان (جگہ) نہیں ہے۔''

۱۹۷۰ء سے' جب پاکستان میں اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں مطالعہ پاکستان کو ایک لازمی مضمون کے طور پر شامل کیا گیا' اب تک تاریخ کے تنقیدی مطالعہ کی جانب یہی رویہ کارفرما ہے۔ ان بچوں اور نوجوانوں کی ایک بھاری اکثریت کو جنہیں او لیول اور اے لیول میں داخلے کی اہلیت حاصل نہیں' تاریخ کی یہی مسخ شدہ عبارت جو فرقہ واریت پر مبنی ہے پڑھائی جاتی ہے۔ محمد ضیاء الحق کے عرصہ حکمرانی میں تعلیمی نظام کو فرقہ واریت کی راہ پر لگانے کا سلسلہ یہاں تک پہنچا کہ نصاب میں سنی اور شیعہ دینیات کا مضمون الگ الگ پڑھایا جانے لگا اور یہ سلسلہ اب تک برقرار ہے۔ ہمارے سرکاری حکام نے جو ہر روز فرقہ وارانہ سیاست کی مذمت کرتے رہتے ہیں' اسکولوں اور کالجوں میں منافرت پر مبنی نصاب کو اب تک برقرار رکھا ہے۔

پاکستان اور ہندوستان میں اس بات میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں' وہ بھی لائق توجہ ہیں۔

MashalBooks.org

اول یہ کہ ہماری تاریخ کے نازک ادوار میں حکومت نے فرقہ وارانہ عناصر کی طرف داری کی ہے اور تاریخ میں تحقیق، تعلیم اور اس کے فروغ کی نہایت شدت سے حوصلہ شکنی کی ہے۔ دوسرا نمایاں فرق یہ ہے کہ ہماری اعلیٰ تعلیم کے ادارے چونکہ روبہ زوال ہوتے گئے اس لئے ہمارے پورے حکمرانوں کو جن میں ضیاء الحق کا مقام اس معبد میں سب سے نمایاں ہے ایسی تاریخ کا سہارا درکار تھا جو ان کے لئے ایجاد کی جائے۔ نتیجہ یہ کہ مورخ پاکستان میں پنپ ہی نہ سکے۔ تاریخ اور کلچر کے مضامین جن میں اسلامی کلچر اور تاریخ کے مضامین بھی شامل ہیں اب سنجیدہ مطالعہ کا موضوع نہیں رہے۔

دراصل پاکستان میں اسلام اور پاکستان سے زیادہ کسی اور مضمون کو مسخ نہیں کیا گیا۔ یہاں اسلام اور اس کی تاریخ چار عشروں تک حاوی رہی اس کے باوجود ان برسوں میں ریاست یا معاشرے نے نہ تو مذہب پر اور نہ تاریخ پر کوئی سنجیدہ توجہ کی۔ مجھے نہیں معلوم کہ پاکستان میں ان مضامین پر کوئی ایک بھی قابل ذکر کتاب شائع ہوئی ہو۔ اسلامیات کا مضمون ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں ایک لازمی مضمون کے طور پر رائج ہے۔ لیکن اس مضمون میں ایک سرے سے نہ تقویٰ کا شعور ملتا ہے نہ روحانیت کا اور نہ تصوف کا۔ زیادہ سے زیادہ ان میں رسمی باتوں کا تذکرہ ملتا ہے اور بدترین بات کہ اس نے اسلام کو محض ایک ضابطہ تعزیرات بنا رکھا ہے اور اس کی تاریخ دہشت انگیز واقعات کے تسلسل کا بیان ہے۔

پاکستان میں بھی الجزائر کی طرح صدق دلانہ لاعلمی کے سوتے بہت گہرے ہوتے گئے ہیں۔ وہاں تعلیم کو مقامی رنگ دینے کی کوتاہ اندیشانہ کوششیں ۱۹۶۲ء میں نوآبادیات کے خاتمے کے بعد شروع ہو گئیں جس کے نتیجے میں تعلیم کے دو متوازی نظام رائج ہو گئے' ایک فرانسیسی ہے اور دوسرا عربی۔ یہ بڑی حد تک انہی دو نظاموں کے پیدا کردہ نتائج ہیں جو ۱۹۹۲ء سے ایک دوسرے کے ساتھ متصادم ہیں' اس جنگ میں اب تک اسی ہزار جانیں ضائع ہو چکی ہیں اور الجزائر اور اس کے عوام پر بے حد مصائب توڑے گئے ہیں۔ پاکستان میں ادھر کئی عشروں کے دوران میں تعلیم کے دو متصادم نظاموں میں غیر معمولی توسیع ہوئی ہے۔ اس عرصے میں دینی مدارس کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے جنہیں حکومت سے فراخدلانہ مالی امداد اور بیرون ملک سے بے اندازہ رقوم ملتی آئی ہیں۔ وزارت تعلیم کے بیان کی رو سے ۱۹۹۵ء میں پاکستان میں ۳۷۰۶ مدارس موجود تھے جن کے طلبہ کی تعداد ۵۴۰۰۴۸ تھی۔ تدریس کے اعلیٰ مدارج میں طلبہ کی تعداد ۱۸۰۰۵ اور طالبات کی ۴۷۳۸ تھی۔ اگر سماجی اور سیاسی عواقب کو پیش نظر رکھیں تو یہ تعداد قابل توجہ ہے۔ بارہ سے اٹھارہ سال تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہاں کے طلبہ اس کے سوا اور کسی پیشے میں کام کرنے کے اہل نہ ہوں گے کہ مساجد میں امام بن جائیں یا ایک اسلامی ریاست کے خواب دیکھیں جس میں غالباً انہیں مقتدر اشرافیہ کی صف میں شامل کر لیا جائے گا۔

اخبارات میں تبصرہ نگار اکثر انہیں "قرون وسطیٰ" کے مدارس سے موسوم کرتے ہیں جو قرون وسطیٰ

MashalBooks.org

کے مسلمانوں کی تہذیب کی صریحاً توہین ہے۔ ایسی کئی درسگاہوں کا جب اچانک معائنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان کے نصاب اور درسی نظام کی معمولی مشابہت بھی قرون وسطیٰ کے درسی مراکز سے نہیں ملتی ہے' جیسا کہ بارہویں صدی میں الازہر تھا یا تیرہویں صدی میں زیتونہ یا چودھویں صدی میں قراوین تھا۔ ان اسلامی درسگاہوں میں ریاضی' کیمیا' علم نباتات' نجوم اور فلسفے کی تعلیم دی جاتی تھی' جب کہ موجودہ مدارس میں ان میں سے کوئی بھی مضمون نہیں پڑھایا جاتا۔ ان میں سے کوئی بھی فارابی' ابن سینا' شیخ سعدی یا جدید دنیائے اسلام کا امیر خسرو نہ تو پیدا ہوا ہے اور نہ اس کے آئندہ پیدا ہونے کا امکان ہے۔ موجودہ مدارس کے نصاب کو چند تعزیرات تک محدود کر دیا گیا ہے اور وضو' طہارت اور نماز ان کے علاوہ گناہ اور سزا اور تعزیر کے بروقت نفاذ تک لا کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ان اداروں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلنے والے ایسے ہزاروں پر جوش اور متحرک نوجوان ہیں' جنہیں بیچ دھارے میں لا کر چھوڑ دیا گیا' اپنے اصل ماضی سے وہ کٹ چکے ہیں اور مستقبل کے چیلنج کو قبول کرنے کی ان میں صلاحیت نہیں۔ وہ صرف ایک دینی سیاست کا خواب دیکھ رہے ہیں اور اسی کے بخار میں مبتلا ہیں۔ وہ بھی ایک تاریخ جسے تاریخ کا نام نہیں دیا جا سکتا مرتب کر سکتے ہیں یعنی فرقہ واریت کے تحت لشکر بنا کر ملک کو صاف پاک کرنے کی مہم پر نکل کھڑے ہوں اور وہ اسلامی نظام قائم کریں جسے وہ اپنے قیاس کے مطابق چلانے کے اہل ہیں۔ طالبان جو پاکستان کے مدارس کے فارغ التحصیل ہیں' ہمارے مذہبی اور سیکولر اسکولوں اور کالجوں کے بیشتر طلبہ کے لئے قابل تقلید بن کر سامنے آئے ہیں۔ تشویش کی بات یہ ہے کہ وہ پاکستانی جنہوں نے طالبان کے شانہ بشانہ جنگ میں شرکت کی ہے' تعداد میں دس ہزار سے پندرہ ہزار تک ہیں۔ پاکستان میں مسلح اسلامی جنگ آزماؤں کی مجموعی تعداد ایک اندازے کے مطابق پینتالیس ہزار سے پچاس ہزار تک ہے اور ان میں بہت سے وہ ہیں جنہوں نے افغانستان اور کشمیر کی جنگوں میں حصہ لیا ہے۔

بہت سے پاکستانی دہشت گرد جنہیں یہاں مواخذے کے لئے پیش ہونا تھا اور جن کی یہاں تلاش ہے' آسانی سے افغانستان میں پناہ حاصل کر لیتے ہیں' یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے بہت کم منظر عام پر لایا گیا ہے۔ قاری اللہ وسایا' جن کے بارے میں باور کیا جاتا ہے کہ ڈیرہ غازی خاں جیل سے نکالنے کے لئے افغانستان کے حرکت الانصار کیمپ سے یہاں بلایا گیا تھا اور ۱۱ جنوری کو مومن پورہ کے قبرستان میں جو قتل عام ہوا تھا وہ دراصل اس واقعہ کی سالگرہ تھی جو اس تاریخ کو بم کے دھماکے کی صورت میں ہوا اور جس میں سپاہ صحابہ کا ایک بانی رہنما ہلاک ہو گیا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ پولیس کی حوالات میں اللہ وسایا کی ہلاکت بھی اسی سے متعلق تھی۔ اس کے جواب میں قتل عام پر احتجاج کرنے والوں نے ڈپٹی کمشنر لاہور اور پوسٹ ماسٹر کے دفتر پر حملہ کر کے اسے آگ لگا دی تھی۔ واقعات کا یہ تسلسل کچھ دوسرے وقوعوں کی طرح اس متضاد رویے کی علامت ہے جس کی بنا پر ریاست فرقہ وارانہ تشدد کے چکر میں پھنس جاتی ہے۔

MashalBooks.org

پاکستان یا ہندوستان میں جب دہشت گردی کی کوئی وحشیانہ واردات ہوتی ہے یا کوئی ہلاکت خیز واقعہ رونما ہوتا ہے تو دونوں ملکوں کے حکام ایک دوسرے کے اداروں را' اور آئی ایس آئی کو مورد الزام قرار دیتے ہیں' کوئی ایک عشرہ پہلے تک اس طرح کے الزامات اتنے تواتر سے سننے میں نہیں آئے لیکن چونکہ اب سنے جا رہے ہیں تو اس سے ایک حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ کہ ہندوستان اور پاکستان میں ایک دوسرے کے خلاف ہونے والی غیر اعلانیہ جنگ میں شدت پیدا ہو گئی ہے۔ کئی مرتبہ پاکستان نے اس شبہ کا اظہار کیا کہ ہندوستان نے ۱۹۸۰ء کے عشرے میں توڑ پھوڑ اور دہشت گردی کرانے کے لئے افغان دہشت گردوں کی مدد کی' ان دہشت گردوں نے کراچی میں نسلی و لسانی فسادات کرائے اور پاکستان کے طول و عرض میں مذہبی و فرقہ وارانہ تشدد کی آگ بھڑکائی۔ اس کے جواب میں ہندوستان نے پاکستان پر یہ الزام لگایا ہے کہ اس نے پنجاب میں بپھرے ہوئے سکھوں کی مدد کی' کشمیر میں شہ زور مسلمانوں کو امداد فراہم کی اور بمبئی اور دہلی میں دہشت گردوں کے ذریعے بموں کے دھماکے کروائے۔ غیر جانب دار مبصروں کا خیال ہے کہ ان الزامات میں خاصی حد تک صداقت پائی جاتی ہے۔

ممکن ہے کہ اس حقیقت کے پیش نظر کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں نے جوہری اسلحہ بنانے کی اہلیت حاصل کر لی ہے۔ ان کے درمیان اس وجہ سے در پردہ جنگ میں شدت آ گئی ہے اور وارداتیں بڑھ گئی ہیں۔ امریکہ اور سوویت یونین نے ایک دوسرے کو جوہری ہتھیاروں کی موجودگی سے ڈرا کر انہیں زیر کرنے کی کوشش کی' ایک دوسرے کے مخالفوں کو بھڑکایا' ان کے باغیوں' انحراف کرنے والوں اور انقلابیوں کو امداد پہنچائی اور ایک دوسرے کے دائرہ اثر میں مداخلت کی۔ ایران' کوریا' ویت نام' کیوبا اور مشرق وسطیٰ میں دونوں بھاری بھرکم ملکوں کے درمیان تصادم ہوتے رہے۔ پھر جوہری اسلحہ کی دھمکی سے اس کشیدگی میں کمی آ گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان بھی اسی خوف کی منطق کا شکار ہو گئے ہیں۔

وہ ممالک جو عبوری دور سے گزر رہے ہیں' جن میں تیز رفتار سماجی تبدیلی کے سبب عدم استحکام اور کئی طرح کی کشیدگی پائی جاتی ہے جن کے درمیان کوئی طویل جغرافیائی فاصلہ بھی نہیں جو ان کے لئے سود مند ہوتا' جن کے پاس اختیارات اور کنٹرول کے استعمال کا کوئی موثر مربوط اور دور تک پھیلا ہوا نظام بھی نہیں کہ ایک دوسرے کے خلاف انتہائی حکمت عملی کو محتاط انداز سے برت سکیں' انہیں اس بات کا شدید خطرہ لاحق ہے کہ حالات کا غلط اندازہ کر کے کسی خطرناک مہم میں کود پڑیں۔

آخر میں' میں اس بات پر زور دوں گا کہ ہمارے معاشرے میں تشدد کے اسباب مختلف ہیں' جیسا کہ تشدد کے علانیہ اظہار کی صورت میں مختلف معاشروں کے اندر ہوتا ہے۔ وہ اسباب یہ ہیں (ا) تشدد کے کلچر کی موجودگی۔ زمانہ حال سے پہلے' اگلے وقتوں میں روایتی اقدار اور سماجی عمل نے تشدد کے کلچر کو اثر انداز ہونے سے ایک حد تک روک رکھا تھا۔ اب تیز رفتار اور ناہموار سماجی اور اقتصادی تبدیلیوں کے باعث پرانی

اقدار کھو کھلی ہو گئی ہیں اور تشدد کا کلچر بدستور موجود ہے۔ (ب) سیاست میں مذہب کا داخلہ اور دین کی فیض رسانی کے وعدے جن کے نتیجے میں فرقہ وارانہ تفرقے اور مطالبے سامنے آ رہے ہیں۔ (ج) امریکہ کی جانب سے پھیلایا جانے والا بین الاقوامی سطح کا جہاد' جس نے اسلحہ کے پھیلاؤ کا ایک نظام مرتب کیا اور اسلحہ بند تشدد کی کارروائیوں کو مذہبی تقدس کا درجہ دیا گیا۔ (د) بین الاقوامی اور علاقائی مفادات' جن کی بدولت' دہشت گرد دھڑوں کی حوصلہ افزائی کی گئی اور انہیں ایک غیر علانیہ جنگ کے لئے استعمال کیا گیا۔ (ف) ایسی تعلیمی پالیسی جو مایوس' بیزار اور علم سے بے بہرہ نوجوانوں کی کھیپ تیار کر رہی ہے۔ ان کی ذہنی تربیت نفرت اور تشدد پر مبنی مواد کے مطالعہ سے ہوئی ہے (ق) جوہری اسلحہ کا بحران' جس کے پیش نظر ہندوستان اور پاکستان یہ باور کرتے آئے ہیں کہ وہ کسی بڑی جنگ کا خطرہ لئے بغیر ایک دوسرے کے ملک میں مسلح کارروائیوں کی حوصلہ افزائی اور منحرفین کی مدد کر سکتے ہیں۔ (ک) ریاست کے اداروں میں اہلیت اور ارادے کی کمی جو جرائم کی چھان بین اور قوانین کو منصفانہ طور پر سختی کے ساتھ نافذ نہیں کرتے۔ دوسرے الفاظ میں' چیلنج بہت بڑا ہے اور پیچیدہ ہے' جس کا مقابلہ محدود اور نیم دلانہ اقدامات سے کیا جا سکتا۔

("ڈان" 25 جنوری 1998ء)

فیوڈل معاشرہ اور تشدد

پاکستان میں تشدد کے اسباب کا سراغ لگانے سے پہلے اس بات کا ناقدانہ جائزہ لینا چاہیے کہ ہمارے معاشرے میں کلچر اور تشدد کے مابین کون سے رشتے ہیں؟ پاکستان کے دانشوروں کے لئے بڑا آسان ہے کہ الزام فیوڈل ازم کے سرتھوپ دیں' تاہم جہاں تک مجھے معلوم ہے پاکستان میں جاگیرداری کی طاقت اور اس کی وسعت کے بارے میں کوئی سنجیدہ مطالعہ نہیں کیا گیا اور جاگیردارانہ کلچر کو اس ملک میں جو بالادستی حاصل ہے' اس پر بھی کوئی کام نہیں ہوا۔

معیشت کے حوالے سے جاگیرداری' ہمارے معاشرے میں بہت سی طاقتوں کے درمیان ایک طاقت ہے اور یقیناً سب پر حاوی نہیں' لیکن جس کلچر کی صدیوں تک اس نے پرورش کی' وہ برقرار ہے۔ ایک بالادست طاقت' کمزور ہونے کے بعد سرے سے غائب ہو جاتی ہے' لیکن کلچر اس کے بعد بھی تقریباً ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔ نو آبادیاتی قبضے کے خاتمے کے بعد نو آبادیاتی کلچر نے پاکستان اور ہندوستان میں جس چالاکی کے ساتھ اپنی گرفت مضبوط کر لی' وہ اس دعوے کی ایک مثال ہے۔ اس کے بدستور قائم رہنے کا سبب یہ ہے کہ آزادی کے بعد ارباب اقتدار متبادل اقدار پیدا کرنے میں' جو نئے کلچر کی بنیاد ہوتا ہے' ناکام رہے۔

پاکستان میں دانشوروں کی مختصر سی تعداد نے جو انتہائی شاہ خرچ اور محتاط ہوتے ہوئے' مغرب سے مرعوب ہے' بڑی حد تک اس حقیقت کو نظر انداز کیا ہے۔ چنانچہ جاگیردارانہ کلچر کو بدستور بالادستی حاصل ہے' یعنی اس کے معمول کے رویے اور اقدار وہی ہیں جو معاشرے کی ہیں۔

چند بیروں سے قطع نظر کرتے ہوئے جاگیردارانہ طور طریقوں کی بنیاد کسی نظریے یا طے شدہ اصول پر نہیں ہوتی اور نہ یہ سرمایہ داری کی طرح پیداوار میں مسلسل اضافے سے اپنی قوت حاصل کرتا ہے' جاگیرداری نظام کی تعریف یہ ہے کہ اسے تشدد پر پوری طرح دسترس حاصل ہے۔ جاگیردار اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں' اس سلسلے میں اکثر مقامی رواج کا خیال رکھتے ہیں اور قانون کی پروا نہیں کرتے' وہ جاگیردار جو قانون کا پابند ہو' ایک مخبوط الحواس شخص ہوتا ہے۔ کوئی بھی تجربہ کار ضلعی افسر آپ کو بتا سکتا ہے کہ سندھ' پنجاب' سرحد اور بلوچستان کے دیہات میں با اثر جاگیرداروں کے درمیان اگر کوئی چیز مانع ہوتی ہے تو وہ حکومت کا ارادہ اور اس کا دبدبہ ہے' قانون اور لاقانونیت' شرافت اور تشدد کے درمیان فرق وہی کرتی ہے۔ اس طرح یہ بات ایک بار ہی جانتا ہے کہ وڈیرے اور کسانوں کے درمیان تعلق کی صراحت صرف تشدد سے ہوتی ہے اور اسے تو اب سے کوئی ساٹھ سال پہلے ہاری کمیشن کی رپورٹ میں صریح طور پر لکھ گیا تھا۔

اب تو یہ بیسویں صدی کی آخری دہائی ہے۔ جاگیردارانہ کلچر کی موجودگی کی ایک غیر معمولی مثال

یہ سامنے آئی کہ ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان نے نجی جیلوں کے دروازے زبردستی کھلوائے ہیں اور پورے پورے خاندانوں کو قید سے رہا کروایا ہے۔ ان میں عورتیں ہیں اور بچے ہیں' جنہیں اذیتیں دی گئیں' بے حرمتی کی گئی' مشقت لی گئی' زنجیروں میں جکڑ کر رکھا گیا۔ ایک اور نمایاں بات یہ ہے کہ انہیں یہ آزادی حکومت کی بدولت نہیں ملی' بلکہ ایک غیر سرکاری تنظیم نے یہ کام کیا۔ یہ ایک بھیانک ناکامی ہے۔ ریاست کی بھی اور اس پر قادر ارباب حکومت کی بھی' جنہوں نے معاشرے میں جاگیرداری کی اقدار کو برقرار رکھا ہے۔

جب تک ریاست قانون کے نفاذ کے لئے مداخلت نہیں کرتی اور دانشور طبقہ جب تک عدم تشدد کی اقدار کو فروغ نہیں دیتا' تشدد کا کلچر موجود رہے گا۔ بلکہ آئندہ سماجی تبدیلیاں تیزی سے رونما ہوں گی اور اس کے ساتھ ہی معاشرے میں نظم وضبط کے روائتی طریقے بے اثر ہوتے جائیں گے اور ریاست کی انتظامی مشنری زنگ خوردہ اور ناکارہ ہوتی جائے گی۔ چنانچہ تشدد کی مختلف صورتوں کے اندر اضافہ ہوتا جائے گا۔

تشدد کو روائتی طور پر ہمارے کلچر میں ایک مرکزی اور بلندتر حیثیت حاصل ہے۔ ہماری سماجی زندگی میں اس کے مختلف مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں۔ میں یہاں صرف تین کا ذکر کروں گا:

1۔ ہم انتقام کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔

2۔ عورتوں کے خلاف تشدد جو نہ صرف موجود ہے بلکہ ممکن ہے اس میں اضافہ ہوا ہو۔

3۔ بچوں کے ساتھ بدسلوکی۔

پاکستانیوں کی شدید غالب اکثریت انتقام کو ایک فطری جذبے کا اظہار سمجھتی ہے۔ ہمارے بہت سے سماجی' سیاسی اور خاندان کے حلقوں میں اسے ایک معمولی بات سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ یہ ایک شخص کی عزت اور انفرادیت' ایک خاندان' برادری اور قبیلے کی حیثیت کا معاملہ ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص انتقامی کارروائی کرتا ہے تو اس کے دوست اور رشتہ دار مدد کے لئے اس کی پشت پر ہوتے ہیں' دوسری طرف اس کا مخالف انتقامی کارروائی کا بدلہ چکانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ جہاں تک میرے علم میں ہے پاکستان میں انتقام کے نتیجے میں ہونے والے قتل کی سالانہ تعداد مرتب نہیں کی جاتی' اگر ایسا ہوتا تو یہ تعداد ہزاروں تک پہنچتی۔ کسی ایک دن کے واقعات پر نظر ڈال لیجئے' آپ کو اس کے شواہد مل جائیں گے۔

دیہی معاشرے کے ایک خاصے بڑے حلقے میں بیوی کی پٹائی کو شوہر کا ایک قانونی حق سمجھا جاتا ہے۔ شہر کے رہنے والوں خاص طور پر مزدور اور نچلے درمیانہ طبقے کے گھروں میں یہ رویہ خاصا عام ہے اور اوپر کے تعلیم یافتہ طبقے میں بھی موجود ہے۔ اگست 1997ء میں عورتوں کی بابت ایک تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی تھی' جو نہایت متوازن اور دانش ورانہ تھی۔ رپورٹ میں لکھا ہے کہ ''بیوی سے بدسلوکی' پاکستان میں خاصی عام سی بات ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس میں شوہر ملوث ہوتے ہیں بلکہ شوہر کے کنبے کے دوسرے افراد بھی شامل ہو جاتے ہیں' اس کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں' مثلاً تھپڑ مارنا' پیٹنا' اذیت دینا' اعضا

کاٹ دینا اور ہلاک کر دینا۔''

جبری بے آبروئی' خاص طور پر اجتماعی زنا کاری وبائی صورت اختیار کر چکی ہے۔صرف لاہور میں سال 1997ء کے ابتدائی نو مہینوں کے دوران میں 100 عورتوں کی جبری بے حرمتی کی گئی' جن میں 28 کے ساتھ یہ فعل اجتماعی طور پر ہوا۔ پولیس کو ان 100 واقعات کی رپورٹ دی گئی۔ المیہ یہ ہے کہ پولیس نے صرف 35 کا اندراج کیا۔ رپورٹ دینے کے خلاف جو جھجک پائی جاتی ہے' اس میں پولیس کے اس رویے سے بھی اضافہ ہوتا ہے۔حقوق انسانی سے متعلق گروپوں کی رائے میں جبری بے حرمتی کے واقعات جس قدر اخبارات میں رپورٹ ہوتے ہیں' اصل تعداد ان سے ڈھائی سے تین گنا زیادہ ہے' لیکن اس لعنت کے خلاف سرکاری بے توجہی بدستور ہے۔

حقوق انسانی کے پاکستانی کمیشن اور خواتین کے چند گروہوں نے بڑے اندیشے مول لے کر اور بڑی محنت کے ساتھ عورتوں کے خلاف ہونے والے جرائم کی تفصیل مرتب کی ہے۔ کمیشن کا اندازہ ہے کہ پاکستان میں ہر تین گھنٹے بعد ایک عورت کی بے حرمتی ہوتی ہے اور ''تقریباً'' اتنی ہی تعداد میں نابالغ' بالغ مردوں کا ہدف بنتے ہیں۔''بیشتر صورتوں میں جرم کا نشانہ بنانے سے پہلے یا بعد میں عورتوں (اور بچوں) کے ساتھ تشدد کیا جاتا ہے' چنانچہ اسی طرح ہدف بننے والے کئی افراد خودکشی کر لیتے ہیں۔عورتوں کے خلاف تشدد' ان کا قتل یا ان کے اعضاء کاٹنے کی وارداتوں کو عزت کی بحالی کے ایک ذریعے کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ وہ فعل ہے جو سندھ' بلوچستان' صوبہ سرحد اور جنوبی پنجاب میں کاروکاری جیسی رسموں کی صورت میں نظر آتا ہے۔

عورتوں کے خلاف تشدد میں ایک اور بھیانک اضافہ چولہے پھٹنے کے واقعات ہیں۔ہسپتالوں میں معائنے سے ظاہر ہوا' ان کی شکار ہونے والی عورتیں ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ جاگیرداری کے کلچر کے بارے میں میرے دلائل کے ساتھ ان واقعات کو شامل کر لیجئے تو دو حقائق سامنے آتے ہیں:

1۔ 80 فیصد جرائم عورتوں کے خلاف دیہی علاقوں میں ہوتے ہیں اور 20 فیصد شہری علاقوں میں۔

2۔ جنسی تشدد کی شکار ہونے والی تقریباً سبھی عورتیں محنت کش ہوتی ہیں۔ (ڈان' 29 اکتوبر 1977)۔

بچے چونکہ ابتدا سے ہی یہ دیکھتے ہیں کہ تشدد بالغ افراد کے رویے میں شامل ہے تو وہ بڑے ہو کر---- عورتیں اور مرد دونوں---- تشدد کو معمول کی زندگی کا لازمی حصہ سمجھنے لگتے ہیں' بلکہ اپنا مقصد حاصل کرنے یا دوسرے شخص کو اپنا رویہ بدلنے کے لئے تشدد کے طریقے کو ترجیح دیتے ہیں۔گھروں کے اندر جو تشدد کیا جاتا ہے' اسے جرم قرار دیتے ہوئے' اس کے خلاف چارہ جوئی کے لئے قوانین موجود نہیں بلکہ ایسے واقعات کے سلسلے میں پولیس مقدمہ درج کرنے کی بجائے شکایت کرنے والے کی حوصلہ شکنی کرتی ہے۔

عورتوں سے زیادہ بچوں کے ساتھ جارحانہ تشدد کا رویہ بہت عام ہے۔بچوں کی تربیت میں اس

مقولے کو مرکزی حیثیت حاصل ہے کہ "مار پیٹ نہ کرو بچے کا غارت ہونا یقینی ہے۔" اس تعریف میں بڑی گنجائش ہے' چنانچہ گھروں سے زیادہ اسکولوں میں مار پیٹ کی جاتی ہے۔ اوپر کے پڑھے لکھے طبقے ہیں اور متوسط درجے کے خاندانوں میں چند عشرے پہلے بچوں کے ساتھ جسمانی طور پر جو بدسلوکی ہوتی تھی' اب وہ پہلے کی طرح عام نہیں۔ تاہم معاشرے کے دوسرے طبقات میں یہ اب تک موجود ہے۔ اس بارے میں اعداد و شمار موجود نہیں۔ لہٰذا یہ بتانا مشکل ہے کہ طبقاتی طور پر اور دیہی / شہری علاقوں میں ایسی وارداتوں کا تناسب کیا ہے۔

مختلف وجوہ سے اور ان میں لاطینی امریکہ کے ملکوں کا مطالعہ بھی شامل ہے' میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ دیہی علاقوں کے مقابلے میں شہر کے مزدور طبقے' نچلے متوسط طبقے اور کمزور لوگوں میں بچوں سے بدسلوکی کی شکایت زیادہ ہوتی ہے۔ دینی مدارس میں جن کی تعداد گزشتہ دو عشروں میں نہایت تیزی سے بڑھتی رہی ہے' طلبہ کو جسمانی سزا دینا ایک مستقل معمول بن چکا ہے۔ حقوق انسانی کے کمیشن نے ایسی مثالیں بھی ڈھونڈ نکالی ہیں کہ وہاں بچوں کو مہینوں بلکہ برسوں تک زنجیروں میں باندھ کر رکھا گیا ہے۔ اس بارے میں خاصا مطبوعہ مواد دستیاب ہے' جن سے ظاہر ہے کہ سزا پانے والے لڑکے بڑے ہو کر جھگڑالو اور گالی گلوچ کرنے والے نوجوان ثابت ہوئے۔

اگر ہماری حکومتیں پاکستان میں جرائم اور تشدد کے واقعات میں کمی کرنا چاہتی ہیں تو وہ کم سے کم یہ ضرور کر سکتی ہیں کہ اس طرح کے ناپسندیدہ طریقوں کی قانونی ممانعت کر دیں۔ قانون' بہر طور جرم و سزا کے درمیان محض ایک تعلق کی حیثیت نہیں رکھتے' وہ موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے اخلاق اور انسانی سلوک کے معیارات قائم کرتے ہیں۔

لیکن ہماری مقتدر انتظامیہ کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ دس برس کی نمائندہ حکومتوں کے دور میں کسی بھی حکومت کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ ایک آمر کے قوانین کو جو حدود' قصاص' دیت اور توہین رسالت سے متعلق ہیں منسوخ کر دیتی۔ یہ وہ قوانین ہیں جو معاشرے میں عورتوں اور اقلیتوں کے بنیادی انسانی حقوق کی اہانت کرتے ہیں۔ رجعتی رویوں کو بڑھاوا دیتے ہیں' قتل پر اکساتے ہیں' جسمانی اعضاء کاٹنے کی ترغیب دیتے ہیں اور فرقہ وارانہ تشدد کو فروغ دیتے ہیں' مجھے گزشتہ اور موجودہ حکومت میں ایک بھی سرکاری افسر ایسا نہیں ملا' جس نے گفتگو کے دوران میں ان قوانین اور رویوں کی مدافعت کی ہو' اس کے برعکس انہوں نے انہیں نہایت مکروہ اور معاشرے کے لئے نقصان دہ پایا' جیسا کہ ہر ذی فہم اور انسان دوست شخص کا ردعمل ہوگا۔

اس کے باوصف یہ حکومت بھی جو اتنی بھاری اکثریت میں ہے کہ آئینی ترامیم کو منسوخ کر سکتی ہے' وہ عورتوں کے تحقیقاتی کمیشن کی جانب سے موصول ہونے والی نہایت معقول سفارشات میں سے ایک

MashalBooks.org

سفارش پر بھی عمل نہیں کر سکی۔ واضح ہو کہ کمیشن کے سربراہ ایک ممتاز قانون دان اور سپریم کورٹ کے جج مسٹر جسٹس اسلم ناصر زاہد تھے۔ یہ ناکامی بھی ایک مثال ہے کہ اپنی ذمہ داری سے دست کش ہو کر کس طرح موقع پرستی کے آگے سپر ڈال دی جاتی ہے اور یہ وہ صورت حال ہے جو ہر جگہ سیاست میں عام ہے۔ حکومت کی بے عملی سے اس امر کی بھی نشاندہی ہوتی ہے کہ ایک منظم اور مربوط رائے عامہ موجود نہیں' جو دائیں بازو کے مذہبی گروہوں کے بلند آہنگ دباؤ کو پسپا کر سکے' یہ وہ گروہ ہیں' جن کے اسلام کے بارے میں دقیانوسی خیالات نہ تو مذہبی اصولوں کے مطابق ہیں اور نہ ہی معاشرے کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔

(''ڈان'' 2 فروری 1998ء)

MashalBooks.org

راستے بند ہیں سب کوچہ قاتل کے سوا

اسلامی دہشت گردی دنیا بھر میں تشویش کا موضوع بن گئی ہے۔ یہ تشویش مسلم دنیا میں بطور خاص ہے۔ امریکہ میں لبنان پر اسرائیلی قبضے کے خلاف مسلمانوں کی مزاحمت مغربی کنارے غزہ اور گولان پر اس قبضے کے خلاف احتجاج اور اس طرح کے واقعات، جیسے نیویارک سٹی میں انٹرنیشنل ٹریڈ سنٹر کو دھماکے سے اڑا دینے کی مبینہ سازش، ان سب نے مل کر ذرائع ابلاغ کو اور سیاسی پروپیگنڈے بازوں کو یہ موقع فراہم کیا ہے کہ مسلمانوں کو بدنام کریں اور انہیں اور اسلام کو مغرب کے مفادات اور خود مغربی تہذیب کے لئے خطرہ بنا کر پیش کریں۔ ان کا یہ عذر نا قابل قبول ہے، کیونکہ عربوں کی مزاحمت کی مذمت کرتے وقت وہ اسرائیل کی دہشت گردی کو جسے امریکہ کی حمایت حاصل ہے، معاف کر دیتے ہیں۔ ان کی تحریک اس لئے بھی ناروا ہے، کیونکہ جیسا کہ ہم ابھی اس پر گفتگو کریں گے، امریکہ اور یورپ نے جن تشدد پسند گروہوں کو اور افراد کو "اسلامی بنیاد پرست" قرار دیا ہے اور نہایت ڈھٹائی سے جن کی مذمت کر رہے ہیں، ان کو بڑھانے اور پھیلانے میں خود انہوں نے تاریخی طور پر حصہ لیا تھا۔ امریکہ اور یورپ نے اس وقت اس مہم سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، جب ان کے مفادات پورے ہو گئے، پھر مقامی باشندے جن کے درمیان نظریاتی دہشت پسندی کو فروغ دیا گیا تھا، اب اس کی بھاری قیمت ادا کئے جا رہے ہیں۔

الجزائر اور مصر جیسے ممالک عملاً خانہ جنگی کے عالم میں ہیں۔ یہ جنگ مختلف عقیدے کے مسلمانوں، اور افسوس کی بات یہ ہے کہ سیکولر لیکن حاکمیت پسند حکومتوں کے درمیان ہو رہی ہے۔ ان ملکوں کے درمیان پاکستان کی حیثیت کئی لحاظ سے نمایاں ہے۔ اول یہ جہاد کا اصل میدان بن چکا ہے، جس کی حیثیت ایک بین الاقوامی تحریک کی تھی۔ دوئم الجزائر اور مصر سے مختلف یہاں پارلیمانی طرز حکومت تھا۔ یہاں 1988ء سے چار مرتبہ انتخابات ہو چکے تھے اور ان انتخابات میں اسلامی جماعتوں کی کامیابی کی شرح برابر کم ہوتی آئی تھی۔

تیسری بات یہ کہ الجزائر اور مصر سے الگ جہاں سنیوں کی اکثریت ہے، پاکستان میں مختلف فرقوں کے لوگ آباد ہیں۔ یہاں غیر سنیوں کی تعداد کل آبادی کی تقریباً ایک چوتھائی ہے۔ مزید یہ کہ سنی بھی فقہی اختلافات کی وجہ سے آپس میں بٹے ہوئے ہیں۔ بریلوی اور دیوبندی اس کی نمایاں مثال ہیں، جو تشدد پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہاں تشدد کے واقعات ہوتے آئے ہیں۔ ابھی تو ہم نے سنیوں اور شیعوں کی خوفناک کارروائیاں ایک دوسرے کے خلاف اور خود سنیوں کی دہشت نا کی، عیسائیوں اور احمدیوں کے خلاف دیکھی ہے۔ بریلوی اور دیوبندیوں کے درمیان قتل کی وارداتیں بھی ہو چکی ہیں۔ بہر حال دہشت گردی میں بے اندازہ طاقت ہے۔ چوتھی بات یہ کہ پاکستان، جیسا کہ کہا جاتا ہے اسلامی نظریے کی "فرنٹ لائن اسٹیٹ"

MashalBooks.org

یعنی محاذ جنگ کی سب سے اگلی صف میں شامل ریاست ہے۔ افغانستان میں جنگ جاری ہے اور ملک کی داخلی صورت حال پر اس کے اثرات مختلف انداز سے' جس پر میں آئندہ سطور میں بحث کروں گا' مرتب ہو رہے ہیں۔ آخری بات یہ کہ پاکستان نظریاتی طور پر ایک دوگونہ سیاست کا ملک ہے' جہاں اسلام کی سیاسی نغمہ سرائی نے حکمران اشرافیہ کے لئے ایک ایسا ہتھیار فراہم کیا ہے' جس سے وہ اپنے کرپشن' اسراف اور مغرب کی اندھی پیروی جیسی خرابیوں کی تلافی کر لیتے ہیں' نتیجے کے طور پر اسلامیوں کی وہ اقلیت جو نظریے میں بہت پرجوش ہوتی ہے' اس مقتدر اشرافیہ پر اپنی گرفت سخت رکھتی ہے' جو اخلاقی اعتبار سے کمزور اور غیر منظم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس انتہا پسند مذہبی اقلیت نے جسے رائے عامہ نے انتخابات میں برابر مسترد کیا اپنی سیاسی گرفت برقرار رکھی ہے۔ بہرحال دہشت کا ماحول بڑھتا جاتا ہے اور اس سلسلے میں نہ تو وہ عناصر جنہوں نے اس کا آغاز کیا تھا اور نہ اس کا شکار بننے والے لوگ کچھ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

پاکستان اس بھیانک تباہی اور اس سے نپٹنے کے لئے حکومت کی ناکامی کی ایک نمایاں مثال ہے۔ اسلام آباد میں مصری سفارت خانے پر بم کے دھماکے سے لے کر لاہور میں مومن پورہ کے قبرستان تک' یہ ملک انتہا پسند اسلام پسندوں کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے بے گناہوں کے خون سے رنگین ہے۔ اس کے باوجود ان المیوں کا ملک پر کوئی عکس نظر نہیں آتا اور نہ ان پر کوئی اثر دکھائی دیتا ہے' جن پالیسیوں نے مبینہ "اسلامی دہشت" کا بیج بویا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ بین الاقوامی جہادی قوتوں کا عالمگیر پیمانے پر ظہور میں آنا ایک بالکل نئی اور جدید صورت حال ہے۔ یہ مختلف قومی گروہوں کا ایک اتحاد ہے' جس کے بانیوں میں امریکہ' پاکستان' سعودی عرب' مصر اور اسرائیل کی حکومتیں شامل ہیں۔ یہ افغانستان میں کمیونسٹ دشمن جہاد تھا' جس کا آغاز امریکہ کی سرپرستی میں ہوا' جس نے بیسویں صدی کے آخری پچیس برسوں میں جہاد کے تصور کو ایک نئی توانائی عطا کی۔ یعنی باعقیدہ لوگوں کی مسلح جدوجہد۔ لبنان' مغربی کنارے' غزہ اور گولان پر اسرائیل کے حملے اور ان علاقوں پر قبضہ اس جدوجہد کو ایک نیا مفہوم اور اخلاقی قوت دیتے ہیں۔

موجودہ صدی میں اب سے پہلے کبھی جہاد نے بطور تشدد اسلامی کردار اور بین الاقوامی حیثیت حاصل نہیں کی تھی۔ بیسویں صدی سیکولر مسلمانوں کی جدوجہد کی صدی تھی۔ عثمانیوں نے اپنی آخری لڑائیاں یقینی طور پر غیر مذہبی اصول پر ایک ایسی حکومت کو بچانے کے لئے لڑی تھیں' جو ٹکڑے ٹکڑے ہونے گی تھی اور کم از کم شرق وسطی میں ان کی جنگیں مسلمان دشمنوں کے خلاف تھیں۔ سعد زغلول سے لے کر عبدالناصر کے رخصت ہونے تک اس تمام عرصے میں مصر کی قومی تحریک سیکولر ہی تھی اور واضح طور پر یہ تحریک عرب تھی اور مصری تھی۔ عراق' شام' فلسطین اور لبنان کی قومی تحریکیں بھی اسی طرح سیکولر تھیں۔ ترکوں نے اپنی آزادی نہایت سخت قسم کے سیکولرازم کے پرچم تلے حاصل کی۔ ایران کے قوم پرستوں نے اس صدی کے اوائل میں جدوجہد کر کے بلجیئم کی طرح کا آئین منظور اور نافذ کروایا۔ ہندوستان میں مسلم قوم

MashalBooks.org

پرستوں نے پاکستان کے حصول کا مطالبہ کیا اور ہندوستانی علما کی ایک بھاری اکثریت کی مخالفت کے باوجود وہ اپنے مطالبے میں کامیاب رہے۔ ان تمام تحریکوں کی بازگشت دوسری مسلم اقوام میں سنائی دیتی رہی' جو انہی حالات میں اپنی آزادی کی جدوجہد میں سرگرم تھے لیکن کسی کا بھی عالمگیر اسلامی حوالہ نہیں تھا۔

جہاد بمعنی کوشش' عربی زبان میں اس کا مصدر جہد یعنی کوشش کرنا ہے۔ نوآبادیاتی نظام کے خلاف مسلمانوں کی جدوجہد میں بہرطور ایک پسندیدہ لفظ تھا۔ جب میرے بھائی کو قومی پرچم لہرانے پر اسکول سے نکال دیا گیا تو گاؤں میں اس کا خیر مقدم مجاہد کہہ کر کیا گیا۔ یعنی وہ فرد جو جدوجہد کرتا ہے۔ مغرب میں الجزائر کے قوم پرست رضاکار فرانس کے خلاف مسلح جدوجہد میں سات سال تک سرگرم رہے اور بڑی کڑی آزمائش سے گزرے' انہیں مجاہدین اور ان کے اخبار کو "المجاہد" کا نام دیا گیا۔ اس اخبار کی ادارت کچھ عرصے تک ایک غیر مسلم فرانز فینن نے کی اور یہ جدوجہد بھی ایک سیکولر تنظیم نے چلائی اس کا نام فرنٹ ڈولبریشن (Front Du Liberation)(ایف ایل این) تھا۔

تیونس میں فوجی جدوجہد کی قیادت حبیب بورقیبہ نے کی جو سیکولر نظریے کے نہایت کٹر ماننے والے تھے۔ اس کے باوصف انہیں مجاہد الاکبر کا خطاب حاصل تھا۔ 1978ء میں انقلاب ایران کے دوران کبھی کبھی جہاد کا نعرہ جوش دلانے کے لئے سننے میں آتا تھا' لیکن شاہ کے خلاف بغاوت میں انقلاب کا نعرہ ہی حاوی تھا۔ اقتدار حاصل کرنے کے بعد ایران کی انقلابی حکومت نے جہاد سازندازی یعنی جہاد برائے تعمیر کا آغاز کیا اور اب وہی عمل کی تحریک میں علامت بن گیا۔ جہاد کا لفظ بیسویں صدی کے دوران میں ایک قومی سیکولر اور سیاسی حوالے میں بلا استثنا ہوتا رہا' یوں سمجھئے کہ افغانستان میں روس کے خلاف جنگ کے آغاز تک۔

پھر یہ ہوا کہ اس صدی میں مسلمانوں کی جدوجہد آزادی میں پہلی بار اسلامی پارٹیوں نے پرچم بلند کیا' ان کے مقابل "بے دین کمیونزم" کے ماننے والے تھے۔ اسلامی پارٹیوں کا عہد یہ تھا کہ بزور بازو ان کا تختہ الٹ دیں گی اور افغانستان میں ایک "اسلامی ریاست" قائم کریں گی۔ ان کا جہاد قدیم معنوں میں اور تمام تر دینی اعتبار سے جہاد تھا۔ انہیں مغربی طاقتوں کی حمایت حاصل تھی جو قبل ازیں آزادی کی کسی بھی تحریک کو حاصل نہ ہوئی تھی۔ امریکہ اور اس کے حلیف ملکوں نے مجاہدین کو تقریباً دس بلین ڈالر کا اسلحہ اور دوسرا سامان بہم پہنچایا۔ اس جہاد میں انہوں نے اپنی بے پناہ طاقت اور ذرائع ابلاغ کی چمک دمک کو داؤ پر لگا دیا۔ ایک موقع پر جو بطور خاص یاد رہے گا وہ تھا جب چند نہایت کٹر اسلام پسندوں نے امریکی ایوان صدر وہائٹ ہاؤس کا دورہ کیا اور صدر رونالڈ ریگن نے انہیں "عالم اسلام میں ہمارے بانی واجداد کا ہم پلہ" قرار دیا۔ اسی طرح امریکہ اور یورپی ذرائع ابلاغ نے افغانستان کو 1980ء کے عشرے کا سب سے بڑا اخباری واقعہ قرار دیتے ہوئے اس کو خوب ہوا دی۔ غیر ملکی نامہ نگاروں نے ہندوکش کا چپہ چپہ چھان مارا تا کہ سرفروشی کی کہانیاں ڈھونڈ نکالیں۔ جہاد کے واقعات کے بیان میں مقابلہ شروع ہو گیا اور وہ بھی اس شدومد سے کہ ایک

بڑے الیکٹرونک میڈیا سی بی ایس نے اسلام اور کمیونزم کے باہمی مقابلے کی فلم بندی کا اسٹیج تیار کروایا اور اس کے لئے بھاری معاوضہ ادا کیا۔ چونکہ مغرب کے ذرائع ابلاغ کو تیسری دنیا میں بڑی اہمیت اور وقار حاصل ہے اس لئے افغانستان کی جنگ کو جس طرح اس نے اپنے یہاں جگہ دی اس سے مسلمان نوجوانوں پر خاص طور پر گہرا اثر ہوا۔

روس کی مداخلت کے بعد ایک ہی سال کے اندر افغانستان بین الاسلامی جہاد کی صورت اختیار کرنے لگا۔ سینکڑوں اور بالآخر ہزاروں مسلمان نوجوان دور دور سے یہاں تک کہ الجزائر، فلپائن، سوڈان اور سنکیانگ سے نکل کر پشاور اور تورخم تک پہنچنے لگے، جہاں انہوں نے اسلحہ کے استعمال کی تربیت حاصل کی اور مختلف اسلامی پارٹیوں کی تحت قیادت میں نظریاتی اعتبار سے پختہ ہو گئے اور پھر اللہ کی راہ میں جہاد کا ذائقہ چکھا۔ امریکہ کی حکومت اور امریکی سی آئی نے جسے اپنی طاقت کا بڑا نشہ تھا، صاف دیکھ لیا کہ اشتراکیت کے خلاف ایک متشدد اسلام کو کھڑا کر دینے اور سرد جنگ جاری رکھنے کا یہ ایک اچھا موقع ہے۔ اگر سوویت یونین یوں اچانک پسپا نہ ہو گیا ہوتا تو امریکہ جہاد کی اس تاریخی مہم سے اب تک منافع کما رہا ہوتا۔

افغانستان کی جنگ جو تشدد پر مبنی ایک بین الاقوامی کردار اختیار کرتی جا رہی تھی اور ہمیں اس کا علم تھا، لیکن کسی بھی ملک نے نہ الجزائر نے اور نہ مصر نے اس دور افتادہ جنگ میں اپنے یہاں کے شہریوں کی شرکت پر احتجاج کیا۔ پاکستان ایک غلط اقدام کی میزبانی کرتا رہا اور سب چپ چاپ تماشا دیکھتے رہے اور منہ پھیر کر کھڑے رہے، یہاں تک کہ افغانستان کی شورش بعد میں خود ان کے گلے پڑ گئی۔ مثال کے طور پر 1986ء میں خود میں نے پشاور میں مصر کے خفیہ ایجنٹوں کی موثر موجودگی کو محسوس کیا، جہاد میں مختلف قوموں کی موجودگی اور کارکردگی کے متعلق وہ بہترین معلومات رکھتے تھے، لیکن ابھی وہ صرف نگرانی کر رہے تھے۔ امریکہ بہر طور ان کا حامی اور محسن تھا۔ وہ امریکہ کے مقاصد میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتے تھے۔ جب امریکہ نے افغانستان میں اپنی سرمایہ کاری کے نتیجے میں سارا مال سمیٹ لیا، تب الجزائر اور قاہرہ سے پاکستان کو اس مضمون کے مطالبے موصول ہونے لگے کہ ان کے شہریوں کو وہاں سے نکالا جائے۔ اس وقت تک الجزائر اور مصر میں انتہا پسندوں پر جہنم کے دروازے کھول دیئے گئے تھے، لیکن پاکستان کس سے یہ درخواست کرے کہ اس ملک کو ان ہزاروں مسلح شورش پسندوں سے نجات دلائی جائے، جنہیں ان حکومتوں نے پالا پوسا اور اب تک ان کی پرورش کر رہے ہیں۔

جہاد کی بین الاسلامی توسیع، تاریخی نوعیت کی ایک نئی صورت حال تھی۔ زمانہ وسطیٰ کی صلیبی جنگوں کے بعد سے اب تک جہاد نے تہذیبی، نسلی اور علاقائی سرحدیں پار نہیں کی تھیں۔ پان اسلام ازم (عالمگیر اسلامیت) نے انیسویں صدی میں نہایت مختصر عرصے کے لئے ظہور کیا تھا اور اس کا پرچم جمال الدین افغانی جیسے نظریہ سازوں اور سید احمد شہید جیسے جنگ آزماؤں نے بلند کیا تھا۔ پان اسلام ازم کی تحریک جن دنوں

MashalBooks.org

اپنے شباب پر تھی، اسی زمانے میں ہندوستان کے مسلمانوں نے خلافت عثمانیہ کو بچانے کے لئے خلافت تحریک کا آغاز کیا۔ خلافت کے رہنماؤں علی برادران نے اس تحریک کو کبھی کبھی جہاد کا نام دیا۔ لیکن وہ عدم تشدد پر مبنی ایک تحریک تھی، جس کو غیر مسلم آزادی پسندوں مثلاً ایم کے گاندھی کی حمایت بھی حاصل تھی۔ محمد علی جناح نے اس تحریک کو ناپسند کیا اور بعد میں پاکستان کی بنیاد رکھی۔ ایک اور توجہ طلب بات یہ ہے کہ اس تحریک میں پان اسلام ازم کی آواز محض برائے نام تھی۔ عربوں، ایرانیوں اور ترکوں نے یکساں طور پر اسے ہندوستانیوں کا مخصوص خلل دماغ قرار دیا۔

مسلمان دانشوروں کی ایک نہایت مختصر تعداد کے ذہنوں میں پان اسلام ازم محض ایک مجرد خواہش کے طور پر زندہ رہی۔ اس کا اثر چند جدید مصنفوں اور شاعروں بشمول محمد اقبال کی تحریروں میں نظر آتا تھا۔ پان اسلام ازم کا انحصار اسلامی یگانگت کے ایک عام جذبے پر ہے اور یہ جذبہ بہر طور حقیقی تھا، جو اپنے ہم مذہبوں مثلاً فلسطین اور بوسنیا کے مسلمانوں کے لئے اتحاد اور یگانگت کی خواہش کے طور پر ظاہر ہوتا آیا ہے۔ اس کے باوصف مسلم عوام کی قومی تحریکیں قومی ہی رہیں اور پان اسلام ازم کا جذبہ اتحاد و یگانگت کے محض ایک خام جذبے کی حد تک برقرار رہا۔ اس کے مقابلے میں جب افغان جنگ شروع ہوئی تو پان اسلام ازم نمایاں پیمانے پر اپنے مالی، تہذیبی، سیاسی اور فوجی امکانات کے ساتھ عالمگیر پیمانے پر ظاہر ہوئی، جس کے روابط، تعاون اور تبادلے کے روابط، ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ پاکستان میں اور دوسری جگہوں پر بھی نئی نئی طرح کے ادارے مدارس، اسلامی یونیورسٹیاں، ٹریننگ کیمپ اور کانفرنس کے مراکز کھل گئے۔ منشیات اور اسلحہ کے تاجروں کو بے اندازہ مواقع نظر آئے چنانچہ انہوں نے اپنے آپ کو اس صورت حال سے جوڑ لیا اور ایک غیر رسمی سا، لیکن غیر معمولی نوعیت کا کاروبار پھیلا دیا، جس میں اسلحہ، سونے اور اللہ تعالیٰ کے نام کی تجارت ہونے لگی۔

جہاد میں بہت سی اقوام کی شرکت سے اسلامی دھڑوں کے دھڑے نہ صرف مضبوط ہوئے بلکہ روایتی طرز کی دینی جماعتیں بھی اسلحہ بند ہو گئیں۔ اس کی ایک مثال پاکستان کی جماعت اسلامی ہے۔ افغانستان میں ملوث ہونے سے پہلے یہ ایک روایتی انداز کی جماعت تھی، جس کے کارکن رضا کار ہوتے تھے۔ ان کا رجحان فکر اور دانش کی طرف تھا اور اسلحہ سے شہ زوری جتانے کی بجائے وہ مباحثے اور احتجاج کی پالیسی پر کاربند تھے۔ آج پاکستانی فوج اور رینجرز کے بعد جنگ آزمودہ اور مسلح رضا کاروں کی سب سے بڑی تعداد اس کے پاس ہے۔ 49-1948ء میں اس کے فکری سربراہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے دینی بنیادوں پر کشمیر میں جہاد کے خیال کو مسترد کر دیا تھا۔ آج انہی کی جماعت کشمیر میں اپنی جنگی کارکردگی کا بڑے فخر کے ساتھ اعلان کرتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ امریکی حکومت اور ذرائع ابلاغ جس زمانے میں ایران کو مسلمانوں کی منظم دہشت گردی کا ذمہ دار قرار دے رہے تھے، اس زمانے میں امریکہ، ضیاء الحق کے پاکستان

میں سی آئی اے کی مالی امداد سے مسلح اسلامی تحریک کو پروان چڑھا رہا تھا۔

حالیہ برسوں میں روائتی اسلامی پارٹیاں' طالبان سے روابط اور کشمیر کی جنگ سے اپنے تعلق کی بنا پر جنگی خطوط پر منظم ہو رہی تھیں' یہ ہیں جمعیت علمائے اسلام اور جمعیت علمائے پاکستان۔ ان کے علاوہ دوسرے مسلح فرقہ پرست ٹولے سپاہ صحابہ' لشکر جھنگوی' حرکت الانصار' سپاہ محمد' لشکر طیبہ اور انجمن سرفروشان اسلام ہیں' جو ریاست کے لئے اور عام شہریوں کے لئے خطرے کا موجب ہیں۔ ان سب کی تشکیل فرقہ وارانہ بنیاد پر ہوئی ہے۔ اسلام سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں' جس کی توضیح پرانی مذہبی جماعتیں مثلاً جماعت اسلامی اور جے یو آئی کرتی ہیں' لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ ان کو ہمسایے میں ہونے والی جنگوں سے جو اسلامی خطوط پر ہو رہی ہیں' طاقت ملتی ہے۔

دوستو! چوکس رہو اور دیکھتے جاؤ' وہ جہاد جس کی ابتدا اور سرپرستی سامراجیت نے کی اس کے نتائج سامنے آنے کو ہیں۔ اس وقت افغانستان آنے والے دور کے لئے ایک اشارہ بن جائے گا۔

("ڈان" 13 فروری 1998ء)

فساد اپنے اندر

جہاد انٹرنیشنل اور ایران اور اس کے مخالفوں کے درمیان محاذ آرائی ایک ایسے زمانے میں عروج پر پہنچی' جب پاکستان کا ماحول مذہبی سرگرمیوں کے لئے خاص طور پر سازگار تھا۔ جنرل محمد ضیاء الحق نے "اسلامیانے" کا عمل شروع کر دیا تھا جس سے اقلیتوں کے درمیان اور ان میں پاکستان کی شیعہ اقلیت بھی شامل تھی' تشویش پیدا ہونے لگی تھی۔ اس کا ایک ردعمل تو یہ ہوا کہ تحریک نفاذ فقہ جعفریہ قائم ہو گئی' جس نے مطالبہ کیا کہ شیعہ صرف اپنی فقہ کے تابع ہوں گے۔ یہ ایسا مطالبہ تھا جو سمجھ میں آتا تھا' تاہم اس سے کئی سنی اٹھ کھڑے ہوئے۔ تحریک جعفریہ کے پیچھے سپاہ صحابہ چل پڑی۔ پاکستان میں مختلف جمعیت کے لوگ رہتے ہیں' جن کی جداگانہ شناخت ہے۔ اس ماحول میں یہ تجویز کہ ریاست' اس کے قوانین اور اداروں کو مذہبی قوانین کے مطابق وضع کیا جائے' لازمی طور پر امتیاز اور تفرقہ پھیلانے پر مبنی قرار دی جائے گی۔

جس طرح ذوالفقار علی بھٹو نے احمدیوں کو اقلیت کا درجہ دیا تھا' اسی طرح ضیاء کی اسلامائزیشن نے یہ کیا کہ ملک میں تقسیم کا ایک خاکہ مرتب کر دیا اور اس کے مختلف لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑا دیا۔ ایسا تو ہونا ہی تھا' خاص طور پر ایک مسلم معاشرے میں' کیونکہ ہماری تاریخ صدیوں کے شرعی تنازعوں' بالعموم پر تشدد تنازعوں کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے' یہ ایسی بات ہے جو موجودہ دور کے سیاست دانوں کی سمجھ میں نہیں آئی' جنہوں نے پچھلے 25 برسوں کے اندر بے مقصد قتل اور خون ریزی کو اپنے آنکھوں سے رونما ہوتے دیکھا' مذہبی فرقہ پرستی کا پیدا ہونا اس نام نہاد "اسلامائزیشن" کا لازمی نتیجہ تھا۔ سب سے پہلے تو یہ بات جو بالکل سامنے کی ہے اور پاکستان میں سیاست دانوں کی کئی نسلوں کو اور وطن عزیز کے جان بازوں کو سجھائی نہیں دی کہ جب کوئی ریاست اپنے مذہبی ہونے کا دعویٰ کرتی ہے تو اس بات پر اختلاف کا پیدا ہونا یقینی ہے کہ کس مذہب کا نفاذ ہوگا؟ دوسری بات یہ کہ جب مذہب کو صریح طور پر سیاست میں داخل کر دیا جائے تو وہ طاقت کا آلہ (یا سکہ) بن جاتا ہے۔ پھر تو کوئی بھی شخص اپنی اعانت کے لئے مذہب کو استعمال کر سکتا ہے اور اپنے حقیقی یا زبردست دشمن کو اس سے زیر کر سکتا ہے۔ اس کی تصدیق کرنا ہو تو کوئی بھی شخص ضیاء کی "اسلامائزیشن" کے بعد سے اب تک قومی اور مقامی سیاست میں مذہب کا ڈنڈا گھماتے ہوئے نو واردوں کی تعداد شمار کر سکتا ہے۔ آج کل کے سب سے زہریلے نفرت کے بیوپاری اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

مذہب کا سکہ سیاست میں ایک بار چل جائے تو پھر اسے سیاست کے میدان میں جائز اور ناجائز ہر طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ سیاست میں بلند عزائم رکھنے والے ایسے لوگ جن کے پاس کوئی دیگر سیاسی

سرمایہ نہیں ہوتا--- یعنی وسیع قطعات اراضی، جدید تعلیم، صنعت اور خاندانی تعلقات--- ان کی ذات سے اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ مذہب کو زیادہ استعمال کریں اور نہایت زہریلے طریقے سے استعمال کریں۔ اس کے بعد یہ دیکھ کر حیرت نہیں ہوتی کہ سپاہ صحابہ اور اس کی شاخ لشکر جھنگوی، دونوں جماعتیں جھنگ میں پیدا ہوئیں، وہاں شیعہ فرقے کے مالکان اراضی روایتی طور پر طاقت کے مالک چلے آ رہے ہیں۔ تاہم گزشتہ چار عشروں میں اقتصادی تبدیلیوں کے نتیجے میں ایک نیا درمیانہ طبقہ پیدا ہوا ہے، جو طاقت کے روایتی مالکوں کے ساتھ مقابلہ کرنے پر مجبور ہے۔ سپاہ صحابہ کے نئے متوسط طبقے کے رہنما پرانوں کو طاقت کے مرکز سے بے دخل کرنے کے لئے بے چین تھے۔ 1980ء کے عشرے میں جو نظریاتی ماحول پیدا ہوا، اس نے انہیں مجبور کر دیا کہ اپنی جنگ میں مخالف شیعہ اسلام کو استعمال کریں۔ نفرت کے اس نظریے میں مذہب کے استعمال کا آگے بڑھنا لازمی تھا۔ اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ کچھ اور اسباب بھی ظاہری طور پر کام کر رہے ہیں۔ ان میں سب سے اہم وہ انتہائی مسخ شدہ معاملات ہیں، جو مسلم معاشروں کے اندر ان کے ماضی اور مستقبل کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو ماضی کے گن گاتے ہیں اور اس کی تخلیق دوبارہ کرنا چاہتے ہیں، وہ تقریباً ہمیشہ ناکام رہتے ہیں، جبکہ وہ لوگ جو ماضی کو وسیع تناظر میں اور ناقدانہ انداز سے دیکھتے ہیں، وہ ماضی پر زیادہ بامعنی اور پائیدار انداز سے انحصار کرتے ہیں، وہ لوگ جنہیں اپنے مستقبل پر یقین ہے، ماضی کا جائزہ نہایت سنجیدگی سے اور گہرائی میں جا کر لیتے ہیں۔ وہ ماضی کا مطالعہ کرتے ہیں، اس کی اقدار اور جمالیات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، ان اسالیب پر نگاہ رکھتے ہیں، جن کی بدولت گزشتہ تہذیب رفعت سے ہمکنار ہوئی یا اس کے برعکس زوال سے دوچار ہوئی۔ ایسے لوگ اس کی باقیات کو محفوظ رکھتے ہیں، بامقصد اقدار کو سنبھالتے ہیں اور ماضی کے تصورات اور روایات سے اجتماعی اور انفرادی دونوں سطح پر فیض حاصل کرتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں وہ حکومتیں اور لوگ جن کا ماضی کے بارے میں غیر یقینی سا خیال ہوتا ہے، ماضی سے اپنے تعلق میں بگاڑ سے کام لیتے ہیں۔ گزری ہوئی تاریخ سے بھاگتے ہیں، اس کے اسباق کو بند کر کے رکھتے ہیں۔ ماضی کی ناقدانہ تفتیش اور تحقیق سے گریز کرتے ہیں، اس کی باقیات سے بے پرواہی برتتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک خیالی ماضی دریافت کر لیتے ہیں جو بڑا چمکیلا اور شاندار ہوتا ہے۔ اس پر وہ ہمارے زمانے کے تعصبات اور نفرتیں قائم کرتے ہیں۔ جنوبی ایشیا میں مذہبی سیاسی تحریکوں کی موجودگی اور مسلم دنیا اس صداقت کی گواہی دے گی۔ اس علاقے میں ہندو اور مسلمان دونوں، جن کا تعلق دائیں بازو سے ہے، تاریخ کو جو فرقہ وارانہ نفرتیں ابھارتی ہیں، اسی طرح دیکھتے ہیں۔

چنانچہ بہت سے مسلمانوں نے سالہا سال تک مغل شہنشاہ اورنگ زیب کو ہندوستان میں مسلمانوں کی طاقت اور مسلم حکمرانی کی خوبیوں کی علامت سمجھا۔ دوسری طرف ہندو قوم پرستوں نے مرہٹہ سردار شیواجی کو مسلمان حکمرانوں کے خلاف ہندوؤں کی مزاحمت کا نشان بنا کر پیش کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ

MashalBooks.org

دونوں اپنی اپنی حیثیت میں المناک تھے۔ تاریخ سے ان کا کوئی جوڑ نہیں تھا' وہ ہندوستان میں ریاستی اقتدار کے زوال کی علامت تھے اور ساتھ ہی یورپی سلطنت کے عروج کی نشانی۔ ان مثالوں کے پیش نظر اور جیسا کہ بابری مسجد کے واقعے سے ظاہر ہے' تاریخ فرقہ وارانہ افسانہ طرازی کے ہاتھوں قتل ہوئی۔

1970ء کی دہائی کے بعد سے جب سے مطالعہ پاکستان کو لازمی مضمون کے طور پر اسکولوں اور کالجوں میں نافذ کیا گیا ہے' اس وقت سے ان طلبہ کی کثیر تعداد کو جو او اور اے لیول کے فیض سے محروم ہیں' تاریخ کا ایک نہایت مسخ شدہ اور فرقہ وارانہ سبق پڑھایا جا رہا ہے۔ ضیاء الحق کے عشرہ حکمرانی میں نظام تعلیم کو فرقوں میں بانٹنے کا رجحان اس حد تک پہنچ گیا کہ سنیوں اور شیعوں کے لئے اسلامیات کے الگ الگ نصاب پڑھائے جانے لگے اور اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ہمارے سرکاری حکام یوں تو ہر روز فرقہ وارانہ سیاست کی مذمت میں بیان دیتے رہتے ہیں لیکن اسکولوں اور کالجوں میں انہوں نے نفرت انگیز اور فرقہ وارانہ نصاب برقرار رکھے ہیں۔

فرقہ وارانہ تاریخ مرتب کرنے میں پاکستانی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ 1990ء کے موسم گرما میں ایودھیا اور متھرا گیا۔ میں تشدد آمیز ہندو تحریکوں' یعنی بی جے پی' وی ایچ پی' آر ایس ایس اور بجرنگ دل کے بارے میں چھان بین کرنے گیا تھا' جو بابری مسجد کو ڈھا دینے اور اس کی جگہ رام مندر بنانے کی مہم چلائے ہوئے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ دو ہزار برس پہلے وہی مقام رام جی کا مولد تھا۔ اس مہم کے دوران میں دو چیزوں کو دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ ہندو رجعت پرستوں نے مطبوعات کا ایک انبار "تعلیمی مواد" کے نام پر وہاں رکھ چھوڑا تھا' جو مسلمانوں کے دور حکمرانی کی مبینہ زیادتیوں اور ہندوؤں کی مدافعانہ کوششوں پر مبنی تھا۔ کتابوں کے علاوہ رنگ رنگ کے پوسٹر بھی لگائے گئے تھے۔ جن میں تمام تر جزئیات کے ساتھ ہندوستان میں ہندو مسلم تصادم میں مسلمانوں کے مفروضہ مظالم اور ہندوؤں کی جان بازی کے مرقعے پیش کئے گئے تھے۔ آڈیو کیسٹ پر نثری بیانات اور گانے بھی درجنوں کے حساب سے دستیاب تھے۔ یہ ڈھیروں کتابیں' زہریلے مواد سے بھری ہوئی' انہیں دیکھ کر مجھے صدمہ ہوا۔ ہندوستان کے چند ممتاز ترین مورخوں کی اس بات پر ہمیشہ تعریف کی جائے گی کہ انہوں نے اس تاریخ کو جو ماضی پرستی پر مبنی ہے' ہمیشہ اور باقاعدگی کے ساتھ رد کیا ہے۔ بی جے پی کے ایک نظریہ ساز ایم آر ملکانی سے جب میں نے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے ایسے مورخوں کے بارے میں بے لاگ تبصرہ صادر کیا۔ "ان ہسٹوریز کے لئے ہندوستان میں کوئی استھان (جگہ) نہیں ہے۔"

پاکستان اور ہندوستان کے مابین اختلافات بہر طور غور طلب ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ہماری تاریخ کے نہایت اہم زمانوں میں حکومتوں نے فرقہ پرست عناصر کی طرفداری کی ہے۔ تاریخ میں تحقیق اور تفتیش کی آگے بڑھ کر حوصلہ شکنی کی ہے' دوسرا نمایاں فرق یہ ہے کہ ہمارے اعلیٰ تدریسی اداروں میں چونکہ بڑی تیزی

MashalBooks.org

کے ساتھ زوال آیا اور ہمارے غیر محفوظ حکمران جن میں محمد ضیاء الحق امتیازی درجے کے مالک تھے تاریخ کی بیساکھی کے ہمیشہ محتاج رہے لہٰذا تاریخ پاکستان میں فروغ نہ پا سکی۔ تاریخ اور کلچر جن میں اسلامی کلچر اور تاریخ شامل ہیں، ایک سنجیدہ مطالعے کے مضمون کی حیثیت سے ختم ہو گئے۔ پاکستان میں اسلام کو اور اسلامی تاریخ کو جس قدر مسخ کیا گیا ہے، شاید ہی کسی اور مضمون کو ان سے زیادہ مسخ کیا گیا ہوگا۔ یہاں اسلام اور اس کی تاریخ چار دہائیوں تک پڑھائی جاتی رہی، لیکن اس تمام عرصے میں نہ تو مذہب کو اور نہ تاریخ کو ریاست یا معاشرے کی طرف سے سنجیدہ توجہ کا مستحق سمجھا گیا۔ میرے علم کے مطابق پاکستان میں ان مضامین پر ایک بھی قابل ذکر کتاب شائع نہیں ہوئی۔ اسلامیات ہمارے اسکولوں اور کالجوں کے نصاب کا ایک لازمی مضمون ہے۔ لیکن یہ مضمون تقریباً اول تا آخر تقویٰ اور روحانیت اور تصوف کے تصور سے خالی ہے۔ ان میں زیادہ سے زیادہ رسمی خانہ پری رہ گئی ہے اور بری بات یہ ہے کہ اس نے اسلام کو محض ایک مجموعہ تعزیرات اور اس کی تاریخ کو مسلسل پرتشدد واقعات کا روزنامچہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

(''ڈان'' 15 فروری 1998ء)

MashalBooks.org

ایک اسلامی المیہ

پاکستان میں اسلامی تاریخ کے باب میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس پر تو کوئی بھی اسلام کا تاریخ داں کانپ اٹھے گا۔ اس موضوع پر چند سال پہلے میں نے ایک پاکستانی یونیورسٹی میں ایم اے کے طلبہ سے کچھ سوالات کیے۔ اسلامی تاریخ میں پہلا بڑا تفرقہ جسے خوارج تحریک کا نام دیا گیا' اس کے اندر کون سے عوامل کام کر رہے تھے؟ اس کا 25 طلبہ میں سے کسی ایک کو شمہ برابر علم نہ تھا۔

اشعری فکر کیا تھی اور اسلامی دینیات کی ترقی میں اس کا کیا مقام تھا؟ اس کا ایک طالب علم نے بھی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ معتزلہ کے بارے میں صرف ایک طالب علم کے ذہن میں کچھ شائبہ سا تھا۔ (وہ اچھے لوگ نہیں تھے' ان کی فکر میں دہریت کے عناصر تھے۔) اس وقت مجھے خیال آیا کہ ہم پاکستان میں تاریخ کا خاتمہ دیکھ رہے ہیں۔ فرانسس فوکویاما نے اس وقت تک تاریخ کے خاتمے کے متعلق اپنا پراسرار نظریہ پیش نہیں کیا تھا۔ پھر خیال آیا کہ میں غلطی پر تھا۔ وہ لاعلمی جس پر نظریے کا بوجھ ڈال دیا گیا ہو' بہرحال ایک تاریخ کو جنم دیتی ہے۔ حق پرست لاعلمی کے سوتے پاکستان میں بھی اتنے ہی گہرے ہیں' جتنے الجزائر میں 1962ء میں نوآبادیات کے خاتمے کے بعد تھے' جہاں ہر شے میں ''مقامیت'' پیدا کرنے کی جھوٹی کوششوں کے باعث تعلیم کے دو متوازی نظام چل نکلے' ایک فرانسیسی اور دوسرا عربی' ایک جدید اور دوسرا روائتی۔ یہ بڑی حد تک انہی دو نظاموں کے پیدا کردہ عناصر ہیں' جو 1992ء سے برسر جنگ ہیں۔ اب تک اس جنگ میں ستر ہزار جانیں ضائع ہو چکی ہیں اور الجزائر اور اس کے عوام پر بے پایاں عذاب برابر بڑھتا جا رہا ہے۔

پاکستان میں پچھلے دو عشروں میں مدرسوں کی توسیع بڑے ڈرامائی انداز سے ہوئی ہے۔ ان مدرسوں کو حکومت سے فراخدلانہ امداد مل رہی ہے اور باہر سے بے اندازہ امدادی رقوم آ رہی ہیں۔ وزارت تعلیم کی اطلاع کے مطابق 1995ء میں پاکستان کے اندر ایسے مدارس کی تعداد 6 37 تھی۔ جن میں طلبہ کی تعداد 540048 تھی۔ اعلیٰ درجوں میں مرد طلبہ کی تعداد 80051 اور طالبات کی تعداد 4738 تھی۔ اس کے سماجی اور سیاسی عواقب خاص طور پر غور طلب ہیں۔ بارہ سے اٹھارہ سال کی تدریس کے بعد یہ نوجوان کسی بھی پیشے کے اہل نہیں رہتے' سوائے اس کے کہ مسجد میں امام مقرر ہو جائیں یا ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کی تمنا کرتے رہیں' جس میں وہ شاید حکمران اشرافیہ کے درمیان شمار کیے جائیں گے۔

یہاں میں یہ بتاتا چلوں کہ محولہ بالا عبارت میں جو اعداد و شمار میں نے پیش کیے وہ محض تخمینے ہیں' جو درست نہیں' جیسا کہ وزارت داخلہ اور وزارت تعلیم کے حکام بیاکی سے تسلیم کرتے ہیں۔ حکومت کے پاس ان مدرسوں کی تعداد کا کوئی ریکارڈ نہیں' نہ ان میں داخلوں کی بابت کوئی علم ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی معلوم نہیں کہ

ان میں کتنے غیر ملکی طلبہ پڑھتے ہیں۔حکومت ان کی مالیات کا آڈٹ نہیں کراتی' نہ یہاں غیر ممالک سے آنے والی رقوم پر نگاہ رکھتی ہے'نہ ان کے نصاب' امتحانی نظام یا ڈسپلن کے آداب کا محاسبہ کرتی ہے۔بعض مواقع پر تشویش میں مبتلا کسی سرکاری افسر یا کسی خفیہ اہلکار نے رجسٹریشن اور اطلاع دہی کا ایک نظام تجویز کیا اور غیر ملکی طلباء اور باتفوں کیلئے قونصل کے تقرر کی سفارش کی' لیکن ہر مرتبہ کوئی پریشر گروپ یا دباؤ ڈالنے والے افراد آڑے آ گئے اور سیاست دانوں نے' جن میں فوجی بھی شامل تھے اور سویلین بھی' چپ چاپ ہتھیار ڈال دیئے۔کہا جاتا ہے کہ وزیر داخلہ کے طور پر جنرل نصیر اللہ خان بابر نے جو حکام بالا میں سب سے بڑے تھے'مذکورہ اقدامات کی حمایت کی' لیکن وہ بھی اس صریح سیاسی موقع پرستی کی رکاوٹ اپنے راستے سے نہ ہٹا سکے۔

اخبارات میں مبصران مدارس کو بالعموم ''ازمنہ وسطیٰ کے ادارے'' قرار دیتے ہیں' جو زمانہ وسطیٰ کے مسلمانوں کی تہذیب کی صریحاً بڑی توہین ہے۔ایسے کئی اداروں کے معائنے سے منکشف ہوا کہ ان مدارس کے نصاب اور طریقہ تعلیم کا زمانہ وسطیٰ کے علمی مراکز سے دور کا بھی واسطہ نہیں' جیسا کہ بارہویں صدی میں الازہر تھا' تیرہویں صدی میں زیتونہ تھا یا چودھویں صدی میں قرویین تھا۔ان اسلامی مراکز میں تدریس کے لئے جو علوم مقرر تھے' آج کے مدارس میں ان میں سے کچھ بھی نہیں پڑھایا جاتا' نہ ریاضی اور کیمیا' نہ علم نباتات اور فلکیات اور نہ فلسفہ' کچھ بھی نہیں۔ان مدارس نے نہ تو اب تک کوئی عالم پیدا کیا ہے اور نہ یہ امکان ہے کہ کوئی عصر حاضر کا الفارابی' کوئی ابن سینا' کوئی شیخ سعدی یا امیر خسرو پیدا کر سکیں گے۔

ایک اسلامی المیہ

ان مدرسوں کا نصاب اسلام کو محض ضابطہ فوجداری تک محدود کر دیتا ہے۔جس میں صرف وضو کرنے'نماز پڑھنے کے طریقے اور صغیرہ کبیرہ گناہوں کی تفصیل اور ان کی سزائیں شامل ہوتی ہیں۔ہزاروں نوجوان جوان مدرسوں سے فارغ ہوتے ہیں۔وہ بیچ بھنور میں بے یار و مددگار ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں۔اپنے ماضی سے ان کا رشتہ منقطع ہوتا ہے اور مستقبل کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ بالکل تیار نہیں ہوتے۔ان کے دماغ میں اس مذہبی ریاست کا خواب بھرا ہوتا ہے'جس میں ان سے کام لیا جائے گا۔

یہ نوجوان فرقہ پرستوں کے جتھے تیار کرنے کیلئے ایک قسم کی تاریخ بنا سکتے ہیں' وہ جتھے جوان کی دانست میں ملک کو تمام آلائشوں سے پاک کریں گے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس کام کے لئے وہی سب سے زیادہ موزوں ہیں۔پاکستانی مدرسوں سے پڑھ کر جو افغان طالبان نکلے ہیں وہ دینی مدارس اور برائے نام سیکولر تعلیمی اداروں سے نکلنے والے بہت سے نوجوانوں کے لئے نمونہ بن کر ابھرے ہیں۔افغانستان میں طالبان کے ساتھ جن پاکستانی نوجوانوں نے جنگ لڑی ہے ان کی تعداد دس ہزار سے پندرہ ہزار تک ہے۔

(دیکھئے احمد رشید کا مضمون: Conflict Eroding Stability in Pakistan۔ Afghanistan مجموعی طور پر پاکستان میں مسلح انتہا پسندوں کی تعداد چالیس سے پچاس ہزار تک ہے۔ ان میں سے اکثر افغانستان اور کشمیر میں لڑ چکے ہیں۔ حقیقت میں تو مذہبی انتشار پسندی بے تحاشا بڑھ چکی ہے۔

بہت سے پاکستانی دہشت گرد جو پولیس کو مطلوب ہیں' وہ افغانستان فرار ہو چکے ہیں۔ اس حقیقت کا اظہار بہت کم کیا جاتا ہے۔ قاری اللہ وسایا نے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ڈیرہ غازی خاں کی جیل سے فرار ہوا تھا' پولیس کو بتایا کہ اسے افغانستان میں حرکت الانصار کیمپ سے حکم ملا تھا کہ اپنے ساتھی دہشت گردوں کو آزاد کراؤ۔ ۱۱ جون ۱۹۹۸ء کو مومن پورہ (لاہور) میں جو قتل عام ہوا تھا' وہ بم کے اس دھماکے کی سالگرہ منائی گئی تھی جس میں سپاہ صحابہ کے ایک بانی رہنما ہلاک ہو گئے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق پولیس کی حراست میں اللہ وسایا کے قتل سے بھی تھا۔ مومن پورہ کے واقعہ پر احتجاج کرنے والوں نے لاہور کے ڈپٹی کمشنر اور پوسٹ ماسٹر کے دفاتر نذر آتش کر دیئے۔ واقعات کا یہ سلسلہ ان متضاد عوامل کی نشاندہی کرتا ہے جن کے باعث ریاست فرقہ وارانہ تشدد کے چکر میں پھنس گئی ہے۔

جب بھی کسی ملک میں تشدد کا کوئی واقعہ یا تخریبی کاروائی ہوتی ہے تو پاکستان اس کا الزام ہندوستان کی خفیہ ایجنسی را، پر لگاتا ہے اور ہندوستان آئی ایس آئی کو مورد الزام قرار دیتا ہے۔ اس سال شاید الزام اتنے زیادہ نہیں لگائے جاتے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان خفیہ جنگ کی رفتار میں تیزی آئی ہے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں پاکستان میں جو تخریبی کارروائیاں ہوئیں اور کراچی اور دوسرے مقامات پر لسانی اور مذہبی ہنگامے ہوئے' پاکستان نے اس میں بھی ہندوستان کے ملوث ہونے کا شبہ ظاہر کیا۔

ہندوستان نے پنجاب میں سکھوں کی اور کشمیر میں مسلمانوں کے تشدد اور بمبئی' دہلی اور کوئمبتور میں بم دھماکوں کا الزام پاکستان پر لگایا۔ غیر جانبدار مبصروں کا خیال ہے کہ دونوں جانب الزاموں میں کسی حد تک صداقت ہے۔

پاکستان اور ہندوستان نے جو ایٹمی صلاحیت حاصل کر لی ہے اس نے بھی دونوں ملکوں میں اس پراکسی جنگ کو تیز کیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ سرد جنگ کے زمانے میں عالمی طاقتوں کے درمیان بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ امریکہ اور سوویت یونین اپنی ایٹمی طاقت کو ایک دوسرے کا حلقہ اثر والے ملکوں کے اندر باغیوں اور شورش پسندوں کی امداد کے لئے استعمال کرتے تھے اور وہاں توڑ پھوڑ کراتے تھے۔ سرد جنگ کے اس دور میں قریب ایک کروڑ ستر لاکھ افراد اس طرح مارے گئے۔ بین الاقوامی امور کے بعض ماہر اس زمانے کو "طویل امن" کا زمانہ کہتے ہیں۔ ایران' کوریا' ویت نام' کیوبا اور مشرقی وسطی میں ان دونوں بڑی طاقتوں کے درمیان مقابلے ہوئے اور ایٹمی جنگ کے خطرے نے ہی ان مقابلوں کو بڑی جنگ میں تبدیل ہونے

سے روکا۔ اس سے یہ منطق پیدا ہوئی کہ ایٹمی صلاحیت جنگ کو روکتی ہے۔

لگتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان اسی منطق میں نہیں گئے ہیں۔ یہ دونوں ملک غلط اور گمراہ کن اندازوں کا شکار ہیں۔ کیونکہ ابھی ترقی کے ابتدائی اور عبوری دور میں ہیں۔ انہیں عدم استحکام کا ہر وقت خطرہ ہے' یہاں شہری کے ساتھ معاشرتی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ دونوں ملکوں کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ بھی نہیں ہے اور ان میں ایٹمی ہتھیاروں کے کمانڈ اور کنٹرول کا ایسا نظام بھی نہیں ہے' اس لئے خطرہ ہے کہ کسی وقت بھی وہ خطرناک مہم جوئی کا شکار ہو سکتے ہیں۔ تاہم ابھی تک دونوں ملکوں کے حکمران طبقوں کو اس خطرے کا احساس نہیں ہے۔ میں پھر کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے معاشرے میں تشدد کی کئی بنیادیں ہیں۔ (۱) روایتی اقدار اور معاشرتی عوامل' جن کا پہلے بھی محدود عمل دخل تھا' تیزی سے ہونے والی غیر مساوی معاشرتی تبدیلیوں نے بالکل ہی ختم کر دیئے ہیں۔ (۲) سیاست میں مذہب کو داخل کرنے اور حکومتوں کی طرف سے اسلامی نظام قائم کرنے کے دعووں نے مذہبی تفرقہ پیدا کیا ہے اور مذہبی انتشار پسندوں کے مطالبات بڑھا دیئے ہیں۔ (۳) امریکہ کی سرپرستی میں جو جہاد شروع کیا گیا' اس نے ملک بھر میں اسلحہ پھیلا دیا ہے اور منظم دہشت گردوں کو ایک جواز مل گیا۔ (۴) بین الاقوامی اور علاقائی مفادات نے مختلف گروہ پیدا کئے ہیں' جو ان کے لئے کام کرتے ہیں۔ (۵) ہماری تعلیمی پالیسی ایسے نوجوانوں کی فوج پیدا کر رہی ہے' جو مایوسی کا شکار ہیں اور ان کے اندر غصہ اور تشدد پروان چڑھ رہا ہے۔ (۶) ایٹمی ہتھیاروں پر سمجھوتہ ہونے کی وجہ سے ہندوستان اور پاکستان دونوں کو یہ موقع ملا ہے کہ وہ ایک دوسرے ملک کے اندر مسلح باغیوں کی حوصلہ افزائی اور امداد کریں۔ (۷) ریاستی اداروں میں جرائم کی تفتیش کرنے اور قانون کی عمل داری نافذ کرنے کی صلاحیت اور عزم و حوصلہ ہی ختم ہو گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہمیں جو چیلنج درپیش ہے بہت ہی پیچیدہ ہے اور مسائل حل کرنے کی ان محدود اور بے دلی کے ساتھ کی جانے والی تدابیر سے ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے' جو سیاسی مصلحت کے ساتھ کی جائیں۔

(''ڈان'' 22 فروری 1998ء)

اسلام اور سیاست

MashalBooks.org

اسلام اور سیاست

اسلام اور سیاست کے حوالے سے لکھنے میں کچھ خاص قباحتیں ہیں۔ اسلامیات کا مطالعہ ایک ایسا میدان ہے، جس میں قدیم غار اور کھائیاں اور جدید بارودی سرنگیں بچھی ہوئی ہیں اور ان پر تسلط بظاہر مختلف، لیکن ایک دوسرے کے معاون دشمنوں کا ہے اور یہ ہیں "روائتی" علما اور "جدید" مستشرقین۔ ان کے طریقے مختلف ہیں، جس طرح ان کے ارادے جداگانہ ہیں۔ جی ہاں، سوائے چند استثنائی صورتوں کے، یہ دونوں فریق اسلام اور سیاست کے تعلق کو بنیاد پرستی اور اس کے متن کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ دونوں اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ اسلام میں مذہب اور سیاست کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ دونوں اپنے ذہنوں میں لازمی طور پر اسلام کا ایک جامع تصور رکھتے ہیں۔ نیز سماجی اور اقتصادی عوامل کے نتیجے میں جو تبدیلیاں اور جدتیں وجود میں آتی ہیں، وہ انہیں مذہب کے مسلمہ اور طبعی معیارات کے منافی خیال کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ میں جو زمانے نہایت تخلیقی نوعیت کے گزرے ہیں، جیسے اسپین میں بنو امیہ کا دور، ہندوستان میں مغلوں کا دور اور ایران میں صفویوں کا عہد، یہ ان سب کو اسلام کے معمولات سے انحراف قرار دیتے ہیں۔ ایک طرف مغرب کے دانشوروں کا کٹر پن ہے، دوسری طرف علمائے دین کا کٹر پن، ان دونوں کے عمل اور ردعمل نے اسلام پر موجودہ گفتگو کی اساس رکھی ہے۔

ایک دوسرا مسلمہ انداز فکر کا اور تعصبات کا ہے، اسے بھی سامنے رکھنا چاہیے۔ یہ صرف اسلامی تہذیب ہے، جس کے ساتھ مغرب کی علاقائی، مذہبی اور تہذیبی سرحدیں ملتی ہیں اور چودہ برس سے ان سرحدوں میں کمی بیشی ہوتی رہی ہے۔ مغرب کے ساتھ اسلام کا تعلق برابر قائم رہا ہے۔ اکثر اس تعلق میں قربت تھی، ان کے درمیان بہت عرصے تک تصادم اور نہایت خون ریز تصادم کی صورت بھی رہی، مفید نتائج بھی نکلے، باہم تعاون بھی رہا، جسے اکثر بھلا دیا گیا۔ محمد رسول ﷺ کی رسالت کے بعد کی صدی میں اسلام کی بالادستی اور ڈرامائی طور پر اس کی توسیع مسیحیت کی موجودگی کے حوالے سے دیکھنے میں آئی۔ نتیجہ یہ کہ مغرب اور اسلام دونوں ایک حریفانہ اشتراک عمل کے رشتے میں جڑے رہے، اس میں اسپین پر مسلمانوں کی حکمرانی کی سات صدیاں، فرانس پر ناکام حملہ اور سسلی پر ناتمام قبضے کی وارداتیں شامل ہیں۔ صلیبی دور کا طویل اور خون ریز تصادم اور بعد میں بلقان پر عثمانیوں کی بالادستی، ان سب باتوں نے مل کر اسلام اور مسلمانوں کے متعلق مغرب کے معاندانہ خیالات اور ان کے کردار کے ڈراؤنے پن کو اور بھی پختہ کر دیا، یہاں تک کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کو بھی نہیں بخشا گیا اور صدیوں تک ان کے پیغام کی غلط تفسیر اور تضحیک آمیز توجیہہ ہوتی رہی۔ اس کے جواب میں زمانہ وسطیٰ کے مسلمان مصنفوں نے جمہوریت اور

مسیحیت کو غلط سمجھا اور ان کی غلط ترجمانی کی۔تاہم اسلام چونکہ بائبل اور اسے لانے والے پیغمبر کا احترام کرتا ہے کیونکہ وہ پیغمبر اسلام کے پیش رو تھے لہٰذا خوش قسمتی سے ان کی لفظی بازیگری نے دشنام کا رنگ اختیار نہیں کیا۔اس کا سہرا مغرب کے سر جاتا ہے کہ وہ ازمنہ وسطیٰ کی گولہ باری کے تعلق سے اسلام پر مسیحیوں کے مباحث (اٹھارہویں صدی عیسوی تک) نہایت خوش اسلوبی سے دستاویزی صورت میں شریک کئے گئے تھے۔

غیر مغربی تہذیب کے ساتھ مغرب کی تہذیب کا تصادم اپنی نوعیت کی کچھ عجیب تاریخ ہے جس کے نتیجے میں بلاشبہ دونوں جانب تعصب اور غیظ وغضب کا طومار جمع ہوتا گیا' لیکن فساد کے اس اسلوب میں بھی قبولیت کے زمانے آتے رہے۔ادھر ہماری تہذیبیں روایتی' زرعی اور عہد وسطیٰ کے مطابق تھیں۔ تاہم ان کے درمیان اپنی ساخت میں یک گونہ تناسب موجود رہا' جس کی بدولت خیالات اور پیداوار دونوں کے باہمی تبادلے میں کسی حد تک برابری باقی رہی۔جنگوں میں جیتنے والے اور ہارنے والے دونوں ایک ہی طرح کا اسلحہ ڈھالتے تھے اور انہیں استعمال کرتے تھے' ایک دوسرے سے ملتے جلتے مال واسباب کا تبادلہ کرتے تھے اور جانے پہچانے عقلی مفروضوں پر آپس میں بحث کرتے تھے۔ان کی اشرافیہ' صناع اور تاجر اور ارباب دانش طبقاتی مفادات میں باہم شریک اور مشترک رویوں کے مالک ہوتے تھے۔ چنانچہ عظیم فاتح صلاح الدین اور شیر دل رچرڈ کے انداز فکر میں یکسانیت ایسی تھی جو آج بھی تقریباً سبھی مسلمان اور مسیحی بچوں کو معلوم ہے۔یورپ اور مسلمانوں کی تاریخ کے طلبہ کو ایسی بہت سی مثالیں یاد ہوں گی' لیکن وہ حسن تناسب جو اسلام اور مغرب کے درمیان موافقانہ اور معاندانہ دونوں رویوں کی بنیاد تھا' جدید زمانے میں آ کر سرے سے غائب ہو گیا ہے۔ماضی میں مسلم دنیا اور مغرب کی باہمی مخاصمت کے لئے اتنی مضرت رساں کوئی بات نہ تھی' جواب روایتی اور زرعیتی اکثریت پر مبنی مسلم معاشروں اور صنعتی سرمایہ دارانہ مغرب کے مابین غیر مساوی مقابلے کی صورت میں پیدا ہوئی ہے۔اس سے جو بہت سے نتائج نکلے ہیں' ان میں جیسا کہ ہم ابھی دیکھیں گے' جدید اسلام کا سیاست کے ساتھ عجیب طرح کا اور بے جوڑ تعلق قائم ہوا ہے۔

مسلم دنیا اور مغرب کے درمیان تعلق میں ایک ڈرامائی تبدیلی 1798ء میں مصر پر نپولین بونا پارٹ کے حملے اور اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں کے درمیان مغلیہ ہندوستان پر برطانوی تسلط کے ساتھ شروع ہوئی۔اس کا خاتمہ عثمانیہ سلطنت کی شکست کے ساتھ ہی ہوا جو آخری مسلمان سلطنت باقی رہ گئی تھی اور پھر شرقی ایشیا سے مغربی افریقہ تک تقریباً پوری اسلامی دنیا پر یورپی ملکوں کا نو آبادیاتی قبضہ ہو گیا۔ مسلمانوں کے لئے یہ ایک کربناک تبدیلی تھی' محض اس حقیقت کی بنا پر نہیں کہ اسلام اور مغرب کے تصادم میں پہلی بار ایسا ہوا کہ مسلمان ملک نو آبادیاتی تسلط کے تابع ہو گئے اور وہ پہلے کی طرح حاکم نہیں رہے بلکہ اسلام اور مغرب کے درمیان اس آخری معرکے کو شدید طور پر غیر انسانی محسوس کیا گیا' جس نے انہیں الگ

MashalBooks.org

تحلک کر کے رکھ دیا تھا۔ تاریخ میں جدید بادشاہت کا کردار عجیب نوعیت کا ہے۔ یہ ایک نہایت مربوط منضبط اور پیچیدہ نظام ہے' جس میں صنعتی دور سے پہلے کی چراگاہی تہذیبوں کا انجام یا تو مکمل تباہی تھا (جیسا کہ مغربی منطقے کی عظیم تہذیبوں کے ساتھ ہوا) یا انہیں کلیتاً اپنے تابع بنا لیا گیا۔ (جیسا کہ ایشیاء اور افریقہ کے ملکوں کے ساتھ ہوا) تاکہ وہ مغرب کے صنعتی شہروں اور تاجروں کی ضرورتیں پوری کرتے رہیں' اس نو آبادیاتی نظام کا جواز (یعنی سفید فام نسل پر ذمہ داری کا بوجھ' شہریت کے مشن کی ترویج اور ابدی ذمہ داری وغیرہ) اس مفروضے پر تھا کہ مقامی باشندے کمتر درجے کے لوگ ہیں' ان کا وجود کمتر حیثیت رکھتا ہے اور وہ کم حیثیت انسانی برادری میں شامل ہیں۔ ''منظم کاروباری ادارے'' کے یہ اہم عناصر تھے' جس کو ایڈورڈ سعید اور دوسرے دانشوروں نے گہرے تجزیے کے بعد اورینٹل ازم (شرقیت) قرار دیا ہے۔

نو آبادیاتی تسلط کے خاتمے کا عمل جیسے جیسے شروع ہوا' مقامی لوگوں یعنی ''نیٹوز'' پر مغرب کی بالادستی کے جواز کی ضرورت کم ہوتی گئی۔ اب یہ امید کی جانے لگی کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منظم لسان طرازی میں قدرے کمی آ جائے گی۔ یہ توقع قابل فہم تھی۔ اس بنا پر کہ امریکہ اور یورپ میں مسیحی دنیا کے اتحاد کا جذبہ تقویت پا رہا تھا اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور بین الاقوامی لین دین کی بدولت مواصلات میں آسانیاں پیدا ہو گئی تھی۔ کئی صدیوں کے تعطل کے بعد یہ امکان نظر آنے لگا تھا کہ مغرب کے اسکالر اور ان کے مقابل مسلمان علماء اپنے علمی کاموں کا از سر نو جائزہ لیں گے۔ ان میں جو کوتاہیاں رہ گئی تھیں' انہیں تسلیم کریں گے اور ان کے اندر تعصبات کی موجودگی کا اقرار کریں گے اور ساتھ ہی تاریخ اور معاشرے میں اسلامی تجربے کے مفہوم کا ناقدانہ لیکن مثبت انداز سے تجزیہ کریں گے۔ دو جنگوں کے درمیان زمانے میں جو رجحان' پہلے فرانس میں اور اس کے بعد برطانیہ اور امریکہ میں ابھر کر سامنے آیا' اس سے یہ اشارہ ملا کہ اس سمت میں تبدیلی کا آغاز ہو چکا ہے۔ فرانس میں لوئی میسی نان (Louis Massignon) کے علمی کاموں سے ترمیم پسند مکتبہ فکر کے فروغ کو تقویت ملی' جس میں ژاک برگ (Jacques Berque)' میکسم روڈینسن (Maxime Rodinson) ایوزلاکوستے (Yves Lacoste) اور روجر آرنالڈز (Roger Arnaldz) جیسے علمائے اسلام شامل تھے۔ برطانیہ اور امریکہ میں ان کے مقابلے میں ایچ اے آر گب (HAR Gibb) ولفرڈ کینٹ ول اسمتھ اور نارمن ڈینئیل (Norman Daniel) تھے۔ بدقسمتی سے ان عناصر نے جن کے اپنے نظریاتی مفادات تھے' اس خوش آئند رجحان پر غلبہ پا لیا۔

نو آبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد بجائے اس کے کہ کشیدگی کم ہوتی' سرد جنگ اور عرب اسرائیل تنازعے نے اسلام کے خلاف مغرب والوں کے بیانات میں تحریف اور مسلمانوں کے لئے بدخواہی کا عنصر شامل کر دیا۔ موجودہ دور میں مسلمانوں کے مسائل کیا ہیں؟ سرد جنگ کے کارپرداز دانشوروں اور شرقی وسطی

میں اسرائیل کے طرف دار "ماہروں" نے اسے سمجھنا مشکل بنا دیا ہے۔ اس عمل میں ان کی تحریف' غلط ترجمانی اور محض تنقید نہیں بلکہ دشنام طرازی بھی شامل ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ناقدانہ تحریروں کو نسلی تعصب اور نظریاتی عناد پر مبنی تحریوں سے الگ رکھا جائے اور ان کے درمیان امتیاز کیا جائے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مراکش سے لے کر شام' عراق اور پاکستان تک مسلمانوں پر مسلح اقلیتیں حکومت کر رہی ہیں۔ ان میں سے کچھ اپنے آپ کو سوشلسٹ اور جمہوری کہتے ہیں' کچھ خود کو اسلامی کہتے ہیں اور کچھ دوسرے اسلامی سوشلسٹ اور جمہوری ہونے کے دعوے دار ہیں۔ تقریباً سبھی مسلمان حکومتوں کی تشکیل بدعنوان اور بے حس اشرافیہ سے مل کر ہوئی ہے جو قدرتی وسائل دولت یا قومی آزادی کے تحفظ سے زیادہ شہری آبادی کو دبانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ مقامی سیاست سے زیادہ ان کا تعلق غیر ملکی سرپرستوں سے رہا۔ اب جو بنیاد پرستی اور نئی طرح کی کثیر استبدادیت مسلمان تحریکوں کی صورت میں ابھی ہے' وہ محض ایک ذہنی لہر ہے' اسلامی تاریخ میں اس کی حیثیت معمول کی نہیں ہے۔ تاہم یہ بات موجودہ حکومتوں کی ناکامی اور کسی قابل عمل متبادل کی عدم موجودگی پر دلالت کرتی ہے اور اب یہ زمانہ والہانہ ستائش اور قصیدہ خوانی کا نہیں رہا۔ سنگ دلی اور موقع پرستی کے ساتھ مہارت جتانے کی بجائے ناقدانہ بصیرت سے کام لینا ہوگا۔ یہ تو تعصب پر مبنی علیت برتنے کا خمیازہ ہے کہ مختلف معاشرے اور ریاستی نظام جن کی بظاہر وہ خدمت پر مامور ہیں' انجام کار انہیں مسخ شدہ حقائق کا عذاب جھیلنا پڑتا ہے۔ بیشتر "ماہرین" کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ مسلمانوں کی سیاست کیا ہے اور ان کے' خاص طور پر مشرقِ وسطیٰ کی اقوام کی اذیت کے اسباب کیا ہیں اور ان کی امنگیں کیا ہیں؟ چنانچہ تاریخ میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ یعنی الجزائر میں ایک عہد ساز انقلاب کی آمد' 1973ء میں عربوں کی فوجی پسپائی یا امن کے لئے انور سادات کا غارت گر فیصلہ' لیکن یہ سارے واقعات جب تک اخبارات کی شہ سرخیوں میں نہیں آئے' عام لوگ ان سے بے تعلق رہے۔ وہ انقلاب جو 1978ء میں ایران میں آیا اور جس کی آمد کی تیاریاں بہت پہلے سے ہو رہی تھیں' امریکہ میں جمی کارٹر سے لے کر والٹر کرنکائٹ تک بڑے بڑے لوگوں کو اس کی خبر بھی نہ ہوئی۔ اسے سمجھنے میں ان کے ماہروں کو جو ناکامی ہوئی اس پر وہ بھی حیران رہ گئے' جس طرح انقلاب ایران کی پیش گوئی کی جا سکتی تھی' ان کی ناکامی کی پیش گوئی بھی ممکن تھی۔ شاہ کو امریکہ کا اور اسرائیل کا بھی دوست سمجھا جاتا تھا۔ وہ اپنے کردار میں "جدید" تھا اور ماہروں کی رائے میں مخالف اسلام تھا اور شاہ خرچ تھا۔ ایران کی بابت سرکردہ ماہرین شاہ کے کردار کی وضاحت کرتے ہوئے ایران اور اس کی تاریخ کو مسخ کر کے پیش کر رہے تھے۔ چنانچہ پروفیسر لیونارڈ بنڈر (Leonard Bindor) جو شکاگو یونیورسٹی کے ایک ممتاز پروفیسر ہیں' لکھتے ہیں:

"یہ ہے وہ قوم (ایران) جس نے تاریخ کے ادوار میں اپنے ملک پر خود حکومت نہیں کی' جس پر ایک مذہب (اسلام) جو اس کے لئے قطعاً اجنبی تھا' مسلط کیا گیا اور جس نے اپنے عرب ایذا دہندوں کو

فریب دینے کے لئے اس مذہب (تشیعت) کو توڑ مروڑ کر اختیار کیا' یہ قوم کسی فوجی ہیرو کی موجودگی پر بھی فخر نہیں کر سکتی۔ اسے اپنے شاعروں اور صوفیوں کے وجود سے بھی محروم رکھا گیا اور اپنے مقدر کو بدلنے کی خواہش بھی اس قوم کے اندر باقی نہیں رہی۔"

پروفیسر مارون زونس (Prof. Marvin Zonis) ایران کے باب میں ایک مشہور ماہر ہیں۔ انہیں "غیر ملکی عالموں کے ساتھ شہنشاہ کے سلوک میں شاہانہ وقار نظر آیا۔ جرات مندانہ بھی اور لائق ستائش بھی۔ ملک کی داخلی صورت پر شہنشاہ کی گرفت اپنے عروج پر ہے۔ یہ بات بلاشبہ عین درست ہے کہ "شہری گوریلوں" کی موجودگی کے باوجود اور غیر ملکی ناقدین کی نکتہ چینی کے باوصف محمد رضا شاہ پہلوی کو 1974ء میں جو اقتدار حاصل تھا اور جو ایک نہایت موثر سیاسی نظام کی سربراہی کر رہا تھا' ایسا اقتدار اور اختیار ایران کی تاریخ میں کسی اور حکمران کو حاصل نہیں ہوا۔ اس کی مثالیں بھی اسی طرح بے افراط ہیں' جس طرح ماہرین بہت ہیں۔ یہ نو آبادیاتی دور کے بعد ظہور میں آنے والے علاقوں کے ماہر' جن کی تربیت سطحی ہوتی ہے جو سرسری اور چلتے ہوئے ضابطوں اور علوم کے ساتھ شناسائی رکھتے ہیں اور اپنی حکومتوں اور اداروں کی ترجیحات کے تحت کام کرتے ہیں اور جنہیں اپنے مطالعہ کے "موضوع" سے کوئی تعلق نہیں ہوتا' روایتی مستشرقین کی طرح ان سب کی محدودات تو ہیں' لیکن ان کی خوبیاں سرے سے نہیں۔ چنانچہ دانش کی وہ روایت جسے مسخ کیا گیا ہے' اسلام کے متعلق مغرب کی فکر پر حاوی چلی آ رہی ہے۔ اس کا اثر مسلمانوں پر بھی شدت سے ہوا ہے۔ اس سے روایتی علماء کے اندر ضد پیدا ہو گئی اور انہوں نے ناقدانہ تجسس اور تحقیق کے لئے نئے طریقوں کی راہ اپنے اوپر بند کر لی۔ اس سے یہ بھی ہوا کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں نے ان وقیع علمی کاموں کو بھی نظر انداز کر دیا جو مغرب کے دانشوروں نے دینی تصورات اور تاریخ کی تفسیر کے باب میں مرتب کئے تھے' ان سب سے بالا مغرب کے متعصبانہ رویے نے جدید مسلمانوں کی مدافعتی جبلت کو بیدار کرتے ہوئے ان میں تخلیق اور تجسس کی قوتوں کو کمزور کر دیا۔

ایک مسلمان اسلام کے بارے میں لکھتے ہوئے جب کہ اس کے ناظرین بڑی تعداد میں مغرب کے لوگ ہوں یہ طے کرنے میں سخت دشواری محسوس کرتا ہے کہ وہ وضاحتیں پیش کرے یا تحقیق سے کام لے۔ جبلت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ غلطیوں کی توجیہہ کرے' الزامات کو ماننے سے انکار کر دے اور مسلمانوں کی تاریخ' ان کے تصورات اور جذبات کی توضیح جس رسوا کن انداز میں کی گئی ہے' انہیں چیلنج کرے۔ سید امیر علی نے سو سال پہلے محمد رسول ﷺ کی سیرت اور تعلیمات لکھی تھی' تب ہی سے بیشتر جدید مسلمان مصنفوں کے یہاں کم وبیش یہی جبلت کام کر رہی ہے۔ ان کی اس کوشش میں یک گونہ دوری کی کیفیت شامل ہوتی ہے کیونکہ ایک محکوم خطے کے مسلمان جنہوں نے مغربی تعلیم حاصل کی' مغرب کے ساتھ مغرب کی ہی شرائط پر گفتگو کرنے کے لئے بے حد مضطرب تھے۔ ان کے اندر غرور تھا' اس کلچر کا جواب وقیع نہیں رہا اور اس تاریخ کا جو

MashalBooks.org

مسخ کی گئی تھی اور اس مذہب کا غرور جس پر بہت تہمتیں دھری گئیں۔ ان ساری کاوشوں کی بنا پر ان کو اسلام کے "معذرت خواہ" نقطہ نظر کا حامل کہا گیا۔ چنانچہ اسلام پر حالیہ دور کی بکثرت تصانیف مستشرقین کے پیش کردہ اسلام کے دفاع اور تصحیح پر مبنی لاحاصل کاوشیں ہیں۔ یہی وہ اصل سبب ہے جس کے تحت میں توضیحات کی شدید خواہش سے خود کو باز رکھنا چاہتا ہوں۔

عام طور پر یہ بات بہ اصرار کہی جاتی ہے کہ مسیحیت اور دیگر مذاہب کے برعکس اسلام میں مذہب اور سیاست ایک دوسرے سے الگ نہیں۔ رسمی نوع کی قانونی اصطلاحات اور کتابی متن کے حوالے سے یہ بات درست ہو سکتی ہے' لیکن اس طرح کا عمومی دعویٰ کرنا' مسلمانوں کے سیاسی طرز عمل کو سمجھنے کے لئے نہ تو تاریخی طور پر درست ہوگا اور نہ زمانہ حال کی روشنی میں صحیح قرار پائے گا۔ انتہائی بنیادی مفہوم میں سیاست کے اندر کچھ نہایت سرگرم رشتے' مثبت اور منفی دونوں' ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں اور معاشرے اور مقتدر اداروں کے درمیان کام کرتے ہیں۔ ان معنوں میں تو مذہب اور سیاست کے درمیان کہیں بھی اور ہمارے زمانے میں تو یقیناً کوئی علیحدگی نہیں رہی۔ مثال کے طور پر ہندوستان کی قومی تحریک کے نظریاتی اور تنظیمی ارتقا میں ہندو دھرم نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اعلیٰ اور مثالی انسانی قدروں پر مبنی' مہاتما گاندھی نے جو اصول خاموش مدافعت اور عدم تشدد کے باب میں وضع کئے تھے وہ ہندوؤں کے اہنسا جیسے طریق کار پر مبنی تھے۔ چنانچہ آریا سماج اور ہندو مہا سبھا جیسی بنیاد پرست مذہبی تنظیموں نے مہاتما گاندھی کو چیلنج کیا اور وہ بالآخر ایک ہندو بنیاد پرست سیاسی شخص کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ جنوبی ایشیا میں بشمول ویت نام بدھ مت اور بودھوں کے ادارے سیاسی دھارے کے دونوں طرف ایک موثر طاقت بنے ہوئے ہیں۔

امریکہ میں جہاں دو سرکردہ سیاسی پارٹیاں صلح اور جنگ کی بنیاد پر باہم اتنی قریب ہو چلی ہیں کہ ان کے درمیان امتیاز کرنا مشکل ہے۔ یہاں مسیحی چرچ' سیاسی مباحث' مناظرے اور زور آزمائی کا اکھاڑہ بن گئے ہیں۔ امریکہ میں عیسائیوں کی سیاسی سرگرمیاں دائیں بازو کے ریورنڈ جیری فال ویل کی تنظیم مورل میجارٹی (Moral Majority) سے لے کر نیشنل کونسل آف چرچز تک جو متوسط درجے کا لبرل ادارہ ہے اور یہاں سے ڈورتھی ڈیز کی عوام پسند انسان دوستی اور فادر ڈینیل بیریگن کی پرجوش صلح جوئی تک پھیلی ہوئی ہیں۔ لاطینی امریکہ کے ملکوں میں' جن میں ارجنٹائن' چلی' ایل سلواڈور اور برازیل شامل ہیں' حکومتوں کی سرکردگی میں چلنے والے قاتل دستوں نے مسیحی اقدار اور اخلاقیات کے تحفظ کے نام پر قاتلانہ وارداتوں کو ایک مشن کے طور پر جاری رکھا ہے۔ دوسری طرف انصاف اور جمہوریت کی وکالت کرنے والے پادری قتل کئے جاتے ہیں اور نرسوں کو بے آبرو کیا جاتا ہے۔

جہاں تک یہودیت کا تعلق ہے اس کی بھرپور سیاسی کارفرمائی' بنیاد پرستی کے نظریے کے ساتھ ہمیں فلسطین پر ان کے دعوے میں نظر آتی ہے۔ اس دعوے کا جواز نہیں بائبل میں نظر آیا۔ جیوڈیا اور سماریا یعنی

MashalBooks.org

مغربی کنارے اور غزہ تک توسیع ان کے لئے جائز ہے اور وہ عیسائیوں اور مسلمان فلسطینیوں کو ان کے قدیم آبائی وطن سے مزید بے دخل کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔ چونکہ انقلابی ایران میں حصول اقتدار کی کشاکش کا نتیجہ ابھی غیر یقینی ہے اور چونکہ پاکستان میں ایک خود ساختہ اسلامی آمر حکمرانی میں سب سے کٹ کر رہ گیا ہے لہٰذا اسرائیل اور سعودی عرب کو شرق وسطیٰ میں دو ہی مذہبی ریاست شمار کرنا ہوگا۔ دونوں کے یہاں اپنے اپنے وجود کا متضاد جواز ملتا ہے' ایک کے یہاں "اسلامی" شہنشاہت ہے' دوسرے کے یہاں فرقہ وارانہ "جمہوریت" جہاں عیسائی اور مسلمان باشندے قانون کی رو سے دوسرے درجے کے شہری سمجھے جاتے ہیں اور ان سے اس طرح کا سلوک ہوتا ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر یہ بات یقیناً اختلافی اور تعصب پر مبنی کہی جائے گی کہ مسلمان خاص طور پر سیاست میں مذہب کے استعمال پر آمادہ رہتے ہیں' جیسا کہ ذرائع ابلاغ کے بعض مبصر اور ماہر علما اکثر دعویٰ کرتے آئے ہیں۔ اب ذرا قریب سے سیاست اور مذہب کے باہمی تعلق اور مذہب اور ریاستی اقتدار کے رشتے کو زیر بحث لاتے ہیں۔ ریاست اور مذہب کے درمیان فاصلہ اسلامی دنیا میں اسلام کی چودہ صدیوں کے اندر کم از کم گیارہ صدیوں تک برقرار رہا۔ مذہب اور ریاستی اقتدار کے درمیان ایک طبعی رشتہ 945ء میں اس وقت ٹوٹ گیا جب ابو واحد شہزادہ معز الدولہ احمد اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ بغداد کے دار الخلافہ میں داخل ہوا اور سیاسی خلیفہ کے اس دوہرے کردار کا خاتمہ کر دیا جس کے تحت وہ دنیاوی اور روحانی دونوں اعتبار سے مسلمانوں کا سربراہ بنتا ہوتا۔ کچھ عرصے تک خلیفہ نے اسلامی دنیا کے مختلف حصوں میں ایک مسلمہ علامتی سربراہ کے طور پر حکمرانی کی' کیونکہ دنیاوی سطح پر حکمرانوں نے اسے یہ اختیار دیا تھا۔ ان میں سلاطین' امراء   اور خان شامل تھے' اگرچہ ان کی طرف سے کامیاب بغاوتیں بھی ہوئیں اور غاصبانہ قبضے بھی۔ ابو وحید حکمرانوں نے امیر کے طور پر عراق اور فارس پر حکمرانی کی اور ایک سو دس برس تک خلافت کو اپنے زیر نگیں رکھا۔ یہاں تک کہ سلجوق جنگ آزماؤں کے سردار طغرل نے 1055ء میں انہیں تخت سے برطرف کر دیا۔ 1258ء میں منگولوں نے بغداد پر حملہ کر کے اسے تہس نہس کر دیا۔ خلیفہ اور اس کے وارثوں کو قتل کر ڈالا اور عباسی خلافت کو جو دو سو برس تک روایتی انداز سے چلی آ رہی تھی' ختم کر دیا۔ اس کے بعد خلافت اگرچہ بحال کر دی گئی اور اس کا دعویٰ مختلف زمانوں میں مختلف مقامات پر الگ الگ ڈھب کے حکمرانوں   نے کیا' لیکن اسے مسلمانوں کی اکثریت کی اطاعت کبھی حاصل نہیں رہی' اقتدار عملاً سیکولر ہی رہا۔

ریاستی اقتدار سے مذہب کی موثر علیحدگی کو 945ء میں ابو وحید کی فوجی مداخلت پر محمول کرنا تو فراخدلی کی بات ہوگی' ورنہ بنیاد پرست علماء تو اس سے زیادہ سخت ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ 650ء میں امیہ خاندان کے برسر اقتدار آنے کے بعد سے کوئی بھی مسلم ریاست اسلامی نہیں تھی۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے قریبی رفقاء یعنی چاروں خلفاء کے خاتمے کے ساتھ ہی اسلامی ریاست حتمی طور پر ختم

MashalBooks.org

ہو گئی تھی۔ تاہم شیعہ علماء جو اقلیت میں ہیں' ان کا عقیدہ ہے کہ جائز حق دار پیغمبر کے وارث تھے' جن کا ان کے ساتھ خون کا رشتہ تھا۔ وہ چار میں سے دو خلفا (عمرؓ اور عثمانؓ) کو جائز حکمران تسلیم نہیں کرتے۔ بنیادی طور پر تین اسباب ہیں' جن کی بنا پر بعض کٹر علماء 650ء کے بعد آنے والی مسلم ریاستوں کے اسلامی کردار کو رد کر دیتے ہیں۔ پہلے سبب کا تعلق ان سب کی تقویٰ سے عاری زندگی سے ہے' البتہ اس میں استثنا بھی ہے۔ (یعنی عمر ابن عبدالعزیز 720۔ 717ء)۔ دوسرا سبب مسلمانوں کی حکمرانی کے طریقوں میں تاریخی طور پر سیکولر قوانین اور طریق کار کا نفاذ تھا اور تیسرا سبب اسلامی دنیا کا بہت سی سیاسی وحدتوں میں تقسیم ہو جانا تھا۔ یہ ہیں تاریخی ادوار میں سلاطین' امارات' خان اور شیوخ کی عمل داریاں' پھر سلطنتوں کا قیام اور اب جمہوریہ کا وجود۔ تمام علمائے دین امت واحدہ کے اصولوں پر متفق ہیں' جس کا ایک خلیفہ امام ہوتا ہے۔ الوہی قوانین اور آنحضورﷺ کی مثال کی روشنی میں یہی ایک سچی اسلامی حکمرانی ہے۔

ایک مثالی اسلامی سیاست میں چونکہ یہ تینوں شرائط موجود نہیں' لہٰذا مسلم اقوام نے ایک ہزار برس سے زیادہ عرصے تک دنیاوی حکومتوں کے اقتدار اور ان کی عمل داری کو جائز تسلیم کیا۔ تا آنکہ وہ انصاف اور دیانت کے بنیادی معمولات پر کاربند رہیں اور جن لوگوں پر حکومت کر رہی ہیں' کسی حد تک ان کی رضامندی بھی انہیں حاصل ہو۔ اس عمومی اصول کا اطلاق اکثریتی علماء اور مقامی مذہبی رہنماؤں پر بھی ہوتا آیا ہے۔ دراصل اسلام کے نہایت سرکردہ علماء نے یعنی الماوردی (1058۔ 974) البغدادی (وفات 1037ء) الغزالی 1111ء۔ 1058ء) اور ابن ماجہ (1333۔ 1241ء) نے اسلام کے مثالی اصول اور اسلامی سیاسی حقائق کے مابین اس تاریخی مفاہمت کی صراحت اور اسے حق بجانب ثابت کرنے کے لئے بکثرت تفسیریں جمع کر رکھی ہیں۔ چنانچہ اسلام کی ہزاروں سالہ روایات کا ایک ذخیرہ' تمام مذہبی جماعتوں کے درمیان موجود ہے۔ جب کوئی بحران آتا ہے' اجتماعی طور پر کوئی مشکل صورت حال درپیش ہوتی ہے اور کوئی مایوس کن مرحلہ آتا ہے تو یہی روایات نہایت شدت کے ساتھ ابھر کر سامنے آ جاتی ہیں۔ آج مسلم اقوام کو جتنے خراب' جتنے دشوار اور ناقابل فہم حالات درپیش ہیں' غالباً پہلے کبھی ایسے نہ تھے۔ اسی لئے وہ تمام متضاد علامات جن کا تعلق سیاست اور معاشرے کی بحرانی کیفیت سے ہو' موجودہ مسلم سیاست کا کردار متعین کرتی ہیں' یعنی مذہبی بنیاد پرستی کا عروج' انقلابی سرگرمیوں کی شدت' اچانک ابھرنے والی بغاوتیں اور ایسی ذہنی آسودگی جو قطعاً ناقابل فہم ہے۔

مذہبی اور سیاسی طاقت کا ادغام مسلم روایات میں ہمیشہ کی طرح آج بھی مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ تاریخ کا تجربہ ہے کہ مذہب اور سیاست کبھی آپس میں مدغم نہیں ہو سکے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس نے مسلم حکمرانی کی روایات اور مسلمان قوموں کی تاریخ کی تشکیل کی ہے۔ اسی کی بہت سی مثالیں مسلمانوں کی سیاست کو سمجھنے کے لئے نہایت اہم ہیں۔ یہاں چند ایک کا بیان ضروری ہے۔

MashalBooks.org

اسلامی امہ ایک مذہبی روایت کی مالک اور دیگر مذاہب کے لوگوں کو اپنے اندر سمیٹے قبول کرنے والی زمانہ وسطیٰ کی تہذیب کی حامل ہے' اس میں دوسرے عقائد اور تہذیبوں کے لئے رواداری کا ایسا جذبہ موجود ہے' جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی ۔ اس بات کو تسلیم کرنا ہمارے لئے بہت اہم ہے' تاریخی صداقت کے لئے بھی اور اس لئے بھی کہ مسلم تہذیب میں عالمگیر اور غیر فرقہ وارانہ اقدار کو از سر نو داخل کرنا نہایت ضروری ہو گیا ہے اور وجہ بات یہ ہے کہ تمام غیر مسلم' خاص طور پر عیسائی' یہودی اور ہندو اسلام کی مہمات کا جزو لازم رہ چکے ہیں ۔ نو آبادیاتی دور سے پہلے کے زمانے میں مسلمانوں کے قوانین اور ان کے نفاذ میں' مذہبی اور سماجی زندگی کے درمیان فاصلہ اور دونوں کی جداگانہ خودمختاری کا پرتو نظر آتا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت میں غیر مسلم آبادی پر تشدد اور ان کے خلاف زیادتی کی مثالیں بھی یقیناً ملتی تھیں ۔ اس کے باوجود سائنس' فلسفہ' ادب' موسیقی' آرٹ اور فن تعمیر میں اور حکمرانی کے طریقوں میں جو شاندار اور عظیم کامیابیاں حاصل ہوئیں' وہ عیسائیوں' یہودیوں' ہندوؤں اور ان سب کا اجتماعی کارنامہ ہیں' جنہوں نے (اسلامی) حکومت کی تہذیبی اور اقتصادی زندگی میں حصہ لیا ۔ درحقیقت اسلامی تاریخ میں سب سے زیادہ تخلیقی ادوار وہی آئے' جب غالب اکثریت کے ساتھ ہمارے اشتراک عمل سے معاشرہ بارآور ہوا ۔ انڈونیشیا سے ہندوستان تک اور پھر زرخیز ہلال (Fertile Crescent) سے ہوتے ہوئے مصر اور اسپین تک مسلمانوں کے اس سیاسی طرز عمل کو علماء اور مستشرقین دونوں نے اپنی تحریروں میں نظر انداز کیا ۔ اس کے باوجود سیاست سے اسلام کے اس تعلق کو سمجھنا' آج کل کے کسی "اسلامی" سیاسی لیڈر کی انوکھی گفتگو سے کہیں زیادہ معنی خیز بات ہو گی ۔

مسلمانوں نے ان دوسری اقوام کی طرح جو پیچیدہ تہذیبوں میں رہتی آئی ہیں' پوری تاریخ میں سیاست کے ساتھ اپنے تعلق کی بابت متضاد رجحانات کا ثبوت دیا ہے ۔ اختلاف پر مبنی تحریکوں میں اسلام نے بسا اوقات حکمرانوں کے کرپشن اور عیاشی و فضول خرچی کی مذمت کرتے ہوئے اور اصلاح اور قناعت پسندی کے مسلک پر مختلف گروہوں کو حزب اختلاف کا ہمنوا بنایا ہے اور انہیں آپس میں متحد رکھنے کے لئے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے ۔ تازہ ترین مثال ایران میں آیت اللہ خمینی کی اسلامی تحریک کی ہے ۔ اس سے پہلے کی مثال ابن تمرت کی سادگی کی تحریک تھی' جس نے شمالی افریقہ میں بارہویں صدی میں اتنی حمایت حاصل کر لی تھی کہ مراکش اور اسپین میں المواردخاندان کو حکومت سے بے دخل کر دیا تھا ۔ اس کے بعد کی مثال اٹھارہویں صدی کی وہابی تحریک تھی' پاکیزگی اور سادگی پر مبنی اس تحریک نے نجد میں اور سعود کے قبیلے سے خاص طور پر امداد حاصل کی اور پورے جزیرہ نما عرب میں پھیل گئی ۔ اقتدار میں آنے کے بعد اس طرح کی اصلاحی تحریکوں نے نرم رویے اور سیکولر طرز عمل کی طرف اپنا میلان ظاہر کیا ہے ۔ مثال کے طور پر المعبد نے قدرے سیکولر اور قیاس پر مبنی فلسفیانہ مکتبہ فکر کی اور اس کے ساتھ ہی ابن رشد (1198 - 1126) کی سرپرستی کی تھی ۔

MashalBooks.org

دوسری طرف ریاست کی طرف سے جب کسی خاص مسلک یا کسی مذہبی مکتبہ فکر کے نفاذ کی کوشش ہوئی تو مسلمانوں نے اس کے خلاف مزاحمت کی۔ چنانچہ عظیم مسلمان فرماں رواؤں میں سے دو کو اس وقت عوام کی طرف سے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا' جب انہوں نے ایک سرکاری مسلک کو رائج کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ہارون الرشید (الف لیلی کے شہرت یافتہ) کے بیٹے اور عباسی خلیفہ المامون نے (833۔ 786) نے جو بغداد میں ایوان دانش کا بانی تھا (اور جہاں یونانی کتب اور تفاسیر کے بکثرت ترجمے ہوئے اور جس نے یورپ کی نشاۃ الثانیہ میں اہم کردار ادا کیا۔) معتزلہ کے اصولوں کو سرکاری مسلک کے طور پر قبول کیا۔ اس وقت تک اسلام میں مذہبی افکار کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کا آغاز ہو چکا تھا۔ اب اس پر ریاست کی تائید کی مہر لگ گئی۔ وہ خلیفہ کے عروج کا زمانہ تھا' چنانچہ اسلامی معاشرے میں اس کے خلاف مزاحمت بڑی تیزی سے ابھرنے لگی۔ اس طرح معتزلہ کے حامیوں کو اسلامی تاریخ میں منفی انداز کا یہ امتیاز حاصل ہوا کہ انہوں نے مذہبی بنیاد پر تشدد کے استعمال کی پہلی مثال قائم کی۔ اسی طرح اکبر اعظم (1605۔ 1542) کو جو ہندوستان کے مغل حکمرانوں میں انتہائی با تدبیر بادشاہ تھا' خود ساختہ دین الٰہی (1582ء) کے نفاذ پر اپنی مسلمان رعیت کی جانب سے وسیع پیمانے پر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ خوش قسمتی سے اکبر کشادہ ذہن کا مالک اور اختلافات کو یک گونہ شک کے ساتھ قبول کرنے والا بادشاہ تھا' اس لئے اس نے اپنے اس احمقانہ مسلک کو عام لوگوں پر جبراً نافذ کرنے سے احتراز کیا۔

علماء اس زمانے میں تاریخی طور پر پھل پھول رہے تھے وہ سیاسی اقتدار اور شہری معاشرے کے درمیان اس طرح ثالثی کا رجعتی کردار ادا کر رہے تھے' جیسے عیسائیوں میں پادری۔ اسلام کی اولین دو صدیوں کے دوران میں علمائے دین کی ایک بڑی تعداد نے اقتدار کے ساتھ اپنی کسی بھی شناخت کو سختی کے ساتھ رد کیا' یہاں تک کہ منصف کی خدمت انجام دینے سے بھی انکار کیا۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ (وفات 767ء) کو جو سنی اسلامی شریعت کے چار میں سے ایک مکتب کے بانی تھے' بغداد میں جج کا عہدہ قبول کرنے سے انکار پر کوڑے لگائے گئے۔ وقف کا ادارہ جس کے تحت نجی اور ریاستی ملکیت' مساجد اور اسکولوں کی گزر اوقات کے لئے مخصوص کر دی جاتی تھی' لامحالہ علماء کی ماتحتی میں چلتا تھا۔ مذہبی قوانین کی تفسیر اور تعلیم کے باب میں ان کا کردار ایسا تھا جس سے انہیں معاشرے میں ایک ممتاز اور نفع بخش حیثیت حاصل تھی جو فوج اور حکام کے بعد انہی کو میسر تھی۔ چنانچہ طبقاتی طور پر ان کا میلان حاکم وقت کی اطاعت اور اس کے استحکام کی جانب نظر آتا تھا' الماوردی' البغدادی اور الباقلانی' جنہیں دینی علوم کے باب میں آج بھی مقتدر سمجھا جاتا ہے' اس رائے پر قائم تھے کہ ایک غیر منصف اور غیر مستحق حکمران کو معاشرے سے اطاعت قبول نہیں کرنی چاہیے اور یہ کہ اس صورت میں اگر معاشرہ اپنی وفاداری کسی اور دعویدار کی طرف منتقل کر دے تو ایسا کرنے میں وہ حق بجانب ہوگا۔ تاہم انہوں نے بغاوت اور خانہ جنگی کو ناپسند کیا۔

MashalBooks.org

عظیم فلسفی اور فقیہ الغزالی نے جو اسلام میں تھامس ایکواس (Thomas Aquinas) کے برابر حیثیت رکھتے ہیں اوران کے جانشین ابن جامع نے نظریہ ضرورت وضع کیا' جس میں یہ مشورہ شامل تھا

کہ عام لوگ اپنے رویے میں رواداری سے کام لیں' کیونکہ نزاجیت اور بلوے فساد کے مقابلے میں ایک برے حکمران کو بھی ترجیح دینا ہوگا' چنانچہ پروفیسر انور سید نے اس سے یہ درست نتیجہ نکالا کہ علمائے دین نے حکومت اور عالموں کے درمیان امداد باہمی کے ایک سمجھوتے کے عوض سیاست کو سیکولر بنانے کے عمل کی توثیق کردی۔

زمانہ حاضر کی بیشتر مسلمان حکومتوں نے علماء کے تاریخی کردار کو تسلیم کرتے ہوئے اور ان کی موجودہ بے اطمینانی کو محسوس کرتے ہوئے ایسے کئی منصوبے آزمائے ہیں جو علماء کو معاشرے میں یک گونہ تحفظ اور مرتبہ دلا سکیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ موجودہ زمانے کے بیشتر مسلمان رہنماؤں کو مثال کے طور پر حبیب بورقیبہ (پیدائش 1903ء) کو علماء کی جانب سے کم سے کم مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ بات محض اس لئے نہیں تھی کہ تیونس کے نجات دہندہ کی حیثیت سے اسے عوام میں زبردست مقبولیت حاصل تھی؛ بلکہ (جدید ترکی کے بانی اور معمار) کمال اتاترک یا (ایران میں پہلوی خاندان کے بانی محمد رضا خاں (1944ء۔ 1877ء) کے برعکس بورقیبہ نے مذہب کو اور روایتی مذہبی اداروں کو زبردستی دبانے کی کوشش نہیں کی' بلکہ جدید اصلاحات کو نافذ کرتے ہوئے اس نے دینی رہنماؤں کو ایک حیثیت دی' ایسی حیثیت لوگوں کو نظر بھی آئی۔

علمائے دین کی سیاسی انفعالیت کو مسلمانوں کے تمام دانش ور طبقوں نے اور اسلامی برادری کی اکثریت نے قبول نہیں کیا۔ بلکہ درحقیقت مسلمانوں کے کلچر کی اخلاقیات اور ارباب اقتدار کے درمیان کشیدگی کی ایک مستقل کیفیت چلی آ رہی ہے۔ کسی ایسے نامور مسلمان بزرگ کی مثال بمشکل ملے گی' جن کا ریاستی اقتدار سے تصادم نہ ہوا ہو۔ اپنے زمانے کے حکمرانوں کے ساتھ ان بزرگوں کے تصادم کو ممکن ہے عام لوگوں نے مبالغے کے ساتھ قبول کیا ہو' جیسے ایران کے درویش مولانا جلال الدین رومی (1273۔ 1207ء) جو مغرب میں ''رقص درویش'' کی حیثیت سے بخوبی جانے پہچانے جاتے ہیں' اور ہندوستان میں خواجہ معین الدین چشتی (1236۔ 1142ء) اور مراکش کے درویش سیدی لاسین لیوی (1691۔ 1631) لیکن اس معاملے میں سیاسی کلچر کی نشاندہی عامتہ الناس کے عقائد سے ہوتی ہے۔ یہ بات بھی اس قدر اہم ہے کہ ہر ایک تصادم محض اتفاقیہ اور ایک عظیم داستان میں رنگ آمیزی کے لئے نہیں تھا' کسی درویش کے کردار کی تشکیل میں ہر واقعہ کی اہمیت ایک سنگ میل کی طرح تھی' تاکہ اس طرح عام مسلمانوں کے مقابلے میں ایک غیر معمولی مسلمان کا فرق نمایاں ہو جائے۔ درویشی کے اس تصور میں ایک

اعتراف بھی موجود ہے یعنی ایک طرف تو وہ دشواری جو تقویٰ کو طاقت کے ساتھ جوڑنے میں اور اس کی قبولیت میں درپیش ہوتی ہے اور دوسری طرف ایک مسلمان کی یہ ذمہ داری کہ سیاسی اقتدار کی زیادتیوں کے خلاف سینہ سپر ہو جائے۔

اسلام کا سیاسی کلچر بڑی حد تک عملی سرگرمی اور شوریدگی کا کلچر ہے۔ دانشوروں نے پاکستان سے ماریطانیا تک کے علاقے کو "اہانت آمیز انکار" کی سرزمین قرار دیا ہے۔ تاریخی طور پر جس طرح مغربی یورپ میں جنگیں ہوا کرتی تھیں' یہاں بغاوتیں معمول بن گئی تھیں اور یہ بغاوتیں ریاستی اقتدار کے خلاف ہوتی تھیں۔ ابھی حال کے زمانے تک چند ایک کے سوا تمام مسلمان ریاستیں بلاد العیا اور بلاد المخزن کے درمیان بٹی ہوئی تھیں۔ شمالی افریقہ کے (مغربی) عرب' جنہیں مغربین کہا جاتا تھا' بلاد الصبا یعنی بغاوت کی سرزمین سے وابستہ تھے اور بلاد المخزن کے معنی تھے خزانے کا ملک۔ اس اصول میں کچھ استثنائی صورتیں بھی ہیں' لیکن بالعموم حزب اختلاف کی طرف سے جو بھی بغاوتیں ہوئیں خواہ وہ عوامی ہوں یا خاندانی تحریک کے نتیجے میں ہوں' ان کی قیادت دنیاوی شخصیتوں نے ہی کی۔ مذہبی تحقیقات اور مذہبی گروہ جب بھی اختلافی سیاست میں شریک ہوئے' ان کے ساتھ عام طور پر تصوف کے ادارے اور افراد شامل ہوئے یعنی دین دار اور عوام میں مقبول شخصیات' نہ کہ متعصب اور شریعت کی روایت سے وابستہ علماء۔ بہر حال ریاستی اقتدار کی طرح اسلام نے بغاوتوں کو جواز فراہم کرنے میں بھی یک گونہ کردار ادا کیا ہے۔ اگر ریاستی اقتدار سے وابستہ علماء نے سرکشی اور حکم عدولی کے خلاف مذہبی احکام صادر کئے تو باغیوں نے بھی قرآن اور سنت رسول ﷺ کا حوالہ دیا ہے اور مسلمانوں کو ظلم و تشدد کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے اور جہاد کرنے کے لئے پکارا ہے۔

یہ جو مسلم معاشروں میں بغاوت کا ایک مستقل میلان پایا جاتا ہے' اس کا سبب جزوی طور پر یہ حقیقت بھی ہے کہ اسلام نے جس جگہ بھی غلبہ حاصل کیا' وہاں ایک اختلافی نقطہ نظر' روایت سے انحراف کا رویہ پہلے سے موجود تھا۔ بہت سے علاقوں میں مثلاً شمالی افریقہ اور وسطی ایشیا میں اسلام کا پھیلاؤ سماجی انقلاب کے ساتھ وابستہ تھا۔ دوسری جگہوں پر مثلاً برصغیر ہند میں اسلام کے فراہم کردہ رفاہی تصورات نے اور سماجی انصاف پر اصرار کے عقیدے نے (اگرچہ عملاً دونوں کی بڑے پیمانے پر خلاف ورزی کی گئی) نچلے اور مفلوک الحال لوگوں کو ظلم و تشدد کی سنگینی سے بچاؤ کا موقع فراہم کیا۔ اپنی بہترین صورت میں اسلام ستم زدہ عوام کا مذہب ہے۔ اسی لئے آج بھی ساری دنیا میں نادار اور مظلوم عوام کے لئے اسلام میں زبردست کشش پائی جاتی ہے۔ افریقہ میں اسلام نہایت تیزی سے پھیل رہا ہے۔ اس کی سیاہ فام آبادی میں اور اس ملک کی جیلوں میں بھی اسلام کا اثر نمایاں طور پر موجود ہے۔ آج کے آزاد ہندوستان میں بھی ہریجنوں کے اندر نو مسلم کثیر تعداد میں نظر آ رہے ہیں۔ (ہریجن کے لغوی معنی ہے' خدا کا بیٹا' اچھوتوں کے لئے گاندھی نے یہی لفظ استعمال کیا۔) اسلام کی مذہبی اور ثقافتی توانائی اپنے فروغ میں اس کے سیاسی امکانات سے بہت آگے

MashalBooks.org

نکلتی جا رہی ہے۔

اس طرح اسلامی برادری نے تاریخی طور پر دو جداگانہ سیاسی اقتدار کے تحت زندگی گزاردی ہے۔ اس میں مختلف نوعیت کے دنیاوی مقتدر ادارے' قبائلی سرداری نظام سے جدید جمہوریتوں تک شامل ہیں۔ یہ سیکولر سیاسی ادارے نسلی' لسانی اور اکثر مذہبی طور پر بھی مختلف نوعیت کے ہیں۔ ان میں مستقل تبدیلیاں بھی رونما ہوتی آئی ہیں' کسی خاندانی اقتدار نے اسے چیلنج کیا' کبھی مقبول عام بغاوتیں ہوئیں اور کبھی مذہب پر مبنی اصلاحی تحریکیں ان تبدیلیوں کا سبب بن گئیں۔ اپنی ساخت میں تنوع کے باوجود دنیائے اسلام کے مبصر مسلم اقوام کی ثقافتی سماجی اور سیاسی زندگی کے درمیان یگانگت کو دیکھ کر خاصے متاثر ہوتے ہیں۔ علاقائی اور لسانی تقسیم کے ہوتے ہوئے بھی ان میں ایک مضبوط اسلامی قربت اور سالمیت پائی جاتی ہے۔ سالمیت اور استحکام کا یہ احساس محض مذہبی عقیدے اور عمل پر مبنی نہیں بلکہ ان کے درمیان تاریخ کا ایک مشترک شعور اور اقتدار کا مشترک ادراک بھی ہے۔ اس اعتبار سے اسلامی تہذیب ماضی میں اور کسی قدر حال میں بھی اپنی ہمہ معنی ساخت کے اندر ایک سیاسی تہذیب ہے۔ وہ قدریں اور رشتے جو تاریخی طور پر مختلف اسلامی برادری کے اتحاد کی شناخت بنتے ہیں' وہ اپنی اصل میں سیاسی ہیں۔ اس موقع پر صرف ان چند عناصر کا بیان کر دینا کافی ہوگا' جنہوں نے صدیوں کے عمل کے دوران میں اختلاف میں اتحاد کے نمونے بنائے۔ جنہیں دانشوروں نے اسلامی تہذیبوں کے موزیک (شطرنجی) کا نام دیا ہے۔

صدیوں تک عام مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں تخصیص پسندوں اور عمومیت پسندوں کے درمیان کشیدگی کی ایک کیفیت موجود رہی ہے' جس کا ردعمل معاشرے اور افراد پر بھی تخلیقی انداز میں ہوا ہے۔ ایک مسلمان دو سطحوں پر اپنی شناخت رکھتا تھا' ایک تو بالکل قریبی نوعیت کی اور سماجی اور خاص انداز سے عمومی شناخت اور دوسری شناخت تاریخی' نظریاتی' تہذیبی اور آفاقی۔ تقریباً سبھی مسلمان برادریوں میں بٹے ہوئے معاشرے میں رہتے آئے ہیں اور تضاد یہ ہے کہ وہ الگ بھی نہیں رہ سکتے ہیں۔ اس عجیب وغریب صورت حال کا ایک سیاسی رخ بھی ہے۔ مقامی قوت حاکمہ یعنی اگر اس کی حیثیت کسی بڑے خاندان کی ہے' قبیلہ ہے' شہر ہے' مخصوص پیشہ ورانہ تنظیم ہے' نسلی یا لسانی گروہ سے ہے تو اصولی طور پر اس قوت حاکمہ کے مفادات اور مطالبات کا مقابلہ مسلم امہ کی عالمگیر امنگوں کے ساتھ ہوگا۔ یعنی مقابلہ ایک وسیع اسلامی اقتدار کے ساتھ عوام کی اس عالمی برادری کے ساتھ جس نے قرآنی تعلیمات کو اپنے سینے سے لگایا ہے اور جو اسلام پر کاربند ہے۔ مسلمانوں کی زندگی میں استحکام اور بہتری کا انحصار اس امر پر ہے کہ مذکورہ دونوں شناختوں کے درمیان کتنی یک جائی ہے۔ اسلامی تہذیب میں اس طرح کی ہم آہنگی کا حصول سیاست کو ہمیشہ مطلوب رہا ہے۔ اسلامی دنیا میں اس کا حصول شہری معاشرے کی عظیم ترین کامیابی تھی۔ جس مسلسل عمل کے تحت یہ کامیابی حاصل ہوئی' ان میں یہ تدبیریں شامل تھیں۔ اقتدار کی کسی حد تک عدم مرکزیت' اختلاف کو برداشت

MashalBooks.org

کرنے کی اہلیت اور مذہبی و ثقافتی امور میں مختلف عناصر کی آزادانہ شرکت۔ اس طرح جہاں امت اپنی وحدت میں برقرار اور مثالی طور پر متحد رہی وہیں اس کا تنوع یقینی اور حقیقت پر مبنی تھا۔ بلکہ اس کا احترام کیا گیا اور اس کو بہت سراہا گیا' کیونکہ واقعی یہ خدا کی قدرت اور اس کی تخلیق کی علامت تھا۔ علاوہ ازیں خود پیغمبر ﷺ نے فرمایا تھا کہ امت کے اندر اختلافات عین رحمت ہیں۔

اسلامی دنیا میں ایک مشترکہ شناخت اور ثقافت کے فروغ میں خواتین کی مجموعی ساخت' شہریوں کی سرگرمیوں اور اداروں نے بڑا کردار ادا کیا ہے۔ قانون کا ایسا نظام جس میں سب شریک ہوں اور تعلیم' جمالیات اور مذہبی تنظیموں کے درمیان اشتراک (خاص طور پر مذہبی اخوت یا صوفیانہ مسلک) نے ایک ایسی روحانی یگانگت کے تسلسل کو جنم دیا ہے جس نے اسلامی ریاستوں کے درمیان سیاسی' نسلی اور لسانی سرحدوں کو توڑ ڈالا۔ مثال کے طور پر وہ امت جو منقسم اور مختلف حصوں میں بٹی ہوئی تھی' مشترکہ قوانین (شریعت) کی پابندی کے ذریعے ان میں کس قدر نظم اور اتحاد کو یقینی بنایا اور شریعت کے قوانین کی بنیاد قرآن اور سنت (رسول ﷺ کے طریقوں کی پابندی) اور اجماع پر ہے۔ (یعنی جمعیت کا معاملات پر اتفاق رائے) دلچسپ بات یہ ہے کہ شریعت نے حکومت کے معمولات میں رہنمائی فراہم کرنے سے زیادہ سماجی روابط میں نظم پیدا کیا۔ جیسے جائیداد اور تجارتی لین دین' شادی بیاہ اور عام لوگوں کی اخلاقیات۔

مسلمانوں میں کئی صدیوں تک نہ صرف یہ کہ پیدائش اور تدفین کی ایک ہی جیسی رسمیں رائج رہیں بلکہ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جرائم پر اور غلطیوں پر ان کے لئے سزا کا دستور بھی ویسا ہی رہا یعنی معاہدے پر عمل کرنے سے معذوری کی سزا' کسی شکایت کے ازالے کی صورت یا جائیداد کے تنازعہ کا تصفیہ' شادی اور طلاق کے معاملات اور اسی طرح کاروباری لین دین کی پابندی' اگرچہ ان کے قوانین اور طریقہ کار میں یگانگت کا پایا جانا ضروری نہ تھا۔ اسی طرح دنیا بھر کے مسلمانوں کا تعلیمی نظام مشترک تھا' اس کی روایت عدلیہ' قانون' فلسفہ' ریاضی' اخلاقیات اور جمالیات کے باب میں مشترک تھی۔ چنانچہ مصنف اور علماء کے لئے یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی کہ وہ اپنی زندگی میں ایک سے زائد ملکوں میں خدمات انجام دیں۔ مصور اور معمار بہت سی بادشاہتوں میں زندگی گزارتے اور اپنے کام کرتے۔ اشرافیہ سیاسی سرحدوں سے ماورا باہم شادی بیاہ کے رشتے استوار کرتی' خانہ بدوش قبائل ایک حکمران کی قلم رو سے نکل کر دوسرے حکمران کے علاقے میں چلے جاتے۔ اسلامی حکمرانی میں پاسپورٹ کا تصور ہی مذموم تھا۔ ان حالات میں مشترک اقدار وجود میں آئیں اور علاقائی حدود سے ماورا ایک ماحول پیدا ہوا جس سے ایک اجتماعی شناخت ابھر کر آئی۔

یہ حالات اٹھارہویں صدی تک برقرار رہے تا آنکہ مغرب کی استعماریت نے مسلم دنیا کو ''دہشت زدہ'' کرنا شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی برطانیہ' فرانس اور ہالینڈ کی نوآبادیات میں اور دائرہ اثر میں ان کی جوق در جوق آمد شروع ہو گئی۔ یورپ کی قومی ریاستوں کی رقابتیں اور اختلافات مسلمان علاقوں

MashalBooks.org

میں ظاہر ہونے لگے۔ اسلامی تہذیب کی طویل اور معرکہ خیز تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ اس کی تعریف ایک دوسرے کے حوالے سے کی جانے لگی۔ ان کی جنگیں اور صلح نامے' ان کی خوشحالی اور بدحالی' اب کچھ بھی تو ان کے اپنے سبب سے نہیں تھی۔ وہ لوگ جن کی کامرانیوں کی ایک تاریخ تھی' اب بے توقیر ہو کر کسی اور کی تاریخ میں کام آنے لگے۔ وہ متنوع رشتے جن کی بدولت اسلامی ثقافت میں تفریق کے اندر اتحاد کا عنصر قائم تھا' وہ سب ٹوٹ گئے۔ اس کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا کئی طریقوں اور کئی اداروں کی صورت میں ظاہر ہوا۔ پھر جب ''آزاد'' قومی ریاستیں' جن میں زبردست مرکزیت تھی پیدا ہوئیں تو رہی سہی کسر پوری ہو گئی۔ ان قومی ریاستوں کے حکمران نوآبادیاتی دور کے بعد ابھرنے والے فوجی اور افسر شاہی امراء تھے' جن کا ہر فرد اپنے پیش رو آقاؤں کی بھونڈی نقل تھا۔ اس طرح مسلم ثقافت کی رنگارنگ شطرنجی تباہ ہو گئی۔ کئی صدیوں تک ایک حیران کن تسلسل' نشوونما اور توسیع کا سلسلہ حوادث اور تباہی کی صورت میں برقرار رہا۔ جس سے اسلامی ثقافت پہچانی جاتی تھی۔ وہ تسلسل ٹوٹ گیا' سماجیات کے عالموں نے اس تبدیلی کو تجدد کا نام دیا ہے۔ دور حاضر کے مسلمانوں کے لئے ایک شکستہ' بے جوڑ اور بے سمت حقیقت کا تجربہ ہے۔ جس کی انہوں نے کبھی خواہش نہیں کی تھی۔ مسلم اقوام کی گزشتہ صد سالہ تاریخ بڑی حد تک اندھیرے میں راستہ تلاش کرنے کی تاریخ ہے۔ تلاش غداریوں اور تقصانات کے درمیان اور اس راستے کی جانب پیش قدمی جس سے رکاوٹ دور ہو اور وہ کسی طور پر اپنی اجتماعی زندگی کے خود مالک بن سکیں اور اپنے ماضی کو مستقبل کے ساتھ جوڑ دیں۔

دور حاضر کی مسلم سیاست میں مذہب کا کیا کردار ہے؟ اس پر بحث کرتے وقت یہ چار نکات نہایت اہم ہیں۔ اول یہ کہ مسلم معاشروں میں جو بحران پایا جاتا ہے' اسلامی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ دوئم' پوری انیسویں اور بیسویں صدیوں کے دوران میں اسلام کا کردار مختلف زمانوں میں اور مختلف مقامات پر جدا جدا رہا ہے۔ سوئم' ماضی کے طریقوں کے ساتھ تسلسل کے شواہد بہت نمایاں ہیں۔ چہارم 1980ء کی دہائی میں بنیاد پرستی اور مسلم تحریکوں میں نئی طرح کی استبدادیت کا رجحان نظر آتا ہے۔ یہ صورت حال مسلم اکثریت کے سیاسی کلچر اور تاریخی روایات کے منافی ہے۔ بنیاد پرست پارٹیوں کے لئے تا حال محدود لیکن بڑھتی ہوئی اپیل' مسلمانوں کی سیاسی زندگی کی کرب ناکی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے' جس میں حالیہ صورت احوال کا کوئی متبادل حل موجود نہیں۔ جب کوئی تہذیب ایک بنیادی بحران سے دوچار ہوتی ہے اور اس کا زوال محسوس ہونے لگتا ہے تو اس صورت میں تین طرح کا ردعمل ظاہر ہوتا ہے۔ اس کو یوں بیان کر سکتے ہیں:

(الف) بازیافت کا عمل' (ب) تعمیر نو کا عمل اور (ج) عملیت پسندی کا رویہ۔

بازیافت کا آرزومند وہ شخص ہے جو ماضی کو اپنی مثالی صورت میں ایک بار پھر پالنا چاہتا ہے' یہ ہے پیش قدمی بنیاد پرستی کی جانب۔ عرب دنیا میں مسلم برادرہڈ (اخوت المسلمین) پاکستان میں جماعت اسلامی'

MashalBooks.org

انڈونیشیا میں شراکت الاسلام اور ایران میں انقلاب کے بعد آنے والی اسلامی حکومت' اس تحریک کی مثالیں ہیں ۔ اسلامی دنیا میں ابھی تک یہ اقلیتی تحریکیں رہی ہیں ۔ بلا استثنا یہ سب تحریکیں' مزدوروں' کسانوں اور دانشوروں کی بڑی اکثریت کو اپنی طرف لانے میں ناکام رہی ہیں ۔ یہ بات ایران پر بھی صادق آتی ہے' جہاں حالیہ بنیاد پرستی کے نظریے کی طرف مراجعت اقتدار حاصل کرنے کے بعد ہوئی ۔

تعمیر نو کا دعوے دار وہ شخص ہے جو معاشرے میں اصلاح کی غرض سے روایت کو جدت کے ساتھ مدغم کرنا چاہتا ہے ۔ جدید مکتبہ فکر کا سارا زور اسی پر ہے' انیسویں صدی کے وسط سے یہی مکتب مسلم دنیا پر دانش اور نظریے دانوں کے اعتبار سے حاوی ہے ۔ جدید اسلام کے نہایت بااثر مفکر جمال الدین افغانی' شبلی نعمانی' سید امیر علی' محمد عبدہ' محمد اقبال' طاہر حداد اسی فکر کے لوگوں میں شامل ہیں اور سیاسی زندگی میں ان کا اثر بعض مسلمان ملکوں میں فوجی حکومتوں کے آنے تک بہت زیادہ رہا ہے ۔ یہ بات ایران کے بارے میں بھی درست تھی' جہاں شاہ کے زوال تک علما کے کسی سرکردہ گروہ نے ممتاز مفکر آیت اللہ خمینی کے خیالات کو علانیہ چیلنج نہیں کیا تھا ۔ خمینی نے (05 ۔ 1904 ء کی) جمہوری اور آئینی تحریک کی حمایت میں اپنے افکار پیش کیے تھے' جن کی تائید شیعہ فرقے کے سرکردہ ارباب شریعت نے کی تھی ۔ ایران کے دینی قائدین کی ایک کے بعد دوسری نسل نے پورے پچاس سال تک اس موقف کی تائید و توثیق کی ۔ 78 ۔ 1977 ء میں جب شاہ کے خلاف بغاوت شروع ہوئی تو ایران کے تمام سرکردہ سیاسی علما نے اور ان میں آیت اللہ خمینی بھی شامل تھے' ایسی سیاست کی تائید کی جس میں ہر خیال کے لوگوں کی شراکت ہو اور پارلیمانی حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا ۔ اس دعوے کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ خمینی نے ایک سوشل ڈیموکریٹک گورنمنٹ کے وزیر اعظم کی حیثیت سے پہلا تقرر مہدی بازرگان کا کیا ۔ اس کے سوا یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ایران کے انقلاب کا رخ اسلام کی طرف موڑنے کا عمل غیر پیشہ ور' مسلمان دانشوروں نے کیا' مثلاً ڈاکٹر مہدی بازرگان' جلال آل احمد اور ابوالحسن بنی صدر ۔ اسلامی مثالیت پرستی کو فروغ دینے والے سب سے اہم شخص علی شریعتی تھے' ایک ترقی پسند' غیر پیشہ ور اور آیت اللہ محمود طالیغانی جو ایک روشن خیال مذہبی رہنما تھے' حالانکہ آیت اللہ خمینی 1963 ء سے حزب اختلاف کی ایک اہم شخصیت کے طور پر معروف تھے' لیکن اس مرکزی حیثیت سے بہت دور تھے جو انہیں 1978 ء میں حاصل ہوئی ۔ جنوری 1978 ء میں جب انقلابی تحریک میں شدت پیدا ہوئی تو شاہ کی حکومت نے خمینی کو یہ امتیاز بخشا کہ سب سے الگ انہی پر ذاتی حملے کیے' جن کی بہت تشہیر کی گئی ۔ یہیں سے وہ شاہ کی ناپسندیدہ' لیکن مرکزی شخصیت کے مقابلے میں' ان کی حریف مرکزی شخصیت بن کر ۔ اس کرشمہ ساز طاقت کے آنافاناً حصول کا راز کیا تھا؟ اس کا جواب ایران کی غیر مربوط ترقی کے باعث اس ملک کے پیچیدہ کردار میں ملے گا جس کی وجہ سے تاریخ کے اس معروضی اور نہایت ترقی یافتہ انقلاب کو جو ایسے ہی بڑے انقلاب میں سے ایک تھا' ہزار سالہ توسیع مل گئی ۔

MashalBooks.org

عملیت پسند کا اپنا ایک رویہ ہے، وہ مذہبی ضرورتوں کو اس طرح دیکھتا ہے گویا ان کا ریاستوں سے اور حکومتوں سے براہ راست کوئی تعلق نہیں اور وہ ریاست کے معاملات کو مروجہ زندگی کے سیاسی اور اقتصادی مطالبات کے تحت طے کرتا ہے۔ ساتھ ہی دینی زندگی کے معاملات کو شہریوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے کہ وہ نجی طور پر انہیں طے کریں۔ دانشوروں کے اس مکتب نے جو تعبیر نو کا قائل ہے، مذکورہ طریقے کی مخالفت نہیں کی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا۔ یہ تاریخی طور پر مسلمانوں کے تجربے کے متوازی ہے اور اس بنا پر عوام نے اور علما کی اکثریت نے بھی اسے تسلیم کر لیا ہے۔ چنانچہ جب بھی کھلے اور عام انتخابات میں

عوامی رویے کا امتحان لیا گیا تو عملیت پسند سیاسی پارٹیوں کو اور سیکولر پروگراموں کو ان کے بنیاد پرست مخالفین کے مقابلے میں بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ حقیقی سیاست کے دائرے میں اس تاریخی عمل کی بازگشت جس پر پہلے بحث کی جا چکی ہے، برابر سنائی دیتی رہی ہے۔ ذیل میں اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔ یہ ایک متضاد تاریخی طرز عمل ہے، جس میں ایک طرف تو دنیاوی معمول کے تحت طاقت کے استعمال کو ترجیح دی جاتی ہے اور دوسری طرف دینی علامتوں اور نعروں کے لئے ترغیب۔ ایک ایسے وقت میں جب جمعیت کو تشویش اور اندیشے لاحق ہوں اور معاشرے پر دباؤ ہو، ان رویوں کی پیروی جدید

زمانے میں بھی کی جاتی ہے۔ اس طرح پوری بیسویں صدی کے اندر مسلم دنیا کے سیاسی ہیرو خالص مسلم اقوام کے بانی اور نجات دہندہ سیکولر اور اپنے طریقوں میں مغربی پائے گئے ہیں۔ یہاں چند نام لوں گا جو لوگوں کے لئے بہت مانوس ہوں گے، جدید ترکی کے بانی کمال اتاترک (1881ء ۔ 1938) پاکستان کے بانی محمد علی جناح (1876ء ۔ 1948) احمد سوئیکارنو (1901ء ۔ 1970) جو انڈونیشیا کے پہلے صدر تھے جمال عبدالناصر (1918ء ۔ 1970) جو جمہوریہ مصر کے پہلے صدر تھے، تیونس کے حبیب بورقیبہ (1903ء) اور الجزائر کے انقلاب کے سات تاریخی سربراہ، یہ سب بلاشبہ اس صدی کے انتہائی مقبول اور تاریخی حیثیت کے حامل مسلمان قائدین تھے۔ انہوں نے جن تحریکوں اور سیاسی تنظیموں کی قیادت کی، وہ سیکولر تھیں اور ان پر جدید بلکہ بڑی حد تک مغرب کے افکار کا غلبہ تھا۔ آج عرب دنیا کی مقبول ترین عوامی تحریک فلسطین کی آزادی خواہ تنظیم "سیکولر اور جمہوری" سیاست کو اپنے پروگراموں کی بنیاد قرار دینے کی دعویدار ہے۔ اس کے تین ممتاز ترین رہنماؤں میں سے دو رہنما عیسائی ہیں۔

اس کے مقابلے میں مشرق قریب میں مذہبی فرقہ پرستی کا زبردست مظاہرہ دیکھنے میں آ رہا ہے، اس کی پشت پر دو علیحدگی پسند نظریے اور تحریکیں ہیں، یہ ہیں فلانجی اور صیہونی ان میں ایک قدیم مارونی عیسائی ہونے کا دعویدار ہے، دوسرا یہودی ہے، سیکولر، جمہوری اور عالمگیر انسانیت سے ان دونوں کو عناد ہے اور یہی بنیاد ہے اسرائیل اور فلانجیوں کے باہمی اتحاد کی۔ یعنی یہودی ریاست اور دوسری عالمی جنگ کے بعد ابھرنے والی پہلی فسطائی تحریک کے درمیان اتحاد جس نے کامیابی سے اقتدار حاصل کر لیا۔ غالباً اس صورت حال سے یہ

حقیقت سمجھ میں آتی ہے کہ اسرائیلی حکام مقبوضہ علاقوں میں عیسائی آبادی پر خاص طور سے کیوں سختی کرتے ہیں۔ عیسائیوں اور فلسطینی مسلمانوں کے درمیان اتحاد کو توڑنے کے لئے اسرائیل کی حکومت مقبوضہ علاقوں میں بنیاد پرست مسلمان گروہوں کو بڑھاوا دے رہی ہے اور انہیں منظم ہونے کے لئے خاصی چھوٹ دے رکھی ہے۔ یہ آزادی فلسطین کو سیکولر اور عام قومی تحریکوں کو حاصل نہیں۔

ایک اور تاریخی رویہ جسے ہمارے زمانے میں دہرایا جا رہا ہے' دو ممالک کے اندر سرکاری مذہب کے مقابلے میں مزاحمت کا رویہ ہے۔ ان ممالک میں ریاست کی جانب سے شہریوں پر اسلام کا سرکاری منو تف تھوپا جا رہا ہے۔ ایران میں آیت اللہ خمینی کی اسلامی حکمرانی کی مخالفت کے نتیجے میں ہزاروں افراد کو سزائیں دی گئیں اور جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ اہم بات یہ ہے کہ آج ایران کے اندر مزاحمت کرنے والوں میں اول وہی لوگ شامل ہیں' جو شاہ کے مخالفین کے حامی اور سابقہ سیاسی کارکن ہیں۔ اس میں نوجوان مجاہدین کی تحریک بھی شریک ہے' جس پر آزاد خیال عالم آیت اللہ محمود طالیغانی اور ڈاکٹر علی شریعتی کے افکار کا اثر ہے۔ اس مزاحمت میں (انقلاب کے بعد ایران کے پہلے صدر) ابوالحسن بنی صدر کے مقلد اور وہ قوم پرست شامل ہیں جنہوں نے اب سے پہلے وزیراعظم محمد مصدق کی آئینی حکومت کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ اس صف میں آیت اللہ خمینی کے سابق معاون بھی شامل ہیں جو ان سے مایوس ہو کر الگ ہو گئے۔ اگر انہیں انتخاب کی آزادی دی جاتی تو ایرانی عوام کی ایک خاصی بڑی تعداد غالباً بنیاد پرستی کے عذاب سے نجات پا لیتی اور اس جمہوری اور ہمہ گیر حکمرانی کی طرف داری کرتی' جس کا ایرانی انقلاب میں وعدہ کیا گیا تھا اور جس کی یقین دہانی اسلامی بازو کے رہنماؤں نے بھی کی تھی۔ پاکستان میں یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ جنرل ضیاء الحق اگر اپنا آزادانہ انتخابات کا وعدہ پورا کرتے تو سیکولر سیاسی پارٹیاں بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کر لیتیں۔ اسی یقین کی بنیاد پر جنرل ضیاء نے فوجی بغاوت کے بعد 90 دنوں کے اندر آزادانہ انتخابات کا جو وعدہ کیا تھا' اس سے مسلسل چھ سال انحراف کرتے رہے۔

مسلم اقوام کا اصل المیہ' مغرب کے ساتھ ان کے تصادم کی نازک ترین نوعیت پر ہے یا نو آبادیاتی دور میں یہ ٹکراؤ تاریخی طور پر بڑا عجیب تھا۔ وہ اس طرح کہ اس وقت زمین اور محنت سرمایہ داری کی اصطلاح میں (جنس) (Commodity) بن رہی تھیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اقتصادی' سماجی اور ریاستی رشتے کمزور پڑ گئے' جو ہزار سال سے بھی زیادہ عرصے تک روایتی مسلمانوں کی بنیاد تھے۔

مغرب میں سرمایہ داری کو جس طرح فروغ ہوا' اس سے مختلف انداز میں مسلم دنیا میں ہوا' یہاں اس کا فروغ' غیر ملکی اقتدار کے تحت ہوا' جس کا فائدہ بڑی حد تک بڑے شہروں کو حاصل ہوا۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں ایک ناہموار اور بے جوڑ تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت اب بھی قدیم طرز کی نادار بستیوں میں جہاں کا افلاس بڑھتا جاتا ہے' زندگی گزار رہی ہے' لیکن اپنی ساخت

میں وہ جدید صنعتی اور شہری دنیا سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ وہ مرد اور عورتیں ہیں' جنہیں مستضعفین کہا گیا ہے' یعنی ضعیف و نا تواں' جن کے دلوں میں الجزائر اور ایران کے انقلابات کے لئے شدید کشش موجود ہے۔ فرانس کے ماہر بشری علوم جرمن ٹلئیین (Germaine Tillion) نے جو الجزائر میں رہتے ہوئے کام کرتا

رہا' بتایا کہ وہاں کے لوگ (دو انتہاؤں کی سرحد پر زندہ ہیں۔ وہ پایاب پانی کے درمیان کھڑے ہیں۔ انہیں رہ رہ کر ماضی یاد آتا ہے۔ اس کے لئے دل میں ہوک اٹھتی ہے' ساتھ ہی وہ مستقبل کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ لیکن ان کے ہاتھ خالی ہیں' معدے بھی خالی ہیں اور وہ اپنی خوش فہمیوں اور گہرے اندیشوں کے درمیان انتظار کی کیفیت میں مبتلا ہیں۔)

آج مسلمانوں کی زندگی کا کربناک المیہ اس بنا پر شدید تر ہوتا جا رہا ہے کہ اسلام کے وہ علاقے جو وسائل سے مالا مال اور جغرافیائی لحاظ سے بے حد اہم ہیں' اب تک مفتوحہ اور نو آبادیاتی حکمران کے تابع ہیں۔ فلسطینیوں کے لئے نو آبادیاتی نظام سے آزادی کا زمانہ 1948ء میں آ گیا' لیکن اس طرح کہ ان کی قدیم آبائی سرزمین کا زیادہ بڑا حصہ ان کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ مغربی کنارے اور غزہ کی صورت میں جو بچے کھچے علاقے رہ گئے ہیں' اب انہیں منظم طور پر ان علاقوں سے بھی بے دخل کیا جا رہا ہے۔ وہ مہاجرین جو 1948ء میں جان بچا کر نکلے تھے' خاص طور پر وہ جو گیلیلی سے آئے تھے' اب لبنان میں انہیں بھی ہراساں کیا جا رہا ہے۔ یہ اسرائیل کی حکمت عملی ہے کہ انہیں منتشر کیا جائے۔ یہ کہیں اکٹھا نہ ہوں۔ یروشلم کا مقدس شہر عرب کی ثقافتی کامرانیوں کی قبلہ گاہ ہے' اسرائیل نے اسے یک طرفہ طور پر قبضے میں لے لیا' جس طرح گولان کی پہاڑیوں پر قبضہ کر لیا۔ جب سے اقوام متحدہ کی انجمن قائم ہوئی ہے' اس کے تین ارکان اپنے علاقوں سے محروم کئے جا چکے ہیں' جن کی اب تک بازیابی نہیں ہوئی۔ یہ تینوں عرب ریاستیں ہیں۔ مصر نے جو علاقے 1967ء میں گنوا دیئے تھے' ان کی بازیابی کا دعویٰ 1982ء میں کیا اور وہ بھی عرب اسلامی عناصر سے خود کو جدا کرتے ہوئے اور دوسروں سے بدعہدی کرتے ہوئے۔ اب مقبوضہ ممالک کی فہرست میں لبنان بھی شامل ہو گیا ہے' اس کے قدیمی شہر ٹائر' سیڈان اور نباتیہ کھنڈر بن گئے ہیں۔ بیروت عرب دنیا کا ثقافتی دارالحکومت ہے۔ اسے دنیا کا وہ پہلا بڑا شہر بننے کا امتیاز حاصل ہے جس کی تباہی ٹیلی ویژن پر ہفتے کے ہفتے دنیا بھر کو دکھائی گئی۔ کوئی عرب' کوئی مسلم حکومت اس پر ٹس سے مس نہیں ہوئی اور جو کسی نے حرکت کی تو اپنے یہاں عوامی حمایت کو دبانے کے لئے کی۔ ان کی نفع بخش تجارت امریکہ کے ساتھ' جو اسرائیل کا واحد کفیل ہے' معمول کی طرح جاری رہی۔ امارت اور کمزوری' مادی وسائل اور اخلاقی دیوالیے پن کے درمیان اتنا المناک تعلق کبھی نہیں تھا۔ مسلمان قوموں کی تاریخ میں سیاسی اقتدار اور شہریوں کے معاشرے کے درمیان اتنی مکمل علیحدگی کبھی دیکھنے میں نہیں آئی' لیکن اس لاتعلقی کے درمیان ایک ٹائم بم موجود ہے۔ جب

MashalBooks.org

عوام کا اخلاقی دھماکہ ہوگا تو بلاشبہ اس کا حوالہ ماضی سے جڑ جائے گا لیکن اس کا مقصد مستقبل کی صورت حال سے جڑا ہوگا۔ نوآبادیات کے خاتمے پر مسلمان معاشروں میں ماضی بہرطور موجود ہوتا ہے۔ وہ ماضی جو نہایت شکستہ ہے' جس پر آزاد منڈیاں حملہ کر رہی ہیں' جس سے اس کی روح اور توانائی چھینی جا چکی ہے' جو اجتماعی زندگی میں تسلسل برقرار رکھنے کے قابل نہیں رہی' لیکن پھر بھی اس سے اس کی طاقت کم نہیں ہوتی۔ زمانہ حاضر کی کربناک صداقتوں سے اور بظاہر قابل عمل متبادل نہ ہونے کی بنا پر اسے طاقت ملتی ہے۔

بیشتر مسلم قوموں کے لئے ماضی کا وہ متبادل جو تجربے میں آ چکا ہے' جہنم ہے۔ اس کا نام ہے' غیر ملکی تسلط' اپنے وسائل سے بے دخلی' اپنی سرزمین سے علیحدگی' جھگیوں اور مہاجر کیمپوں کی زندگی' غیر ملکوں کی طرف ہجرت اور زیادہ سے زیادہ ایک مستقل امید کی کیفیت۔ تخلیق کی قوت سے محروم' ایک مثالی ماضی کی بازیابی پر انحصار اور اس کی شدید خواہش اس جہنم سے فرار کی ایک صورت ہے۔ احتجاج اور برہمی کے ساتھ اسے رد کر دینا اور ایک نئے انقلابی نظام کے لئے جدوجہد کرنا' دوسری متبادل صورت ہے۔ بعض اوقات جیسا کہ ایران میں ہوا' دونوں طرح کے ردعمل باہم مل جاتے ہیں۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ الگ ہو جاتے ہیں' لیکن تاریخی طور پر بھی ایک دوسرے سے جڑے رہتے ہیں۔

یہ "امیدیں" جو ہمارے دور میں مذہبی تحریکوں کی جانب عوامی حمایت اور تائید کی نشاندہی کرتی ہیں' خواہ وہ اسلامی ہوں یا کچھ اور' ان کا تعلق فی الحقیقت "ماضی" سے نہیں۔ ان مذہبی سیاسی تحریکوں کے نعرے اور تصورات یقیناً ماضی سے ماخوذ ہیں' لیکن ان سے جو توقعات پیدا ہوتی ہیں' وہ اپنی اصل میں جیتی جاگتی امیدیں ہیں' جو حالیہ دور کے بحران کے سبب سے پیدا ہوتی ہیں اور اس سے تقویت پاتی ہیں اور موجودہ صورت میں یہ بحران مسلم دنیا کا ہے۔ اسلام کی نظریاتی بیداری کی اکثر تشہیر کی جاتی ہے۔ (سماجی سائنس دانوں اور امریکی ذرائع ابلاغ نے 1920ء کے عشرے میں بھی بدھ مت کی نظریاتی بیداری کا اس طرح ذکر کیا تھا) یہ نظریاتی بیداری ناہموار اور بہت زیادہ جدیدیت کی پیداوار ہے اور حکومتوں کی ناکامی کا نتیجہ ہے' جو قومی سالمیت کے تحفظ میں یا عام لوگوں کی بنیادی حاجتیں پوری کرنے میں ناکام ہیں۔ تیسری دنیا کے "عبوری" معاشروں میں افراد حال کو اخلاقی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں' اس میں ماضی کا اور موروثی اقدار کا حوالہ بھی موجود ہوتا ہے' لیکن مادی طور پر ان کا تعلق مستقبل سے ہوتا ہے' ہماری سماجی اور سیاسی زندگی میں اس مقام پر' ایک دوہری کیفیت بالکل نئے سرے سے جنم لیتی ہے۔ اس سے نپٹنے میں ناکامی ہو یا نپٹنے کی خواہش ہی نہ ہو تو نتیجے میں شدید احساس محرومی پیدا ہوتا ہے' پھر اس کی بھاری قیمت دینی پڑتی ہے اور کسی المیے کا سامنا ہو سکتا ہے۔ ایران پر گریہ کیجئے' پاکستان پر افسوس کیجئے' مصر کے لئے ڈرتے رہیے۔

(اسلامک امپیکٹ' 1988ء)

MashalBooks.org

ماضی اور مستقبل کے درمیان تعلق

پوری انسانی تاریخ میں ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک المناک سا تعلق رہا ہے' وہ لوگ جو ماضی کو شاندار بنا کر پیش کرتے ہیں اور اس کی ازسرِنو تخلیق کرنا چاہتے ہیں' وہ تقریباً ہمیشہ لازمی طور پر اپنی اس کوشش میں ناکام ہوتے ہیں' وہ لوگ جو ماضی کو اس کے پورے تناظر میں ناقدانہ انداز سے دیکھتے ہیں' ان کا حاصل بامعنی اور پائیدار ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو اپنے مستقبل پر اعتماد ہوتا ہے' وہ ماضی کا جائزہ سنجیدگی کے ساتھ اور ناقدانہ احترام کے تحت لیتے ہیں۔ وہ ماضی کا مطالعہ کرتے ہیں' اس کی اقدار' جمالیات اور طریق کار کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں' جن کی بدولت پرانی تہذیب رفعت سے ہم کنار ہوئی یا اس کے زوال کا سبب بنی۔ وہ اس کی باقیات کی حفاظت کرتے ہیں جو بامعنی ہوتی ہیں اور انہیں اپنی تہذیب میں شامل کر لیتے ہیں۔ ماضی کے متمول ستارہ کو اجتماعی اور انفرادی دونوں سطحوں پر اپنے حافظوں میں محفوظ کر لیتے ہیں۔

اس کے برعکس قومیں اور حکومتیں دونوں' جنہیں مستقبل پر یقین نہیں ہوتا' وہ اپنی تاریخ سے بے اعتنائی کا سا رشتہ رکھتی ہیں' وہ تاریخ جو گزاری جا چکی' اس سے اغماض برتتی ہیں' اس کے اسباق کو تہہ کر کے الگ رکھ دیتی ہیں' ماضی کی ناقدانہ تحقیق سے گریز کرتی ہیں' اس کی باقیات سے چشم پوشی کا رویہ رکھتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی ایک خیالی ماضی کی تخلیق کرتی ہیں' جو بہت چمکیلا اور پرشکوہ ہوتا ہے' اس کو بنیاد بنا کر وہ اپنے زمانے کے تعصبات اور منافرتوں کی عمارت تعمیر کرتی ہیں۔ جنوبی ایشیا میں چلنے والی مذہبی و سیاسی تحریکیں اس صداقت کی گواہی دیں گی۔ بہت سے ہندو اور مسلمان ایک ہی طرح اپنی اپنی تاریخ کو پرشکوہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ وہی چیز جسے وہ اپنی تاریخ تصور کرتے ہیں اور اس ڈھب سے پیش کرتے ہیں کہ ایک دوسرے سے الگ ہوتے جائیں' نہیں بلکہ ایک دوسرے سے متعارف ہوں۔

چنانچہ بہت سے مسلمان سالہا سال تک اورنگ زیب کو ہندوستان میں مسلم حکومت کی طاقت اور اعلیٰ خوبیوں کی علامت سمجھتے رہے۔ دوسری طرف ہندو قوم پرستوں نے مرہٹہ سردار شیواجی کو مسلم حکمرانی کے خلاف ہندوؤں کی مزاحمت کی نشانی قرار دیا اور ویسا ہی بنا کر پیش کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ دونوں اپنی تاریخ کے حوالے سے المناک شخصیتیں تھیں' وہ ہندوستان میں حکومت کے زوال کی نشان دہی کرتے تھے اور ہندوستان میں ایک یورپی سلطنت کے ادوار اور عروج کی علامت تھے۔ اس حوالے سے تازہ ترین واقعہ

MashalBooks.org

بابری مسجد کا ہے جہاں تاریخ فرقہ وارانہ افسانہ طرازی کے ہاتھوں ہلاک ہوگئی۔

سال 1990ء کے موسم گرما میں' میں نے اجودھیا اور متھرا کا سفر کیا۔ میں نے بی جے پی' آر ایس ایس اور بجرنگ دل کی اس تحریک کے بارے میں تحقیق کرنا چاہا تھا' جو انہوں نے بابری مسجد کو ڈھا دینے اور اس کی جگہ ایک مندر تعمیر کرنے کے لئے شروع کی تھی۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں رام جی دو ہزار سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔ ان کی اس مہم میں دو باتوں کو دیکھ کر مجھے خاص طور پر بہت حیرت ہوئی۔ ان تجدید پرست ہندوؤں نے مطبوعات اور تعلیمی مواد کا ایک بڑا طومار کھڑا کر رکھا تھا' جس میں مسلمانوں کی حکمرانی کے حوالے سے ان کی مبینہ زیادتیوں اور ہندوؤں کی مزاحمت کا تذکرہ درج تھا۔ کتابوں کے علاوہ رنگین پوسٹر بھی تھے' جن میں بڑی تفصیل کے ساتھ مفروضہ مظالم کی اور ہندوستان کے اندر ہندو مسلم تصادم کی اور ان میں ہندوؤں کی ہیروازم کی تصویریں دکھائی گئی تھیں۔ نثر میں اور گانوں میں بھی وہی باتیں درجنوں آڈیو کیسٹوں کے ذریعے فراہم کی گئی تھیں۔ اس زہر آلود فرضی تاریخ کے سیلاب کو روکنا غیر ممکن دکھائی دیتا تھا۔ ہندوستان کے چند نہایت ممتاز تاریخ دانوں کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ انہوں نے تجدید پرستوں کے دعوؤں کی ہمیشہ تردید کی' لیکن مختصر بات یہ کہ انہیں اپنی کوششوں میں کامیابی نہیں ہوئی۔ تاہم ان کا اثر ایسا نہ تھا کہ بالکل نظرانداز کر دیا جاتا۔ چنانچہ بی جے پی اور اس کے حواریوں کا جوں جوں زوال آتا گیا' اسی تناسب سے تاریخ دانوں کے خلاف غم و غصے کا اظہار شدید تر ہوتا گیا۔ ''ان تاریخ دانوں کے لئے ہندوستان میں کوئی استھان نہیں ہے''۔ بی جے پی کے ایک سرکردہ لیڈر نے اعلان کیا۔

کچھ ایسی ہی صورت حال پاکستان میں بھی ہے' تاہم اس میں اور ہندوستان میں کچھ فرق پایا جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ہماری تاریخ کے انتہائی سنگین زمانے میں' حکومتوں نے تاریخ میں تحقیق' تلاش و تجسس اور تعلیم کی سختی کے ساتھ حوصلہ شکنی کی اور واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کو سراہا۔ دوسرا نمایاں فرق یہ ہے کہ ہمارے اعلیٰ تعلیم کے ادارے چونکہ روبہ زوال ہوتے گئے اور ہمارے رہنماؤں کو جو خود کو نہایت غیر محفوظ پاتے تھے اور اس حکمران گروہ میں سب سے بڑا امام محمد ضیاء الحق کا ہے' مسخ شدہ تاریخ کی بیساکھیاں درکار تھیں' لہٰذا پاکستان میں تاریخ دانوں کو کام کرنے کا موقع نہیں ملا اور تاریخ سنجیدہ مطالعہ کا مضمون ہی نہیں رہا۔ اسی بنا پر پاکستان میں تاریخ کی ایسی توجیہات زیادہ ملتی ہیں اور اس میں حالیہ دور کے موضوعات مثلاً قیام پاکستان کے مضمون کو اور بانی پاکستان کی شخصیت اور ان کے افکار کو شامل کیا گیا ہے' لیکن اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کی شکلیں جس طرح بگاڑی گئی ہیں' اس کی مثال کسی اور مضمون میں نہیں ملے گی۔

پاکستان میں پورے چار عشروں سے بھی زیادہ صبح سے شام تک اسلام اور اس کی تاریخ کا ورد ہوتا آیا ہے' لیکن اس تمام عرصے میں نہ تو مذہب پر اور نہ تاریخ پر سنجیدگی سے توجہ دی گئی ہے۔ یہ کام نہ تو سرکاری طور پر ہوا اور نہ معاشرتی ذریعے سے ہوا۔ مجھے نہیں معلوم کہ پاکستان میں ان مضامین پر کوئی ایک بھی قابل

MashalBooks.org

ذکر کتاب شائع ہوئی ہے۔ ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں دینیات کا مضمون لازمی طور پر شامل ہے' جو سرے سے پاکیزگی (تقویٰ' روحانیت یا تصوف) سے خالی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس کی تدوین رسوم کی بنیاد پر ہوئی ہے اور سب سے بری بات جو ہو سکتی ہے وہ یہ کہ اس نے اسلام کو ضابطۂ تعزیرات بنا دیا ہے۔

جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے' اسلامی تاریخ کے نام پر یہاں جو کچھ پڑھایا جا رہا ہے' اسے دیکھ کر تو اسلام کا کوئی بھی مورخ کانپ اٹھے گا۔ تین سال پہلے کی بات ہے' پاکستان کی ایک بہت بڑی یونیورسٹی میں اس مضمون کی ایم اے کلاس کے طلبہ سے میں نے کچھ سوال کئے۔ 25 طلبہ میں سے کوئی ایک بھی طالب علم ان مسائل کا ایک پر تو بھی پیش نہ کر سکا' جو اسلامی تاریخ کے پہلے بڑے افتراق یعنی خوارجی تحریک کے موجب ہوئے۔ اسلامی دینیات کی تاریخ میں شوریٰ قوانین کا کیا مقام ہے؟ اس کا اور خود اس مضمون کی بابت کوئی ایک طالب علم بھی اطمینان بخش جواب نہ دے سکا۔ معتزلہ کے بارے میں صرف ایک طالب علم بس اس قدر جواب دے سکا کہ "وہ اچھے لوگ نہیں تھے' ان کی فکر میں دہریت کے عناصر تھے۔" اس وقت مجھے خیال آیا کہ "ہم پاکستان میں تاریخ کو ختم ہوتے دیکھ رہے ہیں" (اس وقت تک فرانسس فیوکویاما نے تاریخ کے خاتمے کے بارے میں اپنا پر اسرار نظریہ پیش نہیں کیا تھا) لیکن سچ یہ ہے کہ میں ہی غلطی پر تھا۔ ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جس پیمانے پر جہل کی ترویج ہو رہی ہے' اس کے بعد تاریخ کا کچھ ایسا ہی انجام ہونا چاہیے۔

اس طرح جو تاریخ تیار ہوگی' اس کا ماضی کے ساتھ محض دور کا اور ایک رسمی سا تعلق ہوگا اور مستقبل کے ساتھ اس کا کوئی مثبت رشتہ قائم نہ ہو سکے گا۔ نوآبادیاتی حکمرانی کے بعد آنے والے بیشتر معاشروں میں ماضی کا مطالعہ ناقدانہ اور تخلیقی انداز سے نہیں کیا جاتا۔ بہ اعتبار مجموعی اسلامی دنیا کو ہی لے لیجئے۔ پچھلی تین صدیوں سے یہ بتدریج روبہ زوال ہے۔ اس کے باوجود مسلمان دانش وروں نے اس زوال کے اسباب معلوم کرنے کے لئے دیانت داری کے ساتھ کوئی کاوش نہیں کی' کسی مسئلہ کی نشاندہی کرنے کے بعد ہی اس کے حل تلاش کئے جاتے ہیں' انیسویں صدی میں سید احمد خاں نے مسلمانوں کے زوال کے اسباب جاننے کی علانیہ کوشش کی اور اصلاح کے بھرپور جذبے کے ساتھ خرابی حالات پر قابو پانے کی سعی کی' اس کے بعد آنے والے عشروں میں مسلمانوں نے جو کچھ بھی حاصل کیا' وہ بڑی حد تک سید کی ہی ناقدانہ دانش کا حاصل تھا۔ اسی طرح کی کوششیں عثمانیہ سلطنت کے دور میں اور قاچار کے دور کے ایران میں آئین پرستوں نے کی تھی۔ مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ اصلاح کی جو کاوشیں ابتدا میں ہوئیں تھیں' بعد کی آنے والی نسلوں نے ان کاموں پر کوئی بامعنی اضافہ نہیں کیا۔ اس ناکامی کی بنیادی وجہ سیاست ہے۔ یہ سیاست ہے جو دانش وری کا ماحول تیار کرتی ہے۔ فرقہ وارانہ تحریکوں کے مقابلے میں وہ یکا و تنہا اور ناجائز طور پر حکومت پر

MashalBooks.org

قابض ہونے والے حکمران کچھ کم ذمہ دار نہیں جو تاریخ کو اور مذہب کو اپنی کارستانیوں کے لیے نظریاتی ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے آئے ہیں۔ کچھ آمادہ ذہن ان کی باتوں کو فوراً قبول کر لیتے ہیں' جب زمانہ حال' ناہمواریوں اور مایوسیوں سے بھرا ہوا نظر آئے اور مستقبل سے کوئی امید نہ ہو تو عام لوگ خاص طور پر نوجوان ماضی سے رجوع کرتے ہیں۔ وہ ماضی سے جس قدر نابلد ہوتے ہیں' اس قدر اسے پرشکوہ بناتے ہیں' اس کے بارے میں قیاس آرائی کرتے ہیں اور اپنا ماضی ایجاد کرتے ہیں۔ اس کے بعد ماضی ہی ان کی امیدوں اور ناکامیوں کا محور بن جاتا ہے۔ اکثر اوقات اس صورت حال کو اور میرا خیال ہے' غلط طور پر بنیاد پرستی کہا گیا ہے۔

("ڈان" یکم اپریل 1994ء)

اسلام: ناکام حکمرانوں کی پناہ گاہ

نیویارک ٹائمز (29 اگست) میں وزیراعظم نواز شریف کی تصویر دیکھی۔ وہ اپنے پرستائش سیاسی رفیقوں کے ہجوم میں کھڑے ہیں۔ ان سب کا تعلق دینی رجحان رکھنے والے دائیں بازو سے ہے۔ ایک باریش مولانا سے ہاتھ ملاتے ہوئے وزیراعظم خود بھی نہایت خوش اور فتح مند نظر آتے ہیں' لیکن امکان یہ ہے کہ نہ یہ ستائش باقی رہے گی اور نہ یہ فتح مندی کا احساس۔ ہمارے زمانے میں اسلام کو سیاست میں گھسیٹنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ داخلی طور پر تفرقہ اور شورش پیدا ہوگی۔ اس کا خطرہ پاکستان کو دوسرے ملکوں کی نسبت زیادہ ہے۔

یہ پرمسرت منظر اس تقریب کا ہے جب آئین میں مجوزہ ترمیم پیش ہوئی۔ اندیشہ یہ ہے کہ مجوزہ ترمیم پاکستان کو حاکمیت کے اس گہرے اندھیرے میں ڈال دے گی' جس کا بمشکل قیاس کیا جا رہا ہے۔ اب مسٹر شریف اور ان کے جی حضوریوں اور واہ واہ کہنے والوں کا جو بھی انجام ہو' لیکن غالباً یہ ملک اور اس کے عوام کی سالمیت اور یک جائی برقرار نہیں رہے گی۔ پوری اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ سیاست میں مذہب کی شمولیت کمزوری اور زوال کی علامت بن گئی۔ اورنگ زیب (1618 ـ 1707ء) اپنے متعدد اسلامی اقدامات اور سکھوں اور ہندو سرداروں کے خلاف فوج کشی کی بنا پر جنوبی ایشیا کے اسلامی حلقوں میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اورنگ زیب کی تمام تر زیادتیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے جن میں بھائیوں کا قتل اور باپ کی نظر بندی بھی شامل تھی' وہ اس کے طویل دور حکومت کی ایک مرکزی حقیقت کو بھی فراموش کر دیتے ہیں' وہ یہ کہ اسے ورثے میں ایک پائیدار حکومت ملی تھی اور جب اسے چھوڑا تو ٹوٹنے کے قریب تھی۔ اس بھیانک ناکامی کی ذمہ داری بڑی حد تک اس کی ملائیت پر ڈالی جاتی ہے۔

اورنگ زیب کے لئے پسندیدگی ایک گہرے مرض کی علامت ہے۔ اس سے دور تک پھیلے ہوئے اس نفسیاتی رویے کا پتہ چلتا ہے کہ مذہب کو سیاست میں داخل کرنے سے ریاست میں پہلے سے زیادہ طاقت آ جائے گی۔ چنانچہ پاکستان میں اسلام کی حیثیت کمزور اور مصیبت زدہ رہنماؤں کے لئے ایک پناہ گاہ کی رہی ہے۔ چونکہ یہ ملک سال کی پانچ دہائیوں تک قیادت کے بحران میں مبتلا چلا آ رہا ہے' لہٰذا ایک "اسلامی ریاست" کے قیام کا دعویٰ اس ناکامی کی بنیادی علامت بن کر سامنے آیا ہے۔

MashalBooks.org

محمد علی جناح پاکستان کے غالباً ایک ہی محفوظ لیڈر تھے ان کے سابق عیب جو عناصر اور اب نئے مقلد اس بارے میں ان کے خیالات کو چاہے کتنا ہی مسخ کریں' جناح ایک جدید عہد کے مسلمان تھے۔ ان کا سیکولر زاویہ نظر تھا' رہن سہن کا اسلوب اپنے زمانے کے مطابق تھا اور اقتدار اور سیاست کے ساتھ اسلام کے تعلق پر جدید نقطہ نظر رکھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ صدیوں پرانے احکام اور انتظامی ڈھانچوں کو رسمی انداز سے لائے اور نافذ کئے بغیر انصاف' مساوات اور رواداری کی اسلامی اقدار کے ذریعے اقتدار اور سیاست کی تشکیل کی جانی چاہیے۔ آئین ساز اسمبلی میں ان کی 11 اگست کی تقریر کو اسی طرح دیکھنا چاہیے۔ پاکستان کی ہیئت کے بارے میں ان کا آخری محضر نامہ۔ اب ہم ایک بار پھر دیکھ رہے ہیں' ریاست کے اس تصور سے بد عہدی ٗلہذا ہمیں شریک جرم ہونے کی بجائے مسٹر نواز شریف کی مجوزہ ترمیم کو پوری طاقت کے ساتھ اور اجتماعی طور پر رد کر دینا چاہیے۔

جناح کے جانشینوں کو اس نئی ریاست میں اپنی جڑیں سیاسی اعتبار سے کمزور نظر آ رہی تھیں' پھر ان کا آپس میں بھی مقابلہ جاری تھا۔ ان کی یہ بھی ذمہ داری تھی کہ آئین کے خطوط متعین کریں' ایک ایسی ریاست کا آئین جو قومیت کی بہت سی خصوصیات سے محروم تھا' متنوع اور بٹے ہوئے لوگوں کی ریاست' قرارداد مقاصد ان کے متضاد جذباتی رویے کی پیداوار تھی۔ سیکولر مقاصد کو آپس میں جوڑنے کے لئے اسلام کو بطور سیمنٹ استعمال کرنے کی کوشش۔ ان کے نزدیک امر بالمعروف ونہی عن المنکر ایک اچھی حکمرانی کا پیغام ہے' ماضی کو دوبارہ واپس لانے کا نسخہ نہیں۔ اس طرح انہوں نے 1935ء کے ایکٹ کے تحت قرارداد کو حکمرانی کے جواز کے طور پر استعمال کیا اور بالآخر 1956ء کا آئین تیار کیا' جس کی ''واحد اسلامی'' شق یہ تھی کہ ریاست کا سربراہ ایک مسلمان ہوگا اور کوئی قانون' قرآن اور سنت کے منافی نہیں بن سکے گا۔ اپنی آئینی قلابازیوں میں انہیں یہ حقیقت نظر نہیں آئی کہ مسلم معاشرے میں ترقی چونکہ ناہموار طور پر ہوئی ہے اور ابھی تو گزشتہ عظمتوں اور کامرانیوں کا جشن منایا جا رہا ہے' جیسا کہ کمزور تہذیبوں کا معمول ہے' لہذا آئندہ قرارداد مقاصد میں اور خود اسلام میں تحریفیں ہوں گی اور اسے غلط طور پر استعمال کیا جائے گا۔ 1953ء کے فسادات شروع میں ہی ایک انتباہ کا درجہ رکھتے تھے لیکن افسوس کہ اسے بھی نظر انداز کر دیا گیا۔ یہ بھی نہ ہوا کہ ''امر بالمعروف'' کے ساتھ ان کا عہد انہیں بہت سے ''منکرات'' میں آلودہ ہونے سے روک دیتا۔ قرارداد مقاصد کا مسودہ لکھنے اور اس کی تائید کرنے والوں نے پاکستان کے پہلے فوجی قبضے کے لئے اسٹیج تیار کر دیا تھا۔ پاکستان کے موقع پرست اسلام فروشوں کی غلط حکمرانی کے پیش نظر ایوب خاں کی فوجی بغاوت ایک خوش آئندہ تبدیلی تھی۔ وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے' انہیں اپنی اہلیت پر یقین تھا کہ وہ بہتر طور پر حکومت کر لیں گے۔ ایوب نے اسلام اور سیاست کے تعلق پر وہی قرینہ اختیار کیا جو آج تک سب سے زیادہ روشن خیالی پر مبنی سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے عائلی قوانین نافذ کئے جو خاصے ترقی پسندانہ ہیں اور جمہوریہ

پاکستان سے ''اسلام'' کا لاحقہ نکال دیا۔ اس طرح رشوت خوری موقع پرستی اور بد انتظامی جیسی برائیوں کو اسلام سے خارج کر کے اس کے وقار میں اضافہ کر دیا۔ یہ برائیاں پاکستان کی حکومت اور سیاست کی خصوصیات بن گئی ہیں۔

ایوب خاں نے اپنی حکومت کے ابتدائی برسوں میں ''اسلام میں دینی افکار کی تشکیل جدید'' کا اتنا خیال کیا کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کو واپس پاکستان آنے کی دعوت دی کہ مطالعہ اسلام کے ادارے کی سربراہی قبول کر لیں۔ ڈاکٹر صاحب اسلام کے متعلق پاکستان کے موقر ترین عالم تھے۔ 1965ء کی جنگ کے بعد ایوب خاں کا ستارہ گردش میں آ گیا' چنانچہ دین اور حکومت کے تعلق پر انہوں نے جو روشن دلانہ نقطہ نظر اختیار کیا تھا' وہ بھی ختم ہو گیا۔ ایوب حکومت کے خاتمے سے پہلے ہی مذہبی جماعتیں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئیں اور انہیں ملک بدر ہونا پڑا۔ جب شورش بڑھتی گئی اور پریشانی کی آخری ساعتیں آ گئیں تو خود ایوب نے مذہب کو ایک سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کی نحیف سی کوششیں کی تھیں۔

زیڈ اے بھٹو کی ایوب دشمن مہم میں اسلام کا نام شاید ہی کبھی آیا ہو' بھٹو کا سارا زور بد عہدی پر تھا' تاشقند میں ہماری بہادر افواج سے قومی تحفظ کے معاملے میں بد عہدی کی گئی' پھر ان کا زور غریبی پر تھا' اس لئے روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ۔ وہ بڑے چرب زبان مقرر تھے' اپنے اقتدار کے عروج کے زمانے میں انہوں نے یہ کہہ کر اپنے نکتہ چینوں کا منہ بند کر دیا تھا کہ ''میں شراب پیتا ہوں' عوام کا خون تو نہیں پیتا۔'' تاہم ان کی حکومت اپنے کردار کی بنا پر ایک مثالی نمونہ پیش کرتی ہے کہ اسلام ایک کمزور اور بدمعاش حکومت کی پناہ گاہ کس طرح بنتا ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے ''اسلام ازم'' کے آگے اس وقت سر جھکا دیا جب احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا۔ یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب انہوں نے بلوچستان کی حکومت کو برطرف کیا' پھر صوبہ سرحد کی حکومت کے مستعفی ہونے پر اسے الگ کیا۔ مخالف رہنماؤں کو گرفتار کرا دیا اور بغاوت کی آگ بھڑکائی۔ اسلام ازم کے آگے آخری بار انہوں نے اس وقت سر خم کر دیا جب 1977ء کے موسم گرما میں برسر اقتدار رہنے کی آخری کوشش کر رہے تھے۔ بھٹو نے اس وقت وعدہ کیا تھا جس طرح نواز شریف آج کل دعویٰ کر رہے ہیں کہ وہ شریعت نافذ کریں گے اور پاکستان کو سعودی عرب کی طرح ایک اسلامی ریاست بنا دیں گے۔

بھٹو کے پروردہ اور ان کے قاتل بھی ضیاء الحق ہی تھے' جنہوں نے اس ملک سے ''مخلصانہ وعدہ'' کیا تھا کہ وہ آئین کے مطالبے کے مطابق 90 دنوں کے اندر انتخابات کرائیں گے۔ اس خود ساختہ ''اسلام'' کے سپاہی نے اس وقت جھوٹ بولا تھا اور بعد میں بھی بار بار وہ اسلام کا نام لیتے ہوئے نہیں جھکتے تھے۔ وہ تنہا ایسے ڈکٹیٹر تھے' جنہیں بائیں بازو کی (اسلامی) پارٹیوں کی حمایت حاصل تھی۔ چنانچہ انہوں نے ایک پروگرام ''اسلامیانے'' کے حوالے سے شروع کیا اور افغانستان میں جہاد کا آغاز کیا۔ انہوں نے جو زہر بویا

تھا اس کے کانٹوں کی فصل ہم آج تک کاٹ رہے ہیں۔

اور اب سوڈان اور افغانستان میں اسلام ازم کی لرزہ خیز مثالیں اور ان کے ساتھ المناک مشابہتیں رکھنے کے باوجود مسٹر نواز شریف اس بدنصیب ملک میں مزید تفرقہ ڈالنے' کشیدگی پھیلانے اور ہو سکے تو اسے تباہ کر دینے کی تجویز پیش کر رہے ہیں۔ ضیاء الحق کے برعکس وہ ایک منتخب وزیراعظم ہیں' کوئی یک وتنہا آمر مطلق نہیں' ان کو نواز شریف کے برعکس حصول اقتدار کے لئے مرنے مارنے کا چیلنج درپیش نہیں۔ اس سے الگ' وہ پارلیمنٹ میں ارکان کی بھاری اکثریت رکھتے ہیں اور ان کے بھائی بڑی عافیت کے ساتھ پنجاب میں حکومت کر رہے ہیں۔ پھر وہ اس قدر بوکھلائے ہوئے کیوں ہیں کہ اپنے مسلک اور ملک دونوں کے لئے خطرہ پیدا کر دیا ہے؟

اس سوال کا جواب غالباً ان کے احساس ناکامی میں پوشیدہ ہے' یہ وہ خوف ہے جو کسی شخص کو اس وقت لاحق ہوتا ہے جب وہ محسوس کرتا ہے کہ معاملات اس کے اختیارات سے باہر نکلتے جا رہے ہیں۔ مسٹر نواز شریف ایک بھاری پارلیمانی اکثریت کے ساتھ منتخب ہوئے تھے' جس کا مفہوم انہوں نے یہ لیا کہ یہ وہ "مینڈیٹ" (سرکاری اختیار) ہے جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے وزارت عظمیٰ کا آغاز ملک سے ایک پرجوش خطاب کے ساتھ کیا' جس میں تمام اچھے اچھے وعدے شامل تھے' لیکن یہ آئینی ترمیم اس میں شامل نہیں تھی۔ انہوں نے ان وعدوں میں سے ایک بھی بلکہ اس کا آدھا عہد بھی پورا نہیں کیا اور نہ اب اس کا امکان ہے' بلکہ جو کچھ وعدے کئے تھے' ہر لحاظ سے اس کے برعکس دیکھنے میں آ رہا ہے اور عام لوگ بڑھتے ہوئے احتجاج سے عذاب میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ اب وزیراعظم چاہتے ہیں کہ یہ عطیہ خداوندی دے کر وہ اس کوتاہی کا ازالہ کر دیں۔ یہی پنج وقتہ نماز کا حکم اور ایک باجبروت امیر المومنین کا منصب۔ وہ واقعی خود کو بہت کمزور محسوس کر رہے ہوں گے۔

("ڈان" 6 ستمبر 1998ء)

دائیں بازو کی مذہبیت اور اس کی جڑیں

وہ مختلف اور اکثر مخالف مذہبی طریق سے ہندوازم یہودیت مسیحیت اور اسلام سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے خیالات اور رویوں میں حیران کن یکسانیت پائی جاتی ہے ہندوستان میں انہوں نے کیساؤں کو جلا دیا اور ایک تاریخی مسجد ڈھادی۔ فلسطین میں وہ اپنے آپ کو "معمار" کہتے ہیں مسجدوں اور کیساؤں کی بےحرمتی کرتے ہیں اور ریاست کی اعانت سے مسلمانوں اور عیسائیوں کو جہاں وہ قدیم زمانے سے رہتے آئے ہیں بے دخل کر دیتے ہیں الجزائر میں انہوں نے وہاں کی نیم فوجی حکومت کے خلاف وحشیانہ جنگ جاری رکھی ہے۔ سربیا میں انہوں نے نسل کشی کی کوشش کی اور عورتوں کی جبری بےحرمتی کے لئے کیمپ لگائے۔ پاکستان میں انہوں نے عیسائیوں احمدیوں اور شیعوں پر حملے کئے اور پھر ایک دوسرے کو آپس میں ہی مارا وہ مقدس جنگ لڑتے ہیں اور بڑے تقدس کے ساتھ مظالم ڈھاتے ہیں لیکن دراصل ان کے نزدیک کوئی چیز مقدس نہیں۔ وہ بازاروں میں گھروں میں عدالتوں میں مسجدوں اور کیساؤں میں خون بہاتے ہیں۔ وہ بزعم خود خدا کے سپاہی ہیں اور انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین سے اور بنی آدم کے معیار انصاف سے خود کو بالا سمجھتے ہیں۔

یہ مبینہ طور پر "بنیاد پرست" کہلاتے ہیں یہ وہ خطاب ہے جو مغرب کے ذرائع ابلاغ نے مسلمانوں کے لئے مخصوص کر رکھا ہے جنہیں لامحالہ "اسلامی بنیاد پرست" کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس قبیل کے دوسرے عناصر کو قدرے معتدل نام دیا جاتا ہے۔ فلسطین میں یہودی جنونی آباد کار (Settlers) اور بعض اوقات "انتہا پسند" کہلاتے ہیں۔ ہندوؤں میں شوریدہ سر عناصر نیشنلسٹ کہے جاتے ہیں۔ اور مسیحیوں کو دائیں بازو والا یا نجات دہندہ کا نام دیا گیا ہے۔ زبان کے استعمال میں جو تعصب برتا گیا ہے اس سے ایک اہم حقیقت چھپ جاتی ہے وہ یہ کہ یہ سارے عناصر ایک مشترک مسئلہ کے الگ الگ عکس ہیں ان کی بنیادیں مشترک ہیں اور اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے پیرائے بھی ایک ہی سے ہیں۔

جن لوگوں کو غلطی سے "بنیاد پرست" کہا جاتا ہے وہ نئے زمانے کے مظاہر ہیں۔ جدیدیت اور تشخص میں جو بحران آیا ہے یہ اسی کا جواب ہیں۔ جدیدیت ایک تاریخی عمل ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ معاشرے ترقی کرتے ہوئے ایک طریقہ پیداوار سے دوسرے طریقہ پیداوار میں داخل ہوتے ہیں۔

MashalBooks.org

ہمارے زمانے میں زراعت اور گلہ بانی پرمبنی طریقہ پیداوار سرمایہ دارانہ وصنعتی طریقہ پیداوار کے مرحلے میں داخل ہورہا ہے۔ جب ایک طریقہ پیداوار کے دائرے سے نکل کر دوسرے دائرے میں داخل ہوتے ہیں تو اس سے معاشرے میں انقلابی تبدیلیاں آتی ہیں۔ اس کالازمی نتیجہ سماجی اور اقتصادی زندگی کی ایک نئی منطق ہے۔ اس سے رہن سہن کے موروثی طریقوں کوخطرہ لاحق ہوتا ہے۔ پھر اس کا یہ تقاضا بھی ہوتا ہے کہ زمین' محنت اور سرمایے کے درمیان جو رشتے ہیں' ان کی از سرنو تشکیل ہو۔ اس بناپر حالات کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اپنے رہنے کے اور کرنے کے نئے طریقے اختیار کئے جائیں اور انسانی اقدار میں زبردست تبدیلیاں کی جائیں۔ جنہیں طبقے' افراد' خاندان اور برادریوں کے درمیان جو رشتے پہلے سے چلے آ رہے ہیں' انہیں بھی بنیادی طور پر بدلا جائے۔ اب باہمی تعلق کی نئی تشکیل ہوتی ہے اور جینے کے لئے جتنی وسعت مہیا ہے ان میں نئی ترتیب برتی جاتی ہے۔ حالات کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ جو جگہ کام کے لئے ہے کس طرح ان میں تبدیلی کی جائے اور کیسے نئی مہارتوں کو یکجا کر کے انہیں تقسیم کیا جائے اور کس طرح انہیں چلایا جائے۔ جب ایک بار تبدیلی کا عمل شروع ہو جائے تو پرانی اقدار اور رہن سہن کے طریقے بعد از وقت اور متروک ہو جاتے ہیں' لیکن زیادہ لازوال تعداد اور رہن سہن کے آداب' نئی آنے والی اقدار سے بھی جلدی معاشرے میں اپنی جڑیں پکڑ لیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں جو سماجی اور تہذیبی سرگرمیاں ظاہر ہوتی ہیں انہیں لوگ اپنے لئے خطرہ بھی سمجھتے ہیں اور اپنا نقصان بھی۔ اتھل پتھل کے اس سارے سلسلے کو انسانیت نے ہزاروں برس تک جھیلا ہے۔ مثال کے طور پر جب انسان پتھر کے زمانے سے لوہے کے زمانے میں داخل ہوا تو یا جب اس نے آگ دریافت کی اور شکار کرنے اور پھل چننے کے عمل سے نکل کر زراعت کی طرف آیا۔ لیکن یہ عمل اتنا شدید اور اتنا انقلابی کبھی نہیں تھا' جتنا سرمایہ داری کے ابھار اور صنعتی طریقہ پیداوار کے زمانے میں ہوا ہے۔ ترقی کا یہ عمل اپنے گہرے اثر کی بناپر جتنا انقلابی ثابت ہوا ہے۔ معاشرے پر اتنا گہرا اثر انسانی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

صنعتی طریق پیداوار نے تقریباً ان تمام اقدار اور اداروں کے لئے خطرہ پیدا کر دیا جن کے سہارے لوگ زرعی طریقہ پیداوار کے دور میں رہتے آئے تھے۔ اس نے دیہات سے شہر کی طرف بڑے پیمانے پر نقل مکانی کی راہ ہموار کی اور لوگوں کو اس طرف آمادہ کیا۔ مزدور کو کھیت سے کارخانے کی طرف پہنچایا۔ پیداواری یونٹ اب خاندان اور برادری نہیں رہے بلکہ افراد قرار پائے۔ محنت کی منڈی میں عورتوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں شمولیت پر مجبور کیا۔ جو توجہ سماجی ضابطوں پر تھی ان میں اب رسوم ورواج کی جگہ قوانین نے لے لی' حکمرانی کے ڈھانچے کو نئے سرے سے بدلا۔ اب سلطنت کی جگہ قوم نے لے لی' منڈیوں میں آسانی پہنچنے کے لئے فاصلے مٹادئے اور اقتصادی زندگی میں گزراوقات سے آگے بڑھ کر بڑے پیمانے پر پیدا کرنے اور صرف کرنے کے طریقے نے رواج پایا اور توجہ اب اس طرف ہوگئی۔

اس بڑے پیمانے پر تشکیل نو کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ زندگی کے پرانے طریقوں کو خطرہ لاحق ہوا۔ اس نے خود کفیل دیہی زندگی کے ہزاروں برس پرانے طریقوں کو تباہ کر دیا۔ برادریوں کے درمیان جو فاصلے تھے انہیں مٹا دیا۔ مختلف نوعیت کے لوگوں کو اور افراد کو مجبور کر دیا کہ شہر کی حدود میں رہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ کریں۔ ایک سربراہ کے تحت گزاری جانے والی خاندانی زندگی کا پرانا چلن اور اس کی اقدار جو صدیوں سے رائج تھیں ان کو توڑ پھوڑ ڈالا اور لاکھوں کروڑوں عوام کو روایت اور جدت کی عبوری دنیا میں بے یقینی کے عالم میں چھوڑ دیا۔ مختصر یہ کہ اس صورت حال میں روایتی اقدار اور طرز زندگی سوالوں میں گھر جاتے ہیں اور بتدریج ناکارہ ہوتے جاتے ہیں۔ تاہم اقتصادی اور سیاسی حقیقتوں کے مقابلے میں کلچر سست رفتاری سے بدلتا ہے۔ وہ تمام معاشرے جو اس عمل سے گزرتے ہیں اس اذیت ناک مرحلے سے بھی دوچار ہوتے ہیں۔ کوئی معاشرہ کتنے پرامن اور جمہوری انداز میں یہ سفر طے کرتا ہے اس کا انحصار اس کے تاریخی حالات پر ہے۔ اس کے دانشور طبقے کے عمل پر ہے اس کے رہنما اور حکومت کے نقطہ نظر پر ہے اور ان کے نظریے کے انتخاب پر ہے۔

سرمایہ دارانہ اور صنعتی انقلاب یورپ سے شروع ہوا۔ اس میں جو اتھل پتھل ہوا اس پر یورپ والوں کے ردعمل سے کئی بامعنی تبدیلیاں آئیں جس کا محققین نے ابھی قرار واقعی طور پر مطالعہ نہیں کیا۔ مغربی اور غیر مغربی تجربات کے تقابل سے معلوم ہوا کہ لوگ جب اتنے منظم انداز کے بحران سے دوچار ہوئے تو انہوں نے اپنے ردعمل کا اظہار چار طریقوں سے کیا۔ ہم اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہ بازیابی کے خواہاں (Restorationist) تھے اصلاح پسند تھے وجودیت پسند تھے اور انقلابی تھے۔ بازیابی کے خواہاں یا "واپسی پسند" پرانے طرز زندگی کی طرف واپس جانا چاہتے ہیں۔ پرانا طریق زندگی، پرانے قوانین اور رواج کو پھر سے نافذ کرنا چاہتے ہیں، وہ خصوصیات جو ختم ہو گئیں ان کی بازیابی چاہتے ہیں۔ نپے تلے معمولات کی پر یقین دنیا کو دوبارہ بحال کرنا چاہتے ہیں اور اس ماضی کو جو ان کے خیال میں سنہری ماضی تھا واپس لانا چاہتے ہیں۔ یعنی ہندوتا اور رام راج ایرز اسرائیل (EretzIsrael) نظام مصطفیٰ ﷺ۔ واپسی پسندی کے ساتھ دوسرے کو لازمی طور پر مسترد کرنا ہوگا۔ یعنی مسلم، عرب، ہندو، عیسائی، احمدی اور ساتھ ہی ان سب چیزوں کو جو دوسرے کے طور طریقوں سے وابستہ ہیں۔ یہ سب عورت کے لباس اور مرد کی داڑھی سے لے کر گانے اور ناچ تک اور جدید زندگی کی ان علامتوں تک ہو سکتی ہیں جو ٹیلی وژن اور ریڈیو کی صورت میں موجود ہیں۔

واپسی پسندی کا نظریہ اور پروگرام نسبتاً معتدل سے لے کر انتہا تک موجود ہے۔ مسٹر اٹل بہاری باجپائی، ہندو واپسی پسندی کی ایک معتدل مثال پیش کرتے ہیں، مسٹر بال ٹھاکرے اس کی انتہا ہیں اور لال کرشن اڈوانی ان دونوں کے بین بین ہیں۔ اس طرح جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد کو ایک معتدل

اسلامسٹ' سمجھا جا سکتا ہے جب کہ طالبان کے رہنما ملا عمر اس کے انتہائی سرے پر نظر آتے ہیں۔ اصلاح پسندوں کا طبعی رجحان جدیدیت کی طرف ہوتا ہے ان کے مرد اور عورتیں بڑی شدت سے یہ چاہتے ہیں کہ ان کی مذہبی روایات میں جو باتیں بہترین اور انتہائی بامعنی ہیں ان کا تحفظ کریں اور ایسا کرتے ہوئے انہیں جدید زندگی کے مطالبوں کے مطابق ڈھالیں۔ ان کے فریق مخالف بھی اتنے ہی سچے ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جدید اشکال اور اقدار کو اپنے موروثی کلچر اور عقائد میں ڈھال لیں۔ ہندوستان کے سب سے پہلے مصلح راجہ رام موہن رائے تھے جو برہمو سماج تحریک کے بانی تھے' پہلے عظیم ہندوستانی مسلمان مصلح سر سید احمد خاں تھے اور آخری محمد اقبال کو سمجھنا چاہئے' جن کی تصنیف اسلام میں مذہبی افکار کی تشکیل جدید (Reconstruction of Religious Thought in Islam) جدید اسلام میں اصلاح پسندی کی ایک بلیغ مثال ہے۔ عرب دنیا میں انصار گروپ جس کے قائد مفتی محمد عبدہ تھے اور مغرب میں شیخ بن بعدث' طاہر الحداد اور عبدالعزیز طالبی نہایت باثر مصلح گزرے ہیں۔ واپسی پسندوں کی طرح اصلاح پسندی کا رجحان بھی ایک ردعمل کے طور پر ابھرا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلم اقتدار میں زوال مغربی طاقتوں کے ساتھ مقابلے اور ان کی نوآبادیاتی حکمت عملی کی بنا پر آیا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں اسلامی دنیا کے اندر یہ خیال حاوی ہوتا گیا لیکن نوآبادیات کے بعد کے دور میں اس میں جمود آ گیا۔

اصلاح پسندی کو ابتدائی ناکامی سلطنت عثمانیہ میں ہوئی جہاں یکے بعد دیگرے ساری کوششیں محض اس لئے ناکام ہوتی گئیں کہ وہ بہت کمزور تھیں۔ ترکوں کی انقلابی پیش رفت کی بنیاد سلطنت عثمانیہ کی اصلاحات کی ناکامی پر رکھی گئی تھی۔ مصطفےٰ کمال اسلامی دنیا میں پہلے انقلابی تھے۔ انہوں نے خلافت ختم کر دی' صریح اور واضح انداز کی سیکولر جمہوریہ قائم کی۔ بہت سے مذہبی اداروں کو دبا دیا' پردے کو غیر قانونی قرار دیا' تعدد ازدواج کی ممانعت کر دی اور مساوات کی بنیاد پر عورتوں کے حقوق اور ان کے حق ملکیت کی ضمانت میں سیکولر قوانین منظور کئے۔ اب تک کسی بھی دوسرے مسلمان ملک نے روایات سے آزادانہ قطع تعلق اور ریاستی طاقت کے ساتھ اسلام کے اشتراک کے خاتمے کی مثال اتاترک کے برابر پیش نہیں کی۔ اس کے باوجود ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کے عشروں میں جب اسلام کا دوبارہ فلسفہ اٹھا تو ترکی اس سے بچ نہ سکا۔

ایران میں علما نے ۱۹۰۶ء کے آئین کو جائز قرار دیا۔ جس کی اساس اور اصول سیکولر تھے۔ شیخ محمد حسین (۱۹۳۶ء۔۱۸۶۰ء) نے علما کی جانب سے ایک آئینی حکومت کی حمایت کی خاطر اساسی خطوط متعین کئے جس کی قیادت مزید آیت اللہ العظمیٰ یزدی (۱۸۶۲ء۔۱۸۷۵ء) نے کی جو اپنے وقت کے مرجع کل تھے اور معاصر شیعہ علما میں نہایت بااختیار شخصیت سمجھے جاتے ہیں لیکن رضا شاہ پہلوی نے جو پہلی بغاوت کی اور دوسری بار امریکی سی آئی اے نے ۱۹۵۳ء میں جو باغیانہ سازش کی اس کے نتیجے میں مسلم دنیا کے اندر جمہوری اصلاح پسندی کا وہ تجربہ جو سب سے زیادہ کامیاب تجربہ ہو سکتا تھا بالآخر ختم ہو گیا۔ جزوی اصلاح

MashalBooks.org

کے زیر اثر بہت سی ریاستوں میں۔ تیونس' الجزائر' مصر' شام' عراق' انڈونیشیا' ملائیشیا اور دیگر کئی ریاستوں میں ان کی قومی حکومتوں نے سیکولر آئین منظور کیے اور اس طرح کیے کہ مذہب اور حکومت کے اشتراک کی روایت سے جو تعلق ختم کیا گیا تھا اس پر آنچ نہیں آئی۔ اب ان متعدد سیکولر حکومتوں کو اسلام پسند تحریکوں کے چیلنج کا سامنا ہے۔

نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد جنوبی ایشیا میں' اور پاکستان اس میں شامل نہیں' سیکولرازم کے متبادل طریقے کو پسند کیا گیا ہے۔ ہندوستان نے جواہر لال نہرو کی سربراہی میں ایک سیکولر آئین منظور کیا' چنانچہ ہندوستان میں قانون سازی کرتے وقت یہ دیکھنا ضروری نہیں ہوتا کہ وہ مذہبی عقائد کے مطابق ہو' تاہم آزادی کے فوراً بعد سومنات کے مندر کی مرمت سے ظاہر ہوا' ہندوستان میں کانگریس پارٹی کی حکومتوں نے اکثریتی آبادی کے احساسات کی بطور خاص پاسداری کی جس پر بائیں بازو کے ہندوستانی عوام نے وسیع پیمانے پر کڑی نکتہ چینی کی۔ حالیہ برسوں میں بہت سے صوبوں کے اندر ہندو قوم پرستوں کے برسراقتدار آنے سے اور خود وفاق پر حالیہ دنوں میں ان کی حکومت کی وجہ سے جمہوریہ ہند کے سیکولر کردار کو سخت صدمہ پہنچا ہے یہ وہ مسئلہ ہے جس پر میں آئندہ گفتگو کروں گا۔ دوسری جانب پاکستان میں مذہب اور سیاست کے درمیان تعلق' خلفشار' عدم استحکام اور سیاست میں اسلام کے غلط استعمال کا موجب بنا ہوا ہے' اس صورت حال نے بھی ۱۹۷۱ء کے خوں ریز اسباب پیدا کیے اور بڑی حد تک مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے باعث بنے۔

نوآبادیاتی دور کے ختم ہونے پر ایک غالب عنصر یہ دیکھنے میں آیا کہ مذہب کو مقصوی انداز سے استعمال کیا جانے لگا یعنی جب ارباب اقتدار کی سیاسی آسانی اس کے استعمال میں نظر آئی تو اسے استعمال کیا اور جب حکومت اور مقتدر اشرافیہ کو تحفظ اور اطمینان محسوس ہوا تو انہوں نے مذہب اور سیاست کے تعلق کی نشاندہی کے معاملے کو نظر انداز کر دیا۔ ۸۰ء اور ۹۰ء کے عشرے میں جب اسلامی شہ زوری ابھار پر آئی اور یہ وہ دور تھا جب عالمی معیشت تیزی کے ساتھ گلوبل یعنی کرہ ارض پر حاوی ہوتی گئی تو اس وقت مذکورہ رویے پر سخت نکتہ چینی کی گئی۔ اسلام پسندوں کو مزید طاقت ایران کے انقلاب (فروری ۱۹۷۹ء) سے حاصل ہوئی اور اس سے بھی اہم تر افغان جہاد تھا جو امریکہ کی فیاضی کی بدولت ایک بین الملکی منصوبہ بن گیا۔ ستم ظریفی یہ کہ بعد میں یہی مصر اور الجزائر کی امریکہ نواز حکومتیں افغانستان کے تربیت یافتہ مجاہدین کا خاص ہدف بن گئیں۔

۸۰ء اور ۹۰ء کے عشروں میں دائیں بازو کی مذہبی تحریکوں کا ابھار ساری دنیا میں دیکھا گیا۔ اس کا تشدد آمیز کردار خاص طور پر اسرائیل میں نظر آیا۔ جہاں جوشیلے صیہونی عناصر نے فلسطین کے عربوں پر بطور خاص مظالم توڑے۔ ہندوستان میں ہندو تحریک نے بابری مسجد کے خلاف مہم شروع کر دی جو عوامی تائید

MashalBooks.org

حاصل کرنے کی کوششوں کا ایک حصہ تھی۔ اس کا انجام سولہویں صدی کی مسجد کا انہدام، پرتشدد فرقہ وارانہ فساد اور بی جے پی کا قومی سطح پر اقتدار میں آنا تھا۔ روسیوں کے رخصت ہو جانے کے بعد افغانستان میں دھڑوں کے درمیان بٹے ہوئے مجاہدین نے ملک کے ٹکڑے کر دیئے۔ سوڈان میں ایک اسلامی حکومت نے خوف اور دہشت کا بازار گرم کر دیا نتیجہ بدنظمی تھا جس کے بعد خوفناک قحط پھوٹ پڑا۔ عیسائی "بنیاد پرستوں" نے سرب قوم پرستوں کے ساتھ مل کر اور ملادوک کی شیطانی موقع پرستی کے اشتراک سے بوسنیا ہرزیگووینا میں دہشت گردی اور نسل کشی کا سلسلہ جاری رکھا اور اب وہ کوسوو میں جنگ آزمائی کر رہا ہے۔

("ڈان" 24 جنوری 1999ء)

MashalBooks.org

سیاست میں مذہب

دس برس گزرے میں نے کوئی دو گھنٹے مرار جی ڈیسائی کی صحبت میں گزارے۔ وہ ایک مشہور سیاست دان ہیں اور ایک زمانے میں ہندوستان کے وزیراعظم بھی تھے۔ ہندوؤں کی مذہبی جماعتیں اس جگہ رام چندر جی کا مندر بنانے کے لئے مہم چلا رہی تھیں' جہاں سولہویں صدی کی بنی ہوئی بابری مسجد کھڑی تھی' اور میں اس مہم کے سلسلے میں تحقیق کر رہا تھا۔ ہندو جماعتوں کا دعویٰ تھا کہ وہ جگہ رام جی کا جائے پیدائش ہے۔ ہندوؤں کے روایتی عقیدے کے مطابق رام جی بھگوان کے اوتار تھے جو کوئی تین ہزار قبل از مسیح کے زمانے میں پیدا ہوئے تھے۔

میں اس ملاقات سے پہلے بھی ایک بار ۱۹۷۷ء میں وزیراعظم مرار جی ڈیسائی سے ملا تھا۔ ہندو دھرم سے ان کی گہری محبت اور روایتی انداز نے مجھے متاثر کیا تھا' چنانچہ میں نے سوچا کہ ''ہندو بنیاد پرستی'' کے موضوع پر گفتگو کے لئے وہ بہت موزوں ہوں گے۔

مسٹر ڈیسائی نے بی جے پی اور ان کی حلیف جماعتوں پر نکتہ چینی کی۔ انہیں یہ تشویش تھی کہ یہ لوگ ہندوستان کے کثرور اتحاد اور اس کے سیکولر کردار کو نقصان پہنچائیں گے۔ انہوں نے آر ایس ایس وشوا ہندو پریشد اور شیوسینا پر سخت جارحانہ تنقید کی یہاں تک کہ ایک نقطے پر ہی میں چونک پڑا۔ جب ڈیسائی نے کہا۔ یہ لوگ ہندو دھرم کا چہرہ مسخ کر رہے ہیں۔ اپنی اصل میں یہ بے ختنے کے جنونی مسلمان ہیں۔ میں نے سوال کیا آپ کا مطلب کیا ہے؟ تب انہوں نے وضاحت کرنی شروع کی کہ تنہا رام پر دھیان دے کہ وہ کس طرح وحدانیت کی نقالی کر رہے ہیں اور یہ کہ ان کا دھرم تشدد کا ہے اور رام جنم بھومی پر لوگوں کو اکٹھا کر کے وہ عملاً جہاد کر رہے ہیں جو غیر ہندو رویہ ہے اور ہندوؤں کی سرگرمیوں کے منافی ہے۔

ان کے مذکورہ بیان سے فرقہ وارانہ انداز فکر کی بو آتی تھی لہٰذا میں نے بے عزتی محسوس کی لیکن بعد میں جب میں نے رام جنم بھومی تحریک پر اپنی تحقیق جاری رکھی تو اندازہ ہوا کہ اس زمانے میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان بڑھتا ہوا تشدد اور ان کے مابین تقابل قابل فہم ہے۔ لیکن مرار جی ڈیسائی ایک معاملے میں غلطی پر تھے یہ یکسانیت اس بنا پر نہیں تھی کہ ''پریوار'' ''مسلمان بنیاد پرستوں کی پیروی کر رہے تھے بلکہ کسی مخصوص مذہبی روایت اور دوسرے مشترکہ رویئے' اسلوب اور طرز عمل کا دونوں طرف سے مسخ کیا جانا

ایک ہی سبب سے ہےاور ہمارے زمانے کی مخصوص کشیدہ صورت حال کا باعث بھی ہے۔ میں نے اس نکتے پر ایک اور مضمون میں بحث کی ہے۔ یہاں میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ یہ نام نہاد بنیاد پرست خاص طور پر اسلامی بنیاد پرست اس مذہبی روایت سے کیا علاقہ رکھتے ہیں' جس کی وہ نمائندگی کرتے ہیں اور جس کی محبت کے دعویدار ہیں۔ اس سارے عمل میں مثال اور محاورے بہت پسند کئے جاتے ہیں اس کی علامتیں استعمال ہوتی ہیں اور رسوم پوری کی جاتی ہیں لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی بھی مذہبی سیاسی تحریک یا جماعت نے اسلام' مسیحیت' یہودیت اور ہندوازم کی اقدار یا روایات کو اپنے پروگراموں اور سرگرمیوں میں مضبوط انداز سے شامل نہیں کیا' نہ انہوں نے انفرادی یا اجتماعی طور پر ایسی مثالیں پیش کی ہیں جو ان کی پسندیدہ نظام اقدار اور عقائد سے میل کھاتی ہوں۔ وہ بس یہی کرتے ہیں کہ جو باتیں ان کے سیاسی مقاصد کی موافقت کرتی ہیں' انہی کو پکڑ لیتے ہیں انہیں مقدس اصطلاحات میں ڈھال دیتے ہیں اور یک گونہ مذہبی جواز کے ساتھ آگے چلا دیتے ہیں۔ یہ بگاڑ کا رویہ ہےاور بگاڑنا آسان ہوتا ہے۔

تمام مذاہب کے نظام ایسی تعلیمات سے مل کر قائم ہیں جو معکوس انداز میں ایک دوسرے سے مربوط ہیں' جیسے روشنی اور تاریکی' امن اور جنگ' شر اور خیر لہٰذا یہ بالکل ممکن ہے کہ کسی کل سے ایک جز کو نکال لیا جائے' اسے اصل متن اور مقصد سے الگ کر دیا جائے اور اسے سیاسی اغراض سے استعمال کیا جائے۔ یہ اوزار بندی کا طریقہ تقریباً ہمیشہ قطعیت پر مبنی ہوتا ہے اس میں متن کو اصل عبارت سے الگ کر کے مذہب کا ایک رخ' دوسرے ہر موقف کی پروا کے بغیر یقینی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس صورت حال میں مذہب کو بگاڑا جاتا ہے' روایات پامال کی جاتی ہیں اور جو بھی سیاسی عمل شروع کیا جائے اس کو توڑا مروڑا جاتا ہے جہاد کا خیال اس کی ایک مثال ہے۔

جہاد۔ یہ ایک اسلامی تصور ہے' جس کے بہت سے معنی ہیں' ان میں جنگ آزمائی' سماجی خدمت' انسانی فلاح کے کام' دانشورانہ کاوش یا روحانی مجاہدہ بھی شامل ہیں۔ یہ لفظ عربی کے لفظ ''جہد'' سے نکلا ہے۔ جس میں زبردست کوشش کا مفہوم شامل ہےایسی کوشش جو کسی مثبت مقصد کے لئے بروئے کار لائی جائے۔ اس طرح جہاد میں شامل ہے ہر وہ کوشش جو کسی نیکی کو فروغ دینے اور برائی پر قابو پانے میں کام آئے۔ جہاں اندھیرا ہو' وہاں روشنی پھیلائے جہاں افلاس ہو وہاں خوشحالی لائے' جہاں بیماری ہو' وہاں علاج کے اسباب پیدا کرے' جہاں لاعلمی ہو' وہاں علم پھیلائے اور جہاں ذہنی خلفشار ہو' وہاں ذہن کی صفائی اور بالیدگی پیدا کرے۔ اس طرح مجاہدہ (بمعنی جہاد) اسلام کے اولین دور میں اخلاقی اور روحانی کردار کی تکمیل کے لئے ایک فرد کی کاوش ہوتی تھی۔ مجاہد وہ عالم دین ہے جو جہاد کرتا ہے یعنی نئے حالات اور نئے چیلنج کی روشنی میں مذہبی تنقیحات کی تفسیر کے باب میں کوشش کرتا ہے۔

اسلامی تاریخ کے ابتدائی زمانے میں جب ایمان لانے والوں کی جمعیت میں اضافے اور اس

کے دفاع کی ضرورت کو اولیت حاصل تھی' جہاد کو وسیع پیانے پر جنگ کے معنوں میں لیا جانے لگا۔ نبی کریم ﷺ کی روایات کے تحت ابتدا میں بعض علمائے دین نے جہاد کو دو درجات میں تقسیم کیا۔ جسمانی جہاد یعنی مذہبی جنگ میں شرکت کرنا جس کے قواعد وضوابط صریح طور پر بیان کر دیئے گئے تھے۔ اسے (کمتر جہاد) کے درجے میں رکھا گیا تھا۔ اس کی حدود بختی سے متعین تھیں۔

مسلمانوں کی تعداد اور ان کی طاقت میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا گیا' کثیر آبادی کا مخصوص طرز زندگی اور انداز فکر ابھرنے لگا۔ اب مختلف نقطہ ہائے نظر کے درمیان تصادم ہونے لگا' جس میں ذاتی عزائم بھی کچھ کم شامل نہ ہوتے۔ اس طرح جنگیں اور حکمران خاندانوں کے درمیان لڑائیاں ہوتیں' جن میں اکثر بہت سے مفادات شامل ہوتے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اتحاد کیے جاتے اور جنگیں لڑی جاتیں۔ حسب روایت ان کو مختلف نام دیے جاتے یعنی حرب' جنگ' قتال یا مقاتلہ' لیکن جہاد کبھی نہیں کہا گیا۔ اس روایت کی بنیاد تو موجودہ زمانے کے مسلمانوں نے رکھی ہے۔

عظیم تر جہاد وہ ہوتا تھا' جو ایک فرد اپنے وجود کے اندر اور معاشرے میں کرتا تھا' تاکہ حرص وہوس' بغض وعناد نفرت اور غصہ' انا پرستی اور تکبر پر قابو پالے اور اپنی روحانیت کی تکمیل کرے۔ بڑے بڑے صوفی اس تصور میں زیادہ گہرائی تک جاتے تھے' یعنی نفس کو اپنا تابع کر لیتے تھے۔ جسے جہاد بہ نفسہ کہا گیا ہے' ان کی ساری کوشش یہ ہوتی تھی کہ اللہ اور اس کے بندوں کی عبادت اور خدمت کرتے رہیں۔ ان میں سے بہتوں نے کمزوروں اور محتاجوں کی خدمت کے لئے اپنی ساری زندگی تج دی تھی' چنانچہ ان کی مثالوں سے متاثر ہو کر لاکھوں افراد نے اسلام قبول کیا۔ ایسے لوگوں کا ہر جگہ جیسا کہ ہندوستان میں بھی مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے درمیان یکساں احترام کیا گیا اور برابر کیا جاتا ہے۔

آج کل شائد ہی کوئی اسلامی جماعت ایسی ہوگی جس نے لوگوں اور برادریوں کی خدمت کے فریضے میں خود کو بامعنی طور پر مصروف رکھا ہو' اس کے برعکس آج کے مسلمان ان لوگوں کو پسند کرتے ہیں جنہوں نے اپنے وقت میں صوفی بزرگوں کی تقلید کی اور عظیم تر جہاد میں سرگرم ہو گئے۔ پاکستان میں فی زمانہ ایسی دو مثالیں ڈاکٹر اختر حمید خاں اور مولانا عبدالستار ایدھی کی ہیں۔ دونوں پر صوفیانہ روایات کا گہرا اثر ہے اور دونوں نے ایسے سماجی اداروں کے قیام کے لئے مسلسل جدوجہد کی ہے جو لاکھوں بندگان خدا کی مدد کریں اور ان دونوں پر ان لوگوں نے ظلم کیے ہیں جو اسلام کے چمپئن ہونے کے دعوے دار ہیں۔

اس بات میں ذرا بھی شک نہیں کہ زمانہ حاضر کے مسلمان نظریہ سازوں اور جنگ آزماؤں نے جہاد کی وسیع روایات کو اتنا ہلکا کر دیا ہے کہ اب اس کا ایک معنی یعنی جنگ جوئی رہ گیا ہے۔ جہاد کی شرائط اور قوانین اس سے بالکل خارج کر دئیے گئے ہیں۔ چنانچہ افغانستان میں مارکسسٹ حکومت اور اس کے سوویت حلیف کے خلاف جنگ بیسویں صدی کا مشہور ترین جہاد بن گئی' حالانکہ اسے اسلحہ اور سرمایہ امریکہ نے فراہم کیا' جو

ایک غیر مسلم سپر پاور ہے۔ اب دہشت گردی' فرقہ وارانہ تصادم اور معصوم لوگوں کے قتل جیسی سرگرمیاں مقدس جنگ کہلاتی ہیں۔ معاملات کو آسان بنادینے کا یہ طریقہ اسلامی دنیا میں اپنی مثال آپ ہے۔

ادھر ہمسایہ ملک ہندوستان ہے جہاں ہندو تشدد پسندی ایک بالکل مختلف مذہبی روایت کے باوصف کم و بیش یہی کام کر رہی ہے۔ انہوں نے ہندوازم کو تشدد جنگ اور طاقت کا مذہب بنا کر پیش کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہندو روایت میں تشدد کے عناصر موجود ہیں۔ مہاتما گاندھی ایک مصلح تھے جنہوں نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ ہندوستان کی مذہبی اور تہذیبی روایت میں تشدد کا ایک عنصر موجود ہے' لیکن ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اہنسا ہندوازم کا عطر ہے۔ راج موہن گاندھی' گاندھی پر اپنی تصنیف میں یہ بتاتے ہیں کہ ان کے دوست سی ایف اینڈریوز نے جب یہ کہا کہ ''ہندوستانیوں نے ماضی میں خوں ریزی سے لذت اندوزی' ترک کر دی تھی اور عدم تشدد غیر شعوری طور پر ان کی جبلت میں شامل ہو گیا تھا تو گاندھی نے انہیں یاد دلایا کہ ہندوستانی دیو مالاؤں میں جسمانی پیکر اختیار کرنے والے کردار خوں خوار' تند مزاج اور اپنے دشمن کے لئے نہایت سفاک تھے۔''

لیکن گاندھی ایک انسان دوست اور ذہین رہنما تھے۔ چنانچہ انہوں نے مہابھارت کے اس لازمی سبق کو سمجھ لیا تھا جس میں صرف مٹھی بھر افراد زندہ بچے رہے تھے۔ حالانکہ ''تشدد صریحاً گمراہی اور حماقت ہے۔'' اس کے برعکس تشدد پسند ہندو پارٹیوں کے ساتھ گفتگو میں اہنسا کا تذکرہ جو ایک ہندو قدر ہے بمشکل سننے میں آتا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی مختلف مذہبی اور سیاسی تحریکوں میں بھی یہی جنون غالب ملتا ہے۔ کچھ ہی عرصہ گزرا کہ اسرائیل کے ایک سرکردہ ''ربی'' نے یہ حکم صادر کیا کہ فلسطین میں یہودی بستیوں کے اندر توسیع کی خاطر' عربوں کا قتل دینی طور پر واجب ہے۔

اسلام پر گفتگو میں مجھے وہ اسلام مذہب' معاشرے' کلچر' تاریخ یا سیاست کے حوالے سے نہیں ملتا۔ جس کی رو سے مسلمانوں نے گذشتہ صدیوں کے دوران زندگیاں گزاریں۔ اسلامی تہذیب بیشتر صورتوں میں ایک ہمہ گیر تہذیب رہی ہے جس میں غیر معمولی تنوع اور دشمنی کے ساتھ یکجائی اور اشتراک عمل کی کیفیت ملتی ہے۔ ایک روایتی مسلمان کی تہذیبی زندگی دانش کی سطح پر کم از کم چار ذہین ورثوں سے مل کر بنی ہے۔ دینیات ان میں سے ایک ورثہ ہے باقی ورثے سائنس' جمالیات اور روحانیات ہیں۔

ہمارے زمانے کے مسلمان ان سب ورثوں کو دبا دینے کے درپے ہیں۔ بس ایک دینی ورثے کو تنگ ذہنی کی حد تک برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارے دور میں پروفیسر فضل الرحمٰن بلاشبہ ایک نہایت ممتاز اسلامی مفکر گزرے ہیں۔ میں انہیں ایک کھرے اور پاکباز مسلمان کے طور پر جانتا تھا' جو کلاسیکی عربی' فارسی اور عثمانیہ دور کی ترکی زبانوں کو میری دانست میں کسی بھی اسلامی عالم سے بہتر جانتے تھے۔ جب محمد ایوب خاں نے پاکستان میں مطالعہ علوم اسلامی کا ایک انسٹیٹیوٹ قائم کرنے کی تجویز رکھی تو پروفیسر فضل الرحمٰن نے

MashalBooks.org

جوان دنوں میک گل یونیورسٹی میں تھے' اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تاکہ اس انسٹیٹیوٹ کی سربراہی کرتے ہوئے اسے عالمی معیار کی اکیڈمی بنا دیں۔ چند سال بعد ان کے خلاف ایک مسلسل مہم شروع کر دی گئی اور وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

مذہبی عالموں' فنکاروں' شاعروں اور ناول نگاروں نے جن میں نوبیل انعام یافتہ نجیب محفوظ بھی شامل ہے' نے اسلام کے خود ساختہ چمپیئن صاحبان کے ہاتھوں جارحانہ حملے اور مظالم برداشت کئے ہیں۔ اشتراک عمل اور اجتماعیت عصر حاضر کے اسلامی رہنماؤں کو اور شکر ہے کہ ان میں سب شامل نہیں' سخت خطرے سے دوچار رکھتی ہے اس لئے کہ وہ ایک ایسا اسلامی نظام چاہتے ہیں' جو محض تادیبی اور تعزیری ضابطوں تک محدود ہو کر رہ جائے اور اس میں سے انسان دوستی' جمالیات' دانشورانہ تحقیق اور روحانی سپردگی کا جوہر نکال دیا جائے۔ ان کے مقاصد کی فہرست بہت آسان ہے لہٰذا ان عورتوں اور مردوں کے لئے اس میں بڑی عافیت ہے جو روائیت اور جدت کے گہرے پانی کے بیچ ایسی جگہ آ کر رک گئے ہیں جہاں پانی نایاب ہے۔

اس میں معاملے میں مسلمان' یہودی اور ہندو کوئی بھی منفرد اور انوکھے نہیں۔ موجودہ بنیاد پرستی کی تمام اقسام نے پیچیدہ مذہبی طریقوں کو اور تہذیبوں کو کسی نہ کسی جدید فسطائیت کے قالب میں ڈھال لیا ہے۔ ان کی دلچسپی انسانی روح سے نہیں طاقت سے ہے۔ عام لوگوں کے مصائب و آلام میں شریک ہونے اور ان کی تکلیف کم کرنے سے بھی انہیں کوئی دلچسپی نہیں' بلکہ وہ لوگوں کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے ابھارنا اور سرگرم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا سیاسی ایجنڈا بہت محدود اور مختصر وقت کے لئے ہے۔

("ڈان" 31 جنوری 1999ء)

MashalBooks.org

مذہبی جماعتوں کے اصل چہرے

اس سے پہلے کے دو مضامین میں، میں نے اول اس نکتے پر بحث کی تھی کہ تمام مذہبی سیاسی تحریکیں طریق پیداوار میں تبدیلی اور اس سے لگی ہوئی دوسری تبدیلیوں کے نتیجے میں پیدا ہوئیں۔ یعنی اس وقت جب زراعت اور گلہ بانی کے دور سے نکل کر معاشرہ سرمایہ داری اور صنعت کاری کے دور میں داخل ہوا، دوئم یہ کہ معاشرہ میں جو مذہبی روایات آئیں وہ حقیقت سے زیادہ تصور پر مبنی تھیں، وہ سیاسی موقع پرستی اور مروجہ حالات کے جبر کا نتیجہ تھیں اور ان کا اصل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

یہ جو ام نہاد پرست تحریکیں ہیں ان کی بنیادیں مشترک ہیں اور ان میں حیران کن حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس کی صراحت آئندہ سطور میں کی جا رہی ہے۔

یہودی اور عیسائی، ہندو اور مسلمان "بنیاد پرست" سب اپنی اپنی جگہ اس نظریے کو لے کر چلتے ہیں کہ وہ برتر ہیں اور دوسروں سے مختلف ہیں۔ ہر ایک اپنے سے کمتر کے مقابل کھڑا ہوتا ہے اور دوسرے کو ڈراتا ہے۔ ہر ایک کی سیاست کا مرکز یہ ہے کہ وہ سب سے جدا اور یکسر مختلف ہے۔ اس وجہ سے ہر ایک اپنی ریاستی حدود میں آباد برادریوں کے لئے خطرہ بن جاتا ہے۔ یہودی عربوں کو خاص طور پر فلسطین کے عربوں کو جن کی زمینوں پر وہ حریصانہ نظر ڈالتے ہیں اور برابر قبضہ کئے جا رہے ہیں، تشدد پسند، غلیظ، تہذیب سے عاری، شہوت پرست اور خطرناک سمجھتے ہیں۔

ایک طویل عرصے تک ہندو انتہا پسندوں کا ہدف مسلمان تھا۔ اب ان کے دشمنوں کی فہرست میں عیسائی بھی شامل کر لئے گئے ہیں۔ عیسائی شدت پسندوں نے ایک عرصے تک یہودیوں کو سازشی اور حریص قرار دیا اور اپنا دشمن سمجھا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد سال کے کئی عشروں تک صیہونیت کی مخالفت کو وسیع پیمانے پر ایک ناپسندیدہ تعصب سمجھا گیا اور مسیحی معاشروں میں اس کا حوالہ آتا رہا۔ رفتہ رفتہ مسلمان اور رنگ دار ایشیائی باشندے مغربی دنیا میں یہودیوں کی جگہ لے رہے ہیں۔ مسلمان انتہا پسندوں کا ہدف اب یہودی ہیں، کبھی کبھی عیسائی بھی ہوتے ہیں اور جنوبی ایشیا میں ان کے دشمن ہندو، عیسائی اور احمدی ہیں۔ مجھے آج کوئی ایسی مذہبی سیاسی تنظیم نظر نہیں آتی، جس کو کسی مہیب دشمن سے خطرہ کا سامنا نہ ہو۔ یہ دشمن یا مخالف ہمیشہ ایک منفی متحرک قوت ہوتا ہے۔ ایسی تمام تحریکیں نفرت پھیلاتی ہیں اور اگر نفرت کی مہم کو تیز کرنے کے

لئے غیر معمولی منظم کوشش سے کام کرتی ہیں ۔ رام جنم بھومی تحریک کوئی دو سال تک جاری رہی جس کے دوران بی جے پی کے لیڈروں اوران کے حواریوں نے ہندوستان کے طول وعرض میں ہزاروں دیہات اور قصبات کے دورے کئے اورتحریک میں جوش پیدا کرنے کے لئے اینٹیں بنانے کی رسم جاری کی۔ تا کہ ان اینٹوں سے اس جگہ وہ مندر بنایا جاسکے جہاں سولہویں صدی عیسوی کی ایک مسجد بابری مسجد کے نام سے کھڑی تھی۔ دسمبر ۱۹۹۲ء میں وہ مہم ختم کو پہنچی اس سے پہلے ایک مارچ ہوا۔ مظاہرین کا رخ اجودھیا کی طرف تھا۔ جہاں جنونیوں کے مشتعل ہجوم نے مسجد کو ڈھادیا۔ لازمی تھا کہ اس کے بعد فسادات اور قتل عام کا سلسلہ جاری ہوتا۔

نفرت انگیزی کا فائدہ تو ہے خواہ وہ بالکل عارضی ہو۔تحریک بنانے اور جوش وخروش پیدا کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ بی جے پی جو ایک چھوٹے سے سیاسی دھڑے کی صورت میں تھی' ہندوستان کی دو سب سے بڑی پارلیمانی پارٹیوں میں سے ایک ہوگئی۔ اسرائیل میں دائیں بازو کی پارٹی لیکوڈ اوراس کے انتہا پسند ساتھی اس وقت ایک فوجی طاقت بن کر نمودار ہوئے جب انہوں نے فلسطین کے مقبوضہ علاقے پر قبضہ قائم رکھنے کا تقاضا کیا اور وہاں نفرت انگیزی کی۔ بوسنیا میں مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کے درمیان خوب نفرت پھیلائی گئی اوراس سے پہلے اور بعد میں بھی سربوں نے نسلی تطہیر کی مہم شروع کی۔

کشمیر میں جہاں مہاراجہ کی حکومت میں بڑی سختی تھی اور امتیاز برتا جاتا تھا' ہندو اور مسلمان آپس میں پرامن طریقہ سے رہتے تھے۔ پھر ہندو مہا سبھا اور آر ایس ایس نے مسلمانوں کو الگ کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ ابھی حالیہ دنوں میں ''اسلامی'' دہشت گردوں نے ہندوؤں کے مکانوں پر حملے کئے' دیہات میں گھس گئے اور مظالم کئے۔ ایسے مظالم جن کی اسلامی جنگی قوانین میں سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔

تفریق کے نظریوں میں تشدد کی رسم اور دشمن سازی کے عمل کو تیزی سے پھیلانا شامل ہے' ہرایک دوسرے فریق کے خلاف نفرت کا اظہار منظم تشدد کے ذریعے کرتا ہے۔ یہ سب لوگ مذہب اور تاریخ کے حوالے سے اپنے تشدد کا جواز پیش کرتے ہیں۔ تقریباً ان سب مثالوں میں دشمن کی تعداد دن دگنی ہو جاتی ہے۔ اب سے پہلے ہندوستانی پریوار کے لئے مسلمان اصل دشمن اور گردن زدنی تھا۔ اب ان کا رخ عیسائیوں کی طرف ہے۔ یقین ہے کہ آئندہ ان کا ہدف دلیت' سکھ اور قبائلی برادریاں ہوں گی۔ انتہا پسند یہودی بتدریج اسرائیل کے سیکولر اور روشن خیال یہودیوں کو اپنا ہدف بنا رہے ہیں۔ وہ ایک وزیراعظم کو پہلے ہی ہلاک کر چکے ہیں۔ اور اندرونی تفرقے پیدا کرر ہے ہیں۔

پاکستان میں عیسائیوں اور احمدیوں پر بھی حملے ہو چکے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تشدد پسند گروہوں کا باہمی تشدد بھی خاصا پھیل گیا ہے۔ چنانچہ مسجدوں اور امام بارگاہوں میں بھی تا تلانہ حملے ہوتے ہیں۔ الجزائر میں سفاکانہ کارروائیوں میں اتنی پیچیدگی آ گئی ہے کہ ظالموں کو اور اکثر تو ظلم کا شکار ہونے والوں کو پہچاننا

ممکن نہیں رہتا۔

چونکہ تمام مذہبی وسیاسی جماعتوں کا اپنے ماضی کی مذہبی روایات اور تواریخ سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا اس لئے وہ ایجاد سے کام لیتی ہیں اور اس عمل میں خود اپنی تاریخ اور روایات کو مسخ کر دیتی ہیں۔ میری ملاقات ۱۹۷۴ء میں ایک عظیم صیہونی عالم موشے منیوہم سے ہوئی۔ انہوں نے دوران گفتگو یہودی نظریہ سازوں کے متعلق کہا کہ "مجھے ان کے بیانات اور تحریروں میں صیہونیت اور یہودی تاریخ کا بس ایک سایہ سا نظر آ جاتا ہے۔" حالیہ برسوں میں اسرائیلی تاریخ کے ایک ممتاز گروہ نے یہودی تاریخ نگاروں کے غیر تاریخی کردار کی دستاویز مرتب کرنی شروع کی ہیں۔

مسٹر ایم آر ملکانی آر ایس ایس کے ایک معروف نظریہ دان اور ان دنوں لوک سبھا کے رکن ہیں۔ میں نے جب ان سے کہا کہ ہندوستان کے نہایت محترم تاریخ دانوں نے آپ کے تاریخی دعووں کی صحت کو تسلیم نہیں کیا تو انہوں نے بڑی قطعیت کے ساتھ اعلان کیا "ایسے اتہاسیوں (تاریخ دانوں) کے لئے ہندوستان میں کوئی استھان نہیں ہے۔" پاکستان میں جب "اسلامائزیشن" کا عمل اپنے عروج پر تھا، اسکول اور کالج کی درسی تاریخی کتب میں غلط تاریخی واقعات اور فرقہ واریت پر مبنی دعوے شامل کر لئے گئے جس کا دستاویزی ثبوت ڈاکٹر کے عزیز نے وافر طور پر فراہم کیا ہے۔ ان کتابوں سے ایسے مواد کا نکالنا اور انہیں صاف کرنا آج بھی ایک تعلیمی ضرورت ہے۔

ان تمام مذہبی تحریکوں میں ایک "پدرسری نظام" مردانہ نقطہ نظر ہوتا ہے۔ اور کم و بیش سب میں عورتوں کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے۔ امریتا باسو البرٹ کالج سے وابستہ سیاسیات کی عالم ہیں۔ انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اقلیتوں کے ساتھ عناد کا جو رویہ اختیار کیا جاتا ہے وہ بالکل ویسا ہی ہے جو "پریوار" عرب میں عورتوں کے خلاف (پدرسری نظام کے) نقطہ نظر کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اس معاملے میں اسلام کے دعوے دار اپنے ہندو، یہودی اور عیسائی حریفوں سے بھی آگے نکل گئے تاکہ جنسی عدم مساوات کو برقرار رکھا جا سکے۔

تقریباً تمام مذہبی وسیاسی تحریکوں میں ایک ہی طرح کے گروہ شامل ہوتے ہیں، دیہات کے لوگوں سے زیادہ وہ شہریوں سے مخاطب ہوتے ہیں۔ محنت کشوں اور بالائی طبقے کے لوگوں سے زیادہ ان کا روئے سخن نچلے متوسط طبقوں اور متفرق بے روزگاروں سے ہوتا ہے۔ روشن خیال پیشہ ور لوگوں سے زیادہ وہ ٹیکنیکل لوگوں پر توجہ کرتے ہیں اور قومی بورژوازی سے زیادہ اس بورژوازی سے خطاب کرتے ہیں جو ترک وطن کر کے آئے ہوں۔ ان مثالوں کو سامنے رکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان مذہبی وسیاسی جماعتوں میں ان لوگوں کو اور طبقات کو زیادہ کشش محسوس ہوتی ہے جو روایت اور جدت کے درمیان ایک پایاب پانی میں پھنس گئے ہیں اور کئی اعتبار سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ سماج میں ان کی کوئی جڑ نہیں اور وہ مرکز سے دور ایک

MashalBooks.org

کنارے پر کھڑے ہیں۔

مذہبی و سیاسی پارٹیوں کے لیڈر اور کارکن اپنے روائتی سماجی ماحول میں رہتے ہوئے جدید دور کی ان اشیا سے اور جدیدیت کے علاقوں سے بیک وقت متضاد جذباتی تعلق رکھتے ہیں' وہ ٹیکنالوجی کے دیئے ہوئے آلات سے محبت کرتے ہیں اور انہیں سیاسی اور ذاتی استعمال میں بھی لاتے ہیں' لیکن اس کے ساتھ ہی سائنس کی طرف منفی رویہ رکھتے ہیں جس میں عقلیت پرستی پر زور دیا جاتا ہے۔ ایسی تقریباً تمام جماعتوں کا میلان اس طرف ہے کہ وہ سائنسی دریافتوں کے شواہد اپنے اپنے مذہبی متون میں ڈھونڈ لیتے ہیں اور مسلمان' ہندو' یہودی اور مسیحی سائنس کی موجودگی کا اس وقت سے دعویٰ کرتے ہیں جبکہ حالیہ سائنس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ یہ سارے لوگ گہرے طور پر سنجیدہ اور حس مزاح سے عاری معلوم ہوتے ہیں۔ کم و بیش سبھی ایسے مشاغل پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں جن سے خوشی اور تفریح حاصل ہوتی ہو۔ تہذیب اور علم سے ان کا مثبت رابطہ بمشکل ہوتا ہے بلکہ ان چیزوں کو بداخلاقی کا خطرناک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیمی اداروں پر قبضہ جمانا اور معاشرے کی تہذیبی زندگی میں اپنے ضابطے نافذ کرنا' ان تحریکوں کا بنیادی مقصد بن جاتا ہے۔ طالبان کے آنے کے ساتھ یہ رجحان عروج پر پہنچ گیا ہے جنہوں نے شطرنج' فٹ بال' کبوتر بازی' پتنگ بازی' موسیقی اور رقص کو غیر اسلامی قرار دے دیا ہے۔

یہ تمام مذہبی و سیاسی پارٹیاں جمہوریت میں رہتے ہوئے خود بنیادی طور پر غیر جمہوری ہوتی ہیں۔ نظریے اور عمل دونوں کے اعتبار سے وہ جمہوریت کی بنیادی اقدار سے انکار کرتی ہیں۔ عام لوگوں کے ساتھ فیصلوں میں شراکت' سماجی اور سیاسی زندگی کی ترتیب میں دلیل کو بنیاد تسلیم کرنا اور اختلافات کو مذاکرات سے طے کرنا انہیں قبول نہیں۔ وہ سیکولر قوانین کے بھی خلاف ہیں۔ تقریباً سب کے سب مرکزیت اور حاکمانہ طرز حکومت کو ترجیح دیتے ہیں۔

ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے سوال یہ ہے کہ ان "بنیاد پرست" پارٹیوں اور تحریکوں کا مستقبل کیا ہے؟ میرا خیال ہے کہ ان کا مستقبل محدود اور تاریک ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ ماضی کے ساتھ ان کے رشتے بے بنیاد ہیں۔ مستقبل کے حوالے سے ان کی فکر ناقابل عمل نہیں۔ دور حاضر کی طاقتوں اور معیارات کے ساتھ ان کے تعلقات منفی نوعیت کے ہیں۔ لیکن ان کے محدودات کو دیکھتے ہوئے بہر حال ہمارے لئے اندیشے کی بات تو ہے۔

("ڈان" 7 مارچ 1999ء)

MashalBooks.org

امیدیں اور امکانات

MashalBooks.org

جمہوریت کے فروغ کے لئے

اب یہ اچھا ہو یا برا لیکن ہم پاکستانی نہایت مختلف الخیال اور جرح کرنے والے لوگ ہیں۔ لیکن ایک بات پر ہم سب متفق ہیں' وہ ہے حکومت کے دیگر تمام طریقوں پر جمہوریت کو ترجیح دینا۔ اتفاق رائے کی یہ نادر مثال گذشتہ ہفتے نہایت اعلیٰ سطح پر دیکھنے میں آئی۔

ایک اجلاس میں جس کا اہتمام بے نظیر بھٹو نے کیا تھا' سارک ممالک سے آنے والے حزب اختلاف کے لیڈروں نے "جمہوریت کے تحفظ" کا عہد کیا۔ اس کے ایک دن بعد قائداعظم کی برسی کے موقع پر پاکستان کے صدر اور وزیراعظم نے قوم سے اپنے اپنے خطاب میں کہا کہ وہ (جمہوریت کے لئے جدوجہد) کریں۔ صدر صاحب اپنے خطاب میں خاص طور پر رطب اللسان تھے جب انہوں نے شہریوں کو دعوت دی کہ "جمہوری اداروں کو مستحکم بنائیں۔ جمہوری روایات کو نافذ کریں اور جمہوری اقدار کو فروغ دیں۔" ہم سب کو اس پیغام پر دھیان دینا چاہئے۔ لیکن عام لوگوں سے زیادہ اس پر دھیان دینے کی ذمہ داری ارباب اقتدار پر آتی ہے۔

پاکستان کی سیاست کے نہایت مختصر جائزے سے بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس ملک کے اندر جمہوریت کے فروغ میں اصل رکاوٹ عام لوگوں کے رویے نہیں بلکہ اس کا سراغ سیاست دانوں کے طبقے میں ملتا ہے۔ اس طبقے کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ اس کی سماجی اساس نہایت محدود ہے۔ اس میں اعلیٰ سطح کے سیاست دان' اعلیٰ سرکاری افسر' فوجی حکام' چند تاجر اور اس سے بھی کم کچھ پیشوں کے لوگ شامل ہیں۔ سیاست دان بھاری تعداد میں جاگیردار خاندانوں سے آتے ہیں۔ باقی سب جاگیردار طبقے' اوپر کے شہری گھرانے اور متوسط طبقے سے آنے والوں کا ملغوبہ ہیں۔ ہمارے ملک میں سماجی سطح پر ترقی نہایت پابند نوعیت کی ہے چنانچہ بہت کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ نادار کی اکثریتی آبادی سے نکل کر کوئی فرد اوپر کے مراعات یافتہ طبقے میں پہنچ جائے۔

ایک دوست نے مجھے بتایا کہ اس ملک میں کوئی ستائیس ہزار سات سو افراد کو وی آئی پی کارڈ دیے گئے ہیں' آپ چاہیں تو اس عدد کو تین سے ضرب دے دیں اور فرض کر لیں کہ ان میں سے ہر فرد ایک خاندان کا سربراہ ہے' تو ایک موٹے حساب کے مطابق آپ پاکستان میں اصحاب حل و عقد کی تعداد کا اندازہ کر سکتے

ہیں ۔قدیم اور اصل عربی محاورے میں اس کا حوالہ اس طبقے کی جانب ہے جو ظاہر ہے کہ مسائل کو حل کرنا یعنی کھولنا ہے اور حقد کرنا یعنی جوڑنا ہے۔ میں نے اس معاہدے میں تھوڑا تصرف کیا ہے اور میں حقد کی جگہ نقد استعمال کرتا ہوں۔اس کے لئے وہ سنہری شخصیتیں جو کہ اس ذیل میں نہیں آتیں مجھے معاف فرمائیں۔

یہی وہ اشرافیہ ہے جو مذکورہ خطاب کی بجا طور پر سزاوار ہے جس میں جمہوری اداروں جمہوری روایتوں اور قدروں کو مستحکم بنانے پر زور دیا گیا ہے۔ہم کو اپنی گفتگو کا آغاز ان کی نشاندہی سے کرنا ہوگا۔ جمہوری روایات اور جمہوری قدروں پر میں پھر کسی روز بات کروں گا۔آج کچھ باتیں اداروں کے تعلق سے ہوں گی۔

جمہوریت کے حوالے سے جن اداروں کے نام بالعموم آئے ہیں وہ بنیادی نوعیت کے چھ ہیں۔ شہریت کے ناقابل تنسیخ حقوق ایک انتخابی نظام منتخب نمائندوں کے ادارے حزب اختلاف کی پارٹیاں جنہیں سرکاری طور پر تسلیم کیا گیا ہو ایک آزاد پریس اور نظم ونسق میں قانون کی حکمرانی۔فوجی حکمرانی کے دور میں جو آزادی کے بعد سے ہماری تاریخ کے تقریباً نصف عرصے پر محیط ہے یہ سب نہایت موثر انداز سے ختم کر دیئے گئے۔قبل اس کے کہ اس عرصے کو وقت کا زیاں قرار دیتے ہوئے نظر انداز کر دیا جائے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جہاں تک جمہوریت کا ملک کے اندر تعلق ہے چند سیاست دانوں اور اعلیٰ عہدیداروں کے سوا جو ہمیشہ ناپسندیدہ رہے ہماری باقی حاکم اشرافیہ نے آمریت کے گھناؤنے کھیل میں نہایت خوشی سے بلکہ بہت سی صورتوں میں بڑی گرم جوشی سے حصہ لیا۔ان میں سے چند ریٹائرڈ ہونے کے بعد اور ملازمت میں رہتے ہوئے بھی جمہوریت کے علم بردار بن گئے ہیں۔ہم ان کا یہ نئی جون بدلنے پر خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ یہ تبدیلی قلب مستقل ہوگی۔

زیادہ اذیت ناک بات یہ ہے کہ پاکستان میں جمہوری ادارے منتخب حکومتوں کے ہاتھوں تباہ ہوتے آئے ہیں۔جگہ کی تنگی کی بنا پر یہ ممکن نہیں کہ ایوب خاں کے برسر اقتدار آنے سے پہلے کے عشرے کا جائزہ پیش کیا جائے یا زیڈ اے بھٹو کے پانچ برسوں کا احاطہ کیا جائے تاہم جیسا کہ صدر صاحب نے زور دے کر کہا ہے۔"جمہوری اداروں کو مستحکم کرنے" کی خاطر بہتر ہوگا کہ ہمارے اس تازہ ترین جمہوری تجربے پر نظر ثانی کر لی جائے۔

مبصرین اس امر کی تصدیق کرتے ہیں اور بظاہر سیاست دان بھی اس پر متفق ہیں کہ جنرل ضیاء الحق کے انتقال کے بعد انتخابات بڑی حد تک باضابطہ اور منصفانہ انداز میں ہوئے۔محترمہ بے نظیر بھٹو نے اکثریت حاصل کی اور انہیں وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ضرورت یہ ہے کہ ان کی مشکلات کو تسلیم کیا جائے۔انہیں ایک ایسے انتظامی ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے حکومت کرنا تھا جسے آمریت نے بنایا۔من مانے انداز سے

MashalBooks.org

بنائے گئے قوانین نے گذشتہ حکومت کے افسروں کو محاسبے سے مستثنٰی قرار دے دیا تھا۔ آئینی ترمیم نے صدر کو وہ اختیارات تفویض کر دیے تھے کہ لارڈ کرزن بھی ہوتا تو اس پر رشک کرتا۔ حیرت کی بات ہے کہ محترمہ بھٹو نے اتنی معمولی اکثریت کے ساتھ اور اتنی محدودات کے ہوتے ہوئے حکومت کی سربراہی قبول کر لی۔

محترمہ بھٹو نے کسی دانستہ پالیسی کے تحت جمہوری اداروں کو نقصان تو پہنچایا' لیکن بہت معمولی۔ مسٹر نواز شریف کی پنجاب حکومت کو غلط طریقوں سے برطرف کرنے کی جو کوشش انہوں نے ابتدا میں کی اس سے ظاہر ہوا کہ جمہوری عمل میں ان کے یہاں احترام نہیں تھا۔ اس کا الٹا اثر ہوا۔ انہوں نے پاکستان ٹیلی وژن کو پابندیوں سے آزاد کر دیا' لیکن پھر وہی پابندیاں لگا کر انہوں نے بالواسطہ طور پر خود کو نقصان پہنچایا۔ جو موثر طور پر حکومت نہیں کرتے' یہ ان کی نااہلی تھی۔

اس کے مقابلے میں من مانے انداز سے اسمبلی کو برخاست کر دینا' ایک ایسے ادارے کو جو قوم کا سب سے بڑا منتخب ادارہ تھا' جمہوریت پر ایک ضرب تھا۔ اس عمل نے حکومتی مداخلت کی ایک مثال قائم کرائی ہے' امید ہے کہ آئندہ نہیں دہرایا جائے گا۔ محترمہ بھٹو کی برطرفی کے بعد جو انتخابات ہوئے ان میں بیشتر کوائف کے مطابق بڑے پیمانے پر دھاندلی اور ہیرا پھیری ہوئی۔ مرحوم جام صادق علی (اللہ ان پر رحم فرمائے) کا سندھ میں بطور وزیر اعلیٰ تقرر نہایت مضحکہ خیز بات تھی۔ اس منصب پر رہتے ہوئے ان کا طرز عمل ایسا تھا جس نے جمہوریت کے تصور کو اور جمہوری اداروں کو مزید پامال کیا۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں' اس سے کوئی نیک مقصد پورا نہیں ہوا۔ طاقت کے حصول کی خاطر جمہوریت اور اکثریت کا اتفاق رائے دونوں ہم معنی ہیں۔ جمہوری ریاست سے مراد یہ ہے کہ مہذب' پر امن' قانونی اور ادارے کی سطح پر فریقوں کے درمیان معاملت ہو لہٰذا جمہوریت کے لئے اختلاف کی موجودگی اتنی ہی ضروری ہے' جتنی زندگی کے لئے آکسیجن' ایک بامعنی اور قانونی حزب اختلاف کے بغیر جمہوریت کا وجود ممکن ہی نہیں۔ تاہم جمہوریت میں اقتدار کے لئے جو کھینچا تانی ہوئی ہے اس کی بنا پر حکومتوں کو یہ ترغیب ملتی ہے کہ حزب اختلاف کو دبائیں۔ اس عمل میں وہ حکومت کے عقوبتی شعبوں کو استعمال کرتے ہیں۔ جمہوری نظام میں قانون کی حکمرانی کو اسی وجہ سے بہت اہمیت دی جاتی ہے۔

پاکستان میں انصاف کا ساقط ہو جانا ایک معمول کا عمل ہے' قانون کی حکمرانی کی تلقین اکثر اوقات عام شہریوں کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ پولیس کی ایذا رسانی کے بیشتر شکار پاکستان کے نہایت لاچار وی او پی (بالکل معمولی لوگ) ہوئے ہیں جن کی اعلیٰ حکام تک رسائی نہیں ہوتی۔ ان کی کثرت کو دیکھتے ہوئے پاکستان کو ایک فعال جمہوریت ماننا مشکل ہوگا۔ انصاف کا عمل یہاں بہت سست رفتار ہے اور اکثر ناقابل حصول بھی۔ یہ وہ خرابیاں ہیں جن کے خلاف اس نوزائیدہ جمہوریت میں ہم سب کو جدوجہد کرنی چاہئے اس کی اصلاح میں کچھ وقت لگے گا۔

MashalBooks.org

لیکن جب ملک کے اعلیٰ ترین منصب دار قانون کو ایک سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے لگیں تو قانون کی حکمرانی کا سارا تصور ملیا میٹ ہو جاتا ہے۔ محمد ایوب خاں نے جسٹس ایم آر کیانی کی جرات مندانہ تنبیہوں کے باوجود اپنا کام کر دکھایا۔ مسٹر زیڈ اے بھٹو جو ایک منتخب لیڈر تھے صحیح معنوں میں وہ پہلے حکمران تھے جنہوں نے بڑے پیانے پر قانون کی حکمرانی سے انحراف کیا۔ اس طرح انہوں نے جمہوریت کو بہت نقصان پہنچایا۔ حالات کی ستم ظریفی یہ کہ وہ اپنے بعد آنے والے حکمران کے ہاتھوں ہمارے نظام انصاف کی سفاکانہ غلط کاری کے پہلے اور نہایت الم انگیز شکار بن گئے۔ اس کو یاد کر کے قوم کرب میں مبتلا ہو جاتی ہے اور جزوی طور پر یہی کرب کی کیفیت ہے اور اس عدالتی قتل پر شرمندگی کا احساس ہے جس کی بنا پر عام لوگوں کا ہجوم بے نظیر بھٹو کے گرد اکٹھا ہو جاتا ہے۔ مزید یہ کہ ان کی حکومت اس وقت ختم کی گئی جب پارلیمنٹ میں ارکان کی اکثریت ان کے ساتھ تھی۔ اب انہیں وقفے وقفے کے ساتھ نام نہاد ریفرنسز کے ذریعے خوفزدہ کیا جا رہا ہے جسے آہستہ آہستہ عام لوگ انصاف کا غلط استعمال اور قانون کی حکمرانی کی تضحیک کہنے لگے ہیں۔ پاکستان میں جمہوریت کے مفاد میں اور شرف انسانی کے تقاضے کے تحت مناسب ہوگا کہ وہ ریفرنس واپس لے لئے جائیں۔

جب کوئی ملک اتنا خوش نصیب ہو کہ اس کے یہاں دو بڑی جماعتیں اقتدار میں آنے کی خواہش مند ہوں تو سمجھئے کہ جمہوریت کی آدھی لڑائی تو جیتی جا چکی۔ ایک فعال جمہوریت کے لئے صف بہ صف دو پارٹیوں کا وجود ایک مثالی خاکہ ہے۔ کیونکہ اس صورت میں متبادل صورتیں موجود ہوتی ہیں اور اس طرح منتخب حکومتیں مضبوط ہوں گی۔ ایک مستحکم جمہوریت کی اس خصوصیت کو پاکستان نے حالیہ برسوں میں خوبصورتی کے ساتھ حاصل کرلیا ہے۔

یہ بھی ایک خوش قسمتی ہے کہ یہ دونوں بڑی پارٹیاں یکساں طور پر معتدل مزاج ہیں اور قومی فکر رکھتی ہیں۔ ہمارے سیاست دانوں میں جس بات کی کمی ہے وہ خود اعتمادی ہے اور غالباً سیاسی دور اندیشی بھی۔ مصر اور الجزائر کے میں جو لاینحل تفرقہ پایا جاتا ہے انہیں اس پر غور کرنا چاہئے اور ایک عہد کے تحت عناد میں بھی تعاون کے کلچر کو فروغ دینا چاہئے۔ محترمہ بھٹو اور مسٹر نواز شریف اگر پاکستان میں جمہوریت کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں تو انہیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اپنی مخالفت میں وہ ایک دوسرے کی تکمیل کر رہے ہیں۔ ایک کا وجود دوسرے کے جمہوری وجود کے بغیر باقی نہیں رہے گا۔

("ڈان" 13 ستمبر 1992ء)

اقدار کا مسئلہ

صدر پاکستان کو یہ حق حاصل ہے کہ جمہوریت کی تعمیر کے لئے ملک کی تربیت کریں اور جمہوری اداروں کو اور روایات کو اور اقدار کو مستحکم بنائیں۔

گذشتہ ہفتے میں نے اسی کالم میں اداروں کے سوال پر اظہار خیال کیا تھا اور یہ دلیل دی تھی کہ گذشتہ چار دہائیوں میں انہیں تباہ کیا گیا اور ان پر جارحانہ حملے ہوئے عام شہریوں کی طرف سے نہیں بلکہ ان سرکردہ لوگوں کی جانب سے جو ریاست میں صاحب اختیار ہیں۔ پاکستان میں پارلیمانی حکومتوں کی تباہی کے ذمہ دار پانچ اسباب ہیں' جن کی اب تک نشان دہی کی گئی ہے اول' سیاست دان بے حساب بہکتے آئے ہیں' انہوں نے جمہوریت کی اخلاقیات کا اور قانون کی حکمرانی کا بالکل کوئی احترام نہیں کیا بلکہ ان کی توہین کی۔ دوئم فوج میں یہ رجحان رہا ہے کہ جونہی سیاست دان ناکام ہوئے اس نے فوراً مداخلت کر دی۔ اس مداخلت میں قومی مفادات کا نہیں بلکہ شخصی عزائم کی تکمیل کا جذبہ شامل ہوتا تھا۔ سوئم' آزادانہ سیاسی عمل میں جس طرح کے دباؤ آئے ہیں اور پشیمانیاں لاحق ہوئی ہیں' افسر شاہی نے ان کے مقابلے میں آمرانہ حکمرانی کی یقینی کیفیت کو ترجیح دی۔ چہارم' بالا دست غیر ملکی طاقت کو اس میں آسانی نظر آئی کہ نگران قسم کی حکومتوں سے معاملہ رکھیں جن کے یہاں رائے عامہ سے کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی اور جنہیں قومی مفاد کا بھی چیدہ خیال نہیں رہتا۔ پنجم' معاشرتی زندگی میں توازن پیدا کرنے والی ایسی کوئی طاقت موجود نہیں جو ریاستی سطح پر ان چاروں منفی طاقتوں کے اثرات دور کر سکے۔

غیر جمہوری اور جمہوری طاقتوں کے درمیان سیاسی زندگی میں جو عدم توازن پایا جاتا ہے' اس کی تہہ میں روایت اور اقدار کے بارے میں سوالات پوشیدہ ہیں۔ روایت' ادارے اور اقدار کے درمیان تعلق طبعی ہے۔ روایات کا دار و مدار بلاشبہ اقدار پر ہے۔ روایات جوں جوں پختہ ہوتی ہیں' وہ اقدار کو مضبوط اور مستحکم بناتی ہیں اور اداروں کے استحکام کی بھی ضامن ہوتی ہیں۔ اس کے جواب میں ادارے اقدار کو روبہ عمل لاتے ہیں' ان کی خلاف ورزی پر نظر رکھتے ہیں اور روایت کے احترام کو یقینی بناتے ہیں۔

اس طرح کسی سماجی اور سیاسی نظام کے استحکام کے لئے اور نشوونما کے لئے اقدار کی اہمیت مرکزی ہے۔ جب اقدار ٹوٹ پھوٹ جائیں تو سماج اور سیاسی نظام بھی زوال پذیر ہو جاتے ہیں اور بحران میں دھنستے

MashalBooks.org

چلے جاتے ہیں۔ عقائد کے ایک مجموعے کا نام اقدار ہے جو انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر سماجی اور سیاسی طرزِ عمل کے بارے میں موثر طور پر خبردار کرتے ہیں۔ ''موثر'' کے لفظ پر بطور خاص زور دوں گا' کیونکہ ہمارے معاشرے میں اقدار کے احترام پر جس قدر زبانی جمع خرچ سے کام لیا جاتا ہے اس پر پابندی اسی قدر کم دیکھنے میں آئی ہے۔ غالباً ایک ساعت بھی بیداری کے عالم میں ایسی نہیں گزرتی جس میں کوئی قومی شخصیت اسلامی یا جمہوری اقدار کی پاسداری پر زور نہ دیتی ہو۔ درحقیقت پبلک میں اس طرح کے سارے اعلانات سچائی کے آگے برائی کی جانب سے ہدیہ تحسین ہیں ورنہ جمہوری اور اس سے بڑھ کر اسلامی اقدار ہماری سیاسی اور بتدریج سماجی زندگیوں سے عنقا ہوتی جا رہی ہیں۔

وہ مجرد اصول' جن کا ہم اکثر و بیشتر اس قدر دعویٰ کرتے ہیں' انہیں اپنے انفرادی اور اجتماعی رویے میں شامل کرنے کی اہلیت اور خواہش رفتہ رفتہ ختم ہو گئی ہے' نتیجہ یہ کہ جمہوری اور اسلامی اقدار زواضح ہو کہ دونوں بڑی حد تک یکجان ہیں' ہمارے اجتماعی جنون کی زد میں سب سے پہلے تلف ہو جاتی ہیں۔ میں یہاں تین اقدار کا حوالہ دوں گا جو جمہوریت میں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں اور میرا یقین ہے کہ اسلام میں یہ تینوں موجود ہیں۔ رواداری' برابری اور انصاف۔

یہاں تین سوالات پیدا ہوتے ہیں' ایک یہ کہ رواداری' برابری اور انصاف حقیقتاً ہماری زندگی میں کس حد تک موجود ہیں؟ دوسرے' ہمارے یہ اصول کہاں تک تشنۂ تکمیل ہیں یا جزوی طور پر پورے ہوئے ہیں اور انہیں پوری طرح حاصل کرنے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟ تیسری بات یہ کہ ان اقدار کو بروئے کار لانے کے لئے اگر ہم محض برائے نام کوشش کرتے ہیں حالانکہ انہیں سر پر اٹھائے پھرتے ہیں تو ہماری ناکامی کی وجہ کیا ہے؟

رواداری کے معاملے میں ہمارا حالیہ ریکارڈ خوش قسمتی سے ملا جلا ہے۔ شہریوں کو تقریر اور اجتماع کی آزادی حاصل ہے۔ اخبارات اور دانشوروں کی طرف حکومت کا رویہ کہیں زیادہ رواداری کا ہے' اتنا کہ پاکستان کی تاریخ میں اس قدر پہلے کبھی نہ تھا۔ اس سے آزادی کا احساس پیدا ہوا ہے اور اس کا خوش آئند اثر ہوا ہے۔ پاکستان کے اخبارات پہلے سے زیادہ جان دار ہو گئے ہیں۔ ٹھیک ہے کہ ان میں لڑکپن کی لغزشیں ہیں اور ان اخبارات میں کبھی کبھار لاپروائی کا رویہ اور غلط رپورٹنگ کی مثالیں نظر آ جاتی ہیں لیکن کوتاہیوں کے باوجود یہ پریس ایک بہتر حکمرانی اور بہتر معاشرے کے فروغ میں بڑی حد تک مثبت کردار ادا کر رہا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ بہت سے مستند تربیت یافتہ اور مقصد کی لگن رکھنے والے نوجوان اس پیشے میں داخل ہوئے ہیں اور انہوں نے پاکستان میں صحافت کا معیار بلند اور اس کا مستقبل روشن کیا ہے۔

البتہ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ یہ بہتری اصلاً انگریزی زبان کے اخبارات میں آئی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ بتدریج یہ رجحان پھیل کر دوسرا ئکر اخبارات تک بھی پہنچ جائے گا۔ مزید یہ امید کی جاتی ہے کہ حکام

MashalBooks.org

میں اتنی فہم ہوگی کہ وہ ان صحافیوں کو ہراساں کرنے کی دیرینہ عادت ترک کردیں گے' جن کے قلم کی نوک انہیں چبھتی ہے اور فرماں برداروں کو در پردہ نوازنا بھی بند کردیں گے۔ انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ صحافت کا کردار ایک جمہوری معاشرے میں مقتدر اداروں کے مقابلے میں حریفانہ ہونا ہے' تنقید ان کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس کے آگے ازالہ حیثیت عرفی کا قانون ہے جس سے افراد کے حقوق کا تحفظ ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اقتدار سے دوستانہ مراسم رکھنے والے صحافی ہیں جو واقعی ریاست' معاشرے اور صحافت کے پیشے کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

لیکن رواداری' بہ اعتبار مجموعی ہماری سیاست میں مختلف سطحوں پر ناپید ہے۔ حکومت اور حزب اختلاف کے درمیان بد اعتمادی اور عدم رواداری اتنی شدید ہے کہ ہر روز جمہوری طرز عمل کی مبادیات بھی پامال کی جاتی ہیں۔ کسی بھی خود آگاہ جمہوریت میں یہ نہیں ہوگا کہ حکومت حزب اختلاف کے لیڈر کو کسی تباہ حال علاقے میں جانے کے لئے طیارہ استعمال کرنے سے روک دے۔ حکومت اور حزب اختلاف کے درمیان تعلقات کو جاگیردارانہ ذہنیت سے نکال کر جدید شہری ماحول میں لانے کے لئے اخبارات کو کوشش کرنی چاہئے۔

رواداری کا ماحول پیدا کرنے میں ایک بڑی رکاوٹ مذہبی فرقہ واریت ہے۔ یہ عناصر مذہبی بنیادوں پر دوسرے شہریوں کے خلاف زہر پھیلاتے رہتے ہیں۔ یہ نقصان دہ رجحان ادھر چند ہفتوں کے دوران میں عام لوگوں میں تشویش کا موجب بنا ہوا ہے۔ ان کی یہ تشویش خوش آئند ہے۔ یہاں تک باتیں ہو رہی ہیں کہ فرقہ وارانہ جماعتوں پر پابندی لگا دی جائے۔ یہ خیال درست نہیں ہے کیونکہ اس طرح دبانے سے یہی ہوگا کہ تحریک زیر زمین چلی جائے گی اور اسے عام لوگوں کی ہمدردی حاصل ہو جائے گی جس کی وہ مستحق نہیں۔ فرقہ وارانہ عدم رواداری کو قابو میں لانے کے دوسرے جمہوری' قانونی اور دانش مندانہ طریقے موجود ہیں۔

جمہوریت کے اس وقت تک کوئی معنی نہیں ہوں گے نہ اس کا کوئی جواز ہوگا جب تک اسے برابری اور انصاف کے ساتھ مشروط نہ کر دیا جائے۔ ان دونوں معاملوں میں پاکستان نے کوئی ترقی نہیں کی اور نہ یہ عناصر یہاں کے معاشرے میں موجود ہیں۔ عدم مساوات کی مثالیں یہاں چاروں سمتوں میں طبقاتی سطح پر اس سے الگ بھی' آزادی کے بعد ہی سے پینتالیس سال تک برابر پھیلتی آئی ہیں۔

برابری یا مساوات کے معنی صرف دولت' تعلیم' مکان' صحت اور مال و منال میں برابری نہیں۔ ان معنوں میں تو عدم مساوات کی صورت سبھی معاشروں میں کم و بیش موجود ہے۔ یہاں برابری سے مراد شہریوں کا احتیاج سے آزاد ہونا' زندگی گزارنے کے لئے سب کا مساوی حق' معاشرے میں آگے بڑھنے کے مواقع' صحت' تعلیم اور انصاف کے حصول ہیں۔ سب کے درمیان برابری' ان محدود سیاسی معنوں میں مساوات

ہمارے معاشرے میں مفقود ہے۔ اور اس کے بغیر جمہوریت ایک لفظ سے زیادہ کچھ نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ یہ ہم وطن شہریوں کے لئے ایک امید کے نام ہے جو ان کے دلوں میں آرزو بن کر زندہ ہے۔

ہم محض بہ لحاظ دولت ہی تقسیم نہیں ہوئے بلکہ زبان، مقام، تعلیم، طاقت کے وسائل اور ان سب کے سوا اپنے بچوں کے ساتھ توقعات کی بنا پر بھی تقسیم ہو گئے ہیں۔ انگریزی جو معاشرے میں سماجی روابط کا ذریعہ ہے، اب ایک طرح سے اشرافیہ کی زبان بن گئی ہے حالانکہ ہماری غلامی کے زمانے میں ایسا نہیں تھا۔ نو آبادیاتی حکومت کے افسران بالا سب سے الگ سرکاری کالونیوں میں رہتے تھے۔ ان کی مختصر سی تعداد بیشتر غیر ملکیوں پر مشتمل تھی۔ آج ہر شہر میں ایک طبقہ متمول لوگوں کا آباد ہے اور دوسری طرف نادار لوگ بستے ہیں۔ خوبصورت لوگوں نے نادار لوگوں کو باہر نکال دیا ہے۔ پاکستان میں متمول اور افلاس پر مبنی طبقاتی تقسیم کا یہ نقش بہت سے پہلوؤں سے جنوبی افریقہ اور اسرائیل کی ایسی ہی بستیوں سے بھی زیادہ بدہیئت نظر آتا ہے کیونکہ اس کا تعلق ملک کی داخلی کیفیت سے ہے اور یہ ناکامی بہت محکم اور دیرپا معلوم ہوتی ہے۔

ہمارے ملک میں کوئی قدرتی آفت بھی آتی ہے تو اس کا ایک غیر جمہوری پہلو ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر حالیہ سیلاب میں ایک مرد، ایک عورت اور ایک بچہ جو پاکستان کی نادار آبادی کی نمائندگی کرتے تھے کام آ گئے۔ یہی ہلاکت زدہ اکثریت ہے، جس کی بدولت ہمارے یہاں بچوں کی شرح اموات، ناخواندگی، خرابی صحت اور نیم خانہ زدگی اعداد و شمار کی رو سے دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ اس کے باوجود یہاں وہ لوگ آباد ہیں جو وافر اشیا پیدا کرتے ہیں، جن سے تھوڑے سے ہی لوگ اپنی آسائش کے اسباب حاصل کرتے ہیں وہی لوگ جو بے مصرف زندگی گزارتے ہیں۔

برابری اور انصاف طبعی طور پر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، جہاں برابری نہیں ہوگی وہاں انصاف بھی نہیں ہوگا۔ آپ کا جی چاہے تو عدالتی کارروائیوں پر ایک نظر ڈال لیجئے۔ اونچے درجے کے مجرموں کو ہمارے ملک میں بمشکل سزا ہوتی ہے البتہ نادار لوگوں سے جیلیں بھری ہوئی ہیں۔ جو لوگ سیاسی انتقام کا نشانہ بنتے ہیں، ان سے قطع نظر، اگرچہ شکر ہے کہ ان کی تعداد ان دنوں کم نظر آتی ہے، پولیس اور جاگیردار کی ایذا رسانی کا ہدف بھی یہی غریب لوگ ہوتے ہیں اور عدالتوں میں ان کی کم ہی شنوائی ہوتی ہے۔

نابرابری اور بے انصافی ہمارے دیرینہ امراض ہیں۔ جمہوریت سے ان کا فوری علاج تو ممکن نہیں، لیکن اس کی جڑیں اگر واقعی معاشرے میں پیوست ہو جائیں تو یہ بات ہمارے دیرینہ امراض کے علاج کی طرف پہلا قدم ہوگی اور انہیں ہرگز ہرگز بڑھنے نہیں دے گی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہی وہ افادی پہلو ہے جسے سمجھنے میں ہماری حکومتیں ناکام رہیں۔ یہ جو پرائیویٹائزیشن (نجی ہاتھوں میں دینے کا عمل) بڑے زور و شور سے جاری ہے، جب تک اس کے ساتھ ایسا قانون نہیں بنایا جائے گا، جو منصفانہ تقسیم کی ضمانت دے اور اقتدار

MashalBooks.org

کو انصاف کے ساتھ تقسیم کرے‘ اس وقت تک ہمارے معاشرے میں نابرابری اور بے انصافی کم نہیں ہوگی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ برائیاں بڑھتی جائیں گی۔ ہندوستان کی طرح ہم بھی ایک رسمی سی قانونی جمہوریت بن کر رہ جائیں گے‘ ہماری بدعنوان آمریت سے بہتر تو ہوں گے لیکن اس سے زیادہ نہیں۔

مولانا عبدالستار ایدھی کے اس بیان سے اختلاف مشکل ہے کہ یہ ملک بتدریج دو طبقوں میں تقسیم ہوگیا ہے۔ اپنی لاجواب سادگی کے ساتھ وہ اس کی تعریف ظالم اور مظلوم کے الفاظ سے کرتے ہیں۔ اس تقسیم کے دونوں جانب کھڑے ہوئے لوگ آزاد ہیں کہ اپنے طبقے کا انتخاب کرلیں‘ وہ ظالم رہنا پسند کریں گے یا مظلوم‘ اختیار ان کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ ان کے درمیان انتخاب نہیں کرسکتے تو یہ بھی ان کا انتخاب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا ایدھی اور ڈاکٹر اختر حمید خاں کی باتیں سن کر جمہوریت اور اسلام کے بارے میں کہیں زیادہ علم حاصل کیا جاسکتا ہے بہ نسبت ان سیاست دانوں اور ”اسلامی مفسروں“ کے جو بڑے چرب زبان ہیں اور محض ہوائی باتیں کرتے ہیں۔

(”ڈان“ 20 ستمبر 1992ء)

MashalBooks.org

حق کا سوال

پاکستان میں اداروں اور قدروں کی طرح جمہوری حقوق پر بھی مسلسل حملے ہوتے آئے ہیں۔ یہ حقوق پامال کرنے والے بھی عام لوگوں سے زیادہ سیاستدان اور وہ انتظامی عہدیدار ہیں جنہیں ہم نے جمہوریت کے پاسبان مقرر کیا ہے۔ یہ خلاف ورزیاں ہر روز ہوتی ہیں اور منظم اداروں کی سطح پر ہوتی ہیں۔ مثالیں لاتعداد ہیں۔ہم یہاں صرف ایک پر اظہار خیال کریں گے' یہ ہے شہریت کے حقوق۔

جمہوریت کا سنگ بنیاد شہری حقوق ہیں یہ ناقابل تنسیخ حقوق ہیں۔ قانون کے تحت تمام شہریوں میں برابری جمہوریت کا ایک اور بنیادی تصور ہے۔ پاکستان میں ان دونوں اصولوں کی خلاف ورزی کی جا رہی ہے۔ اور یہاں یہ کوئی غیر معمولی بات بھی نہیں۔ ہم میں جس بات کی کمی ہے وہ یہ کہ ان خلاف ورزیوں کو روکنے اور شہری حقوق کے احترام کی روایت قائم کرنے کی مستقل مزاجی سے کوشش نہیں کرتے۔ باخبر اقلیت میں بھی اس کا فقدان ہے۔ ایسے ماحول میں معمولات زندگی کی وسیع پیمانے پر خلاف ورزی ہو رہی ہو اور اسے چیلنج کئے بغیر اس کی عام اجازت ہو' وہاں جمہوریت پروان نہیں چڑھ سکتی۔ روایات بہر طور اقدار ہوتی ہیں' مستحکم ہوتی ہیں اور سماج میں ان کی جڑیں پیوست ہوتی ہیں۔

شہریت کا حق نا داروں کو تو دیا جا سکتا ہے لیکن ان سے چھینا نہیں جا سکتا۔ جمہوریتوں میں جہاں کسی مجرم کو اس کے سنگین جرم کی بنا پر سزائے موت تو دی جا سکتی ہے لیکن سزا یافتہ شخص سے اس کا شہریت کا حق چھینا نہیں جا سکتا۔ یہ حق صرف شہریوں کو حاصل ہے کہ شہریت کے حق سے دستبردار ہو جائیں اور کسی دوسری ریاست کی شہریت اختیار کر لیں۔

چند قوانین ایسے ہو سکتے ہیں جن کے تحت کوئی شہری اپنی شہریت سے محروم ہو سکتا ہے لیکن ایسے معاملات میں بھی جہاں شہریت سے محرومی درپیش ہو فرد کو کارروائی کا استحقاق ہو گا۔ ریاست کو نہیں۔ مثال کے طور پر بہت سی ریاستیں کسی فرد کو دوہری شہریت کا حق نہیں دیتیں۔ یعنی جب ایک شخص کسی دوسرے ملک کا شہری بن جاتا ہے تو اسے یہ انتخاب کرنا ہوتا ہے کہ اپنی گذشتہ شہریت ترک کر دے۔ بعض ریاستیں اپنے شہریوں کو اس بات سے منع کر دیتی ہیں کہ کسی دوسرے ملک کے لئے ہتھیار اٹھائیں اور یوں اپنا شہری حق گنوا بیٹھیں۔ ابھی زمانہ حال تک امریکہ میں ایسے قوانین موجود تھے لیکن ان استثنائی صورتوں سے قطع نظر جن کو

قانونی تحفظ دیا گیا ہےایک شہری کا حق شہریت نہایت محکم ہے۔

موجودہ دور کی تاریخ میں اس اصول کی خلاف ورزی صرف پولیس اسٹیٹ میں (ان ریاستوں میں جہاں پولیس کی حکمرانی ہو) ہوتی رہی ہے۔ جب نازی جرمنی نے اپنے لاکھوں یہودی شہریوں کو ملک بدر کیا تو اس طرح اس نے بربریت کی حدیں پار کرلی تھیں۔ جرمنی کے قبضے کے بعد بہت سی یورپی ریاستوں نے جن میں فرانس کی وچی (Vichy) حکومت بھی شامل تھی نازیوں کے دباؤ میں آ کر اپنے جپسی اور یہودی شہریوں کو ملک بدر کردیا اورانہیں عقوبتی کیمپوں میں پہنچا دیا گیا۔ عجیب اتفاق تھا کہ شہری حقوق کی پاسداری میں اگر کوئی ملک کھڑا ہوا تو وہ ایک مسلمان ملک تھا۔

مراکش فرانس کے زیر تولیت تھا' جہاں فرانس کے ریزیڈنٹ جنرل کی موثر حکمرانی تھی اور سلطان جوان دنوں محمد پنجم تھا صرف مراکش کی آزادی کی علامت کے طور پر برسرحکومت تھا۔ مراکش میں یہودیوں کی آبادی اچھی خاصی تھی۔ چنانچہ وچی کا حکم ملتے ہی ریزیڈنٹ جنرل نے بادشاہ سے کہا کہ وہ ایک فرمان پر دستخط کر دیں جس کے تحت یہودیوں کو مراکش سے ملک بدر کردیا جائے۔ سلطان محمد پنجم نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ اپنے شہریوں کے حقوق کا تحفظ میری بنیادی ذمہ داری ہے۔ ان کی اس مدافعت نے مراکش کی قومی تحریک کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ اور محمد پنجم جو موجودہ سلطان حسن دوئم کے باپ تھےاپنے عوام کے ہیرو بن گئے۔

گذشتہ ہفتے میرے مشاہدے میں یہ آیا کہ پاکستان کے سرکردہ سیاست دانوں اور دانشوروں میں شہری حقوق کے لئے احترام کتنا کم ہے۔ روزنامہ فرنٹیئر پوسٹ نے بہاریوں' یعنی مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد ان اردو بولنے والوں کی بحالی کے لئے جنہوں نے اپنی پاکستانی شہریت کو برقرار رکھنا چاہا' ایک کانفرنس منعقد کی۔ مسٹر رحمت شاہ آفریدی نے بنگلہ دیش میں وہ کیمپ دیکھنے' جہاں نکبت وافلاس کا دور دورہ ہے۔ اس تجربے سے وہ بہت متاثر ہوئے اور وہ چاہتے تھے کہ اس مسئلہ پر عام لوگوں میں کھل کر بحث ہو۔ ظاہر ہےان کا مقصد یہ تھا کہ ان بے زمین پھنسے ہوئے لوگوں کی مدد کی جائے لیکن اس کا الٹا ہی اثر ہوا۔ دوسرے روز ایک اخبار کی سرخی تھی۔ "بہاریوں کی واپسی کے خلاف اتفاق رائے۔"

لاہور میں فرنٹیئر پوسٹ کے اقامتی ایڈیٹر خالد احمد نے ایک نہایت پرمغز تعارفی تقریر میں وہ حقائق پیش کئے جن کی رو سے اس امر میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہی کہ پاکستانی شہریت کی خاطر بہاریوں کا دعویٰ جائز اور برحق ہے۔ چار سابقہ حکومتوں نے جن میں مسٹر بھٹو' ضیاء الحق' جونیجو اور مسز بےنظیر بھٹو کی حکومتیں شامل تھیں' بہاریوں کی واپسی میں لیت ولعل سے کام لیا اور مالی دشواریوں کا عذر پیش کیا' لیکن اس بات سے انکار کسی نے بھی نہیں کیا کہ وہ درماندہ لوگ پاکستان کے شہری ہیں۔ بلکہ مسٹر بھٹو نے 1974ء میں ان کو پاکستان لانے کا اقرار کرتے ہوئے ایک سمجھوتے کی ذمہ داری بھی لی تھی۔

کانفرنس کے بہت سے شرکا نے شہری حقوق جیسے دوراز کار معاملے کو سنجیدگی سے توجہ کے قابل نہیں سمجھا۔ بہاریوں کی دوبارہ بحالی کو شہریت سے الگ کرتے ہوئے دوسری بنیادوں پر اس کی مخالفت کی گئی۔ پنجاب جو پہلے ہی زیر بار ہو رہا ہے اس پر بوجھ بڑھ جائے گا (پروفیسر عزیز الدین) قومی رائے عامہ اس کے حق میں نہیں (چوہدری اعتزاز احسن)، سندھ میں آبادی کا عدم توازن پیدا ہوگا (سندھی سیاست دان) اور (بس بہت ہو چکا) (عبداللہ ملک)۔ میرے ایک دوست عبدالرشید نے میری بے چینی کو بجا طور پر محسوس کرتے ہوئے شگفتگی سے کہا۔ "پرانے کامریڈ تو ہوا کے رخ پر اڑ گئے اب وہ جنرل حمید گل اور مسٹر مجیب الرحمٰن سے ہمدردی کریں گے۔" سچ کہا۔

اس مسئلہ پر جب مزید بحث چلی تو چودھری اعتزاز احسن اور رسول بخش پلیجو دونوں وکلا نے اس پر زور دے کر کہا کہ جن لوگوں کا مسئلہ درپیش ہے وہ سرے سے شہری نہیں ۔ مسٹر پلیجو نے کہا کہ وہ سب غدار ہیں کیونکہ خانہ جنگی میں وہ مکتی باہنی کی بجائے پاکستانی فوج کے طرف دار تھے۔ اس کے بعد میں نے یہ سوال بہت سے ممتاز قانون دانوں کے سامنے رکھا اور کسی نے بھی اس امر میں شک نہیں کیا کہ قانون کے تحت وہ پاکستان کے شہری ہیں۔

مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ پاکستان میں حقوق انسانی کے کمیشن نے ایک کمیٹی بہاریوں کی حیثیت کے تعین کے لئے قائم کی تھی۔ کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی کہ بنگلہ دیش میں پھنسے ہوئے لوگ پاکستانی شہری ہیں۔ لیکن جب سندھی ارکان کی طرف سے اس پر احتجاج ہوا تو کمیشن نے اس مسئلہ کو داخل دفتر کر دیا۔ اس بات کی تصدیق کی خاطر میں جسٹس دراب پٹیل اور عاصمہ جہانگیر سے نہیں مل سکا ہوں۔ لیکن یہ خبر اگر درست ہے تو یہ بات افسوسناک ہے کہ ایک ادارہ جس کا تعلق حقوق انسانی سے ہے سیاسی دباؤ میں آ کر اپنی ذمہ داری سے دست بردار ہو جائے۔

سندھ کے ساتھ بہت بے انصافی ہوئی ہے۔ سندھی لوگ ستم رسیدہ اور کئی معاملات میں محصور ہیں ۔ وہ ہمارے تعاون اور حمایت کے مستحق ہیں بدقسمتی یہ ہے کہ سندھ کے بحران کا تجزیہ کرنے یا ان کے مسائل کا حل معلوم کرنے کی طرف سنجیدگی سے پوری توجہ نہیں دی گئی۔ دکھاوے کی حد تک علامتیں تو ابھاری گئی ہیں جب کہ حقیقی مسائل کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ان کی شکایات کو خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط ابھارنے اور اس سے بھی سوا مخصوص مفادات کے تحت ان کے اندیشوں کو مقصد براری کے لئے استعمال کر کے ہم ان کی کوئی خدمت نہیں کر رہے ہیں۔ محض علامتی فاصلے کے لئے اپنے اصولوں کو قربان کر کے ہم ملک کو اور اس کے مستقبل کو اور خود سندھ کے مستقبل کو کہیں زیادہ نقصان پہنچا رہے ہیں۔

شہریت کے حقوق نہ تو کسی قسم کی ترجیحات کے اور نہ کسی حقیقی یا خیالی اتفاق رائے کے تابع ہونے چاہئیں یہ ایک محکم اور ناقابل تنسیخ حق ہے اور یہی ہونا چاہئے ۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ہم یقیناً شائستہ سیاست کی

MashalBooks.org

حدود سے باہر نکل جائیں گے۔ اس معاملے میں بھی ایک اصول کی پابندی کرنے سے تو نہ بڑے خطرات لاحق ہیں۔ پاکستان کی آبادی میں ہر مہینے جو اضافہ ہو رہا ہے بے خانماں شہریوں کی ڈھائی لاکھ کی تعداد اس سے بھی کم ہے۔ علاوہ ازیں ان کو تو پنجاب میں بسایا جائے گا۔ ان کی بحالی کے مخالفوں کا کہنا یہ ہے کہ آخرکار وہ سندھ پہنچ جائیں گے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ لیکن یہ تشویش محض علامتی ہے' حقیقی نہیں' حقیقت یہ ہے کہ ہر سال کوئی تین لاکھ افراد ترک سکونت کر کے سندھ آ رہے ہیں۔

جہاں تک قانون کے تحت مساوات کے اصول کا تعلق ہے اس کی خلاف ورزی اکثر و بیشتر اور دنیا بھر میں شہریت کے حقوق کی پامالی اس سے بھی زیادہ ہو رہی ہے۔ اسرائیل جس کے جمہوری کردار کا مغرب کے ذرائع ابلاغ زور و شور سے برابر ذکر کرتے رہتے ہیں' اپنے عرب شہریوں کے ساتھ اور ان میں عیسائی اور مسلمان دونوں شامل ہیں' غیر مساوی سلوک کرتا ہے' جنوبی افریقہ میں جہاں نسلی تفریق کی پالیسی رائج ہے اور شکر ہے کہ مغرب میں اس کا جشن نہیں منایا جاتا' سیاہ فام باشندوں کو تو علامتی طور پر بھی مساوی سلوک سے محروم رکھا گیا ہے۔ بالآخر سیاہ فام نسل کے باشندوں کی آزادی کے لئے طویل اور سخت جدوجہد کے نتیجے میں اب وہاں کے حالات تبدیل ہونے لگے ہیں۔

امریکہ کے آئین میں اس کے زمانہ آغاز میں ایک ولولہ خیز کلیہ تسلیم کر لیا گیا تھا۔ وہ یہ کہ تمام شہری یکساں پیدا کئے گئے ہیں' لیکن اس اصول کی پابندی صرف اس سے انحراف کی صورت میں ہوئی۔ امریکی جمہوریت کے بانی بجائے خود غلاموں کے مالک تھے۔ اس کے باوجود آنے والی نسلوں کے لئے جدوجہد کی خاطر یہ روشنی کا ایک مینار تھا۔ امریکہ میں مساوی حقوق کی جدوجہد کبھی ختم نہیں ہوئی۔ اس کا تازہ ترین مظہر سول رائٹس کی تحریک ہے جس کی سربراہی مارٹن لوتھر کنگ اور میلکم ایکس جیسی مختلف شخصیات نے کی۔

پاکستان کے پہلے آئین میں مساوات کے اصول کو اس وقت زک پہنچی جب' ستم ظریفی یہ کہ اسلام کے نام پر ہمارے غیر مسلم شہریوں کے حقوق' خواہ کم ہی سہی لیکن محدود کر دئے گئے' لیکن اس وقت تو اسے تار تار کر دیا گیا' جب ذیڈ اے بھٹو نے احمدیوں کو قانونی طور پر غیر مسلم قرار دے دیا۔ مزید ستم ظریفی یہ کہ ضیاء الحق کے ساتھیوں نے بھٹو کی اس دین کو اس انتہائی منطقی حد پر پہنچا دیا۔ اب ہم اپنے ہی شہریوں کو قانون کے تحت اذیت دینے پر آ گئے ہیں۔ اس طرح آئندہ کے لئے ایک مثال قائم ہو گئی ہے جو اسلام اور جمہوریت دونوں کے منافی ہے۔ اب شیعوں کو غیر مسلم قرار دئے جانے کے لئے فرقہ وارانہ فساد پھیلایا جا رہا ہے۔ امید کی جانی چاہئے کہ کوئی اور سیاست دان اس مطالبے کو اپنی مقبولیت کے حصول کا ذریعہ سمجھ کر استعمال نہیں کرے گا۔

("ڈان" 27 ستمبر 1992ء)

MashalBooks.org

انصاف کے منافی قانون

سالہا سال تک میں نے اسے ایک مثالی پاکستانی سمجھا۔ وہ شخص جس نے آدمیت کے راستے میں حائل طاقت' دولت اور جہالت کی ساری رکاوٹوں کو پار کر دیا۔ چنانچہ جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ لاہور میں ہے تو میں اس سے ملنے کے لئے چلا گیا' وہ ضعیف العمر شخص بستر پر دراز تھا' ہڈیوں کا ایک بڑا ڈھانچا' گوشت سے خالی' میں گذشتہ موسم گرما میں اس سے مل چکا تھا۔ اس وقت وہ 79 سال کا تھا۔ وہ شگفتگی جو اس کے توانا شکن آلود چہرے پر نظر آئی تھی' جس سے اس کی جھریاں بھر جاتی تھیں' اب غائب ہو چکی تھی۔ اس کی وہ آنکھیں جن میں بچوں کی آنکھوں جیسی چمک تھی اور جو اس وقت دیکھنے میں آئی تھی' جب اس نے ہمیں وہ مکانات دکھائے جو نادار لوگوں نے اس کی مدد سے بنائے تھے آج ان آنکھوں میں تھکن تھی۔

میں نے بزرگ سے اورنگی کے بارے میں سوال کیا' حرکت وعمل سے بھرپور کراچی سے باہر اس گوٹھ کے بارے میں۔ کوئی دس لاکھ نکبت زدہ بستی کے مفلوک الحال لوگ جو وہاں آباد تھے اور جنہیں اس کی رہنمائی میں ایک نئی زندگی مل گئی تھی' لیکن ایک بار تو اسے مجبوراً ان کے مسائل سے الگ ہونا پڑا' دین کے خود ساختہ محافظوں کی بدولت اور ایک انتہائی افسوسناک قانونی موشگافیوں کے نتیجے میں۔ ارے اقبال صاحب' ان مقدموں سے جان چھوٹے تو کام کروں۔ ابھی تو بڑے کام تھے۔ لیکن اب تو عدالتوں کا چکر ہے۔ کراچی سے چھوٹا تو ملتان میں مہینوں پھنسا۔ اب ساہیوال جانا تھا۔ اسی انصاف کی تلاش میں۔ لیکن دل ناتواں نے مچل کر تڑپا دیا۔ انہوں نے شگفتہ لہجے میں کہا اور ان کی تھکی تھکی آنکھوں میں ایک پل کے لئے چمک لوٹ آئی۔ ظاہر تھا کہ خان صاحب نے اس زبردست حملہ قلب کے طربیہ بیان سے بھی لطف حاصل کیا۔

ہم نے ان کے مقدمے کی کارروائی پر مختصر گفتگو کی۔ ان کا خیال تھا کہ جس حد تک برا ہونا تھا' وہ ہو چکا۔ ملتان کے مقدمے کا تبادلہ ساہیوال کر دیا تھا جہاں منصفانہ سماعت کی امید کی جاتی تھی۔ ان کی پیروی اپنے طور پر رضا کاظم کر رہے تھے جو ایک نامور وکیل ہیں۔ قید کا امکان بہت دور تھا اور سزائے موت دور تر" یقیناً اہم بات یہ ہوئی کہ وہ پوسٹر جو کراچی کی دیواروں پر ہزاروں کی تعداد میں چسپاں کئے گئے تھے اور جن میں ان کا تقابل سلمان رشدی سے کرتے ہوئے واجب القتل قرار دیا گیا تھا' ایک عدالتی حکم کے بعد واپس لے لئے گئے تھے۔ اس طرح ان کے خاندان کے افراد کو ایک لمحے کے لئے سکون کا سانس لینا نصیب ہوا

تھا۔

انہوں نے لاہور میں آرام کیا تھا اور اب 28 ستمبر کو کراچی واپس جا رہے تھے۔ 29' تاریخ کو کراچی میں عدالت نے طبی بنیاد پر مقدمے کی سماعت کی تاریخ آگے بڑھا دی۔ ان کا دل اپنی امکانی صلاحیت سے پچیس فیصد کم کام کر رہا تھا۔ اس کے باوجود ایک فوجی افسر اسی رات پولیس کے سپاہیوں کا ایک دستہ لے کر آئے اور انہیں گرفتار کر لیا' ان کے ساتھ ایک پنشنر حسین شفیع بھی تھا' اس کی موجودگی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے خان صاحب کے ساتھ کام کیا تھا اور وہاں سے نکالے جانے کے بعد انتقام لینے پر اتر آیا تھا۔ کیپٹن کے پاس کوئی وارنٹ گرفتاری نہیں تھا اور عزیز بھٹی پولیس اسٹیشن پر پولیس افسروں نے خود اپنی لاعلمی کا اظہار کیا کہ نہیں معلوم یہ گرفتاری کیوں ہوئی تھی۔ وہ تو صرف فوجی احکام کی تعمیل کر رہے تھے۔ جب اعلیٰ حکام نے جو غالباً خان صاحب کے مداحوں میں سے تھے مداخلت کی تو انہیں رہا کر دیا گیا۔ قبل ازیں اسی طرح ایک بار رات کے وقت انہیں گرفتار اور پھر رہا کر دیا گیا' دونوں اس بار سفارش کی بناء پر۔

ان کی کہانی بہت طویل ہے' یہاں اس کا بیان ممکن نہیں۔ پوری کہانی لکھنے کے لئے تو کافکا جیسا کوئی اہل قلم چاہئے۔ یہ اپنی علامت میں پاکستان کی بھی کہانی ہے۔ (1) یہ انحطاط درجے کی فراخدلی اور کینے کی علامت ہے جو ہمارے اندر موجود ہے۔ (2) قانون کو جس طرح اسلام کے نام پر مسخ کیا گیا ہے' یہ اس کی بھی علامت ہے۔ (3) فرقہ پرست خدائی فوجدار حکومت کے اندر کس حد تک گھس آئے ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے۔ (4) ہماری ریاستی انتظامیہ کتنی نازک ہے کہ شر کے آگے بے بس ہو جاتی ہے۔ لیکن مجھے پہلے اختر حمید خاں کا تعارف کرا دینا چاہئے جنہوں نے زندگی کا سفر اس طرح طے کیا ہے کہ ہر اچھے مسلمان کی خواہش ہونی چاہئے کہ ان کے بچے ویسے ہی ہوں۔

ان دنوں نوآبادیاتی حکمرانی کے دور میں جب انڈین سول سروس کو اعلیٰ ترین سماجی حیثیت حاصل تھی' وہ ایک آئی سی ایس افسر ہو گئے' کوٹے کی بنیاد پر نہیں بلکہ اپنی اہلیت کی بنا پر کیمبرج میں ادب اور تاریخ کے مضامین پڑھنے کے بعد انہوں نے بنگال میں خدمات انجام دیں: جہاں باریسال اور میمن سنگھ اضلاع کے پرانے لوگ آج بھی بڑا صاحب کی کہانیاں سناتے ہیں' جو ایک رحمدل بادشاہ کی طرح حکومت کرتا تھا اور عام لوگوں کے درمیان ایک فقیر کی طرح گھومتا پھرتا تھا۔ بنگال کے قحط نے اس پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ اس نے نوآبادیاتی نظام کی سفاکی کا خود مشاہدہ کیا تھا اور نادار لوگوں کی زندگیوں کا بھی جائزہ لیا تھا جو کتنے کمزور اور بے بس تھے۔ لوگوں کی خدمت کے لئے اسے ملازمت چھوڑنی پڑی۔ 1945ء میں اس نے استعفیٰ دے دیا۔

میں نے سنا ہے کہ جب بنگال کے گورنر نے جسے اس' استعفے سے بڑی حیرت تھی' سوال کیا کہ تم یہ ملازمت کیوں چھوڑ رہے ہو تو جواں سال افسر نے جواب دیا: ''پہلے میں آپ کی خدمت کر رہا تھا' اب اپنے خدا کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔'' انگریز نے جواب میں کہا تھا: ''درست میں خدا کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا۔''

ممکن ہے یہ کہانی غیر مصدقہ ہو لیکن یہ بات ان کے کردار میں شامل ہے۔ اختر حمید خاں ایک صاف گو انسان ہیں۔ ان کی ذہنی اور اخلاقی نشوونما میں مذہب کی مرکزی حیثیت ہے۔ اسلام پر ان کی فہم بہت گہری ہے اور اس کا مطالعہ وسیع ہے۔

انڈین سول سروس سے مستعفی ہونے کے بعد وہ تالہ بنانے والے ایک کاریگر کے یہاں پھیرے والے بن گئے' ان کی کوشش یہ تھی کہ خود کو طبقاتی تفریق سے الگ کر لیں۔ اس نوع کی بیشتر ارادی کوششوں کی طرح اپنے طبقے سے الگ رہنے کی یہ کوشش بھی زیادہ عرصے برقرار نہیں رہی' لیکن ان پر اس کا گہرا اثر ہوا۔ وہ وہاں تھے جب ڈاکٹر ذاکر حسین نے جو بعد میں ہندوستان کے صدر مقرر ہوئے انہیں جامعہ ملیہ کے تدریسی عملے میں شامل کر لیا۔ 1947ء میں کراچی چلے گئے' جہاں سے مشرقی پاکستان پہنچے۔ وہاں انہیں وکٹوریہ کالج کومیلا کا پرنسپل بنا دیا گیا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں دیہی ترقیات کے شعبے میں ان کے اندر گہری دلچسپی پیدا ہوئی۔

ان کا دوگونہ پروگرام ایک تو دیہی کاموں کے بارے میں تھا اور دوسرا قرضے اور تربیت کے متعلق' جس سے ایک انتہائی ذہین آدمی کی موجودگی کا پتہ چلتا تھا۔ یہ بہت سادہ لیکن نمایاں طور پر موثر تھا۔ ان کا پروگرام پورے مشرقی پاکستان میں پھیل گیا وہ شخص اور اس کا ضلع اور وہ اکیڈمی جو اس نے قائم کی تھی' دنیا بھر میں مشہور ہو گئے۔ امریکہ کی کئی اعلیٰ درجے کی یونیورسٹیوں میں کومیلا کے تجربے کی تدریس ہونے لگی۔ ان کا نام دیہی ترقیات کے دیسی پروگرام کا بدل بن گیا۔ انہیں ستارہ پاکستان اور رامون میگا سے ایوارڈ اور کئی دوسرے اعزازات دیئے گئے۔

1971ء میں پاکستان کے دونیم ہونے کے بعد انہیں تیسری بار ہجرت کرنی پڑی۔ یہاں انہوں نے ایک پختون علاقے میں کام شروع کیا۔ یہ جگہ داؤدزئی تھی جہاں ان کی غیر معمولی کامیابی ہی ان کی ناکامی بن گئی۔ داؤدزئی' نیشنل عوامی پارٹی کا انتخابی حلقہ تھا۔ اس لئے ذوالفقار علی بھٹو نے انہیں وہاں سے نکال دیا۔

مشی گن اسٹیٹ یونیورسٹی نے خان صاحب کو مدعو کیا اور انہیں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری' اس کے ساتھ انہیں سوشیالوجی کے شعبے کی سربراہی پیش کی۔

وہ ایسٹ لینگ میں تین سال رہے اور پھر واپس کراچی آ گئے تاکہ یہاں شہر کے ایک ایسے علاقے میں کام شروع کریں' جہاں ترقیاتی کام غیر ممکن نظر آتا تھا۔ یہاں ایک بار پھر ماہرانہ سادگی اور سماجیات کے بصیرت افروز علم کا اشتراک دیکھنے میں آیا اور پھر مفصل نظم وضبط' حیران کن حد تک' عالمی بنک نے دنیا بھر میں جن دو شہری ترقیاتی منصوبوں کا انتخاب کیا ہے' ان میں سے ایک اورنگی ہے' جو اس لائق ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے اور اس کی تقلید بھی کی جائے۔ اختر حمید خاں نے شعیب سلطان خاں کو ساتھ لے کر

MashalBooks.org

پاکستان میں ایک اور نہایت کامیاب شہری منصوبے کا تصور پیش کیا اور اسے عملی شکل دی یہ ہے شمالی علاقے کا آغا خاں رورل سپورٹ پروگرام۔

1988ء سے انہیں رہ رہ کر قتل، قید اور قانونی چارہ جوئی کی دھمکیاں دی جاتی رہی ہیں۔ انہیں پہلے تو تعزیرات پاکستان کی دفعہ 245 کے تحت پیغمبر اسلام حضرت محمد صلعم کے نام سے توہین برتنے کا ملزم قرار دیا گیا۔ اس کے بعد الزام آیا کہ انہوں نے حضرت علیؓ کی توہین کی۔ یہ نوآبادیاتی دور کا ایک قانون ہے جسے فرقہ پرستی کو تقویت دینے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ برطانوی قانون میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلق کا خیال کرتے ہوئے مذہبی جذبات کی اہانت کو یا دوسرے فرقے کی جائے عبادت کی توہین کو جرم قرار دیا گیا تھا۔ بھٹو کی قانون سازی کے بعد جس کے تحت احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا تھا، ضیاءالحق کی آمریت میں مذکورہ قانون کی دونوں شقوں میں ترامیم کی گئی تھیں۔ دونوں الزامات کے تحت سزائے موت، جسے عمر قید میں بدلا جا سکتا ہے رکھی گئی ہے۔ چنانچہ اس جرم کے تحت سیکڑوں احمدی جیلوں میں پڑے سڑ رہے ہیں۔

پہلے جرم کا ثبوت خان صاحب کا ایک مبینہ انٹرویو ہے جسے تکبیر نے 1988ء میں جو جماعت اسلامی کا حامی جریدہ شائع کیا۔ اس پر ایک منظم ہمہ جہتی مہم شروع کر دی گئی۔ ایک لاکھ پوسٹر جن میں سزائے موت کا مطالبہ کیا گیا تھا آناً فاناً سامنے آ گئے۔ کئی سو علماء نے اختر حمید خاں کی مذمت میں فتوے صادر کرائے۔ قاضی حسین احمد نے ضیاء پر دباؤ ڈالا کہ فوری کارروائی کریں۔ لیکن ثبوت خاصا ناقص تھا۔ کراچی میں ایک پولیس تھانے میں ناکافی شواہد کی بنا پر مقدمہ درج کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ ایف آئی اے (وفاقی تحقیقاتی ایجنسی) نے ثبوت کو بہت کمزور پایا۔ چنانچہ معاملہ داخل دفتر ہو گیا۔ اس پر سرگرم مخالفین نے طرح طرح کی موشگافیوں کے تحت اور جماعت اسلامی کے روابط استعمال کرتے ہوئے ملتان میں مقدمہ درج کرایا۔ جس نے اس کی لرزہ خیز روداد سنی ہے خان صاحب یا ان کے وکیل سے سنی، کہ وہاں کس طرح عدالتی بے قاعدگی برتی گئی۔ چنانچہ خان صاحب کے وکیل نے مقدمہ ساہیوال منتقل کرا دیا۔

اس دوران میں اختر حمید خاں کے خلاف ایک اور مقدمہ کراچی میں درج کرایا گیا، اس لایعنی الزام کے تحت کہ انہوں نے ایک نظم میں جو بچوں کی ایک کتاب میں شائع ہوئی حضرت علیؓ کی توہین کی ہے۔ ایک ہلکی پھلکی نظم میں یہ ایک بیوقوف آدمی کا قصہ ہے جس نے ایک شیر پالا اور بالآخر شیر نے اسے پھاڑ کھایا۔ اس نظم کی 1982ء میں اشاعت کی بنا پر اسے بھٹو اور ضیاء کی در پردہ حکایت بھی قرار دیا جا سکتا تھا، لیکن ایک نہایت بیمار ذہن کو ہی اس میں حضرت علیؓ کا حوالہ نظر آ سکتا تھا۔

استغاثہ دائر کرنے والوں کی بنیاد شیر خدا کے استعارے پر تھی۔ یہ واقعی حیران کن بات تھی لیکن اس رکیک اور ہولناک ڈرامے کے محرکات کیا تھے۔ اس میں ہمارے لئے کیا سبق ہے۔ اس میں چار نکات اہم

MashalBooks.org

نظر آتے ہیں۔

اول صاف ظاہر ہے کہ ایک سابق ملازم نے اختر حمید خاں سے جو خفا تھا اور صاحب وسیلہ بھی تھا' ان کے درپے آزار ہوا۔ خان صاحب کی درخواست پر سندھ ہائیکورٹ نے مبین افضل کو ہدایت کی کہ وہ خان صاحب کو رسوا کرنے سے باز رہیں۔ چنانچہ پوسٹر ہٹا دیئے گئے' لیکن اس نے اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر جیسا کہ ایک فوجی افسر کے ذریعے خان صاحب کی غیر قانونی گرفتاری کی تازہ ترین مثال موجود ہے' اپنی معاندانہ سرگرمیاں جاری رکھی ہوئی ہیں۔ ایک بار پھر یہ ظاہر ہو گیا کہ فوج بھی نجی مقاصد کے لئے ریاست کی طاقت غیر قانونی طور پر استعمال کر سکتی ہے۔ پاکستان میں آئندہ حکمرانی کے لئے یہ ایک برا شگون ہے۔

دوئم: پہلے تو یہ بات مجھے بہت عجیب لگی کہ مذہبی جماعتیں اور مذہبی شخصیات مستقل طور پر ایک ایسے شخص کے درپے آزار ہو سکتی ہیں' جس نے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور ملک کے لئے اتنے اچھے کام کیے۔ جماعت اسلامی کے حوالے سے تو یہ بات اور بھی عجیب لگی جس کی تنظیم سوجھ بوجھ اور معقولیت پر مبنی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک وسیع تناظر میں ان کا ایک سوچا سمجھا مقصد ہے۔ جس قانون میں انہوں نے ترمیم اور توسیع کروائی ہے' اس کے تحت سزا دلوا کر وہ ایک مثال قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس ملک میں اسلام کے نام پر قانون کو مسخ کیا گیا ہے اور حقیقی طور پر جو مسخ کرنے والے ہیں' وہ اس عمل کو مستحکم بنانا چاہتے ہیں۔ ایک آزاد فکر اور قانون کی پابند جمعیت ایسے معاملات میں اگر شد و مد سے شامل ہو جائے تو میرا خیال ہے' اس کی بہترین وجہ وہی ہو گی اور ہمارے لئے یہ موقع بہت اہم ہے کہ ان غیر اسلامی اور غیر جمہوری قوانین کی تنسیخ کے لئے جدوجہد کریں۔

سوئم' اختر حمید خاں میں کچھ ایسی باتیں ہیں' جو اس نئی اسلامی نظریہ سازی کے لئے ناقابل برداشت ہوں گی۔ خان صاحب اسلام کو جانتے ہیں' وہ عربی دان ہیں اور اس ضمن میں بڑے کشادہ نظریات رکھتے ہیں۔ وہ الغزالی یا ابن تیمیہ کے مقابلے میں افصارانی اور ابن العربی سے خود کو قریب تر پاتے ہیں۔ وہ تصوف کے تقدیری اور جبری مدرسہ فکر کے قائل ہیں اور تعزیری نکتے کو چنداں اہمیت نہیں دیتے۔ یہ اختلافات بہت اہمیت اختیار کر لیتے ہیں کیونکہ وہ بہت سے حلقوں میں اپنا رسوخ رکھتے ہیں اور لوگوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اورنگی میں بہت سی عورتوں نے کارکنوں میں شمولیت اختیار کی ہے اور محلے کی مساجد کے لاؤڈ سپیکر سے برتھ کنٹرول کے موضوع پر ہونے والے تنظیمی جلسوں کا اعلان بھی سننے میں آتا ہے۔ وہ جدید فکر کے لوگ اور آزاد خیال مسلمان جو

ان نئی رجعتی تحریکوں کے باعث تشویش میں مبتلا رہتے ہیں' انہیں اختر حمید خاں کے گرد اکٹھا ہونا چاہیئے ان کو چاہیئے کہ خان صاحب پر اپنے یقین کا اظہار کریں بلکہ اس ملک میں ان کے ساتھ پورا تعاون کریں۔ آخر پاکستان میں ایک اختر حمید خاں دفاعی کمیٹی کیوں نہیں بنائی گئی۔ ہم یہ مطالبہ کیوں نہیں کرتے کہ ان کے

خلاف مقدمات کوعدالت سے خارج کیوں نہیں کر دیا جاتا۔

جہاں تک خان صاحب کا تعلق ہے میں ان سے دست بستہ عرض کروں گا کہ اب آپ دل ناتواں پر مزید بوجھ نہ ڈالیں۔ آپ نے ایک اعلیٰ مقصد کے لئے اپنی زندگی کو بہت ہلکان کیا ہے۔ آپ کو معلوم ہو جانا چاہئے کہ آپ خود ایک اعلیٰ مقصد ہیں۔

(''ڈان'' 4 اکتوبر 1992ء)

MashalBooks.org

معاشرے میں دانشور کا کردار

فنکاروں اور دانشوروں کا کاروبار یہ ہے کہ اپنے دماغ سے کام لیں' جان داروں میں جو چیز انسانوں کو جانوروں سے ممیز کرتی ہے' وہ یہی دماغ کے استعمال کا طریقہ ہے' اور تہذیب کی سطح کیا ہے' اس کے درمیان تفریق ادب اور فن کے کارناموں' اقتصادی خوش حالی اور اخلاقی انداز فکر کی بنیاد پر ہوتی ہے کہ دانش کے وسائل کو کس حد تک اور کس انداز سے استعمال کیا گیا۔ یہ ایک انتہائی پیچیدہ مضمون ہے۔ اس کے متنوع پہلو ہیں۔ یہاں میں صرف ایک پہلو پر گفتگو کروں گا' جسے میں اہم سمجھتا ہوں۔ اس کا تعلق تصور سے ہے' جو کسی طرح غیر متنازعہ بھی نہیں کہ دانشور کی خاص ذمہ داری حق اور صداقت کو نافذ کرنا اور بدی اور بے انصافی کو روکنا ہے۔ یہ دلیل جو ظاہر ہے' اخلاقی ہے فنکاروں اور دانشوروں میں اقرار اور مزاحمت کے ایک مستقل اشتراک کا تقاضا کرتی ہے۔ وہ فنکار' شاعرانہ دانشور جو یکجائی کے اس تصور کو نظر انداز کر دیتے ہیں اس سے ان کا فن متاثر ہوتا ہے' دانش منجمد ہو جاتی ہے' اور عام لوگ مستقبل سے امید رکھنا اور اعتماد کرنا چھوڑ دیتے ہیں' اقرار اور انکار کے درمیان یہ تال میل فن کا حاصل' تخلیق کا محرک اور جمالیات کی روح ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو تاریخ کو بچاتی ہے' اجتماعی ذہنوں کو رنج اور رسوائی کی اذیت سے نجات دلاتی ہے۔ اس طرح فنکار اور معمار روح عصر کے ایسے ابدی اور عالمگیر مجسمے تعمیر کرا دیتے ہیں' جن کا مقابلہ کوئی مورخ نہیں کر سکتا۔ اس وقت میرے ذہن میں گویا کہ وہ تصویریں ہیں' جو اس نے نپولین کی فوجوں کے خلاف مزاحمت کے موضوع پر بنائیں۔ اور پکاسو کی گورنیکا (Guernica) ہے مظہر امہ ریمبراں کے بنائے ہوئے وہ بے رحم چہرے ہیں' جو اس نے خیرات خانے کے متولیوں کے بارے میں بنائے' جہاں وہ رہتا تھا۔

یہاں میں ایک ذاتی بات کہتا چلوں۔ سال کی وہ تین دہائیاں جو میں نے ملک سے باہر گزاریں' جب ایوب خان' یحییٰ خان' ذوالفقار علی بھٹو اور محمد ضیاء الحق برسر حکومت تھے' ان سب نے مجھے اس ملک سے الگ کر دینے میں بہت کچھ کیا۔ ان کے برعکس شاعر مجھے یہاں کے معاشرے سے قریب لے آئے۔ وہ اہم شخصیات یعنی وی وی آئی پی' جن کے لئے ٹریفک رک جاتی ہے' انہوں نے نہیں بلکہ حبیب جالب کی مترنم آواز نے ہماری تاریخ میں عظمت کے نایاب لمحے چھوڑے ہیں' جب اس نے کہا۔

تیرے آئین کو' ایسے دستور کو' میں نہیں جانتا' میں نہیں مانتا

اور فیض احمد فیض

ہر حلقۂ زنجیر میں اپنی زبان رکھ دی

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
لبوں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

آمر تو بھلا دیئے جائیں گے لیکن ان کے بعد فیض اور جالب ہمارے دلوں میں مدتوں زندہ رہیں گے اور ہمارے شعور کی تعبیر کرتے رہیں گے ان کی صلاحیتیں کوئی غیر معمولی نہیں تھیں۔ بلکہ تنقید کی نظر سے دیکھا جائے تو جالب کوئی عظیم شاعر نہیں تھے۔ ان کے بہت سے معاصرین کی صلاحیتیں ان سے زیادہ تھیں۔ پھر بھی جالب کو زندگی کے عالمگیر رشتے کے تعلق سے اور اس بنا پر کہ اس نے ظلم اور بے انصافی کی بے لاگ مخالفت کی ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ بلاشبہ فیض عظیم تر شاعر تھے لیکن ان کے مقابل تو اور بھی شاعر تھے، جن میں راشد اور میرا جی شامل ہیں، لیکن فیض نے جس طرح ہمارے دلوں پر اثر کیا، کسی اور جدید شاعر نے نہیں کیا۔ اگر میں ان کی غیر معمولی شعری توانائی کو بیان کرنا چاہوں تو میں سب سے پہلے ان کی انسانی خوبیوں کا ذکر کروں گا۔ فیض کی ان خوبیوں میں جالب بھی شامل تھے، اور انہی میں ان کی مشترک عظمتیں شامل ہیں۔

دانشوروں اور فنکاروں نے انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ محصور قوموں کے لئے روشنی کے مینار کا کام کیا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ وہ تازہ ترین مثالیں بوسنیا سے پیش کروں۔ اوسلوبوڈرجے (Osloboderje) بوسنیا کا ایک اخبار ہے۔ اس نے دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں خفیہ طور پر اپنی اشاعت کا آغاز کیا۔ یہ ان فریقوں کا ترجمان تھا جو یوگوسلاویہ پر غاصبانہ تسلط کے خلاف لڑ رہے تھے۔ جب یوگوسلاویہ ٹوٹ گیا تو اس نے بوسنیا کی صحافت ایک سیکولر ملک کے طور پر کی، جہاں مختلف ملی گروہوں کے لوگ آباد تھے۔ اس اخبار نے وہی کیا، جس کی تبلیغ کرتا آیا تھا۔ اس کا ایڈیٹر ایک مسلمان ہے۔ نائب مدیر ایک عرب خاتون ناقابلِ یقین حد تک دلیر، باقی عملے میں ملے جلے لوگ، مسلمان، سرب اور کروٹ، چنانچہ یہ اخبار سرب قوم پرستوں کا نشانہ بن گیا۔ اسے نشانہ بنالینا بہت آسان تھا، کیونکہ اس کے دفاتر سراجیوف کی "وادی مرگ" میں واقع تھے یعنی سرب گولہ اندازی کی زد پر۔ اس اخبار نے اور اس کے عملے نے بہت چرکے کھائے لیکن اس کی اشاعت میں ایک دن کا بھی ناغہ نہیں ہوا۔ کبھی کبھی وہ ایک ہی صفحے پر شائع ہوا۔ اس طرح اوسلوبورین بوسنیا والوں کے عزم کی علامت بن گیا۔ سراجیوف کے باشندوں کا یہ عزم کہ وہ زندہ رہیں گے اور بوسنیا کا یہ استقلال جس کی بنا پر سرب ان کی اقدار کو شکست دینے میں ناکام رہے۔ مثال بن گئے۔ میں نے اخبار کے ایڈیٹر کمال کریسپک سے پوچھا، آپ اپنا اخبار سراجیوف سے باہر کیوں نہیں لے جاتے۔ وہ

MashalBooks.org

ابھی بم کے حملے میں بال بال بچے تھے' سادگی سے جواب دیا: ''ہم یہ نہیں کر سکتے۔ اوسلو یورین روشنی کا مینار ہے۔''

دوسری مثال ایک نوجوان معمار کی ہے۔ گذشتہ سال ایک نمائش ''سراجیوف : ماضی' حال اور مستقبل'' کے عنوان سے پیرس میں اور پھر نیو یارک میں ہوئی' یہاں میں نے وہ نمائش دیکھی۔ سراجیوف یونیورسٹی میں فنِ تعمیر کے طلبہ نے اس کا اہتمام کیا تھا۔ اس کے تین حصے تھے ایک وہ جس میں طلبہ نے از سرِ نو تعمیرات کی تھیں' ان کے فوٹو منظر' خاکے اور پیمانہ' یعنی ایک تباہ شدہ شہر کا احوال جیسا کہ وہ پہلے تھا۔ دوئم' ایک ایک گلی کی تباہ حالی جزئیات کے ساتھ' جیسا کہ سرب بمباروں نے گولے بازوں نے سراجیوف کو تباہ کیا۔ سوئم انہوں نے سراجیوف کی نئی تعمیر کا مفصل منصوبہ' تعمیراتی نقشوں اور کاغذ کے ماڈلوں کی مدد سے بنایا تھا۔ یہ سب نہایت حیران کن تھا۔ میں نے ان کے پروفیسر صاحبان میں سے ایک سے پوچھا' کیا نمائش کے لئے آپ نے اس پر کام کیا تھا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: ''بالکل نہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگوں کو اچھا' برا اور حیران کن سب کچھ دکھائیں۔'' خوش قسمتی سے ہمارے ملک نے اور اس کے عوام نے نسلی خون ریزی کا سامنا نہیں کیا۔ ہم تو لالچ' اقتدار اور دولت کے شکار ہیں۔ یہ تو ہمارے اندر کی دیمک ہے جو معاشرے کے وجود کو چاٹ رہی ہے۔ ہمیں اسے اس طرح نہیں بچا سکتے کہ خود بھی دیمک بن جائیں۔ ہمیں اس طرح ابتدا کرنی ہوگی کہ پہلے اپنے وجود کے خانوں کو ذہنی اور پیشہ ورانہ خانوں کو دیمک سے پاک کریں۔ ان سب کے الگ الگ نام ہیں۔ اقتدار تک رسائی کی ہوس۔ لالچ' اسرافیت' بے حسی۔

تخلیق اس وقت دم توڑ دیتی ہے جب دانشور اور فنکار اقتدار کا قرب حاصل کرنے لگیں۔ ازمنہ وسطیٰ نے دو طرح کے شاعروں کو دیکھا ایک وہ جو شاعرالخلافہ تھے یعنی اقتدار کے شاعر' دارالخلافہ میں رہتے تھے اور خلیفہ یا اس کے وزیروں اور درباریوں کے لطف و کرم سے فیض یاب ہوتے تھے۔ وہ اپنی اہمیت کے زعم میں مبتلا اور خود کو سرپرستی کا بجا طور پر مستحق سمجھتے تھے۔ فن کے لحاظ سے وہ پیچھے رہ جاتے تھے اور ان کی صلاحیت صرف ہجو اور قصیدہ لکھنے کے قابل رہ جاتی تھی۔ پھر شاعرالامامہ' وہ شاعر ہوتے جو رہنمائی کرتے۔ مضافات میں اور بیشتر معمولی حالات کے اندر زندگی گزارتے' معاشرے کے دل کی دھڑکنوں سے بہت قریب ہوتے۔ وہ اقتدار کے آگے سچ بولتے تھے۔ یہی وہ شاعر تھے جو ہمارے حافظے میں اب تک محفوظ ہیں۔

اٹلی کے ایک مارکسی فلسفی انتونیو گرامچی نے اس کی مثال ہماری صدی سے پیش کی ہے اس نے ریاست اور شہری معاشرے کے درمیان امتیاز کرتے ہوئے انہیں دو بالکل مختلف اکائیاں قرار دیا ہے۔ گرامچی نے تین بنیادی نتائج اخذ کیے ہیں۔ (1) جب شہری معاشرہ (اس میں مختلف پیشوں کے لوگ' ادب اور فن کے ادارے اور انجمنیں شامل ہیں) کسی چوں و چرا کے بغیر اطاعت کرنے لگیں یا ریاستی دباؤ کے تحت

MashalBooks.org

خاموش ہو جائیں تو مکمل حاکمیت پھیل جاتی ہے۔ جب شہری معاشرے میں بہت سے اداروں اور انجمنوں کی موجودگی میں چہل پہل کی کیفیت ہو اور ان کا تعلق ریاستی اداروں کے ساتھ ناقدانہ انداز سے ہو تو جمہوریت فروغ پاتی ہے۔ (۴) جب ریاست اور معاشرہ اپنی ساخت میں اور تہذیبی طور پر معاندانہ تعلق رکھتے ہوں تو خانہ جنگی اور نزاع کے حالات پیدا ہو جاتے ہیں اور معاشرہ دونوں عواقب سے بچنا چاہتا ہے' لیکن یہ صرف اس صورت میں ممکن ہوتا ہے جب دانشور طبقہ اصلاح یا پھر انقلاب کا ایک پروگرام بنائے اور اسے عوام میں مقبول کرے۔ ان دونوں صورت حالات میں فنکاروں اور دانشوروں کا انتخاب نہ صرف ان کی اپنی ذات پر بلکہ معاشرے کے مستقبل پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

اس ساری گفتگو کا حاصل یہ نکتہ ہے کہ فنکاروں اور معماروں کو ساری پیشہ ورانہ زندگی میں اپنی اخلاقی اور سیاسی حیثیت کے انتخاب کا مسئلہ درپیش رہے گا۔ وہ جو بھی انتخاب کریں گے' اس سے پاکستان میں غالباً ریاست اور معاشرے کے مستقبل کی راہ متعین کرنے پر اثر پڑے گا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ ملک گراچی کے بیان کردہ آخری منظر نامے کی دہلیز پر کھڑا ہے۔ ریاست اور معاشرے کے درمیان ساختیاتی اور تہذیبی دونوں طرح کا ایک نہایت بنیادی تضاد پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ اس صورت حال کا بنیادی سبب طاقت کے موجودہ نظام اور پاکستان کے پیداواری نظام کے درمیان بڑھتا ہوا معاندانہ فرق ہے۔ ہمارا اقتدار کا ڈھانچا جو ہمیں ورثے میں ملا ہے' نو آبادیاتی ہے اور اس کی ساخت ایسی ہوئی ہے کہ دیہی معیشت کے تقاضے پورے کرتا رہے۔ جاگیردار' فوجی اور افسر شاہی اور اشرافیہ پر اس کا قبضہ ہے۔

لیکن پاکستان میں ایک صنعتی معیشت آگے آ رہی ہے' شہری متوسط طبقہ اور مزدور طبقہ آبادی کا تیس فیصد ہو ہی چکا ہے' قومی پیداوار میں اس کا حصہ نصف کے برابر ہے چنانچہ حکمرانی کا ڈھانچا فطری طور پر اور خاص طور پر شہروں کے لئے از کار رفتہ اور ناقابل عمل ہے۔ کراچی کے بحران کی وجہ نسلی تفریق' ایم کیو ایم کی خراب سیاست یا حکومت کی غیر قانونی زیادتیوں سے زیادہ یہی صورت حال ہے۔

کراچی کو وسیع پیمانے پر (میٹروپولیٹن) کہا جاتا ہے جس کے لفظی معنے (ملک کا خاص شہر) اور اس کی سرگرمیوں کا مرکز ہے یہ شہر پاکستان کا تجارتی دارالحکومت ہے' ایک برتن جس میں سارے عناصر پگھل کر یکجان ہو رہے ہیں' مزدور' پیشہ ور لوگ اور سرمایہ دار' جو سب سے زیادہ ٹیکس دینے والے ہیں اور فی الوقت اس کے سارے گہرے زخم اپنی جان پر جھیل رہے ہیں۔ کراچی ہمارے ماضی اور مستقبل کا نقطہ اتصال ہے' وعدوں اور وعدہ شکنیوں کا ہماری آرزوؤں اور امیدوں کی ناکامی کا شہر۔ کراچی تضادات میں نہایا ہوا' ایک میٹروپولیٹن جسے نسلی تنازعوں نے پارہ پارہ کر دیا ہے' ایک جدید میگالوپولیٹن' جس پر جاگیردار اشرافیہ کی حکمرانی ہے۔ یہ ثروت مند شہر غریبوں کا مسکن ہے' یہاں تک کہ اس کی کچی آبادیوں میں بھی بے خانماں اور دربدر ہونے والوں کے لئے ایک کشش ہے۔ اس شہر میں وہ تیزی اور حرکت ہے کہ اسے شمار میں لانا ممکن

MashalBooks.org

نہیں ۔اس کے معاملے میں ساری پیش گوئیاں ناکام ہو جاتی ہیں۔کئی سال سے اسے قتل کیا جا رہا ہے لیکن وہ ہے کہ مرنے کا نام نہیں لیتا۔کراچی پاکستان ہے اور نوجوان اس کے مستقبل کے معمار ہیں۔

("ڈان" 10 دسمبر 1995ء)

مولانا کے نائبین

ذیابیطس اپنا اثر دکھا رہی ہے۔وہ آہستگی سے رک رک کر چلتے ہیں' 47 سال کے ہیں' لیکن اپنی عمر سے بڑے لگتے ہیں۔ ہلکے سے خم سے اندازہ ہوتا ہے کہ کمر میں تکلیف رہتی ہے۔کبھی کبھی اندازہ ہوتا ہے کہ درد کی کیفیت ان کے ستے ہوئے' تھکے ہوئے اور مسکراتے ہوئے چہرہ پر نمودار ہوتی ہے۔لیکن وہ اپنی تکلیف بیان نہیں کرتے۔ جب کوئی ملاقاتی اپنی تشویش کا اظہار کرتا ہے تو وہ اپنی کیفیت کو کم کر کے بیان کرتے ہیں: "جی ہاں تھوڑی سی تکلیف تو ہے۔"

وہ چودہ سے سولہ گھنٹے تک ایک جن کی طرح کام کرتے ہیں۔ان کی انگلیاں پاکستان کے درماندہ اور ہلاکت زدہ انسانیت کے احوال پر ہوتی ہیں: ان ایجنوں میں جب کوئی تباہی آتی ہے۔ساج میں "تشدد" کی وبا بڑے پیانے پر پھوٹ پڑتی ہے' جیسا کہ سندھ میں 1990ء میں ہوا۔یا جب عناصر فطرت غضبناک ہوتے ہیں' جس طرح 1992ء کے سیلاب کے زمانے میں ہوا اس وقت فون کرتے کرتے ان کی انگلیاں سوج جاتی ہیں کہ فلاں جگہ ایمبولینس چاہئے' اس طرف بحالی کے دستے بھیجے جائیں اور جگہ جگہ متاثرہ لوگوں کو خون فراہم کیا جائے۔ان کے ایک رفیق کار نے کہا' وہ ہنگامی حالات میں بھی اس وقت تک کام کرتے رہتے ہیں جب تک ان میں چلنے کی سکت باقی رہتی ہیں۔انگلیاں سوج جائیں یا کمر دکھتی رہے کاظمی صاحب کو اپنے کام سے محبت ہے۔وہ مولانا عبدالستار ایدھی کا داہنا بازو ہیں' یا غالباً بایاں بازو۔

میں ان سے کوئی بیس برس پہلے ملا تھا۔ جب وہ یونیورسٹی سے نکلنے کے بعد ایک ٹریڈ یونین آرگنائزر تھے۔نیشنل عوامی پارٹی کو' جو دھڑوں میں بٹ گئی تھی' انہوں نے چھوڑ دیا اور مزدور کسان پارٹی (ایم کے پی) میں سرگرم ہو گئے۔ میں نے ان کو ایک ایسا بائیں بازو والا پایا' جو نایاب ہوتے ہیں' ایک کھلے ذہن کے آدمی۔ایک بار کراچی کے ایک دورے میں ایم کے پی کے ناظرین کے سامنے میں نے ایک سوال رکھا یعنی مزدور طبقے کی آمریت کے بارے میں لینن کا تصور اور فی زمانہ اس نظریے کی قدر و قیمت اور اس کے امکانی خطرات کیا ہیں؟ حاضرین اس سوال پر دم بخود رہ گئے اور پریشان بھی۔لیکن کاظمی ان چند افراد میں سے تھے جن سے کھل کر بحث ہو سکتی تھی۔وہ دھڑے بندی سے دور بھاگتے تھے چنانچہ جب ایم کے پی میں رخنہ پڑ گیا تو وہ اس سے بھی الگ ہو گئے۔

MashalBooks.org

انتہائی سنجیدہ بائیں بازو والوں کی طرح کاظمی، عوام کے لئے حصول انصاف میں سرگرداں تھے۔ وہ ان لوگوں کے دقیانوسی نظریاتی تنازعوں سے بالکل الگ رہتے تھے، جنہیں وہ "کمیونسٹ ملا" کہتے تھے جیسا کہ بیشتر سچے لوگوں کا معاملہ ہے ان کی وفاداری 'افتادگان خاک' سے تھی۔ اس میں فیشن کے ساتھ کبھی نہیں آئی بڑی عمر میں تبدیلی اثر انداز ہوئی۔ عبدالستار ایدھی کے ساتھ ان کی کچھ رسم وراہ 1962 سے تھی، یہ وہ زمانہ تھا جب عبدالستار ایدھی نے اپنی دوعدد سوزوکی پک اپ کو ایمبولینس میں تبدیل کرایا تھا اور میٹھادر میں کام کر رہے تھے۔ بسم اللہ بلڈنگ کی آفت زدگی میں مولانا نے جس مستعدی اور تیز رفتاری سے متاثرہ افراد کو مدد پہنچائی تھی، اس سے کاظمی بہت متاثر ہوئے اور مولانا کے ساتھ کام سے لگ گئے۔ وہ کہتے ہیں: "یہ ایک بڑا موڑ تھا، مولانا صاحب کے لئے بھی۔" ایک سال بعد جب سیلاب آیا تو مولانا اپنی امدادی سرگرمیوں میں ستر ہ ایمبولینس گاڑیوں اور ٹرکوں کے ساتھ شریک تھے۔

"1982 تک انور کاظمی ایک کل وقتی کارکن بن گئے، ایک مختلف طرح کی پارٹی کے کارکن" انور نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ میں نے پوچھا: "مختلف کس طرح؟" اور وہ کچھ سوچتے ہوئے جواب دیتے ہیں: "اس کا مشن ہے تو محدود لیکن زیادہ آزادانہ ہے۔ نیپ اور ایم کے پی میں لیڈر صاحبان کے تعلق سے میں خود کو مزارعہ سمجھتا تھا۔ یہاں میں خود کو ایک ذمہ دار شہری محسوس کرتا ہوں۔ یہ ایک دور حاضر کی تنظیم ہے۔ بائیں بازو کی پارٹیوں کی ساخت فیوڈل ہے۔ تامل کی کچھ اور باتیں بھی ہیں۔"

ایدھی ویلفیئر ٹرسٹ تنظیم سازی میں کامیابی کا ایک نادر نمونہ ہے۔ دنیا بھر میں کہیں بھی اس پیمانے پر سماجی خدمت کی شاید ہی کوئی مثال ملے گی اور ہوئی بھی تو اس سے بہتر نہیں ہوگی۔ اس کا مشن اور اس کے کام کے طریقے ڈاکٹر اختر حمید خاں کے اورنگی پائلٹ پروجیکٹ سے مختلف ہیں۔ لیکن ایک ایسے ملک میں جہاں بڑے بڑے حکومتی اور نیم سرکاری ادارے دراصل وسائل کے زیان اور نااہلی کے نمونے بن گئے ہیں یہ دونوں نجی تنظیمیں اس قابل ہیں کہ ان کے انتظام، سماجی حرکت و عمل اور پھر ترقی اور سماجی انصاف کے عوام کی بیتابانہ خواہش کے حوالے سے ان کا گہرا مطالعہ کیا جائے۔ خان صاحب کے اورنگی پراجیکٹ کی طرف میں پھر رجوع کروں گا اس وقت کاظمی صاحب اور ایدھی ویلفیئر کی کامیابی کا تذکرہ ہے۔

اعداد و شمار سے پوری بات سامنے نہیں آتی، لیکن ان سے کچھ سمجھ میں آتا ہے کہ اگر صحیح سمت میں تحریک ہو تو اس ملک میں عورتیں اور مرد کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ ایدھی کے 325 ہنگامی مراکز ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں، ان میں تین ہزار سے زائد کارکن ملازم ہیں جو دن رات کے چوبیس گھنٹے آفت زدہ لوگوں کو مدد پہنچاتے ہیں۔ ان کے ساتھ وائرلیس سے رابطہ رہتا ہے، اس کے ذریعے آفت اور تباہی کی صورت میں تو ہر پیمانے پر رات دن خبر ملتی رہتی ہے اور مصیبت زدگان کی فوری امداد اور تحفظ کے لئے پہنچا جا سکتا ہے۔ پچھلی مرتبہ کوئٹہ میں نو بج کر دس منٹ پر زلزلہ آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی سرکاری ادارہ مدد کو پہنچتا، ایدھی کے رضا

MashalBooks.org

کارسوا نو بجے وہاں پہنچ گئے تھے۔ 1992ء میں جب تباہ کن سیلاب آیا اور منگلا کا بند ٹوٹ گیا تو ایدھی کی امدادی ٹیمیں فوج کے امدادی دستوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی دو گھنٹے پہلے جہلم پہنچ گئیں۔

مستعدی تیز رفتاری اور بہادری یہ ایدھی کی حفاظتی اور طبی ٹیموں کی امتیازی خوبیاں ہیں۔ 1992ء میں اس مضمون کی چھوٹی سی ایک خبر چھپی تھی کہ چولستان کے قریب سرحد پار کرتے ہوئے دو بنگلہ دیشی مارے گئے۔ ایدھی کی ایمرجنسی ٹیم ان کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ اس نے 940 کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا ان کو دریافت کر لیا اور گیارہ ہلاک ہونے والوں کی تدفین کی۔ چھ لاشوں کی تدفین رینجر یونٹ نے کی۔ پولیس اور فوج کے دستے ایدھی والوں کی

جرات مندی اور تیز رفتار کارکردگی پر بھروسا کرنے لگے ہیں۔ جب سواریوں سے بھری ہوئی تین بسیں گوادر میں پھنس گئیں اور نکلنے کی کوئی امید نہ رہی تو رینجرز نے مدد کے لئے آواز دی اور مدد ان کو فراہم کر دی گئی۔ ایدھی ٹرسٹ کی ایمبولینس ہر ماہ اوسطاً ایک لاکھ افراد کو مدد دیتی ہیں۔ 1988ء میں ایدھی ٹرسٹ نے اپنی ایمبولینس کے دستے میں ایک آٹھ نشستوں والے جہاز کو شامل کیا تھا۔ اب ان کے پاس ایک ہیلی کاپٹر بھی آ گیا ہے۔ 1992ء کے سیلاب میں ان دونوں نے بالائی پنجاب میں کل چالیس اور ملتان میں بارہ پروازیں کیں اور 36 ہزار متاثرین کو امدادی سامان بہم پہنچایا۔

مولانا کا بنیادی مرکز کراچی ہے جہاں سے ان کے مراکز صحت رفتہ رفتہ آگے تک پھیل گئے ہیں۔ کام کا دباؤ سندھ میں زیادہ ہے لیکن ان مراکز کی موجودگی دوسری جگہوں پر بھی محسوس کی جانے لگی ہے۔ نیشنل ہائی ویز کے ساتھ ساتھ ایمرجنسی کے مراکز کھولنے کا منصوبہ جس کے تحت 65 مراکز پہلے سے ہی کام کر رہے ہیں اب تقریباً مکمل ہونے کو ہے۔ کراچی کوئٹہ ہائی وے پر جہاں آبادیاں دور ہیں ایسے سات مراکز کام کر رہے ہیں۔ بہت سے علاقوں میں جہاں پاکستان کے شہری کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں ایدھی کی ایمبولینس اور طبی سروس ان کا واحد سہارا ہے۔ ان مراکز میں ایک لاکھ مریضوں کا ہر ماہ علاج ہوتا ہے۔ ایدھی ہوم اور ایدھی کے ہسپتالوں میں ہر ماہ تقریباً بارہ تیرہ سو لاوارث بچے پامال عورتیں ذہنی یا جذباتی طور سے پریشان حال بچے اور شدید بیمار افراد داخل کئے جاتے ہیں۔ چند ہفتے قبل جب میں نے معلوم کیا تو اس وقت ایدھی کی مہیا کردہ سہولتوں سے چھ ہزار داخل مریض فیض یاب ہو رہے تھے۔

ایدھی کے ان اداروں میں روایات کی خوبی اور جدت دونوں دیکھنے میں آتی ہیں۔ یہ جگہیں صاف ستھری ہیں اور ان میں ایک ایسی تمکنت اور وقار کا احساس نظر آتا ہے جو پاکستان کے کسی اور پبلک ہسپتال میں موجود نہیں۔ یہ نظم وضبط کے تحت پابند اور ایسے ادارے ہیں جن میں سب کی شراکت ہے۔ اس کے لئے کام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ یہاں ہیں وہ سیکھتے بھی ہیں عزت نفس حاصل کرتے ہیں ان میں کام کے لئے تحریک پیدا ہوتی ہے وہ اپنے ادارے پر فخر کرتے ہیں اور یہ تنظیم اپنے معمولی وسائل سے

MashalBooks.org

زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرتی ہے۔ کورنگی میں اس کا بچوں کا گھر ہے' جہاں دو سو بچوں کو جنہیں مجرمانہ انداز سے الگ کر دیا گیا تھا' ہمیں اپنے فرائض بڑی محنت سے انجام دیتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ یہ بچے چھ افراد کے ایک نگران عملے کے تحت اس جگہ کو خوبی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔ سرکاری منصوبوں میں انتظامی مصارف بالعموم چالیس فیصد سے اوپر چلے جاتے ہیں اور کبھی کبھی تو کل منصوبے کی سلیت کا ساٹھ ستر فیصد ہو جاتے ہیں۔ ایدھی ٹرسٹ میں انتظامی امور پر کل بجٹ کا صرف دس فیصد خرچ ہوتا ہے۔

کراچی سے باہر 65 ایکڑ پر واقع ایدھی کمپلکس میں ایک ہزار چھ سو دماغی مریض رہتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کسی فرد کی نگرانی میں کام کرتے ہیں۔ یہ مریض صاف ستھرے لباس پہنتے ہیں۔ کاظمی صاحب کہتے ہیں: ''ہمیں عطیے میں خاصے کپڑے مل جاتے ہیں' چنانچہ ہمارے لئے ان کے لباس اکثر تبدیل کراتے رہنا ممکن ہے۔'' اس موقع پر میں ایک گہرے ذاتی شکر کا بھی اقرار کروں گا۔ میری ایک بھتیجی شدید جذباتی اضطراب کا شکار تھی۔ سال گزرنے کے ساتھ اس کی حالت بگڑتی گئی۔ اس کی بیوہ ماں اور بہنوں کے لئے اب یہ ممکن نہیں رہا کہ اسے اپنے ساتھ رکھیں۔ امریکہ سے یہاں ایک دورے میں' میں نے اور میری بیوی نے کراچی' لاہور اور اسلام آباد پنڈی میں کسی ایسی جگہ کی تلاش کی' جہاں اسے اقامت اور علاج کی سہولت مل سکے۔ ہمیں دو ایسے پرائیویٹ ''ہسپتال'' نظر آئے' جہاں متمول کینوں نے اپنے مریض رشتہ داروں کو ڈال رکھا تھا۔ دونوں جگہیں نفرت انگیز اور ان کی حیثیت خوش نما قید خانے کی تھی۔ ہمارے معائنے کے دو ہفتے بعد ان میں سے ایک ہسپتال میں دو مریضوں نے خودکشی کر لی تھی۔ ان کے مقابلے میں ایدھی کا سادہ اور صاف ستھرا گھر مناسب معلوم ہوا' جہاں کا ماحول ایک ذہنی مریض کے لئے زیادہ انسانی تھا۔ میری بھتیجی وہیں رہی اور وہیں اس کا انتقال ہوا۔ آخری مرتبہ جب میں وہاں گیا تو مولانا صاحب اور ان کی بیوی بلقیس ایدھی نے اس کا تذکرہ بڑی اپنائیت سے کیا۔

عام طور پر غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ ہمارے معاشرے کے نادار اور محروم افراد ہی ایدھی کی خدمات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خوشحال اور متوسط طبقے کے لوگ جتنا ایدھی ویلفیئر ٹرسٹ کو عطیہ کرتے ہیں' اس سے زیادہ اس ادارے کی خدمات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایدھی باہر کی ایجنسیوں سے کوئی رقم نہیں لیتے۔ اور خوشحال طبقے اس کے وسائل کا صرف بیس فیصد دیتے ہیں۔ مالی طور پر اس ادارے کی ریڑھ کی ہڈی معمولی محنت کش افراد ہیں۔ اس سے فائدہ اٹھانے والے جو اس کو چندہ دینے والوں اور نکتہ چینوں سے کسی طرح کم نہیں' پاکستانی معاشرے کی ایک تصویر پیش کرتے ہیں۔ ایک مکمل اور بھرپور تصویر' جو کوئی سرکاری رپورٹ میرے علم کی حد تک یا کوئی عالمانہ کتاب بھی پیش نہیں کرتی۔

ایدھی ویلفیئر ٹرسٹ کو بالعموم ایک عظیم اور سچے مولانا سے منسوب کیا جاتا ہے جن کے کرب و انداز کا بیان میں ابھی کروں گا۔ یہ بھی کچھ اپنی قسم کی غلط فہمی ہے۔ ایدھی کے کام کا انحصار ایسے مردوں اور عورتوں کی

ایک ٹیم پر ہے جنہوں نے انسانیت کی خدمت کا عہد کر رکھا ہے اور یہ عہد اس بات کی یاد دہانی ہے کہ مثالیت پسندی، بے لوثی اور مصائب و آلام کو دور کرنے کی عملی خواہش ملک کے اندر اب تک موجود ہے جن لوگوں کو میں مولانا کے سچے جانشینوں میں شمار کرتا ہوں، انہی میں سے ایک پرانے کامریڈ انور کاظمی بھی ہیں۔

مولانا کا ذاتی کرب

ڈیفنس، گلبرگ، اسلام آباد غیر رسمی طور پر پاکستان میں ایک اور نسلی آبادی کا خطہ ہے۔ اس شخص کے لئے جو بالعموم اس طرف رہتا ہے، اس کے لئے میٹھا در پہنچنا ایک ناقابل برداشت تجربہ ہوگا۔ اس کی گلیوں میں جہاں چہل پہل رہتی ہے۔ بیماری کی بدبو نہیں ہوتی اور نہ بدحال بچوں کا سامنا ہوتا ہے، جن پر مکھیاں بھنکتی ہوتی ہیں۔ میٹھادر کی گندی نالیاں صرف آدھی ڈھکی ہوتی ہیں اور ان میں دریا کی روانی نہیں ہوتی، لیکن شہر جہاں آپ پر امنڈا پڑتا ہے، گویا آپ پر سوار ہو جاتا ہے۔ یہاں آپ کو خالی جگہ کہیں نہیں ملے گی اور کوئی چیز مستحکم نظر نہیں آئے گی۔ اس کی پرہجوم تنگ تنگ گلیوں میں ایک منظم بدنظمی نظر آتی ہے۔ یہ گلیاں پیچ در پیچ اس طرح پھیلی ہوتی ہیں، جیسے کسی بڑے جانور کی نکلی ہوئی آنتیں، جن کے اندر لوگ چیونٹیوں کے سے انہماک کے ساتھ گھومتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ جانی پہچانی اور بوسیدہ عمارتیں بھی حرکت کرتی ہوئی نشیب کی جانب آمادہ نظر آتی ہیں۔ یہاں کسی کا پتہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے، لیکن میٹھا در میں ایدھی سنٹر کو ہر شخص جانتا ہے، دکاندار آپ کو رضاکارانہ طور پر وہاں کونے کی اس معمولی عمارت میں جہاں وہ سنٹر ہے، پہنچانے پر تیار رہتے ہیں۔ صدر دروازے پر کچھ لوگ بنچ پر بیٹھے نظر آتے ہیں اور کچھ اس معمولی سے ڈیسک کے آس پاس منڈلا رہے تھے جس کے کنارے بیٹھے ایدھی کے رضاکاران کے کام کر رہے تھے۔ یہ پرانی طرز کی ایک عمارت ہے، جس کے کمرے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ایک قطار میں ہیں۔ تیسرے کمرے میں جس میں ایک چھوٹی سی کھڑکی بھی تھی، مولانا بیٹھے ہوئے تھے، ان کی داڑھی، پچھلے سال کے مقابلے میں اب کچھ زیادہ سفید ہو گئی تھی، ڈیسک پر ڈھیروں کاغذ پھیلے تھے۔ وہ باتیں کرنے کے موڈ میں تھے اس کا مطلب تھا کہ صبح اچھی گزری تھی۔ "ایدھی بھیک" کا ایک پھیرا لگا کر وہ ابھی ابھی واپس پہنچے تھے۔ اب کے ان کا پھیرا مزار قائد کے پاس تھا۔ ان کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی جب انہوں نے کہا:

"یہ آنے والے کل کا فنڈ ہے۔ میں ہر پاکستانی سے صرف ایک روپیہ مانگتا ہوں۔"

ان کے منصوبے بہت اونچے ہیں۔ وہ صحت سے متعلق اپنی خدمات کو دور تک پھیلانا چاہتے ہیں، جس کی پشت پر ایک بڑے سرمایے کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے لئے ان کا منصوبہ پانچ سو کروڑ کی رقم جمع کرنا ہے۔ وہ بڑے جوش کے ساتھ اپنی مختلف اسکیموں کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں۔ ایک گھر بنانا ہے ذہنی مریضوں کے لئے، ایک بے گھر عورتوں کے لئے اور ایک گھر بے سہارا نادار بچوں کے لئے، یہ سب ہر صوبے میں ہوں گے۔ اس کے علاوہ ایک نگران مرکز قومی صحت اور حادثوں کے متعلق، جن کا آپس میں رابطہ

بجلی کے ذریعے ہوگا اور ان کے ساتھ طبی امداد دینے والوں کی موبائیل ٹیمیں ہوں گی اور پاکستان کی بڑی بڑی شاہراہوں کے ساتھ ہر پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر صحت اور اس کی تعلیم کے مراکز ہوں گے۔مولانا اپنے خوابوں کی گرہیں بڑی صفائی کے ساتھ کھولتے جاتے ہیں۔ سننے والوں کی بے یقینی دور ہوتی جاتی ہے' جب انہیں یاد آتا ہے کہ اس خواب دیکھنے والے نے اپنے کام کا آغاز ایک سوزوکی پک اپ سے کیا تھا جس میں ایک ''ایمبولینس'' لگائی گئی۔اسی سے نے ایک غیر معمولی دنیا خدمت کی خاطر تخلیق کی جس میں اب دو ہزار ایمبولینس گاڑیاں ہیں اور علاج معالجے کے نہایت مستعد مراکز کام کر رہے ہیں۔

مولانا اپنا کام معمولی انداز سے شروع کرتے ہیں اور عزائم بلند رکھتے ہیں' یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔ وہ درجہ بدرجہ آگے بڑھتے ہیں' ان مقاصد کے حصول کے لئے جو نہایت بلند ہیں ان کی نظریں بہت دور تک دیکھتی ہیں۔ حقیقت میں مزاج میں توازن پیدا کیا ہے۔ وہ ماضی کو ایک بوجھ کے مقابلے میں کمتر طور پر پرشکوہ کامیابی قیاس کرتے ہیں۔ معاشرے کے بارے میں ان کے گہرے مشاہدے نے' ایسا معاشرہ جو لالچ اور کرپشن میں بری طرح آلودہ ہے جہاں بے نتیجہ رقابتیں ہیں اور فضول خرچیاں ہیں اس نے مولانا کو مایوس کر دیا ہے' لیکن عوام پر اور ان کے مستقبل پر ایک یقین کی بدولت اس نے ان کے مزاج میں اعتدال بھی پیدا کر دیا ہے۔

اس روز میں نے ان کو فکرمند دیکھا۔ جس قدر کربناک کیفیت سے وہ گزر رہے تھے اور جتنے بے گانگی کے احساسات ان میں گھر کر چکے تھے اس نے انہیں بے حال کر رکھا تھا۔ بار بار انہوں نے کہا۔ ''پاکستان مسلمانوں سے بھرا ہوا ہے' لیکن یہاں اسلام نہیں ہے۔'' انہوں نے کہا کہ میں نے امریکہ میں' کینیڈا' نیویارک اور سوئیڈن میں اسلامی اقدار کے تحت زندگی گزارتے ہوئے اور ان اقدار کو برتتے ہوئے لوگوں کو دیکھا ہے۔ وہ پاکستان کے مراعات یافتہ لوگوں کو اور ان سب سے بڑھ کر ملک کے سیاست دانوں کو حرص و ہوس' تشدد اور عام لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہوئے خود غرضانہ لوٹ مار کا ماحول پیدا کرنے کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ سماج کے زینے پر آپ جس قدر اونچے ہوتے جائیں گے' اخلاقی زینے کے اتنے ہی نیچے اتر رہے ہوں گے۔ یہ بات انہوں نے ایک بدیہی حقیقت کے انداز میں کہی۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ غیر ملکی ثروت مندوں کے بارے میں ان کی رائے بہت اچھی ہے اور قوم کے اپنے ثروت مندوں کے باب میں بری ہے' سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ مالی عطیات آخر ان سے کیوں لیتے ہیں' غیر ملکیوں سے کیوں نہیں لیتے؟۔ مولانا وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے خیال میں معاشرے کی بہت سی خرابیاں دوسروں پر انحصار کرنے اور عوام کے بارے میں حقیر رائے رکھنے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں۔ جب عام لوگ اپنی مدد خود کریں گے' اپنے ادارے خود بنائیں گے' خود انحصاری سے کام لیں گے اور غیر ملکی امداد کو سختی سے رد کر دیں گے تو ان میں اپنی قدر و قیمت کا احساس پیدا ہوگا اور معاشرے کو دوسرے پر

MashalBooks.org

انحصار کرنے کے حوصلہ شکن کلچر سے بھی نجات دلائیں گے۔ ''میں غیر ملکیوں کا احترام کرتا ہوں جو امداد دینے پر آمادہ ہوتے ہیں' لیکن میں دوسروں پر انحصار کرنے کی اس برائی کو برقرار رکھنا نہیں چاہتا۔ اس برائی کو دور کرنا ہماری ذمہ داری ہے' غیر ملکی ایجنسیوں کی نہیں۔'' مولانا بہ اصرار یہ کہتے ہیں کہ ہمارا مستقبل عام لوگوں کی فعال طاقت بھی ہے۔

مولانا صاحب اپنے ڈیسک کی دراز سے وہ خط نکالتے ہیں جو انہوں نے اور ان کی اہلیہ بلقیس نے اپنے بیٹے قطب کے نام جو امریکہ میں زیر تعلیم ہے' ارسال کیا تھا۔ یہ ایک غمناک خط ہے۔ ان کی محبت اور دکھے ہوئے دلوں کی پکار۔ اس خط میں وہ سیاسی' لسانی اور مذہبی جماعتوں کے بارے میں لکھتے ہیں' جنہوں نے عوام میں عدم تحفظ اور نفرتیں پیدا کی ہیں اور جو ہمیں بھی خوفزدہ کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے مزید لکھا کہ ''ترقی'' کا عمل ایک ذریعہ بن گیا ہے' قومی خزانے کو لوٹنے کا اور یہ کہ پرمٹ اور قرضے اپنے رشتے داروں اور دوستوں میں خیرات کی طرح بانٹ دیئے جاتے ہیں۔ قوم کا مستقبل غیر ملکی بینکوں میں گروی رکھا جا رہا ہے اور آبادی کی اکثریت بدستور نادار اور مظلوم ہے۔

ایدھی کے دل میں پاکستان کے رہنماؤں کے لئے شدید نفرت ہے اور وہ ان پارٹیوں کو جن پر یہ رہنما قابض ہیں' عام لوگوں کی اخلاقی گراوٹ اور ملک کی سیاسی زندگی میں زوال کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ پاکستان کا ماحول' اصلاح کے ذریعے تجدید نو کی حد سے گزر چکا ہے۔ ان کی پیش گوئی ہے کہ ''کسی نہ کسی دن اس ملک میں سماجی انقلاب رونما ہوگا۔'' جس ہفتے کے دوران یہ خط لکھا گیا اور ڈاک میں ارسال کیا گیا' یعنی 25 ستمبر 1993ء میں ان کی مایوسی اس انتہا کو پہنچ چکی تھی کہ ایدھی اور بلقیس دونوں نے اپنے بیٹوں کو لکھا۔ ''ابھی گھر واپس نہ آنا۔ جہاں تم ہو' وہیں انسانیت کی خدمت کرو۔ تمہاری واپسی کا ایک دن ضرور آئے گا۔'' میں یہ سوچ کر دنگ رہ گیا کہ وہ شخص جو اس ملک کے ساتھ اتنی گہرائی سے وابستہ ہے اس کے عوام کی خدمت میں اس حد تک غرق ہو چکا ہے اور جس کے لئے عوام کے دلوں میں اس قدر احترام ہے وہ اس کے سماجی اور سیاسی ماحول سے اس شدت کے ساتھ دل برداشتہ ہو جائے گا۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ مولانا ایدھی کی مایوسی میں شدت ان کے تجربے سے آئی ہے۔ ان پر اور ان کی تنظیم پر طرح طرح کا سیاسی دباؤ ڈالا گیا۔ سیاسی پارٹیوں اور مذہبی جماعتوں نے ان پر براہ راست حملے کئے۔ وہ اپنے مقبوضہ علاقوں میں ایدھی کی تنظیموں کو دھمکاتے رہتے ہیں' اس سلسلے میں ان کا تجربہ اختر حمید خاں کے تجربے سے کچھ مختلف نہیں' خان صاحب کا نظریہ اور عمل یہ ہے کہ ترقی کمیونٹی کی سطح پر ہونی چاہیئے۔ اس نے ایک معزز اور ایسا متبادل طریق کار پیدا کیا ہے' جسے دنیا بھر میں سراہا گیا ہے۔ اس ملک میں ترقیاتی منصوبہ بندی کے نام پر افسر شاہی کی جو لوٹ اور سیاسی رشوت خوری جاری رہی ہے' مذکورہ طریقہ اس کا متبادل ہے۔ یہ دونوں افراد اسلامی روایات کے پروردہ ہیں' یعنی صوفیانہ مزاج کے ساتھ تقویٰ اور انسان دوستی سے

MashalBooks.org

مملو۔ یہ خوبی ان مروجہ نظریے سے یعنی سرکاری اور قدامت پرست جماعتوں سے بالکل متصادم ہے۔ یہ دونوں افراد جن تنظیموں کی نمائندگی کرتے ہیں وہ سیاسی مذہبی اور اقتصادی مفادات کے حامل بااثر لوگوں کے لئے ایک چیلنج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کو دشمنی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کھلی دشمنی اور ڈھکی چھپی عداوت بھی۔مولانا کہتے ہیں کہ "یہ لوگ کسی دیانت دار اور باضمیر فرد کو سوسائٹی کے لئے خطرہ سمجھتے ہیں۔"

ایدھی کے اپنے لوگ

میں پہلی بار ان سے سہراب گوٹھ میں ایدھی کے پرہجوم کمپلکس میں ملا۔ یہ 1986ء کا سال تھا۔ اس وقت ان کی سرگرمیوں کا مرکز اپنا گھر تھا۔ بے گھر عورتوں کا گھر۔مولانا وہاں نہیں تھے۔ملاقاتیوں کے اس کشادہ ہال میں جہاں ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی بہت سے لوگ ان کا انتظار کر رہے تھے یا ایدھی کے عملے کو اپنا مسئلہ بیان کر رہے تھے۔جوں ہی میں اندر داخل ہوا ایک کارکن نے جو معمولی کپڑوں میں تھا لپک کر مجھ سے میری آمد کا سبب پوچھا۔اس نے کہا کہ "مولانا صاحب یہاں گیارہ بجے تک آئیں گے بشرطیکہ درمیان میں کوئی فوری بلاوا نہ آجائے۔کیا آپ انتظار کرنا چاہیں گے؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔اس نے مجھے کرسی پیش کی اور اپنے کام کے لئے چلا گیا۔میں نے اس سارے منظر کا بغور مشاہدہ کیا اور اپنے مشاہدات لکھتا گیا۔

ایک لڑکی جو شکل سے سولہ سال کی ہوگی جھجکتی رک رک کر چلتی اندر داخل ہوئی اور تھکی ہوئی لگتی تھی۔اس کی کشادہ بھوری آنکھوں سے اس کے اندیشے اور خوف کا پتہ چلتا تھا۔لڑکی ایک کونے میں کھڑی ہو جاتی ہے اور ڈوپٹے کا ایک کونہ پکڑے ایک اضطرابی کیفیت میں اس سے کھیلتی رہتی ہے ان کے عملے کا ایک فرد اس کے پاس آتا ہے۔"تم یہاں رہنے کے لئے آئی ہو" وہ کچھ اس طرح سے پوچھتا ہے گویا اس فقرے میں سوال اور جواب دونوں شامل ہوں۔لڑکی اثبات میں سر ہلاتی ہے۔ چند ہی لمحوں کے بعد ایک معمر خاتون اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے آتی ہے۔ عملے کا آدمی میرے سوال کے جواب میں کہتا ہے۔ "ہم داخل پہلے کر لیتے ہیں سوالات بعد میں۔" مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ لڑکی گھر سے بھاگی تھی پھر جب اس کے منگیتر نے اس پر جسم فروشی کے لئے دباؤ ڈالنا شروع کیا تو وہ وہاں سے نکل بھاگی۔میں نے پوچھا۔آپ لوگ اسے یہاں کب تک رکھیں گے؟ انہوں نے جواب دیا۔"معلوم نہیں شاید اس کے وارث آئیں گے اور اسے واپس لے جائیں گے تب تک وہ یہاں کام کرے گی اور اگر کوئی معقول رشتہ ملا تو یہیں اس کی شادی بھی ہوسکتی ہے۔"

ایک عورت اندر داخل ہوتی ہے۔اس کے ہمراہ دو لڑکیاں ہیں اور ایک چھوٹا لڑکا۔میں سوچ رہا تھا کہ وہ کس لئے وہاں آئی تھیں کہ ایک کارکن نے بتایا کہ "مولانا صاحب موجود ہیں۔" وہ بے جھجک اندر

داخل ہو جاتی ہے مولانا پست قامت گول چہرہ بھرواں داڑھی خاکستری رنگ کے کھدر کا کرتا شلوار پہنے پاؤں میں موٹے ربڑ کا سینڈل۔ ان کے وجود سے پھرتیلا پن ظاہر تھا۔ کارکن انہیں متوجہ کرتا ہے کہ ایک عورت کنبے کے ساتھ ملنے آئی ہے۔

وہ اس کی طرف توجہ کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ آپ کا معاملہ کیا ہے۔ عورت ملی جلی پنجابی اور اردو میں کہتی ہے۔ ''میں ایتھے ہی رہوں گی۔ گھر چھوڑ دیا۔''

''ٹھیک ہے'' مولانا جواب دیتے ہیں اور اپنے کارکن کو تاکید کرتے ہیں ''داخلہ کر دو۔'' اس عورت کا تعلق اپنا گھر کے ناراض حصے سے تھا۔ جس کے لئے وہ مغرب کی اصطلاح (Battered women) استعمال نہیں کرتے۔ اکثر اوقات شوہر انہیں واپس لے جانے کے لئے آتے ہیں۔ اس وقت ایدھی کے کارکن ثالث بن کر ان کے درمیان سمجھوتہ کرا دیتے ہیں۔ ساٹھ فیصد سے زیادہ ناراض عورتیں بالاخر اپنے گھروں کو واپس چلی جاتی ہیں۔ ایدھی کی موجودگی ایسا سہارا ہے کہ عورتوں کو معاملہ کرنے میں طاقت کا احساس ہوتا ہے۔ اس ادارے کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ مردوں کے لئے بھی مفاہمت پر مائل ہونا اور نادم ہونا آسان ہو گیا ہے۔ میں نے ایک سندھی سے بات کی تو اس نے کہا۔ ''یہ تقوٰی والی جگہ ہے مصیبت زدہ لوگوں کو یہیں پناہ ملتی ہے۔'' معاً مجھے خیال آیا کہ قدیم زمانے میں ان کے آباؤ اجداد نے اسی طرح ایک صوفی خانقاہ بنانے کے بارے میں سوچا ہوگا۔

اس وقت تک مجھے ایدھی کی چند ابتدائی خصوصیات کا پرتو نظر آیا تھا۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ ان میں ایک قائد کے طور پر فوری اور حتمی فیصلہ کرنے کی کس قدر صلاحیت ہے۔ کئی سال بعد ان کے عملے کے ایک رکن نے مجھے بتایا کہ ستار ایدھی خرچ کی پروا کئے بغیر فوری عمل کرتے ہیں۔ کچھ دوسرے لوگ ان کی دیگر خوبیاں بیان کرتے ہیں۔ ''وہ ہمارے ساتھ مل کر مرے ہوئے شخص کو اٹھاتے اور مردے نہلاتے ہیں۔'' یہ ہمیں ایدھی ٹرسٹ کے ایمبولینس ڈرائیور نے بتایا۔ ان کے ایک اور مددگار نے بتایا۔ ''وہ بڑے حساب سے خطرہ مول لیتے ہیں اور ہم میں خود اعتمادی کی روح پھونک دیتے ہیں۔'' ایک اور رکن نے کہا مولانا مستقل مزاج ہیں' وہ حوصلہ نہیں ہارتے۔ ان کے دو ساتھیوں سے منت کر کے پوچھا' ''ان کی کمزوریاں کیا ہیں''؟ ''وہ بدگمان ہو جاتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ان میں یہ بات تب پیدا ہوئی' جب ان کا بھائی ان کے خلاف ہو گیا تھا۔'' ایک اور ساتھی نے کہا' ان کی شخصیت مرکزی ہے۔ فیصلے ان کے گرد گھومتے ہیں۔ اور لوگ پوچھتے ہیں کہ ان کے بعد اس تنظیم پر کیا گزرے گی۔ یہ سوال جس کے بارے میں ہم آئندہ مضمون میں لکھیں گے خود مولانا کو بھی فکرمند رکھتا ہے۔

وہ لوگ جو ایدھی ویلفیئر ٹرسٹ سے مدد حاصل کرتے ہیں اور وہ بھی جو اس کی مدد کرتے ہیں' ہم مل جل کر پاکستان کا ایک نقشہ بناتے ہیں' یہ نقشہ' یہ چہرہ تو ہمارا جانا پہچانا ہے لیکن ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے۔

MashalBooks.org

حقیقت تو یہ ہے کہ بہت سے لوگ ظاہر کرتے ہیں گویا انہیں اس کی موجودگی کا علم ہی نہیں۔ پھر اکثر اوقات خود فریبی میں مبتلا ایسے لوگ اپنے مفروضوں پر یقین کرنے لگتے ہیں گویا یہی ان کی سزا ہوتی ہے۔ ناراض عورتوں کے معاملے کو ہی لیجئے۔ ہم ظاہر یہ کرتے ہیں کہ عورت کے پاؤں تلے جنت ہے۔ لیکن عورتوں کی ایک بھاری اکثریت ہماری گالیوں اور مار پیٹ کا نشانہ بنتی آئی ہے۔ نہ تو ریاست ان عورتوں کا کوئی مداوا کرتی ہے اور نہ معاشرہ توجہ دیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم اسے ایک مسئلہ مانتے ہی نہیں۔ ہمارے علماء اور مشائخ شاید ہی کبھی اس بدسلوکی کے خلاف اپنے خطبوں میں کچھ کہتے ہوں بلکہ عورتوں کے ساتھ بدسلوکی کو وہ درگزر کرتے آئے ہیں گویا یہ کوئی اسلامی عمل ہے۔

ایدھی کی پناہ میں بے گھر لڑکے بھی ہیں۔ مٹھی بھر تعداد ان لڑکوں کی ہے' جنہیں ریاست اور معاشرہ دونوں نے نظرانداز کر دیا ہے۔ خاندانوں میں یہ جنسی تشدد اور بدفعلی کا نشانہ بنتے ہیں' پھر انہی میں ذہنی بیمار اور جذباتی طور پر بجھے ہوئے لوگ بھی ہیں۔ ایک سرکردہ ماہر نفسیات نے بتایا کہ جذباتی طور پر دل شکستہ بالغوں کی تعداد پاکستان میں پندرہ تا بیس فیصد ہوگی۔ یہ لوگ قابل علاج ہیں۔ لاہور' اسلام آباد اور کراچی میں ادویہ فروش جذباتی دباؤ کے مریضوں کو آسانی سے دوائیں بیچ دیتے ہیں' حالانکہ کوئی اور یورپی یا امریکی حکومت ڈاکٹری نسخے کے بغیر ایسی ادویہ بیچنے کی اجازت نہیں دے گی' اور فارمیسی والوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایسی دوا کی بھی بڑی مانگ ہے اور خوب بک رہی ہیں۔ جذباتی دباؤ یا اور ذہنی بیماری ہمارے یہاں ایک ممنوعہ مرض ہے۔ ہم اس مفروضے کے ساتھ زندہ ہیں کہ اس کا کوئی وجود نہیں' اور ہم نے اس کے علاج کا انتہائی ناکافی بندوبست کیا ہے۔ کراچی میں ایدھی ہوم کے اندر ذہنی بیماروں کے حصے میں سولہ سو مریض زیر علاج ہیں۔ مولانا کہتے ہیں۔ "یہ تعداد تو عشیر عشیر بھی نہیں" ہم صرف اس قدر نفسیاتی علاج کرا سکتے ہیں جو پہلی طبی امداد کے برابر ہے۔ نفسیاتی مسائل سے نمٹنے کے لئے ہمارے پاس طبی وسائل نہیں یہ بات ایک نوجوان نفسیاتی معالج نے مجھے "اپنا گھر" میں 1987ء میں بتائی تھی۔

پھر ایسے ہزاروں افراد ہیں' جن کا علاج ایدھی کے مراکز صحت میں ہوتا آیا ہے۔ اور وہ بیمار اور زخمی ہیں جنہیں ایدھی ٹرسٹ کی ایمبولینس ہسپتال پہنچاتی ہیں اور کچی آبادیوں میں رہنے والے وہ لوگ ہیں' جنہیں سرکاری اہلکاروں اور سیاست دانوں کے حواریوں سے بچانے کی ناکام کوشش ایدھی کے لوگ کرتے رہتے ہیں۔ یہ زمینوں پر ناجائز قبضہ کرنے والے حریص اور ہوس کار افراد ہیں جو غریب لوگوں کو ان کے ٹھکانوں سے بے دخل کرتے رہتے ہیں۔ چند ہفتے پہلے جب مولانا سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں بے حد خفا پایا۔ وہ بنگلہ دیش کالونی کی آتش زدگی کے سانحے سے سخت ناراض تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اس آتش زدگی کا مقصد کالونی کے باشندوں کو بے گھر کر کے ان کی زمین پر ناجائز قبضہ کرنا تھا۔ ایدھی سے فیض یاب ہونے والے اس بات کی علامت ہیں کہ ہمارے قومی مصائب کے حل کی ابتدا ہو چکی ہے۔ ان کا وجود انسانی

MashalBooks.org

صورت حال کے بارے میں صرف ایک طرح کی یاد دہانی ہے اور مقتدر حاکموں نے شہریوں کی ضرورتوں سے جو بے رحمانہ لاتعلقی اختیار کی ہے اس کی نشاندہی ہے اور اس حقیقت کا اظہار ہے کہ سماجی مسائل کرنے کے لئے بہت زیادہ روپے کی نہیں بلکہ فرض شناسی کی ضرورت ہے۔

مولانا کو یہ علوم ہے کہ ایک غیر منصفانہ اور احساس فرض سے عاری ریاست میں این جی او (غیر سرکاری ادارے) انصاف پر مبنی معاشرہ قائم نہیں کر سکتے۔ میری ملاقات سے چند دنوں پہلے مولانا ایک خاصی بڑی رقم کا عطیہ جو جنرل ضیاء الحق نے ذاتی طور پر دیا تھا' اگرچہ سرکاری خزانے سے تھا' واپس کر چکے تھے۔ مولانا نے جنرل ضیاء الحق کو جو خط لکھا تھا' اس کی اور چیک کی نقول مجھے نہیں مل رہی ہیں جو مولانا نے مجھے دی تھیں۔ تاہم یاد آتا ہے کہ انہوں نے نہایت شائستہ الفاظ میں یہ لکھا تھا کہ انہوں نے اپنا کام سرکاری کارکردگی کے متبادل کے طور پر شروع نہیں کیا تھا بلکہ حکومت کو جو کام کرنا چاہئے' میرا مقصد اس کے روبرو ایک نمونہ اور ایک چیلنج پیش کرنا تھا' لہٰذا میں حکومت سے بہ اصرار یہ کہوں گا کہ اس رقم کو وہ کسی مفید کام میں لگائیں اور سماجی تعمیر نو کا آغاز کریں۔ مولانا کا یہ انکار صوفیوں کی انقلابی روایت کے مطابق تھا' جنہوں نے ریاستی طاقت پر انحصار کرنے سے ہمیشہ گریز کیا۔ یہ ایک تازہ تاکید بھی تھی کہ ریاست کو وہ ذمہ داری پوری کرنی چاہئے جو شہریوں کی جانب سے اس پر عائد ہوتی ہے۔

ایدھی غیر ملکی امدادی ایجنسیوں سے کبھی عطیات نہیں لیتے۔ میں نے پوچھا' پھر آپ کی مدد کون کرتا ہے؟ اس کرشمہ ساز بوڑھے نے جواب دیا۔ ''یہ ایک الگ کہانی ہے۔ کل شام پانچ بجے کے بعد آ جانا۔'' دوسرا دن جمعرات کا تھا۔ میں شام چھ بجے سہراب گوٹھ پہنچ گیا۔ وہاں یہ دیکھا کہ لوگوں کی تین لمبی قطاریں لگی ہوئی ہیں' پہلے تو میں یہ سمجھا کہ وہ لوگ ایدھی سنٹر میں علاج کے لئے آنے والے بیرونی مریض ہیں لیکن دراصل وہ نادار محنت کش تھے جو ختم ہونے والے ہفتے کی شام کو اپنے عطیات جمع کرانے کے لئے آئے تھے۔ ان کے پاس آٹا' گندم' مرغیاں' گھر میں سلے ہوئے کپڑے' کسی کے پاس ایک دنبہ' دو بکریاں اور ہاں کچھ مناسب سی نقدی بھی تھی۔ ایدھی کے کارکن ایک ایک کے تحائف کو رجسٹر میں لکھتے جاتے اور رسید دیتے جاتے تھے۔ بیشتر نے رسید لینے سے انکار کر دیا۔ اس منظر نے ملک کے بارے میں اور اس کے شہریوں کے بارے میں میرے یقین کو پختہ تر کر دیا۔ یہی معمولی عطیات دینے والے ایدھی ویلفیئر ٹرسٹ کے لئے ریڑھ کی ہڈی ہیں' یہ لوگ سالانہ تیس کروڑ کی رقم یعنی ایدھی کے کل بجٹ کا 80 فیصد حصہ جمع کراتے ہیں۔

ایدھی کو ملنے والے عطیات کی مثال سے ایک اور اندوہناک حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ کہ غریب زیادہ دیتے ہیں' متوسط طبقے کے لوگ کم دیتے ہیں' دولت مند کم سے کم دیتے ہیں اور فیوڈل (جاگیردار) خاندان بالکل نہیں دیتے۔ اس بارے میں مولانا صاحب خاموش ہیں۔ لیکن ان کے رفقائے کار

کے ساتھ بات چیت کے دوران میں پاکستانیوں کے ضمیر کا قدرے اندازہ ہو جاتا ہے۔ بڑے عطیات دینے والے بمشکل آدھے درجن افراد ہیں ان میں سے ہر ایک ایک لاکھ روپے کے لگ بھگ عطیہ دیتا ہے۔ بڑے جاگیردار گھرانوں سے ملنے والے عطیات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بڑے صنعتی گروپوں میں سے کوئی ایک بھی نہیں جو انفرادی یا اجتماعی طور پر کوئی بڑی رقم بطور عطیہ دیتا ہو۔ ایدھی کے سالانہ مصارف کا انیس فیصد متوسط طبقے سے ملنے والے عطیات سے پورا ہوتا ہے اس میں قربانی کی کھالیں بھی شامل ہیں۔

ایدھی کے حامیوں کا ایک توسیعی جائزہ لیں تو ایک اور سماجی حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے۔ کم سے کم رقم ان علاقوں سے آتی ہے جہاں جاگیرداری رشتے بہت مضبوط ہیں۔ یہ کیفیت تو وہاں بھی ہے' جہاں ایدھی کا کام بہت پھیلا ہوا ہے۔ ایدھی ٹرسٹ نے ٹھٹھہ میں ایک مرکز صحت قائم کیا جو گیارہ سال سے چل رہا ہے۔ ساٹھ ہزار کی آبادی میں یہ مرکز ہر فرد پر اوسطاً بیس ہزار روپیہ ماہانہ خرچ کرتا ہے۔ ایدھی کو 1993ء میں صرف 26 افراد نے نظرانہ دیا تھا۔ ٹھٹھہ سے ملنے والی کل رقم دو صد گیارہ روپے تھی۔ بلوچستان' سندھ اور جنوبی پنجاب میں جہاں بھی جاگیرداری کی گرفت ہے یہی قرینہ موجود ہے۔ پورے ملک کے شہری علاقوں سے اور مرکزی پنجاب سے جہاں جاگیرداری کی گرفت باقی نہیں رہی۔ ایدھی کو مستقل امداد ملتی رہتی ہے۔ مرکزی پنجاب اور کراچی سے موصول ہونے والی رقم ٹرسٹ کی کل آمدنی کا اسی فیصد ہے۔

ٹرسٹ کے کارکن ایسی درجنوں کہانیاں بیان کرتے ہیں' جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں دوسروں پر تکیہ کرنے کی روش اور اندھی ترجیحات کس طرح کارفرما ہیں' بالخصوص ان علاقوں میں جہاں کا ماحول جاگیردارانہ ہے۔ اندرون سندھ سے ایک بہت بڑے وڈیرے کو آغا خاں ہسپتال لے جایا گیا۔ جہاں اسے ایک مہنگے پرائیویٹ کمرے میں ٹھہرایا گیا' لیکن اس کے افراد خاندان کو ایدھی ایمبولینس کا کرایہ جو تین روپیہ فی میل کے حساب سے محض بارہ سو روپیہ بنتا تھا' دینے میں تامل تھا۔ (بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ اس نے ہسپتال کا بل جو 56 ہزار کی رقم تھی بخوشی دے دیا) ٹرسٹ کے ایک کارکن نے یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہے ان کی ذہنی ساخت۔ جہاں انہیں مفت سواری کا موقع مل جائے وہاں یہ کچھ بھی دینے کے حق میں نہیں۔"

بہرحال' جاگیرداری نظام لب گور ہے۔ اس سے پاکستان کی ترقی میں تاخیر تو ہوگی' لیکن یہ نظام ترقی کے عمل کو روک نہیں سکے گا۔ ہمارے معاشرے میں تجدید اور تبدیلی کی راہ میں اس سے کہیں بڑی رکاوٹیں کچھ دوسری جگہوں پر نظر آ رہی ہیں۔ مولانا عبدالستار ایدھی جیسے لوگوں کے لئے وہ زیادہ تشویشناک ہیں۔ ان مسائل پر ہم پھر کبھی غور کریں گے۔

("ڈان" 2 جنوری 1996ء)

MashalBooks.org

آپ کے ملک کا میزانیہ

مختلف ممالک ہر مالی سال کے آخر میں اپنے نفع ونقصان کا میزانیہ مرتب کرتے ہیں۔ ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں نے جدید معمولات کے مطابق اس معاملے میں بھی حالات کی نشاندہی کی ہے۔ دولت مند ملک جو اشاریہ تیار کرتے ہیں نادار ممالک' یہ دیکھے بغیر کہ ان کی پسماندگی کے پیش نظر وہ اشاریہ کتنا مفید ہوگا' اس پر عمل شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارے یہاں مقامی طور پر تیار کردہ کوئی اپنے معیارات نہیں' جن کی بنیاد پر حکومتوں کی کارکردگی کی پیمائش ہو سکے اور ان معاشروں کے نفع ونقصان کا حساب کیا جا سکے' جنہیں اب تک تیسری دنیا کے ممالک کہا جاتا ہے۔ یہاں ذیل میں کچھ معیارات پیش کئے جاتے ہیں' جن کی مدد سے ہماری بدقسمت اقوام کی صورت حالات کا تخمینہ لگایا جا سکتا ہے۔

یہاں سب سے پہلے ایک جانی پہچانی حقیقت کا بیان ضروری ہے۔ حکمرانی' ترقی اور پسماندگی کے درمیان ایک رسمی سا تعلق پیدا کرتی ہے۔ معاشرے سے اور معیشت کے عمل دخل سے اس کا وہی رشتہ ہے جو آکسیجن کا زندگی سے ہے۔ نظم حکومت کی کمزوری اور اس کی ناکامی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود ریاست بلکہ تہذیب بھی ڈھے جاتی ہے۔ یاد کیجئے کہ مشرقی ایشیا' جنوبی ایشیا' مشرق وسطی اور افریقہ میں نوآبادیاتی دور کا آغاز ہی اس وقت ہوا جب حکومت کے مقامی اقتدار کو گھن لگ چکا تھا اور ان میں حکمرانی کی اہلیت اور خواہش دونوں باقی نہیں رہ گئی تھیں۔ نوآبادیاتی دور کے بعد زمانے میں تیسری دنیا کی ریاستوں کے اندر سماجی اور اقتصادی ترقی کا انحصار ان کی حکومتوں کی پالیسیوں اور پالیسیوں کے موثر نفاذ پر رہا ہے۔ اس بنا پر ذیل میں جو فہرست پیش کی گئی ہے اس میں پسندیدگی کا میلان نظم حکومت کے معیار کی جانب ہے۔

پہلی بات یہ کہ آپ کی حکومت کے سربراہ نے کتنے غیر ملکی دورے کئے' انہیں شمار کیجئے' اگر ایک سال کے اندر ان دوروں کی تعداد چار سے زیادہ ہو تو پھر آپ کا ملک مصیبت میں مبتلا ہے اور اگر وزیراعظم اور صدر کے دورے باہم مل کر تعداد میں بڑھتے جا رہے ہیں تو ملک کے لئے مصیبت اس حساب سے بہت زیادہ ہے سوائے عرصہ جنگ کے جب اتحادی لیڈروں کے ساتھ مشاورت کی ضرورت بڑھ جاتی ہے اور اس لئے دوروں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ سربراہان ریاست بہت زیادہ غیر ملکی دورے نہیں کرتے کیونکہ اس سے اندرون ملک کے نہایت ضروری کاموں میں خلل واقع ہوتا ہے۔ اس سے قیادت کا خلا پیدا ہوتا ہے۔ فیصلہ

MashalBooks.org

کرنے کے مراحل میں رکھنے پڑتے ہیں اور ماتحت لوگوں کے لئے ایک مثال قائم ہو جاتی ہے کہ وہ بھی اس طرح دورے کریں۔ تیسری دنیا کے ملکوں کے لوگ پہلے ہی مالی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ یہ دورے بہت زیادہ مہنگے پڑتے ہیں۔ اس کے باوجود دوروں کی کثرت پسماندگی پر ایک عذاب بن گئی ہے۔ تیسری دنیا کے رہنما دولت مند صنعتی ملکوں کے رہنماؤں کے مقابلے میں زیادہ غیر ملکی دورے کرتے ہیں اور خاصے مہنگے دورے کرتے ہیں۔

دوسری بات: یہ کہ آپ کا لیڈر اپنے ہر دورے میں کتنے افراد کو ساتھ لے کر چلتا ہے؟ اس کا شمار کیجئے۔ ایک سنہری اصول اس سلسلے میں یہ ہے کہ افراد کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی وہ حکومت اتنی ہی گہری ہوگی۔ معمول یہ ہے کہ تیسری دنیا کے لیڈر اپنے ساتھ ہجوم لے کر چلتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں پہلی دنیا کے رہنما اپنے ساتھ صرف چند معاون رکھتے ہیں' تقریباً پندرہ سال ہوئے میں نیویارک کے یورپین پلازہ ہوٹل میں اپنے دوست اولف پامے سے ملاقات کے لئے گیا۔ وہ اس وقت سوئیڈن کے وزیر اعظم تھے اور جنرل اسمبلی کے اجلاسوں میں شرکت کے لئے وہاں آئے تھے جہاں ان دنوں نئے اقتصادی انتظام (New Economic Order) کی بابت نادابستہ ممالک کے مطالبے پر بحث چل رہی تھی۔ ہوٹل کی لابی میں افریقیوں کا ہجوم تھا۔ انگولا کے صدر کسنیونیٹو بھی ابھی وہاں پہنچے تھے۔ ان کے دورے میں ایک سو دو افراد شامل تھے۔ میں نے ہوٹل کی دسویں منزل کے ایک کمرے میں پامے سے ملاقات کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے اپنی سیکرٹری سے کہہ رکھا تھا کہ اس ملاقات میں نوٹس لینے کی ضرورت نہیں' چنانچہ اس نے کافی کا آرڈر دیا اور کمرے سے چلی گئی' حیرت ہے۔ میں نے سوال کیا' آپ کے وفد میں کتنے افراد شامل ہیں انہوں نے کہا چار۔ میں نے کہا نمایاں طور پر بہت کم ہیں۔ انہوں نے جواب دیا ایسا بھی نہیں۔ اقوام متحدہ میں سوئیڈن کا سفارتی عملہ ہماری مدد کے لئے موجود ہے۔

اور اب تیسری بات: حکومت میں کرپشن کی کثرت اور اسکی نوعیت پر غور کیجئے اور پھر اس کی طرف قیادت کا رویہ۔ دنیا میں کہیں بھی کوئی بھی حکومت کرپشن سے بری نہیں۔ سرمایہ دارانہ صنعت کاری کے فروغ کے زمانے میں حکومت کے اوپری طبقوں کے اندر کرپشن عام ہو جاتی ہے۔ برطانیہ میں رابرٹ کلائیو اور وارن ہیسٹنگز جیسی سرکردہ شخصیتوں نے جنہوں نے ایک سلطنت کی تعمیر کی تھی' کرپشن کے الزام میں پارلیمنٹ کا سامنا کیا اور انہیں سزا دی گئی۔ امریکہ میں نمایاں ترقی کا زمانہ جو سول وار کے بعد آیا' سنہری دور کے نام سے مشہور ہے۔ اس دور میں یولیس گرانٹ جیسے ہیرو کی شہرت بری طرح داغ دار ہوئی جب کہ ایک اور امریکی صدر اینڈریو جانسن 1868ء میں کانگریس کے مواخذے سے بمشکل بچ سکا۔ آج بھی جیسا کہ لاک ہیڈ اور واٹر گیٹ کے رسوا کن واقعات سے ظاہر ہے ترقی یافتہ صنعتی جمہوریتوں میں سرمایے اور طاقت کی کرپشن پھیلی ہوئی ہے۔ مگر کرپشن اور اقتصادی ترقی کے درمیان تعلق لازمی طور پر منفی نہیں ہے۔ لہذا کرپشن کو

MashalBooks.org

تجربے کی روشنی میں دیکھنا ہوگا' البتہ یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ کرپشن بہر طور بہر حال میں اخلاقی طور پر قابل مواخذہ اور معاشرے کے لئے نقصان دہ ہے۔

کسی معاشرے کے مستقبل پر کرپشن کے کیا اثرات ہوتے ہیں؟ یہ جاننے کے لئے بعض امور بہت اہم ہیں۔ ایک تو یہ کہ کرپشن کہاں تک پھیل چکا ہے۔ کرپشن اگر بڑے پیمانے پر پھیل جائے تو ریاست کی بنیادوں اور معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ کر کھوکھلا کر دیتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اگر یہ کسی شعبے تک محدود ہے اور اس کی نوعیت اتفاقیہ ہے تو اس سے نپٹنا ممکن ہے بشرطیکہ سزا دینے اور اصلاح کرنے والے ادارہ کو معقول طور پر کام کرنے دیا جائے۔ برطانیہ اور امریکہ میں جہاں کی مثالیں اوپر دی گئی ہیں' اصلاح کے انتظامی ادارے کی کارکردگی کی بدولت ہی ریاست اس کی ضرر رسانی سے بچی رہی بلکہ معاشرے میں اس کا اختیار کچھ اور بڑھ گیا۔ اس کے بعد سوال رویے کا پیدا ہوتا ہے۔ آمرانہ حکومت میں عام شہری بے بسی کی زندگی گزارتے ہیں اور کرپشن بالائی طبقے میں موجود ہوتا ہے عوام ان حالات میں عملاً مقبوضہ ہوتے ہیں۔ جمہوریت میں اگر پریس اپنا کام کر رہا ہو تو وہ بڑے بڑے مالی اسکینڈل کا پول کھول دیتا ہے۔ لیکن اگر حکومت اور پارلیمنٹ اس کے جواب میں موثر طور پر چھان بین نہیں کرتیں اور معاملات کو نہیں کھولتیں تو جمہوریت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اور ریاست کا اقتدار زوال سے دوچار ہوتا ہے۔ آخری بات یہ کہ کرپشن کی نوعیت کیا ہے اس کا تعلق کسی پیداوار سے ہو سکتا ہے یا یہ چوری ہو سکتی ہے ایک سرمایہ کار سے رشوت اس لئے لی جاتی ہے کہ دفتری رکاوٹیں عجلت کے ساتھ دور ہو جائیں گی۔ یہ حرکت غیر قانونی اور غیر اخلاقی ہے۔ لیکن ان حالات میں یہ ملک کے لئے زیادہ نقصان دہ نہ ہوگی لیکن ایک اسلحہ فروش کے مقابلے میں رشوت کے عوض دوسرے کو ترجیح دینا ملک کی سلامتی اور معیشت دونوں کے لئے ضرر رساں ہو سکتا ہے۔

چوتھی بات: جائزہ لیجئے اس بات کا کہ حکومت نے ایک مقررہ مدت میں کتنی اراضی کتنے لائسنس اور کتنے قرضے کی منظوری دی۔ یہ ہیں تیسری دنیا کے مسائل۔ ان ملکوں میں بالعموم چونکہ کچھ پیدا نہیں ہوتا' لہٰذا یہ مقررہ ملکیت اور بے نتیجہ التفات تک محدود رہتی ہے۔ تیسری دنیا کے کرپشن میں زیادہ تر چوری اور قومی وسائل کا اسراف شامل ہوتا ہے اس سے دولت بمشکل پیدا ہوتی ہے۔ اراضی کے پلاٹ' مرسڈیز گاڑیاں' لائسنس اور ناقابلِ واپسی قرضے' ٹھیکے اور مراعات وہ ذرائع ہیں جو اشرافیہ کی دولت میں اضافے کا وسیلہ ہوتے ہیں اور ان سے پسماندگی کی مدت بڑھتی جاتی ہے۔

پانچویں بات: سماجی سطح پر بہت سی نشانیاں ملتی ہیں' جو بالعموم اس جانب اشارہ کرتی ہیں کہ کوئی معاشرہ ترقی کی جانب جا رہا ہے یا جمود کی طرف' کیا آپ کی حکومت گہری سنجیدگی کے ساتھ ترقی کے سب سے یقینی اور مستحکم ادارے یعنی تعلیم کے فروغ پر سرمایہ کاری کر رہی ہے یا نہیں؟ عورتوں' مزدوروں' کسانوں اور اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ اور ان کی پاسداری کے لئے حال ہی میں کتنے قوانین منظور کئے گئے؟ کیا

MashalBooks.org

آپ کے ملک نے زیادہ نجی گاڑیاں درآمد کیں اور انہیں اسمبل کیا یا زیادہ ٹرانسپورٹ گاڑیاں حاصل کیں۔ ریلوے میں کتنے میل کا اضافہ ہوا؟ بڑے بڑے شہروں میں بجلی کے تعطل میں کتنے فیصد کمی ہوئی؟ آپ کے غیر ملکی قرضے میں کتنے فیصد کمی ہوئی یا خدانخواستہ اس میں اضافہ ہوا؟ کیا حکومت کی کوششوں کے نتیجے میں آبادی میں اضافے کی شرح کم ہوئی یا اس جانب بے توجہی کی بدولت پیدائش میں اضافے کی قومی حالت اپنی جگہ قائم رہی؟

چھٹی بات: نج کاری اور غیر ملکی سرمایہ کاری کے اس دور میں اہم نوعیت کے امور پر گہری نظر رکھنا بے حد ضروری ہے۔ میکسیکو کے تعلیم یافتہ باشندے دو سال تک اپنے ملک میں ڈالر کی سرمایہ کاری پر خوشی سے ناچتے رہے، پھر 1995ء میں جب ان کی آنکھ کھلی تو اس وقت تک تباہی نے آ لیا تھا۔ وہاں کی معیشت تباہ ہو چکی ہے۔ ان کے سرکاری سکے پیسو کی شرح صرف ایک مہینے میں پچالیس فیصد گر گئی ہے۔ صدر کلنٹن گویا نافٹا (NAFTA) کی مُدوائف ہیں، جو میکسیکو کو تباہی سے بچانے کے لئے اپنا سارا زور لگا رہے ہیں۔ میکسیکو کو امریکہ کی ہمسائیگی کی وجہ سے جو تحفظ حاصل ہے وہ تیسری دنیا کے ملکوں کو میسر نہیں، پھر میکسیکو اس تجارتی بلاک میں شامل ہے جس کا قائد امریکہ ہے۔ تاہم تیسری دنیا کے ملکوں کو اس سے کچھ سبق سیکھ لینا چاہئے۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔ (1) گھر کا قیمتی اثاثہ اور نوادر بیچ دینے (نج کاری کا مطالعہ غور سے کیجئے) کا مطلب یہ نہیں کہ اس طرح دولت پیدا ہو جائے گی اور اگر کسی نے اس رقم سے قرضے ادا نہیں کئے تو اس کا مطلب ہو گا کہ اس نے غیر ذمہ دارانہ عمل کو طول دے دیا۔ (2) ایم او یو (MOU) یعنی مفاہمت کی دستاویز کو اصل سرمایہ کاری سے مت جوڑیئے۔ اس معاملے میں دونوں کے درمیان فاصلہ پیالے کو ہونٹوں تک لانے تک نہیں بلکہ میلوں پر محیط ہوتا ہے۔ حکومتیں تجویز کرتی ہیں جب کہ کارپوریشنیں، اپنی ترجیحات اور منافع کا تخمینہ لگانے کے بعد ہی اس کو زیر عمل لاتی ہیں۔ واشنگٹن نے تو بطور خاص سیاست کو تجارت سے ملانے کا ماہرانہ انداز سیکھ لیا ہے اور مفاہمت کی دستاویز کو ایک شکاری کی طرح چارے کے طور پر استعمال کرتا آیا ہے۔ میخائیل گورباچوف کو مفاہمت کی دستاویز کی مد میں کئی بلین ڈالر کی سرمایہ کاری کا عطیہ دیا گیا تھا، لیکن اصل سرمایہ کاری پانچ سو ملین ڈالر سے بھی کم کی ہوئی۔ (3) سکے کو دولت، غیر ملکی سرمایہ کاری کو توانا معیشت اور چند لوگوں کی ثروت مندی کو عوام کی خوشحالی ہرگز نہ سمجھئے۔

آخر میں یہ کہ دوسری تمام نشانیاں اتنی بامعنی نہیں ہو سکتیں۔ جتنی بامعنی سماج میں امن کی حالت ہے۔ ریاستیں بالعموم اور تیسری دنیا کے ممالک تو خاص طور پر لسانی اور فرقہ وارانہ سیاست کے دباؤ میں رہتے ہیں۔ اس موقع پر صومالیہ، روانڈا اور لائبیریا کے نام ذہن میں آتے ہیں جو اس دباؤ میں پس کر رہ گئے ہیں۔ لبنان اپنی زندگی کی بحالی کے لئے جدوجہد کر رہا ہے۔ سری لنکا اپنی سلامتی کے لئے سرگرداں ہے۔ الجزائر خون میں نہایا ہوا ہے۔ ان تمام مثالوں میں فیصلہ کن عنصر یہ ہے کہ ریاست قانون کی عمل داری، شہریوں کے

MashalBooks.org

حقوق اور عزت و آبرو کے تحفظ اور جمہوریت اور انصاف کے بنیادی اصولوں کی پاسداری اور احترام میں ناکام رہی۔ جب آپ کا ملک ایک طویل عرصے تک فرقہ واریت کا شکار رہتا ہے اور حکومت ناکام ہو' خواہ اس کا سبب حکومت کی کمزوری' جانبدارانہ سیاست یا احمقانہ بے پروائی ہو' تو یقین کر لیجئے کہ تباہی قریب ہے۔ پھر فوری ضرورت اس امر کی ہے کہ شہری متحد ہوں اور ملک کو شرافت اور قانون کی حکمرانی کی طرف لانے کے لئے کوشش کریں۔

(''ڈان'' 5 فروری 1995ء)

MashalBooks.org

گلے شکوے کا معاشرہ

میں پاکستان کے دیہات میں سفر کرتا رہا ہوں۔ وہاں میری ملاقاتیں ایسے لوگوں سے ہوتی رہی ہیں' جو نہایت معمولی' لیکن جفاکش ہیں ان میں سے زیادہ تر ناخواندہ ہیں۔ وہ شدید موسم کی سختیاں برداشت کرتے ہیں اور نہایت سادہ زندگی گزارتے ہیں' جس میں احتیاج کبھی پوری نہیں ہوتی۔ یہاں عورتیں کھیت میں کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں' گھٹنے ٹیکے ہوئے' کمر دوہری جھکی ہوئی' اوزار ہاتھ میں سنبھالے' کبھی اجنبی لوگوں کو گزرتے دیکھ لیتی ہیں' ان کی خوبصورتی دھوپ میں جھلسی ہوئی' اس بات کی شاہد ہے کہ اپنی انتھک محنت کی بدولت وہ اس ملک کے لوگوں کے پیٹ بھرتی ہیں اور حکمران اشرافیہ کے عیش و عشرت کی قیمت ادا کرتی ہیں۔ آٹھ دس سال کے چھوٹے چھوٹے بچے پانی لے کر پہاڑ کی چڑھائی چڑھتے ہوئے مویشی چراتے ہوئے' گھر کی صفائی کرتے ہوئے اور اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی دیکھ بھال کرتے نظر آجاتے ہیں' دبلے پتلے گٹھے ہوئے جسموں والے مردان کے یہاں آنے والوں کے سوالوں کے جواب دینے کے لئے ارد گرد اکٹھا ہو جاتے ہیں۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ بوڑھی ماں یا بیمار بچے کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے میں یا بیوی کو زچہ بچہ کی ماہر ڈاکٹر کے یہاں پہنچانے اور بچوں کو اسکول لے جانے میں کتنی مشکلات لاحق ہوتی ہیں۔

وہ اپنی صورت حال کی تفصیل بالکل غیر جذباتی انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں' جیسے یہ کوئی فطری تباہی ہو یا ایک لا علاج بیماری۔ جو کچھ انہیں میسر ہے اس پر خدا کا شکر بجالاتے ہیں اور جو نہیں ہے اس پر اپنی محرومی کا الزام بھی کسی کو نہیں دیتے۔ بجٹ سے پہلے وزیر اعظم کی ایک تقریر میں اتفاق سے جوتے کا حوالہ آ گیا تھا۔ اس سے مجھے خیال آیا کہ ان سے جوتوں کے بارے میں پوچھنا چاہیئے۔ میں نے سوال کیا آپ کے پاس اور آپ کے گھر میں لوگوں کے پاس جوتوں کے کتنے جوڑے ہوں گے؟ وہاں جو پچیس افراد موجود تھے ان کے اور ان کے افراد خانہ کے پاس جوتے کا ایک بھی فالتو جوڑا نہیں تھا۔ جوتے کا وہ جوڑا جو اس وقت ان کے پاس ہے' جب کسی کام کا نہیں رہے گا تو دوسرا جوڑا خرید لیں گے۔ کیا وہ جوتے کی پندرہ فیصد زائد قیمت ادا کر سکیں گے؟ اس سوال پر سب نے چپ سادھ لی۔ جب میں نے اصرار کیا تو ایک شخص بولا۔ "ہاں میرا خیال ہے۔" اپنے خیال کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "اس سال گھر کو محض دو یا تین جوڑے جوتوں کی ضرورت ہوئی۔" ہر خاندان میں اوسطاً دس افراد ہیں۔ اس شخص کے کنبے میں گیارہ افراد

ہیں۔اوپری یا درمیانہ طبقے کے لوگوں کی طرح ان کے یہاں کوئی بچت نہیں ہوتی۔سیلز ٹیکس میں اضافے کے بعد ان کے اوقات کچھ اور تنگ ہو جائیں گے۔

پاکستان کے سخت کوش کسانوں اور مزدوروں کے افلاس کو دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے۔ یہ اس معاشرے کو پال رہے ہیں' اس کے پیٹ کو روٹی دیتے ہیں اور اس کی حکمران اشرافیہ کی عیش کوشی کے لئے سرمایہ فراہم کرتے ہیں اس ملک کے مراعات یافتہ تین فیصد سے بھی کم لوگ یہاں کی ستر فیصد دولت کے مالک ہیں۔محنت کشوں کی اکثریت اس ابتلا کا شکار ہے کہ اس کی اضافی پیداوار مختلف حیلوں سے چھین لی جاتی ہے۔اس میں کھلی لوٹ اور بلاواسطہ ٹیکس بھی شامل ہیں' اور یہ بنیادی بے انصافی بھی اس کا حصہ ہے کہ وہ اس معاشرے کے مفت خوروں کی فضول خرچی کی قیمت بھی ادا کرتی ہے' جبکہ اس کے پاس خود اپنے لوگوں کو کھلانے کے لئے کچھ نہیں بچتا۔مواصلات کی جدید سہولتوں' شہروں اور دور افتادہ ممالک کی طرف نقل مکانی اور کاروبار کی لازمی صورتوں نے انہیں بتا دیا ہے کہ اس دنیا میں کیسی کیسی سہولتیں ہیں' جن پر ان کا حق ہے خاص طور پر صحت' تعلیم اور ایسی بنیادی سہولتیں جیسے بجلی' گیس' مٹی کا تیل اور پینے کا صاف پانی۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کا افلاس اور پسماندگی خدا کی طرف سے نہیں ہے بلکہ حکمران اشرافیہ اور ان کی حکومتوں کی جانب سے ہے' اور یہ بھی ان کے علم میں ہے کہ قسمت' سزا کے باب میں فرمانِ الٰہی نہیں ہے بلکہ قسمت متبادل صورت حال کی راہ کھولتی ہے۔ تاہم انہیں خیال آتا ہے کہ وہ چونکہ بے اختیار ہیں اور یہ نظام ان کے خلاف بہت سخت ہے' اس لئے وہ اس جال میں جکڑے گئے ہیں۔ایک بوڑھے سپاہی نے جو پچھلی دو جنگوں میں شریک تھا' دوٹوک انداز میں کہا۔''ہمارے پاس وہ چابیاں نہیں' جن سے دروازے کھلتے ہیں۔کوئی طاقت نہیں کوئی پیسہ نہیں' کوئی تعلیم نہیں۔''

ان لوگوں کی فراست اور شعور کی سطح کو دیکھتے ہوئے ان کی قنوطیت پر حیرت ہوتی ہے۔ میں نے سوال کیا۔آپ لوگ شکایت کیوں نہیں کرتے؟ ان کا جواب عام طور سے یہ ہوتا۔''کس سے شکایت کریں۔''اور بعض دفعہ یہ کہتے۔''ہمیں اس قدر کام کرنے ہوتے ہیں۔''ان کا جواب کچھ اس طرح کا لگتا کہ شکایت سننے کے لئے ایک سننے والا چاہئے اور پھر فرصت بھی چاہئے اور انہیں دونوں میسر نہیں۔ان کی قنوطیت کو بھی میں نے غیر متوقع طور پر خوش گوار پایا کیونکہ معزز لوگوں کے یہاں گلے شکووں کا جو قرینہ ہے' یہ ان سے یکسر مختلف ہے۔ان کو ملنے والی سہولتیں ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں میں متوسط اور بالائی طبقوں کے لوگوں کو ملنے والی سہولتوں سے کہیں زیادہ ہیں' ان کے لئے کھلی جگہیں ہیں۔ ہمیشہ پختہ اور اکثر سنگِ مرمر سے مزین منتظر ہیں کہ کوئی ان کا قبضہ حاصل کر لے۔آپ اسے نوآبادیات کے بعد کی کشادگی کا نام دے سکتے ہیں۔ ہر طرح کے آلات یہاں کے مکانوں میں بافراط میسر ہیں' تھالیوں میں پیزے' پیسٹریاں اور چائے اٹھائے ہوئے بیرے آتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔باہر کھڑی ہوئی گاڑیوں کی عقبی کھڑکیوں پر اکثر

MashalBooks.org

اس مضمون کے اشکر چسپاں ہوتے ہیں' جن میں کسی کالج یا یونیورسٹی کا نام درج ہوتا ہے۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مالکوں کے بچے کہاں زیر تعلیم ہیں۔ اس کے باوجود ان کے ڈرائنگ روم میں زیادہ تر گفتگو اس بات پر ہوتی رہتی ہے کہ ان کی محرومیاں کیا ہیں اور شکایات کیا ہیں۔

یہاں اس طرح کی شکایتیں بہت سننے میں آتی ہیں' جرائم بہت ہیں' گھٹن بڑھتی جاتی ہے' نظم و نسق بہت خراب ہے۔ بہت بری سیاست چل رہی ہے' سودے بازی ہو رہی ہے' افراط زر' کرپشن' لوڈ شیڈنگ اور ہاں ملازموں کا مسئلہ' کسی بھی شام کو یا سہ پہر میں یہ سارے موضوعات چھوٹی چھوٹی شکائتوں کے ضمن میں زیر بحث آتے ہیں۔ اس شکایت کے سوا جو نوکروں کے سلسلے میں پائی جاتی ہے' باقی ساری شکائتیں قابل توجہ نہیں۔ کرپشن' سودے بازی' منشیات فروشی' کتوں کی دوڑ وغیرہ کی جو مذمت ہوتی ہے' اس پر کوئی اعتراض کرے گا۔ بظاہر ان صورتوں کو دیکھ کر تو ایسا لگتا ہے گویا پورا ملک برائیوں میں غرق ہو رہا ہے' لیکن ہماری تمنا ہے کہ پاکستان واقعی ایک پاک سرزمین ہوتا۔ جالب کے الفاظ میں اس وطن عزیز کے بارے میں ایلیٹ کے معروف مصرعوں کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:۔

یہ سب پڑھے لکھے لوگ ہیں' ان معنوں میں کہ انگریزی بولتے ہیں اور اگر سب کے پاس نہیں تو بیشتر کے پاس غیر ملکی ڈگریاں ہیں۔ لیکن ذہن کی بیداری' ان کی تعلیم سے باہر کی چیز ہے۔ ان کی وسعت ذہنی میں بس اتنی ہی چیزیں آتی ہیں' جو زیر استعمال ہوں اور کچھ جانے پہچانے لوگ۔ اس ملک میں رہتے ہوئے مجھے سات سال ہو گئے۔ دوستوں کے ایک نہایت مختصر دائرے سے باہر' سنجیدہ گفتگو تصف در جن سے بھی کم موقعوں پر میں نے سنی ہوگی۔ ایک ایسے ملک میں جو بنیادی طور پر نادار اور پسماندہ ہو' افلاس اور پسماندگی کے اسباب اور علاج پر بمشکل کوئی بحث سننے میں آتی ہے۔ ان کی شام کی سوشل مصروفیات سے جو بہت طویل ہوتی ہیں' کتابوں اور فکر انگیز باتوں کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ سنجیدہ کتابوں کی دکانیں اس ملک میں بڑے برے حال میں ہیں۔ کسی بھی شہر میں اچھی کتابوں کی دو دکانیں بھی نہیں ملیں گی۔ جب کوئی حوصلہ مند کتب فروش دکان کھولتا ہے جیسے کہ نجم سیٹھی نے لاہور اور اسلام آباد میں کتابوں کی دکانیں کھولیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کتابوں کی نہیں' درسی کتابوں کی مانگ ہے' گاہکوں سے زیادہ کتابیں چرانے والے ہوتے ہیں اور ادب میں بھی سنجیدہ کتابوں سے زیادہ خرافات کی فروخت زیادہ ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اپنی کوشش ترک کر دیتے ہیں اور آرام سے اچھی کتابیں بیچنے لگتے ہیں۔

مجھے ایک گفتگو یاد آتی ہے جو تیس سال پہلے سنی تھی۔ میں اپنے خاندان کے افراد سے ملنے کے لئے آیا تھا' اور چونکہ میری گریجوشن کی تعلیم ختم ہونے والی تھی اس لئے تدریس کے کسی موقع کی بھی تلاش تھی۔

ایک روز لاہور میں میری مڈبھیڑ ایک دوست نام بریڈی سے ہوگئی۔ اس نے نیویارک ٹائمز کے لئے الجزائر میں ساڑھے سات سال تک ہونے والی جنگ کی خبریں بھیجی تھیں۔ وہ اس طیارے میں بھی سوار تھا'

جس میں ایف ایل این کے تاریخی رہنما بن بیلا' بودیف' آیت احمد اور رباط حیات سوار تھے لیکن ان کا طیارہ ابھی مراکش اور تیونس کے درمیان فضا میں ہی تھا کہ فرانس کی فضائی فوج نے اسے اغوا کرلیا۔ ٹام نے جو ایک پختہ کار جنگی نامہ نگار تھا' الجزائر کی خبریں بڑی بے خوفی اور زبردست اخلاقی جرات کے ساتھ اخبار کو بھیجی تھیں۔ پھر ہم آپس میں گہرے دوست بن گئے۔ 1962ء میں جنگ ختم ہونے کے بعد ٹام کو ٹائم کے جنوبی ایشیا بیورو کا چیف بنا کر دہلی بھیج دیا گیا۔ جب لاہور میں ہماری ملاقات ہوئی تو وہ کئی بار پاکستان آچکا تھا۔ میں نے پوچھا' تمہیں یہ ملک کیسا لگا؟ خوش طبع بوڑھا خلاف معمول سنجیدہ ہوگیا اور بولا ''میں اس کے بارے میں فکرمند ہوں اور یہاں تمہاری واپسی کے سلسلے میں بھی۔'' پھر اس نے اپنی بات کی وضاحت کچھ اس طرح کی۔

''میں نے جنگیں دیکھی ہیں' افلاس' قحط اور کرپشن بھی دیکھا ہے لیکن ایسی سماجی دیوانگی جو یہاں ہے' اس کا کوئی جواب نہیں پاکستان کے تعلیم یافتہ اور متمول لوگوں کے اخلاقی نقطہ نظر سے پہلے تو میں بہت متاثر ہوا' وہ شکایت کرتے ہیں' کرپشن کی' خویش پروری' حکومت میں اسراف' تام جھام اور شان وکت کی۔ نمائش اور برائیاں غداری کی سطح تک پھیلی ہوئی' وہ ان سب کے بارے میں اس شدت سے شکایت کرتے ہیں' جیسے انہیں اور کسی بات سے دلچسپی نہیں۔ رفتہ رفتہ مجھے یہ نظر آنے لگا کہ وہی لوگ جن برائیوں کی شکائتیں اور مذمت شام کے وقت کرتے ہیں' دن کے وقت وہی برائیاں کرتے اور انہیں پھیلاتے ہیں۔ یہ بڑی خطرناک' خوفناک بات ہے۔'' ٹام نے اپنی بات مکمل کی تو میں نے اپنا دفاع کرتے ہوئے کہا' ٹھیک ہے' خوفناک ہے' لیکن خطرناک کیوں ہے۔ اس نے جواب دیا'' اس لئے کہ انسانوں کا پورا طبقہ سارے لکھے پڑھے لوگ اجتماعی طور پر' انفرادی طور پر ہر روز' ہر ساعت میں اپنے آپ کو مجرم قرار دیتے رہتے ہیں۔''

میں نے اپنی بات پر اصرار کرتے ہوئے کہا۔ پھر کیا ہوا؟ اس طبقے کے لوگ معاشرے میں اصلاحات یا انقلاب نہیں لاتے۔ ٹام نے فوراً جواب دیا۔'' بچے مت بنو۔ یہ کوئی صنعتی معاشرہ اور یہاں کوئی پیچیدہ سماجی ڈھانچا نہیں کہ آپ قیادت کی تلاش کہیں اور سے کریں۔ اسے تو دانشوروں سے ہی آنا ہے۔ جیسے چین' کیوبا اور ہندوستان اور خود تمہارے ملک میں ہوا۔'' لیکن بالائی اور متوسط طبقوں سے ہی ایک باضمیر اقلیت قیادت کے لئے ابھر کر آتی ہے میں نے اپنی دلیل دی۔

ٹام نے کہا یہ نکتہ تو ہے لیکن خود ملامتی کا یہ اجتماعی عمل اس اقلیت کو پیدا ہونے نہیں دیتا۔ یہ خود ملامتی بچوں سے کردار چھین لیتی ہے ان کو اپنے عہد کی پاسداری کے جذبے سے محروم کر دیتی ہے۔ انہیں آسانی سے ملنے والے آرام کا عادی بنا دیتی ہے' انہیں ایسا بنا دیتی ہے کہ پھر وہ اپنے اوپر اور دوسروں پر بھی بھروسا کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔'' ہم قائل ہوئے بغیر جرح کرتے رہے۔ ٹام کا تعلق امریکیوں کی اس نسل سے تھا' جس نے جیکب ریس اور لنکن اسٹیفنس جیسے کھوجی پیدا کئے جو کھود کھود کر لوگوں کے عیب نکالتے تھے اور جن

MashalBooks.org

کے نزدیک دو غلے پن کی باتیں فحش گوئی سے بھی بدتر ہوتی ہیں۔ وہ بدمعاش حرکت و عمل سے بھر پور تھے اور معاشرے کے لئے آزاد طبع اور مقبول عام مفت خوری سے کم نقصان رساں تھے۔

کئی سال بعد ایک اور دوست رضا کاظم نے کچھ ایسے ہی دلائل دیئے ان لوگوں کے بارے میں جو انہی کے الفاظ میں پاکستان کی 'بھتری' (رؤسا) ہیں۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کے اندر کوئی قوت عمل نہیں! کوئی داخلی حرکی طاقت نہیں۔' پھر جب میں بیس سال قبل ان سے ملا تو انہوں نے اس 'بھتری' کو "بی سی سی آئی جنریشن" کا نام دیا۔ یعنی وہ نسل جو آغا حسن عابدی کے معروف بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس انٹرنیشنل سے فیض یاب ہوتی آئی ہے اور اب بھی طنزیہ انداز میں مجھ سے پوچھتے ہیں "کیا تم اب تک بی سی سی آئی جنریشن میں مصلحین کی تلاش کر رہے ہو؟"

میں مام بریڈی اور رضا کاظم کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ پرامید ہوں لیکن میری امید رفتہ رفتہ کم ہوتی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ہر سال جب بجٹ آتا ہے

تو میرے قدموں سے زمین کچھ اور سرک جاتی ہے۔ یہ سوچ کر حوصلہ پست ہو جاتا ہے کہ پاکستان جب اکیسویں صدی میں داخل ہو گا تو اس وقت بھی حقیقی اصلاحات سے محروم ہو گا اور جب 95۔ 1994ء میں عوامی حکومت بے آسرا عوام سے سات بلین کی رقم ٹیکس میں وصول کرے گی تو سندھ کے وڈیرے ایک کروڑ سے بھی کم ٹیکس دیں گے۔ میں یہ حساب نہیں کر سکتا کہ جوتوں پر ٹیکس لگنے کے بعد پاکستان کے خزانے میں کتنی رقم آئے گی لیکن اس قدر جانتا ہوں کہ پاکستان کی برہنہ پا اکثریت کو اس کا عشر عشیر بھی فائدہ نہیں ہو گا۔ اور مجھے یہ بھی یقین ہے بالکل اس طرح جیسے رات کے بعد دن نکلتا ہے کہ نادار اور محروم لوگوں کی یہ منجمد خاموشی جس میں مجھے اندوہناک کرب نظر آتا ہے ایک دن ضرور ٹوٹے گی اور مزاحمت کا کلچر شکوے کے کلچر پر غلبہ پالے گا۔

("ڈان" 14 جنوری 1994ء)

SELECTED ESSAYS OF DR. EQBAL AHMAD

(EQBAL AHMAD KAY MUNTAKHAB MAZAMEEN)

edited by Dohra Ahmad, Iftikhar Ahmad & Zia Mian

Urdu translation: Hasan Abidi

Copyright © Urdu 2001 Mashal Books

Publisher: Mashal Books

RB-5, Second Floor,

Awami Complex, Usman Block, New Garden Town,

Lahore-54600, Pakistan

Telephone & Fax: 042-5866859

E-mail: mashbks@brain.net.pk

www/mashalbooks.com

Title design: Ahmar Rehman

Printers: Maktaba Jadeed Press, Lahore.

Price: Rs. 300/-

MashalBooks.org

Mashal is a small organisation dedicated to the publishing of books on social, cultural and developmental themes of contemporary relevance. Trends in modern thought, human rights, the role of women in development, issues of governance, environmental problems, education and health, popular science, drugs and creative literature relating to these and other themes are the focus of Mashal's programme.

While Mashal works for the widest dissemination of its publications, it is a non-commercial and non-profit enterprise. Mashal therefore seeks the support of individuals and aid giving agencies worldwide which consider the foregoing objectives worthy of promotion.

مشعل معاشرتی، معاشی اور ثقافتی امور اور عہد حاضر سے متعلق ترقیاتی موضوع پر کتابیں شائع کرتا ہے۔ جدید فکری رجحانات، انسانی حقوق، بہتر نظم و نسق، ترقی میں خواتین کے کردار، ماحولیات منشیات اور قومی و عالمی تخلیقی ادب مشعل کی خصوصی توجہ کا مرکز ہیں۔

مشعل کی کوشش ہے کہ اس کی مطبوعات وسیع پیمانے پر دستیاب ہوں۔ یہ ایک غیر تجارتی اور غیر نفع مند ادارہ ہے۔ چنانچہ مشعل ایسے پاکستانی اور غیر ملکی اداروں اور افراد سے امداد کا خواہاں ہے جو مشعل کے اغراض و مقاصد سے اتفاق رکھتے ہوں۔